حسن بن صباح، اس کے باطنی فدائیوں اور مصنوعی بہشت کی پُراسرار داستان
فردوسِ ابلیس
عنایت اللہ

پہلا حصہ

حسن بن صباح اور اُس کی بہشت کی پُراسرار داستان

عنایت اللہ

خزینہ علم و ادب

الکریم مارکیٹ اُردو بازار لاہور ۷۶۳۱۶۹

پیش لفظ

حسن بن صباح ایک ایسا نام ہے جس سے شاید ہی کوئی مسلمان ناواقف ہو گا۔ یہ نام ذہن میں آتا ہے تو وہ بہشت (جنّتِ ارضی) لازماً یاد آتی ہے جو حسن بن صباح نے وادی اَلموت میں بنائی تھی۔ایک بار جو اس بہشت میں داخل ہو گیا وہ اپنے دین و ایمان کو' اپنے ماں باپ اور بچّوں کو' دنیا کو اور اللہ کو بھی بھول گیا۔اس نے حسن بن صباح کو اپنا باپ اور اپنا خدا مان لیا۔

حسن بن صباح نے اسے کہا کہ اپنے خنجر سے اپنا پیٹ چاک کر دو پھر تم ہمیشہ ایسی بہشت میں رہو گے جو اس بہشت سے زیادہ دلنشین اور سحرانگیز ہو گی ... اس "بہشتی" نے پلک جھپکتے خنجر نکالا اور اپنا پیٹ چاک کر لیا۔ کسی سے کہا کہ اس محل کی چھت پر چڑھ جاؤ اور اپنے آپ کو سر کے بل زمین پر گراؤ.... اس شخص نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور اتنی بلند چھت سے سر کے بل کُود کر جان دے دی۔

یہ تھے حسن بن صباح کے فدائین جو اپنی جان دینے یا کسی دوسرے کی جان لینے کو یوں سمجھتے تھے جیسے پانی کا گھونٹ پی لیا۔ تاریخ کو لرزہ براندام کر دینے والی اس داستان میں آپ کو ایسے ہی چند ایک واقعات ملیں گے جن کی تاریخ گواہی دیتی ہے۔

اس بہشت کی حقیقت کیا تھی؟.... میں نے اس سوال کا جواب اتنی تفصیل سے پیش کیا ہے کہ یہ دو جلدوں پر پھیل گیا ہے۔اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا' مؤرخوں اور بعد کے مستند تاریخ نویسوں' وقائع نگاروں اور مبصّروں

کے حوالوں سے بات کی ہے۔ یہ افسانے یا من گھڑت قصے ہیں۔ کسی دانشمند نے بالکل درست کہا ہے کہ حقیقت افسانے سے زیادہ دلچسپ ہوتی ہے۔

اس تاریخی داستان میں ایسی دلچسپیاں ملیں گی جو آپ کو حیرت زدہ بھی کریں گی، آپ کی جذباتی دنیا کو زلزلے جیسے جھٹکوں سے ہلا ڈالیں گی پھر آپ سوچوں میں کھو جائیں گے کہ یہ سب ہوا کیسے؟ یقین نہیں آتا کہ صرف ایک انسان نے لوگوں کے دلوں میں اپنی ایسی عقیدت پیدا کر لی کہ لوگوں نے اپنے ہوش و حواس بھی اس کے حوالے کر دیئے اور دنیا سے لاتعلق ہو کر اسی کے ہو کے رہ گئے۔

حیران ہونے والی کوئی بات نہیں، حسن بن صباح نے انسان کی فطری کمزوریوں کو اُبھارا، انسانی فطرت کی دکھتی رگوں کو مٹھی میں لیا اور انہیں ہپناٹائز کر لیا۔ اُس دَور میں علمِ نفسیات کا وجود نہیں تھا۔ آج کی ہپناٹزم سے بھی کوئی واقف نہیں تھا لیکن انسان اپنی تمام تر نفسیاتی کمزوریوں کے ساتھ موجود تھا۔ اسے گمراہ کرنے والے اپنی ابلیّت کے ساتھ موجود تھے۔

حضرت آدمؑ جو انسانی زندگی کے پہلے انسان تھے ابلیس کے فریب میں آ کر جنّت سے نکالے گئے اور زمین پر پہنچے گئے تھے۔ میں نے اس داستان کو عنوان دیا ہے — "فردوسِ ابلیس" — کیونکہ حسن بن صباح نے جو بہشت بنائی تھی وہ اس کے ابلیسی ذہن کی تخلیق تھی۔

یہ کہنا غلط نہیں کہ حسن بن صباح جیسا ماہرِ نفسیات اور ہپناٹسٹ تاریخ نے نہ کبھی پہلے دیکھا تھا نہ اس کے بعد۔ اللہ کے بھیجے ہوئے پیغمبروں نے لوگوں کو انسانی عظمت کی راہ پر ڈالا تھا لیکن حسن بن صباح نے اپنے پیروکاروں کو انسانیت کی راہ سے ہٹا کر ابلیسیّت کی راہ پر ڈال دیا۔

اس کی بہشت کی اصل حقیقت حشیش میں پوشیدہ تھی۔ حشیش کو عام فہم زبان میں بھنگ کہا گیا ہے لیکن یہ بھنگ سے ملتا جلتا ایک پودا تھا جس کا نشہ بھی بھنگ سے ملتا جلتا تھا مگر اثرات بھنگ سے زیادہ اور کچھ مختلف تھے۔ ان سے انسان

بڑے ہی حسین تصوّرات دیکھتا اور انہیں حقیقت سمجھتا تھا۔

اس نشے کے ساتھ حسین و جمیل لڑکیاں فردوسِ ابلیس کو مکمل کر دیتی تھیں۔ ان لڑکیوں کو خصوصی ٹریننگ دی ہوئی تھی۔ یہی انسان کی وہ کمزوریاں ہیں جو اسے اللہ کی جنّت سے نکلوا کر ابلیس کی بہشت میں پہنچا دیتی ہیں.... عورت، نشہ، حقائق سے فرار اور لذّت پرستی!

حسن بن صباح سلجوقیوں کے دَورِ حکومت میں اُٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے عروج تک جا پہنچا۔ سلجوقی اسلام کے شیدائی، اسلام کی عسکری روایات کے رکھوالے اور مردانِ حُر تھے۔ ایک سلجوقی حکمران نے حسن بن صباح کی گرفتاری کا حکم دیا لیکن یہ شخص قبل از وقت پتہ چل جانے سے فرار ہو گیا پھر کسی کے ہاتھ نہ آیا۔ وہ کہاں گیا، کدھر ڈوبا، کدھر نکلا، یہ بڑی ہی دلچسپ اور سنسنی خیز واقعات سے بھرپُور داستان ہے جو میں اس کتاب میں پیش کر رہا ہوں۔

فردوسِ ابلیس کے اس خالق نے ایک جنگجو لشکر تیار کر لیا تھا۔ چند ایک قلعوں اور میدانوں میں اس لشکر کی سلجوقی مسلمانوں کے ساتھ خونریز لڑائیاں ہوئیں مگر حسن بن صباح کی شاطرانہ اور زمین دوز کارروائیوں نے مسلمانوں کے قدم کسی بھی میدانِ جنگ میں جمنے نہ دیئے۔

حسن بن صباح کے پیروکاروں، خصوصاً" اس کے فدائیوں کو حشیشین کہا جاتا تھا کیونکہ وہ حشیش کے نشے میں اپنی تمام پُراسرار کارروائیاں کرتے تھے۔ پھر انہوں نے بڑی بڑی شخصیات کو قتل کرنے میں خصوصی شہرت حاصل کی تھی۔ انہوں نے صلاح الدین ایوّبی پر چار قاتلانہ حملے کئے تھے۔ غالباً" ایوّبی واحد شخصیت تھی جسے حشیشین قتل کرنے میں ناکام رہے ورنہ ان کے ہاتھوں کوئی زندہ نہیں رہتا تھا۔ اس داستان میں آپ کو یہ تفصیلات بھی ملیں گی کہ انہوں نے کیسی کیسی شخصیات کو کیسے کیسے طریقوں سے قتل کیا۔

تاریخ کی ایک مشہور و معروف شخصیت نظام الملک جو بہت بڑا عالمِ دین اور دانشور تھا، عمرِ خیام اور حسن بن صباح ایک ہی مدرسے میں پڑھتے تھے اور گہرے

دوست بن گئے تھے۔ آگے چل کر تینوں کے راستے جدا ہو گئے۔ نظام الملک سلجوقی حکومت کا وزیرِ اعظم بنا اور حسن بن صباح کو نوکری دلوائی لیکن ایک وقت آیا کہ حسن بن صباح نے نظام الملک کو قتل کروا دیا۔ یہ اس داستان کا ایک خاص حصہ ہے جو آپ کو قدم قدم پر چونکا دے گا۔

یہ تمام سنسنی خیز اور فکر انگیز تفصیلات تو آپ اس داستان میں پڑھیں گے ہی، یہاں اتنا سا اور کہہ دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ حسن بن صباح کی موت کے بعد اس کے فدائین پیشہ ور قاتل بن گئے تھے۔ جنہیں آگے چل کر عیسائیوں نے بھی اُجرت پر استعمال کیا تھا اسی لئے انگریزی بولنے والی قوموں نے حشیشین کی بجائے ان کا نام ASSASSINS رکھ دیا تھا۔ انگریزی میں آج تک انہیں اسی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

یہ بھی بتا دوں کہ حسن بن صباح کے فدائی ابھی موجود ہیں۔ میری یہ کہانی جب "حکایت" میں بالا قساط چل رہی تھی تو اس دوران مجھے چار خط ملے۔ لکھنے والوں نے مجھے بہت کوسا کہ میں ایک نبی کی توہین کر رہا ہوں اور جو کچھ بھی لکھ رہا ہوں یہ سب تعصب کا مظاہرہ ہے۔ ایک صاحب نے کچھ گالیاں بھی لکھی تھیں لیکن گلگت کے ایک صاحب نے اپنے خط میں لکھا — "آپ اپنی یہ بکواس بند کر دیں، میں آپ کو وارننگ دیتا ہوں کہ حسن بن صباح کے فدائی اب بھی موجود ہیں جو کسی بھی وقت آپ تک پہنچ سکتے ہیں"۔

میں نے ایک دو نہیں، کم و بیش ایک درجن مستند تاریخ نویسوں کی تحریریں پڑھ کر یہ داستان مکمل کی ہے۔ ان میں تین یورپی مؤرخ بھی شامل ہیں۔ بہر حال کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے، پڑھیں اور اپنی رائے خود قائم کریں۔ میں یہ دعویٰ کرتا ہوں کہ یہ کتاب آپ نے شروع کر دی تو ختم کر کے ہی اُٹھیں گے۔

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

اولادِ آدم کی داستانِ حیات اتنی ہی طویل ہے جتنی لمبی لمبی صدیاں گذر گئی ہیں۔

انسان اتنے لمبے اور ایسے کٹھن سفر میں اکیلا نہیں تھا۔ ابلیس اس کا ہمسفر رہا... آخری منزل تک ہمسفر رہے گا.... اس کا نتیجہ یہ کہ اولادِ آدم کی زندگی کی کہانی سزا و جزا کی داستان بن گئی ہے مگر عجوبہ یہ کہ انسان اپنی ہی آپ بیتی پر نگاہ ڈالتا ہے تو محوِ حیرت ہو جاتا ہے، عبرت حاصل نہیں کرتا، شرمسار نہیں ہوتا بلکہ خود فریبی سے اپنا دل پرچا لیتا ہے، اور اُس ابلیس کے آگے سجدہ ریز ہو جاتا ہے جس نے اللہ کے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا تھا کہ آدم کے آگے سربسجدہ ہو جا۔

کہانی کوئی بھی ہو، کسی کی بھی ہو، اسی صورت میں دلچسپ، سنسنی خیز، عبرتناک اور خیال افروز بنتی ہے جب اس کہانی کے کردار اللہ والے ہوں سوائے ایک دو کے جو ابلیس کے پجاری ہوں۔ اگر ابلیس اللہ کا حکم مان لیتا اور آدم کے آگے سجدے میں گر پڑتا تو بات اللہ کی عظمت اور بندوں کی بندگی پر اور عابد و معبود تک ہی رہ جاتی۔

اللہ نے نیک اور پارسا بندوں سے جنت کا وعدہ کیا ہے۔

ابلیس نے بندوں کو بدی کے راستے پر ڈال کر انہیں دنیا میں جنت دکھا دی ہے۔

اور یہی ہے وہ ابلیس کی جنت جس نے اولادِ آدم کی سوانحِ حیات میں قوسِ قزح جیسے رنگ بھرے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ابلیس نے اپنے پجاریوں کے لئے جو بھی جنت بنائی اور اسے بڑے ہی دلنشیں رنگ دیئے، وہ کچھ عرصے بعد صرف ایک رنگ میں روپوش ہو گئی... یہ رنگ خون کا تھا۔

شداد علو حضرت موسیٰؑ کے دور کے لگ بھگ ایک ملک کا حکمران تھا۔ مورخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ صحیح طور پر وہ کس دور کا بادشاہ تھا۔ جب بھی تھا، جہاں بھی تھا، اس میں اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس حقیقت پر سب مؤرخ متفق ہیں کہ شداد کے مزاجِ شاہی میں فرعونیت تھی، اس کا طرزِ حکومت فرعونوں جیسا تھا۔ رعایا کو وہ اُس کے بندے نہیں سمجھتا تھا جس نے انہیں پیدا کیا تھا بلکہ وہ انہیں اپنا غلام اور اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ ورنہ صفت بادشاہ تھا۔

مقہور و مجبور رعایا نے جب اس کے آگے سجدے کرنے شروع کر دیئے تو اس نے خدائی کا دعویٰ کر دیا اور بھوکی ننگی رعایا نے اسے خدا مان لیا۔ وہ معبود بن گیا۔

وہ خدا ہی کیا جس کے پاس جنت نہ ہو۔ شداد نے ایک جنت بنائی جو آج تک باغِ ارم کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں اس نے جنت کی تمام تر رنگینیاں اور رعنائیاں سمو ڈالیں۔ اس جنت میں اس نے حوروں کو بھی لا بسایا۔ یہ حسین اور نوجوان لڑکیاں تھیں۔ شراب کے مٹکے رکھوا دیئے اور ابلیسیت کے تمام تر دلنشیں،

دلفریب اور سحر انگیز اہتمام کیے۔

جنّت مکمل ہو چکی تو شدّاد اپنی جنّت دیکھنے کے لئے گیا مگر جنّت کے صدر دروازے میں قدم رکھا ہی تھا کہ تیورا کر گرا اور مر گیا۔

"خدا" کو اپنی جنّت میں قدم رکھنا بھی نصیب نہ ہُوا۔

روایت ہے کہ اللہ بزرگ و برتر نے فرشتۂ اجل سے پوچھا "کیا کبھی تجھے کسی جسم سے روح نکالتے وقت افسوس بھی ہُوا ہے؟

"ہاں اے پروردگارِ عالم!" ——— فرشتۂ اجل نے جواب دیا ——— "دو بار ... ایک بار ایک جہاز سمندر میں ڈوب گیا تھا۔ مسافروں میں سے صرف ایک ماں زندہ بچ نکلی تھی۔ جس کی گود میں دو تین ماہ عمر کا بچہ تھا۔ وہ بچے کو بھی زندہ نکال لائی تھی.... باری تعالیٰ! آپ نے حکم دیا کہ اس عورت کی روح نکال لاؤ۔ مجھے بہت دکھ ہُوا کہ ماں زندہ نہ رہی تو بچے کا کیا بنے گا لیکن خدائے بزرگ و برتر! موت و حیات آپ کے اختیار میں ہے۔ میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی"۔

"اور دوسری بار؟"

"اے پروردگارِ عالم!" ——— فرشتۂ اجل نے کہا ——— "شدّاد عاد ایک بادشاہ تھا۔ اُس نے بڑی محنت سے جنّت بنائی تھی۔ اس پر خزانے لُٹا دیئے تھے۔ اس کی تکمیل میں اُس کی عمر کا ایک حصہ گذر گیا تھا۔ اُس نے اپنی جنّت کی تعمیر اُس وقت شروع کی تھی جب جوان تھا۔ تکمیل اُس وقت ہوئی جب جوانی گذر گئی تھی۔ وہ اپنی جنّت کو دیکھنے گیا تو آپ نے حکم دیا کہ یہ شخص اپنی بنائی ہوئی جنّت میں داخل ہونے لگے تو اس کی روح نکال لاؤ....

"میں نے آپ کے حکم کی تعمیل کی' اپنا فرض ادا کیا لیکن میرا دل رنج و ملال میں مبتلا ہو گیا کہ یہ شخص اپنی بنائی ہوئی جنّت میں قدم بھی نہ رکھ سکا کہ اس کا بے روح جسم جنّت کے دروازے میں گر پڑا لیکن اے خالقِ کائنات! میں چون و چرا نہیں کر سکتا"۔

"جانتے ہو یہ شدّاد کون تھا؟" ——— باری تعالیٰ نے پوچھا اور خود ہی جواب دیا ——— "یہ وہی بچہ تھا جسے ماں سمندر میں سے زندہ نکال لائی تھی اور میں نے تجھے کہا تھا کہ اس کی ماں کی روح نکال لاؤ"۔

"یَاحَیُّ یَاقَیُّومُ یَامُمِیتُ!" ——— فرشتۂ اجل نے رکوع میں جا کر کہا ——— "بے شک آپ ہمیشہ زندہ رہنے والے' زندگی اور موت دینے والے ہیں"۔

پھر تاریخوں میں ایک اور جنّت کا ذکر ملتا ہے جو شدّاد کے باغِ ارم جیسی پرانی بات نہیں بلکہ کل کی بات لگتی ہے۔ پانچویں صدی ہجری (گیارھویں صدی عیسوی) کو تاریخ پرانی بات نہیں کہتی۔ تاریخ میں سال لمحوں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

یہ ابلیس کے حکم سے بنائی ہوئی دوسری ارضی جنّت تھی جس کا خالق حسن بن صباح تھا۔ اس نے خدائی کا دعویٰ تو نہیں کیا تھا لیکن بلا خوفِ تردید یہ دعویٰ کرتا تھا کہ خداوند تعالیٰ اس پر وحی نازل کرتا ہے اور براہِ راست احکام دیتا ہے۔

اس کے بنائے ہوئے فرقے کے پیروکار آج بھی موجود ہیں۔ حسن بن صباح نے ابلیس کی حکومت قائم کر دی تھی۔ اس نے جو فرقہ بنایا تھا وہ انتہائی خوفناک سازشوں' زعماء کے قتل اور بے حد شرمناک اور ہولناک گناہوں کی وجہ سے مشہور ہُوا۔ اس فرقے کی بنیاد ہی بدی پر رکھی گئی تھی۔

جتنی بھیانک وارداتیں حسن بن صباح نے کرائیں وہ سن کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ حسین اور نوجوان لڑکیوں کا جو استعمال حسن بن صباح نے کیا' وہ اس سے پہلے یا بعد کے ادوار میں کبھی نہیں ہُوا .... اور اولادِ آدم اور ابلیس کی جو پُراسرار' سنسنی خیز اور فکر انگیز کہانیاں اس دَور میں ملتی ہیں وہ کسی اور دَور میں نہیں ملتیں۔

بھنگ جسے حشیش کہتے ہیں' اس فرقے کی روحانی غذا تھی۔ اس فرقے کی کامیابی کا راز بھنگ میں تھا۔ حسن بن صباح کی جنّت میں دو ہی تو چیزیں تھیں جو انسان کو ابلیس کا چیلا نہیں بلکہ مکمل ابلیس بنا دیتی تھیں۔ یہ چیزیں تھیں حشیش اور حوریں۔ اس جنّت میں حیران کن حد تک خوبصورت اور نوخیز لڑکیاں رکھی جاتی تھیں۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ حُوریں ان سے زیادہ کیا خوبصورت ہوں گی۔

نشہ شراب کا ہو خواہ حشیش کا' چرس کا ہو خواہ ہیروئن کا' اللہ تبارک و تعالیٰ نے اسے اُم الخبائث کہا ہے۔ اس میں نسوانی حسن اور جنّت کا نشہ شامل ہو جائے تو انسان خود خباثت کا چلتا پھرتا مجسمہ بن جاتا ہے۔

اولادِ آدم جب راہِ حیات کے اس موڑ پر آئی جہاں حسن بن صباح نے جنّت بنائی تھی تو اسے ابلیس کے قہقہے سنائی دینے لگے۔ یہاں سے ایسے قصّوں اور کہانیوں نے جنم لیا جو آج بھی سنو تو دل پر ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ کبھی شک ہوتا ہے کہ یہ واقعات صداقت کے پیمانے پر پورے نہیں اُترتے لیکن یہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل تک سچے ہیں۔

اعمالِ صالح کہانی نہیں بنا کرتے۔ کہانیاں اعمالِ بد کی کوکھ سے جنم لیا کرتی ہیں۔

یہ کوئی کہانی نہیں ہوتی کہ ایک انسان نے ایک پیاسے کو پانی پلایا۔ کہانی اس سے بنتی ہے کہ ایک انسان نے ایک انسان کا خون پی لیا۔

پانی کا پیاسا کسی کہانی کا کردار نہیں بنا کرتا۔ کہانی اُس انسان سے بنتی ہے جو انسان کے خون کا پیاسا ہو۔

آج داستان گو آپ کے لئے اُس دور کی داستانیں لے کر آیا ہے جو سلجوقیوں کا دورِ حکومت تھا۔ خلافت بغداد کی چولیں ڈھیلی ہو گئی تھیں۔ اسلام کا پرچم یوں پھڑ پھڑا رہا تھا جیسے شمع بجھنے سے پہلے ٹمٹمایا کرتی ہے۔ طوائف الملوکی اسلام کے تار و پود بکھیر رہی تھی۔ اہلِ صلیب پرچم ستارہ و ہلال کو ہمیشہ کے لئے گرا دینے کو

طوفان کی طرح بڑھے آرہے تھے۔

اللہ نے اپنے دین کو ہر دور میں سنبھالا اور سہارا دینے کا سبب پیدا کیا ہے۔ اس پُر آشوب دور میں جب خلفاء ہوسِ اقتدار سے دیوانے ہو کر اپنے فرائض کو بھلا بیٹھے تھے اور مسلمانوں کی عسکری قوت خلفاء کی عدم توجہی اور شاہانہ طرزِ بود و باش کی وجہ سے کمزور ہوتی چلی جا رہی تھی، اللہ نے سلجوقیوں کو بھیجا۔ ان ترک جنگجوؤں نے آکر اسلام کے گرتے ہوئے پرچم کو تھاما، دین کی بنیادیں مستحکم کیں، طوائف الملوکی کا خاتمہ کیا، فوج میں عسکری روح بیدار کی اور اہلِ صلیب کے لشکروں کے آگے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کھڑی کر دی۔

اس دور میں فرقہ باطنیہ نے سر اٹھایا اور حسن بن صباح ابلیس کے روپ میں سامنے آیا اور جسدِ اسلام کا کینسر بن گیا۔

حسن بن صباح آیا کہاں سے تھا؟

○

تھوڑا سا ذکر سلجوقیوں کا بھی ہو جائے تاکہ داستان گو کی بات سمجھنے میں آسانی رہے۔ ان کا دورِ حکومت اسلام کے عروج اور عظمت و اقبال کا زمانہ تھا۔ سلجوق ایک غیر مسلم ترک جنگجو سلجوق بن لیکاک کی نسل سے تھے۔ سلجوق ترکستان کے خانِ اعظم کے ہاں ملازم تھا۔ یہ لوگ فطرتاً جنگجو تھے۔

اللہ نے اس غیر مسلم خاندان کو اسلام کی بقا، سلطنتِ اسلامیہ کی سلامتی اور توسیع اور دین کے فروغ کی سعادت عطا کرنی تھی۔ اس کا سبب یوں بنا کہ سلجوق بن لیکاک نے خانِ ترکستان کی ملازمت چھوڑ دی اور اپنے خاندان کے ساتھ بخارا چلا گیا۔ اس کا قبیلہ بھی اس کے ساتھ ہی ہجرت کر گیا کیونکہ اس میں کچھ ایسے اوصاف تھے کہ قبیلہ اسے اپنا پیر و مرشد مانتا تھا۔

سلجوق اپنے اوصاف اور صلاحیتوں کو کسی بہتر اور عظیم مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا تھا۔ وہ یقیناً کسی ایسے عقیدے اور ایسے مذہب کی تلاش میں تھا جو فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہو۔ بخارا میں وہ اسلام سے متعارف ہُوا تو اس نے بلا پس و پیش اسلام قبول کر لیا اور اپنے خاندان اور قبیلے کو اسلام کی بنیادی تعلیمات سے روشناس کرا کے کہا کہ وہ سب مسلمان ہو جائیں۔ وہ تو حکم کے منتظر تھے۔ پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔

یہ ایک معجزہ تھا۔ "کُنْ فَیَکُوْن" کا مظاہرہ تھا۔ آلِ سلجوق تو ترکستان میں وحشی، جنگلی اور تہذیب و تمدن سے بے بہرہ مشہور تھے۔ جنگجو ایسے کہ ان کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتا تھا لیکن اللہ نے انہی سے اپنے دین کا تحفظ کرانا تھا۔ سلجوق صرف مسلمان ہی نہ ہوئے بلکہ اسلام کو سربلند کرنے کی ذمہ داری بھی اپنے سر لے لی۔

یہ ایک اور داستان ہے کہ سلجوقیوں نے سلطنتِ اسلامیہ کی عنان کس طرح اپنے ہاتھ میں لی۔ مختصر یہ کہ غیر مہذب اور آوارہ گرد ترک تہذیب اور شائستگی کے پیکر بن گئے۔ تعلیم سے بے بہرہ سلجوقیوں نے عالموں

اور فاضلوں کو دربار میں اکٹھا کر کے ان کی پذیرائی کی۔ ان کی خانہ بدوش ذہنیت مدنیت کے رنگ میں رنگی گئی۔

یہ ہمارا عقیدہ ہے کہ دینِ اسلام کا اور توحید و رسالت کا محافظ و ناصر خود اللہ تبارک و تعالیٰ ہے۔ اس کی ذاتِ باری نے جس طرح عرب کے بوریا نشینوں، صحرا نوردوں، گناہوں اور جاہلیت میں ڈوبے ہوئے بندوں کو رسالت اور اپنے دین سے نوازا تھا، اسی طرح پسماندہ ترکوں کو اعزاز بخشا کہ انہیں عسکری قوت اور کردار کی عظمت عطا کی اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ایران، عراق، شام، الجزیرہ اور ایشیائے کوچک پر چھا گئے۔ ان کے سامنے جو بھی اسلام دشمن طاقت آئی اُسے کچل اور مسل کر ختم کر دیا۔

بنیادی تبدیلی تو یہ آئی کہ خلافتِ عباسیہ کے کردار کی کمزوریوں نے سلطنت میں جو طوائف الملوکی پیدا کر دی تھی اس کا قلع قمع ہو گیا۔ سلجوقیوں نے اس کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک بادشاہی قائم کر دی اور افغانستان سے بحیرۂ روم تک کا علاقہ ایک سلطنت بن گیا اور یہ سلطنتِ اسلامیہ تھی۔

بادشاہت کا نظام حکومت اسلام کے منافی ہے لیکن سلجوقیوں نے سلطنت کو ایک مرکز کے تحت لانے کے لئے بادشاہت کا نظام اپنایا تھا۔ اس کے نتیجے میں یہ فائدہ حاصل ہُوا کہ سلطنت میں جو انتشار اور عدم اتحاد پیدا ہو گیا تھا وہ یک جہتی اور قومی اتحاد میں بدل گیا۔

پھر ان سلجوقیوں نے یورپ کے اہلِ صلیب کی یلغار کو یوں قہر و غضب سے روکا کہ انہیں بار بار حملے کرنے کے قابل نہ چھوڑا۔

سلجوق بن لیکاک کی حکومت اس کے پوتوں طغرل بیگ سلجوقی اور چغرا بیگ سلجوقی تک پہنچی۔ بادشاہوں کے خاندانوں میں یہ روایت لازمی طور پر چلتی رہی ہے کہ سگے بھائی تخت نشینی پر ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے تھے۔ اگر کوئی بہن ہوتی تو وہ الگ سازشیں کرتی تھی۔ محلاتی سازشیں شاہی خاندانوں میں لازمی سمجھی جاتی تھیں لیکن سلاطینِ آلِ سلجوق آپس میں عناد رکھنے کو گناہ سمجھتے تھے۔

طغرل بیگ اور چغرا بیگ سگے بھائی تھے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ان کا آپس میں پیار تھا کہ تخت کا وارث بڑا بھائی تھا لیکن بڑے نے چھوٹے بھائی کو اقتدار میں اپنے ساتھ رکھا اور دو دارالسلطنت بنا دیئے۔ چغرا بیگ کے لئے ترکستان کا مَرو اور خراسان کا شہر نیشاپور جو طغرل بیگ کا دارالسلطنت تھا۔ اس طرح بھائیوں میں پیار اور اتحاد بھی قائم رہا اور سلطنت چونکہ وسیع تھی اس لئے دو دارالسلطنت بننے سے انتظام پہلے سے بہتر ہو گیا۔

آلِ سلجوق نے خلیفہ کو نہ چھیڑا اور اُسے کچھ علاقہ دے کر اُس کی حیثیت برقرار رکھی تھی۔ یہاں ایک واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہو گا۔ اُس وقت خلیفہ قائم بامر اللہ تھا۔ 450ھ کا ذکر ہے کہ بساسیری نام کے ایک غیر مسلم نے خلیفہ قائم کو کمزور اور تنہا سمجھ کر بغداد پر حملہ کر دیا اور خلیفہ کو قید میں ڈال دیا۔

طغرل بیگ کو اطلاع ملی تو اس نے بساسیری پر حملہ کر دیا اور اسے بہت بُری شکست دے کر اسے گرفتار کر

لیا۔ حکم دیا کہ اس کا سر کاٹ کر میرے حوالے کیا جائے۔ تھوڑی ہی دیر میں سر اس کے سامنے پڑا تھا۔ طغرل بیگ نے سر اٹھوا لیا اور خلیفہ کے گھر کی طرف چل پڑا۔ خلیفہ کو بساسیری کی قید سے رہا کرا لیا گیا تھا۔

طغرل بیگ نے بساسیری کا سر خلیفہ کے قدموں میں رکھ دیا۔

”طغرل!“ — خلیفہ قائم بامر اللہ نے کہا — ”کیا تم چار سال انتظار کر سکتے ہو؟“

”کیسا انتظار؟“ — طغرل بیگ نے پوچھا۔

”میں اس احسان کا تمہیں صلہ دینا چاہتا ہوں جو تم نے مجھ پر کیا ہے“ — خلیفہ قائم نے کہا۔

”پہلی بات یہ ہے محترم خلیفہ!“ — طغرل بیگ نے کہا — ”کہ میں نے آپ پر احسان نہیں کیا، فرض ادا کیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں چار سال انتظار کا مطلب نہیں سمجھ سکا“۔

”میری ایک ہی بیٹی ہے“ — خلیفہ نے کہا — ”ابھی کمسن ہے۔ بارہ تیرہ سال عمر ہے۔ چار سال بعد جوان ہو جائے گی تو اس کی شادی تمہارے ساتھ کراؤں گا۔ یہ ایسا انعام ہے یا تحفہ ہے جو میں کسی غیر عباسی کو نہیں دے سکتا۔ ہم اپنی لڑکیاں عباسیوں میں ہی بیاہتے ہیں۔ تم سلجوقی ہو لیکن تمہارے احسان کا صلہ اس سے کم نہیں دوں گا۔ میں نے اپنی بیٹی تمہیں دے دی۔ چار سال بعد شادی ہو جائے گی“۔

چار سال بعد خلیفہ نے اپنی بیٹی کی شادی طغرل بیگ سے کر دی۔

○

بادشاہوں کے ہاں یہ رواج رہا ہے کہ انہیں وزیروں کی ضرورت نہیں ہوتی تھی لیکن رسمی طور پر وہ ایک وزیر اعظم اور برائے نام دو تین وزیر رکھ لیتے تھے۔ حکم تو بادشاہ کا چلتا تھا۔ وزیر تائید اور خوشامد کرتے تھے۔ ان کے مشیر بھی حاشیہ بردار اور جی حضوری ہوتے تھے۔ بادشاہ ان سے رسماً کسی کام یا کسی مسئلے کا مشورہ لیتا تو وہ بادشاہ کی مرضی اور مزاج کے مطابق مشورہ دیا کرتے تھے لیکن سلجوقیوں کے ہاں یہ رواج نہیں تھا۔

سلاطینِ آلِ سلجوق علم و فضل کے قدر دان تھے۔ ان کی کامیابی کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ وہ بادشاہوں جیسے دربار نہیں لگاتے تھے اس لئے وہ خوشامدیوں اور درباریوں کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان کے فیصلے دوٹوک اور اٹل ہوتے تھے۔

چغرا بیگ اور طغرل بیگ کا دورِ حکومت تھا جنہوں نے دو دار السلطنت بنا لئے تھے۔ چغرا بیگ مَرو میں تھا۔ ایک روز ایک جواں سال آدمی اس کی ملاقات کے لئے آیا۔ اس شخص کا لباس بتا رہا تھا کہ وہ معمولی سا کوئی سوالی نہیں، وہ کوئی عالم یا کسی اونچے درجے کے خاندان کا فرد لگتا تھا۔

”سلطان کو کیا بتاؤں آپ کون ہیں؟“ — دربان نے پوچھا — ”اور غرض ملاقات کیا ہے؟“

”میرا نام خواجہ حسن طوسی ہے“ — ملاقاتی نے بتایا — ”نیشا پور سے آیا ہوں۔ نیشا پور کے امام موافق کا شاگرد ہوں۔ ان کے مدرسے سے فارغ التحصیل ہو کر آیا ہوں۔ فقیہ اور محدث ہوں۔ غرض ملاقات

سلطان کو بتاؤں گا“۔

دربان کے لئے حکم تھا کہ کوئی عالم ملاقات کے لئے آجائے تو اُسے روکا نہ جائے۔ چنانچہ دربان نے اندر جا کر سلطان چغرا بیگ کو اطلاع دی۔

”کیا وہ فقیہ اور محدث لگتا ہے؟“ — سلطان نے پوچھا۔

”ہاں سلطانِ محترم!“ — دربان نے جواب دیا — ”زبان شائستہ اور لباس عالمانہ ہے۔ چہرے سے مہذب لگتا ہے“۔

”تو اسے اتنی دیر باہر کھڑا رکھنا خلافِ تہذیب ہے“ — سلطان نے کہا — ”اسے فوراً اندر بھیج دو“۔

چند لمحوں بعد خواجہ حسن طوسی سلطان چغرا بیگ کے سامنے کھڑا تھا۔ سلطان نے اسے احترام سے بٹھایا۔

”اے نوجوان!“ — سلطان نے پوچھا — ”میں کیسے مان لوں کہ تُو امام مُوافق کا شاگرد ہے؟ ہم جانتے ہیں امام مُوافق کی شاگردی کتنا بڑا اعزاز ہے“۔

”میرے پاس سند ہے“ — خواجہ طوسی نے سند سلطان کے حوالے کرتے ہوئے کہا — ”میں نے فقہ اور حدیث کی اور دیگر دینی امور کی تعلیم پائی ہے“۔

”کیا تُو فارغ التحصیل ہو گیا ہے؟“ — سلطان نے پوچھا۔

”نہیں سلطانِ عالی مقام!“ — خواجہ طوسی نے جواب دیا — ”میں مدرسے سے فارغ ہوا ہوں تحصیلِ علم سے نہیں۔ علم ایک سمندر ہے۔ موتی اُسی کے ہاتھ آتا ہے جو اس سمندر میں غوطہ زن ہو کر تہہ سے سیپی اٹھالانے کا عزم رکھتا ہے“۔

سلطان چغرا بیگ کچھ متاثر ہوا۔

”ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ تُو کتنا کچھ دانشمند ہے“ — سلطان نے کہا — ”کتابیں علم دے سکتی ہیں عقل نہیں... تُو اپنے آپ کو کتنا دانشمند سمجھتا ہے؟“

”سلطانِ محترم!“ — خواجہ حسن طوسی نے کہا — ”انسان اتنا ہی احمق ہے جتنا وہ اپنے آپ کو دانشمند سمجھتا ہے، اور انسان اتنا ہی چھوٹا ہے جتنا وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔ یہ فیصلہ دوسرے کیا کرتے ہیں کہ فلاں احمق اور فلاں دانشمند ہے“۔

”ایک بات بتا طوسی!“ — سلطان نے پوچھا — ”حکمران میں کیا صفات اور کیسے اوصاف ہونے چاہئیں کہ وہ رعایا میں ہردلعزیز ہو اور مرنے کے بعد بھی لوگ اسے اچھے الفاظ سے یاد کریں؟“

”وہ اپنے دین اور سلطنت کے لئے آگ کا طوفان ہو“ — خواجہ حسن طوسی نے جواب دیا — ”رعایا کے لئے پانی ہو، زمین کی طرح فیاض اور آسمان کی طرح سخی ہو، عقاب کی مانند تیز نگاہ کوّے کی طرح محتاط اور

کوئل کی طرح خوش گلو ہو، شیر کی طرح بے خوف اور چاند ستاروں کی مانند راست رَو ہو، یوں نہیں کہ آج
اِدھر کل اُدھر بھٹکتا پھرے"۔

"کیا یہ صفات ہم میں ہیں؟" —— سلطان نے پوچھا۔

"اگر میں نے کہا ہاں ہیں تو یہ خوشامد ہوگی" —— خواجہ طوسی نے کہا —— "خوشامد منافقت ہے۔ میں
منافق نہیں بننا چاہتا۔ اگر میں نے کہا کہ سلطان میں کچھ صفات کی کمی ہے تو میں معتوب ہوں گا۔ مجھ میں
تبِ عتاب نہیں"۔

"اے نوجوان!" —— سلطان نے کہا —— "تیری صاف گوئی قابلِ داد ہے لیکن ایک بات بتا... اگر ان
صفات اور اوصاف میں سے ایک یا دو ہم میں نہ ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے؟"

"سلطانِ عالی مقام!" —— خواجہ حسن طُوسی نے کہا —— "تسبیح میں ایک سَو دانے اور گرہ صرف ایک
ہوتی ہے۔ اگر یہ ایک گرہ کھل جائے تو تمام دانے بکھر جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے آپ کی وہ صفت اور وہ وصف
کمزور ہو جو گرہ کی حیثیت رکھتا ہے تو گرہ کسی بھی وقت صفات و اوصاف کے دانے بکھیر دے گی"۔

"خواجہ حسن طُوسی!" —— سلطان چغرابیگ نے پُرجوش لہجے میں کہا —— "ہم نے تجھے مشیر مقرر کیا۔
اگر تُو نے راست گوئی اور صداقت پسندی کو قائم رکھا تو یہ ہماری پیشین گوئی ہے کہ ایک روز تُو اس سلطنت کا
وزیرِ اعظم ہوگا"۔

بیس بائیس سال بعد سلطان چغرابیگ کی پیش گوئی پوری ہو گئی۔ خواجہ حسن طوسی وزیرِ اعظم بن گیا۔
اُس کا وقت سلطان چغرابیگ کا پوتا سلطان ملک شاہ حکمران تھا۔ مَرو یعنی دوسرے دارالسلطنت میں سلطان
الپ ارسلان تھا۔ خواجہ طوسی سلطان الپ ارسلان کا وزیرِ اعظم تھا۔

خواجہ حسن طُوسی تاریخِ اسلام کی مشہور و معروف شخصیت ہے۔ اسے سلجوقی سلطانوں نے نظام الملک کا
خطاب دیا تھا۔ تاریخوں میں اسے خواجہ حسن طُوسی کم نظام الملک زیادہ لکھا گیا ہے اس لئے وہ اسی نام سے جانا
پہچانا جاتا ہے۔ وہ دینی امور کا اور فقہ و حدیث کا عالم تھا۔

نظام الملک نے بغداد میں مدرسہ نظامیہ بنایا تھا۔ سلطان صلاح الدین ایوبی اور اس کے ساتھی بہاؤالدین
شدّاد جو اُس وقت کا مشہور سکالر تھا اسی مدرسے میں اکٹھے پڑھے تھے۔

○

ایک روز نظام الملک طُوسی اپنے کام کاج میں مصروف تھا کہ اسے اطلاع ملی کی نیشاپور سے ایک شخص
اسے ملنے آیا ہے اور اپنا نام عمر خیام بتاتا ہے۔ نظام الملک نے ذہن پر زور دیا۔ یہ نام اسے کچھ مانوس لگا اور
ایک شک کی بنا پر کہا اسے اندر بھیج دو۔

عمر خیام اندر آیا۔ نظام الملک نے اسے دیکھا تو اچھل کر اٹھا۔ اس نے عمر خیام کو پہچان لیا تھا۔ دونوں اس

بھی میں نے اعتراض کر دیا کہ میں روٹی کمانے کے لئے اس کا ساتھ نہیں دیتا"۔

"تمہیں کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش تو تلاش کرنا ہی ہوگا" —— نظام الملک نے کہا —— "بغیر کام کے زندگی
کی تنگی نہیں ہوتی"۔

"میں تمہیں ایک عہد نامہ یاد دلانے آیا ہوں خواجہ!" —— عمر خیام نے کہا —— "عہد نامہ جو ہم نے
لڑکپن میں کیا تھا"۔

"عہد نامہ؟" —— نظام الملک نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا —— "بائیس تئیس سال گذر گئے ہیں عمر!
ذرا سا اشارہ دے دو"۔

نظام الملک اور عمر خیام کا ایک ہم جماعت اور بھی تھا۔ اُس نے تو تاریخ میں ایسا نام پایا ہے کہ اسے
تاقیامت بھلایا نہیں جا سکے گا۔ یہ تھا جنتِ ارضی کا خالق حسن بن صباح۔ ان کے ہم جماعت تو اور بھی تھے
لیکن نظام الملک، عمر خیام اور حسن بن صباح کی آپس میں دوستی اتنی گہری ہو گئی تھی کہ وہ ایک ہی کمرے میں
رہتے اور جدھر ایک نے جانا ہوتا اُدھر تینوں جاتے تھے۔

ایک روز حسن بن صباح نے ایک عہد نامہ پیش کیا اور تینوں دوستوں نے آپس میں یہ عہد کیا۔ یہ ان کا
ایک تاریخی عہد نامہ ہے جس کا ذکر تقریباً ہر مؤرخ نے کیا ہے۔ اتنی مدت بعد عمر خیام نظام الملک سے ملا تو
نظام الملک عہد نامہ بھول چکا تھا۔

"مدرسے کی ایک رات یاد کرو خواجہ!" —— عمر خیام نے نظام الملک کو عہد نامہ یاد دلانے کے لئے کہا ——
"ہم تینوں دوست اُس روز کا پڑھا ہوا سبق دہرا کر فارغ ہوئے تو حسن بن صباح نے کہا کہ اہل مدرسے کی یہ
روایت ہے کہ جو یہاں سے پڑھ کر نکلا اور جسے امام مَوافق نے ذہین اور لائق کہا وہ کسی نہ کسی اونچے رتبے پر
پہنچا۔ پھر حسن بن صباح نے کہا تھا کہ ضروری نہیں کہ ہم تینوں اونچے رتبوں پر پہنچیں گے۔ ہو سکتا ہے ہم
تینوں میں سے کوئی ایک کسی بلند رتبے تک جا پہنچے اور باقی دو بڑی مشکل سے دو وقت کی روٹی کما سکیں۔

"پھر حسن بن صباح نے کہا تھا کہ تو آپس میں عہد کریں کہ ہم میں سے جو بھی کسی اونچے منصب یا
رتبے پر پہنچا تو وہ دونوں دوستوں کی مالی معاونت کرے گا اور انہیں اپنی خوش بختی میں برابر کا شریک بنائے گا یا
ان کے ذریعہ معاش کا بندوبست کرے گا اور طوطا چشمی اور خود غرضی سے گریز کرے گا... ہم تینوں نے پوری
سنجیدگی اور سچے دل سے عہد و پیمان کئے تھے کہ ایسے ہی ہوگا"۔

"ہاں عمر!" —— نظام الملک نے مسکراتے ہوئے کہا —— "مجھے یاد آ گیا ہے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے میں
نے سب سے زیادہ پُرجوش طریقے سے عہد کیا تھا کہ مجھے اللہ نے کوئی بڑا رتبہ دے دیا اور میرے دونوں
دوستوں کو میری ضرورت محسوس ہوئی تو میں ان کی مالی اور ہر طرح کی معاونت کروں گا"۔

"تو پھر خواجہ!" —— عمر خیام نے کہا —— "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ لمبا عرصہ میرا کوئی ذریعہ معاش نہیں رہا۔

طرح بغلگیر ہو کر ملے جیسے لمبی مدت کے بچھڑے ہوئے دوست ملا کرتے ہیں۔

وہ تھے ہی پرانے اور بچھڑے ہوئے دوست۔ امام موفق کے مدرسے میں ہم جماعت تھے۔ اس مدرسے کے متعلق تاریخوں میں لکھا ہے کہ طلباء کم ہوا کرتے تھے اور جو بھی طالب علم امام موفق کی شاگردی سے فارغ ہوتا تھا وہ حکومت یا معاشرے میں اونچے درجے پر فائز ہو جاتا تھا۔ اس کی ایک مثال خواجہ حسن طوسی کی تھی جو سلطنتِ سلجوق کا وزیر اعظم بنا' نظام الملک کا خطاب پایا اور تاریخ میں آج تک اس کا نام زندہ ہے اور تابد زندہ رہے گا۔

پھر ایک اور مثال عمر خیام کی ہے۔ عمر خیام کی رباعیاں آج بھی مشہور ہیں۔ اردو میں بھی ان رباعیوں کا ترجمہ ہوا ہے اور انگریزی میں بھی۔ اس طرح عمر خیام اردو اور انگریزی ادب کا ایک مقبول شاعر بن گیا ہے۔

عمر خیام کوئی عام قسم کا شاعر نہ تھا' وہ فلسفی شاعر تھا۔ اس کی رباعیوں میں نسوانی حسن کی رعنائیاں تو بہت تھیں لیکن ان رباعیوں میں زندگی کا فلسفہ اور دانش ہوتی تھی۔ اس کی رباعیاں خیال کی گہرائیوں کی بدولت آج بھی زندہ ہیں۔

یہی نہیں' عمر خیام حکیم بھی تھا۔ اس نے حکمت کی پریکٹس ہی نہیں کی تھی بلکہ بعض لاعلاج امراض کی دوائیاں بھی ایجاد کی تھیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ عمر خیام نے آبِ حیات بھی تیار کر لیا تھا جو ہر مرض کی دوا اور لامحدود عمر کا ضامن تھا لیکن یہ محض روایت ہے۔ کسی بھی مورخ نے آبِ حیات کا ذکر نہیں کیا۔

یہ تھا عمر خیام جو اپنے پرانے ہم جماعت خواجہ حسن طوسی' نظام الملک سے ملنے آیا تھا۔ یہاں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ عمر خیام کسی امیر باپ کا بیٹا نہیں تھا۔ اس کا باپ جس کا نام عثمان تھا' موٹے کھدر کا کپڑا بنتا تھا۔ یہ اس کا خاندانی پیشہ تھا۔ اس کے بعد اس نے خیموں کی سلائی کا کام شروع کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ خیام کہلانے لگا۔۔۔ عثمان خیام۔۔۔ اس کے بیٹے عمر نے جب دیکھا کہ وہ شعر موزوں کر سکتا ہے تو اس نے باپ کے پیشے کی مناسبت سے اپنا تخلص خیام رکھ لیا۔ یہ تخلص اس کے نام کا حصہ بن گیا اور عمر خیام کے نام سے مشہور ہوا۔

○

"کہو عمر!" ۔۔۔ نظام الملک نے پُرمسرت لہجے میں کہا ۔۔۔ "اتنا عرصہ کہاں رہے؟ آج تم نے لڑکپن یاد دلا دیا ہے"۔

"پہلی بات یہ ہے خواجہ!" ۔۔۔ عمر خیام نے کہا ۔۔۔ "میں اب عمر نہیں عمر خیام ہوں۔ شعر و شاعری میں مقام پیدا کر لیا ہے۔ حکمت میں قسمت آزمائی کر رہا ہوں۔ علم و ادب کی کتابیں بھی پڑھ رہا ہوں اور حکمت کی بھی' لیکن ذریعۂ معاش کوئی نہیں۔ باپ خیمہ سازی کرتا ہے۔ میں نے اس پیشے کو اپنانے کی کوشش کی تھی لیکن میرے ذہنی رجحان نے اسے قبول نہیں کیا۔ میری صلاحیتیں مجھے کسی اور طرف لے جا رہی تھیں۔ باپ کو

بیٹا"۔

"میں اس کا کچھ بندوبست کر دوں گا" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "تم صاحبِ علم و فضل ہو۔ فلسفہ' شاعری اور حکمت میں دسترس رکھتے ہو۔ میں سلطان سے کہوں گا کہ تم سلطنت کے لئے معتمد اور سودمند ثابت ہو سکتے ہو' اور میں سلطان سے یوں کہوں گا کہ تمہیں میرے ساتھ ملازمت دے دی جائے اور تمہیں میرا معاون بنا دیا جائے۔ یہ سلاطین مجھے اچھا جانتے ہیں اور مجھ سے بہت ہی متاثر ہیں"۔

"میں تمہارے کردار کی عظمت کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں" ۔۔۔ عمر خیام نے کہا ۔۔۔ "لیکن خواجہ! تم تو مجھے اعلیٰ منصب پر اپنے ساتھ بٹھانا چاہتے ہو لیکن میں اس منصب کے قابل نہیں۔ میں ساری عمر تمہارا مشکور و ممنون رہوں گا"۔

"نہیں عمر!" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "میرا خیال ہے کہ ذریعۂ معاش کے بغیر تم نے جو اتنا عرصہ گزارا ہے' اس کے زیرِ اثر تمہیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہا۔ میں تمہارا اعتماد بحال کرنا چاہتا ہوں اور مجھے پوری امید ہے کہ سلطانِ محترم میرے کہنے پر تمہیں اچھے منصب پر قبول کر لیں گے"۔

"نہیں خواجہ! یہ بات نہیں" ۔۔۔ عمر خیام نے کہا ۔۔۔ "میں کام کرنے سے نہیں گھبراتا اور بے روزگاری نے مجھ پر کوئی نقصان دہ اثر نہیں چھوڑا۔ میری صلاحیتیں جس طرف چل نکلی ہیں میں چاہتا ہوں کہ میں اسی راستے کی منزل تک پہنچ جاؤں۔ میں اپنی تحریریں' اشعار اور حکمت کے وہ نسخے جو میں نے دریافت کئے ہیں' اپنے ساتھ لایا ہوں۔ میں علم و ادب اور حکمت میں مزید تحقیقات کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ ایک نظر انہیں دیکھ لو۔ میرے پاس کوئی پیسہ نہیں جس سے میں اپنے اس تحقیقی مسلک کو آگے بڑھاؤں۔ اگر میں نے ملازمت قبول کر لی تو اس سے صرف یہ حاصل ہو گا کہ میں اور میرے اہل و عیال باعزت روٹی کھا لیں گے اور مجھے عزت حاصل ہو جائے گی۔

"میری اس بات پر غور کرو خواجہ!۔۔۔ میں صرف اپنے اور اپنے گھر والوں کے لئے روٹی نہیں چاہتا' میں بنی نوعِ انسان کے لئے کچھ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ میں نے نایاب اور انتہائی کارآمد جڑی بوٹیاں تلاش کرنی ہیں اور کچھ قیمتی سامان بھی درکار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میرے پاس اتنی رقم ہونی چاہئے جس سے میں گھر والوں کو دو وقت کی روٹی مہیا کر سکوں"۔

نظام الملک نے اس کے کاغذات کا پلندہ دیکھا۔ تب اسے اندازہ ہوا کہ یہ شخص علم و ادب کے لئے اور حکمت کے لئے کتنا بڑا کام کر رہا ہے اور اگر اسے مالی معاونت مل جائے تو بنی نوعِ انسان کے لئے اس کی یہ کاوشیں بہت ہی سودمند ثابت ہوں گی۔ چنانچہ اس نے عمر خیام کو اپنے ہاں مہمان رکھا اور اس کا یہ تحقیقی کام سلطان الپ ارسلان کو دکھایا اور اسے اس تحقیق کی افادیت اور اہمیت بتائی۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ سلاطین سلجوق علم و فضل اور عمر خیام جیسے تحقیقی کام کرنے والوں کی بہت قدر

کرتے تھے۔ سلطان نے عمر خیام کے لئے بارہ سو مثقال سونا سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا۔ آج کی کرنسی کے حساب سے بارہ سو مثقال پینتیس ہزار روپے کے برابر تھے۔ عمر خیام پہلا وظیفہ وصول کر کے نیشاپور چلا گیا۔

عمر خیام کو اتنی زیادہ مالی سہولت حاصل ہو گئی تو وہ علم و حکمت کے تحقیقی کاموں میں مصروف ہو گیا۔ اس نے اپنی پہلی جو کتاب لکھی وہ عقیدت مندی اور شکریئے کے طور پر خواجہ نظام الملک کے نام سے منسوب کی۔ پھر اس نے اپنی تحقیق اور تجربات کی ایک اور کتاب مرتب کی جس کا نام "علم المساحت و المکعبات" تھا اور پھر اس نے اقلیدس کے اصول و مسائل پر ایک کتاب لکھی۔ عمر خیام علم قیافہ میں بھی دسترس رکھتا تھا۔ ان کتابوں کی بدولت عمر خیام ایران میں اس قدر مشہور و مقبول ہو گیا کہ اسے بو علی سینا کا ہم پلہ سمجھا جانے لگا۔

عمر خیام کا مستقل قیام نیشاپور میں تھا۔ نیشاپور خراسان کا دارالسلطنت تھا اور وہاں کا سلطان ملک شاہ تھا۔ سلطان ملک شاہ ارباب علم اور اہل نظر کا اتنا قدردان تھا کہ اس نے عمر خیام کی شہرت سنی تو اسے نیشاپور بلایا اور اسے اصلاحِ تقویم کی ذمہ داری سونپ دی۔ عمر خیام علم الاعداد میں بھی دسترس رکھتا تھا۔ اس علم میں اس نے خاصی اصلاح و ترمیم کی۔

○

یہ تھا عمر خیام جسے خواجہ حسن طوسی نظام الملک نے بام عروج پر پہنچایا۔ ان کا ایک تیسرا دوست بھی تھا، حسن بن صباح۔۔۔ ہم ذرا پیچھے چلتے ہیں جہاں عمر خیام نظام الملک کے پاس گیا تھا۔ عمر خیام نے نظام الملک کو مدرسے کے دور کا عہد نامہ یاد دلایا تو حسن بن صباح کا ذکر آیا۔

"کیا جانتے ہو عمر! وہ کہاں ہے؟" ۔۔۔ نظام الملک نے پوچھا۔

"میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ وہ رے چلا گیا تھا" ۔۔۔ عمر خیام نے جواب دیا ۔۔۔ "وہ وہیں کا رہنے والا تھا۔ تمہیں یاد ہو گا، وہ خاصا ہوشیار اور چالاک ہوا کرتا تھا۔ تمہیں شاید یاد نہ ہو، اس نے مدرسے کے ایک لڑکے کے کچھ پیسے چرا لئے تھے۔ ہم دونوں نے اس کی وکالت کی تھی کہ حسن چور نہیں ہو سکتا لیکن اس نے یہ چوری کی تھی، پھر بھی ہم نے اسے دوست بنائے رکھا تھا"۔

"ہاں عمر!" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "مجھے یاد آ گیا ہے۔ اس میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو ہمیں اتنی اچھی لگتی تھی کہ میں اس کے بغیر اپنے آپ کو ادھورا سمجھتا تھا"۔

"یہ اس کی زبان کا کمال تھا" ۔۔۔ عمر خیام نے کہا ۔۔۔ "بولتے تو ہم بھی ہیں لیکن وہ جب بولتا تھا تو کچھ اور ہی تاثر پیدا ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہ خوبرو تھا۔ اس کی آنکھوں میں کوئی ایسی تاثیر تھی کہ وہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا تھا تو سننے والا بلا پس و پیش اس کی بات مان لیتا تھا"۔

دونوں دوست حسن بن صباح کی باتیں کرتے رہے۔ دو تین دنوں بعد عمر خیام چلا گیا۔

چار پانچ دن گذرے ہوں گے کہ نظام الملک کو اطلاع ملی کہ رے سے ایک آدمی اسے ملنے آیا ہے۔ اپنا نام حسن بن صباح بتاتا ہے۔

"حسن بن صباح!" ۔۔۔ نظام الملک نے بڑے اشتیاق سے کہا اور اٹھتے ہوئے بولا ۔۔۔ "اسے فوراً اندر بھیجو"۔

حسن بن صباح اندر آیا تو نظام الملک کو اپنے استقبال کے لئے دروازے میں کھڑا پایا۔ دونوں ہم جماعت اور دوست تادیر بغلگیر رہے۔

"میں نے سنا کہ میرا دوست وزیر اعظم ہو گیا ہے تو میں خوشی سے پھٹنے لگا" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "میں اٹھ دوڑا کہ اپنے لڑکپن کے جگری یار کو وزارتِ عظمیٰ کی مسند پر بیٹھا دیکھوں"۔

"وہ تو تم نے دیکھ لیا ہے" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "یہ بتاؤ یہ بائیس تئیس سال کہاں رہے اور ذریعۂ معاش کیا ہے؟"۔

"خاک ہے میرا ذریعۂ معاش!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "ہمت قسمت آزمائی کی مصر تک گیا لیکن قسمت نے کہیں بھی ساتھ نہ دیا۔ کچھ دنوں کے لئے روزگار ملا پھر وہی بے روزگاری ۔۔۔ ایک جگہ گیا تو مجھے بہت اچھا جواب ملا۔ مجھے کہا گیا کہ تم نے تعلیم ایسی اور اتنی زیادہ پائی ہے کہ تم کوئی چھوٹی نوکری نہیں کر سکتے اور اسی وجہ سے تمہارا دماغ تجارت کو بھی قبول نہیں کرتا"۔

"ہاں حسن!" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "اس شخص نے دانشمندی کی بات کی ہے۔ امام موافق کا شاگرد کوئی عام سی نوکری نہیں کر سکتا اور وہ دکانداری بھی نہیں کر سکتا ۔۔۔ ہمارا دوست عمر آیا تھا۔ وہ اب عمر خیام ہے۔ اس نے فلسفہ، علم و ادب اور حکمت میں بہت کام کیا ہے لیکن ذریعۂ معاش کوئی نہیں"۔

"ہاں ۔۔۔ عمر!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "ہمارا پیارا دوست۔ اس نے فلسفی اور شاعر ہی بننا تھا"۔

"اس نے مجھے عہد نامہ یاد دلایا تھا" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "میں تو اس عہد نامے کو بھول گیا تھا جو ہم تینوں دوستوں نے ایک رات مدرسے میں کیا تھا"۔

"پھر تم نے اس کے لئے کچھ کیا ہے؟"

"ہاں حسن!" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "میں نے اس کے لئے سالانہ وظیفہ منظور کرا لیا ہے"۔

"میں بھی تمہیں وہی عہد نامہ یاد دلانے آیا ہوں" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "لیکن مجھے وظیفہ نہیں چاہئے۔ مجھے اپنی تعلیم اور خاندانی حیثیت کے مطابق ملازمت چاہئے"۔

"میں دوستی کا حق ادا کروں گا حسن!" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "اور میں لڑکپن کے عہد نامے کا پورا پاس کروں گا۔ تم سلطان سے ملنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔ میں اس کے ساتھ پہلے ہی بات کر لوں گا"۔

معروف تاریخ نویس ابنِ اثیر نے چند ایک مورخوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ عہدِ طفلی کا ایک

معاہدہ تھا جس کی حیثیت ایک مذاق سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں تھی نہ ہی یہ معاہدہ قرآن پر ہاتھ رکھ کر حلفیہ کیا گیا تھا لیکن نظام الملک صاحبِ کردار اور دیندار آدمی تھا۔ سلطان ملک شاہ نے اس میں یہی اوصاف دیکھ کر اسے اعلیٰ منصب پر فائز کیا تھا اور انہی اوصاف کی بدولت وہ سلطنت کا وزیرِاعظم بن گیا تھا۔ اس نے لڑکپن کے معاہدے کا اتنا پاس کیا کہ سلطان کے آگے حسن بن صباح کے کردار، تعلیم اور دانشمندی ایسے انداز سے بیان کی کہ سلطان متاثر ہو گیا۔

اس نے حسن بن صباح سے کہا وہ اسے سلطان سے ملوائے گا اور وہ اپنی تعلیم اور دانشمندی کا پُراثر مظاہرہ کرے۔

حسن بن صباح فنِ گفتگو کا تو استاد تھا۔ نظام الملک نے اسے سلطان کے سامنے پیش کیا تو اس نے زبان کا جادو چلا کر سلطان کو متاثر کر لیا۔ اس کا راستہ تو نظام الملک نے پہلے ہی صاف کر دیا تھا۔

"یہ فیصلہ وزیرِاعظم کو کرنا چاہئے کہ اس دانشمند شخصیت کو کس منصب پر فائز کیا جائے" ——— سلطان نے کہا۔

"میں حسن بن صباح کو سلطانِ عالی مقام کے معتمدِ خاص کے رتبے سے کم درجے کا کوئی نہیں سمجھتا" ——— نظام الملک نے کہا ——— "سلطانِ عالی مقام کو ایک معتمدِ خاص کی ضرورت بھی ہے"۔

"ہمیں منظور ہے" ——— سلطان نے کہا ——— "آپ انہیں رکھ لیں اور انہیں اچھی طرح بتا دیں کہ ان کا کام کیا ہو گا۔ انہیں تمام تر امورِ سلطنت سمجھا دیں۔ کچھ دن اپنی نگرانی میں رکھیں"۔

اس طرح حسن بن صباح کو وہ رتبہ مل گیا جو اختیارات کے لحاظ سے وزارت سے کم نہ تھا۔ وہ اُسی دن اپنا سامان اور بیوی بچوں کو لانے کے لئے رے روانہ ہو گیا۔

نظام الملک محسوس نہ کر سکا کہ اُس نے ابلیس کے لئے جنت کا دروازہ کھول دیا ہے۔

○

حسن بن صباح کون تھا؟

اُس کا باپ خراسان کے شہر طُوس کا رہنے والا تھا۔ اس کا نام علی بن احمد تھا اور وہ اسماعیلی مذہب کا پیروکار تھا۔ حسن بن صباح طوس میں پیدا ہُوا تھا۔ اس کا باپ شہر رے میں جا کر رہائش پذیر ہو گیا تھا۔ رے کا حاکم ابو مسلم رازی تھا۔ علی بن احمد نے ابو مسلم رازی تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ اس کا کام تھا ابو مسلم رازی کی خوشامد کرنا اور لوگوں کے خلاف مخبری کرنا۔ وہ چاہتا تو کسی شریف آدمی کو ناکردہ گناہ میں گرفتار کرا دیتا اور کسی مجرم کو جھوٹ کے ذریعے بیگناہ ثابت کرا دیتا۔

رے تجارت کا مرکز تھا جہاں غیر ملکی تاجر آئے رہتے تھے۔ علی بن احمد منڈی میں چلا جاتا اور کسی نہ کسی غیر ملکی تاجر کو جھانسہ دے کر اس کا مال اُڑا لیتا یا کچھ رقم بٹور لیتا تھا۔ یہ کام وہ ایسی مہارت سے اور ایسے معزز

انداز سے کرتا تھا کہ نقصان اٹھانے والے اس پر ہاتھ ڈالنے سے جھجکتے تھے۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ رے کے حاکم ابو مسلم رازی کا خاص آدمی اور اس کا منظورِ نظر ہے۔

علی بن احمد کی عیاری کے قصے اتنے کم نہیں کہ داستان کو سارے سنا دے۔ وہ بردہ فروشی تک کرتا تھا لیکن یوں نہیں کہ ایک لڑکی کو اغوا کیا اور اسے بیچ ڈالا۔ وہ کسی حسین اور نوجوان لڑکی کو یا کسی جوان سال بیوہ کو نہایت باعزت طریقے سے ورغلاتا اور ایسے سبز باغ دکھاتا کہ لڑکی پر سحر طاری ہو جاتا تھا۔ نوخیز لڑکی ہوتی یا جوان سال عورت، نتائج سے بے خبر اس کے جال میں آجاتی تھی۔ وہ چار دن اسے اپنے پاس رکھ کر عیش و عشرت کرتا تھا۔ اس فریب کاری میں لڑکی کو اسے جتائے بغیر کوئی نشہ بھی پلاتا تھا۔ اس دوران وہ گاہک کی تلاش میں رہتا اور ایک دن اسے کسی مالدار گاہک کے حوالے کر دیتا تھا۔

کسی گھر میں لڑائی جھگڑا ہوتا یا بازار میں دو دکانداروں کے درمیان جھگڑا ہو جاتا یا تاجروں کا آپس میں کوئی تنازعہ ہوتا تو وہ ثالث یا منصف بن کر اپنے آپ کو ان پر مسلط کر کے تصفیہ کراتا تھا۔

لوگ جانتے تھے کہ یہ شخص عیار اور فریب کار ہے پھر بھی اس کی عزت کرتے اور اس سے مشورے اور مدد لیتے تھے۔ لوگوں میں مقبولِ عام بننے کے لئے وہ ان کے چھوٹے موٹے مسئلے حل کر دیا کرتا تھا۔ اس میں ڈھیٹ پن اتنا زیادہ تھا کہ کہیں سے دھتکار دیا جاتا تو وہاں سے ایک دروازے سے نکل کر دوسرے دروازے سے پھر اندر چلا جاتا اور عیاری کا کوئی اور حربہ استعمال کر کے دھتکارنے والوں کو شیشے میں اتار لیتا تھا۔

لوگوں میں یہ جو مشہور تھا کہ وہ حاکم ابو مسلم رازی کا منظورِ نظر ہے، غلط نہ تھا۔ ابو مسلم جابر اور دانشمند حاکم تھا لیکن علی بن احمد کمال استادی سے اسے دوستانہ سطح پر لے آیا کرتا تھا۔ ابو مسلم رازی اہلِ سنت و جماعت تھا۔ علی بن احمد بلاشک و شبہ اسماعیلی تھا لیکن ابو مسلم کو اس نے یقین دلا رکھا تھا کہ وہ اہلِ سنت ہے۔ ایک بار ابو مسلم کو مصدقہ اطلاع ملی کہ علی بن احمد سُنی نہیں اسماعیلی ہے۔ ابو مسلم نے اس سے جواب طلبی کی۔ اس نے قرآن ہاتھوں پر اٹھا کر قسم کھائی اور کہا کہ وہ سُنی مسلمان ہے۔

اس کا بیٹا حسن بن صباح کئی سالوں سے ایک اسماعیلی عالم اور اتالیق عبدالملک بن عطاش کے ہاں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس کا علم ابو مسلم کو ہو گیا۔ اس نے ایک روز علی بن احمد کو بلایا۔

"کس کا بچہ کہاں پڑھتا ہے، مجھے کیا!" ——— ابو مسلم نے علی سے کہا ——— "اپنی اولاد کے متعلق ماں باپ کے فیصلوں کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں لیکن تمہارے بیٹے کے متعلق میں اس لئے بات کر رہا ہوں کہ تم اہلِ سُنت و جماعت ہو لیکن اپنے بیٹے کو تم نے اسماعیلی عالم کی شاگردی میں بٹھا رکھا ہے..... کیوں؟..... کیا یہ تمہارے اسماعیلی ہونے کا ثبوت نہیں؟"

"نہیں ابو مسلم!" ——— علی بن احمد نے کہا ——— "یہ میری ایک مجبوری کا ثبوت ہے۔ میں اپنے بیٹے کو نیشا پور امام موافق کی شاگردی میں بھیجنا چاہتا ہوں لیکن میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ اپنی اس خواہش کی

تکمیل کر سکوں"۔

"پیسے میں دلواتا ہوں" — ابو مسلم رازی نے کہا — "میں سرکاری خزانے سے پیسے دلواؤں گا"۔

علی بن احمد نے ایسے انداز سے خوشی کا اظہار کیا جیسے اس کا ایک لاینحل مسئلہ حل ہو گیا ہو۔ اس نے سرکاری خزانے سے رقم وصول کی اور حسن بن صباح کو نیشاپور امام موافق کے مکتب میں بھیج دیا۔ امام موافق کٹر اہلِ سنت تھا۔ تاریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابو مسلم رازی علی بن احمد کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا لیکن اسے دھتکار بھی نہیں سکتا تھا۔

○

حسن بن صباح اپنے باپ کی عیارانہ سرگرمیوں سے بڑی اچھی طرح واقف تھا۔ اس نے باپ سے متاثر ہو کر عیاری کو ہی اپنا اصول بنا لیا تھا۔ اس نے باپ کے خاص کمرے میں بڑی حسین اور نوخیز لڑکیاں بھی دیکھی تھیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا باپ کبھی کبھار ایسی ایک لڑکی یا ایک جوان عورت لاتا ہے اور اسے ایک نشہ پلاتا ہے۔ حسن بن صباح نے یہ نشہ دیکھ لیا اور اس کی تھوڑی مقدار شربت میں ملا کر پی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد اسے یوں نظر آنے لگا تھا جیسے یہ دنیا بہت ہی حسین ہو گئی ہو۔ مورخ لکھتے ہیں کہ اسے بوڑھی عورتیں بھی جوان نظر آنے لگی تھیں۔

اس نے چرب زبانی باپ سے سیکھی تھی۔ لڑکپن میں ہی وہ زبان کے جادو کا ماہر ہو گیا تھا۔ اپنے باپ کو وہ اپنا بہترین استاد سمجھتا تھا۔ اس کے باپ کو معلوم ہو گیا تھا کہ اس کے بیٹے میں اسی کے ذہنی رجحانات پیدا ہو گئے ہیں۔ اس نے بیٹے کو کبھی روکا ٹوکا نہیں تھا بلکہ نیشاپور امام موافق کے مکتب میں بھیجتے وقت اس نے بیٹے کو کچھ ہدایات دی تھیں۔

"یہ نہ بھولنا بیٹے!" — اس نے حسن بن صباح سے کہا تھا — "ہم اسماعیلی ہیں اہلِ سنت نہیں۔ تم نے اہلِ سنت کا درس لینا ہے اور رہنا اسماعیلی ہے۔ اس مدرسے سے جو طلباء اچھے درجے میں کامیاب ہو کر نکلتے ہیں وہ اونچے رتبوں پر فائز ہو جاتے ہیں۔ تم ایسے ایک دو لائق لڑکوں کے ساتھ دوستی کر لینا۔ آگے چل کر یہ تمہارے کام آئیں گے"۔

باپ کو شاید اندازہ نہیں تھا کہ اس کا بیٹا اسی عمر میں اس سے کہیں زیادہ چالاک ہو گیا ہے جتنا وہ سمجھتا ہے۔ بیٹے نے مدرسے میں خواجہ حسن طوسی اور عمر خیام کو دوستی کے لئے منتخب کر لیا۔ اس کی دور بین نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ یہ دونوں پڑھنے میں بہت تیز ہیں اور یہ بڑے ہو کر اونچے رتبے پر پہنچیں گے۔

"تاریخ جلیس" میں واضح طور پر لکھا ہے کہ تینوں دوستوں میں یہ جو معاہدہ ہوا تھا کہ جو دوست کسی اعلیٰ منصب پر فائز ہو گیا وہ دونوں دوستوں کی مدد کرے گا اور اپنے مال و دولت میں بھی انہیں شریک کرے گا، یہ معاہدہ حسن بن صباح کے عیار دماغ کی اختراع تھا۔

اس معاہدے سے عمر خیام نے بھی فائدہ اٹھایا لیکن وہ جائز فائدہ تھا۔ عمر خیام کے شاہکار آج تک زندہ ہیں، لیکن حسن بن صباح نے نظام الملک سے اس معاہدے کا جو فائدہ اٹھایا' وہ ایک ابلیس کا کارنامہ تھا۔ یہ حسن بن صباح کا پہلا قدم تھا۔ وہ جب نظام الملک کے پاس یہ سن کر گیا تھا کہ وہ وزیرِ اعظم ہو گیا ہے تو اس نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ اتنا عرصہ بے روزگار رہا ہے۔ وہ کچھ خفیہ سرگرمیوں میں مصروف رہا تھا۔ وہ اپنا ایک فرقہ بنانے کے لئے زمین ہموار کر رہا تھا۔

اس مقصد کے لئے وہ مصر تک چلا گیا تھا۔ مصر میں عبیدیوں کی حکومت تھی جو ظاہری طور پر اسماعیلی کہلاتے تھے لیکن وہ در پردہ باطنی تھے۔ وہاں بات چیت کر کے واپس رے آ گیا۔ کچھ دنوں بعد عبیدیوں کا ایک وفد اس کے پاس رے گیا۔ وفد چلا گیا تو ابو مسلم رازی کو اطلاع ملی اور اسے حسن بن صباح کے عزائم معلوم ہوئے۔ ابو مسلم نے حسن بن صباح کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ حسن بن صباح کو قبل از وقت پتہ چل گیا اور وہ بھاگ گیا۔

وہ اس وقت زمین دوز روپوشی سے ابھرا جب وہ نظام الملک کی مروت اور کوششوں سے سلطان ملک شاہ کے معتمدِ خاص کا منصب حاصل کر چکا تھا اور رے اپنا سامان اور اپنے بیوی بچے لینے آیا تھا۔ ابو مسلم خاموش ہو گیا۔

اس وقت اس کا باپ بسترِ مرگ پر پڑا تھا۔ حسن بن صباح نے آ کر اسے خوشخبری سنائی کہ اسے یہ رتبہ مل گیا ہے۔

"اب میں سکون سے مر سکوں گا" — باپ نے کہا — "میں تمہیں اسی منصب پر دیکھنا چاہتا تھا... جانتے ہو اب تم نے کیا کرنا ہے؟"

"جانتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "سب سے پہلے نظام الملک کو اس کرسی سے اٹھانا' نکلوانا اور خود وزیرِ اعظم بننا ہے"۔

"شاباش!" — باپ نے کہا — "تم دروازے میں داخل ہو گئے ہو۔ اہم کمروں پر قبضہ کرنا تمہارا کام ہے... یاد رکھو بیٹے! بدی میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے زیادہ طاقت عورت اور نشے میں ہے۔ ان دو چیزوں کے ذریعے تم دنیا کے سب سے زیادہ طاقتور بادشاہ کو اپنے قدموں میں بٹھا سکتے ہو"۔

باپ کو ہچکی آئی اور اس کے ناپاک جسم سے روح نکل گئی لیکن وہ اپنی ابلیسیت اپنے بیٹے میں منتقل کر گیا۔

یہاں سے عورت اور نشے کی، عیاری اور بدی کی ایسی داستانوں نے جنم لیا جن سے زمین و آسمان کانپ اٹھے۔ آج بھی سنو تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

○

داستان کو اس داستان کو وہاں تک لے گیا ہے جہاں حسن بن صباح خواجہ طوسی نظام الملک کی سفارش سے سلجوقی سلطان ملک شاہ کا معتمد خاص بن جاتا ہے۔ حسن اور خواجہ طوسی امام موافق کے مدرسے سے فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو ان کی ملاقات بیس اکیس سال بعد سلطان ملک شاہ کے محل میں ہوئی تھی۔ اگر اس بیس اکیس سال کے عرصے کی روئیداد نہ سنائی جائے تو تاریخ کی یہ ہولناک اور شرمناک داستان ادھوری رہ جائے گی۔ یہی وہ عرصہ ہے جس میں حسن بن صباح حسن بن ابلیس بنا تھا۔ اسی عرصے میں اس نے علمِ نجوم اور علمِ سحر میں دسترس حاصل کی تھی۔

کیا یہ اچھا نہ ہو گا کہ داستان کو آپ کو بیس اکیس سال پیچھے لے جائے جب حسن کے باپ علی بن احمد نے اسے امام موافق کے مدرسے میں داخل کرانے سے بہت پہلے ایک اسماعیلی عالم عبدالملک بن عطاش کی شاگردی میں بٹھایا تھا؟

کوئی انسان اپنے آپ ہی گناہگار نہیں بن سکتا اور کوئی انسان اپنے آپ ہی زاہد اور متقی نہیں بن سکتا۔ کچھ حالات اور چند انسان مل کر ایک انسان کو بگاڑتے یا بناتے ہیں۔

حسن بن صباح کا کردار اسی روز ایک خاص سانچے میں ڈھلنا شروع ہو گیا تھا جس روز باپ اسے عبدالملک بن عطاش کے پاس لے گیا تھا۔ عبدالملک حسن کے باپ کو اچھی طرح جانتا تھا جس طرح ایک جسم کے دو ہاتھ ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے ہیں۔ عبدالملک علی ابن احمد کی عیاریوں سے بھی واقف تھا اور وہ علمِ جوتش و نجوم کی بھی شُد بُدھ رکھتا تھا۔

"لے ابنِ عطاش!" — حسن کے باپ نے اسے عبدالملک بن عطاش کے سامنے بٹھا کر کہا — "یہ میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے مرنے کے بعد یہ گمنام ہو جائے یہ اس سے زیادہ شہرت حاصل کرے جو میں نے حاصل کی تھی"۔

"ایک پہلو اپنی زندگی کا یہ بھی سامنے رکھ علی!" — ابنِ عطاش نے کہا — "تو نے شہرت تو اتنی حاصل کی ہے کہ اس جگہ کے حاکم کے ساتھ بھی تیرا اٹھنا بیٹھنا ہے لیکن یہ کوئی اچھی شہرت نہیں"۔

"شہرت تو ہے ابنِ عطاش!" — علی بن احمد نے کہا — "میں کہتا ہوں یہ نام پیدا کرے اچھا یا برا!"

"اپنے بچے کو اندر لے آ"۔

علی بن احمد اپنے بیٹے حسن بن صباح کو اندر لے گیا اور عبدالملک ابنِ عطاش کے سامنے بٹھا دیا۔ عبدالملک نے حسن کے سر سے دستار اتار دی اور اس کے سر پر اس طرح ہاتھ رکھا کہ اس کی انگلیاں حسن کی پیشانی پر تھیں۔ عبدالملک نے انگلیاں اس کی پیشانی پر آہستہ آہستہ پھیریں پھر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر ذرا اوپر کیا اور حسن کی آنکھوں میں بڑی غور سے دیکھا پھر اس کے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں پھیلا کر دیکھیں۔ ہتھیلیوں کو غور سے دیکھتے دیکھتے عبدالملک نے اپنا چہرہ یوں تیزی سے پیچھے کر لیا جیسے اس بچے کی ہتھیلیوں سے اچانک سانپ نکل آیا ہو۔

عبدالملک بن عطاش نے کاغذ قلم لے کر کاغذ پر قلم سے خانے بنائے اور ہر خانے میں کچھ لکھا وہ وقفے وقفے سے حسن کے چہرے کو دیکھتا تھا۔

"جا بچے!" — ابنِ عطاش نے حسن سے کہا — "تو باہر جا بیٹھ!"

حسن بن صباح باہر نکل گیا تو ابنِ عطاش نے اس کے باپ کی طرف دیکھا اور دیکھتا ہی رہا۔

"جو کہنا ہے کہہ دے ابنِ عطاش!" — علی نے کہا — "میں جانتا ہوں کہ جو تو کہے گا وہ تجھے تیرے علم اور ستاروں نے بتایا ہے"۔

"تیری بیوی کی کوکھ سے ایک نبی پیدا ہوا ہے" — ابنِ عطاش نے کہا۔

"نبی؟" — علی بن احمد نے حیران سا ہو کے پوچھا — "نبوت کا سلسلہ تو ختم ہو چکا ہے"۔

"نبوت کا سلسلہ اللہ کی طرف سے ختم ہوا ہے" — ابنِ عطاش نے کہا — "اللہ کے بندوں کی طرف سے یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا نہ کبھی ختم ہو گا۔ اب تک کتنے ہی آدمی نبوت کا دعویٰ کر چکے ہیں۔ کیا تو نے صاف ابنِ صیاد مدنی کی نبوت کا قصہ نہیں سنا؟ وہ یہودی تھا۔ اس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں ہی نبوت کا دعویٰ کر دیا تھا اور آپؐ سے اس کی ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار اس سے پوچھا 'کیا تجھ پر وحی نازل ہوتی ہے؟ صاف ابنِ صیاد نے جواب دیا 'میرے پاس ایک صادق اور ایک کاذب آتا ہے"۔

"صادق اور کاذب کا کیا مطلب؟" — علی بن احمد نے پوچھا۔

"مطلب سمجھنے کی کوشش کرو علی!" — ابنِ عطاش نے جواب دیا — "مطلب یہ کہ تمہارے پاس ایک فرشتہ آتا ہے اور ایک ابلیس — وہ کہنا یہ چاہتا تھا کہ فرشتہ بھی اور ابلیس بھی اس کے دماغ میں اپنے اپنے اشارے اور اپنے اپنے امورِ غیب ڈال جاتے ہیں — دراصل بات یہ تھی کہ صاف ابنِ صیاد علمِ سحر میں مہارت رکھتا تھا۔ ساحر ہم میں بھی ہیں۔ اس علم کے اسرار و رموز میرے پاس بھی ہیں لیکن یہ علم یہودیوں کو اتنا مرغوب ہے کہ انہوں نے اسے بہت ہی طاقتور بنا دیا ہے اور اس میں ابلیسیت بھر دی ہے۔ ان کے ساحر بالکل صحیح پیش گوئی کر سکتے ہیں۔ صاف ابنِ صیاد بھی پیش گوئی کر سکتا تھا۔ اسے اس نے یوں بیان کیا کہ ایک فرشتہ اس کے پاس آتا ہے جو اسے خدا کا پیغام دیتا ہے اور ابلیس بھی آتا ہے جو اسے آنے والے حالات بتاتا جاتا ہے"۔

"تم میرے بیٹے کی بات کر رہے تھے" — حسن بن صباح کے باپ نے کہا — "یہ کس قسم کا نبی بنے گا؟"

"جیسے کئی اور بنے ہیں" — ابنِ عطاش نے کہا — "تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی مانو نہ مانو، میں اس حدیث کا منکر نہیں ہو سکتا.... جھوٹے نبی آتے رہیں گے اور تمہارے سامنے ایسی ایسی باتیں کریں گے جو تم نے ہی نہیں، تمہارے باپ داداؤں نے بھی نہ سنی ہوں گی۔ ان سے خبردار رہنا اور اپنے ایمان کو ان سے محفوظ رکھنا۔ یہ تم میں گمراہی اور فتنہ پھیلائیں گے'.... طلیحہ اسدی نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ تم نے مسیلمہ کذاب کا نام سنا ہوگا۔ پھر ایک عورت سجاح بنتِ حارث نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا تھا.... پھر ہوا کیا؟.... صاف ابن صیاد نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ طلیحہ مسلمان ہو گیا تھا۔ اس نے نبی بن کر اتنی شہرت حاصل نہیں کی تھی جتنی مسلمان ہو کر میدانِ جنگ میں اسے ملی"۔

"اگر تو آنے والے وقت کے پردے اٹھا سکتا ہے تو بتا" — علی بن احمد نے کہا — "میرے بیٹے کا مستقبل کیا ہوگا؟ یہ کس انجام کو پہنچے گا؟"

"انسان کو اپنی فطرت انجام کو پہنچایا کرتی ہے" — ابنِ عطاش نے کہا — "انجام اچھا بھی ہو سکتا ہے برا بھی۔ اس کا انحصار انسان کے اپنے اعمال پر ہے۔ اگر میں تیرے بیٹے کی آنکھوں میں عکس غلط نہیں دیکھ رہا تو یہ اتنی زیادہ طاقت کا مالک ہوگا کہ یہ جس کی آنکھوں میں آنکھیں

ڈال کر دیکھے گا وہ اس کے آگے سجدہ ریز ہو جائے گا اور یہ جس عورت پر نگاہ ڈالے گا وہ عورت اپنے آپ کو اس کی ملکیت میں دے دے گی لیکن یہ طاقت نبیوں والی نہیں ہوگی بلکہ یہ ابلیسی طاقت ہوگی"۔

"کیا یہ طاقت میرے بیٹے کے حق میں اچھی ہوگی؟" — علی بن احمد نے پوچھا۔

"کیا تیری فطرت تیرے حق میں اچھی نہیں؟" — ابنِ عطاش نے کہا — "حاکمِ وقت تک تیری رسائی ہے۔ تیرے جاننے والوں میں کون ایسا ہے جس کا دل تجھے پسند کرتا ہے؟ لیکن کون ہے جو تیرے آگے تعظیم سے جھک نہیں جاتا؟ کون ہے جو سانپ سے پیار کرتا ہے لیکن ہر کوئی سانپ سے ڈرتا ہے"۔

"کیا تو اس کا راستہ بدل سکتا ہے؟" — علی بن احمد نے پوچھا — "کیا تو اس کے دل میں خوفِ خدا پیدا کر سکتا ہے؟"

"دنیا کا بادشاہ خدا ہے" — ابنِ عطاش نے کہا — "سب جانتے ہیں کہ یہ دنیا خدا نے بنائی ہے اور ایک روز خدا اسے تباہ کر دے گا اور یہ قیامت ہوگی لیکن خدا کے بندوں کے دلوں پر ابلیس کی حکمرانی ہے۔ اسے کہتے ہیں ابلیسی قوت!"

"میں کہتا ہوں میرا بیٹا نام پیدا کرے" — علی بن احمد نے کہا۔

"نام پیدا کرے گا" — ابنِ عطاش نے کہا — "نام بھی ایسا پیدا کرے گا کہ رہتی صدیوں تک دنیا اسے یاد کرے گی لیکن اس کی تاریخ خون سے لکھی جائے گی۔ اس پر گناہوں کی سیاہی کے حاشیے ہوں گے"۔

"پارسائی میں کیا رکھا ہے ابنِ عطاش!" — علی بن احمد نے ایسی مسکراہٹ سے کہا جو مسرت سے خالی تھی — "میں بچہ تیری شاگردی میں بٹھا رہا ہوں۔ اسے ایسے راستے پر ڈال دے کہ تجھ جیسا عالم بن جائے"۔

علی بن احمد اپنے بیٹے حسن کو عبدالملک بن عطاش کے حوالے کر کے چلا گیا۔

○

تھوڑا ہی عرصہ گزرا تھا کہ عبدالملک علی بن احمد کے گھر گیا۔ ان دونوں کی ملاقاتیں تو ہوتی ہی رہتی تھیں لیکن اس رات عبدالملک ابنِ عطاش کسی خاص مقصد سے وہاں گیا تھا۔

"عزیزِ احمد!" ــــ ابنِ عطاش نے کہا ــــ "میں نے تیرے بیٹے کو دینی اور معاشرتی علوم میں رواں کرنے کا قصد کیا تھا لیکن لڑکے کا ذہن کسی اور طرف لے جا رہا ہے۔ میں تیرے ساتھ یہ بات کرنے آیا ہوں کہ تیرا بیٹا اپنے فرقے کے لئے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر تو اجازت دے دے تو میں اسے اسی راستے پر ڈال دوں اور فن علوم اور عملیات کا اسے ماہر بنا دوں جو اس کے لئے ضروری ہیں"۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حسن بن صباح کا باپ جیسا خود تھا ویسا ہی اپنے بیٹے کو بنانا چاہتا تھا۔ عبدالملک ابن عطاش اپنے فرقے کا صرف مذہبی پیشوا ہی نہ تھا بلکہ وہ اپنے عقیدے کی تبلیغ اور فرقے کی سربلندی کے لئے زمین دوز کارروائیوں میں بھی لگا رہتا تھا۔ اس کا اپنا ایک بیٹا احمد جوان ہو رہا تھا۔ اس بیٹے کا نام احمد بن عبدالملک ہونا چاہئے تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو احمد بن عطاش کہلانا زیادہ پسند کیا۔ عبدالملک نے اسے اپنے فرقے کی تبلیغ اور دیگر کارروائیوں کے لئے بھیج دیا تھا۔ اس نے حسن بن صباح کو جو تربیت دینی شروع کی تو اس کے پیشِ نظر اپنا یہی مشن تھا۔ اس نے اس کمسن لڑکے میں بڑے کام کے جوہر دیکھ لئے تھے۔

عبدالملک نے حسن کو علمِ نجوم اور سحر کے سبق دینے شروع کر دیئے تھے۔ اس نے دیکھا کہ یہ لڑکا بڑی تیزی اور پورے انہماک سے یہ علوم سیکھ رہا تھا۔ یہ اس کی اضافی تعلیم تھی۔ اصل تعلیم تو دینی اور معاشرتی علوم کی تھی۔

داستان گو پہلے سنا چکا ہے کہ اس شہر رے کے حاکم ابو مسلم رازی کو پتہ چل گیا کہ علی بن احمد کا بیٹا عبدالملک ابنِ عطاش کی شاگردی میں بیٹھا ہے۔ رازی جانتا تھا کہ عبدالملک اسماعیلی ہے۔ علی بن احمد نے رازی کو حلفیہ طور پر یقین دلا رکھا تھا وہ اہلِ سنت ہے۔ ایک روز ابو مسلم رازی نے اس سے پوچھا کہ وہ اہلِ سنت ہے تو اس نے اپنے بیٹے کو اسماعیلی اتالیق کی شاگردی میں کیوں بٹھا لیا ہے؟

علی بن احمد نے جواب دیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو نیشاپور امام موافق کی شاگردی میں بٹھانا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس اتنے پیسے نہیں۔ ابو مسلم رازی نے اسے سرکاری خزانے سے اتنی رقم دلا دی کہ اس نے اپنے بیٹے کو نیشاپور امام موافق کے پاس بھیج دیا۔

حسن بن صباح فارغ التحصیل ہو کر رے اپنے گھر چلا گیا۔

پھر وہ بیس اکیس برس بعد اپنے ہم جماعت اور دوست خواجہ حسن طوسی کے پاس گیا تھا۔ اس وقت خواجہ طوسی سلجوقی سلطنت کا وزیراعظم بن کر سلجوقی سلطان سے نظام الملک کا خطاب بھی حاصل کر چکا تھا۔ حسن نے نظام الملک سے کہا تھا کہ اس نے اپنی عمر کا یہ اتنا لمبا اور اتنا قیمتی عرصہ روزگار کی تلاش میں دربدر ٹھوکریں کھاتے گزارا ہے اور اب اسے پتہ چلا ہے کہ خواجہ طوسی وزیراعظم ہے۔

حسن بن صباح نے جھوٹ بولا تھا۔ یہی وہ عرصہ تھا جس عرصے میں وہ ایک طاقت اور ایک انتہائی خطرناک انسان بن گیا تھا۔ وہ آگ میں سے گزر کر کندن بن گیا تھا۔ اس نے ہزارہا پیروکار ہی نہیں بنا لئے تھے بلکہ ان پر اپنی عقیدت کا پاگل پن طاری کر دیا تھا اور اس کے یہ جنونی پیروکار کسی ایک شہر یا قصبے میں نہیں بلکہ بڑے وسیع علاقوں میں جنگلوں میں پھیل گئے تھے۔

اس نے یہ مقبولیت اور یہ طاقت کس طرح حاصل کی تھی؟

○

نیشاپور سے رے پہنچتے ہی وہ اپنے پہلے اتالیق کے ہاں گیا۔ اتالیق عبدالملک ابنِ عطاش نے ایسے تپاک سے ملا کہ اسے گلے سے لگایا اور کچھ دیر گلے سے ہی لگائے رکھا۔

"مجھے پوری امید تھی کہ تم ایسے ہی خوبصورت جوان نکلو گے" ــــ ابنِ عطاش نے اسے اپنے سامنے بٹھا کر کہا اور اس کے بازوؤں پھر کندھوں کو ہاتھوں سے دباتے ہوئے بولا ــــ "پٹھوں میں جوانی کی طاقت آ گئی ہے" ــــ پھر اس کے سر کے دائیں اور بائیں ہاتھ رکھ کر کہنے لگا ــــ "میں کیسے جان سکتا ہوں کہ تیرے دماغ میں بھی کچھ گیا ہے یا نہیں"۔

"محترم اتالیق!" ــــ حسن نے کہا ــــ "دماغ میں تو بہت کچھ بھر لایا ہوں۔ یہ علم ہے۔ یوں کہہ لیں کہ علم کے الفاظ ہیں جو دماغ میں ٹھونس لایا ہوں لیکن ایک تشنگی ہے جو بے قراری بن کر دماغ کو ایک سوچ پر قائم نہیں رہنے دیتی"۔

"کیا تو علم کی تشنگی محسوس کرتا ہے؟"

"عمل کی!" ــــ حسن نے کہا ــــ "میں کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ پیٹ بھرنے کے لئے نہیں ..... میں کیا چاہتا ہوں؟..... میں اپنے آپ کو اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا..... آپ کی شاگردی میں بیٹھا تو آپ نے بتایا کہ مذہب کیا اور فرائض کیا ہیں، پھر آپ نے مجھے ستاروں سے

روشناس کرایا اور مجھ پر سحر کے بھید کھولے"۔۔۔۔ وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا اور اس حسن [illegible]
باتیں دیکھنے لگا جیسے بے چینی اور اضطراب پر اُس کا قابو نہ رہا ہو۔ کچھ دیر بعد بولا ۔۔۔ "آپ
بتائیں محترم اتالیق! میں کیا چاہتا ہوں؟۔۔۔ میری منزل کیا ہے؟ کہاں ہے میری منزل؟"
"تیری منزل تیرے اپنے دماغ میں ہے"۔۔۔ ابنِ عطاش نے کہا ۔۔۔ "دماغ کو کھوج"
"یہ کام آپ کریں"۔۔۔ حسن نے کہا ۔۔۔ "ہاں... وہ تین بار خیال آیا ہے جیسے میں
فرعون بننا چاہتا ہوں"۔

عبدالملک ابنِ عطاش نے زوردار قہقہہ لگایا۔ حسن حیرت سے اس کے منہ کو دیکھنے لگا۔
"تو نے اپنی منزل کا سراغ پالیا ہے"۔۔۔ ابنِ عطاش نے کہا ۔۔۔ "اب تیری بے قراری کو
ختم کرنا میرا کام ہے۔ کچھ وقت لگے گا حسن! محنت، مشق اور ریاض کی ضرورت ہے۔ وہ میں
کراؤں گا۔ تیرے اندر ایک ایسی طاقت ہے جو ہر کسی میں نہیں ہوتی۔ یہی طاقت ہے جو تجھے
بے قرار اور بے چین رکھتی ہے۔ تو اس کا مالک ہے لیکن تو اس سے ناآشنا ہے۔ اگر تو نے اسے نہ
ابھارا تو ایک دن تو اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹ لے گا یا تو اپنے ماں باپ کو قتل کر دے گا اور تیری
گردن جلاد کے ہاتھوں کٹے گی"۔

"ہاں اتالیق!"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "آپ کے اس انکشاف نے میرے دل میں
شمع روشن کر دی ہے۔ میں کچھ ایسا ہی محسوس کیا کرتا ہوں کہ میں قتل کروں گا یا قتل ہو جاؤں گا۔
کیا آپ میری راہنمائی کر سکتے ہیں؟"

"صرف میں ہوں"۔۔۔ ابنِ عطاش نے کہا ۔۔۔ "میرے سوا اور کوئی نہیں جو تیری
راہنمائی کر سکے۔ لیکن حسن! تجھے اپنے باپ سے اجازت لینی پڑے گی"۔

"مجھے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں میرے بزرگ اتالیق!"۔۔۔ حسن نے دو ٹوک لہجے
میں کہا ۔۔۔ "میں یہ جانتا ہوں کہ میں وہ سیلابی دریا ہوں کہ میرے سامنے جو رکاوٹ آئی وہ تنکوں
کی طرح بہہ جائے گی۔۔۔ یہ بھی سوچئے کہ میرا باپ کہاں کا زاہد اور پارسا ہے۔ اُس نے عیاری
اور مکاری میں شہرت پائی ہے۔ میری فطرت اُسی کے سانچے میں ڈھلی ہے۔ مجھے بھروسہ ہے تو
صرف آپ کی ذات پر ہے"۔

مورخ لکھتے ہیں کہ عبدالملک ابنِ عطاش کو حسن بن صباح کے مستقبل کے ساتھ کوئی ایسی دلچسپی نہیں تھی کہ اپنی توجہ اور کاوشیں اسی پر مرکوز کر لیتا۔ اُس کی دلچسپی اپنے فرقے کی تبلیغ اور فروغ کے ساتھ تھی۔ اسلام نے اوّلیں مسلمانوں کے حسنِ اخلاق سے مقبولیت حاصل کی تھی۔ وہ دور دُور پیچھے رہ گیا تھا۔ پانچویں صدی گذر رہی تھی۔

فرقہ بندی نے اسلام کی بنیادیں ہلا ڈالی تھیں۔

اسلام اگر کھانے پینے والی کوئی چیز تھا تو اس میں زہریلی ملاوٹیں گھول دی گئی تھیں۔

اسلام اگر پیرہن تھا تو اس کا گریبان، بھی اُس کا دامن بھی تار تار ہوا جا رہا تھا۔ اس کی صرف آستینیں محفوظ تھیں اور ان آستینوں میں سانپ پرورش پا رہے تھے۔

عبدالملک ابنِ عطاش انہی سانپوں میں سے تھا۔ حسن بن صباح کے باپ کی بات تو داستان گو سنا چکا ہے کہ حاکمِ شہر ابو مسلم رازی کی دوستی قائم رکھنے کی خاطر قسمیں کھا کر کہتا تھا کہ وہ اہلِ سنت و جماعت ہے لیکن وہ اسماعیلی تھا' بلکہ وہ اسماعیلی فرقے کے لئے بھی سراپا توہین تھا۔ اس کا اگر کوئی مذہب تھا تو وہ فریب کاری تھی۔ اُس کا عقیدہ اگر تھا تو وہ عیاری تھی۔

تاریخ ایک دلچسپ بات بتاتی ہے۔ حسن بن صباح علی بن احمد کا بیٹا تھا اس لئے اس کا نام حسن بن علی ہونا چاہئے تھا لیکن حسن نے حسن بن صباح کہلانا زیادہ پسند کیا۔ اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ اُس کے پردادے کا نام صباح تھا۔ اُس کے کردار کے متعلق جو روایات سینہ بہ سینہ حسن تک پہنچی تھیں' وہ عیاری اور فریب کاری کی وارداتیں تھیں۔ اُس وقت کی سوسائٹی میں اُس کا کوئی مقام اور کوئی رُتبہ نہیں تھا لیکن بادشاہ اور بڑے بڑے حاکموں تک اُس کی رسائی تھی اور لوگ اُس کی فطرت سے آگاہ ہوتے ہوئے اُسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

حسن بن صباح کو اپنے پردادا کی یہ فطرت اور اُس کی یہ شہرت اتنی اچھی لگی کہ اس نے اپنا نام حسن بن علی کی بجائے حسن بن صباح رکھ لیا۔ تاریخوں میں اس کا نام حسن بن صباح حمیری لکھا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسن بن صباح کس فطرت کا انسان تھا۔

اُس نے ایک بار پھر عبدالملک ابنِ عطاش کی شاگردی کر لی لیکن اب یہ شاگردی درپردہ تھی کیونکہ ابنِ عطاش اسے بڑے ہی پُراسرار راستے پر ڈال رہا تھا۔ ابنِ عطاش اسے کہا کرتا تھا کہ اس کا کام شہروں اور قصبوں میں نہیں ہو گا بلکہ اس کی زیادہ تر زندگی جنگلوں' بیابانوں اور غاروں

میں گزرے گی۔

اگر حسن بن صباح کے ماں باپ دیکھ لیتے کہ عبدالملک ابنِ عطاش ان کے نوجوان بیٹے کو کس قسم کی تربیت دے رہا ہے تو وہ اسے اس استاد کی شاگردی سے فوراً اٹھا لیتے۔ ابنِ عطاش اُسے کئی کئی گھنٹے مسلسل ایک ٹانگ پر کھڑا رکھتا تھا۔ وہ گرنے لگتا تو اُسے ایک دو کوڑے لگا دیتا تھا۔

دو دو تین تین دن اُسے بھوکا رکھتا اور اس کے بعد اسے کھانے کو جَو کے کچھ دانے دیتا تھا۔

اپنے آپ کو پوری طرح قابو میں رکھنے کے لئے ابنِ عطاش نے اُسے اس امتحان میں بھی ڈالا کہ ایک کمرے میں ایک انتہائی خوبصورت اور نوخیز لڑکی کو برہنہ کر کے اس کے سامنے بٹھا دیا۔ اُس کے سامنے دیوار پر ایک چھوٹا سا سیاہ دائرہ بنا کر کہا کہ وہ اپنی نظریں اس دائرے پر مرکوز رکھے اور ایک لمحے کے لئے بھی لڑکی کی طرف نہ دیکھے۔

علمِ سحر کے عامل لکھتے ہیں کہ تربیت کے اس مرحلے سے کامیاب نکلنا تقریباً" ناممکن ہوتا ہے، خصوصاً" نوجوانی کی عمر میں یہ مرحلہ اور زیادہ مشکل ہو جاتا ہے۔ حسن بن صباح جیسے کردار کا نوجوان اس مرحلے کو برداشت ہی نہیں کر سکتا۔ استاد اس مشق کو اس طرح اور زیادہ مشکل بنا دیا کرتا تھا کہ حسن دیوار کے دائرے پر نظریں مرکوز رکھتا تو لڑکی کبھی اُس کا ایک ہاتھ پکڑ لیتی، کبھی اُس کے قریب ہو جاتی اور کبھی اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگتی۔ کمرہ بند ہوتا تھا اور کمرے میں ایک حسن ہوتا اور یہ حسین لڑکی۔

اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کی یہ مشق حسن سے بارہا کروائی گئی اور حسن سُوئی کے اس ناکے میں سے بھی گذر گیا۔ حسن کو معلوم نہیں تھا کہ اس کمرے کے دروازے کے ایک کواڑ میں چھوٹا سا ایک سوراخ تھا جس میں سے اُس کا استاد اسے دیکھتا رہتا تھا۔

"تُو ساری دنیا کو فتح کرنے کی طاقت اور صلاحیت رکھتا ہے" —— ایک روز عبدالملک ابنِ عطاش نے اُسے خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا —— "عورت میں اتنی طاقت ہے کہ وہ جابر بادشاہ کو تخت سے اٹھا کر اپنے قدموں میں بٹھا سکتی ہے۔ معلوم نہیں امام موافق نے تجھے ایسی کوئی کہانی سنائی ہے یا نہیں۔ جولیس سیزر روم کا بڑا ہی زبردست، طاقتور اور جنگجو بادشاہ تھا۔ اُس زمانے میں روم ہی ایک جنگی طاقت تھی جس کے خوف سے دنیا لرزتی تھی۔ جولیس سیزر نے

مصر پر فوج کشی کی۔ اُس وقت قلوپطرہ مصر کی ملکہ تھی۔ اُسے اطلاع ملی کہ روم کی فوج شہر کے باہر پہنچ گئی ہے۔ قلوپطرہ نے جولیس سیزر کی طرف اپنا ایلچی اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ وہ اُس سے ملنا چاہتی ہے۔

"جولیس سیزر نے سن رکھا تھا کہ قلوپطرہ کے ہاتھ میں کوئی ایسا جادو ہے جو ہر حملہ آور بادشاہ کو اس کا غلام بنا دیتا ہے۔ جولیس سیزر کو یہ بھی بتایا گیا تھا کہ قلوپطرہ کے ہاتھ میں کوئی جادو ہے یا نہیں، وہ اپنی پُرشباب نسوانیت کا ایسا جادو چلاتی ہے کہ حملہ آور بادشاہ کتنا ہی پتھر دل کیوں نہ ہو، اس کے آگے موم ہو جاتا ہے۔ ان حکایات و روایات کے پیشِ نظر جولیس سیزر نے قلوپطرہ سے ملنے سے انکار کر دیا۔ اُس نے تہیہ کر لیا تھا کہ ملکۂ مصر کو اُس وقت دیکھے گا جب رومی فوج شہر میں داخل ہو کر مصری فوج سے ہتھیار ڈلوا چکی ہو گی۔۔۔

"جولیس سیزر نے شہر کو محاصرے میں لینے کا حکم دے دیا۔ وہ بادشاہ تھا۔ اُس کا خیمہ ایک سفری محل تھا۔ محاصرہ مکمل ہونے کے ایک دو روز بعد ایک ادھیڑ عمر آدمی جو مصری تھا اپنے کندھے پر ایک قالین اٹھائے جولیس سیزر کے خیمے کے سامنے آن رکا۔ قالین گولائی میں رول کیا ہُوا تھا جو اس مصری نے کندھے پر اٹھا رکھا تھا۔ اُس نے جولیس سیزر کے محافظوں سے کہا وہ قالین باف ہے اور یہ قالین جو بہت ہی قیمتی اور بہت ہی خوبصورت ہے، بادشاہ کو دکھانا چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے بادشاہ کو قالین پسند آ جائے اور وہ اسے خرید لے، اس سے غریب آدمی کا بھلا ہو جائے گا۔۔۔

"رومی محافظ اُسے دھکے دے کر پیچھے ہٹانے لگے کہ وہ بادشاہ کے آرام میں مخل نہ ہو۔ مصری قالین باف نے بڑی اونچی آواز میں بولنا شروع کر دیا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ میں یہ قالین تمہارے بادشاہ کو دے کر ہی جاؤں گا۔ یہ شور شرابہ خیمے میں جولیس سیزر کے کانوں میں پڑا تو اُس نے وہیں سے حکم دیا کہ یہ جو کوئی بھی ہے، اُسے اندر بھیج دو۔ محافظوں نے اُسے خیمے میں بھیج دیا۔۔۔

"خیمے میں جا کر مصری نے جولیس سیزر سے کہا کہ وہ ایک بار قالین دیکھ لے، یہ قالین روم کے بادشاہ کے لئے ہی موزوں ہے۔ جولیس سیزر نے کہا کہ قالین کھول کر دکھاؤ۔ اُس آدمی نے کندھے سے قالین زمین پر رکھا۔ یہ چوڑائی میں رول کیا ہُوا تھا۔ جب اسے کھولا تو اس میں سے

قلوپطرہ نکلی۔ جولیس سیزر کا چہرہ عتابِ شاہی سے سرخ ہو گیا لیکن قلوپطرہ نے جب اپنی پُرکشش نسوانیت کا جادو چلایا تو کچھ ہی دیر بعد روم کا اتنا زبردست اور طاقتور بادشاہ جیسے بھول ہی گیا ہو کہ وہ بحیرۂ روم کی لہروں کو چیرتا مصر میں کیوں آیا تھا...

"پھر جانتے ہو حسن کیا ہُوا؟... جولیس سیزر جو حملہ آور تھا' ایک شاہی مہمان کی حیثیت سے قلوپطرہ کے ساتھ شہر میں داخل ہُوا۔ بہت دنوں بعد جولیس سیزر اپنی فوج کو ساتھ لے کر واپس چلا گیا۔ اُس کے جرنیلوں نے روم میں اپنے ساتھی جرنیلوں کو بتایا کہ مصر میں ان کے بادشاہ نے کیا کیا تھا۔ ایک روز جولیس سیزر محل میں بیٹھا تھا کہ اُسے اطلاع دی گئی کہ فلاں جگہ فوراً" پہنچے۔ وہ اٹھ کر چل دیا۔ محل کے قریب ہی ایک اور عمارت تھی جس میں اُسے جانا تھا۔ وہ جونہی اس عمارت میں داخل ہُوا' دس بارہ آدمیوں نے اسے گھیر لیا اور خنجروں سے اسے بڑی ہی بیدردی سے قتل کر دیا"۔

"ہاں محترم اتالیق!" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں۔ اس سبق کو نہیں بھولوں گا"۔

"لیکن حسن!" ــــ ابنِ عطاش نے کہا ــــ "اس کا یہ مطلب نہیں کہ تجھے عورت سے دُور رہنا پڑے گا' عورت انتہائی حسین اور نوجوان لڑکیوں کی صورت میں تیرے ساتھ رہے گی۔ یہ تیرا ایک ہتھیار ہو گا لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو میں نے تجھے کہیں اور بھیجنا ہے۔ اگر تُو اس مرحلے سے بھی زندہ و سلامت نکل آیا تو پھر تجھ میں ایسی طاقت آجائے گی کہ آسمان کی طرف دیکھ کر تُو جس ستارے کی طرف اشارہ کرے گا وہ تیری جھولی میں آگرے گا"۔

○

ابنِ عطاش نے حسن بن صباح کو تربیت کے اگلے مرحلے میں ڈال دیا جس میں اُسے قبروں میں مدفون انسانوں کی مختلف ہڈیوں کا استعمال سکھایا جاتا تھا۔ ابنِ عطاش نے اسے پہلی بار آدھی رات کے وقت کہا کہ وہ قبرستان میں جائے اور کوئی ایسی قبر تلاش کرے جو بہت ہی پرانی ہو۔

"پرانی قبر کی نشانی کیا ہو گی؟" ــــ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"کوئی ایسی قبر دیکھ جو نیچے کو دھنس گئی ہو" ــــ ابنِ عطاش نے کہا ــــ "تجھے کچھ قبریں ایسی بھی نظر آجائیں گی جو پوری طرح نیچے کو دھنسی ہوئی ہوں گی اور ان میں مُردوں کی ہڈیاں نظر

آتی ہوں گی۔ ایسی کسی قبر میں سے ایک کھوپڑی اور کندھے سے کہنی تک دائیں اور بائیں بازو کی دو ہڈیاں بھی لانی ہیں"۔

حسن بن صباح قبرستان میں چلا گیا۔ وہ جنگ و جدل کا زمانہ تھا۔ لڑائیاں ہوتی ہی رہتی تھیں اس لئے قبرستان بہت ہی وسیع و عریض تھے۔ آدھی رات کے وقت چاند پورا تھا۔ حسن بن صباح قبرستان میں دھنسی ہوئی قبر تلاش کرنے لگا۔ استاد نے اسے تلوار ساتھ لے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

قبرستان کو شہرِ خموشاں کہا جاتا ہے لیکن وہاں عالم یہ تھا کہ زندہ انسانوں کا شہر خاموش تھا اور مرے ہوئے انسانوں کی اس بستی میں کئی ایک آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ علاقہ سرسبز تھا۔ پیڑ پودے بہت زیادہ تھے۔ دو تین اُلّو باری باری بولتے تھے۔ جھینگروں اور مینڈکوں کی آوازیں بھی مسلسل آرہی تھیں۔ اُسے بھاگتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ اُس نے ڈر کے اُدھر دیکھا۔ ایک بِلّی بہت تیز بھاگتی آرہی تھی۔ دو بھیڑیئے اُس کے تعاقب میں تھے۔ وہ اس کے قریب سے گذر گئے اور آگے جا کر غائب ہو گئے۔

وہ اپنا دل مضبوط کر کے چل پڑا۔ وہ ہر قبر کو دیکھ رہا تھا۔ اُسے دھنسی ہوئی کوئی قبر نظر نہیں آرہی تھی۔ کچھ دور جا کر اُسے ایک گڑھا نظر آیا جو قبر کی طرح لمبوترا تھا۔ یہ قبر ہی ہو سکتی تھی۔ اس کے ہر طرف قبریں تھیں۔ یہ قبر اُس کے مطلب کی تھی۔ قبر کے کنارے پہنچ کر اُس نے نیچے دیکھا تو پہلے اُس نے ایسی آوازیں سنیں جیسے کُتے غرّایا کرتے ہیں۔ پھر یکلخت قبر میں سے دو کُتے اچھل کر اوپر آگئے۔ تب اُس نے دیکھا کہ یہ بھیڑیئے ہیں۔

اُس نے فوراً" تلوار نکالی اور زور زور سے گھمانے لگا۔ بھیڑیئے سمتیں بدل بدل کر اُس پر جھپٹنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اُس کی گھومتی ہوئی تلوار بھیڑیوں کو قریب نہیں آنے دے رہی تھی۔ ایک بار وہ اس دھنسی ہوئی قبر کے کنارے پر اس طرح چلا گیا کہ اُس کی پیٹھ قبر کی طرف تھی۔ بھیڑیوں سے بچنے کے لئے وہ ذرا سا پیچھے ہٹا تو قبر میں جا پڑا۔ اُس کی ایک ٹانگ گھٹنے تک مٹی میں دھنس گئی۔ اُسے مری ہوئی ایک بِلّی نظر آگئی جو قبر میں پڑی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ وہی بِلّی ہے جس کے پیچھے بھیڑیئے دوڑ رہے تھے۔ بِلّی شاید اس قبر میں گر پڑی یا چُھپنے کے لئے اس میں اُتر گئی تھی۔ بھیڑیوں نے اُسے وہیں دبوچ لیا۔ بھیڑیئے اُس وقت بِلّی کو کھا رہے تھے

جب حسن وہاں پہنچا۔

بھیڑیے یہ سمجھے کہ یہ شخص ان سے ان کا شکار چھیننے آیا ہے۔ حسن نے فوراً چیری پھاڑی ہوئی بلی کو ٹانگ سے پکڑا اور اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ اگر وہ ایک لمحہ اور بھیڑیوں کا شکار باہر نہ پھینکتا تو وہ اوپر سے اس پر حملہ کر کے اسے چیر پھاڑ دیتے۔ بھیڑیے اپنا شکار اٹھا کر چلے گئے لیکن حسن بن صباح پر ایسا خوف طاری ہو گیا کہ وہ اپنے جسم میں لرزہ محسوس کر رہا تھا۔ اُس نے تو یہ بھی سوچ لیا تھا کہ وہاں سے بھاگ آئے لیکن استاد کے ڈر سے اُس نے بھاگنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

اُس نے کچھ اس قسم کی کہانیاں سن رکھی تھیں کہ بعض لوگ اللہ کو اتنے عزیز ہوتے ہیں کہ وہ مر جائیں اور کوئی ان کی قبروں کی توہین کرے تو اللہ اُس پر اُسی وقت عذاب نازل کرتا ہے۔ اس خیال نے اُس کے خوف میں اضافہ کر دیا لیکن ابنِ عطاش نے اُسے کہا تھا کہ مطلوبہ ہڈیاں ہر حالت میں لانی ہیں اور خوف پر قابو پانا ہے۔ حسن نے اپنی دھنسی ہوئی ٹانگ باہر کھینچی۔ یہ لحد تھی جس میں ہڈیاں ہونی چاہئیں تھیں۔

اُس نے دیکھا کہ وہاں سے ایک سِل نیچے کو گری ہوئی تھی۔ اُس نے ہاتھوں سے مٹی باہر پھینکی پھر سِل اٹھا کر الگ رکھ دی۔ چاندنی میں مُردے کی ہڈیاں صاف نظر آ رہی تھیں۔ یہ مُردے کا اوپر والا حصہ تھا۔ اُس نے کھوپڑی اٹھائی اور دونوں بازوؤں کی ہڈیاں بھی اٹھا لیں۔ عین اُس وقت اُس نے دیکھا کہ چاندنی بجھ گئی ہے اور ایک سایہ اُس کے اوپر سے گذر رہا ہے۔ اُس نے گھبرا کر اوپر دیکھا کالی گھٹا آگے کو بڑھ رہی تھی اور رات تاریک ہوتی چلی جا رہی تھی۔ حسن کھوپڑی اور ہڈیاں اٹھا کر تیزی سے قبر سے نکلا۔ اچانک بجلی بڑی زور سے چمکی۔ دو تین سیکنڈ بعد بجلی کی کڑک سنائی دی جو اتنی خوفناک تھی کہ حسن بن صباح جیسا دلیر نوجوان بھی سُن ہو کے رہ گیا اور اُسے اپنے دل کی دھڑکن صاف سنائی دینے لگی۔

اس علاقے میں بارش کا اچانک آجانا کوئی عجیب چیز نہیں تھی لیکن حسن کے دل پر یہ خوف سوار [illegible] یہ کسی برگزیدہ بزرگ کی قبر ہے جس کی توہین پر آسمان اپنی بجلیاں گرانے پر اُتر آیا ہے۔ حسن کو پھر وہی خیال آیا کہ یہ کھوپڑی اور دونوں ہڈیاں لحد میں واپس رکھ دے لیکن اُسے اپنے استاد کی یہ بات بھی یاد آگئی کہ اگر تو ڈر گیا یا ویسے ہی ناکام لوٹا تو پھر یہ علم سیکھنے کے لئے نہ جانے کتنے سال درکار ہوں گے۔ اُس نے بڑی مشکل سے اپنا حوصلہ مضبوط کیا اور وہاں سے چل

پڑا۔

اچانک موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ بارش کے قطرے کنکریوں کی طرح جسم کو لگتے تھے۔ وہ دوڑ پڑا۔ ایک جگہ اُس نے سامنے دیکھا تو اُسے تین چار قدم دور ایک آدمی کھڑا نظر آیا جس کے خدوخال صاف نظر نہیں آتے تھے۔ وہ دھندلا سا سایہ تھا جو سیدھا کھڑا تھا۔ اُس کا قد اتنا لمبا تھا کہ عام انسان سے زیادہ تھا۔ اُس نے دونوں بازو کندھوں کی سیدھ میں دائیں بائیں پھیلا رکھے تھے جیسے حسن کو آگے بڑھنے سے روک رہا ہو۔ اُس کا سر گول نہیں بلکہ لمبوترا تھا۔ وہ بالکل خاموش تھا۔

حسن رک گیا۔ دل پر خوف کی گرفت ایسی جیسے ایک مضبوط ہاتھ اُس کے دل سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑنے کے لئے شکنجے کی طرح دباتا جا رہا ہو۔ اُس نے فیصلہ کر لیا کہ کھوپڑی اس خوفناک آدمی کے قدموں میں رکھ دے گا۔ بجلی بار بار چمکتی اور کڑکتی تھی۔ اس چمک سے حسن کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی تھیں۔ بارش بڑی ہی تیز تھی۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے یہ غیر معمولی طور پر لمبا تڑنگا انسان اوپر نیچے اور دائیں بائیں حرکت کر رہا ہو، پھر ایک بار اُسے یوں لگا جیسے یہ آدمی آگے بڑھ رہا ہو۔

اچانک حسن کی مردانگی بیدار ہو گئی۔ یہ شاید موت سے بچنے کی آخری کوشش تھی۔ اُس نے تلوار نکالی اور بڑی ہی تیزی سے آگے بڑھ کر تلوار اس آدمی کے پیٹ میں گھونپی۔ اُسے امید تھی کہ جس طاقت سے اُس نے یہ وار کیا ہے، تلوار اس پُراسرار آدمی کے پیٹ میں سے گذر کر پیٹھ کی طرف سے نکل جائے گی لیکن تلوار کی نوک بھی پیٹ میں نہ گئی۔ حسن نے بجلی کی سی تیزی سے تلوار پیچھے کھینچی اور اس طرح تلوار پہلو کی طرف چلائی جس طرح تلوار کا وار کیا جاتا ہے لیکن اُس کے اپنے ہاتھ کو بڑی زور سے جھٹکا لگا اور تلوار پیچھے کو آگئی۔ اس آدمی کے بازو پھیلے رہے۔ حسن اس سے ایک دو قدم ہی دور تھا۔ اب جو بجلی چمکی تو حسن نے آگے بڑھ کر اس کو ہاتھ لگایا تب اُسے پتہ چلا کہ یہ ایک ٹُنڈ مُنڈ درخت ہے جو خشک ہو چکا ہے اور اس کے ٹوٹے ہوئے دو ٹُن دائیں اور بائیں پھیلے ہوئے ہیں۔

حسن کھوپڑی اور بازوؤں کی ہڈیوں کو مضبوطی سے پکڑے دوڑ پڑا۔ قبرستان سے نکلتے نکلتے وہ دو تین بار پھسل کر گرا اور جب قبرستان سے نکل آیا تو ذرا آرام سے چلنے لگا۔ عبدالملک ابنِ

عطاش نے اُسے کہا تھا کہ وہ گھر میں اُس کا منتظر ہو گا خواہ ساری رات گذر جائے۔

حسن اُس کے گھر پہنچا تو وہ جاگ رہا تھا۔ حسن کے کپڑوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ گھٹنوں تک کیچڑ تھا۔ کچھ تو وہ بارش کی وجہ سے کانپ رہا تھا اور کچھ خوف سے۔ اُس نے کھوپڑی اور ہڈیاں ابنِ عطاش کے آگے رکھ دیں۔ ابنِ عطاش نے اُسے شاباش دی پھر اُس کے کپڑے تبدیل کرائے اور پوچھا کہ وہ ڈرا تو نہیں؟

"میں بتا نہیں سکتا کہ میں کتنا زیادہ ڈر گیا تھا"۔۔۔ حسن بن صباح نے جواب دیا۔ چند لمحے سوچ کر کہنے لگا۔۔۔ "محترم اتالیق! کیا یہ بھی میری تربیت کے لئے ضروری ہے؟"

"اتنا ہی ضروری جتنا جسم کے لئے پانی اور ہوا کی ضرورت ہے"۔۔۔ ابنِ عطاش نے کہا۔۔۔ "اب بتا یہ ہڈیاں قبر سے تو کیسے نکال لایا؟"

حسن نے تفصیل سے سنایا کہ اُس پر کیا گذری ہے۔

"محترم اتالیق!"۔۔۔ حسن نے کہا۔ "میں نے آج رات سچ مان لیا ہے کہ کسی برگزیدہ شخصیت کی قبر اور اس کی ہڈیوں کے ساتھ یہ سلوک کرو جو میں نے کیا ہے تو اُسی وقت عذاب نازل ہوتا ہے"۔۔۔ اُس نے ڈری ہوئی سی آواز میں پوچھا۔۔۔ "کیا مجھ پر مزید عتاب نازل ہو گا؟"

○

"نہیں!"۔۔۔ ابنِ عطاش نے جواب دیا۔۔۔ "جو ہونا تھا ہو چکا ہے۔ راز کی ایک بات ہے۔ اسے دل اور دماغ میں محفوظ کر لے۔ تو مُردے کی قبر میں اترا تجھ پر بھیڑیئے ٹوٹ پڑے ہڈیوں کو ہاتھ لگایا تو بجلیاں کڑکنے لگیں۔ کیا اس سے تُو یہ نہیں سمجھا کہ مرے ہوئے انسان میں بھی طاقت ہوتی ہے؟ کیا تُو نے کبھی روح یا بدروح نہیں سنی؟ میں نے تجھے کس علم میں ... ہے، یہ علم تجھے روحوں اور بدروحوں سے ملاقات کرائے گا اور یہ علم تجھے یہ بھی سکھائے گا مرے ہوئے انسانوں میں جو طاقت ہوتی ہے وہ تیرے قابو میں آجائے اور اسے تُو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرے لیکن ابھی نہیں۔ یہ طاقت تجھے کہیں سے حاصل ہو گی اور اپنی ہڈیاں تڑوا کر تُو یہ طاقت حاصل کرے گا۔ جہنم کی آگ میں سے گذر کر تُو جنت میں داخل ہو گا"۔

عبدالملک ابنِ عطاش نے اسے کھوپڑی اور ہڈیوں کے متعلق ایک سبق دیا اور اسے گھر بھیج دیا۔

○

اگلے دن حسن بن صباح شہر کے قریب سے گذرنے والی ندی کے کنارے ٹہل رہا تھا۔ اُس کے دماغ میں اپنے استاد کے سبق گھوم رہے تھے۔ گذشتہ رات کی طوفانی بارش سے ندی کی کیفیت تھی اور ہر طرف کیچڑ تھا۔ حسن نے تنہائی میں، شہر کے ہنگامے سے دور کسی جگہ بیٹھ کر نجوم اور سحر کے سبق دہرانے تھے۔ کیچڑ میں وہ بیٹھنے کے لئے کوئی خشک جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔

کچھ دُور جا کر اُسے اتنا بڑا پتھر پڑا نظر آگیا جس پر وہ آسانی سے بیٹھ سکتا تھا۔ وہ اُفق سے ابھرتے ہوئے سورج کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا، آنکھیں بند کر لیں اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

زیادہ دیر نہیں گذری تھی کہ اُس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ اس کے سامنے سورج ہونا چاہئے تھا لیکن سورج نہیں تھا۔ اس کی بجائے ایک رنگ دار کپڑا تھا جو اُس کے اور سورج کے درمیان آگیا۔ حسن سُن سا ہو گیا۔ اُس نے ڈرتے ڈرتے اور بہت ہی آہستہ آہستہ نظریں اوپر اٹھائیں۔ اُسے ایک بڑا ہی حسین نسوانی چہرہ نظر آیا۔۔۔ یہ ایک نوخیز لڑکی کا چہرہ تھا۔ ہونٹوں پر ادھ کھلی کلی جیسی مسکراہٹ تھی۔ لڑکی اُس سے صرف ایک قدم دور کھڑی تھی۔

حسن ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ یہ چہرہ پہلے بھی کہیں دیکھا ہے، کہاں دیکھا ہے؟

اُسے یہ خیال بھی آیا کہ یہ سحر کا کرشمہ ہو گا۔

"پہچاننے کی کوشش کر رہے ہو؟"۔۔۔ لڑکی کی آواز میں ترنم تھا۔

حسن بن صباح نے سر کو ہلایا کہ ہاں، وہ پہچاننے کی کوشش کر رہا ہے۔

"اتنی دیر تمہارے سامنے برہنہ بیٹھی رہی تھی"۔۔۔ لڑکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اوہ!"۔۔۔ حسن کو یاد آگیا۔۔۔ "تم وہ ہو۔۔۔۔ ایک بات بتاؤ۔۔۔۔ کیا تم حقیقت ہو یا میرے استاد کا تخلیق کیا ہوا تصور ہو جو اُس نے حقیقی روپ میں میرے ذہن میں ڈال دیا ہے؟"

"خود دیکھ لو"۔۔۔ لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھ حسن کے آگے کر کے کہا۔۔۔ "میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر محسوس کرو کہ میں تصور ہوں یا جیتی جاگتی ایک لڑکی ہوں"۔

حسن نے اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں پر لے کر دبائے، ان کی حرارت محسوس کی، ان کا گداز

محسوس کیا۔

"تم کون ہو؟" ــــ حسن نے جھنجھلا کر پوچھا ــــ "کیا ہو تم؟ اگر تم حقیقت میں لڑکی ہی ہو تو کس کی بیٹی ہو؟ ــــ تم آبرو باختہ لڑکی ہو جو برہنہ ایک نوجوان مرد کے سامنے بند کمرے میں بیٹھی رہی ہو"۔

"میری آبرو محفوظ ہے" ــــ لڑکی نے کہا ــــ "اگر میں ایسی ہوتی جیسی تم کہہ رہے ہو تو [illegible]بدالملک ابنِ عطاش جیسا درویش مجھ سے منہ نہ لگاتا۔ میں کنواری ہوں حسن! میری طرف بہت سے ہاتھ بڑھے ہیں، مجھ پر دو جاگیرداروں کے بھی ہاتھ لپکے ہیں۔ میں کسی کے ہاتھ نہیں لگی"۔

"تم کس باپ کی بیٹی ہو؟" ــــ حسن نے پوچھا۔

"میرا باپ [illegible] لڑ رہا [illegible]" ــــ اُس نے ایک طرف اشارہ کر کے کہا ــــ "وہ دیکھو میری بکریاں!"

حسن نے گردن گھما [illegible] دیکھ تو لیں لیکن اس کی دلچسپی لڑکی کے ساتھ تھی۔

"تم میرے سامنے برہنہ [illegible] طرح بیٹھ گئی تھیں؟" ــــ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"اس برگزیدہ آدمی نے حکم دیا تھا جسے ہم پیرو مرشد مانتے ہیں" ــــ لڑکی نے جواب دیا ــــ "میں ان کے حکم کو ٹال نہیں سکتی تھی۔ انہوں نے [illegible] دیا تھا کہ یہ آدمی تجھ پر ہاتھ ڈالے تو مجھے آواز دینا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کواڑ [illegible] کے سوراخ سے دیکھتے رہیں گے"۔

"کیا اب بھی تم میرا امتحان لینے آئی ہو؟" ــــ حسن نے پوچھا۔

"نہیں!" ــــ لڑکی نے جواب دیا ــــ "اب اپنے دل کے کہنے پر آئی [illegible] تمہارے لئے آئی ہوں ..... اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میں تمہارے ساتھ جسموں کا لین دین کر[illegible] نہیں آئی۔ اگر تم قبول کر لو تو اپنے دل میں جگہ دے دو، پھر ہم ساری عمر کا ساتھ نبھائیں [illegible]..... تم تو بولتے ہی نہیں۔ کچھ کہو نا!"

لڑکی کا حسن ایسا تھا کہ حسن بن صباح جیسے کردار کا نوجوان کہہ ہی نہیں کہ وہ اسے دل میں جگہ نہیں دے گا لیکن اُس کے دل پر اُس کے استاد عبدالملک ابن عطاش کا قبضہ تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس کا دل اپنے اختیار میں نہیں۔ اس کے ساتھ ہی اُسے یہ ڈر تھا کہ یہ بھی امتحان ہے۔ اُس نے اس امتحان میں پورا اترنے کا تہیہ کر لیا۔

وہ پتھر پر بیٹھا تھا۔ لڑکی زمین پر بیٹھ گئی اور ہاتھ اُس کے زانو پر رکھ دیئے پھر اُس نے اپنی ٹھوڑی بھی اُس کے ایک زانو پر رکھ دی۔ لڑکی کے سر پر سیاہ چادر تھی۔ اس میں اُس کا گورا چہرہ اور ایک گال پر لہراتے دو تین بال جو ریشم کے تاروں جیسے تھے، حسن جیسے نوجوان کو اس لڑکی کے قدموں میں بٹھا سکتے تھے۔

"تمہارا نام؟" ــــ حسن نے پوچھا۔

"فرح!" ــــ لڑکی نے جواب دیا ــــ "نام تو فرحت ہے، گھر والے فرح کہتے ہیں، سہیلیاں فرحی کہتی ہیں۔ تم بھی فرحی کہو تو مجھے اچھا لگے گا"۔

"ایک بات بتاؤ" ــــ حسن نے پوچھا ــــ "تمہیں مجھ میں کیا خوبی نظر آئی ہے کہ جاگیرداروں کو ٹھکرا کر تم میرے پاس چلی آئی ہو؟"

"یہ میرے دل کا معاملہ ہے" ــــ لڑکی نے کہا ــــ "جاگیرداروں نے تو میرے باپ کو دولت پیش کی تھی۔ میرا باپ ہے تو گڈریا لیکن عزت اور غیرت والا آدمی ہے۔ ایک بات اور بھی ہے۔ میرے باپ نے امام سے بات کی تھی"۔

"امام کون؟"

"وہ جو تمہارے استاد ہیں" ــــ لڑکی نے جواب دیا ــــ "عبدالملک ابنِ عطاش..... انہوں نے کہا تھا کہ اس لڑکی کو ضائع نہ کر دینا اور دولت کی چمک سے اندھے ہو کر اس کا ہاتھ کسی امیر کبیر کے ہاتھ میں نہ دے دینا۔ اس لڑکی کی زندگی کا راستہ کوئی اور ہے..... میں امام کے گھر جاتی رہتی ہوں۔ انہوں نے مجھے کہا ہے اپنی عصمت کو پاک رکھنا اور اپنا جسم صرف اپنے خاوند کو پیش کرنا..... میں تمہیں اپنا خاوند بنانا چاہتی ہوں"۔

"میں نے پوچھا تھا کہ تم نے مجھ میں کیا خوبی دیکھی ہے؟"

"میں نے کہا تھا کہ یہ میرے دل کا معاملہ ہے" ــــ لڑکی نے جواب دیا ــــ "تم میں وہ مردانگی ہے جو مجھے اچھی لگی ہے۔ میں اتنی دیر تمہارے سامنے برہنہ بیٹھی رہی اور تم نے میری طرف دیکھا تک نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بڑے مضبوط مرد ہو اور دلوں کی محبت کا مطلب سمجھتے ہو"۔

فرحی معصوم سی لڑکی تھی اور ایک گڈریئے کی بیٹی تھی۔ وہ عالم اور فلسفی نہیں تھی کہ تجزیہ کر کے بتا سکتی کہ وہ حسن کی محبت میں کیوں گرفتار ہوئی ہے۔ اُس نے ایسے انداز سے حسن کو اپنی محبت و وفا کا یقین دلایا کہ حسن نے اُس کی محبت کو قبول کر لیا۔

"فرحی!" — حسن نے کہا — "تم میرے دل پر غالب آگئی ہو لیکن میں اپنے بزرگ استاد سے اجازت لے کر تمہیں جواب دوں گا"۔

"کل یہاں آؤ گے؟" — فرحی نے پوچھا۔

"آجاؤں گا" — حسن نے جواب دیا۔

فرحی چلی گئی۔

○

ابو مُسلم رازی رے کا حاکم تھا۔ رے ایران کا بہت بڑا شہر تھا۔ تجارتی مرکز تھا اور اتنا زیادہ پھیل گیا تھا کہ اس کی وسعت صوبے جیسی ہو گئی تھی۔ اتنے وسیع و عریض شہر کے لئے بڑے ہی دانشمند اور قابل حاکم کی ضرورت تھی۔ ابو مسلم رازی میں یہ تمام صلاحیتیں موجود تھیں۔ بعض تاریخوں میں اسے رے کا سلطان لکھا گیا ہے۔ یہ صحیح نہیں' البتہ یہ صحیح ہے کہ اسے تقریباً" سلطان کے اختیارات حاصل تھے' یعنی وہ سلطان سے اجازت لئے بغیر انتہائی اہم فیصلے کر سکتا تھا۔ کٹر اہلِ سنت والجماعت تھا۔

داستان گو یہ بتانا ضروری سمجھتا ہے کہ حسن بن صباح کی زندگی بڑی ہی پُر اسرار تھی۔ جنت بنانے تک اُس کی زیادہ تر سرگرمیاں زمین دوز رہی ہیں۔ وہ کس طرح ایسی شخصیت بنا کہ اُس کے پیرو کاروں کا حلقہ پھیلتا ہی چلا گیا؟ یہ ایسا سوال ہے جس کا جواب قلمبند کرنا آسان نہیں۔ یہ اُس کی پس پردہ جدوجہد تھی جس میں مورخوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ مثلاً" کسی واقعہ میں بعض نے لکھا کہ اُس وقت حسن کی عمر اتنی تھی لیکن بعض نے کچھ اور ہی عمر لکھی۔ بعض شخصیات اور کرداروں کے ناموں میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔

ہماری تاریخ کا یہ پہلو بھی قابلِ غور ہے کہ اسلام میں فرقہ بندی جڑ پکڑ چکی ہے۔ تاریخ ہر فرقے کے تاریخ نویسوں نے لکھی جس سے تاریخ کے ساتھ یہ زیادتی ہوئی کہ لکھنے والوں نے اپنے اپنے فرقے کے نظریات' مغالطات اور تعصبات کو سامنے رکھا اور واقعات کو مسخ کر ڈالا۔

جب ایک ہی واقعہ مختلف تاریخوں میں مختلف شکلوں میں نظر آتا ہے تو ہمیں تمام تر پس منظر کو غور سے دیکھ کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اصل واقعہ کیا تھا۔ یہ امر کتنا افسوسناک ہے کہ مسلمانوں نے فرقوں میں تقسیم ہو کر اپنی تاریخ کو بھی فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

رات کا پہلا پہر تھا۔ حسن بن صباح اپنے استاد عبدالملک ابنِ عطاش کے ہاں بیٹھا تھا اور اُسے سنا رہا تھا کہ فرحی اُسے ملی تھی اور اُس نے کیا کہا تھا۔

"ایسی ہی ایک لڑکی نے تیری زندگی میں داخل ہونا تھا" — ابنِ عطاش نے کہا — "لیکن ابھی تیری شادی نہیں ہو گی۔ اُس نے کہہ دیا ہے کہ وہ تجھے چاہتی ہے تو وہ تجھے ہی چاہتی رہے گی۔ کوئی اُس کے آگے دولت کے ڈھیر لگا دے گا تو وہ قبول نہیں کرے گی۔ وہ ہمیشہ تمہاری رہے گی"۔

"لیکن محترم اتالیق!" — حسن نے کہا — "کوئی شاہی جاگیردار اُسے اغوا نہ کرا لے"۔

"نہیں!" — ابنِ عطاش نے کہا — "اُسے کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ میں نے اس کے گرد حصار کھینچ دیا ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی جابر اور کتنا ہی بڑا حاکم کیوں نہ ہو' فرحی کو بُری نیت سے پھانسنے کی کوشش کرے گا تو منہ کی کھائے گا"۔

"میں تو سمجھا تھا کہ آپ نے میرا امتحان لینے کے لئے اُسے میرے پاس بھیجا ہے" — حسن نے کہا۔

"نہیں!" — ابنِ عطاش نے کہا — "یہ کوئی امتحان نہ تھا لیکن یہ بات دماغ میں رکھ لے حسن! خوبصورت عورت مرد کے لئے بہت بڑا امتحان ہوتی ہے۔ میں تجھے یہ سبق دے چکا ہوں۔ فرحی جیسی حسین لڑکی تجھ پر اپنا نشہ طاری کر کے تیری کھال بھی اتار سکتی ہے۔ آگے چل کر میں تجھے بتاؤں گا کہ دوسروں کو پھانسنے کے لئے عورت کو جال میں دانے کے طور پر کس طرح استعمال کیا جاتا ہے"۔

"تو کیا میں فرحی سے مل سکتا ہوں؟"

"ہاں!" — ابنِ عطاش نے جواب دیا — "تو اُسے مل سکتا ہے۔ تو اُس کے ساتھ پیار محبت کی باتیں کر سکتا ہے' اور تیرا امتحان ہو گا کہ تو گناہ سے دامن بچا کر رکھنے کے قابل ہو جائے"۔

"کیا آپ مجھے پارسا بنائیں گے؟"

"نہیں!" — ابنِ عطاش نے کہا — "ابھی ایسے سوال مت پوچھ۔ میں ابھی تجھے اندر اور باہر سے مضبوط کر رہا ہوں.... اب اپنے گھر چلا جا۔ میں تجھے پھر کہتا ہوں کہ کسی کو نہیں بتانا کہ میں تجھے کیسی تعلیم اور کیسی تربیت دے رہا ہوں۔ میں آج تجھے کوئی اور سبق نہیں دوں گا" کچھ لوگ آ رہے ہیں"۔

حسن بن صباح اپنے استاد کے گھر سے نکل رہا تھا کہ چار آدمی حویلی میں داخل ہوئے۔

○

عبدالملک ابنِ عطاش انہی آدمیوں کے انتظار میں تھا۔

"کیا یہی وہ لڑکا ہے جسے آپ تیار کر رہے ہیں؟" — ایک آدمی نے پوچھا — "ہم نے اسے باہر نکلتے دیکھا ہے"۔

"ہاں!" — ابنِ عطاش نے جواب دیا — "یہی ہے"۔

"کیا یہ ہمارے محاذ اور مقصد کے لئے تیار ہو جائے گا؟" — اسی آدمی نے پوچھا۔

"مجھے پوری امید ہے" — ابنِ عطاش نے جواب دیا — "میں نے تمہیں پہلے بتایا ہے کہ اس نوجوان میں جس کا نام حسن بن صباح ہے میں نے ایسے جوہر دیکھے ہیں جو شاذ و نادر ہی کسی آدمی میں پائے جاتے ہیں۔ ایسی صلاحیتوں اور ایسے اوصاف والا انسان اللہ کا برگزیدہ اور لوگوں کا مُرشد بنتا ہے یا مجسّم ابلیس بن جاتا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ لوگوں میں مقبولیت حاصل کرتا ہے۔ مقبولیت بھی ایسی کہ اُس کے مرید اور معتقد اُس کے اشاروں پر ناچتے بلکہ اُس کے اشارے پر جان تک قربان کر دیتے ہیں"۔

"یہ لڑکا کس طرف جاتا نظر آتا ہے؟"

"میں ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا" — ابنِ عطاش نے جواب دیا — "مجھے شک ہے کہ اس میں ابلیسی اوصاف کچھ زیادہ ہیں۔ اگر یہ اس راستے پر چل نکلا تو بھی ہمارے لئے سود مند ہوگا۔ رہے گا میرے قبضے میں ہی۔ میں اس کو روحانی تقویت دے رہا ہوں"۔

"کیا ہمیں تبلیغ کا کام تیز نہیں کر دینا چاہئے؟"

"تبلیغ تو ہو رہی ہے" — ابنِ عطاش نے جواب دیا — "لیکن ہم یہ کام آزادی سے

نہیں کر سکتے کیونکہ حکومت اہلِ سُنّت کی ہے اور آبادی کی اکثریت بھی سُنّی ہے۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں ہماری تبلیغ دیہات میں زیادہ ہونی چاہئے۔ وہاں پکڑے جانے کا خطرہ کم ہے"۔

"ہم نے دیہاتی علاقوں میں اپنے عقیدے کی تبلیغ کے لئے مبلغ بھیجنے شروع کر دیئے ہیں" — ایک آدمی نے کہا۔

"صرف تبلیغ کافی نہیں" — ابنِ عطاش نے کہا — "حکومت اپنے ہاتھ میں آنی چاہئے۔ حکومت ہاتھ آجائے تو ہم سُنّی مسلک کو آسانی سے ختم کر کے لوگوں کو بتا سکتے ہیں کہ اصل اسلام ہمارے پاس ہے.... لیکن حکومت آسانی سے ہاتھ نہیں آئے گی۔ ہمیں مصر کے عبیدیوں کی مدد حاصل کرنی پڑے گی"۔

"میں ایک شک میں پڑ گیا ہوں" — ایک اور بولا — "مصر کے حکمران تو عبیدی ہی ہیں لیکن سنا ہے وہ باطنی ہیں"۔

"نہیں!" — ابنِ عطاش نے کہا — "وہ پکے اسماعیلی ہیں اور وہ ہماری مدد کو ضرور آئیں گے۔ میں انہیں سلجوقی سلطنت پر حملے کے لئے اکساؤں گا لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ اِدھر ہمارے لوگ تیار ہوں لیکن یہ تیاری پوشیدہ رہے۔ مصری حملہ آور آئیں اور ہمارے لوگ ہتھیار بند ہو کر ان سے جا ملیں۔ اتنی تیاری کے لئے بہت وقت چاہئے"۔

اسی شہر رے کے حاکم ابو مسلم رازی کے پاس دو سپہ سالار بیٹھے تھے۔ دو آدمی اور بھی تھے جو فوجی نہیں لگتے تھے۔ یہ دونوں جاسوسی اور مخبری کے محکمے کے حاکم تھے۔

"....اپنے مخبروں کو اور تیز کرو" — ابو مسلم رازی نے کہا — "میں تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ شہر سعدؓ بن ابی وقاص نے فتح کیا تھا اور آتش پرست ایرانیوں کو اٹھنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ سلطنتِ کسریٰ کے تابوت میں آخری کیل یہیں ٹھونکی گئی تھی۔ ان اوّلین مجاہدین نے یہاں اسلام کا نور پھیلایا تھا۔ ان کی قبروں کے کہیں نشان نہیں ملتے لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ ان کی ہڈیاں یہیں دفن ہیں جنہوں نے اللہ کی راہ میں جانیں قربان کی تھیں۔ ان کی روحیں یہیں ہیں۔ ہمیں دیکھ رہی ہیں اور یقیناً بے چین ہوں گی کہ اُمّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا ہو گیا ہے کہ فرقوں میں بٹ گئی ہے۔

"میرے رفیقو! میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا اور یہ بات معمولی سے دماغ کا آدمی بھی سمجھ

سکتا ہے کہ ملّت میں اتحاد تھا تو مجاہدین نے تھوڑی سی تعداد میں دنیا کی اُس وقت کی دو سب سے بڑی جنگی طاقتوں، قیصرِ روم اور کسریٰ فارس، کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا مگر آج وہی ملّت فرقوں میں بٹ کر خانہ جنگی کے خطرے میں آن پڑی ہے۔ اس کا فائدہ اسلام اور سلطنتِ اسلامیہ کے دشمنوں کو پہنچے گا"۔

"ہمیں مصر کی طرف سے چوکنا رہنے چاہئے" ــــ جاسوسی نظام کے ایک حاکم نے کہا ــــ "وہاں کے حکمران اسماعیلی کہلاتے ہیں لیکن ہماری اطلاع یہ ہے کہ وہ فرقہ باطنیہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اسماعیلیوں کو بدنام کر رہے ہیں۔ خطرہ یہ ہے کہ وہ اسماعیلیوں کو دھوکے میں اپنے ساتھ ملا کر ہم پر حملہ کر سکتے ہیں"۔

"ہاں!" ــــ ابو مسلم رازی نے کہا ــــ "آپ کے جاسوسوں کی تمام اطلاعات میرے سامنے ہیں۔ مصر میں اپنے جاسوسوں کا موجود رہنا بہت ضروری ہے اور یہاں اس شہر کے ہر گھر اور ہر فرد پر نظر رکھیں۔ اسلام کی وحدت کو پیشِ نظر رکھیں۔ قرآن کے اس فرمان کو اپنی حکومت کا بنیادی اصول بنائیں کہ اُمّتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جماعت ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی تھے۔ آپ کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ یہ فرقے بعد میں پیدا ہوئے اور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ نبیوں نے نہیں عام قسم کے انسانوں نے بنائے ہیں اور یہ اس اسلام کے منافی ہیں جس کے ہم پیروکار ہیں۔ اصل اسلام وہ ہے جو اللہ کے آخری رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چھوڑ گئے تھے۔ یہاں کسی کے متعلق پتہ چلے کہ وہ فرقہ بندی کو ہوا دے رہا ہے تو مجھے اطلاع دو۔ میں اُسے ساری عمر کے لئے قید خانے میں ڈال دوں گا"۔

○

وقت گذرتا چلا گیا۔ عبدالملک ابنِ عطاش نے حسن بن صباح کی تربیت جاری رکھی۔

حسن بھی بڑا خوبصورت جوان نکلا۔ عیّاری اور فریب کارانہ اداکاری میں تو اُس نے مہارت حاصل کر لی۔ فرحی کے ساتھ اُس کی ملاقاتیں جاری رہیں۔ فرحی غیر معمولی طور پر دلیر لڑکی نکلی جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اُسے ابنِ عطاش کی حوصلہ افزائی حاصل تھی۔ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ اپنے پورے خاندان کے ساتھ ابنِ عطاش کی مرید تھی اور اُس کی ہر بات کو فرحی آسمان سے اُتری ہوئی بات سمجھتی تھی۔ ابنِ عطاش نے اُسے کہہ دیا تھا کہ اُس کی زندگی کا ساتھی حسن بن صباح ہے۔

حسن بن صباح پر پہلے جو خوف سا طاری رہتا تھا وہ اب ختم ہو چکا تھا۔ اُسے ابنِ عطاش نے کئی بار آدھی رات کے وقت قبرستان میں بھیجا تھا۔ ہر بار وہ حسن کو مُردے کی کوئی نہ کوئی ہڈی لانے کو کہتا تھا یا قبرستان میں بیٹھ کر کوئی عمل کرنا ہوتا تھا۔

ایک رات حسن قبرستان میں دو پرانی قبروں کے درمیان بیٹھا کوئی عمل کر رہا تھا۔ اُس رات بھی چاند پورا تھا۔ وہ اپنے عمل میں محو تھا کہ اُس کے قریب "سی سی" کی آوازیں اٹھیں۔ اُس نے ذہن کو ایک مقام پر کرنے اور دنیا سے لاتعلق ہو جانے کی اس قدر مہارت حاصل کر لی تھی کہ اُسے جیسے یہ آواز سنائی ہی نہ دی ہو۔ اُس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔

اس نے اپنے عمل کے مطابق آنکھیں کھولیں تو وہ چونک پڑا۔ اُس سے صرف دو قدم کے فاصلے پر اُس کے سامنے سیاہ کالا ایک ناگ پھن پھیلائے ہوئے "سی سی" کر رہا تھا۔ استاد نے اُسے بتا رکھا تھا کہ قبرستان میں سانپ ہوتے ہیں۔ اگر کبھی سانپ سے آمنا سامنا ہو جائے تو وہ بے حس ہو جائے۔ کوئی حرکت نہ کرے۔ اس سے سانپ کو یہ تاثر ملے گا کہ یہ کوئی بے جان چیز ہے جس سے اُسے کوئی خطرہ نہیں۔ پھر سانپ چلا جائے گا۔

حسن بن صباح نے ناگ کو دیکھا تو پتھر مار کر اُسے بھگانے کی بجائے بیٹھا رہا اور انگلی تک نہ ہلائی۔ ناگ اُسے دیکھتا رہا اور اس کا پھن دائیں بائیں جھولتا رہا۔ حسن نے ننگی تلوار زمین میں گاڑ رکھی تھی۔ اُس نے تلوار کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔ اُس کے دل میں خوف آنے لگا لیکن اُس نے ہوش ٹھکانے رکھے۔

ناگ ذرا سا آگے آیا۔ حسن کے لئے اپنے آپ پر قابو پانا محال ہو گیا۔ اُس کے لئے دو ہی صورتیں تھیں۔ ایک یہ کہ اٹھ کر بھاگ جائے، دوسری یہ کہ تیزی سے زمین سے تلوار اکھاڑے اور ناگ کو مارے لیکن ناگ نے اپنا پھن لپیٹا اور پیچھے کو مڑ کر چلا گیا۔ حسن نے اپنا عمل مکمل کیا اور گھر چلا گیا۔

○

اگلی صبح عبدالملک ابن عطاش کے ہاں گیا۔ پہلے اُسے بتایا کہ اُس نے عمل مکمل کر لیا ہے پھر بتایا کہ ایک ناگ اُس کے سامنے آ گیا تھا۔ اُس نے تفصیل سے سنایا کہ ناگ کس طرح آیا

اور کس طرح گیا۔

"سانپ سانپ کو نہیں ڈسا کرتا" ___ ابنِ عطاش نے کہا۔ "میری بات سمجھ۔۔!"

میں تجھے اسی مقام پر لانا چاہتا تھا۔ تو اپنی منزل کے آدھے راستے تک پہنچ گیا ہے۔ اب منزل تک تجھے کوئی اور پہنچائے گا۔ میری استادی یہاں پر ختم ہو جاتی ہے"۔

"تو کیا مجھے کوئی اور استاد ڈھونڈنا پڑے گا؟" ___ حسن نے پوچھا ___ "یا آپ مجھے کسی کے پاس بھیجیں گے؟"

"اس سوال کا جواب تجھے خواب میں ملے گا" ___ ابنِ عطاش نے جواب دیا ___ "گزشتہ رات کا عمل جو تجھ سے کروایا ہے، وہ کوئی معمولی عمل نہیں۔ ناگ کا تمہارے پاس آنا اور تجھے ڈسے بغیر چلے جانا اس عمل کی کامیابی کا ثبوت ہے۔ اگر تو بھاگ آتا یا ناگ تجھے ڈس لیتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ تو نے عمل صحیح نہیں کیا یا عمل کسی اور وجہ سے ناکام ہو گیا ہے۔ پانچ سات دنوں کے اندر تو خواب میں کچھ دیکھے گا۔ وہ ایک راستہ ہو گا جو بہت ہی دشوار گزار ہو سکتا ہے اور بالکل آسان بھی۔۔۔

"میری دعا ہے کہ تجھے راستہ دشوار نظر آئے۔ سکھ، دکھوں میں سے گزر کر ہی ملتا ہے۔ دولت آسانی سے ہاتھ آجائے تو انسان کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ خون پسینہ بہا کر اور محنت مشقت سے اپنی ہڈیاں تڑوا کر پیسہ پیسہ اکٹھا کیا جائے تو انسان اس پیسے کی قدر کرتا ہے۔ اگر گلاب کے پھول کے ساتھ کانٹے نہ ہوں تو اس پھول کی قدر و قیمت ختم ہو جائے۔۔۔

"گزشتہ رات کے عمل نے تیرے دل و دماغ پر ایسا اثر چھوڑ دیا ہے کہ تو ایک خواب دیکھے گا۔ تو کہیں جا رہا ہو گا۔ اس راستے کو ذہن میں محفوظ کر لینا۔ جونہی آنکھ کھلے کاغذ قلم لے کر یہ راستہ اور اس کے اشارے کاغذ پر اتار لینا۔ ہو سکتا ہے خواب میں تمہیں دو پہاڑوں کے درمیان ایک وادی نظر آئے۔ ایک غار بھی نظر آئے گا۔ اسے ذہن میں محفوظ کر لینا"۔

"محترم اتالیق!" ___ حسن نے پوچھا ___ "کیا یہ خدائی اشارہ ہو گا؟"

عبدالملک ابنِ عطاش نے سر جھکا لیا اور کچھ دیر کچھ بھی نہ بولا۔ معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے شاگرد کے اس سوال کا جواب نہ دینا چاہتا ہو۔ اُس نے آخر سر اٹھایا اور نظریں اپنے شاگرد کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔

"اگر یہ کوئی راز کی بات ہے تو نہ بتائیں محترم اتالیق!" ___ حسن نے کہا۔

"ہاں حسن!" ___ ابنِ عطاش نے کہا ___ "بات راز کی ہی ہے لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ یہ راز بھی تجھے دے دوں۔ تو اس قابل ہو گیا ہے کہ ہر راز کو اپنے سینے میں محفوظ رکھ سکتا ہے۔۔۔

"میں نے آج تک تجھے جو سبق دیئے ہیں اور جو عمل کروائے ہیں اور گزشتہ رات کا جو عمل تھا، یہ خدائی عمل نہیں۔ یہ ابلیسی علم ہے۔ اس سے تجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔۔۔ کیا تو اپنے آپ میں روحانی سکون محسوس نہیں کر رہا؟"

"ہاں محترم اتالیق!" ___ حسن نے جواب دیا ___ "میں آپ کو بتانا یہ چاہتا تھا کہ میں اپنے آپ میں ایسا سکون محسوس کرتا ہوں جیسے میں فضا میں اُڑ رہا ہوں، اور اس کے ساتھ ہی میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ میرے وجود میں ایک طاقت آگئی ہے جو چٹانوں کے بھی جگر چاک کر سکتی ہے"۔

"میں تجھے بتاتا ہوں" ___ ابنِ عطاش نے کہا ___ "تیرے اندر ایسے اوصاف غالب تھے جو ایسے ہی عملیات سے تجھے سکون اور طاقت دے سکتے تھے۔ یہ سب ابلیسی عملیات ہیں جنہیں اسلام نے گناہ قرار دیا ہے۔ یہ علم فرعونوں کے زمانے میں بھی تھا اور پھر اس علم کو یہودیوں نے اپنا لیا اور اس میں شہرت حاصل کی۔۔۔ تو نے ایک بار کہا تھا کہ تو فرعون بننا چاہتا ہے۔ میں نے تیرے اندر اتنی طاقت پیدا کر دی ہے کہ تو اس غار تک پہنچے گا جو تجھے خواب میں نظر آئے گا۔ وہاں تیرا یہ علم مکمل ہو جائے گا۔ اب یہ مت سوچ کہ یہ علم خدائی ہے یا ابلیسی"۔

یہ سحر کا علم تھا جسے آجکل کالا جادو کہا جاتا ہے۔ ابنِ عطاش اس علم میں جتنی دسترس رکھتا تھا وہ اُس نے حسن کے دماغ میں ڈال دیا تھا۔ اس دوران وہ حسن کو علمِ نجوم بھی پڑھاتا رہا تھا۔

تیسرے چوتھے دن حسن بن صباح ایک کاغذ اٹھائے اپنے استاد کے ہاں دوڑا گیا اور کاغذ اُس کے آگے رکھ کر کہا کہ میں نے خواب میں یہ راستہ دیکھا ہے۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ یہ راستہ اگر خواب جیسا ہی ہے تو بہت ہی خوفناک ہے۔ وہاں تک زندہ پہنچنا مشکوک نظر آتا ہے۔

"میں جانتا ہوں" ___ ابنِ عطاش نے کہا ___ "اگر تو نے یہ سفر بخیر و خوبی کر لیا تو سمجھ لے کہ تو نے ساری دنیا فتح کر لی۔ کل اُس وقت نکل جا جب تجھے فجر کی اذان سنائی دے"۔

اگلے روز جب سورج افق سے ابھرا تو شہر سے کوسوں دور دو گھوڑے جا رہے تھے۔ ایک پر حسن بن صباح سوار تھا اور دوسرے گھوڑے پر فرحی سوار تھی۔ گزشتہ روز جب وہ فرحی سے ملا تو اُس نے فرحی کو بتایا کہ وہ کس سفر پر روانہ ہو رہا ہے۔ فرحی نے کہا کہ وہ بھی ساتھ جائے گی۔ حسن نے اُسے روکنے کے لئے بہت کچھ کہا لیکن فرحی نہ مانی۔ وہ تو اُس کے پیچھے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔

"میری زندگی تمہارے ساتھ ہے حسن!" —— فرحی نے کہا تھا —— "میں پیچھے رہ گئی تو کسی جاگیردار یا کسی امیر وزیر کے ہاتھ چڑھ جاؤں گی۔ امام عبدالملک کب تک میری حفاظت کریں گے۔ تم جس سفر پر جا رہے ہو' یہ بڑا خطرناک ہے۔ معلوم نہیں زندہ لوٹ سکو گے یا نہیں۔ میں تمہارے ساتھ جینا اور تمہارے ساتھ مرنا چاہتی ہوں۔ اگر تم ساتھ نہیں لے چلو گے تو میں تمہارے پیچھے پیچھے آجاؤں گی۔ اس شہر میں نہیں رہوں گی"۔

حسن بن صباح اتنا مجبور ہو گیا کہ وہ فرحی کو روک نہ سکا۔ حسن تو اپنے گھر والوں کو بتا کر گھر سے نکلا تھا۔ اُسے اُس کے باپ نے خود ہی عبدالملک ابنِ عطاش کی شاگردی میں بٹھلایا تھا لیکن فرحی گھر والوں کو بتائے بغیر نکلی تھی۔ وہ اُس وقت جاگ اٹھی تھی جب گھر والے گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ گھوڑا اُس کے ایک بھائی کا تھا۔ وہ اندھیرے میں ہی گھر سے نکل آئی تھی۔ وہ جس قدر خوبصورت تھی اس سے کہیں زیادہ مضبوط حوصلے والی تھی۔ حسن ابھی شہر سے تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ فرحی اس سے جا ملی۔

حسن کے ذہن میں خواب کی باریک سے باریک تفصیل بھی محفوظ تھی اور اس کے پاس کاغذ بھی تھا جس پر اُس نے اشارے لکھ لئے تھے۔ اگر یہ کوئی سیدھا راستہ ہوتا تو وہ بہت ہی دور نکل گئے ہوتے لیکن یہ کوئی باقاعدہ راستہ نہیں تھا۔ جنگل تھا کہیں بنجر علاقہ تھا اور پھر پتھریلا علاقہ شروع ہو گیا۔ پہلے ایک ندی آئی جو اتنی گہری نہیں تھی۔ ان کے گھوڑے اس میں سے گذر گئے لیکن آگے جو ندی آئی وہ خاصی گہری تھی اور پانی کا بہاؤ بھی خاصا تیز تھا۔ حسن نے راستے والا کاغذ ایک ہاتھ میں لے کر ہاتھ اونچا کر لیا تاکہ یہ بھیگ نہ جائے اور انہوں نے گھوڑے ندی میں ڈال دیئے۔ چونکہ بہاؤ تیز تھا اس لئے گھوڑے سیدھے جانے کی بجائے بہاؤ کے ساتھ بہتے

گئے اور خاصی دور جا کر کنارے پر چڑھے۔

حسن نے ذہن پر زور دیا اور دیکھنے لگا کہ وہ نشانیاں کہاں ہیں جو اسے خواب میں نظر آئی تھیں۔ اس نے کاغذ سے بھی مدد لی اور آگے بڑھنے لگے۔ آگے علاقہ چٹانی تھا۔ اونچی نیچی چٹانیں بے آب و گیاہ تھیں۔ ان میں بعض نوکیلی اور بعض اوپر سے چپٹی تھیں۔ بعض کا رنگ سلیٹی اور بعض کوئلے کی طرح سیاہ تھیں۔ حسن دو چٹانوں کے درمیان چلا گیا۔ تھوڑی ہی دور جا کر یہ راستہ ایک طرف کو جاتا تھا۔ وہ اُدھر مڑا تو اُسے بائیں کو مڑنا پڑا۔ اس طرح اسے چٹانوں نے کبھی دائیں کبھی بائیں اتنا زیادہ موڑا کہ وہ بھول ہی گیا کہ اُسے کس سمت کو جانا ہے اور وہ ان بھول بھلیوں میں کس طرف سے داخل ہوا تھا۔

اُس نے سورج سے سمت معلوم کر لی لیکن یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ آگے بڑھ رہا ہے یا ایک ہی جگہ پر گھوم رہا ہے یا پیچھے کو جا رہا ہے۔ سورج اپنے روز مرہ سفر پر چلا جا رہا تھا اور افق سے تھوڑی ہی دور رہ گیا تھا۔ حسن پریشان ہو گیا۔ اُسے شام گہری ہونے سے پہلے پہلے وہاں سے نکلنا تھا۔ اُس نے گھوڑے کی رفتار اور تیز کر لی۔

"معلوم ہوتا ہے تم خواب والا راستہ بھول گئے ہو" —— فرحی نے کہا۔

"میں خواب میں بھی اسی طرح ان بھول بھلیوں میں گھومتا رہا تھا" —— حسن نے کہا —— "راستہ مل جائے گا"۔

ان چٹانی بھول بھلیوں میں گھومتے پھرتے اُسے ایک ایسی چٹان نظر آئی جو اوپر سے آگے کو جھکی ہوئی تھی۔ یہ قدرت کا ایک شاہکار تھا۔ یہ بغیر ستونوں کے برآمدے جیسی تھی۔ وہاں پہنچ کر حسن نے گھوڑا روک لیا اور فرحی سے کہا کہ کچھ دیر آرام کر لیا جائے۔

دونوں گھوڑوں سے اُتر آئے اور برآمدے کی چھت جیسی چٹان کے نیچے بیٹھ گئے۔ یہ کوئی غار تو نہیں تھا لیکن چٹان اندر سے ایک وسیع کھوہ جیسی ہو گئی تھی۔ اس کا فرش زمین کی سطح سے گز ڈیڑھ گز نیچے تھا۔ حسن تو بیٹھ گیا لیکن فرحی کھوہ میں دیکھنے لگی۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ رات گذارنی پڑی تو یہیں گذاریں گے۔ اس کے ساتھ ہی اُس کی ہلکی سی چیخ سنائی دی۔

حسن تیزی سے اٹھا اور فرحی تک پہنچا۔

"نیچے دیکھو حسن!" —— فرحی نے کہا۔

حسن نے نیچے دیکھا۔ انسانی ہڈیوں کے دو پنجر پڑے تھے۔ ان کے کپڑوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ ہڈیاں بالکل خشک ہو چکی تھیں۔ ایک پنجر مرد کا تھا اور دوسرا عورت کا۔ عورت کی نشانی بڑی صاف تھی۔ اس کے لمبے لمبے بال کھوپڑی کے قریب ہی پڑے تھے۔ دونوں اس پوزیشن میں نہیں تھے جس طرح لاش کو قبر میں سیدھا رکھا جاتا ہے۔

حسن کُود کر نیچے چلا گیا۔ اُس نے مرد کی پسلیوں میں دیکھا وہاں ایک خنجر پڑا ہُوا تھا۔ جن دو پسلیوں کے درمیان یہ خنجر پھنسا ہُوا تھا' وہاں سے دونوں پسلیاں تھوڑی تھوڑی کٹی ہوئی تھیں۔ ایک تلوار دونوں ڈھانچوں کے قریب پڑی تھی۔

"معلوم نہیں یہ کون تھے" —— فرحی نے کہا۔

"کوئی ہم جیسے ہی ہوں گے" —— حسن نے کہا —— "لیکن یہ کچھ اور معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ اس آدمی کو سینے میں خنجر مار کر مارا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے عورت کو اس تلوار سے مارا گیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ہماری طرح ان بھول بھلیوں میں پھنس گئے ہوں اور یہاں رات گزارنے کے لئے رک گئے ہوں۔ میرا خیال ہے کہ یہ بھوک اور پیاس سے مرے تھے۔ ان کے پاس پانی نہیں تھا۔ ہوتا تو یہاں مشکیزہ پڑا ہوتا"۔

"حسن!" —— فرحی نے کہا —— "میں کبھی ڈری نہیں لیکن میں دل پر خوف کی گرفت محسوس کر رہی ہوں۔ ہم یہاں نہیں رکیں گے"۔

"پھر ہمیں یہاں سے جلدی چل پڑنا چاہیے" —— حسن نے کہا۔

دونوں گھوڑوں پر سوار ہوئے اور دو چٹانوں کے درمیان چلنے لگے۔ یہ تنگ سا راستہ انہیں ایسی جگہ لے گیا جہاں چٹانیں پیچھے رہ گئی تھیں اور ذرا کھلا میدان تھا۔ تین اطراف چٹانیں تھیں۔ چوتھی طرف کی چٹان کے درمیان تھوڑا سا راستہ تھا۔ حسن اُس طرف ہو لیا۔

دونوں گھوڑے پہلو بہ پہلو چلے جا رہے تھے۔ جب دونوں اس تنگ سے راستے کے قریب گئے تو دونوں گھوڑے اپنے آپ ہی رک گئے۔ پہلے وہ کچھ بے چینی سے اِدھر اُدھر ہونے لگے پھر دونوں گھوڑے کانپنے لگے۔ انہوں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی' باگیں جھٹکیں لیکن گھوڑے کانپتے رہے اور آگے بڑھنے کی بجائے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگے۔

"وہ دیکھو فرحی!" —— حسن نے کہا —— "گھوڑے آگے نہیں بڑھیں گے"۔

فرحی نے دیکھا ان سے دس بارہ قدم دور ویسا ہی ایک کالا ناگ پھن پھیلائے ہوئے تھا جیسا حسن نے قبرستان میں دیکھا تھا۔ یہ گھوڑے کی نفسیات ہے کہ اس کی پیٹھ پر سوار موجود ہو اور وہ اپنے راستے میں سانپ دیکھ لے تو رک کر خوف سے کانپنے لگتا ہے۔ اگر سوار نہ ہو تو گھوڑا سرپٹ بھاگ اٹھتا ہے۔

ناگ تیزی سے گھوڑوں کی طرف آیا۔ حسن نے دیکھا کہ اس کے پیچھے پیچھے ایسا ہی ایک ناگ اور ہے۔ گھوڑوں نے جب ناگوں کو اپنی طرف آتے دیکھا تو فوراً" پیچھے بھاگ اٹھے۔

حسن اور فرحی نے گھوڑوں کو قابو میں رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن گھوڑے قابو میں نہیں آ رہے تھے۔ حسن کا گھوڑا آگے تھا اور اپنے آپ ہی دائیں بائیں مڑتا جا رہا تھا۔ حسن بار بار پیچھے دیکھتا تھا کہ فرحی کتنی دور ہے۔

گھوڑے دوڑتے' ان بھول بھلیوں میں دائیں بائیں مڑتے رہے اور حسن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کا گھوڑا اُس جگہ جا نکلا جہاں سے وہ ان بھول بھلیوں میں داخل ہوئے تھے۔ وہ میدان تھا۔ چٹانیں پیچھے رہ گئی تھیں۔

حسن نے بڑی مشکل سے گھوڑے کو قابو میں کیا اور اسے روک لیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ فرحی کے گھوڑے کو ڈھونڈ رہا تھا۔ اُسے فرحی کا گھوڑا تو نظر آ گیا لیکن فرحی اُس کی پیٹھ پر نہیں تھی۔ حسن نے اس گھوڑے کی طرف اپنا گھوڑا دوڑا دیا اور اس کی لگام پکڑ لی۔ اُس نے فرحی کو آوازیں دیں' بہت پکارا لیکن فرحی کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ حسن آہستہ آہستہ ان چٹانی بھول بھلیوں کی طرف چل پڑا۔ وہ فرحی کو ڈھونڈنے جا رہا تھا۔

حسن بن صباح کے ہوش اُڑ گئے تھے۔ وہ دنیا کو‘ اپنے عزائم کو اور اپنی منزل کو بھول گیا تھا!

وہ ایک بار پھر چٹانوں کی بھول بھلیوں میں داخل ہو گیا اور بڑی ہی بلند آواز سے فرحی کو پکار رہا تھا لیکن چٹانوں سے گذرتی ہوئی تیز ہوا کی سرسراہٹ کے سوا اسے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔

یہیں سے وہ باہر نکلا تھا مگر اب وہ وہیں سے اندر گیا تو اسے وہ جگہ ایسی اجنبی محسوس ہوئی جیسے پہلے کبھی دیکھی ہی نہ ہو۔ ایک چٹان اُس کے سامنے تھی۔ اس کے پہلوؤں سے دو راستے جاتے تھے اور ایک راستہ دائیں کو جاتا تھا۔ حسن بن صباح کو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ وہ ان تینوں میں سے کون سے راستے سے باہر آیا تھا۔

سامنے والی چٹان کا یہ اُدھر والا سرا تھا اور اس کی ڈھلان بڑی آسان تھی۔ حسن بن صباح نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور چٹان پر چڑھ گیا۔ اس نے فرحی کے گھوڑے کی باگ اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ لی تھی۔ اوپر جا کر اس نے ہر طرف نظریں گھمائیں۔ دور دور تک اونچی نیچی چٹانوں کی چوٹیوں کے سوا کچھ اور نظر نہ آیا۔ کچھ چٹانیں اوپر سے چپٹی تھیں اور کچھ ایسی بھی تھیں جو چٹانیں لگتی ہی نہیں تھیں۔ وہ بہت ہی بڑے بڑے بتوں کی مانند تھیں۔ کوئی بت انسانوں جیسا اور کوئی کسی جانور جیسا تھا۔ ایک چٹان ایسی تھی جو مندر کے مینار کی طرح اوپر چلی گئی تھی۔ اس کی چوٹی پر ایک بہت بڑا گول پتھر یوں رکھا ہوا تھا جیسے کسی عورت نے سر پر گھڑا رکھا ہوا ہو۔

یہ سارا منظر اس دنیا کا خطہ لگتا ہی نہیں تھا۔ یہ تو خواب کا منظر تھا۔ یہ خطہ تین میل لمبا چوڑا ہو سکتا تھا اور چار میل بھی۔

”فرحی!“ — حسن بھیپھڑوں کا سارا ہی زور لگا کر پکارنے لگا — ”کہاں ہو فرحی!... فرحی!“

کوئی جواب نہیں... خاموشی!

”وہ دوڑتے گھوڑے سے گر کر بیہوش پڑی ہو گی“ — اس نے اس طرح اونچی آواز میں کہا جیسے اپنے پاس کھڑے کسی آدمی کو بتا رہا ہو۔

اس کے پاس دو گھوڑوں کے سوا کوئی بھی نہیں تھا۔ اسے فرحی تک جلدی پہنچنا تھا۔ ہو سکتا تھا وہ گر کر مر گئی ہو یا مر رہی ہو اور یہ بھی ناممکن نہ تھا کہ وہ گری تو اسے ناگ نے ڈس لیا ہو گا۔

حسن بن صباح کو اپنے استاد عبدالملک ابنِ عطاش کا ایک سبق یاد آ گیا کہ راستہ یاد نہ رہے‘

مسافر کہیں کھو جائے یا کوئی چیز گم ہو جائے تو کیا عمل کیا جائے۔

وہ گھوڑے سے اترا اور نیچے دیکھا۔ چٹان کی ایک سل سلیٹ کی طرح ہموار تھی۔ حسن اکڑوں بیٹھ گیا اور چھوٹا سا ایک پتھر اٹھا لیا۔ ابن عطاش نے اسے مراقبے میں جانے کی بہت مشق کرائی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور دو تین بار لمبے سانس لئے۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور انگلیوں میں پکڑے ہوئے کنکری جیسے پتھر سے سل پر اوٹ پٹانگ سے خانے بنانے لگا۔

ان خانوں کو اس نے غور سے دیکھا اور کسی خانے میں ایک حرف اور کسی میں ایک ہندسہ لکھا۔ ان پر کچھ دیر نظریں جمائے رکھیں اور اٹھ کھڑا ہوا۔ گھوڑے پر سوار ہو کر وہ چٹان سے اترا اور اس چٹان کے ساتھ ساتھ آگے کو چل پڑا۔

○

سورج غروب ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ یہ راستہ کچھ آگے جا کر ایک طرف مڑ گیا۔ تھوڑا آگے جا کر اس راستے کو ایک گول چٹان نے روک لیا تھا اور وہاں دو راہا بن گیا تھا۔ حسن رک گیا اور دونوں راستوں کو دیکھا۔ اس نے گھوڑا روک لیا تھا۔ آنکھیں بند کر کے اس نے کچھ سوچا۔

دائیں طرف اسے ہلکی سی کوئی آہٹ یا آواز سنائی دی۔ اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور ادھر دیکھا۔ کچھ دور ایک نیولہ کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حسن نیولے کو دیکھتا رہا۔ نیولہ ایک طرف دوڑ پڑا۔ حسن گھوڑا اس طرف لے گیا اور وہاں تک چلا گیا جہاں نیولہ کھڑا تھا۔ اس طرف دیکھا جس طرف نیولہ گیا تھا۔

یہ دو چٹانوں کے درمیان بہت ہی تنگ راستہ تھا جو کچھ دور تک چلا گیا تھا لیکن سیدھا نہیں بلکہ کئی ایک گول گول اور کچھ منحنی سی چٹانوں سے گھومتا مڑتا جاتا تھا۔

حسن بن صباح جو فرحی کے لئے پریشان ہو رہا تھا اور اسے پکارتا بھی رہا تھا‘ اب یوں اطمینان سے چلا جا رہا تھا جیسے اسے فرحی مل گئی ہو یا فرحی اس کے دل سے اتر گئی ہو۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نے چٹان پر بیٹھ کر سحر (کالے جادو) کا ایک عمل کیا تھا جس میں اسے واضح اشارہ ملا تھا کہ وہ فرحی تک پہنچ جائے گا لیکن ایسا کوئی اشارہ نہیں ملا تھا کہ فرحی جس جگہ ہے وہاں تک راستہ کون سا جاتا ہے‘ البتہ یہ پتہ چل گیا تھا کہ اسے اشارے ملتے رہیں گے جنہیں سمجھنے کے لئے وہ اپنی

عقل استعمال کرے۔

تاریخ کی یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ حسن بن صباح نے پُراسرار علوم سیکھ لیئے تھے۔
ابن خلدون "تاریخ ابن خلدون" حصہ پنجم میں لکھتا ہے ــــ "علمِ نجوم و سحر میں حسن بن صباح کو ید طولی حاصل تھا" ــــ ابنِ اثیر اور دیگر مؤرخوں نے بھی لکھا ہے کہ حسن بن صباح انتہا درجے کا عیار اور مکار تو تھا ہی' اس نے علم سحر میں بھی خصوصی مہارت حاصل کرلی تھی۔

اس نے ان پراسرار علوم میں اس سفر کے بعد مہارت حاصل کی تھی۔ اس سفر کے دوران اس کے پاس سحر کی اتنی ہی طاقت تھی جو اسے اپنے اتالیق ابن عطاش سے حاصل ہوئی تھی۔ وہ ان علوم کی تکمیل کے لئے ہی جا رہا تھا۔

وہ جا تو رہا تھا لیکن ایسے چٹانی خطے میں پھنس کے رہ گیا تھا جسے وہ کبھی کبھی خواب سمجھتا تھا۔ اس میں بھی شاید کوئی راز تھا کہ اسے بڑے دشوار گذار راستے پر ڈالا گیا تھا۔ اسے اس راستے کا اشارہ خواب میں ملا تھا۔

داستان گو سنا رہا تھا کہ حسن بن صباح ایک تنگ راستے پر عجیب و غریب سی شکلوں کی چٹانوں کی دنیا میں جا رہا تھا کہ پھر ایک مقام آگیا جو دوراہا تھا۔ حسن نے رک کر دونوں راستوں کو دیکھا۔ دونوں راستے تھوڑی دور جا کر مڑ جاتے تھے۔ حسن کبھی ادھر کبھی ادھر دیکھتا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ غیب سے اسے کوئی اشارہ ملے گا لیکن کچھ بھی نہ ہوا' سوائے اس کے کہ وہ جس گھوڑے پر سوار تھا' وہ آہستہ سے ہنہنایا اور کھر مارنے لگا۔ دوسرے گھوڑے نے بھی یہی حرکت کی۔ اس انداز سے گھوڑے کا ہنہنانا اور گھوڑے کا کھر مارنا اس کی بے چینی کا اظہار ہوتا ہے۔

حسن نے قدرے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا کہ گھوڑوں نے پھر سانپ دیکھ لیا ہے لیکن اسے خیال آگیا کہ گھوڑا ڈر کا اظہار کسی اور انداز سے کرتا ہے۔ وہ گھوڑوں کا زمانہ تھا۔ لوگ گھوڑوں کی نفسیات سمجھتے تھے۔ حسن سمجھ گیا کہ گھوڑے بھوکے ہیں۔ شاید پیاسے بھی ہوں۔
گھوڑا اپنے آپ ہی ایک راستے پر چل پڑا۔ حسن نے لگام کھینچ لی لیکن گھوڑا رکنے کی بجائے اور تیز ہو گیا۔ اس کی زین کے ساتھ بندھا ہوا گھوڑا اس سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہا

تھا۔ حسن نے کچھ سوچ کر گھوڑے کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی۔ یہ اشاروں پر چلنے والا گھوڑا تھا اور حسن کو اس گھوڑے پر اعتماد تھا۔
گھوڑا سر نیچے کر کے دوڑ پڑا۔ وہ سر کی اور ہی طرح دائیں بائیں جھٹک رہا تھا۔

○

گھوڑا اگلا موڑ سوار کے اشارے کے بغیر ہی مُڑ گیا۔ حسن دیکھ کر حیران رہ گیا کہ آگے چٹانوں میں گھری ہوئی کشادہ جگہ تھی جہاں ہری بھری گھاس تھی اور سرسبز درخت تھے۔ یہ جگہ صحرا میں نخلستان جیسی تھی۔

گھوڑا اور تیز دوڑا اور وہاں تک پہنچ گیا۔ وہاں سبزے میں گھرا ہوا ایک چشمہ تھا۔ پانچ سات گز لمبائی چوڑائی میں بارش سے دُھلے ہوئے آسمان جیسا شفاف اور نیلا پانی جمع تھا۔ شفاف بھی اتنا کہ اس کی تہہ میں کنکریاں بھی صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ فالتو پانی کہاں غائب ہو رہا تھا۔

گھوڑا بے صبری سے پانی پینے لگا۔ حسن نے اُتر کر دوسرے گھوڑے کی باگ اپنے گھوڑے کی زین سے کھول دی۔ اس نے بھی بے تابی سے چشمے سے منہ لگا لیا۔ تب حسن کو خیال آیا کہ گھوڑے پیاسے تھے۔

جانور' خصوصاً گھوڑے اور خچر' پانی کی مُشک دور سے پا لیتے ہیں۔ گھوڑا بے لگام اور منہ زور ہو کر پانی تک پہنچ جاتا ہے۔

حسن بن صباح نے گھوڑوں کو پانی پیتے دیکھا تو اُسے بھی پیاس محسوس ہونے لگی۔ چشمے کے کنارے گھٹنے ٹیک کر وہ پانی پر جھکا اور چلو بھر بھر کر پانی پینے لگا۔ اس کا سر جھکا ہوا اور نظریں پانی پر لگی ہوئی تھیں۔ اُس کے ہاتھ رک گئے اور اُس نے ذہن پر زور دیا۔
اُسے اپنا خواب یاد آگیا جس میں اُس نے اس سفر کا راستہ دیکھا تھا۔ اُسے یاد آیا کہ خواب میں اُس نے چشمہ دیکھا تھا۔ اُسے یہ بھی یاد آیا کہ اس چشمے سے روشنی سی پھوٹی تھی۔ ذہن پر زور دینے کے باوجود اُسے اس سے آگے یاد نہ آیا لیکن اُسے اطمینان ہو گیا کہ وہ غلط راستے پر نہیں جا رہا۔

وہ ایک بار پھر چلو بھرنے کے لیئے پانی میں ہاتھ ڈالنے لگا تو اس کے ہاتھ ایک بار پھر رک گئے

اور نظریں پانی پر جم گئیں۔ پانی کے سامنے والے کنارے کے نیچے پانی میں ایک آدمی کا عکس جھلملا رہا تھا۔ پانی ساکن نہیں تھا۔ چھوٹی چھوٹی لہریں اس کنارے سے اُس کنارے تک جا رہی تھیں۔ اس آدمی کا عکس ان لہروں پر تیر رہا تھا۔

حسن سُن ہو کے رہ گیا۔ وہ بزدل نوجوان نہیں تھا۔ اُس کے پاس تلوار تھی اور ایک خنجر بھی تھا لیکن اسے اپنی ذات سے یہ اشارہ مل رہا تھا کہ یہ آدمی کوئی مسافر نہیں جو پیاس بجھانے سرِراہ چشمے پر آگیا ہو۔

حسن نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔ اُس سے بیس بائیس قدم دور ایک ٹیکری پر ایک لمبا تڑنگا آدمی کھڑا تھا۔ لباس سے وہ اسی خِطّے کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اُس کے سر پر اس خطے کی مخصوص پگڑی تھی اور پگڑی پر اتنا بڑا سیاہ رومال پڑا ہُوا تھا جس نے اُس کے کندھوں اور پیٹھ کے کچھ حصے کو بھی ڈھانپ رکھا تھا۔ سلیقے سے تراشی ہوئی اُس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی تھی۔

حسن نظریں اُس پر جمائے ہوئے آہستہ آہستہ اٹھا۔ اُس آدمی نے اسی طرح اُس پر نظریں جما رکھی تھیں۔ اُس کے جسم میں ذرا سی بھی حرکت نہیں تھی۔ یہ شک غلط معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ بُت ہے۔

○

آخر اُس آدمی میں حرکت ہوئی۔ وہ آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔

اُس کے عقب میں منظر یہ تھا کہ ایک چٹان دائیں سے بائیں گئی ہوئی تھی۔ قدرت نے درمیان سے اس طرح کاٹ دیا تھا کہ ایک گلی بن گئی تھی جس میں سے ایک گھوڑا آسانی سے گزر سکتا تھا۔ گلی کی طرف چٹان کے دونو حصے دیواروں کی طرح عمودی تھے۔

وہ آدمی اُلٹے قدم چلتا اس گلی میں داخل ہو گیا۔ حسن بن صباح نے فرحی کے گھوڑے کی باگ اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھی، اپنے گھوڑے پر سوار ہُوا اور گلی میں داخل ہو گیا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اُس پر کچھ اثر ہو گیا ہے اور وہ اب اسی اثر کے قبضے میں ہے۔

وہ آدمی اس قدرتی گلی کے اگلے سرے پر کھڑا تھا۔ اُس کے پیچھے ایک اور چٹان تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہاں یہ گلی بند ہو گئی ہو۔ اُس آدمی نے اپنا بایاں بازو بائیں طرف لمبا کیا اور اُس طرف غائب ہو گیا۔

حسن وہاں تک جا کر اُسی طرف مڑ گیا جس طرف اُس آدمی نے اشارہ کیا تھا۔ وہ آدمی آگے جا کر ایک اور موڑ مُڑ رہا تھا۔ حسن اس طرح اُس کے پیچھے جا رہا تھا جیسے اُس کا پالتو جانور ہو یا جیسے اُس شخص نے اسے ہپناٹائز کر لیا ہو۔

وہ جگہ کشادہ تھی۔ بے آب و گیاہ چٹانوں کی بجائے وہاں ہری بھری ٹیکریاں تھیں۔ یہ ہریالی اُس چشمے کی بدولت تھی جو قریب ہی تھا۔

حسن آگے جا کر ایک سرسبز ٹیکری سے مُڑا تو سامنے کا منظر دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ یہ منظر اُس کے لئے غیر متوقع تھا۔ اُس کے سامنے ایک اونچی ٹیکری تھی جو دائیں بائیں گئی ہوئی تھی۔ یہ سرسبز گھاس اور پھولدار جنگلی پودوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ انسانی ہاتھوں سے بنائی گئی ہو لیکن اُس کی چھت اور دیواریں بتا رہی تھیں کہ یہ قدرت کی تعمیر ہے۔ اس کے اوپر سے خودرو بیلیں لٹک رہی تھیں۔

وہ آدمی جس کی راہنمائی میں حسن وہاں پہنچا تھا، اس گُپھ کے باہر کھڑا تھا۔ حسن وہاں گیا تو اُسے اندر کا منظر نظر آیا۔ کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی خاصی لمبی چوڑی چٹائی بچھی ہوئی تھی۔ سامنے ایک آدمی گاؤ تکیے سے لگا بیٹھا تھا۔ اُس کی داڑھی لمبی اور خشخشی تھی۔ اُس کے سر پر خرگوش کی کھال کی ٹوپی تھی اور ٹوپی پر کالے رنگ کا رومال تھا جو اس کے کندھوں سے بھی نیچے آیا ہوا تھا۔ اُس نے سبز رنگ کا چغہ پہن رکھا تھا۔ اس کی وجاہت سے پتہ چلتا تھا کہ وہ مذہبی پیشوا ہے۔ یہ بتانا مشکل تھا کہ وہ کس فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔

تین آدمی اُس کے ایک طرف اور تین دوسری طرف آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سب کے سروں پر ایک مخصوص انداز کی پگڑیاں تھیں اور ان پر سیاہ رنگ کے رومال تھے جو ان کے کندھوں سے نیچے تک آئے ہوئے تھے۔

اس بزرگ نے جس کے چہرے پر جلال تھا، اس آدمی کو ہاتھ سے اشارہ کیا جس کی راہنمائی میں حسن وہاں پہنچا تھا۔ وہ آدمی اندر چلا گیا۔ اس کشادہ گُپھ میں ایک چوڑا ٹیلہ سا تھا۔ وہ آدمی اُس کے پیچھے چلا گیا۔ وہاں سے باہر آیا تو اس کے ساتھ فرحی تھی جو ذرا لنگڑا کر چل رہی تھی۔

فرحی کو دیکھ کر حسن بن صباح کو یقیناً اطمینان ہُوا ہو گا کہ وہ زندہ ہے لیکن یہ سوال اُسے پریشان کر رہا تھا کہ یہ کون لوگ ہیں اور فرحی ان کے پاس کیسے آگئی ہے؟

یہ لوگ ڈاکو اور رہزن تو نہیں لگتے تھے لیکن ڈاکوؤں اور رہزنوں کے سروں پر سینگ تو نہیں ہوتے۔ بزرگ کے اشارے پر فرحی کو اُس کے سامنے بٹھا دیا گیا۔ سورج اپنا اُس روز کا سفر پورا کر کے اُفق کے پیچھے جا سویا تھا۔ شام تاریک ہو گئی تھی۔ گُف میں مشعلیں رکھ دی گئی تھیں۔ عجیب عجیب سے سائے گُف کی دیواروں پر ناچ رہے تھے

○

داستان گو اس بزرگ کو درویش کہے تو زیادہ موزوں ہو گا۔

"اے نوجوان!" — درویش نے حسن بن صباح سے کہا — "کیا گھوڑے سے اتر کر ہمارے درمیان بیٹھنا تجھے گوارا نہیں؟ ہم سب تیرے انتظار میں بیٹھے ہیں"۔

"میں ابھی چہرے پڑھنے کے قابل نہیں ہُوا!" — حسن نے کہا — "میں دل کی نیت کو آنکھوں کے آئینے میں نہیں دیکھ سکتا۔ اگر آپ کے دل میں بھی وہی جلال ہے جو آپ کے چہرے پر دیکھ رہا ہوں تو آپ میرے اس سوال کا جواب ضرور دیں گے کہ میری یہ ہمسفر آپ تک کس طرح پہنچی؟"

"گھوڑے سے اُتر اے نوجوان!" — درویش نے کہا — "تجھے ہر سوال کا جواب ملے گا اور تو ہمارے سوالوں کے بھی جواب دے گا... یہ لڑکی تیری ہمسفر ہے، ہماری نہیں... آ اس کے ساتھ بیٹھ اور اس کے ساتھ روانہ ہو"۔

حسن گھوڑے سے اُترا اور جوتے اتار کر چٹائی پر گیا۔ درویش نے اپنا دایاں ہاتھ حسن کی طرف بڑھایا تو حسن نے دونوں ہاتھوں سے اس کے ساتھ مصافحہ کیا۔ درویش کے اشارے پر وہ فرحی کے پاس بیٹھ گیا۔

فرحی نے اُس کی طرف اور اُس نے فرحی کی طرف دیکھا۔ فرحی کے چہرے پر خوف کی ذرا سی بھی جھلک نہیں ملتی تھی۔ وہ گھبرائی ہوئی بھی نہیں لگتی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ حسن کے چہرے پر تذبذب کا جو تاثر تھا وہ اُڑ گیا اور اُس کے چہرے پر رونق آ گئی۔

"تمہارا نام؟" — درویش نے پوچھا۔

"حسن بن صباح"

"تیرے اس کٹھن سفر کی منزل کیا ہے؟" — درویش نے پوچھا — "کہاں ہے منزل

تیری؟"

"خوابوں کے سفر کی منزل بیان نہیں کی جا سکتی"۔ — حسن نے کہا۔

"خوابوں کے سفر کی منزل ہوتی ہی نہیں اے نوجوان!" — درویش نے کہا — "کیا تو نیند میں خواب دیکھا کرتا ہے یا بیداری میں؟"

"نیند میں خواب جو دیکھا کرتا ہوں انہیں بیداری میں حقیقت بنانے کی کوشش کیا کرتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا۔

"تو شاید نہیں جانتا اے نوجوان!" — درویش نے کہا — "نیند کے خواب خواہشوں اور آرزوؤں کے چلتے پھرتے عکس ہوتے ہیں۔ آنکھ کھلتے ہی بُلبلوں کی طرح پھٹ جاتے ہیں... اور بیداری کے خواب فرار کا ایک سفر ہے جس کی کوئی منزل نہیں ہوتی"۔

"اے درویش!" — حسن نے کہا — "میں خواہشوں اور آرزوؤں کا پجاری نہیں نہ میں نے کبھی اپنی روح کو خواہشوں اور آرزوؤں کی غذا دی ہے"۔

"پھر تو روح کو کیا غذا دیا کرتا ہے؟"

"عزم!" — حسن نے جواب دیا — "میں اپنی ہر آرزو کو عزم کے سانچے میں ڈھال لیا کرتا ہوں"۔

"اپنے سفر کی بھی کچھ بات کر اے نوجوان!" — درویش نے کہا۔

"یہ بھی ایک خواب ہے" — حسن نے کہا — "خواب میں جو دیکھا تھا وہ میرے سامنے آ رہا ہے"۔

"ہمیں بھی دیکھا تھا کیا؟" — درویش نے پوچھا — "ہم بھی تو تیرے سامنے آئے ہیں؟"

"دیکھا تھا اے درویش!" — حسن نے جواب دیا — "شفاف پانی کا ایک چشمہ دیکھا تھا۔ اس میں سے ایک عکس نکلا جس نے انسان کا روپ دھار لیا۔ اُس نے خاموشی کی زبان میں میری راہنمائی کی۔ میں نے سات غزال دیکھے جو ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے"۔

"کہاں ہیں وہ غزال؟"

"چھ میرے سامنے بیٹھے ہیں" — حسن نے جواب دیا — "ساتواں کھڑا ہے"۔

"اس سے تو کیا سمجھا؟"

"یہ کہ میں سیدھے راستے پر جا رہا ہوں"۔۔۔ حسن نے جواب دیا۔

حسن بن صباح نے دیکھا کہ صرف یہ درویش بولتا ہے اور باقی سب بالکل چپ بیٹھے ہیں۔ درویش کے ہونٹوں پر تبسم ہے اور باقی سب کے چہرے بے تاثر ہیں۔ درویش بولتا ہے تو سب اس کی طرف دیکھتے ہیں اور حسن بولتا ہے تو سب اُس کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔

"قابلِ احترام درویش!"۔۔۔ حسن نے پوچھا۔۔۔ "کیا میں اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں؟"

"تمہارا اس لڑکی پر کوئی حق نہیں اے نوجوان!"۔۔۔ درویش نے کہا۔۔۔ "اس لڑکی کا ہم پر کچھ حق تھا' جو ہم نے ادا کر دیا ہے"۔

حسن کے چہرے پر حیرت کا تاثر آ گیا۔ وہ کبھی درویش کو اور کبھی فرحی کو دیکھتا تھا۔

"ہم نے یہ پھول ان پتھروں سے اٹھایا ہے"۔۔۔ درویش نے کہا۔۔۔ "یہ تیری ہمسفر ہے۔ اسے تیرے ساتھ ہی جانا ہے' لیکن ہم یہ ضرور دیکھنا چاہیں گے کہ تو اُس لڑکی کے قابل ہے یا نہیں.... حیران مت ہو لڑکے! غصے کو بھی اپنے قابو میں رکھ۔ ہم تجھے راز کی یہ بات بتاتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں تُو کہاں جا رہا ہے۔ اُتنے طویل اور کٹھن سفر میں اتنا حسین ہمسفر مل جائے تو مسافت آسان ہو جاتی ہے اور فاصلے سمٹ آتے ہیں لیکن راہِ حیات کے جو مسافر عورت کو صرف اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک خوبصورت جسم ہے' ان کی آسان مسافتیں بھی کٹھن ہو جایا کرتی ہیں۔ ہم یہ دیکھنا چاہیں گے کہ تُو عورت کو کیا سمجھتا ہے"۔

"اس لڑکی کا آپ پر کیا حق تھا؟"۔۔۔ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"تُو ہی اسے بتا دے اے لڑکی!"۔۔۔ درویش نے فرحی سے کہا۔

"تمہارے گھوڑے ناگوں سے ڈر کر بھاگ اٹھے تھے ناں!"۔۔۔ فرحی نے حسن سے کہا۔۔۔ "میرا گھوڑا بے قابو ہو کر ایک اور ہی طرف نکل گیا۔ میں سنبھل نہ سکی اور گر پڑی۔ گرنے تک یاد ہے۔ ہوش میں آئی تو یہاں پڑی تھی۔ انہوں نے میری دیکھ بھال ایسی کی کہ خوف سے نجات مل گئی۔ صرف تمہارا غم تھا۔ انہوں نے کہا تم آ جاؤ گے اور تم آ گئے"۔

"کیا تم نے انہیں بتایا ہے ہم کہاں جا رہے ہیں؟"۔۔۔ حسن نے فرحی سے پوچھا۔

"نہیں!"۔۔۔ فرحی نے جواب دیا۔۔۔ "یہ پوچھتے رہے میں کہتی رہی کہ میرا ہمسفر بتانا

چاہے گا تو بتا دے' میں نہیں بتاؤں گی۔ پھر انہوں نے کہا کہ یہ کہہ دو مجھے معلوم نہیں۔ میں نے کہا مجھے معلوم ہے۔ بتاؤں گی نہیں۔ انہوں نے کہا ہم تمہیں بے آبرو کر کے مار ڈالیں گے۔ میں نے کہا تب بھی نہیں بتاؤں گی۔ انہوں نے کہا ہم تمہاری آبرو کے محافظ ہیں' تمہیں گھر چھوڑ آئیں گے۔ میں نے کہا پھر بھی نہیں بتاؤں گی.... اس بزرگ نے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا' آفرین! ہم تمہاری پُوجا کریں گے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ تیرے ہمسفر کو یہاں لانے کے لئے آدمی چلا گیا ہے"۔

"سن لیا اے نوجوان؟"۔۔۔ درویش نے حسن سے پوچھا۔۔۔ "اب ہم نے دیکھنا ہے کہ تُو اس لڑکی کے جسم کو چاہتا ہے یا روح کو؟"

درویش نے اُس آدمی کو جو حسن کو یہاں لایا تھا' اشارہ کیا۔ وہ آدمی گُف کے اندر ہی کہیں غائب ہو گیا۔

○

وہ مشعلوں کی روشنی میں سامنے آیا تو اُس کے ہاتھوں میں تین گڑیا تھیں۔ یہ مٹی کے بنے ہوئے تین عورتوں کے بُت تھے۔ خوبصورتی سے بنائے گئے تھے۔ ہر بُت تقریباً" ڈیڑھ فٹ اونچا اور ہر بُت برہنہ تھا۔

"تینوں بُت اور گولی اس کے آگے رکھ دو"۔۔۔ درویش نے کہا۔

اُس کے حکم کی تعمیل ہوئی۔

"کوئی ایک گڑیا اٹھا"۔۔۔ درویش نے حسن سے کہا۔۔۔ "اور اس کے دائیں کان میں گولی ڈال"۔

حسن نے ایک بُت اٹھا کر اس کے کان میں گولی ڈالی۔

یہ گولی بُت کے منہ سے نکل کر زمین پر گر پڑی۔

"اب دوسری گڑیا اٹھا لے"۔۔۔ درویش نے کہا۔۔۔ "اور گولی اس کے کان میں ڈال"۔

حسن بن صباح نے یہ بُت اٹھایا اور گولی بھی اٹھائی۔ یہ گولی ایک گول کنکری تھی۔ یہ کانچ کی ان گولیوں جیسی تھی جن سے آج کل بچے کھیلا کرتے ہیں۔ حسن نے پتھر کی یہ گولی بُت کے کان میں ڈال دی۔ کان میں ایک سوراخ تھا۔ گولی اس کان میں گئی اور دوسرے کان سے باہر آ

گئی۔

"آپ ایک اور گڑیا اٹھا" — درویش نے کہا — "اور یہ گولی اس کے دائیں کان میں ڈال"۔

حسن نے دوسرا بُت الگ رکھ کر تیسرا بُت اٹھالیا۔ گولی اٹھا کر اس بُت کے کان میں ڈالی۔ یہ گولی اندر ہی کہیں غائب ہو گئی۔

"زور زور سے ہلاؤ" — درویش نے کہا — "گولی کو باہر آنا چاہئے"۔

حسن نے بُت کو بہت ہلایا، جھنجھوڑا، الٹا کیا، دائیں اور بائیں پہلو پر کر کے ہلایا مگر گولی باہر نہ آئی۔

"یہ گڑیا بیکار ہے" — درویش نے کہا — "اسے الگ رکھ دے۔ اس بدبخت نے ہماری گولی ہضم کر لی ہے"۔

حسن نے یہ بُت رکھ دیا۔

"کیا یہ بُت خوبصورت نہیں؟" — درویش نے پوچھا — "کیا یہ تجھے اچھے نہیں لگتے؟"

"خوبصورت ہیں" — حسن نے جواب دیا — "دل کو اچھے لگتے ہیں۔ بنانے والے نے عورت کی رعنائیاں ان بتوں میں سمو دی ہیں۔ ان میں صرف جان ڈالنی باقی رہ گئی ہے"۔

"ہم تجھے انعام دینا چاہتے ہیں" — درویش نے کہا — "کوئی ایک گڑیا اٹھا لے.... تینوں ایک جیسی ہیں"۔

حسن بن صباح نے سب سے آخر والا بُت اٹھا لیا جس کے کان میں گولی ڈالی تو کسی طرف سے گولی باہر نہیں آئی تھی۔ درویش نے اسے بیکار کہہ کر ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

"تُو نے عقل سے کام نہیں لیا اے نوجوان!" — درویش نے کہا — "یا تُو نے سنا نہیں کہ میں نے اس گڑیا کے متعلق کہا تھا کہ اس نے ہماری گولی ہضم کر لی ہے، اسے الگ پھینک دو"۔

"محترم درویش!" — حسن نے کہا — "میں عقل اور توجہ سے کام نہ لیتا تو آپ کی اس گڑیا کو ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ دوسری دونوں میں سے کوئی ایک اٹھا لیتا لیکن میری عقل نے مجھے بتایا کہ یہ گڑیا اٹھا لے"۔

"تیری عقل نے اس میں کیا خوبی دیکھی ہے؟" — درویش نے پوچھا۔

"ایک کے کان میں گولی ڈالی تو وہ اس کے دوسرے کان سے نکل گئی" — حسن نے کہا — "اے درویشِ عالی مقام! آپ یقیناً ایسی بیٹی کو پسند نہیں کریں گے جو اپنے باپ کی پند و نصیحت ایک کان سے سنے اور دوسرے کان سے نکال دے.... ایسی بہن بھی بُری، ایسی بیوی بھی بُری۔

"دوسری کے کان میں گولی ڈالی تو اس نے منہ کے رستے نکل دی۔ ایسی عورت تو اور زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ وہ گھر کا کوئی راز اپنے دل میں رکھ نہیں سکتی۔ بات سنی اور ہر کسی کے آگے اُگلنا شروع کر دی۔ ایسی عورت اپنے گھر کا اور اپنے ملک کا بھی بیڑہ غرق کرا دیا کرتی ہے....

"اور جسے آپ نے بیکار کہا ہے، یہ بڑی قیمتی عورت ہے، جو راز کی بات اپنے دل میں دفن کر دیا کرتی ہے۔ میں نے اس بُت کو یا گڑیا کو بہت ہلایا، الٹا کیا، ہر پہلو پر کر کے زور زور سے جھنجھوڑا لیکن اس نے گولی نہیں اُگلی۔ اسے آپ توڑ پھوڑ کر اس کا وجود ختم کر دیں تو ہی آپ اس کے اندر سے گولی نکال سکتے ہیں....

"یہ وہ خوبی ہے جو آپ نے فرحی میں دیکھی ہے۔ آپ آٹھ ہیں اور یہ اکیلی۔ کیا آٹھ آدمیوں سے ڈر کر اس نے آپ کو بتا دیا تھا کہ ہم کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟ میں اسے اپنی عمر کی ہمسفر بناؤں گا"۔

"آفرین اے نوجوان!" — درویش نے کہا — "خدا نے تجھے وہ دانش اسی عمر میں دے دی ہے جو اوروں کو عمر بھر کا تجربہ حاصل کر کے بڑھاپے میں بھی نہیں ملتی.... تُو پیدائشی دانشمند ہے" — درویش نے اپنے آدمی سے کہا — "تینوں گڑیوں کو اُٹھا کر سنبھال لو۔ ان کے امتحان میں شاید کبھی کوئی کامیاب ہُوا ہو"۔

ایک آدمی نے تینوں بُت اٹھائے اور مشعلوں کی روشنی سے نکل گیا۔

"کھانا گرم کرو" — درویش نے حکم کے لہجے میں کہا — "دسترخوان لگ جائے.... فوراً۔ یہ دونوں بھوکے ہیں"۔

○

اس ویرانے میں اتنا پُرتکلف کھانا حسن بن صباح کے لئے حیران کن تھا۔ حسن اور فرحی اس قدر بھوکے تھے کہ بے صبری سے کھانا نگلتے چلے گئے۔

کھانے کے بعد درویش نے حسن بن صباح کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ باقی سب وہاں سے چلے گئے۔ حسن اور فرحی کے سونے کا الگ انتظام کر دیا گیا۔ فرحی جا کر سو گئی تھی۔

"حسن؟" ـــ درویش نے کہا ـــ "تیرا نام حسن بن علی ہونا چاہئے تھا لیکن تُو نے حسن بن صباح کہلانا زیادہ پسند کیا"۔

"میرے آباؤاجداد میں صباح حمیری ایک شخص ہو گزرا ہے" ـــ حسن نے کہا ـــ "میرا باپ کچھ کم استاد نہیں لیکن صباح کے متعلق سنا ہے کہ اُس نے بہت ہی شہرت اور عزت پائی تھی، اور اُس کا کمال یہ تھا کہ کسی کو شک تک نہ ہونے دیا کہ وہ عیاروں کا عیار اور فریب کاروں کا اُستاد ہے۔ بس یہ وجہ ہوئی کہ میں نے بن علی کی بجائے بن صباح حمیری کہلانا زیادہ پسند کیا..... لیکن آپ کو میرا نام کس نے بتایا ہے؟"

"صرف نام ہی نہیں حسن!" ـــ درویش نے جواب دیا ـــ "تمہارے متعلق مجھے بہت کچھ بتایا گیا ہے۔ تم جس جگہ سے آ رہے ہو اور جس جگہ جا رہے ہو، میں ان کے درمیان ایک رابطہ ہوں، ایک رشتہ ہوں، پُل سمجھ لو اور....."

"رک جائیں" ـــ حسن اچانک بول پڑا ـــ "مجھے یاد آ گیا..... میرے استاد عبدالملک ابنِ عطاش نے مجھے بتایا تھا کہ خواب میں مجھے ایک غار نظر آئے گا اور اس غار میں میرا علم مکمل ہو جائے گا..... میں آپ کی ذات میں ایسا گم ہو گیا تھا کہ یاد ہی نہ رہا کہ میں نے خواب میں ایک غار دیکھا تھا۔ اس غار پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ اتنا ہی پتہ چلتا تھا کہ اس دھند میں کچھ ہے۔ میں نے پہلے جن غزالوں کا ذکر کیا ہے کہ خواب میں دیکھے تھے، وہ اسی دھند میں غائب ہو گئے تھے.... محترم درویش! یہ میرے خواب والا غار تو نہیں؟"

"ہاں حسن!" ـــ درویش نے کہا ـــ "غار وہی ہے لیکن تیرا علم یہاں مکمل نہیں ہو گا یہاں سے تجھے روشنی ملے گی جس میں تجھے اپنی منزل، اپنا مستقبل اور اپنی شخصیت بہت ہی بڑی نظر آئے گی..... اب تُو یہ پوچھے گا کہ میں کون ہوں اور میں یہاں کیا کر رہا ہوں"۔

"یہ تو میں نے پوچھنا ہی ہے" ـــ حسن نے کہا۔

"اس سے پہلے کچھ ضروری باتیں سن لے حسن!" ـــ درویش نے کہا ـــ "مجھے معلوم تھا تو آئے گا۔ یہ ہمارا ایک زمین دوز نظام ہے۔ اس نظام کو ہم زمین کے اوپر لانے کی کوشش کر

رہے ہیں۔ یہاں سے وہ علاقہ شروع ہوتا ہے جس پر ہم نے قبضہ کرنا ہے۔ آگے بہت سے قلعے ہیں جن میں کچھ چھوٹے اور بعض بہت ہی چھوٹے ہیں اور چند ایک ذرا بڑے ہیں۔ ان میں کئی ایک ایسے ہیں جو چند ایک امراء کی ذاتی ملکیت بنے ہوئے ہیں۔ ہم نے ان پر قبضہ کرنا ہے"۔

"قلعے فتح کرنے کے لئے تو فوج کی ضرورت ہوتی ہے" ـــ حسن نے کہا ـــ "ہم فوج کہاں سے لائیں گے؟"

"لوگوں کی فوج بنائیں گے" ـــ درویش نے کہا۔

"لیکن کس طرح؟" ـــ حسن نے پوچھا۔

درویش نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

○

"یہ ہے وہ سبق جو میں نے تجھے دینا ہے" ـــ درویش نے کہا ـــ "تُو نے عبدالملک ابنِ عطاش کی شاگردی کر لی ہے۔ اب تُو ایک اور شخص کی شاگردی کرے گا وہ ہے احمد بن عطاش۔ آگے ایک قلعہ ہے جس کا نام قلعہ اصفہان ہے۔ احمد بن عطاش اس قلعے کا والی ہے۔ وہ تجھے علمِ سحر کا ماہر بنا دے گا....

"اب میں جو بات کہنے لگا ہوں اس کا ایک ایک لفظ غور سے سننا اور ہر لفظ کو سینے میں محفوظ رکھتے جانا۔ بنی نوع انسان دو طاقتوں کے غلبے میں ہے۔ یوں کہہ لو کہ دنیا پر دو طاقتوں کی حکومت ہے۔ ایک ہے خدا اور دوسرا ہے ابلیس۔ انسان خدا کو کوئی روپ دے کر اس کی عبادت کرتا ہے۔ انسان نے سورج کو خدا بنایا، آگ کو، سانپ کو اور آسمانی بجلی کو بھی انسان نے خدا بنایا۔ آخر اسلام نے آ کر انسان کو بتایا کہ خدا ایک ہے۔ یہ بھی بتایا کہ یہ سورج، چاند، آسمانی بجلیاں، آگ، سانپ وغیرہ خدا نہیں بلکہ یہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہیں۔ اس خدا کی وحدانیت کو لوگوں نے مان لیا....

"ہم بھی خدا کو ماننے والے مسلمان ہیں لیکن ہم نے اپنا الگ فرقہ بنا لیا ہے اور ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ صحیح اسلام ہمارے پاس ہے لیکن اہلِ سنت نے لوگوں کے دلوں پر اپنے عقائد ایسے طریقے سے نقش کر دیئے ہیں کہ اب ہم ان کے عقائد کو نہیں بدل سکتے۔ ہمیں کوئی اور طریقہ

اختیار کرنا پڑے گا"۔

"کیا آپ نے کوئی طریقہ سوچا ہے؟" — حسن نے پوچھا۔

"ہاں!" — درویش نے کہا — "یہی بتانے لگا ہوں لیکن یہ طریقہ ایسا نہیں کہ پتھر اٹھاؤ اور کسی کے سر پر مارو۔ یہاں معاملہ نظریات کا ہے اور اس معاملے کو صرف تم سمجھ سکتے ہو"۔

"صرف میں کیوں؟" — حسن نے کہا — "میرا علم ابھی خام ہے اور تجربہ کچھ نہیں"۔

"تمہارے پاس سب کچھ ہے" — درویش نے کہا — "پہلے وہ سن لو جو ہم نے سوچا ہے، پھر تم خود محسوس کرو گے کہ یہ تو پہلے ہی تمہارے دل میں تھا.... بات یہ ہے حسن! اہلِ سنّت نے لوگوں کا رشتہ خدا کے ساتھ براہِ راست قائم کر دیا ہے۔ عیسائیت نے بھی خدا کو ہی اوّل اور آخر قرار دیا ہے اور وہ عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں۔ یہودی ہیں، آتش پرست ہیں، یہ بھی خدا کو مانتے ہیں۔ ہمارے لئے سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ حکومت اہلِ سنّت کی ہے"۔

"شاید آپ کو معلوم ہو گا" — حسن نے کہا — "کہ ہمارا امیر ابو مسلم رازی اس قدر کٹر سُنّی ہے کہ اُس نے میرے باپ سے کہا تھا کہ تم اپنے آپ کو اہلِ سنّت ظاہر کرتے ہو تو اپنے بیٹے کو ایک اسماعیلی پیشوا عبدالملک ابن عطاش کی شاگردی میں کیوں بٹھا رکھا ہے؟.... میرے باپ نے ابو مُسلم رازی کے عتاب سے بچنے کے لئے مجھے امام موافق کے مدرسے میں بھیج دیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہُوا ہے کہ ابو مسلم نے اپنے جاسوس پھیلا رکھے ہیں جو گھر گھر کی خبر رکھتے ہیں کہ کہیں سُنّی عقیدہ کے خلاف کوئی بات تو نہیں ہو رہی"۔

"ہاں حسن!" — درویش نے کہا — "ابو مُسلم رازی نے اپنے جاسوس پھیلا رکھے ہیں۔ اُسے معلوم نہیں کہ ہم نے اُس کے جاسوسوں کے پیچھے جاسوس چھوڑے ہوئے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ سلجوقی سلاطین کی حکومت ہماری دشمن ہے لیکن ہم ان کی جڑیں کھوکھلی کر دیں گے۔ ہمیں مصریوں پر بھروسہ ہے۔ وہ عبیدی ہیں اور ہمارے ہم عقیدہ بھی ہیں"۔

"محترم درویش!" — حسن نے کہا — "معلوم نہیں کیوں مجھے خیال آتا ہے کہ میں مصر جاؤں اور وہاں سے سلجوقیوں کے خلاف طاقت حاصل کروں"۔

درویش عجیب سی طرح ہنسا اور کچھ دیر حسن بن صباح کے منہ کو دیکھتا رہا۔

"کیوں محترم درویش؟" — حسن نے ذرا کھسیانا سا ہو کر پوچھا — "کیا میں نے غلط بات

کہہ دی ہے؟"

"نہیں حسن!" — درویش نے کہا — "میں تمہاری اس بات سے خوش اور مطمئن ہُوا ہوں کہ تمہیں مصر کا خیال آیا ہے۔ میں خوش اس لئے ہوں کہ یہ خیال ویسے ہی نہیں آیا بلکہ تم میں ایک پُراسرار طاقت ہے جو تمہیں اشارے دیتی ہے۔ میں پورے وثوق کے ساتھ پیشین گوئی کرتا ہوں کہ تم میں نبوت کے نمایاں آثار پائے جاتے ہیں۔ تم نبی بنو یا نہ بنو، تمہیں اتنی ہی شہرت ملے گی جو صرف نبیوں کو ملا کرتی ہے۔ آنے والی نسلیں اور ان کی نسلیں ہمیشہ تمہارا نام لیتی رہیں گی.... لیکن ضروری نہیں کہ تمہیں اچھے نام سے ہی یاد کیا جائے گا۔ لوگ تمہیں یاد ضرور رکھیں گے"۔

پہلے درویش کی ہنسی نکلی تھی اب حسن ہنس پڑا۔

"آپ کو میری بات سے خوشی حاصل ہوئی تھی" — حسن نے کہا — "اور مجھے آپ کی بات سے خوشی حاصل ہوئی ہے۔ معلوم نہیں کیوں مجھے بُرائی سے مسرت حاصل ہوتی ہے"۔

"میں تمہیں اسی بات پر لا رہا تھا" — درویش نے کہا — "میں خدا کا جو ذکر کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ ایک قوت خدا کی ہے اور دوسری ابلیس کی۔ خدا کا نام لے کر لوگوں کو ان کے عقیدوں سے ہٹانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس کام کو ہم اس طرح آسان کریں گے کہ ہم دوسری قوت کو استعمال کریں گے، یعنی ابلیس کی قوت....

"بدی میں بڑی طاقت ہے حسن! بدی میں کشش ہے، بدی میں لذت ہے اور بدی میں نشہ ہے۔ یہ قوت تمہارے دل و دماغ میں موجود ہے۔ ہم لوگوں پر بدی کا نشہ طاری کریں گے۔ تمہارے ساتھ یہ جو لڑکی ہے، یہ تمہارا کام آسان کرے گی۔ اس کے ساتھ ہی ہم علمِ سحر کو کام میں لائیں گے۔ یہ علمِ سحر کا ہی کرشمہ ہے کہ تم مجھ تک پہنچے ہو۔ اب ہم نے تمہارے اس علم کی تکمیل کرنی ہے....

"انسان میں خدا نے یہ کمزوری شروع سے ہی رکھ دی تھی کہ وہ بدی کی طرف جلدی آجاتا ہے۔ وہ ابلیس ہی تھا جس نے انسان کو بہکا کر جنت سے نکالا تھا.... ہم لوگوں کو دنیا میں ہی جنت دیں گے اور یہ تم دو گے"۔

"محترم درویش!" — حسن نے کہا — "میرا خیال ہے کہ مزید باتوں کی ضرورت نہیں۔

آپ جو کچھ بھی کہے جا رہے ہیں یہ پہلے ہی میرے ذہن میں موجود ہے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ آپ مجھے میری اس منزل تک پہنچا دیں جہاں سے میں اپنا محاذ کھول سکوں گا"۔

"کل صبح تم یہاں سے روانہ ہو جاؤ گے"۔۔۔ درویش نے کہا۔۔۔ "اس لڑکی کو بھی تعلیم و تربیت دی جائے گی"۔

○

حسن بن صباح کا اس درویش کے پاس اس انداز سے پہنچنا جس انداز سے اسے پہنچایا گیا' پُراسرار افسانہ لگتا ہے لیکن فرقہ باطنیہ اسی طرح زمین دوز اور پُراسرار طریقوں سے پھلا پھُولا تھا۔ سلجوقی سلاطین اہلِ سنت والجماعت تھے اس لئے وہ کسی اور فرقے کا وجود برداشت نہیں کرتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے جاسوسوں اور مخبروں کے ذریعے اپنی سلطنت کے ہر گوشے میں نظر رکھی ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ فرقہ باطنیہ زمین دوز ہو گیا اور اس کے پیشواؤں نے اپنی کارروائیوں کو اتنا خفیہ کر دیا کہ جاسوسوں اور مخبروں کو بھی ان کی کارروائیوں کا علم نہیں ہوتا تھا۔

حسن بن صباح کا استاد عبدالملک ابن عطاش کوئی معمولی شخصیت نہیں تھا۔ وہ فرقہ باطنیہ کا صفِ اول کا پیشوا تھا۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہ ایک قلعے کا مالک بھی تھا۔

اگلی صبح سورج ابھی افق سے نہیں ابھرا تھا جب چار گھوڑے ان چٹانی بھول بھلیوں سے نکلے۔ ان کا رُخ خراسان کی طرف تھا۔ ایک گھوڑے پر حسن بن صباح سوار تھا۔ دوسرے پر فرحی' تیسرے پر درویش اور چوتھے پر درویش کا ایک آدمی سوار تھا۔

جب سورج اُفق سے اٹھ آیا اُس وقت یہ چاروں گھوڑے ایک سرسبز پہاڑی کی ڈھلان پر چڑھتے جا رہے تھے۔ یہ باقاعدہ راستہ تھا جس پر بیل گاڑیاں اور گھوڑا گاڑیاں بھی چلا کرتی تھیں۔ درویش نے گھوڑا روک لیا۔ باقی تین گھوڑے بھی رک گئے۔ درویش نے اپنے گھوڑے کا منہ اُس طرف پھیر دیا جس طرف سے وہ آئے تھے۔

"پیچھے دیکھو حسن!"۔۔۔ درویش نے کہا۔۔۔ "اور تم بھی فرحی!"

حسن اور فرحی نے پیچھے دیکھا۔ ان کے چہروں کے تاثر بدل گئے۔ اس بلندی سے انہیں دُور دُور تک پھیلا ہُوا جو منظر نظر آ رہا تھا وہ کچھ عجیب سا تھا۔ جس پہاڑی کی بلندی پر وہ کھڑے تھے

بڑی خوبصورت گھاس' پھول اور پودوں اور خوشنما درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ پہاڑی کے دامن میں کچھ دور تک روح افزاء سبزہ زار تھا۔ دور ایک ندی ابھرتے سورج کی کرنوں میں چمک رہی تھی۔

اس سحر انگیز خطے میں میلوں رقبے میں پھیلا ہُوا ایک بے آب و گیاہ چٹانی سلسلہ تھا جو گولائی میں تھا۔ چٹانیں نوکیلی بھی تھیں۔ بعض کی چوٹیاں مخروطی تھیں۔ کچھ بہت بڑے بڑے انسانی بُتوں جیسی تھیں اور زیادہ تر اس طرح گول تھیں جیسے قدرت کے ہاتھوں نے انہیں بڑی محنت سے بنایا ہو۔ ان کے وسط میں کچھ جگہ ہری بھری نظر آ رہی تھی جہاں چند ایک درخت بھی کھڑے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں درویش کا ڈیرہ تھا۔ ان چٹانوں کا رنگ سلیٹی بھی تھا اور سیاہ بھی' اور یہ خطہ ڈراؤنا سا لگتا تھا۔

"دیکھ رہے ہو حسن!"۔۔۔ درویش نے کہا۔۔۔ "تم بھی دیکھو فرحی! میں یہاں سے آگے نہیں جاؤں گا۔ یہاں تک تمہارے ساتھ اس لئے آیا ہوں کہ ایک آخری بات کہنی تھی جو یہاں آ کر ہی کہی جا سکتی تھی۔۔۔۔ زندگی ہری بھری گھاس اور پھولوں کی سیج ہی نہیں' اس میں ایسی ایسی دشواریاں بھی ہیں کہ انسان ہمت ہارنے کے مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ کامیاب وہی ہوتے ہیں جو ان دشواریوں میں سے گذر جاتے ہیں۔۔۔۔

"تمہارا استاد عبدالملک ابنِ عطاش تمہیں سیدھے راستے پر بھی ڈال سکتا تھا لیکن اُس نے تمہیں اپنے علمِ سحر کے ذریعے ایسا خواب دکھایا جس میں تم کو یہ راستہ نظر آیا۔ تم ان چٹانوں کے اندر آ گئے۔ تمہیں راستہ نہیں مل رہا تھا۔ دو ناگوں نے تمہیں بھگا کر پھر وہیں پہنچا دیا جہاں سے تم اس سلسلۂ کوہ میں داخل ہوئے تھے۔ انسان کی زندگی میں ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ اُسے سمجھ نہیں آتی کہ نجات کا راستہ کون سا ہے۔ وہ حالات اور کئی طرح کی دشواریوں میں اس طرح بھٹک جاتا ہے جیسے بھُول بھلیوں میں آ گیا ہو۔۔۔

"ان چٹانوں کے اندر زندگی کا ایک سبق ہے۔ دیکھو قدرت نے کیسی خوفناک جگہ کے اندر کتنا شفاف چشمہ بنا رکھا ہے اور اس کے ساتھ ہی کتنی اچھی پناہ گاہ ہے۔ ایسے چشموں تک وہی پہنچ سکتے ہیں جو ان چٹانوں سے ڈرتے نہیں' بھٹک بھٹک کر راستہ تلاش کر لیتے ہیں اور میٹھے چشمے تک پہنچ جاتے ہیں۔۔۔۔

"ہم یہاں موجود تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ تم آرہے ہو۔ ہمارے آدمی تمہیں دیکھ رہے تھے۔ ہمیں پہلے بتا دیا گیا تھا کہ تم آرہے ہو۔ یہ تو تم جان ہی چکے ہو کہ اس لڑکی کو ہمارے آدمی اٹھا کر لے آئے تھے۔ ہمارا کوئی آدمی ان بھول بھلیوں میں بھٹک نہیں سکتا.... میں اُس وقت تم سے بہت چھوٹا تھا جب میرا استاد مجھے یہاں لایا تھا۔ وہ باہر بیٹھ گیا تھا۔ اُس نے میری کلائی کے ساتھ ایک دھاگہ باندھ دیا تھا۔ یہ بڑا ہی لمبا دھاگہ تھا جو گولے کی شکل میں استاد نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ میں باہر بیٹھوں گا، تم اندر چلے جاؤ، اندر ایک چشمہ ہے، ایک کوزہ اس چشمے کے پانی کا بھر لاؤ....

"استاد نے مجھے بتایا کہ یہ دھاگہ راستے میں چھوڑتے جانا اور میں باہر بیٹھا گولے سے دھاگہ ڈھیلا کرتا جاؤں گا۔ اگر تم تھک ہار گئے اور چشمے کو نہ پا سکے تو اس دھاگے کو دیکھ دیکھ کر واپس آجانا۔ خیال رکھنا کہ دھاگہ ٹوٹ نہ جائے ورنہ اندر جا کر باہر نہیں نکل سکو گے.... میں اندر چلا گیا، استاد دھاگہ ڈھیلا چھوڑتا گیا.... یہ ذرا لمبی بات ہے کہ میں چشمے تک کس طرح پہنچا۔ میں اتنا زیادہ بھٹکا تھا کہ ٹانگیں اکڑ گئیں اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور چلتا گیا....

"پھر میرے ہوش و حواس اندھیرے میں ہی گم ہو گئے۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر بعد ہوش میں آیا۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میں چشمے کے کنارے پڑا ہوا تھا۔ میں اچھل کر اٹھا۔ مٹی کا کوزہ جو میرے ہاتھ میں تھا وہ ٹوٹا پڑا تھا۔ میں بیہوش ہو کر گرا تو کوزہ پتھر پر گر کر ٹوٹ گیا تھا....

"اپنے استاد کو یہ یقین دلانے کے لئے کہ میں چشمے تک پہنچ گیا تھا، میں کپڑوں سمیت چشمے میں اتر گیا اور باہر آ کر چل پڑا۔ میری راہنمائی کے لئے دھاگہ موجود تھا جو میں راستے میں پھینکتا آیا تھا۔ سورج ابھی غروب نہیں ہوا تھا کہ میں باہر اپنے استاد کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ کوزہ ٹوٹ گیا ہے اور میں چشمے میں اُتر کر اپنے کپڑے بھگو لایا ہوں....

"میں تمہیں وہ سبق دینا چاہتا ہوں جو استاد نے مجھے دیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ زندگی کے چشمے خود چل کر کسی کے پاس نہیں آجایا کرتے، انسان کو چل کر ان کے پاس جانا پڑتا ہے، اور پھر زندگی کے چشمے ان کا استقبال کیا کرتے ہیں جو ان کی تلاش میں سنگلاخ وادیوں، سوکھی سڑی چٹانوں کی بھول بھلیوں میں اور پُرخار راستوں پر چلتے ہی جاتے ہیں اور پایۂ استقلال میں لغزش

نہیں آنے دیتے....

"اور استاد نے کہا تھا کہ یہ دھاگہ جو میں نے تمہاری کلائی سے باندھا تھا، اسے صرف ایک دھاگہ ہی نہ سمجھنا۔ یہ دھاگہ انسانی رشتوں کی علامت ہے۔ انسانی رشتے ٹوٹنے نہیں چاہئیں۔ تم اکیلے کچھ بھی نہیں، تم تنہا رہ گئے تو سمجھو تمہاری ذات ہی ختم ہو گئی۔ ہمیشہ یاد رکھنا کہ رشتوں کا یہ دھاگہ نہ ٹوٹنے دینا۔ ذرا سوچو۔ اگر یہ دھاگہ ٹوٹ جاتا تو میرا اور تمہارا رشتہ ٹوٹ جاتا اور تم ان بھول بھلیوں سے نکل نہ سکتے۔

"تو یہ ہے وہ آخری سبق جو میں نے تم تک پہنچانا تھا حسن! ثابت قدم رہنا۔ تم نے فوج کے بغیر قلعے سر کرنے ہیں۔ انسانی فطرت کی کمزوریوں کو اپنے مقاصد اور مفادات کے لئے استعمال کرنا ہے۔ انسانوں پر نشہ طاری کر دو۔ نشہ دولت کا بھی ہوتا ہے، عورت بھی آدمی کے لئے نشہ بن جایا کرتی ہے۔ نشوں کی کمی نہیں حسن! ابلیسی اوصاف میں بڑی طاقت ہے۔ میں تمہیں راز کی ایک بات بتاتا ہوں۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو نماز اپنا فرض اور خدا کی عبادت سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ عام لوگ نماز صرف اس لئے پڑھتے ہیں کہ اگلے جہان جنّت میں جائیں گے جہاں حوریں اور شراب ملے گی اور سوائے عیش و عشرت کے کوئی کام نہیں ہو گا"۔

"میں ان لوگوں کو دنیا میں جنت دکھا دوں گا" ___ حسن نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

"زندہ باد حسن بن صباح!" ___ درویش نے کہا ___ "اب جاؤ، میں یہاں سے واپس جا رہا ہوں.... الوداع!"

"الوداع!"

○

دو دنوں کی مسافت کے بعد حسن بن صباح فرحی اور اپنے رہبر کے ساتھ ایران کے جس قلعے میں داخل ہوا وہ قلعہ اصفہان تھا۔ عام طور پر اسے قلعہ شاہ در کہا جاتا تھا۔ یہ سلجوقی سلطان ملک شاہ نے تعمیر کروایا اور ذاکر نام کے ایک سرکردہ فرد کو امیرِ قلعہ یا والیٔ قلعہ مقرر کیا تھا۔

ذاکر سلجوقیوں کی طرح پکا مسلمان اور اسلام کا شیدائی تھا۔ یہ کوئی بڑا قلعہ نہیں تھا کہ اس کے اندر شہر آباد ہوتا۔ اندر آبادی تو تھی لیکن چند ایک معزز اور اچھی حیثیت اور سرکاری رتبوں اور عہدوں والے لوگ، انتظامیہ کے اور لوگوں کے ذاتی ملازم رہتے تھے۔ آبادی قلعے سے باہر اور

ذرا دور دور تھی۔ اس آبادی میں فرقۂ باطنیہ کے لوگ بھی رہتے تھے لیکن وہ اپنی اصلیت ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔

ذاکر کی عمر کم و بیش پچاس سال تھی اور اس کی دو بیویاں تھیں۔ دونوں کی عمریں چالیس سال سے اوپر ہو گئی تھیں۔ ذاکر کوئی عیاش آدمی تو نہ تھا، پابند صوم و صلوٰۃ تھا لیکن انسانی فطرت کی کمزوریاں تو ہر انسان میں موجود ہوتی ہیں۔ ایک روز وہ ہرنوں کے شکار کو گیا۔ وہ ہرا بھرا سر سبز علاقہ تھا۔ پیڑ پودوں نے جنت کا منظر بنا رکھا تھا۔ شفاف پانی کی دو ندیوں نے کچھ اور ہی بہار بنا رکھی تھی۔

ذاکر گھوڑے پر سوار ایک ندی کے کنارے کنارے جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ چار محافظ اور دو مصاحب تھے۔ ذاکر ان کے آگے آگے جا رہا تھا۔ ندی کا موڑ تھا۔ درخت تو بہت تھے لیکن دو درخت اس کے قریب تھے۔ ایک خودرو بیل دونوں کے تنوں سے اس طرح لپٹی اور پھیلی ہوئی تھی کہ چھت سی بن گئی تھی اور اس کی شکل مٹی کے ٹیلے میں گُف جیسی بنی ہوئی تھی۔ بوٹے کے پھولوں جیسے اس کے پھول تھے۔ نیچے خوشنما گھاس تھی۔

ذاکر نے وہاں جا کر گھوڑا روک لیا۔ پہلے تو اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر آیا پھر ہونٹوں پر تبسم آیا۔

پھولدار بیل کی چھت کے نیچے ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جس کی عمر سترہ سال سے ذرا کم یا ذرا ہی زیادہ تھی۔ اس کی گود میں ہرن کا بچہ تھا۔ لڑکی کی آنکھیں ہرن کے بچے جیسی نشیلی، سیاہ اور موہنی تھیں اور اس کا حسین چہرہ بیل کے پھولوں کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اس کے ریشمی بالوں میں سے دو چار بال اس کے سرخی مائل سپید چہرے پر آئے ہوئے تھے۔

"یہ بچہ کہاں سے لائی ہو لڑکی؟" — ذاکر نے پوچھا۔

"جنگل میں اکیلا بھٹکتا پھر رہا تھا" — لڑکی نے جواب دیا — "بہت دن ہو گئے ہیں۔ ماں کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا...."

"کھڑی ہو کر بات کر لڑکی!" — ایک محافظ نے لڑکی کو ڈانٹ کر کہا — "امیرِ قلعہ کے احترام میں کھڑی ہو جا۔"

ذاکر نے اس محافظ کو خشمگیں نگاہوں سے دیکھا۔

"تم سب آگے چلو" — ذاکر نے محافظوں اور مصاحبوں کو حکم دیا — "پل پر میرا انتظار کرو۔"

لڑکی کے چہرے پر خوف کا تاثر آ گیا اور وہ آہستہ آہستہ اٹھنے لگی۔ ذاکر گھوڑے سے اتر آیا اور لڑکی کے قریب جا کر ہرن کے بچے کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ لڑکی نے ہرن کا بچہ پیچھے کر لیا۔ اس کے ہونٹوں پر جو لطیف سا تبسم تھا وہ غائب ہو گیا اور خوف کی جھلک اس کی غزالی آنکھوں میں بھی ظاہر ہونے لگی۔ ذاکر نے اپنے ہاتھ پیچھے کر لیے۔

"ڈر کیوں گئی لڑکی؟" — ذاکر نے لڑکی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا — "اس بدبخت نے تمہیں ڈرا دیا ہے۔ میرے دل کو تم اور ہرن کا یہ بچہ ایسا اچھا لگا کہ میں رک گیا۔ میں امیرِ قلعہ ضرور ہوں لیکن تم پر میں کوئی حکم نہیں چلاؤں گا۔"

"میں ہرن کا یہ بچہ نہیں دوں گی۔"

"میں تم سے یہ بچہ لوں گا بھی نہیں" — ذاکر نے کہا اور اس سے اس کا نام پوچھا۔

"زریں!" — لڑکی نے جواب دیا۔

"کیا اس بچے کے ساتھ تمہیں بہت پیار ہے؟" — ذاکر نے پوچھا اور لڑکی کا جواب سنے بغیر بولا — "یہ بچہ اتنا پیارا ہے کہ ہر کسی کو اس پر پیار آتا ہے۔"

"نہیں امیر!" — لڑکی نے خوف سے نکل کر کہا — "یہ پیارا اور خوبصورت تو ہے لیکن میں اس سے کسی اور وجہ سے پیار کرتی ہوں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ یہ ماں کے بغیر جنگل میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا بچپن یاد آ گیا جب میں بھی جنگل میں بھٹک گئی تھی اور میں اپنی ماں کو ڈھونڈتی پھرتی تھی۔"

ذاکر اس لڑکی میں اتنا محو ہو گیا کہ لڑکی کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے بٹھا دیا اور خود اس کے پاس بیٹھ گیا۔ لڑکی نے اس سے پرے ہٹنے کی کوشش نہ کی۔

"پھر تمہیں ماں کہاں ملی تھی؟" — ذاکر نے پوچھا۔

"ماں آج تک نہیں ملی" — زریں نے جواب دیا — "اس وقت میری عمر تین چار سال تھی۔ چھوٹا سا ایک قافلہ تھا جس کے ساتھ ہم جا رہے تھے۔ میرے ماں باپ غریب لوگ تھے۔ ان کی عمر خانہ بدوشی میں گزر رہی تھی۔ میں نے ہوش سنبھالا تو اپنے آپ کو ان کے ساتھ

جنگلوں، پہاڑوں اور بیابانوں میں چلتے پھرتے اور نقل مکانی کرتے تھیا"۔

"تم ان سے بچھڑ کس طرح گئی تھیں؟"

"بڑا ہی تیز و تند طوفان باد و باراں آ گیا تھا" ــــ زرّیں نے جواب دیا ــــ "قافلے والے نفسا نفسی کے عالم میں تتر بتر ہو گئے۔ چند ایک گھوڑے تھے اور دو تین اونٹ تھے۔ سب سامان سمیت اِدھر اُدھر بھاگ گئے۔ میرے چار اور بہن بھائی بھی تھے۔ کسی کو کسی کی خبر نہیں تھی۔ ہر کوئی جدھر منہ آیا اُدھر پناہ لینے کو اُٹھ دوڑا۔ میں اکیلی رہ گئی۔ طوفان کے تھپیڑے اس قدر تند تھے کہ میرے پاؤں اکھڑ گئے۔ میں چھوٹی سی تو تھی، طوفان نے مجھے اپنے ساتھ اُڑانا شروع کر دیا۔ اب میں باد و باراں کے رحم و کرم پر تھی...

"وہ شاید ندی نہیں تھی جس میں میں گر پڑی تھی، ویسے ہی پانی کا ریلا تھا جو مجھے اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ میں نے چیخنا چلاّنا اور ماں کو پکارنا شروع کر دیا لیکن طوفان کی چیخیں اتنی بلند تھیں کہ میری چیخیں اس میں دب جاتی تھیں۔ پھر اس طرح یاد آتا ہے جیسے بڑا ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔ میں پوری طرح بیان نہیں کر سکتی۔ یہ بڑی اچھی طرح یاد ہے کہ میں ڈوب رہی تھی اور دو ہاتھوں نے مجھے پانی سے نکال لیا۔ میں اُس وقت کچھ ہوش میں اور کچھ بے ہوش تھی۔ لگتا یاد ہے کہ وہ ایک بزرگ صورت آدمی تھا، جس نے مجھے اسی طرح اپنے سینے سے لگا لیا تھا جس طرح میں اس بچے کو گود میں اٹھائے رکھتی ہوں۔ بس یہ وجہ ہے کہ میں نے کچھ دن پہلے اس بچے کو جنگل میں بھٹکتے دیکھا تو اسے اٹھا لیا۔ میں اسے اپنے ہاتھ سے دودھ پلاتی ہوں"۔

"تو کیا اس شخص نے تمہیں پالا پوسا ہے؟" ــــ ذاکر نے پوچھا ــــ "یا تمہیں ماں باپ مل گئے تھے؟"

"نہیں امیر!" ــــ زرّیں نے جواب دیا ــــ "وہ کہاں ملتے۔ معلوم نہیں بے چارے خود بھی زندہ ہیں یا نہیں۔ مجھے اس بزرگ ہستی نے اپنی بیٹی سمجھ کر پالا پوسا ہے۔ میں انہیں ہی اپنا باپ اور ان کی بیوی کو اپنی ماں سمجھتی ہوں۔ ان سے مجھے بہت پیار ملا ہے اور ایسی زندگی ملی ہے جیسے میں شہزادی ہوں"۔

"کون ہیں یہ لوگ؟"

"احمد بن غناش!" ــــ زرّیں نے جواب دیا ــــ "قلعے کے باہر رہتے ہیں۔ مذہب کے

عالم ہیں اور پکے اہلِ سُنت ہیں"۔

زرّیں کا اندازِ بیاں اتنا معصوم اور بھولا بھالا تھا کہ ذاکر اس میں جذب ہو کے رہ گیا جیسے اس کی اپنی کوئی حیثیت ہی نہ رہی ہو۔ کچھ تو لڑکی بڑی پیاری تھی اور کچھ یہ وجہ بھی تھی کہ لڑکی نے اپنی زندگی کی ایسی کہانی سنائی تھی جس سے ذاکر کے دل میں اس کی ہمدردی پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے لڑکی کے ساتھ ایسے انداز سے اور اس قسم کی باتیں شروع کر دیں جیسے ہمجولی کیا کرتے ہیں۔ زرّیں میں اتنی معصومیت اور سادگی تھی کہ وہ بچوں کی طرح ذاکر میں گھل مل گئی۔

ذاکر نے ہاتھ بڑھا کر بیل سے ایک پھول توڑا۔

"زرّیں!" ــــ ذاکر نے بڑے پیار سے کہا ــــ "اس پھول میں میرا پیار ہے۔ یہ تم لے لو"۔

زرّیں نے پھول لے لیا اور چھوٹے سے بچے کی طرح ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی ایسی تھی جیسے جلترنگ سے نغمہ پھوٹا ہو۔

"ایک بات بتاؤ زرّیں!" ــــ ذاکر نے کہا ــــ "کیا تم نے میرا یہ پھول دل سے قبول کر لیا ہے؟"

"ہاں تو!" ــــ زرّیں نے کہا ــــ "پیار کو کون قبول نہیں کرتا!"

"تو کیا تم میرے گھر آنا پسند کرو گی؟" ــــ ذاکر نے کچھ التجا کے لہجے میں پوچھا۔

"وہ کیوں؟"

"میں تمہیں ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گا" ــــ ذاکر نے کہا ــــ "میں تمہیں اپنی زندگی کا ساتھی بنانا چاہتا ہوں"۔

"تو پھر میں کیوں آؤں؟" ــــ زرّیں نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا ــــ "آپ کیوں نہیں آتے؟"

"نہیں زرّیں!" ــــ ذاکر نے کہا ــــ "تم اتنی معصوم ہو کہ میری بات سمجھ نہیں سکیں۔ میں تمہیں اپنے گھر لانا چاہتا ہوں۔ تم مجھے اس پھول جیسی پیاری لگتی ہو"۔

"پھول کسی کے پاس چل کر نہیں جایا کرتے امیرِ محترم!" ــــ زرّیں نے مسکراتے ہوئے کہا ــــ "پھولوں کے شیدائی خود چل کر پھولوں کے پاس جایا کرتے ہیں اور وہ کانٹوں میں سے

بھی پھول توڑ لیا کرتے ہیں۔ آپ نے یہ پھول جو مجھے دیا ہے' ہاتھ لمبا کر کے توڑا ہے۔ آپ کسی پھول کو حکم دیں کہ وہ آپ کے پاس آجائے۔ کیا پھول آپ کے حکم کی تعمیل کرے گا؟"

ذاکر نے قہقہہ لگایا اور اس کے ساتھ ہی لڑکی کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے کر اپنے قریب کر لیا۔ زرّیں نے مزاحمت نہ کی۔

"تم جتنی حسین ہو اتنی ہی دانشمند ہو" ــــ ذاکر نے کہا ــــ "اب تو میں تمہیں ہر قیمت پر حاصل کروں گا"۔

"اور میں اپنی جان کی قیمت دے کر بھی آپ سے بھاگوں گی" ــــ زرّیں نے پہلے جیسی شگفتگی سے کہا۔

"وہ کیوں؟"

"میں نے بادشاہوں کی بہت کہانیاں سنی ہیں" ــــ زرّیں نے کہا ــــ "آپ جیسے امیر بھی بادشاہ ہوتے ہیں۔ مجھ جیسی لڑکی پر فریفتہ ہو کر اسے زرو جواہرات میں تول کر اپنے حرم میں ڈال لیتے ہیں اور جب انہیں ایسی ہی ایک اور لڑکی مل جاتی ہے تو وہ پہلی لڑکی کو حرم کے کباڑ خانے میں پھینک دیتے ہیں۔ میں فروخت نہیں ہونا چاہتی اے امیرِ قلعہ!.... ہاں اگر آپ کے سپاہی مجھے زبردستی اٹھا کر آپ کے محل میں پہنچا دیں تو میں کچھ نہیں کر سکوں گی۔ میرا بوڑھا باپ احمد بن غطاش بھی سوائے آنسو بہانے کے کچھ نہیں کر سکے گا۔ وہ بوڑھا بھی ہے' عالمِ دین بھی ہے اور وہ شاید تلوار بھی نہیں چلا سکتا"۔

"نہیں زرّیں!" ــــ ذاکر نے کہا ــــ "احمد بن غطاش کی طرح میں بھی سُنّی مسلمان ہوں۔ کیا تم نے کبھی مسلمانوں میں کوئی بادشاہ دیکھا ہے؟ پھر میں کسی ملک کا حکمران نہیں۔ میں سلجوقی سلطان کا ملازم ہوں۔ حکومت سلطان ملک شاہ کی ہے۔ وہ بھی اپنے آپ کو بادشاہ نہیں سمجھتے۔ میرے پاس کوئی حرم نہیں۔ دو بیویاں ہیں جو جوانی سے آگے نکل گئی ہیں۔ وہ تمہاری خدمت کیا کریں گی اور وہ تمہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گی"۔

اُس دور میں عربوں میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا رواج تھا۔ اُس وقت سوکن کا تصور نہیں تھا۔ بیویاں ایک دوسری کے ساتھ خوش و خرم رہتی تھیں۔ یہاں تک بھی ہوتا تھا کہ خاوند عیاش طبیعت ہو تو کبھی کبھی کوئی بیوی اپنی کسی سہیلی کو ایک آدھ رات کے لئے اپنے

خاوند کو تحفے کے طور پر پیش کرتی تھی۔ داستان گو جس دور اور جس خطے کی کہانی سنا رہا ہے' وہاں سلجوقی سلاطین کی حکومت تھی۔ سلجوقی ترک تھے۔ ان کے ہاں بھی یہی رواج تھا۔ اسلام قبول کر کے انہوں نے بھی اپنے آپ کو پابند کر لیا تھا کہ ایک آدمی زیادہ سے زیادہ چار بیویاں رکھ سکتا ہے۔ حرم کا تصوّر عربوں کی طرح ان کے ہاں بھی ناپید تھا۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ سلجوقی بیویوں کے حقوق کا پورا پورا خیال رکھتے تھے۔

زرّیں نے جب ذاکر سے یہ سنا کہ اس کی دو بیویاں ہیں اور دونوں جوانی سے آگے نکل گئی ہیں تو اُس پر ایسا کوئی اثر نہ ہُوا کہ اس کی دو سوکنیں ہوں گی۔

"میں تمہیں زبردستی نہیں اٹھواؤں گا زرّیں!" ــــ ذاکر نے کہا ــــ "نہ میں تمہیں زرو جواہرات میں تولوں گا۔ میں اللہ اور رسولؐ کے احکام کے مطابق تم سے نکاح پڑھواؤں گا۔ فیصلہ تم کرو گی"۔

"تو پھر اُس پودے کے پاس جائیں جس کا پھول توڑنا ہے" ــــ زرّیں نے کہا۔

"ہاں زرّیں!" ــــ ذاکر نے کہا ــــ "میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں۔ میں احمد بن غطاش کے ساتھ بات کروں گا.... میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں زرّیں! پہلے تو مجھے تمہارا یہ معصوم حسن اچھا لگا تھا لیکن میں نے دیکھا کہ تم میں عقل و دانش بھی ہے تو میں نے کہا تھا کہ میں تمہیں ہر قیمت پر حاصل کروں گا۔ یہ اس لئے کہا تھا کہ میں اس قلعے کا حاکم ہوں۔ تم جیسی دانشمند بیوی میرے لئے سود مند ثابت ہو گی۔ تم مجھے سوچ بچار میں مدد دو گی"۔

"میرے باپ سے فیصلہ لے لیں" ــــ زرّیں نے قدرے سنجیدگی سے کہا ــــ "میں نے آپ کو ٹھکرایا نہیں لیکن میں آپ کو یہ بتا دیتی ہوں کہ مجھے دولت نہیں محبت چاہئے"۔

ذاکر نے زرّیں کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر زرا ملا اور کچھ دبایا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔

"زرّیں!" ــــ ذاکر نے بڑے سنجیدہ لہجے میں کہا ــــ "میری فطرت بادشاہوں جیسی ہوتی تو میں درہم و دینار کی ایک تھیلی تمہارے قدموں میں رکھ دیتا لیکن نہیں۔ میں محبت کو محبت سے خریدوں گا"۔

ذاکر گھوڑے پر سوار ہُوا اور ایڑ لگا دی۔ اس کے محافظ اور مصاحب ندی کے پل پر اس کے منتظر تھے۔

"ایک بات غور سے سن لو" ـــ ذاکر نے کہا ـــ "اگر کوئی ہرن سامنے آئے تو مجھے دیکھ کر یہ ضرور بتا دیا کرو کہ یہ نر ہے یا مادہ۔ بھی کسی ہرنی کو نہیں مارنا۔ ہو سکتا ہے وہ بچے والی ہو۔"

○

ذاکر شکار سے واپس آ رہا تھا۔ اُس نے ایک ہی ہرن مارا تھا لیکن اُس روز وہ بہت بڑا شکار کھیل آیا تھا۔ وہ زرّیں تھی جو ادھ کھِلے پھول کی طرح معصوم تھی۔

ذاکر کو ابھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ شکار کر کے آیا ہے یا خود شکار ہو گیا ہے۔

زرّیں نے اُسے اپنی بستی بتا دی تھی جو قلعے سے تھوڑی ہی دور تھی۔ اس بستی کے قریب آ کر ذاکر نے گھوڑا روک لیا اور اپنے ایک مصاحب سے کہا کہ یہاں احمد بن غطاش نام کا ایک عالمِ دین رہتا ہے اُسے میرا اسلام پہنچایا جائے۔

ایک مصاحب نے گھوڑا دوڑا دیا اور وہ بستی کی گلیوں میں غائب ہو گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اُس کے ساتھ ایک آدمی تھا جو سر سے پاؤں تک سفید چغے میں ملبوس تھا۔ اُس کے سر پر سلجوقی ٹوپی تھی اور ٹوپی پر سفید رومال تھا جو کندھوں تک لٹک رہا تھا۔ اس کی داڑھی لمبی تھی اور اس کے لباس کی طرح سفید۔ ذاکر نے اسے بستی سے نکلتے دیکھا تو گھوڑے سے کود کر اترا اور بہت ہی تیز چلتا اس شخص تک پہنچا۔ جھک کر سلام کیا پھر اُس کے گھٹنے چھو کر مصافحہ کیا۔

"احمد بن غطاش؟"

"ہاں امیرِ قلعہ؟" ـــ اس شخص نے کہا ـــ "احمد بن غطاش میں ہی ہوں ... میرے لئے حکم؟"

"کوئی حکم نہیں اے عالمِ دین!" ـــ ذاکر نے التجا کے لہجے میں کہا ـــ "ایک درخواست ہے ... کیا آپ آج کا کھانا میرے ہاں کھانا پسند فرمائیں گے؟"

"زہے نصیب!" ـــ احمد بن غطاش نے کہا ـــ "حاضر ہو جاؤں گا .... مغرب کی نماز کے بعد؟"

ذاکر نے ایک بار پھر جھک کر اُس سے مصافحہ کیا اور واپس آ گیا۔

مغرب کی نماز کے بعد احمد بن غطاش ذاکر کے محل نما مکان میں اُس کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا تھا۔ کھانے کے دوران ہی ذاکر نے درخواست کے لہجے میں احمد بن غطاش سے کہا کہ وہ اس

کی بیٹی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ زرّیں اُسے کہاں ملی تھی اور یہ بھی کہ زرّیں نے اسے بتایا تھا کہ وہ احمد بن غطاش کی بیٹی کس طرح بنی تھی۔

"اللہ نے میری دعائیں قبول کر لی ہیں" ـــ احمد بن غطاش نے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر کہا ـــ "میں نے اس بچی کو طوفان میں سے نکالا تھا اور اسے بڑے پیار سے پالا ہے۔ میں دعائیں مانگا کرتا تھا کہ اس بچی کی زندگی خانہ بدوشوں جیسی نہ ہو اور اس کا مستقبل روشن ہو۔ اگر آپ نے اسے اپنی رفاقت کے قابل سمجھا ہے تو بچی کے لئے اور میرے لئے اور خوش نصیبی کیا ہو گی۔"

○

دو چار ہی دنوں بعد زرّیں دلہن کے لباس میں ذاکر کی زندگی میں داخل ہو گئی۔ ذاکر کی دونوں بیویوں نے بڑے پیار سے اس کا استقبال کیا۔ ذاکر نے دو خادمائیں زرّیں کے لئے وقف کر دیں۔

"مجھے کسی خادمہ کی ضرورت نہیں" ـــ زرّیں نے ذاکر سے کہا ـــ "میں آپ کی خدمت اپنے ہاتھوں کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ رات کو آپ دودھ پیتے ہیں تو وہ خادمہ آپ کو دیتی ہے۔ آئندہ یہ دودھ میں خود آپ کے لئے تیار کیا کروں گی۔ میں جانتی ہوں آپ دودھ میں شہد ملا کر پیتے ہیں۔"

ذاکر کی عمر پچاس سال ہو چکی تھی۔ اسے غالباً توقع نہیں تھی کہ سترہ سال عمر کی اتنی حسین لڑکی اس پر فریفتہ ہو جائے گی۔ اُس نے زرّیں کو اجازت دے دی کہ رات کا دودھ وہ خود اسے پلایا کرے گی۔

کچھ دنوں بعد زرّیں نے ذاکر سے کہا کہ جس شخص نے اسے طوفان سے بچایا اور اتنے پیار سے پالا ہے' اس کے بغیر وہ اپنی زندگی بے مزہ سی محسوس کرتی ہے۔ ذاکر احمد بن غطاش کو اجازت دے دے کہ وہ ایک دو دنوں بعد کچھ وقت یہاں گزارا کرے۔

مختصر یہ کہ یہ نوخیز لڑکی ذاکر کے دل و دماغ پر چھا گئی۔ ذاکر نے احمد بن غطاش کو بلا کر بڑے احترام سے کہہ دیا تھا کہ وہ جب چاہے اس کے گھر آ جایا کرے اور جتنے دن چاہے رہا کرے۔

ذاکر کو ذرا سا بھی شک نہ ہوا کہ احمد بن غطاش چاہتا ہی یہی ہے کہ اُسے ذاکر کے گھر میں داخلہ مل جائے اور احمد اپنی سازش کو اگلے مرحلے میں داخل کرے۔ وہ اجازت مل گئی اور احمد ذاکر

کے گھر جانے لگا۔

ذاکر کو یہ شک بھی نہ ہُوا کہ احمد بن غطاش کٹر باطنی ہے اور فرقہ باطنیہ کا پیشوا اور اس فرقے کی زمین دوز تنظیم کا بڑا ہی خطرناک لیڈر ہے۔ وہ جس بستی میں رہتا تھا وہاں باقاعدہ خطیب بنا ہُوا تھا اور ہر کوئی اسے اہلِ سُنّت سمجھتا تھا۔

تاریخ نویس ابوالقاسم رفیق دلاوری مرحوم نے مختلف مؤرخوں کے حوالے سے لکھا ہے کہ ایک طرف ایک نوخیز لڑکی امیرِ قلعہ کے اعصاب پر غالب آگئی اور دوسری طرف احمد بن غطاش نے مذہب کے پردے میں اپنی زبان کا جادو چلانا شروع کر دیا۔ ذاکر احمد بن غطاش سے اس قدر متاثر ہُوا کہ اُس نے بعض سرکاری امور میں بھی اُس سے مشورے لینے شروع کر دیئے۔ زرّیں کو خصوصی ٹریننگ دی گئی تھی جس کے مطابق وہ ذاکر کو ہپناٹائز کئے رکھتی تھی۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس لڑکی نے ذاکر کو یہ جو پیشکش کی تھی کہ اُسے وہ خود دودھ پلایا کرے گی، اس سازش کی ایک اہم کڑی تھی۔ وہ دودھ میں اُسے ہر روز کچھ گھول کر پلاتی تھی جس کے فوری طور پر اثرات ظاہر ہونے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔ یہ اثرات اندر ہی اندر اپنا کام کر رہے تھے۔ اس دوائی میں نشے کا بھی کچھ اثر تھا جو کچھ اس طرح تھا کہ ذاکر کے مزاج میں بڑی خوشگوار تبدیلی آجاتی تھی اور وہ زرّیں کے ساتھ ہم عمر ہجولیوں کی طرح کھیلنے لگتا تھا۔

صرف ایک بار ایسے ہُوا کہ ذاکر کی ایک بیوی نے زرّیں کو یہ دوائی دودھ میں ڈالتے دیکھ لیا اور زرّیں سے پوچھا بھی کہ اُس نے دودھ میں کیا ڈالا ہے۔ زرّیں نے بڑی خود اعتمادی سے کہا کہ اُس نے کچھ بھی نہیں ڈالا۔ اس بیوی نے ذاکر کو بتایا اور کہا کہ اُسے شک ہے کہ زرّیں ذاکر کو دودھ میں کوئی نقصان دہ چیز پلا رہی ہے۔ ذاکر کا ردِعمل یہ تھا کہ اُس نے اس بیوی کو طلاق تو نہ دی لیکن اسے یہ سزا دی کہ اسے الگ کر دیا اور اُس کے ساتھ کچھ عرصے کے لئے میاں بیوی کے تعلقات ختم کر دیئے۔

کم و بیش تین مہینوں بعد ذاکر صاحبِ فراش رہنے لگا لیکن وہ یہ بیان نہیں کر سکتا تھا کہ بیماری کیا ہے اور تکلیف کس نوعیت کی ہے۔ طبیبوں نے اس کے علاج میں اپنا پورا علم صرف کر ڈالا لیکن نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اٹھ کر ایک قدم بھی چلنے کے قابل نہ رہا۔

اُس کے بستر کے قریب احمد بن غطاش اور زرّیں ہر وقت موجود رہتے تھے۔ اس کیفیت میں

مریض کو وہ انسان فرشتہ لگتا ہے جو اُس کی تیمارداری پوری ہمدردی سے کرے اسے یہ احساس دلاتا رہے کہ وہ جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔

احمد بن غطاش نے اُس کے پاس بیٹھ کر بڑی ہی پُرسوز آواز میں تلاوتِ قرآن پاک شروع کر دی۔ ذاکر کو اس سے کچھ سکون ملتا تھا۔

پھر وہ وقت بھی آگیا کہ ذاکر نے کہا کہ وہ زندہ نہیں رہ سکے گا۔ اُس نے سلطان ملک شاہ کے نام ایک پیغام لکھوایا جس میں اُس نے احمد بن غطاش کی دانشمندی اور علم و فضل کا ذکر کیا اور لکھوایا کہ اُس کی آخری خواہش ہے کہ اس قلعے کا امیر احمد بن غطاش کو مقرر کیا جائے۔

ذاکر مرتے دم تک احمد بن غطاش کو سُنّی سمجھتا رہا۔ دو چار روز بعد وہ اللہ کو پیارا ہو گیا۔

اُس کی موت کی اطلاع سلطان ملک شاہ کو ملی تو اُس نے پہلا حکمنامہ یہ جاری کیا کہ آج سے قلعہ شاہ در کا امیر احمد بن غطاش ہے۔

اُس وقت تک بہت سے باطنیوں کو قید میں ڈالا جا چکا تھا۔ سلجوقی چونکہ اہلِ سُنّت و الجماعت تھے اس لئے انہیں جوں ہی پتہ چلتا تھا کہ فلاں شخص اسماعیلی یا باطنی ہے، اُسے قید میں ڈال دیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ زیادہ تر باطنی اپنے آپ کو سُنّی کہلاتے تھے لیکن خفیہ طریقوں سے وہ بڑی ہی خوفناک سازشیں تیار کر رہے تھے۔

احمد بن غطاش نے امیرِ قلعہ بنتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اُن تمام باطنیوں کو جو قلعے کے قید خانے میں بند تھے، رہا کر دیا، پھر اُس نے درپردہ باطنیوں کو قلعے کے اندر آباد کرنا شروع کر دیا اور باطنیوں پر جو پابندیاں عائد تھیں وہ منسوخ کر دیں۔

اس کے فوراً بعد قافلے لُٹنے لگے اور رہزنی کی وارداتیں بڑھنے لگیں۔ ان وارداتوں کا مقصد پیسہ اکٹھا کرنا تھا۔

یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ احمد بن غطاش علمِ نجوم اور علمِ سحر کا ماہر تھا۔ خطابت میں اُس کی مہارت ایسی تھی کہ سننے والے پر طلسماتی سا تاثر طاری ہو جاتا تھا۔

یہ تھا وہ قلعہ شاہ در جس میں حسن بن صباح فرحی اور اپنے راہبر کے ساتھ داخل ہُوا تھا۔ راہبر اُسے سیدھا امیرِ قلعہ احمد بن غطاش کے گھر لے گیا۔ یہ گھر محل جیسا مکان تھا۔ احمد بن غطاش کو اطلاع ملی کہ رے سے حسن بن صباح آیا ہے تو اُس نے کہا کہ اسے فوراً اندر بھیجا

جائے۔

''آ نوجوان!'' ـــ احمد بن عطاش نے حسن بن صباح کو اپنے سامنے دیکھ کر کہا ـــ ''میں نے تیری بہت تعریفیں سنی ہیں۔ آج آرام کر لو کل صبح سے تمہیں بتایا جائے گا کہ کیا کرنا ہے اور اب تک کیا ہو چکا ہے''۔

حسن بن صباح نے جھک کر سلام کیا اور باہر نکل آیا۔ اہلِ سُنت سلطان ملک شاہ کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اُس کی سلطنت میں ابلیس اُتر آیا ہے۔

حسن بن صباح اُس جگہ پہنچ گیا جہاں سے اُس نے اپنے تاریخی سفر کا آغاز کرنا تھا۔ ابلیس اُس کا ہمسفر اور ابلیس ہی اُس کا میرِ کارواں تھا۔

حسن بن صباح ایک انسان تھا.... تنِ تنہا.... اکیلا انسان.... سلاطینِ سلجوق کی سلطنتِ اسلامیہ کا ایک فرد جس کی حیثیت ایک عام اور گمنام آدمی سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ کسی قبیلے کا سردار نہیں تھا۔ اُس کے پاس کوئی لشکر نہیں، کوئی فوج نہیں تھی۔ دو چار آدمی بھی اس کے ساتھ نہیں تھے جو تیغ زن یا تیر انداز ہوتے۔ وہ خود بھی تو شمشیر زن اور شہسوار نہیں تھا۔

اُس کے پاس صرف ایک طاقت تھی، اور وہ تھی ابلیسیت!

اس ایک آدمی نے اسلام کی عمارت کو بھونچال کے جھٹکوں کی طرح ہلا ڈالا اور ثابت کر دیا تھا کہ ابلیسی طاقتیں خدائی طاقت کو چیلنج کر سکتی ہیں۔ یہ بعد کی بات ہے کہ خدائی طاقت کو چیلنج کرنے والے کیسے کیسے بھیانک انجام کو پہنچے۔

اسلام آج تک ابلیسی طاقتوں کے لئے چیلنج بنا ہُوا ہے۔ ایک وقت تھا کہ مسلمانوں نے اُس دور کی دو سپر پاورز، روم اور فارس کو ریت کے گھروندوں کی مانند روند کر ان ملکوں میں اللہ کی حکومت قائم کر دی تھی۔ پھر مسلمان جدھر کا رخ کرتے ادھر بغیر لڑے قلعے ان کے حوالے کر دیئے جاتے تھے۔ مسلمانوں نے ملک نہیں لوگوں کے دل فتح کئے تھے۔ انہوں نے اپنی دہشت طاری نہیں کی دستگیری کی تھی۔۔ مظلوم و مجبور رعایا کی دستگیری!

آج مسلمان ابلیسی طاقتوں کے محاصرے میں آئے ہوئے ہیں اور ان کا قتلِ عام ہو رہا ہے۔ یہ اسلام کو ختم کرنے کے جتن ہیں لیکن:

نُورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بُجھایا نہ جائے گا

قتل مسلمان ہو رہے ہیں، اسلام زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔
پروانے جل رہے ہیں، چراغ روشن ہے اور روشن رہے گا۔
جس چراغ کو غارِ حرا کی تاریکی نے نور عطا کیا تھا، وہ اسلام کے جاں نثاروں کے لہو سے جل رہا ہے۔

دنیا میں مسلمانوں کا نام و نشان نہیں رہے گا۔ صرف ایک مسلمان حاملہ عورت زندہ رہے

گی۔ اُس کے بطن سے جو بچہ پیدا ہوگا' وہ اسلام کو زندہ رکھے گا۔

داستان گو حسن بن صباح کی داستان سنا رہا ہے لیکن وہ محسوس کرتا ہے کہ مختصر سا قصہ تکذیب کے اُن علمبرداروں کا بھی سنا دے جنہوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے ساتھ ہی نبوّت کے دعوے کیے اور اپنے اپنے انجام کو پہنچے تھے۔

حسن بن صباح بھی اپنے ذہن اور دل میں نبوّت کے عزم کی پرورش کر رہا تھا۔

تکذیب اور ارتداد کا مقصد اسلام کی بیخ کنی تھا۔ یہ سلسلہ بڑا ہی دراز ہے۔ داستان گو اس کی جھلک پیش کرے گا تاکہ یہ اندازہ ہو جائے کہ دین کے دشمن اُسی روز سے اسلام کے درپے ہیں جس روز پہلے آدمی نے اسلام قبول کیا اور اس شہادت کا اقرار کیا تھا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' اللہ واحدہٗ لاشریک ہے' محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔

اسلام نے یہود و نصاریٰ اور تکذیب و ارتداد کے بڑے تیز و تند طوفان دیکھے ہیں لیکن اللہ کا سچا دین تاقیامت زندہ و پائندہ رہنے کے لئے آیا تھا۔

حسن بن صباح کی جنّت اسی اسلام دشمن سلسلے کی ایک کڑی تھی۔

○

آیئے' ذرا ابلیس کا رقص دیکھ لیجئے پھر حسن بن صباح کو سمجھنا آسان ہو جائے گا ورنہ بے خبر لوگ جو اُس کے صرف نام سے واقف ہیں' اُسے افسانوی کردار ہی سمجھتے رہیں گے۔

سجاح بنت حارث تمیمہ ہوازن کے قبیلہ بنو تمیم کی سرکردہ عورت تھی۔ عیسائیت کی پیرو کار تھی اور وہ دریائے دجلہ اور فرات کے اُس درمیانی علاقے کی رہنے والی تھی جو الجزیرہ کہلاتا ہے۔ وہ عالم شباب میں تھی اور حسین بھی تھی۔

اُس کے حُسن کے متعلق مؤرخ لکھتے ہیں کہ بنو تمیم میں اُس سے زیادہ حسین عورتیں بھی موجود تھیں لیکن سجاح کی شکل و شباہت اور جسم کی ساخت میں کوئی ایسا تاثر تھا جو دیکھنے والوں کو مسحور کر لیتا تھا۔ اس کا زیرِلب تبسّم اپنا ایک اثر پیدا کرتا تھا لیکن اُس کا اصل حُسن اُس کے اندازِ دلربائی میں تھا۔ وہ جب بات کرتی تھی تو اُس کے ہاتھوں کی حرکت' آنکھوں کے بدلتے ہوئے زاویے اور گردن کے خم دوسروں کے دل موہ لیتے تھے۔

اُس نے اپنے آپ میں یہ خوبی بھی پیدا کر رکھی تھی کہ اُس کے پاس کوئی عبادت گزار اور پارسا آ بیٹھتا تو وہ ایسے انداز سے بات کرتی تھی کہ پارسا اُسے اپنے سے زیادہ پارسا سمجھ لیتے اور اس کے عقیدت مند ہو جاتے تھے۔ کوئی عیاش دولت مند اُس کے پاس آتا تو وہ اس عورت کو اپنے جیسی سمجھ کر اُس پر دولت نچھاور کرنے لگتا مگر سجاح اُسے اپنے جسم سے دو ہاتھ دور ہی رکھتی تھی۔ وہ شخص اُس کا گرویدہ ہو جاتا اور اُس کے اشاروں پر ناچتا تھا۔

کوئی امیر ہوتا یا غریب' گناہ گار ہوتا یا نیکوکار' وہ سجاح کو اپنا مونس و غم خوار سمجھتا تھا۔

مؤرخوں نے متفقہ طور پر لکھا ہے کہ سجاح کاہنہ تھی۔ اُس زمانے میں وہ آدمی جو مذہبی پیشوا ہونے کے ساتھ ساتھ علمِ جوتش و نجوم کا بھی ماہر ہوتا اور آنے والے وقت کے متعلق پیش گوئی کی اہلیت رکھتا وہ کاہن کہلاتا تھا اور ایسی عورت کو کاہنہ کہتے تھے۔

وہ توہم پرستی اور پسماندگی کا دور تھا۔ لوگ جوتشیوں اور نجومیوں کے آگے سجدے کرتے اور قسمت کا حال پوچھتے تھے۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ کاہن بگڑی ہوئی قسمت کو سنوار سکتے ہیں۔

تاریخ نویس ابوالقاسم رفیق دلاوری' ابنِ اثیر' بلاذری اور "دبستان مذاہب" کے حوالوں سے لکھتے ہیں — "سجاح بنت حارث فصیح اور بلیغ اور بلند حوصلہ عورت تھی۔ اسے تقریر و گویائی میں یدِطولیٰ حاصل تھا۔ جدتِ فہم' جودتِ طبع اور اصابتِ رائے میں اپنی نظیر نہیں رکھتی تھی"۔

ایک تو عالمِ شباب تھا' دوسرے اندازِ دلربائی تھا اور تیسرے یہ کہ اُس نے شادی نہیں کی تھی۔ دولت والے' جاگیروں والے وہ تاجر جن کا مال سینکڑوں اونٹوں پر آتا اور جاتا تھا' اُس کی رفاقت کے امیدوار تھے۔ وہ اپنا دامن بچائے رکھتی اور کسی کو مایوس بھی نہیں کرتی تھی۔

انسانی فطرت کے عالم لکھتے ہیں کہ عربی عراق کی یہ عورت کاہنہ تھی یا نہیں البتہ اپنے ناز و انداز سے وہ جس طرح پتھروں کو بھی موم کر لیتی تھی' اس سے یہ یقینی تاثر ابھرتا تھا کہ وہ ساحرہ ہے۔ وہ اپنے مذہب عیسائیت کی پیشوا بنی ہوئی تھی یہ اُس کا ظاہری روپ تھا جو دراصل بہروپ تھا۔ اُس نے اندرونی طور پر اپنے کردار میں ابلیسی اوصاف پیدا کر لئے تھے اور وہ اُس مقام پر پہنچ گئی تھی جہاں انسان مکمل ابلیس بن جاتا ہے اور اس میں مسحور کر لینے والے اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں۔

○

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرما گئے تو نبوّت کے متعدد دعویدار پیدا ہو گئے۔ ان

میں جس نے سب سے زیادہ شہرت پائی وہ مسیلمہ تھا۔ اُس کا نام مسیلمہ بن کبیر تھا۔ رحمٰن یمامہ کے نام سے مشہور تھا۔ آخر وہ مسیلمہ کذاب اور کذّابِ یمامہ کے نام سے مشہور ہُوا کیونکہ جھوٹ بولنے میں وہ یکتا تھا۔ جھوٹ بھی وہ ایسے انداز سے بولتا تھا کہ جو لوگ جانتے تھے کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے وہ بھی اُس کے جھوٹ کو سچ مان لیتے تھے۔

عجیب بات یہ ہے کہ مسیلمہ کی عمر سو سال کے لگ بھگ تھی جب اُس نے نبوّت کا دعویٰ کیا تھا۔ اُس کی جسمانی صحت کا یہ عالم تھا کہ جسمانی طاقت کے مظاہروں میں جوان بھی اُس کے مقابلے میں بعض اوقات پیچھے رہ جاتے تھے۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ خوراک اچھی ہونے کے علاوہ وہ فطری طور پر متحمل مزاج تھا۔ کوئی اُس کے منہ پر اس کے خلاف بُری بات کہہ دیتا تو اسے بھی وہ خندہ پیشانی سے برداشت کرتا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رہتی تھی۔ غصہ تو اسے آتا ہی نہیں تھا۔ اپنے دشمن سے بھی انتقام نہیں لیتا تھا بلکہ ایسی بُردباری اور نرمی سے بات کرتا تھا کہ دشمن بھی اُس کے قائل ہو جاتے تھے۔

ایسے کردار اور عادات کی بدولت ایک تو اُس کی صحت ضعیف العمری میں بھی جوانوں جیسی رہی اور دوسرے یہ اثرات دیکھنے میں آئے کہ اُس نے نبوّت کا دعویٰ کیا تو لوگ اُس کے گرویدہ ہو گئے۔

مسیلمہ نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں ہی نبوّت کا دعویٰ کر دیا تھا لیکن اُس نے یہ نہیں کہا تھا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول نہیں بلکہ اُس نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ رسالت میں برابر کا شریک ہے اور اُس پر بھی وحی نازل ہوتی ہے۔ اُس نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں خط لکھا تھا کہ وہ نبوّت میں آپؐ کا برابر کا شریک ہے اور عرب کی سرزمین نصف آنحضورؐ کی اور نصف اُس کی ہے۔

تاریخوں میں آیا ہے کہ جب یہ خط رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچا تو آپؐ نے قاصد سے کہا —— "اگر قاصد کا قتل جائز ہوتا تو میں تجھے قتل کر دیتا" —— یہاں یہ بتانا دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ یہ پہلا قاصد تھا جسے آنحضورؐ نے یہ الفاظ کہے تھے۔ اس کے بعد آپؐ کے یہ الفاظ ایک قانون یا ضابطے کی صورت اختیار کر گئے۔ کسی کا قاصد یا ایلچی مسلمانوں کے ہاں آتا اور خلیفہ کے سامنے کیسی ہی بدتمیزی کیوں نہ کرتا اُسے معاف کر دیا جاتا تھا۔

مسیلمہ کے پیروکاروں میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچنے لگی۔ اُس نے اپنی آیات لکھنی اور انہیں پھیلانا شروع کر دیا تھا۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ یہ آیات اُس پر بذریعہ وحی آتی ہیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرما گئے تو مسیلمہ کھل کر سامنے آ گیا۔ اُس نے معجزے دکھانے بھی شروع کر دیئے تھے۔

حیرت ہے کہ لوگ یہ دیکھتے تھے کہ مسیلمہ کوئی معجزہ دکھانے لگتا تو وہ بالکل اُلٹ ظاہر ہوتا، پھر بھی لوگ بیعت کرتے چلے جا رہے تھے۔

داستان گو نے حسن بن صباح کی داستان شروع کی تھی لیکن بات سے بات نکلی تو بہت دُور جا پہنچی۔ چونکہ مسیلمہ کے معجزات دلچسپی سے خالی نہیں اس لئے داستان گو چند ایک "معجزات" سناتا ہے۔

ایک روز مسیلمہ کے پاس ایک عورت آئی اور بولی کہ ان کے نخلستان میں ہریالی ختم ہو رہی ہے اور وہاں جو دو تین چشموں جیسے کنوئیں ہیں وہ خشک ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

"یارسول!" —— اُس عورت نے کہا —— "ایک بار خزاں کا نخلستان خشک ہو گیا تھا کیونکہ اس کے چشمے نے پانی دینا چھوڑ دیا تھا۔ وہاں کے لوگ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس گئے اور عرض کی کہ ان کا نخلستان خشک ہو گیا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے چُلّو بھر پانی اپنے منہ میں ڈالا اور چشمے میں اُگل دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چشمہ اس طرح پھوٹ پڑا کہ وہاں جھیل بن گئی اور خرما کے درختوں کی جو شاخیں سوکھ کر لٹک آئی تھیں وہ ہری بھری ہو گئیں"۔

مؤرخوں نے لکھا ہے کہ مسیلمہ کذاب نے یہ سنا تو اُسی وقت اٹھا اور اونٹ پر سوار ہو کر اُس عورت کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ جب اُس نخلستان میں پہنچا تو دیکھا کہ کنوؤں میں بہت ہی تھوڑا پانی ہے۔ اُس نے حکم دیا کہ ایک کنوئیں سے تھوڑا سا پانی نکالا جائے۔ پانی نکالا گیا۔ مسیلمہ نے کچھ پانی اپنے منہ میں ڈالا اور کنوؤں میں تھوڑا تھوڑا اُگل دیا۔

تاریخ گواہ ہے کہ کنوؤں میں جو تھوڑا تھوڑا پانی رہ گیا تھا، وہ بھی خشک ہو گیا اور خرما کے درختوں کی جو چند ایک ٹہنیاں ابھی سبز تھیں، وہ بھی سوکھ کر لٹک گئیں۔ اس کے بعد یہ نخلستان مکمل طور پر ریگستان بن گیا۔

اُس کے ساتھیوں میں نہار نام کا ایک خاص ساتھی تھا۔ اُس نے ایک روز مسیلمہ سے کہا کہ

محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس کسی کے بچے کو دیکھتے اُس بچے کے سر پر ہاتھ پھیرا کرتے تھے۔ یہ دیکھا گیا تھا کہ جس بچے کے سر پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ پھیرا اُس بچے میں ایسی ذہانت پیدا ہو گئی کہ لڑکپن میں پہنچنے تک وہ بچہ نامور مجاہد یا دانشور بنا۔

مسیلمہ نے یہ بات سنی تو اُس نے باہر نکل کر اپنے قبیلے بنو حنیفہ کے چند ایک بچوں کو بلایا اور اُن کے سروں پر اور اُن کی ٹھوڑیوں پر ہاتھ پھیرا۔ لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ اُن بچوں کے سروں کے بال گرنے لگے اور سورج غروب ہونے تک یہ تمام بچے گنجے ہو گئے۔ اُن کی ٹھوڑیوں پر ہاتھ پھیرنے کا یہ اثر ہُوا کہ یہ تمام بچے زبان کی لکنت یعنی ہکلاہٹ میں مبتلا ہو گئے۔

مسیلمہ نے کسی سے سنا کہ کسی شخص کی آنکھیں خراب ہو جاتیں او وہ آشوب چشم کا مریض ہو جاتا تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی آنکھوں پر اپنا لعاب دہن لگاتے تو آنکھوں کا جو بھی مرض ہوتا وہ رفع ہو جاتا تھا۔ مسیلمہ نے بھی ایک بار آنکھوں کے ایک مریض کی آنکھوں پر اپنا لعابِ دہن لگا دیا اور وہ شخص بینائی سے ہی محروم ہو گیا۔

ایک عورت اُس کے پاس یہ شکایت لے کر آئی کہ اُس کی اچھی بھلی بکری نے دودھ دینا چھوڑ دیا ہے۔ مسیلمہ کے کہنے پر وہ عورت بکری کو لے آئی۔ مسیلمہ نے بکری کی پیٹھ پر اور پھر تھنوں پر ہاتھ پھیرا۔ نتیجہ یہ سامنے آیا کہ بکری جو چند قطرے دودھ دیتی تھی وہ بھی خشک ہو گئے۔

تاریخوں میں ایک واقعہ نے زیادہ شہرت پائی ہے۔ ایک بیوہ مسیلمہ کے پاس آئی اور کہا کہ وہ بیوہ ہے اور اس کا سہارا بیٹے تھے لیکن زیادہ تر بیٹے مر گئے ہیں، صرف دو زندہ ہیں۔ یا رسول، دعا کریں کہ یہ دونوں بیٹے زندہ رہیں۔

مسیلمہ نے اپنے اوپر مراقبہ طاری کر کے اُس بیوہ کو مژدہ سنایا کہ تمہارے یہ دونوں بیٹے بڑی لمبی عمر پائیں گے۔ بیوہ خوشی خوشی وہاں سے گھر کو چلی۔ گھر پہنچتے ہی اُسے اطلاع ملی کہ اُس کا ایک بیٹا کنوئیں میں گر کر مر گیا ہے۔ اُسی رات دوسرا اور آخری بیٹا تڑپنے لگا۔ کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اُسے کیا ہُوا ہے۔ صبح طلوع ہونے تک وہ بھی مر گیا۔

یہ چند ایک واقعات ہیں۔ ایسے بہت سے واقعات تاریخ کے دامن میں محفوظ ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ اُلٹے اثرات کو بھی لوگ معجزہ ہی کہتے تھے جس کی وجہ یہ ہے کہ مسیلمہ ایسے انداز اور ایسے الفاظ میں ان کی تاویلیں پیش کرتا تھا کہ لوگ انہیں سچ مان لیتے تھے۔

پھر یہ کیا تھا؟ یہ غیرتِ خداوندی تھی۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نبوّت کے ایک جھوٹے دعویدار کو اپنے محبوب رسولؐ کی برابری میں کھڑا نہیں کر سکتا تھا۔ بعض اوقات ایک عام انسان بھی کوئی معجزہ کر گزرتا ہے لیکن اس آدمی کے کردار اور اس کی فطرت کو دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ اس شخص کی روحانی قوتیں بیدار ہیں، اس کے قابو میں ہیں اور قابو میں اس لئے ہیں کہ وہ شخص دین دار اور ایمان دار ہے۔ مسیلمہ تو تھا ہی کذاب یعنی جھوٹ بولنے والا۔ جھوٹ ایک ایسی لعنت ہے جو بنے بنائے کام بھی بگاڑ دیتا ہے اور وہ انسان اللہ کے حضور جو دعا کرتا ہے اُس کا اثر اُلٹا ہوتا ہے۔

مسیلمہ کی مقبولیت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد اتنی بڑھی کہ اُس نے ایک لشکر تیار کر لیا۔ خلیفہ اوّل حضرت ابو بکر صدیقؓ کو مسیلمہ کی اس جنگی طاقت کی اطلاع ملی تو انہوں نے اُس کے خلاف اعلانِ جہاد کیا۔ مسیلمہ کی لڑائیاں تین سالاروں سے ہوئی تھیں۔ ایک تھے عکرمہؓ دوسرے تھے شرجیل بن حسنہ اور تیسرے تھے خالد بن ولیدؓ۔ آخر شکست تو مسیلمہ کو ہوئی تھی لیکن اُس کی جنگی طاقت کا یہ عالم تھا کہ اُس نے تاریخِ اسلام کے ان تین نامور سپہ سالاروں کو حیران و پریشان کر دیا تھا۔ کئی ایسے مواقع آئے جب یوں پتہ چلتا تھا کہ فتح مسیلمہ کی ہو گی۔

یہ لڑائیاں ایک الگ اور بڑی ہی ولولہ انگیز داستان ہے لیکن داستان گو اپنی داستان کی طرف لوٹتا ہے۔

○

بات سجاح بنتِ حارث کی ہو رہی تھی۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اس حسین ساحرہ کے دماغ میں آئی کہ مسیلمہ اس بڑھاپے میں نبوّت کا دعویٰ کر کے ایک لشکرِ جرار بھی تیار کر سکتا ہے تو کیوں نہ وہ بھی نبوت کا دعویٰ کرے۔ اُسے اپنے ان اوصاف کا پوری طرح احساس تھا جو لوگوں کے دل موہ لیا کرتے تھے۔ اس وقت تک اس عورت میں ابلیسی اوصاف کُوٹ کُوٹ کر بھرے جا چکے تھے۔

ایک روز اُس نے اپنے قبیلے کو اکٹھا کیا اور اعلان کیا کہ گزشتہ رات خدا نے اُسے نبوّت عطا

کی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک وحی سنادی۔ وہ عیسائی مذہب کی عورت تھی لیکن نبوت کے اس جھوٹے دعوے کے ساتھ ہی عیسائی مذہب ترک کر دیا۔ چونکہ وہ حسین عورت تھی اس لئے لوگ اُس سے متاثر ہو گئے۔

اُس میں جو اوصاف تھے اور جو کشش تھی وہ پہلے بیان ہو چکی ہے۔ اُس کے قبیلے کے سردار اُس کے امیدوار بھی تھے۔ سب سے پہلے ان سرداروں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی۔ سب سے پہلے بنو تغلب نے اُس کی نبوت کو تسلیم کیا جس کی وجہ یہ تھی کہ اس قبیلے کا ایک سردار جو سب سے زیادہ اثر و رسوخ والا تھا سجاح کا گرویدہ ہو گیا تھا۔ ایسا ہی ایک سردار ابن ہبیرہ بنو تمیم کا تھا وہ بھی سجاح کا مرید ہو گیا۔

اُس وقت کا معاشرہ قبیلوں میں منقسم تھا۔ قبیلوں پر سرداروں کا اثر و رسوخ تھا۔ ایک سردار جس طرف جاتا، پورا قبیلہ اُس کے پیچھے جاتا تھا۔ سجاح نے سب سے پہلے قبیلوں کے سرداروں کو زیر اثر لیا اور بہت تھوڑے سے عرصے میں کئی ایک قبیلوں نے اُس کی نبوت کو تسلیم کر لیا۔ یہاں تک کہ بہت سے ایسے لوگ جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا، اسلام سے منحرف ہو کر سجاح کے پیروکار بن گئے۔ سجاح نے مسیلمہ کی طرح ایک لشکر تیار کر لیا اور اُس نے مدینہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کر لیا۔

اُس کے اپنے ایک مشیر مالک بن نمیرہ نے اُسے مدینہ پر حملہ کرنے سے روک دیا اور ان قبیلوں سے نمٹنے کا مشورہ دیا جو اُس کی نبوت کو تسلیم نہیں کر رہے تھے۔ اس طرح سجاح نے اچھی خاصی لڑائیاں لڑیں۔

خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے سجاح کی سرکوبی کے لئے خالد بن ولیدؓ کو بھیجا۔ شرجیل بن حسنہ اور عکرمہؓ ابن ابی جہل بھی ساتھ تھے۔ خالد بن ولیدؓ کو اطلاع ملی کہ ان کا مقابلہ ایک نہیں بلکہ دو لشکروں کے ساتھ ہو گا۔ چنانچہ انہوں نے پیش قدمی اس غرض سے روک لی کہ دشمن کی قوت کا اندازہ جاسوسوں سے کر لیا جائے۔

اِدھر مسیلمہ نے محسوس کیا کہ وہ شکست کھا جائے گا۔ اُس نے سجاح کو پیغام بھیجا کہ وہ اُسے ملنا چاہتا ہے۔ وہ دراصل سجاح کو اپنے ساتھ ملانا چاہتا تھا اور اُس کا ارادہ یہ بھی تھا کہ سجاح پر حاوی ہو کر اُسے اپنے زیر اثر کر لے۔ وہ سجاح کی نبوت کو ختم کرنا چاہتا تھا۔

سجاح نے مسیلمہ کو ملاقات کے لئے اپنے ہاں بلا لیا۔

○

مسیلمہ اپنے ساتھ چالیس ایسے پیروکار لے گیا جو دماغی لحاظ سے بہت ہوشیار اور دانش مند تھے اور تیغ زنی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ مسیلمہ سن چکا تھا کہ سجاح میں کیا کیا خوبیاں ہیں اور اُس کا حُسن کس قدر سحر انگیز ہے۔

مسیلمہ اپنے ساتھ بڑا ہی خوش نما اور بڑے سائز کا خیمہ لے گیا تھا۔ شراب و کباب کا انتظام بھی اس کے ساتھ تھا۔ رنگا رنگ روشنی دینے والے فانوس بھی تھے۔ مختصر یہ کہ عیش و عشرت اور زیب و زینت کا پورا سامان مسیلمہ کے ساتھ تھا۔ وہ ایسے عطر اپنے ساتھ لے گیا تھا جن کی مہک مخمور کر دیتی تھی۔

مسیلمہ اور سجاح کی ملاقات ایک نخلستان میں ہوئی۔ مسیلمہ نے یہ تو سن رکھا تھا کہ سجاح میں ایسے اوصاف موجود ہیں جو پتھر دل مرد کو بھی موم کر دیتے ہیں لیکن وہ سجاح کے سامنے گیا تو اُس نے محسوس کیا کہ سجاح کی شخصیت اس سے زیادہ سحر انگیز ہے جتنی اُس نے سنی تھی۔ تب اُس نے محسوس کیا کہ اس حسین ساحرہ کا میدانِ جنگ میں مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ یہ خطرہ وہ پہلے ہی سوچ چکا تھا۔ اسی لئے وہ اپنے ساتھ یہ سارا ساز و سامان لے گیا تھا۔ اس نے سجاح سے کہا کہ وہ اس کے خیمے میں چلے کیونکہ یہ جگہ اس قابل نہیں کہ سجاح جیسی عورت کسی غیر سے بیٹھ کر بات کرے۔

مسیلمہ معمر اور تجربہ کار آدمی تھا۔ اُس میں دانش مندی بھی تھی۔ اُس نے باتوں باتوں میں سجاح کو اتنا اونچا چڑھا دیا کہ وہ پھولی نہ سمائی اور مسیلمہ کی باتوں میں آ گئی۔ اُسی وقت اٹھی اور مسیلمہ کے ساتھ اس کے خیمے میں چلی گئی۔ اس نے جب خیمے کے اندر زیب و زینت اور آرام و آرائش کا سامان دیکھا تو اس پر کچھ اور ہی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے دماغ پر کچھ اور ہی اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔

یہ اثرات جو اس کے دماغ پر مرتب ہو رہے تھے، یہ اس عطر کی مہک کے اثرات تھے۔ یورپی مؤرخوں میں سے دو نے لکھا ہے کہ یہ ایک خاص عطر تھا جس کی مہک ذہن میں رومانی خیالات پیدا کر دیتی تھی۔

مسیلمہ نے خیمے میں جو بستر لگوایا تھا اس پر ریشمی گدے اور پلنگ پوش تھے۔ اُس نے سجاح کو اس بستر پر بٹھایا اور خود اس کے پاس بیٹھ گیا۔

"میں تمہیں یہاں ایک خاص مقصد کے لئے لایا ہوں"۔۔۔ مسیلمہ نے سجاح سے کہا۔

"اے نبی!"۔۔۔ سجاح نے کہا۔۔۔ "اس خیمے میں آکر میں کچھ اور ہی محسوس کرنے لگی ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے میں یہاں سے نکلنا ہی نہیں چاہوں گی۔ کیا اب آپ مجھے بتائیں گے کہ آپ کا مقصد کیا ہے؟"

"ایک خواہش ہے"۔۔۔ مسیلمہ نے ایسے انداز سے کہا جیسے وہ سجاح کا گرویدہ ہو گیا ہو۔۔۔ "میں تمہاری باتیں سننا چاہتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ تمہاری زبان میں ایسی شیرینی ہے کہ دشمن بھی تمہارے قدموں میں سر رکھ دیتا ہے"۔

"نہیں!"۔۔۔ سجاح نے کہا۔۔۔ "میں چاہتی ہوں کہ آپ کوئی بات کریں"۔

"تمہارے سامنے میں کیا بات کر سکتا ہوں!"۔۔۔ مسیلمہ نے کہا۔

"کوئی تازہ وحی نازل ہوئی ہو تو وہ سنا دیں"۔۔۔ سجاح نے کہا۔

مسیلمہ نے اپنی دماغی قوتوں اور ابلیسی دانش کو بروئے کار لاتے ہوئے سجاح کے ساتھ کچھ باتیں کیں اور اُس کے سامنے سے اٹھ کر بستر پر اس طرح بیٹھ گیا کہ اُس کا جسم سجاح کے جسم کے ساتھ لگ گیا۔ اس نے ایک وحی سجاح کو سنائی۔

مشہور مؤرخ ابنِ اثیر نے لکھا ہے کہ یہ وحی عورتوں کے متعلق تھی اور اس قدر فحش کہ اس کا ترجمہ تحریر میں لایا ہی نہیں جا سکتا۔ اس کے ساتھ ہی مسیلمہ نے سجاح کے جسم کے ساتھ آہستہ آہستہ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔

مسیلمہ نے سجاح کے چہرے پر ایک تبدیلی دیکھی اور اس کے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ دیکھی جو پہلے اس کے ہونٹوں پر نہیں تھی۔ مسیلمہ کو معلوم تھا کہ اس عورت کا شباب جوبن کے انتہائی درجے پر پہنچا ہوا ہے اور اس نے ابھی تک شادی نہیں کی۔ پھر اس نے یہ سوچا کہ اس عورت نے نبوت کا دعویٰ کر رکھا ہے اس لئے کوئی مرد اس کے جسم کے ساتھ تعلق رکھنے کی جرأت نہیں کرتا۔ اس کے تمام پیروکار اس کے جسم کو مقدس اور لائقِ عبادت سمجھتے ہیں لیکن یہ جوان عورت ہے' انسان ہے اور اس میں انسانی جذبات بھی ہیں جن میں حیوانی جذبات بھی

شامل ہیں۔ مسیلمہ کی صرف ایک فحش بات سے ہی سجاح کا چہرہ تمتما اُٹھا تھا۔

مسیلمہ نے ایک اور وحی سنا دی جو پہلی وحی سے زیادہ فحش تھی اور حیوانی جذبات کے لئے اشتعال انگیز بھی تھی۔ اس کے بعد مسیلمہ نے ایسی ہی بلکہ اس سے زیادہ اشتعال انگیز اور بڑی ہی بے حیائی کی باتیں شروع کر دیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ سجاح کے حسن کی تعریفیں کرتا جاتا تھا اور یہ بھی تسلیم کرتا تھا کہ سجاح سچی نبی ہے۔

سجاح کو عطر کی مہک نے اور ریشمی بستر کے گداز نے اور مسیلمہ کی باتوں اور اُس کے انداز نے نبوت کے درجے سے ہٹا کر ایک ایسی جوان عورت کے درجے پر گرا دیا تھا جو جذبات کی تشنگی سے مری جا رہی تھی۔ مسیلمہ اُس کے خیالوں کی یہ تبدیلی اس کے چہرے اور اس کی سانسوں سے محسوس کر رہا تھا جو اُکھڑی جا رہی تھیں۔ مسیلمہ معمر آدمی تھا لیکن اس کا انداز جوانوں والا تھا اور یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے اعضاء پر عمر کی طوالت نے ذرا سا بھی اثر نہیں کیا۔

سجاح نے بے قابو ہو کر مسیلمہ کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیا اور اپنے سینے پر رکھ دیا۔

"میرا ایک مشورہ مانو سجاح!"۔۔۔ مسیلمہ نے کہا۔۔۔ "آؤ ہم شادی کر لیتے ہیں"۔

"وہ کیوں؟"۔۔۔ سجاح نے پوچھا۔۔۔ "کیا آپ کو میرا جسم اتنا اچھا لگا ہے؟"

"جسم کی بات نہ کرو"۔۔۔ مسیلمہ نے کہا۔۔۔ "نبی جسموں کے ساتھ تعلق نہیں رکھا کرتے۔ روح کی بات کرو۔ میں جانتا ہوں تمہارا جسم تشنہ ہے لیکن میرا مطلب یہ ہے کہ ہم دونوں نبی ہیں۔ اگر ہماری فوجیں الگ الگ مسلمانوں کا مقابلہ کرتی رہیں تو دونوں شکست کھا جائیں گی۔ اگر ہماری فوجیں مل کر ایک ہو جائیں تو ہم سارے عرب پر قبضہ کر لیں گے۔ صرف مسلمان ہیں جو ہماری نبوت کو قبول نہیں کرتے اور ہمیں ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ ہم دونوں مل کر مسلمانوں کو ختم کر دیں اور پورے عرب پر قابض ہو کر دوسرے ملکوں پر چڑھائی کریں اور اپنی نبوت کو دُور دُور تک پھیلا دیں"۔

اُس وقت سجاح پر کچھ اور ہی کیفیت طاری تھی۔ اُس پر ابلیسیت کا غلبہ تھا۔ اُس نے اپنے آپ میں خاص طور پر ابلیسی اوصاف پیدا کئے تھے۔ یہ اوصاف اُس پر ایسے غالب آئے کہ اُس

نے مسیلمہ کے آگے ہتھیار ڈال دیئے اور کہا کہ وہ ابھی اس کی بیوی بننے کو تیار ہے۔

مسیلمہ کے ساتھ چالیس آدمی آئے تھے۔ وہ خیمے سے کچھ دور چاک و چوبند کھڑے تھے کہ نہ جانے مسیلمہ کا کوئی حکم کس وقت آجائے۔ تقریباً اتنے ہی آدمی برچھیوں اور تلواروں سے مسلح سجاح کے ساتھ آئے تھے۔ وہ الگ تیار کھڑے تھے۔

دونوں طرف کے یہ مسلح آدمی یقیناً یہ سوچ رہے ہوں گے کہ خیمے کے اندر دونبیوں میں جو مذاکرات ہو رہے ہیں، ان کا نتیجہ نہ جانے کیا ہوگا۔ توقع یہی تھی کہ مذاکرات ناکام ہو جائیں گے کیونکہ ایک نیام میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔

دونوں طرف یہ وہم و گمان بھی نہ تھا کہ خیمے کے اندر کوئی اور ہی کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ بغیر کسی اعلان کے اور بغیر کوئی رسم ادا کئے مسیلمہ اور سجاح میاں بیوی بن چکے تھے اور خیمہ حجلۂ عروسی بنا ہوا تھا۔ سجاح ہوش و حواس گم کر بیٹھی تھی اور اس نے اپنی نسائیت اور نبوت مسیلمہ کے حوالے کر دی تھی۔

مؤرخ لکھتے ہیں کہ مسیلمہ اور سجاح تین دن اور تین راتیں خیمے سے باہر نہ نکلے۔ خیمے میں صرف کھانا اور شراب جاتی تھی۔ باہر کے لوگ پریشان ہوتے رہے کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ آخر چوتھے روز وہ باہر نکلے۔ سجاح کے چہرے پر شرم و ندامت کے تاثرات آگئے۔ یہ اس وقت آئے جب اس نے اپنے مسلح آدمیوں کو دیکھا۔

وہ سر جھکائے ہوئے اپنے لشکر میں پہنچی۔

○

سجاح کے مشیر اور خاص پیروکاروں نے اس سے پوچھا کہ بات چیت کس نتیجے پر پہنچی ہے۔

"میں نے مسیلمہ کی نبوت کو تسلیم کر لیا ہے" — سجاح نے کہا — "اس کی نبوت برحق ہے۔ میں نے اس کے ساتھ نکاح کر لیا ہے۔ اب نبوت میری ہو یا اس کی، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا"۔

"نکاح تو ہو گیا" — سجاح سے پوچھا گیا — "مہر کیا مقرر ہوا ہے؟"

"مہر؟" — سجاح نے کہا — "یہ تو مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ مہر بھی مقرر کرنا تھا"۔

مؤرخوں نے لکھا ہے کہ یہ جواب دے کر سجاح کی آنکھیں جھک گئیں جیسے وہ نادم اور شرمسار ہو۔ اس کا نبوت والا انداز بالکل ہی بدل گیا تھا۔

ان مشیروں نے اسے مشورہ دیا کہ جب کوئی عورت کسی مرد کی زوجیت میں جاتی ہے تو وہ نکاح میں اسے قبول کرنے سے پہلے اپنا مہر مقرر کرواتی ہے۔ اسے مشورہ دیا گیا کہ وہ مسیلمہ کے پاس جائے اور مہر مقرر کروا کر آئے۔

دلچسپ امر یہ ہے کہ اگر مسیلمہ نے اسے اپنی بیوی بنایا تھا تو اسے اپنے ساتھ لے جاتا لیکن اس نے اسے عصمت سے محروم کر کے اس کے لشکر میں بھیج دیا۔ یہ معلوم نہیں کہ اس نے سجاح کو کیا کہہ کر اسے اس کے لشکر میں بھیجا تھا۔ اس کے مشیر سجاح کی اس حرکت پر پریشان سے ہوئے اور اسے بار بار یہی کہا کہ وہ مسیلمہ کے پاس جا کر مہر مقرر کروا لے۔

○

مسیلمہ سجاح کو اس کے لشکر میں بھیج کر خود بڑی تیزی سے وہاں سے کوچ کر گیا اور اپنے قلعہ میں جا پہنچا۔

"تم سب کو چوکنا اور محتاط رہنا ہوگا" — مسیلمہ نے قلعے میں جا کر اپنے محافظوں اور مصاحبین سے کہا — "میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ سجاح کے ساتھ میں نے کیا سلوک کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے پیروکار اور مصاحبین یہ سن کر بھڑک اٹھیں کہ اس نے میرے ساتھ شادی کر لی ہے۔ اگر ان کا ردِعمل یہ ہوا تو وہ ہم پر حملہ کر سکتے ہیں۔ یہ سوچ لو کہ ادھر مسلمانوں کا لشکر آ رہا ہے۔ اگر سجاح کے لشکر نے بھی ہم پر حملہ کر دیا تو ہم پس جائیں گے۔ قلعے کے دروازے دن کے وقت بھی بند رکھو"۔

یہ کوئی بڑا قلعہ نہیں تھا۔ مسیلمہ کا اپنا مکان تھا جو قلعے کی طرح تھا۔ اس نے اندر سے دروازے بند کر لئے تھے۔ سجاح کو اپنے ہاں رکھنے کا اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

اگلے روز سجاح مسیلمہ کے قلعہ نما گھر کے دروازے پر پہنچی۔ دروازہ بند پا کر اس نے کہا کہ مسیلمہ کو اطلاع دی جائے کہ اس کی بیوی سجاح آئی ہے۔ مسیلمہ کو اطلاع پہنچی تو وہ ڈر گیا کیونکہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی کہ وہ اگلے ہی روز اس کے پاس پہنچ جائے۔ مسیلمہ کو یہ بھی بتایا گیا کہ سجاح کے ساتھ اس کا محافظ دستہ بھی ہے۔

تاریخوں میں آیا ہے کہ مسیلمہ نے یہ نہ کہا کہ اسے اندر لے آؤ اور نہ وہ خود دروازے پر آیا۔ وہ مکان کی چھت پر چلا گیا اور وہاں سے سجاح کو پکارا۔

"دروازہ کھلواؤ" ___ سجاح نے کہا ___ "میں اندر آنا چاہتی ہوں"۔

"اس وقت تمہارا اندر آنا ٹھیک نہیں" ___ مسیلمہ نے کہا ___ "یہ بتاؤ تم کیوں آئی ہو"۔

"اپنا مہر مقرر کروانے کے لئے" ___ سجاح نے جواب دیا ___ "نکاح اتنی عجلت میں ہوا ہے کہ مجھے مہر مقرر کروانے کا خیال ہی نہیں رہا"۔

"تو سن لو" ___ مسیلمہ نے کہا ___ "محمد صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے پانچ نمازیں فرض کروا کے لائے تھے۔ اب میں خدا کا رسول ہوں۔ میں تمہیں، تمہارے پیروکاروں اور تمہارے لشکر کو دو نمازیں، صبح اور عشاء کی تمہارے مہر میں معاف کرتا ہوں۔ واپس جا کر منادی کرا دو کہ تم نے مہر میں دو نمازیں معاف کروائی ہیں"۔

سجاح واپس چل پڑی۔ اس کے ساتھ محافظ دستے کے علاوہ اس کا مؤذن شیث بن ربیع بھی تھا۔ تقریباً تمام مسلمان مؤرخوں نے لکھا ہے کہ سجاح کے یہ مصاحب کچھ شرمسار سے تھے وہ سمجھ گئے کہ مسیلمہ نے ان کی نبی کے ساتھ بڑا ہی شرمناک سلوک کیا ہے۔ وہ خود بھی شرمسار ہو رہے تھے۔ سجاح کا ایک خاص مصاحب عطا بن حاجب بھی تھا۔

"ہماری نبی ایک عورت ہے جسے ہم ساتھ لئے پھرتے ہیں" ___ عطا بن حاجب نے کہا ___ "لیکن لوگوں کے نبی مرد ہوتے ہیں اور انہیں شرمسار نہیں ہونا پڑتا"۔

تاریخوں میں یہ بھی لکھا ہے کہ مسیلمہ نے علاقہ یمامہ کے محصولات سجاح کو ایک سال کے لئے دے دیئے تھے لیکن مسلمانوں نے انہیں محصولات وصول کرنے کی مہلت نہ دی۔ خالدؓ بن ولید اپنے لشکر کے ساتھ پہنچ گئے۔ مسیلمہ کے ساتھ نکاح کرنے سے سجاح کی قدر و منزلت اپنے پیروکاروں میں بڑی تیزی سے ختم ہو گئی تھی۔ بڑے اچھے اور قابل پیروکار اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔

سجاح نے جب دیکھا کہ اس کے پاس لڑنے کی طاقت بھی نہیں رہی تو وہ بھاگ اٹھی اور بنو تغلب میں جا پہنچی۔ ابن اثیر اور ابن خلدون نے لکھا ہے کہ سجاح بالکل ہی بجھ کے رہ گئی اور اس نے ایک خاموش اور گمنام زندگی کا آغاز کیا۔ نہ اس میں انداز دلربائی رہا نہ وہ جاہ و جلال رہا

یہاں تک کہ امیر معاویہؓ کا زمانہ آ گیا۔

اسی سال ایسا خوفناک قحط پڑا کہ لوگ بھوکوں مرنے لگے۔ سجاح کا قبیلہ بنو تغلب فاقہ کشی سے گھبرا کر بصرہ جا آباد ہوا۔ سجاح بھی ان کے ساتھ تھی۔ مسلمانوں کے سلوک اور اناج کی مساوی تقسیم سے متاثر ہو کر بنو تغلب کے تمام قبیلے نے اسلام قبول کر لیا۔ سجاح بھی مسلمان ہو گئی اور اس نے سچے دل سے اللہ کی عبادت شروع کر دی۔ اس کے کردار میں جو ابلیسی اوصاف پیدا ہو گئے تھے وہ عبادتِ الٰہی سے دھلنے لگے حتیٰ کہ وہ بالکل ہی متقی اور عبادت گزار بن گئی۔

تھوڑے ہی عرصے بعد وہ بیمار پڑی اور مر گئی۔ ان دنوں ایک صحابی سمرۃؓ ابن جندبؓ بصرہ کے حاکم تھے۔ انہوں نے سجاح کی نماز جنازہ پڑھائی تھی۔

سجاح پر تو اللہ نے اپنا خاص کرم کیا کہ وہ دین داری کی حالت میں مری اور اس کی عاقبت محفوظ ہو گئی لیکن مسیلمہ کا انجام کچھ اور ہوا۔ اس نے مسلمانوں کے خلاف بڑی خونریز لڑائیاں لڑی تھیں۔ معمر ہونے کے باوجود وہ جوانوں کی طرح لڑتا تھا۔

آخری لڑائی میں جب اس نے دیکھا کہ خالد بن ولیدؓ کا لشکر اس کے گھر تک آ پہنچا ہے تو وہ خود زرہ اور آہنی خود پہن کر گھوڑے پر سوار ہوا اور باہر نکلا۔

پہلے وہ باغ میں گیا جہاں لڑائی ہو رہی تھی پھر وہ باغ سے نکلا۔ جونہی وہ آگے آیا۔ ایک برچھی اس کے سینے میں دل کے مقام پر اتر گئی۔

برچھی مارنے والا عرب کا مشہور برچھی باز وحشی تھا۔ اس کا نام ہی وحشی تھا۔ اس کی برچھی بازی کا ایک کمال تاریخ کے دامن میں محفوظ ہے۔ ایک رقاصہ کے سر پر ایک کڑا جو عورتیں اپنے بازوؤں میں ڈالتی ہیں، سیدھا کھڑا کر کے بالوں کے ساتھ باندھ دیا گیا اور رقاصہ ناچنے لگی۔ اس کا جسم تھرک رہا تھا اور وہ بار بار گھومتی اور ادھر ادھر ہوتی تھی۔

وحشی ہاتھ میں برچھی لئے رقاصہ سے بارہ چودہ قدم دور اس کی حرکت کے ساتھ حرکت کرتا کڑے کا نشانہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے برچھی کو ہاتھ میں تولا اور تاک کر رقاصہ کے سر پر برچھی پھینکی۔ رقاصہ اس سے بے نیاز رقص کی اداؤں میں محو تھی۔ وحشی کی پھینکی ہوئی برچھی رقاصہ کے سر پر بندھے ہوئے کڑے میں سے اس طرح گذر گئی کہ رقاصہ کو احساس تک نہ ہوا۔

جنگِ اُحد میں وحشی اہلِ قریش کے ساتھ تھا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ کو اسی وحشی نے پیٹ میں برچھی مار کر شہید کیا تھا۔ اس کے بعد جب خالدؓ بن ولید نے اسلام قبول کیا' وحشی نے بھی اسلام قبول کر لیا اور اگلے معرکوں میں تاریخ میں نام پیدا کیا۔ یہ سعادت اُسی کے نصیب میں لکھی تھی کہ مسیلمہ کذاب جیسے بڑے ہی طاقتور جھوٹے نبی کو جہنم واصل کیا۔

تاریخ میں یوں آیا ہے کہ مسیلمہ کو ہلاک کرنے والے دو مجاہد تھے۔ ایک تو وحشی تھا جس نے اُسے برچھی ماری تو وہ گھوڑے سے گرا۔ اُس کے ساتھ ہی مدینہ کے ایک انصاری نے اُس پر تلوار کا بھرپور وار کیا۔ وحشی نے مسیلمہ کا سر تن سے کاٹا اور برچھی کی اَنی پر اُڑس کر برچھی بلند کی۔

"میں نے اُحد کا گناہ معاف کرا لیا ہے" ــــ وحشی مسیلمہ کا سر برچھی پر اٹھائے میدانِ جنگ میں دوڑتا اور اعلان کرتا پھر رہا تھا۔

بعد میں اُس نے کئی بار کہا تھا کہ حضرت حمزہؓ کے قتل کا افسوس اُسے ہمیشہ پریشان کرتا رہا۔ مسیلمہ کو قتل کر کے اُسے اُحد کے افسوس اور پچھتاوے سے نجات ملی ہے۔

یہ تھا انجام دو جھوٹے نبیوں کا۔ یہ ابلیس کا رقص تھا۔ انسان جب اپنے کردار میں ابلیسی اوصاف پیدا کر لیتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اُسے نتائج سے بے خبر کر دیتے ہیں۔ انہیں پکڑنے کے لئے اللہ آسمان سے فرشتے نہیں اتارا کرتا۔ یہ لوگ اپنے قدموں چل کر انجام کو پہنچ جایا کرتے ہیں۔

کوئی عبرت حاصل نہیں کرتا۔

○

"ہمیں مصر کے عبیدیوں سے مدد لینی پڑے گی" ــــ قلعہ شاہ در میں احمد بن غطاش حسن بن صباح سے کہہ رہا تھا ــــ "لیکن کسی طرح یہ یقین کر لینا بہت ہی ضروری ہے کہ وہ ہماری مدد کریں گے بھی یا نہیں؟"

"کیوں نہیں کریں گے؟" ــــ حسن بن صباح نے پوچھا اور کہا ــــ "وہ ہمارے ہی فرقے کے لوگ ہیں"۔

"کچھ شک والی بات ہے" ــــ ابنِ غطاش نے کہا ــــ "پہلے تو یہ جائزہ لینا ہے کہ وہ اسماعیلی ہیں یا نہیں۔ پتہ چلا ہے کہ ظاہری طور پر وہ اسماعیلی ہیں لیکن در پردہ وہ کوئی اپنا ہی نظریہ رکھتے ہیں"۔

"اگر یہ جائزہ لینا ہے تو مجھے مصر جانا پڑے گا" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "اور میں مصر چلا ہی جاؤں گا"۔

"ہاں حسن!" ــــ ابنِ غطاش نے کہا ــــ "میں تمہیں مصر بھیجوں گا۔ ہمارا پہلا مقصد یہ ہے کہ اہلِ سنت کی حکومت کا تختہ اُلٹنا ہے۔ سلجوقیوں کا خاتمہ لازمی ہے"۔

"محترم استاد!" ــــ حسن بن صباح نے پوچھا ــــ "میں عبیدیوں کو نہیں جانتا.... ان کی جڑیں کہاں ہیں؟"

احمد بن غطاش نے حسن بن صباح کو اپنے رنگ اور اپنے انداز سے تفصیلاً" سنایا کہ عبیدیوں کی جڑیں کہاں ہیں اور اس فرقے نے کہاں سے جنم لیا تھا۔ مستند مؤرخوں اور اُس دور کے علماءِ دین کی تحریروں سے عبیدیوں کا پس منظر اور پیش منظر واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ یہ بھی اسلام پر فرقہ پرستوں کی ایک یلغار تھی۔

داستان گو نے پہلے کہا ہے کہ اسلام نے' خصوصاً" اہلِ سنت والجماعت نے' جو تیز و تند طوفان برداشت کئے ہیں وہ پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں۔ ایک تو صیہونی اور صلیبی یلغار تھی جس نے اسلام کے تناور درخت کو جڑوں سے اکھاڑنا چاہا تھا۔ آج کے دور میں یہ یلغار ایک بار پھر شدت اختیار کر گئی ہے۔

یہ تو بیرونی یلغار ہے' اہلِ اسلام کے اندر سے جو حملہ آور اٹھے' ان کا ہدف اہلِ سنت تھے۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے تھے لیکن اُن کے عزائم اور سرگرمیاں نہ صرف غیر اسلامی یا اسلام کے منافی تھیں بلکہ اسلام کی بقا' سلامتی اور فروغ کے لئے بے حد خطرناک تھیں۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

عبیدیت ایسا ہی ایک فتنہ تھا جو تیسری صدی ہجری میں اٹھا۔ یہ اسماعیلیوں کی ایک شاخ تھی لیکن اصل میں یہ فرقہ باطنی تھا اور اس کے بانی پیشواؤں میں بھی ابلیسی اوصاف پائے جاتے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے

"کیا ہم تمہیں بتائیں کہ شیاطین کن پر اُترا کرتے ہیں؟ وہ ایسے لوگوں پر نازل ہوتے (اور ان پر قابض ہوتے ہیں) جو جھوٹ بولنے والے اور بدکردار ہوتے ہیں" — (سورہ 26 - آیت 221)۔

عبیدی فرقے کا بانی عبیداللہ تھا جس کے متعلق پورے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں کا رہنے والا تھا۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہ کوفہ کا رہنے والا تھا اور کچھ نے لکھا ہے کہ وہ حمص کے علاقے کے ایک گاؤں سلمیہ کا رہنے والا تھا۔ اُس کے باپ کا نام محمد حبیب تھا اور وہ اپنے قبیلے کا سرکردہ فرد تھا۔

محمد حبیب کو ایک خواہش پریشان رکھتی تھی۔ وہ عمر کے آخری حصے میں پہنچ چکا تھا۔ اُس کا بیٹا عبیداللہ جوان ہو گیا تھا اور وہ دیکھ رہا تھا کہ عبیداللہ میں ایسے ابلیسی اوصاف پائے جاتے ہیں کہ وہ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کے لئے ہر ڈھنگ کھیل سکتا ہے۔ اُس کی خواہش یہ تھی کہ تھوڑے سے علاقے میں اُس کی اپنی سلطنت قائم ہو جائے۔

محمد حبیب نے اعلان کر دیا کہ اُس کا بیٹا مہدی آخرالزماں ہے۔ یہ بڑی لمبی داستان ہے کہ عبیداللہ اور اُس کے باپ نے کیسے کیسے ڈھنگ کھیل کر اور کیسی کیسی فریب کاریوں سے اپنے پیروکار بنا لئے اور اُن کی تعداد بڑھتی چلی گئی۔

عبیداللہ نے 270 ہجری میں مہدویت کا اعلان کیا تھا اور اُس نے اپنے فرقے کو فرقہ مہدویہ کا نام دیا تھا۔ اُس نے 278 ہجری میں حج کیا اور وہاں اپنے مہدی موعود ہونے کا پروپیگنڈہ ایسے انداز سے کیا کہ بنوکنانہ کے پورے قبیلے نے اُسے امام مہدی تسلیم کر لیا۔

محمد حبیب نے اپنے بیٹے کو مہدی تسلیم کرانے کے لئے قبیلوں کے سرداروں کو بڑی خوبصورت لڑکیوں اور سونے چاندی کے انعامات کے ذریعے بھی پھانسا تھا۔ جب اس فرقے میں پیروکاروں کی تعداد زیادہ ہو گئی تو مہدیوں نے خفیہ اور پُراسرار قتل کا سلسلہ شروع کر دیا۔ قتل اہلِ سنت کے علماء کو کیا جاتا تھا اور پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ قاتل کون ہے۔ چونکہ اس فرقے کی مخالفت اہلِ سنت کی طرف سے ہوتی تھی اس لئے وہی قتل ہوتے تھے۔ جہاں کہیں سے بھی مخالفانہ آواز اٹھتی تھی وہاں کے چیدہ چیدہ آدمی ہمیشہ کے لئے لاپتہ ہو جاتے تھے۔

"تاریخ الخلفاء" میں لکھا ہے کہ ایک روز ایک سرکردہ فرد ابن طباطبا علوی عبیداللہ سے ملنے گیا۔ عبیداللہ دربار لگائے بیٹھا تھا۔ وہاں کچھ امراء بھی تھے اور عام حاضرین کی تعداد خاصی تھی۔

"اے عبیداللہ!" — علوی نے کہا — "میں تجھے مہدی آخرالزماں تسلیم کر لوں گا۔ پہلے یہ تو بتا کہ تیرا حسب و نسب کیا ہے اور کون سا قبیلہ تیری پہچان ہے؟"

عبیداللہ نے اپنی نصف تلوار نیام سے کھینچی اور بولا — "یہ ہے میرا نسب!" — پھر وہ ایک تھیلی میں ہاتھ ڈال کر سونے کی بہت سی اشرفیاں نکال کر دربار کے حاضرین کی طرف پھینک کر بولا — "اور یہ ہے میرا حسب!"

درباری اشرفیوں پر ٹوٹ پڑے۔ ابنِ طباطبا علوی وہاں سے چپ چاپ باہر نکل گیا۔

یہ تھی عبیداللہ کی کامیابی کی اصل وجہ۔ اس کے علاوہ اُس نے اس قسم کے عقیدے رائج کر دیئے کہ ایک آدمی بیک وقت اٹھارہ عورتوں کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔ جب کہ اسلام نے صرف چار بیویوں کی اجازت دی تھی اور وہ بھی مخصوص حالات میں۔ اُس کا دوسرا عقیدہ یہ تھا کہ حکومت کا جو سربراہ ہو اور مذہب کا جو امام ہو، وہ گناہوں سے پاک ہوتا ہے اور اُس سے اُس کے اعمال پر کوئی بازپُرس نہیں کی جا سکتی۔ ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ امام کسی عورت سے یہ کہہ دے کہ تم فلاں کی بیوی ہو تو اس عورت پر یہ فرض ہو جاتا تھا کہ وہ اس کی بیوی بن جائے۔

اس قسم کے عقائد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عبیداللہ نے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کے لئے اُن کے دل پسند عقائد تخلیق کئے تھے۔

○

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ عبیداللہ کے عروج و زوال کی داستان بہت لمبی ہے، اسے اختصار سے پیش کیا جا رہا ہے تاکہ جو اصل داستان ہے اُس کی طرف پوری توجہ دی جا سکے۔

عبیداللہ کے باپ محمد حبیب نے سوچا کہ اپنی سلطنت قائم کرنے کے لئے کوئی ایسا آدمی چاہئے جو ذہنی طور پر بہت ہی ہوشیار ہو اور فریب کاریوں میں خصوصی مہارت رکھتا ہو۔

اُسے عبیداللہ کے پیروکاروں میں سے ایک شخص بہت ہی ذہین، ہوشیار اور چالاک نظر آیا۔ اُس کا نام ابوعبداللہ تھا۔ محمد حبیب نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا اور اسے اپنے ڈھنگ کی ٹریننگ دینے لگا۔ پھر اُسے بتایا کہ اس کا اصل مقصد کیا ہے۔

ابوعبداللہ اپنے ایک بھائی ابوعباس کو بھی ساتھ لے آیا اور انہوں نے ایک منصوبہ تیار کر

لیا۔ عبیداللہ نے باقاعدہ فوج تیار کرنی شروع کر دی۔ ابو عبداللہ حج پر گیا اور وہاں ایسی اداکاری کی کہ لوگوں نے اُسے بہت بڑا عالم سمجھ لیا۔ وہاں سے اُسے بہت زیادہ حمایت ملی۔

سلطنت قائم کرنے کے لئے ان لوگوں نے سوچا کہ شمالی افریقہ بڑی اچھی جگہ ہے۔ وہ بربروں کا علاقہ تھا بربر ضعیف الاعتقاد تھے اور جنگجو بھی تھے۔ مختصر یہ کہ ابو عبداللہ اور ابو عباس شمالی افریقہ گئے اور وہاں لوگوں کو سبز باغ دکھا دکھا کر ایک فوج بنالی۔ یہ سب لوگ مالِ غنیمت کے لالچ میں ان بھائیوں کے ساتھ ہو گئے تھے۔ بہرحال انہوں نے وہاں ایک اپنی سلطنت قائم کر لی۔

عبیداللہ بھی وہاں چلا گیا۔ یہ شخص مکمل طور پر ابلیس بن چکا تھا۔ اس نے ابو عبداللہ اور ابو عباس کی کوششوں سے بنی ہوئی سلطنت پر قبضہ کر لیا اور وہاں باقاعدہ حاکم بن گیا۔ دونوں بھائی اس کے خلاف ہو گئے۔ ابو عباس نے تو صاف کہنا شروع کر دیا کہ عبیداللہ مہدی نہیں ہے۔

وہاں کے ایک شخص نے جو شیخ المشائخ تھا' عبیداللہ سے کہا کہ وہ اگر مہدی ہے تو کوئی معجزہ دکھائے۔ عبیداللہ نے تلوار نکالی اور اس عالم دین کی گردن کاٹ دی۔

ابو عبداللہ اور ابو عباس نے یہ سکیم بنائی کہ عبیداللہ کو قتل کر دیا جائے۔ اس محفل میں جس میں یہ سکیم بنی تھی' عبیداللہ کے جاسوس بھی موجود تھے۔ یہ فیصلہ ایک بڑے ہی طاقتور شخص ابو زاکی کے گھر میں ہوا تھا۔

عبیداللہ نے ابو زاکی کو طرابلس کا گورنر بنا کر بھیج دیا اور اس کے ساتھ ہی وہاں اپنے آدمی درپردہ بھیجے۔ انہیں یہ کام سونپا کہ طرابلس میں ابو زاکی کو اس کے کمرے میں جب وہ سویا ہوا ہو قتل کر دیا جائے۔

عبیداللہ کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ ابو زاکی گورنر تھا۔ وہ سوچ ہی نہیں سکتا تھا کہ جس عبیداللہ نے اسے یہ رتبہ دیا ہے وہ اسے قتل بھی کروا دے گا۔ وہ سکون اور اطمینان سے سو گیا پھر کبھی بھی نہ جاگا۔ اس کے محافظ دستے میں سے ایک آدمی اُس کے کمرے میں گیا اور اُس کا سر اُس کے جسم الگ کر دیا اور پھر اُس کا سر عبیداللہ کے پاس بھیج دیا۔

اس کے بعد عبیداللہ نے اسی طرح ابو عبداللہ اور ابو عباس کو بھی قتل کروا دیا۔ انہی بھائیوں نے یہ سلطنت قائم کی تھی۔

عبیداللہ نے اپنی بیعت کے لئے ہر طرف مبلغ پھیلا دیئے لیکن بہت کم لوگوں نے اس کی طرف دھیان دیا بلکہ مخالفت شروع ہو گئی۔ عبیداللہ نے قتل و غارت کا طریقہ اختیار کر لیا۔ اہلِ سنت کے علماء کو سب سے پہلے قتل کیا گیا۔ پھر جہاں کہیں اشارہ ملتا کہ یہ گھر اہلِ سنت کا ہے' اس گھر کے تمام افراد کو قتل کر دیا جاتا۔ ان کا مال و اسباب عبیداللہ کے پیروکاروں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ وہ دراصل اسماعیلیت کی تبلیغ کر رہا تھا۔ جو شخص اُس کے زیادہ سے زیادہ مرید بناتا تھا' اُسے وہ جاگیریں عطا کرتا اور بعض کو اُس نے زر و جواہرات سے مالا مال کر دیا۔

عبیداللہ نے طاقت جمع کر کے مصر پر حملہ کیا۔ ایک ہی معرکے میں سات ہزار عبیدی مارے گئے لیکن عبیداللہ نے ہمت نہ ہاری۔ ایک بار اُس کے لشکر میں کوئی ایسی وباء پھوٹ پڑی کہ انسان اور گھوڑے مرنے لگے۔ عبیداللہ نے کچھ عرصے کے لئے مصر کی فتح کا ارادہ ترک کر دیا آخر 356 ہجری میں اُس نے مصر فتح کر لیا۔ مصر کے سب سے بڑے شہر قاہرہ کی بنیاد اُسی نے رکھی تھی۔ عبیداللہ تو مر گیا اور اُس کا خاندان 567 ہجری تک مصر پر حکومت کرتا رہا۔

حسن بن صباح کے دَور میں عبیدی ہی مصر پر حکومت کر رہے تھے۔ تاریخوں میں لکھا ہے کہ تاتاریوں نے بغداد میں مسلمانوں کا اتنا قتلِ عام نہیں کیا تھا جتنا عبیداللہ نے اہلِ سنّت کا کیا۔

○

یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ پرستی کے ایک اور فتنے کا ذکر کر دیا جائے۔ اس فرقے کا نام قرامطی تھا اور اس کا بانی ابو طاہر سلیمان قرامطی تھا۔ اس کا باپ ابو سعید جنابی 301 ہجری میں اپنے ایک خادم کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ ابو طاہر قرامطی بھائیوں میں چھوٹا تھا۔ اس میں حسن بن صباح والے اوصاف موجود تھے۔ اُس نے اپنے بڑے بھائی سعید پر ایسے ظلم و ستم کئے کہ اُسے ذہنی اور جسمانی لحاظ سے مفلوج کر دیا اور خود باپ کا جانشین بن گیا۔

اس خاندان کی اپنی ایک سلطنت تھی جس میں طائف' بحرین اور ہجر جیسے اہم مقامات شامل تھے۔ ابو طاہر نے نبوّت کا اعلان کر دیا۔ اس شخص کے متعلق بھی مؤرخوں نے لکھا ہے کہ اسلام اور اہلِ سُنّت کے لئے تاتاریوں اور عبیداللہ سے بھی زیادہ خطرناک قاتل ثابت ہوا۔

دس سال تک ابو طاہر اپنی نبوّت کی تبلیغ کرتا رہا اور فوج بھی تیار کرتا رہا۔ اس کا ارادہ بصرہ کو فتح کرنے کا تھا۔ آخر ایک رات اُس نے ایک ہزار سات سو آدمی اپنے ساتھ لئے اور بصرہ پر حملہ

کر دیا۔ وہ اپنے ساتھ بڑی لمبی لمبی سیڑھیاں لے گیا تھا۔

یہ سیڑھیاں شہر پناہ کے ساتھ لگا کر حملہ آور اوپر گئے اور شہر میں داخل ہو گئے۔ حملہ غیر متوقع اور اچانک تھا۔ ابو طاہر کے آدمیوں نے شہر کی سوئی ہوئی مختصر سی فوج کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ لوگ باہر کو بھاگنے لگے۔ ابو طاہر کے حکم سے شہر کے دروازے کھول دیئے گئے اور لوگ کھلے دروازوں کی طرف بھاگے۔ ہر دروازے کے ساتھ قرامطی کھڑے تھے۔ انہوں نے لوگوں کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر الگ ساتھ لے گئے۔ تمام گھروں اور سرکاری خزانے میں لوٹ مار کی اور اس طرح بصرہ شہر کو تباہ و برباد کر کے اور اس کی گلیوں میں خون کے دریا بہا کر قرامطی اپنے مرکزی شہر ہجر کو چلے گئے۔

اُسی سال ابو طاہر نے حاجیوں کے قافلوں کو لُوٹنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ قرامطی صرف لُوٹ مار نہیں کرتے تھے بلکہ وہ قتلِ عام بھی کرتے تھے۔ انہوں نے حج سے واپس آنے والے حاجیوں کو لُوٹ کر قتل کیا۔ اس طرح ہزارہا حاجی شہید ہو گئے۔

خلیفۂ وقت نے قرامطیوں کی سرکوبی کے لئے لشکر بھیجے۔ قرامطی اتنے طاقتور ہو چکے تھے کہ انہوں نے ہر جگہ خلیفہ کے لشکر کو شکست دی اور شہروں میں داخل ہو کر شہریوں کا قتلِ عام کیا۔ خلیفہ اپنے لشکر کو کمک بھیجتا رہا لیکن ابو طاہر کا لشکر اتنا تیز اور ہوشیار تھا کہ وہ خلیفہ کے لشکر کے ہاتھ نہیں آتا تھا۔ قرامطیوں میں سرفروشی اور جانثاری اس وجہ سے تھی کہ ابو طاہر تمام مالِ غنیمت ان کے حوالے کر دیتا تھا اور شہروں سے جتنی جوان عورتیں پکڑی جاتی تھیں وہ بھی ان ہی کو دے دیتا تھا۔ لشکر کو شراب تک پینے کی کھلی اجازت تھی۔ حادثہ یہ کہ قرامطی اپنے آپ کو اہلِ اسلام کہتے تھے اور ابو طاہر نبی بنا ہُوا تھا۔

مسلمانوں یعنی اہلِ سُنّت کی کمزوری یہ تھی کہ خلافت خلفائے راشدین جیسی مخلص اور دین دار نہیں تھی۔ خلافت اقتدار کی کرسی یا شہنشاہیت کا تخت بن گئی تھی۔ خلافت کے لشکر میں خلفائے راشدین کے دَور والا جذبہ اور اللہ کی راہ میں شوقِ شہادت نہیں رہا تھا۔ ایک وہ وقت تھا کہ مجاہدین کے چالیس ہزار کے لشکر نے آتش پرستوں کے ایک لاکھ بیس ہزار کے طاقتور لشکر کو ہر میدان میں شکست دے کر سلطنتِ فارس کو ختم کر دیا تھا مگر اب خلیفہ کے دس ہزار فوجی ایک ہزار قرامطیوں پر غالب آنے سے معذور تھے۔

ابلیسی طاقتیں اسلام کا قلع قمع کرنے کے لئے تیز و تند طوفان کی طرح اٹھ آئی تھیں۔

○

یہاں بھی ابلیس کا رقص دیکھئے۔

ابو طاہر نے شہر ہجر کو اپنا دارالحکومت بنایا اور وہاں ایک عالی شان مسجد تعمیر کروائی۔ اس کا نام دارالہجرت رکھا گیا۔ جب مسجد مکمل ہو گئی تو ابو طاہر قرامطی اسے دیکھنے کے لئے اندر آیا۔

"میرے قرامطیو!"۔۔۔ اُس نے منبر پر کھڑے ہو کر اعلان کیا۔۔۔ "اصل اسلام کے علمبردار تم ہو۔ وہ مسلمان نہیں جو قرامطی نہیں اور جو مجھے نبی نہیں مانتا۔ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ اب حج مکہ میں نہیں یہاں ہجر میں ہُوا کرے گا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ حجرِ اسود کو مکہ سے اٹھا کر یہاں اس مسجد میں رکھا جائے"۔

"ہم تیرے شیدائی ہیں"۔۔۔ ایک آدمی نے اٹھ کر کہا۔۔۔ "ہمیں یہ بتا کہ وہ پتھر جسے ہم حجرِ اسود کہتے ہیں، یہاں کس طرح لایا جائے گا۔ اہلِ سنت ہمیں یہ پتھر اٹھانے کی ہمت نہیں کرنے دیں گے، پھر ہم کیا کریں گے؟"

"کیا تمہاری تلواریں کُند ہو گئی ہیں؟"۔۔۔ ابو طاہر نے کہا۔۔۔ "ہم نے کہاں کہاں اہلِ سُنّت کا خون نہیں بہایا؟ کیا تم خانہ کعبہ میں ان منکروں کا خون بہانے سے گریز کرو گے؟۔۔۔ ہم اس سال حج کے موقع پر مکہ جائیں گے اور خانہ کعبہ کی وہ حالت کر دیں گے کہ اہلِ سنت آئندہ مکہ کی طرف دیکھیں گے بھی نہیں"۔

○

319 ہجری میں ابو طاہر قرامطی نے مکہ مکرّمہ کا رخ کیا۔ حاجی وہاں پہنچ چکے تھے بلکہ وہ بیت اللہ کے طواف میں مصروف تھے۔ بعض نماز پڑھ رہے تھے۔ ابو طاہر سب سے پہلے گھوڑے پر سوار، تلوار ہاتھ میں لئے مسجد حرام میں داخل ہُوا۔ اُس نے شراب منگوائی اور گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے شراب پی۔

مورخ لکھتے ہیں کہ جب ابو طاہر گھوڑے پر بیٹھا شراب پی رہا تھا، اس کے گھوڑے نے مسجد میں پیشاب کر دیا۔

"دیکھا تم سب نے؟"۔۔۔ ابو طاہر نے قہقہہ لگا کر بڑی بلند آواز سے کہا۔۔۔ "میرا گھوڑا

بھی مجھے اور میرے عقیدے کو سمجھتا ہے"۔

مسجدِ حرام میں کچھ مسلمان موجود تھے۔ انہوں نے شور شرابہ کیا۔ اُدھر سے حجاج دوڑے آئے۔ وہ سب نہتے تھے اور سب نے احرام باندھ رکھے تھے۔ ابو طاہر کے اشارے پر قرامطیوں نے ان کا قتلِ عام شروع کر دیا۔

وہاں سے ابو طاہر خانہ کعبہ میں گیا اور وہاں بھی حجاج کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ ابو طاہر کے حکم سے خانہ کعبہ کا دروازہ اکھاڑ دیا گیا۔

"میں خُدا ہوں" ــــ ابو طاہر نے جو گھوڑے پر سوار تھا متکبرانہ اعلان کیا ــــ "اور خدا میری ذات میں ہے۔ تمام خلقت پر میری بندگی فرض ہے" ــــ پھر اُس نے کہا ــــ "اے گدھو! تمہارا قرآن کہتا ہے کہ جو شخص بیت اللہ میں داخل ہو جائے اُسے امن مل جاتا ہے..... کہاں ہے وہ امن؟ میں نے جسے چاہا زندہ رہنے دیا اور جسے چاہا اُسے خون میں نہلا دیا"۔

ایک حاجی آگے بڑھا اور اس نے ابو طاہر کے گھوڑے کی لگام پکڑ لی۔

"اے منکرِ دین؟" ــــ اس شخص نے ابو طاہر سے کہا ــــ "تُو نے قرآن کی یہ آیت غلط پڑھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص بیت اللہ میں داخل ہو جائے اُسے امن دو اور اُس پر ہاتھ نہ اٹھاؤ"۔

اس شخص کے عقب سے ایک تلوار حرکت میں آئی اور اُس کا سر کٹ کر دُور جا پڑا۔

ابو محلب امیرِ مکہ تھا۔ اس کے پاس اتنی فوج نہیں تھی کہ وہ قرامطیوں کا مقابلہ کرتا۔ وہ اپنے چند ایک آدمیوں کو لے کر ابو طاہر کے پاس گیا۔ یہ سب لوگ تلواروں سے مسلح تھے۔ ابو محلب نے ابو طاہر سے کہا کہ وہ اپنے آپ کو نبی کہتا ہے اور مسلمان بھی لیکن وہ خدا کے اس گھر کی اس طرح بے حُرمتی کر رہا ہے۔

"حجاج کے قتل سے ہاتھ کھینچ لے ابو طاہر!" ــــ ابو محلب نے کہا ــــ "اللہ کے عذاب سے ڈر کہیں ایسا نہ ہو کہ تجھے اسی دنیا میں اس کی سزا مل جائے"۔

"اس شخص کو عذابِ الٰہی دکھا دو" ــــ ابو طاہر نے بلند آواز سے کہا۔ بہت سے قرامطی ابو محلب اور اس کے آدمیوں پر ٹوٹ پڑے۔ ابو محلب اور اس کے آدمیوں نے جو سب کے سب تلواروں سے مسلح تھے جم کر مقابلہ کیا لیکن وہ اتنے تھوڑے تھے کہ اتنے زیادہ آدمیوں کے

ہاتھوں شہید ہو گئے۔

کعبہ معلّٰی کے اوپر میزاب نصب تھا جو سونے سے مرصع تھا۔ ابو طاہر نے حکم دیا کہ اوپر چڑھ کر میزاب اتار کر اس کے گھوڑے کے قدموں میں رکھا جائے۔

ایک قرامطی کعبہ معلّٰی پر چڑھا۔ تاریخ میں ایک شخص محمد بن ربیع بن سلیمان کا نام آیا ہے۔ وہ دور کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اُس نے بعد میں مسلمانوں کو بتایا کہ جب قرامطی کعبہ معلّٰی پر چڑھا تو محمد بن ربیع نے ہاتھ پھیلا کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا ــــ "یا اللہ تیری بُردباری کی کوئی حد نہیں۔ کیا تیری ذات باری اس شخص کو بھی بخش دے گی؟" ــــ محمد بن ربیع نے لوگوں کو بتایا کہ وہ قرامطی جو کعبہ معلّٰی پر چڑھ گیا تھا، نہ جانے کیسے اوپر سے سر کے بل گرا اور گرتے ہی مر گیا۔

محمد بن ربیع کا ہی بیان ہے کہ ابو طاہر نے بڑے غصے میں ایک اور قرامطی کو کعبہ پر چڑھنے کا حکم دیا۔ یہ آدمی اوپر پہنچنے والا ہی تھا کہ اُس کا ہاتھ چھوٹ گیا اور وہ بھی سر کے بل گر پڑا اور مر گیا۔

ابو طاہر اور زیادہ غصے میں آ گیا اُس نے ایک اور قرامطی کو حکم دیا کہ وہ اوپر جائے۔ تقریباً تمام مؤرخوں نے لکھا کہ یہ تیسرا شخص ایسا خوفزدہ ہوا کہ اوپر چڑھنے کی بجائے ایک ہی جگہ کھڑا تھر تھر کانپنے لگا اور اچانک باہر کی طرف بھاگ گیا۔

ابو طاہر پر کچھ ایسا اثر ہُوا کہ اس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ کچھ دیر کعبہ معلّٰی کو دیکھتا رہا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اُس کے خیالوں میں کچھ تبدیلی آئی ہے لیکن ابلیس کا غلبہ اتنا شدید تھا کہ وہ اچانک آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ غلافِ کعبہ کو کھینچ کر اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔

قرامطی غلافِ کعبہ پر ٹوٹ پڑے اور تلواروں سے غلافِ کعبہ کو کاٹ کاٹ کر اس کے ٹکڑے سارے لشکر میں تقسیم کر دیئے۔

ابو طاہر نے بیت اللہ کا سارا خزانہ اپنے قبضے میں لے لیا۔

جو حجاج قتلِ عام سے بچ گئے تھے انہوں نے بغیر امام کے حج کا فریضہ ادا کیا۔

○

ابو طاہر حجرِ اسود کو اپنے دارالحکومت ہجر لے جانا چاہتا تھا۔ اس پتھر پر حضرت ابراہیمؑ کا نقشِ پا

ہے۔ رات کا وقت تھا۔ بچے کھچے حجاج ابھی وہیں تھے۔ کسی ذریعے سے انہیں پتہ چل گیا کہ ابو طاہر حجرِ اسود اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔

حجاج کے جذبہ کو دیکھئے۔ انہوں نے رات ہی رات اتنے وزنی پتھر کو وہاں سے اٹھایا اور مکہ کی گھاٹیوں میں لے جا کر چھپا دیا۔ یہ کوئی معمولی کارنامہ نہ تھا۔ ایک تو پتھر بہت وزنی تھا اور دوسرے جان کا خطرہ بھی تھا۔ وہاں ہر طرف قرامطی موجود تھے۔ وہ دیکھ لیتے تو ان تمام حجاج کے جسموں کے ٹکڑے اُڑا دیتے۔ ان کی آنکھوں میں دھول جھونک کر پتھر اٹھا لے جانا اور غائب کر دینا ایک معجزہ تھا۔

دوسری صبح طلوع ہوئی۔ ابو طاہر پھر خانہ کعبہ میں آن دھمکا اور حکم دیا کہ حجرِ اسود اٹھا لو۔

"پتھر وہاں نہیں ہے" ۔۔۔ کسی قرامطی نے پتھر کی جگہ خالی دیکھ کر ابو طاہر سے کہا۔

"وہ بہت وزنی پتھر تھا" ۔۔۔ ابو طاہر نے کہا ۔۔۔ "مجھے مت بتاؤ کہ کوئی انسان اسے اٹھا کر لے گیا ہے"۔

اُس کے کانوں سے پھر یہ آواز ٹکرائی کہ پتھر وہاں نہیں ہے۔ تب اُس نے خود جا کر دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ پتھر وہاں نہیں ہے۔ اُس نے قہر و غضب سے حکم دیا کہ پتھر کو تلاش کیا جائے۔ حجاج وہاں سے جانے کی تیاریاں کر رہے تھے اور کچھ جا بھی چکے تھے۔ قرامطیوں نے چند ایک حجاج سے پوچھا کہ پتھر کہاں ہے۔ جس کسی نے لاعلمی کا اظہار کیا اُسے قتل کر دیا گیا۔

تلاش کرتے کرتے پتھر مل گیا۔ ابو طاہر نے اُسی وقت پتھر ایک اونٹ پر لدوایا اور ہجر کی طرف روانگی کا حکم دے دیا۔

یہ واقعہ بروز دو شنبہ ذوالحجہ 317 ہجری کا ہے۔

ابو طاہر نے چشمہ زم زم کی جگہ کو بھی مسمار کروا دیا۔ بعض مورخ لکھتے ہیں کہ وہ چھ دن مکہ معظمہ میں رہا اور بعض نے گیارہ دن لکھے ہیں۔

یہ وہ دور تھا جب مصر میں عبیداللہ کا طوطی بول رہا تھا اور وہ مہدی موعود بنا ہوا تھا۔ وہ اُس کے عروج کا زمانہ تھا۔ عجیب بات ہے کہ ابو طاہر قرامطی بھی اُس کے اس دعوے کو تسلیم کرتا تھا کہ وہ مہدی آخرالزماں ہے۔ ہو سکتا ہے وہ عبیداللہ کی طاقت سے ڈرتا ہو اور اُسے خوش رکھنے کا یہی ایک طریقہ ہو سکتا تھا کہ وہ اُسے مہدی آخرالزماں مان لے۔

ابو طاہر نے حجرِ اسود کو مکہ سے لا کر اپنی بنائی ہوئی مسجد دارالہجرت کی غربی جانب رکھا اور عبیداللہ کے نام ایک پیغام لکھوا کر بھیجا۔ اس میں اُس نے عبیداللہ کو لکھوایا کہ میں نے حکم دے دیا ہے کہ خطبے میں آپ کا نام لیا جائے۔ میں نے اپنی سلطنت میں آپ کے نام کا خطبہ جاری کر دیا ہے۔

اُس نے اس پیغام میں عبیداللہ کی عقیدت کا اظہار بڑے جذباتی انداز میں کیا اور پھر لکھا کہ اُس نے مکہ میں کس طرح تباہی مچائی ہے اور خانہ کعبہ کے اندر اور مکہ کی گلیوں میں اہلِ سنت کے خون کی ندیاں بہا دی ہیں۔ اس نے اس پیغام میں اہلِ سنت کو اہلِ فساد اور اہلِ ذلت لکھا۔

اُسے توقع تھی کہ عبیداللہ اس کے اس پیغام سے بہت خوش ہو گا لیکن اس کا قاصد پیغام کا جواب لے کر آیا تو ابو طاہر حیران رہ گیا۔ عبیداللہ نے لکھا کہ تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہاری ان بداعمالیوں پر تمہیں خراجِ تحسین پیش کروں۔ تُو نے خانہ کعبہ کی توہین کی اور اتنی مقدس جگہ میں مسلمانوں کا خون بہایا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے جو حجاج آئے تھے انہیں قتل کیا اور پھر حجرِ اسود کو اکھاڑ کر لے گیا۔ تُو نے یہ بھی نہ سوچا کہ حجرِ اسود اللہ کی کتنی بڑی امانت ہے جسے ایک جگہ سنبھال کر رکھا گیا تھا۔ جماعتِ عبیدیہ تجھ پر کفر اور الحاد کا فتویٰ عائد کرتی ہے۔ ہم تمہیں کوئی انعام نہیں دے سکتے۔

ابو طاہر نے یہ پیغام پڑھا تو آگ بگولہ ہو گیا اور اُس نے اعلان کر دیا کہ کوئی قرامطی عبیداللہ کو مہدی آخرالزماں نہ مانے۔

○

پورے دس سال ۔۔۔ 317 ہجری سے 327 ہجری تک ۔۔۔ فریضہ حج ادا نہ کیا جا سکا۔ کوئی بھی حج کعبہ کو نہ گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ حج کو جانے والے قرامطیوں سے ڈرتے تھے اور دوسرے یہ کہ وہاں اب حجرِ اسود نہیں تھا۔

ایک شخص ابو علی عمر بن یحییٰ علوی ابو طاہر کا گہرا دوست تھا۔ ایک روز وہ ابو طاہر کے پاس گیا۔

"غور کرو ابو طاہر!" ۔۔۔ ابو علی عمر نے کہا ۔۔۔ "دس سالوں سے حج بند ہے۔ اس کی وجہ تم خود جانتے ہو۔ صرف تمہارے ظلم و تشدد کی وجہ سے مسلمان فریضہ حج ادا نہیں کر سکتے۔ اس

بے نتیجے میں لوگ تمہاری عقیدت سے منحرف ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ حج کرنے والوں کو امن کا یقین دلاؤ اور ان پر محصول مقرر کر دو۔ پانچ دیناری اونٹ محصول وصول کرو"۔

ابو طاہر کو یہ تجویز اچھی لگی۔ اس سے ایک تو اس کی ساکھ بحال ہوتی تھی اور دوسرے اُسے بے شمار رقم محصول کے ذریعے حاصل ہو رہی تھی۔ اُس نے ہر طرف قاصد دوڑا دیئے کہ وہ اعلان کرتے جائیں کہ آئندہ حج پر کوئی مداخلت نہیں ہو گی اور حجاج کو امن کی ضمانت دی جاتی ہے۔ اُس نے محصول کا اعلان بھی کر دیا۔

ابنِ خلدون نے لکھا ہے کہ خلیفہ کے حاجب محمد بن یاقوت نے بھی ابو طاہر کو لکھا تھا کہ حجاج پر ظلم و تشدد چھوڑ دو اور حجرِ اسود واپس کر دو۔ اس کے عوض خلیفہ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ جو علاقہ اس وقت تمہارے قبضے میں ہے وہ تمہارا ہی رہے گا اور اس سلسلے میں تمہیں خلافت اپنا دشمن نہیں سمجھے گی۔

ابو طاہر نے اس کے جواب میں یہ یقین دہانی کرا دی کہ آئندہ قرامطی فریضۂ حج کی ادائیگی میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کریں گے لیکن ابو طاہر نے حجرِ اسود واپس دینے سے انکار کر دیا۔

ابو طاہر نے جو محصول نافذ کیا تھا یہ دراصل آج کے دور کا جگا ٹیکس تھا۔ خلافت اتنی کمزور تھی کہ وہ ابو طاہر کا ہاتھ روکنے سے قاصر تھی۔

ابو طاہر کو توقع تھی کہ لوگ حجرِ اسود کی خاطر ہجر آئیں گے اور پھر آہستہ آہستہ حج ہجر میں ہی ہُوا کرے گا لیکن کوئی بھی اہلِ سنت ان دس سالوں میں وہاں نہ گیا۔ خلیفہ مقتدر باللہ نے ابو طاہر کو پچاس ہزار درہم پیش کئے کہ اس رقم کے عوض حجرِ اسود واپس کر دے لیکن ابو طاہر نے صاف انکار کر دیا۔

اس کے بعد خلیفہ مطیع باللہ کچھ عرصے بعد مسندِ خلافت پر آیا تو اُس نے تیس ہزار دینار ابو طاہر کو پیش کئے کہ وہ حجرِ اسود واپس کر دے۔ ابو طاہر نے یہ سودا قبول کر لیا۔ صرف ایک مؤرخ نے لکھا ہے کہ ابو طاہر نے حجرِ اسود اللہ کے نام پر واپس کیا تھا اور لیا کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ تحریر اس وجہ سے مشکوک لگتی ہے کہ یہ بیان ایسے شخص کا ہے جو اسماعیلی تھا۔

10 محرم 339 ہجری ابو طاہر کا ایک آدمی جس کا نام شبیر بن حسین قرامطی تھا، حجرِ اسود لے کر

مکہ مکرمہ پہنچا۔ دن سہ شنبہ تھا۔ اُسی روز حجرِ اسود کو اپنی اُس جگہ پر رکھ دیا گیا جہاں سے اُسے اکھاڑا گیا تھا۔ خلیفہ نے اس کے ارد گرد چاندی کا حلقہ چڑھوا دیا۔ اس چاندی کا وزن 14 سیر تھا۔

حجرِ اسود چار روز کم بائیس سال ابو طاہر قرامطی کے قبضے میں رہا۔

اللہ کی کرامت ملاحظہ فرمایئے۔ جب حجرِ اسود مکہ سے ہجر لے جایا گیا تھا تو اس کے وزن کے نیچے چالیس اونٹ اس سفر کے دوران مر گئے تھے۔ وہ اس طرح کہ پہلے یہ پتھر ایک اونٹ پر لادا گیا۔ وزن خاصا زیادہ تھا جو یہ اونٹ کچھ فاصلے تک ہی برداشت کر سکا۔ آخر یہ اونٹ بیٹھ گیا اور پھر ایک پہلو پر لڑھک گیا اور مر گیا۔ پھر یہ دوسرے اونٹ پر لادا گیا۔ یہ اونٹ بھی کچھ فاصلہ طے کر کے گرا اور مر گیا۔ اسی طرح چالیس اونٹ اس پتھر تلے مرے اور پتھر ہجر تک پہنچا لیکن یہی پتھر جب ہجر سے مکہ کو واپس لایا گیا تو صرف ایک اونٹ وہاں سے مکہ تک لے آیا۔ پتھر کا وزن اتنا ہی تھا اور اسے لانے والا اونٹ کوئی غیر معمولی طور پر طاقتور نہ تھا۔ یہ خدا کا معجزہ تھا اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کی نظر میں اس پتھر کی اہمیت اور تقدس کتنا زیادہ ہے۔

اللہ نے ابو طاہر کو بڑی لمبی رسّی دی تھی۔ حجرِ اسود کی واپسی کے بعد یہ رسّی ختم ہو گئی۔ حجرِ اسود مکہ معظمہ پہنچا اور اُدھر ابو طاہر چیچک کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ وہ اس مرض میں بہت دن زندہ رہا لیکن اُس کی حالت جو کوئی بھی دیکھتا تھا وہ کانوں کو ہاتھ لگاتا اور وہاں سے بھاگ آتا۔ بعض عقل والے قرامطی اُس کی یہ حالت دیکھ کر تائب ہو گئے اور اہلِ سنت کے عقیدے میں واپس آ گئے۔

ابو طاہر چیختا اور چلاتا تھا اور ایک روز اُس کی چیخیں اور اُس کا تڑپنا بند ہو گیا اور وہ اپنے پیچھے اپنے گھر میں اپنے گلے سڑے جسم کی بدبو چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

آج بھی کہیں کہیں قرامطی پائے جاتے ہیں۔ کسی وقت انہوں نے ملتان کو اپنا مرکز بنا لیا تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے جب اپنے ایک حملے کے دوران ملتان پر چڑھائی کی تھی تو اُسے پتہ چلا تھا کہ یہاں اکثریت قرامطیوں کی ہے۔ محمود غزنوی کی لڑائی ہندوؤں سے تھی لیکن ملتان میں قرامطی اُس کے مقابلے میں آ گئے تھے۔ ہم نے ان لڑائیوں کی تفصیلات اپنی کتاب "اور ایک بُت شکن پیدا ہُوا" میں پیش کی ہیں۔ محمود غزنوی خود ایک سپاہی کی طرح لڑا تھا۔ محمود غزنوی کے عتاب کا یہ عالم تھا کہ سارا دن تلوار چلاتا رہا اور اُس کی تلوار کے دستے پر اتنا خون جم گیا تھا کہ

اُس کا دایاں ہاتھ بڑی مشکل سے تلوار کے دستے سے اُکھاڑا گیا تھا۔ ملتان کی گلیوں میں بارش کے پانی کی طرح خون بہنا شروع ہو گیا تھا۔ محمود غزنوی نے قرامطیوں کا خاتمہ کر دیا تھا اور قرامطیوں نے اہلِ سنت کا جو خون بہایا تھا' اس کا انتقام لے لیا تھا۔ اس کے بعد کم از کم ملتان میں قرامطی پھر کبھی نہ اٹھ سکے۔

حسن بن صباح قلعہ شاہ در میں احمد بن غطاش کے پاس بیٹھا تھا۔ احمد بن غطاش جس طرح اس قلعے کا والی بنا تھا' وہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ وہ حسن بن صباح کو بتا چکا تھا کہ اس نے اس قلعے پر کس طرح قبضہ کیا ہے۔

"..... لیکن حسن!" —— احمد بن غطاش نے کہا —— "لوگ کہتے ہوں گے کہ احمد بہت بڑا فریب کار تھا جو قلعہ کا والی بن گیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو طاقت تم میں ہے وہ مجھ میں نہیں ہے۔ تم ان چند ایک لوگوں میں سے ہو جنہیں خدا ایک خاص طاقت دے کر دنیا میں بھیجتا ہے۔ میں نے تمہیں عبیداللہ کی بات سنائی ہے۔ اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف اُس کا باپ تھا جس نے اُس کی پشت پناہی کی تھی۔ دیکھ لو' وہ مصر کا حکمران بنا اور آج بھی مصر عبیدیوں کے قبضے میں ہے۔ ابو طاہر قرامطی بیوقوف آدمی تھا۔ وہ اپنی عقل کی حدود سے آگے نکل گیا تھا"۔

"استادِ محترم!" —— حسن بن صباح نے کہا —— "یہ تو میں جانتا ہوں کہ مجھ میں کوئی مافوق الفطرت طاقت ہے لیکن مجھے ایسی رہنمائی کی ضرورت ہے' جس سے میں جان سکوں کہ یہ طاقت کیا ہے اور اسے کس طرح استعمال کروں"۔

"وہ طاقت تم اپنے ساتھ لے آئے ہو" —— احمد بن غطاش نے کہا۔

"وہ تو میں جانتا ہوں" —— حسن بن صباح نے کہا —— "وہ میرے اندر موجود ہے"۔

"نہیں حسن!" —— احمد بن غطاش نے کہا —— "میں تمہارے اندر کی طاقت کی بات نہیں کر رہا۔ میں اس لڑکی کی بات کر رہا ہوں جو تمہارے ساتھ آئی ہے۔ کیا نام ہے اس کا..... فرح!۔ کیا تم نے محسوس نہیں کیا کہ تم اس لڑکی کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتے؟"

"ہاں استادِ محترم!" —— حسن بن صباح نے کہا —— "میں اس لڑکی کے بغیر نہیں رہ سکتا"۔

"کہتے ہیں عورت مرد کی بہت بڑی کمزوری ہے" —— احمد بن غطاش نے کہا —— "وہ غلط

نہیں کہتے۔ حسین عورت بہت بڑی طاقت ہے۔ دلکش عورت ایک نشہ ہے۔ عورت کی دلربائی نے پتھر دل بادشاہوں کے تختے الٹے ہیں۔ تم اس طاقت کو استعمال کرو گے۔

"میں نے تمہیں سجاح بن حارث اور مسیلمہ کی کہانی سنائی ہے۔ سجاح نے اتنا بڑا لشکر کس طرح اکٹھا کر لیا تھا؟ اُس نے کئی قبیلوں کے سرداروں کو کس طرح اپنا پیروکار بنا لیا تھا؟ صرف اس لئے کہ وہ حسین عورت تھی۔ وہ نشہ بن کر آدمی پر طاری ہو جاتی تھی"۔

"لیکن استادِ محترم!" —— حسن بن صباح نے مسکرا کر کہا —— "وہ تو ایک مرد سے مار کھا گئی تھی"۔

"نہیں حسن!" —— احمد بن غطاش نے کہا —— "مسیلمہ نے اُسے تین روز اپنے خیمے میں رکھ کر اُسے بیوی بنائے رکھا تھا۔ یہ اُس کی بہت بڑی کمزوری تھی اور اگر غور کرو تو اس کے بعد ہی مسیلمہ کا زوال شروع ہوا تھا۔ میں تمہیں طریقے بتاؤں گا کہ جو طاقت تم اپنے ساتھ لائے ہو' اس سے تم نے خود کس طرح بچنا ہے اور اسے کس طرح استعمال کرنا ہے"۔

"کیا آپ مجھے علمِ سحر بھی سکھائیں گے؟" —— حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ہاں" —— احمد بن غطاش نے جواب دیا —— "وہ تو میں نے تمہیں سکھانا ہی ہے لیکن یہ خیال رکھو حسن! سحر کے علاوہ کچھ پُراسرار علوم اور بھی ہیں۔ اگر تم ان میں سے کسی ایک علم کے بھی ماہر ہو جاؤ تو معجزے کر کے دکھا سکتے ہو لیکن بھروسہ اسی طاقت پر کرنا ہے جو تمہاری اپنی ہے۔ اپنی روحانی قوتوں کو بیدار کرو تو پھر تم دیکھو گے کہ معجزے کس طرح ہوتے ہیں لیکن ہمیں کسی اور قوت کی ضرورت ہے"۔

احمد بن غطاش نے اُس کے ساتھ تقریباً' وہی باتیں کیں جو اس سے پہلے ابن عطاش اور پھر ایک اور درویش اُس کے ساتھ کر چکے تھے۔ احمد ابن غطاش نے اسے ایک بات یہ بتائی کہ اس علاقے میں جو چھوٹے بڑے قلعے ہیں ان پر قبضہ کرنا ہے۔

"میں نے تمہیں کچھ تربیت دینی ہے" —— احمد بن غطاش نے کہا —— "اور تمہیں تیار کرنا ہے کہ کسی طرح سلجوقیوں کی حکومت میں داخل ہو جاؤ۔ وہاں تمہیں کوئی عہدہ مل جائے' پھر وہاں تم نے حاکموں کے حلقے میں اپنے ہم خیال پیدا کرنے ہیں اور پھر سلجوقیوں کی جڑیں کاٹنی ہیں"۔

اُسی رات سے احمد بن غطاش نے حسن بن صباح اور فرح کو تربیت دینی شروع کر دی اور انہیں اس طرح کے سبق دینے لگا کہ اپنے ہم خیال کس طرح پیدا کرتے ہیں۔ اُس نے دیکھا کہ فرح کچھ جھینپی ہوئی سی تھی۔

"دیکھ لڑکی!" ___ احمد بن غطاش نے فرح سے کہا ___ "ہم نے تجھے ہر کسی مرد کا کھلونا نہیں بنانا۔ ذرا سوچ' پودے کے ساتھ ایک پھول ہے۔ اسے نہ جانے کتنے لوگ سونگھتے ہیں لیکن پھول کی خوشبو اور تازگی ختم نہیں ہوتی۔ ہم نے تجھے ایسا ہی پھول بنانا ہے لیکن ہم تجھے ایسا پھول نہیں بننے دیں گے جسے شاخ سے توڑ لیا جاتا ہے۔ شاخ سے ٹوٹا ہوا پھول مُرجھا جاتا ہے یا پتی پتی ہو کر مسلا جاتا ہے۔ میں تجھے یہ طریقے بتاؤں گا کہ تُو کس طرح شاخ کے ساتھ رہے گی اور تیری خوشبو اور تازگی ہمیشہ زندہ رہے گی"۔

اسلام کا قافلہ ساڑھے چار صدیوں کی مسافت طے کر چکا تھا۔

اس قافلے نے لق و دق صحرا' جسموں کا پانی چوس لینے والے ریگزار اور خون کے دریا پار کئے تھے۔ اس قافلے نے جوش میں آئی ہوئی جوئے کہستاں کی مانند چٹانوں کے جگر چاک کئے تھے۔

اس قافلے نے دشوار گذار جنگلوں کے سینے چیر دیئے تھے۔

اس قافلے نے تیروں اور برچھیوں کی بوچھاڑوں میں بحرِ ظلمات میں گھوڑے دوڑا دیئے تھے اور زرتشت کے پجاری اپنی سلطنت مجاہدین کے اس قافلے کے قدموں میں پھینک کر بھاگ گئے تھے۔

اس قافلے نے تیز و تند طوفانوں کے منہ موڑ دیئے تھے۔

مگر کذب و ارتداد کی ایسی آندھی آئی کہ یہ قافلہ بکھرنے اور بھٹکنے لگا۔

حسن بن صباح بڑے ہی خوفناک طوفان کا ہراول تھا۔ اس کا خطرہ روز بروز شدید ہوتا جا رہا تھا۔ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ آنے والا وقت کس کے عروج اور کس کے زوال کی داستان سنائے گا۔

داستان گو نے خیر اور شر کی اس داستان کو قلعہ شاہ در تک پہنچایا تھا۔ اس قلعے پر ایک اسماعیلی احمد بن غطاش نے ایک بڑی حسین و جمیل دوشیزہ زریں کے ذریعے قبضہ کیا تھا۔ قلعہ فوج فتح کیا کرتی ہے۔ قلعے کا محاصرہ کیا جاتا ہے' محاصرہ طول بھی پکڑ لیا کرتا ہے' قلعے میں داخل ہونے کے لئے کمندیں پھینکے اور دروازے توڑنے کی کوششیں ہوتی ہیں' اوپر سے تیروں اور برچھیوں کا مینہ برستا ہے' محاصرہ کرنے والے لہولہان ہوتے ہیں' تڑپتے ہیں اور مرتے ہیں اور خون کے دریا بہا کر ایک قلعہ سر ہوتا ہے لیکن قلعہ شاہ در ایک نوخیز لڑکی نے بڑے ہی پیارے انداز سے قلعے کے والی کی چہیتی بیوی بن کر فتح کر لیا۔ اس والیٔ قلعہ کا نام ذاکر تھا جس کی تفصیلی داستانِ رومان پہلے سنائی جا چکی ہے۔ قلعہ احمد بن غطاش کے قبضے میں آگیا۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حسن بن صباح اس قلعے میں کس طرح پہنچا تھا۔ اس کے ساتھ فرح نام کی ایک لڑکی بھی تھی۔ حسن بن صباح اور فرح اُس محبت کی زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے جس کا تعلق دلوں اور روحوں سے ہوتا ہے۔ احمد بن غطاش نے دونوں کی تربیت شروع کر دی تھی۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ احمد بن غطاش نے اُن تمام اسماعیلیوں کو جو قلعہ شاہ در کے قید خانے میں بند تھے رہا کر دیا تھا' اور پھر قافلے لٹنے لگے۔ راہزنی کی وارداتوں میں اضافہ ہو گیا۔

تاریخ بتانے سے قاصر ہے کہ حسن بن صباح اس استاد کی شاگردی میں کتنا عرصہ گزار چکا تھا۔ غالباً" دو اڑھائی سال گزر گئے تھے۔ ایک تو حسن بن صباح دنیا میں آیا تو شیطانی اوصاف اپنے ساتھ لایا تھا' اس کے بعد اس نے ان ہی اوصاف کو اُبھارا اور پھر ابنِ عطاش اور احمد بن عطاش نے ان اوصاف کو پختہ تر کر کے اسے پکا ابلیس بنا دیا تھا۔ اسے علمِ سحر بھی سکھا دیا اور غالباً" اسے احمد بن عطاش کچھ ایسی تربیت بھی دے رہا تھا جو زمین دوز تخریب کاری کے لئے کارآمد ہوتی ہے۔ ان لوگوں کا اصل مقصد یہ تھا کہ اسلام کو اسلام ہی رہنے دیں لیکن اللہ کے اس دین کو اپنے نظریات اور اپنی نفسانی خواہشات کے سانچے میں ڈھال لیں۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جو ان لوگوں نے زمین کے نیچے جا کر لڑنی تھی۔

کسی عمارت کو گرانا ہو تو اسے اوپر سے نہیں توڑا جا سکتا۔ وقت لگتا ہے اور توڑنے والے منڈیر کی ایک دو اینٹیں ہی اکھاڑیں گے تو پکڑے جائیں گے۔ عمارت کی بنیادوں میں پانی چھوڑ دیا جائے تو عمارت ملبے کا ڈھیر بن جاتی ہے اور لوگ اس کے سوا کچھ نہیں کہتے کہ عمارت کی بنیادوں میں پانی چلا گیا تھا۔

اسلام کی فلک بوس عمارت کو مسمار کرنے کا یہی طریقہ اختیار کیا جا رہا تھا۔ اس طریقہ جنگ کے لئے ہتھیاروں کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی جتنی مال و دولت کی ہوتی ہے۔ اس میں انسان خریدے جاتے ہیں۔ دین داروں کے دین و ایمان کی قیمت دی جاتی ہے۔ احمد بن عطاش نے زر و جواہرات کی فراہمی کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔

سلطنتِ اسلامیہ میں قافلوں کو لوٹنے کا سلسلہ کبھی کا ختم ہو چکا تھا۔ کوئی لٹیرا رہزنی کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ قافلے کے ساتھ بے شمار لوگ ہوتے ہیں' اکیلا آدمی مال و دولت لئے پاپیادہ دشت و بیابان میں بے دھڑک سفر کرتا تھا۔

سلجوقی تو اس معاملے میں اور زیادہ سخت تھے لیکن سلجوقی سلطان ملک شاہ کے دور میں آ کر قافلے لٹنے لگے۔ یہ سراغ نہیں ملتا تھا کہ اچانک لٹیروں کے یہ گروہ کہاں سے آ گئے ہیں۔ یہ تاریخ سے پتہ نہیں چلتا کہ سرکاری طور پر اس کا کیا سدِباب ہوا تھا البتہ یہ واضح ہے کہ قافلوں کی آمدورفت تقریباً" بند ہو گئی تھی۔

ایک روز احمد بن عطاش سے ملنے ایک آدمی آیا۔ حسن بن صباح بھی اس کے پاس بیٹھا تھا۔ دربان نے جونہی احمد بن عطاش کو اس آدمی کی اطلاع دی تو احمد بن عطاش نے چونک کر کہا کہ اسے جلدی اندر بھیجو۔

"خوش آمدید میرے بھائی!" ۔۔۔ احمد بن عطاش نے اس آدمی کو دیکھتے ہی پُر مسرت لہجے میں پوچھا ۔۔۔ "بیٹھنے سے پہلے یہ سناؤ کہ کوئی خوشخبری لائے ہو؟"

"بہت بڑی خوشخبری!" ۔۔۔ اس آدمی نے بیٹھتے ہوئے کہا ۔۔۔ "ایک بہت بڑا قافلہ آ رہا ہے۔ اور جوں جوں یہ آگے بڑھتا آ رہا ہے' اس کی تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے"۔

"اور مال و دولت میں اضافہ ہوتا آ رہا ہے" ۔۔۔ حسن بن صباح نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس شخص نے جو قافلے کی خبر لایا تھا' یہ بتانا شروع کر دیا کہ قافلہ کہاں ہے اور یہ کس راستے پر جا رہا ہے۔ یہ راستہ شاہ در سے بہت دُور سے گزرتا تھا۔ وہ علاقہ پہاڑی بھی تھا اور یہ پہاڑ اور وادیاں درختوں سے لدی پڑی تھیں اور جو علاقہ میدانی تھا وہ سب جنگلاتی تھا۔ چونکہ قافلے جو پہلے لُٹ چکے تھے وہ شاہ در سے بہت دُور لُٹے تھے اس لئے کسی کو ذرا سا بھی شُبہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ قافلے لُوٹنے والے احمد بن عطاش کے آدمی ہیں اور یہ ساری دولت احمد بن عطاش کے قبضے میں جا رہی ہے۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ اس قافلے میں کیا کچھ ہے؟" ۔۔۔ احمد بن عطاش نے پوچھا۔

"کیوں نہیں!" ۔۔۔ اس شخص نے فاتحانہ انداز سے جواب دیا ۔۔۔ "میں نے اس قافلے کے ساتھ دو پڑاؤ سفر کیا ہے اور پوری تفصیلات اپنی آنکھوں دیکھ کر اور کچھ قافلے والوں سے سن کر آیا ہوں"۔

"ہمیں تم جیسے آدمیوں کی ضرورت ہے" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "اب بتاؤ کیا دیکھ آئے ہو"۔

"زیادہ تر تاجر ہیں" ۔۔۔ اس شخص نے جواب دیا ۔۔۔ "ان میں بعض تو بہت ہی امیر کبیر لگتے ہیں۔ بیس بیس تیس تیس اونٹوں پر ان کا مال جا رہا ہے"۔

"مال کیا ہے؟"

"اناج بھی ہے" ۔۔۔ اس شخص نے جواب دیا ۔۔۔ "کپڑا ہے' چمڑا ہے اور سونے چاندی کے زیورات بھی ہیں۔ چند ایک کنبے بھی قافلے کے ساتھ ہیں"۔

"تو جوان لڑکیاں بھی ہوں گی!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"زیادہ تو نہیں!" ۔۔۔ اس شخص نے جواب دیا ۔۔۔ "سات آٹھ اچھی خاصی خوبصورت اور نوخیز لڑکیاں ہیں۔ چھوٹی عمر کی بچیاں بھی ہیں"۔

"یہ تو اور زیادہ اچھا ہے" ۔۔۔ احمد بن عطاش نے کہا ۔۔۔ "ہمیں پنیری چاہئے جسے ہم اپنی

رضی سے جہاں چاہیں گے وہاں لگادیں گے اور اپنے انداز سے اس کی آبیاری کریں گے"۔

"سوچنے والی ایک بات ہے"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "کئی ایک قافلے لُوٹے جا چکے ہیں پھر ان تاجروں وغیرہ نے یہ جرأت کیسے کی ہے کہ وہ اتنا مال و دولت اور اتنا بڑا قافلہ لے کر چل پڑے ہیں؟.... شاید ان لوگوں نے یہ سوچا ہو گا کہ کچھ عرصے سے قافلوں کو لُوٹنے کا سلسلہ بند ہے اس لئے لُٹیرے کسی اور علاقے میں چلے گئے ہوں گے"۔

"میرا خیال کچھ اور ہے"۔۔۔ قافلے کی خبرلانے والے آدمی نے کہا ۔۔۔ "قافلے میں جو کوئی بھی شامل ہوتا ہے اسے کہا جاتا ہے کہ اس کے پاس تلوار اور برچھی لازمی طور پر ہونی چاہئے اور اس میں حملے کی صورت میں لڑنے کا جذبہ بھی ہونا چاہئے۔ میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ جہاں پڑاؤ ہوتا ہے وہاں کئی ایک نوجوان رضاکارانہ طور پر پورے پڑاؤ کے ارد گرد گھوم پھر کر پہرہ دیتے ہیں۔ قافلے میں نوجوان آدمیوں کی تعداد ذرا زیادہ ہے۔ میں یہی بات آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ قافلے کے ساتھ حفاظت کا انتظام بھی موجود ہے اس لئے ہمیں زیادہ آدمیوں کی ضرورت ہے اور سب سے بڑی ضرورت احتیاط کی ہے"۔

"ہاں... یہ سوچنے والا معاملہ ہے"۔۔۔ احمد بن غطاش نے کہا اور گہری سوچ میں گم ہو گیا۔

"ہم اس قافلے کو محافظ دیں گے"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا اور قافلے کی خبرلانے والے سے مخاطب ہُوا ۔۔۔ "تم کچھ دیر میرے پاس بیٹھنا.... اور استادِ محترم یہ کوئی پریشان کرنے والا معاملہ نہیں"۔

اس شخص نے بتایا کہ اس وقت تک قافلے کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہو چکی ہے اور جس بستی اور شہر کے قریب سے یہ قافلہ گزرتا ہے اس میں لوگ شامل ہوتے جا رہے ہیں۔

"میں اس کی وجہ سمجھتا ہوں"۔۔۔ احمد بن غطاش نے کہا ۔۔۔ "ایک عرصے بعد لوگوں نے ایک قافلہ دیکھا ہے اس لئے لوگ اس قافلے کے ساتھ چل پڑے ہیں"۔

"یہ قافلہ منزل پر نہیں پہنچنا چاہئے"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔

"اسی لئے تو میں اتنی دُور سے آیا ہوں"۔۔۔ اس شخص نے کہا ۔۔۔ "مجھے فوراً بتائیں کہ میں نے کیا کرنا ہے۔ مجھے جلدی روانہ ہو جانا چاہئے"۔

احمد بن غطاش اور حسن بن صباح نے اسے ہدایات دینی شروع کر دیں۔

○

یہ شخص گھوڑے پر سوار، قلعے سے اس طرح نکلا کہ کسی نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں

کہ یہ کون ہے اور کہاں جا رہا ہے۔ شہر سے کچھ دُور جا کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دیکھتے ہی دیکھتے سرسبز ٹیکریوں اور جنگل میں غائب ہو گیا۔

اس کے جانے کے فوراً بعد احمد بن غطاش نے اپنے دو خاص مصاحبین کو بلایا اور انہیں کچھ ہدایات دیں۔ دونوں بڑی تیزی سے چلے گئے۔ پہلے تو وہ شاہ در میں کچھ لوگوں سے ملے اور پھر دیہات میں نکل گئے۔

اسی شام کو سورج غروب ہونے کے بعد شاہ در سے سات آٹھ میل دُور کم و بیش پچاس گھوڑ سوار اکٹھے ہو گئے۔ انہوں نے احمد بن غطاش کی ہدایت کے مطابق اپنا ایک امیر، کمانڈر مقرر کر لیا اور اُس طرف چل پڑے جس طرف سے قافلے نے گزرنا تھا۔ انہیں راستہ وغیرہ سمجھا دیا گیا تھا۔ ان کے سامنے دو اڑھائی دنوں کی مسافت تھی۔

قافلے کا راستہ وہاں سے تقریباً ساٹھ میل دُور تھا۔ اس وقت تک قافلے کی تعداد ڈیڑھ ہزار سے تجاوز کر گئی تھی۔ اس میں بوڑھے آدمی بھی تھے، بوڑھی عورتیں بھی تھیں، جوان اور نوجوان لڑکے زیادہ تھے، نوجوان لڑکیاں اور بچے بھی تھے، اونٹ بے شمار تھے، تجارتی مال اور گھریلو سامان سے لدی ہوئی چار پانچ بیل گاڑیاں اور مال بردار گھوڑا گاڑیاں بھی تھیں۔ قافلے کے زیادہ تر آدمی گھوڑوں پر سوار تھے۔

ایک پڑاؤ سے علی الصبح قافلہ چلا۔ ابھی چند میل ہی طے کئے ہوں گے کہ قافلے کے آگے آگے جانے والے رک گئے۔

"ڈاکو.... ڈاکو"۔۔۔ قافلے کے آگے سے بڑی بلند آواز سے اعلان ہُوا ۔۔۔ "ہوشیار ہو جاؤ جوانو! ڈاکو آ گئے ہیں۔ تیار ہو جاؤ"۔

قافلے کی لمبائی ایک میل سے کہیں زیادہ تھی۔ اعلان کئی بار دہرایا گیا۔ اس کے جواب میں قافلے میں جتنے بھی نوجوان لڑکے، جوان اور ادھیڑ عمر آدمی تھے تلواریں اور برچھیاں تان کر ایسی ترتیب میں ہو گئے کہ قافلے کو محاصرے میں لے لیا۔ تب پتہ چلا کہ قافلے میں کئی ایک ایسے لوگ ہیں جن کے پاس کمانیں اور تیروں سے بھری ہوئی ترکشیں ہیں۔

"لڑکیوں اور بچیوں کو درمیان میں کر لو"۔۔۔ اعلان ہُوا ۔۔۔ "کچھ آدمی لڑکیوں کے ساتھ رہیں"۔

ایک طرف سے کم و بیش پچاس گھوڑ سوار قافلے کی طرف آ رہے تھے۔ ان کے آنے کا انداز ایسا تھا جیسے وہ حملہ کرنے نہیں آ رہے۔ ان کے پاس تلواریں تھیں لیکن تلواریں نیاموں

میں تھیں۔ بعض کے پاس برچھیاں تھیں اور کچھ ایسے تھے جن کے پاس جنگی کلہاڑے تھے۔ گھوڑوں کی رفتار حملے والی یا تیز بولنے والی نہیں تھی۔ وہ جب قریب آئے تو ان کے آگے آگے جو دو سوار تھے ان دونوں نے ہاتھ اوپر کر کے لہرائے جو ایک پُرامن اشارہ تھا۔

قافلے میں جو تیر انداز تھے وہ ایک صف میں کھڑے ہو گئے اور کمانوں میں ایک ایک تیر ڈال لیا۔

"ہم دوست ہیں" — آنے والے ایک سوار نے کہا — "ہمیں دشمن نہ سمجھو"۔

"پھر وہیں رک جاؤ" — قافلے میں سے ایک آدمی نے کہا — "صرف ایک آدمی آگے آ کر بتاؤ کہ تم کیا چاہتے ہو۔ ہمارے تیر اندازوں کو تیغ زنوں اور برچھی والوں کو دیکھ لو۔ تم اتنے تھوڑے ہو کہ تھوڑی سی دیر میں تم اپنے خون میں ڈوب جاؤ گے اور تمہارے گھوڑے اور ہتھیار ہمارے پاس ہوں گے"۔

ان مشکوک گھڑ سواروں کے آگے آگے آنے والے دونوں سواروں نے پیچھے مڑ کر اپنے ہاتھ ہلائے جو اشارہ تھا کہ باقی سوار پیچھے ہی رک جائیں۔ تمام سوار رک گئے اور یہ دونوں سوار قافلے کے قریب آ گئے۔

"اب بتاؤ تمہارا ارادہ کیا ہے!" — قافلے کے اس معزز آدمی نے کہا جس نے اپنے آپ کو خود ہی میر کارواں بنا لیا تھا۔

"ڈرو نہیں دوستو!" — ایک سوار نے کہا — "ہم پیشہ ور لڑاکے ہیں۔ ہمارا پیشہ امیر لوگوں کی حفاظت کرنا ہے۔ ہم میں اتنی جرأت اور طاقت نہیں کہ اتنے بڑے قافلے پر حملہ کریں۔ ہمیں پتہ چلا کہ ایک قافلہ جا رہا ہے اور ہمیں یہ بھی پتہ ہے کہ قافلوں کو لوٹنے والے بھی موجود ہیں تو ہم نے اپنے ان دوستوں کو اکٹھا کیا اور کہا کہ چلو اس قافلے کے پیچھے جاتے ہیں اور امیر لوگوں کو حفاظت مہیا کریں گے اور حلال کی روزی کما لیں گے۔ تمہارا سفر ابھی بہت لمبا باقی ہے قافلے پر کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ حملہ ہو سکتا ہے۔ ہماری التجا ہے کہ ہمیں قافلے کی حفاظت کے لیے اپنے ساتھ لے چلو ہم راتوں کو پہرہ بھی دیں گے"۔

"کیا تم دیکھ نہیں رہے کہ ہمارے ساتھ کتنے آدمی ہیں!" — میرِ کارواں نے کہا — "کیا تم انہیں اپنی حفاظت خود کرنے کے قابل نہیں سمجھتے؟"

"نہیں!" — ایک سوار نے جواب دیا — "ان میں ہمیں ایک بھی ایسا نظر نہیں آتا جس نے کبھی لڑائی لڑی ہو۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ قافلوں کو لوٹنے والے لڑنے اور مرنے کی

مہارت رکھتے ہیں؟ تمہارے ان آدمیوں نے جب اپنے ساتھیوں کے جسموں سے خون کے فوارے پھوٹتے دیکھے تو یہ سب بھاگ جائیں گے.... ہمیں اپنے محافظ بنا کر اپنے ساتھ لے چلیں ہم اتنی زیادہ اُجرت نہیں مانگیں گے، جو تم دے ہی نہ سکو۔ تم میں بڑے بڑے امیر تاجر بھی ہیں، جوان لڑکیوں کے باپ بھی ہیں۔ پھر آپ کے ساتھ چھوٹے بچے بھی ہیں۔ آپ سب مل جل کر ہمیں اتنی سی اُجرت تو دے ہی سکتے ہیں جس سے کچھ دن ہمارے بچے بھی روٹی کھا لیں گے"۔

"ایک بات میں بھی کہوں گا" — دوسرے سوار نے کہا — "اگر آپ ہمیں حلال روزی مہیا نہیں کریں گے اور ہمیں کہیں سے بھی روزی نہیں ملے گی تو ایک روز ہم بھی راہزنی شروع کر دیں گے اور قافلوں کو لوٹنے کا گروہ بنا لیں گے"۔

"روزی دینے والا خدا ہے" — ایک بزرگ نے آگے آ کر کہا — "میرے ہمسفرو! معلوم ہوتا ہے خدا نے ان کی روزی ہمارے ذمے کر دی ہے۔ نہ جانے یہ بیچارے کتنی دُور سے ہمارے پیچھے آئے ہیں اور یہ حلال کی روزی کے پیچھے آئے ہیں۔ انہیں مایوس نہ کرو اور ان کے ساتھ اُجرت طے کر لو۔ انہیں ساتھ لے لینے سے ہماری حفاظتی طاقت میں اضافہ ہو جائے گا۔ ان سے بات کر لو"۔

ان سے اُجرت پوچھی گئی جو انہوں نے بتائی اور ان کے ساتھ سودا طے کر لیا گیا۔ ان محافظ سواروں نے دو شرطیں پیش کیں۔ ایک یہ کہ انہیں اُجرت پیشگی دے دی جائے اور دوسری یہ کہ ان کا کھانا پینا قافلے کے ذمے ہو گا۔

ان کی دونوں شرطیں مان لی گئیں۔ قافلے کے ہر فرد نے اتنی رقم دے دی جو حساب کے مطابق ہر ایک کے ذمے آتی تھی۔

قافلہ چل پڑا۔ ان پچاس محافظوں نے اپنے آپ کو اس طرح تقسیم کر لیا کہ کچھ قافلے کے آگے ہو گئے۔ کچھ قافلے کے پیچھے اور باقی قافلے کے دائیں اور بائیں ہو گئے۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ محنت مزدوری کرنے والے لوگ ہیں اور وہ پیشہ ور چوکیدار اور محافظ ہیں۔

پہلا پڑاؤ آیا تو ان میں سے بہت سے آدمیوں نے رات بھر دو دو ہو کر پڑاؤ کے چاروں طرف پہرہ دیا۔ اس سے قافلے والے ان سے مطمئن اور متاثر ہو گئے۔ اگلی رات بھی انہوں نے اسی طرح پہرہ دیا۔

تیسرے پڑاؤ تک پہنچتے قافلے میں ڈیڑھ دو سو مزید افراد کا اضافہ ہو چکا تھا۔

قافلہ ایک اور پڑاؤ کے لئے رک گیا۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ لوگ رات بسر کرنے کے لئے اپنے اپنے انتظامات میں مصروف ہو گئے۔ عورتیں کھانا تیار کرنے لگیں۔ پانی کی وہاں کوئی قلت نہیں تھی۔ علاقہ سرسبز اور پہاڑی تھا۔ پہاڑیاں ذرا پیچھے ہٹی ہوئی تھیں اور ان کے درمیان ہری بھری گھاس کا میدان تھا۔ قریب ہی سے شفاف پانی کی ندی گزرتی تھی۔ پڑاؤ کے لئے یہی جگہ موزوں تھی۔

قافلے والے دن بھر کے تھکے ہوئے تھے کھانا کھا کر لیٹے اور لیٹتے ہی سو گئے۔ محافظ سوار پہرے پر کھڑے ہو گئے اور ہر رات کی طرح پڑاؤ کے ارد گرد گھوم پھر کر پہرہ دینے لگے۔ آدھی رات سے کچھ پہلے تھوڑی دور سے الو کے بولنے کی آواز آئی۔ ایک الو پڑاؤ کے بالکل قریب سے بولا۔ ایک بار پھر دور کے الو کی آواز آئی۔

قافلے والے گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ پچاس ساٹھ گھوڑ سوار قافلے کے پڑاؤ کی طرف آ رہے تھے۔ وہ جب پہاڑوں میں پہنچے اور پڑاؤ انہیں اپنے سامنے نظر آنے لگا تو وہ وہیں رک گئے۔ گھوڑوں سے اترے اور آہستہ آہستہ چلتے پڑاؤ کی طرف بڑھنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ چند ایک کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں۔ وہ جو پچاس محافظ تھے' ان میں سے کچھ پہرے پر کھڑے تھے اور باقی سوئے ہوئے تھے۔ ان کے جو ساتھی پہرے پر کھڑے تھے' ان میں سے کچھ آہستہ آہستہ آئے اور انہیں جگایا۔

تمام سوئے ہوئے محافظ آہستہ آہستہ اٹھے۔ انہوں نے تلواریں نکال لیں پھر یہ سب ایک جگہ اکٹھے ہوئے۔ ادھر سے وہ بھی آ گئے جنہوں نے گھوڑے پہاڑیوں کے پیچھے کھڑے کئے تھے۔ یہ سب یعنی محافظ بھی اور ادھر سے آنے والے بھی ایک جگہ آپس میں ملے۔ محافظوں میں سے ایک نے نئے آنے والوں کو بتانا شروع کر دیا کہ کون کہاں ہے' یعنی فلاں جگہ امیر کبیر تاجر ہیں اور فلاں جگہ نوجوان لڑکیاں ہیں وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب' محافظ بھی اور ادھر سے آنے والے بھی تعداد میں ایک سو سے زیادہ ہو گئے۔ محافظ دراصل لٹیرے ہی تھے جنہوں نے دھوکہ دے کر قافلے کے ساتھ رہنا تھا اور ان کے پچاس ساٹھ ساتھیوں نے راستے میں آ کر ان سے ملنا تھا۔ یہ محافظ اس لئے قافلے میں شامل ہوئے تھے کہ انہوں نے پیچھے دیکھ لیا تھا کہ قافلے میں لڑنے والے جوانوں کی تعداد خاصی زیادہ ہے۔

جو آدمی احمد بن غطاش کو اس قافلے کی اطلاع دینے گیا تھا' اس نے بتایا تھا کہ اس قافلے پر

حملہ ناکام بھی ہو سکتا ہے کیونکہ اس میں لڑنے والے آدمیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ احمد بن غطاش یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا تھا لیکن حسن بن صباح کے دماغ نے فوراً" یہ ترکیب سوچ لی تھی کہ لٹیروں کے گروہ کے آدھے آدمی پیشہ ور محافظ بن کر قافلے میں شامل ہو جائیں گے تاکہ قافلے والے راتوں کو خود پہرہ نہ دیں اور وہ اپنی حفاظت سے بے فکر ہو جائیں۔ حسن بن صباح نے اطلاع لانے والے کو یہ ترکیب بڑی اچھی طرح سمجھا دی تھی۔

یہ شخص بڑی تیزی سے لٹیروں کو اکٹھا کرتا پھرا اور ان کا جو لیڈر تھا' اسے اس نے یہ ترکیب سمجھا دی۔ لیڈر نے بڑی خوش اسلوبی سے اس ترکیب پر عمل کیا۔

قافلے والے سمجھ ہی نہ سکے کہ جنہیں وہ محافظ سمجھ بیٹھے ہیں وہ راہزن ہیں۔ ان راہزنوں نے قافلے کے بچے بچے پر اپنا اعتماد قائم کر لیا تھا۔

ان ایک سو سے زیادہ رہزنوں نے پڑاؤ کے ایک طرف سے قتلِ عام شروع کیا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ نوجوان لڑکیوں' کمسن بچیوں اور بچوں کو زندہ لانا ہے۔ جب قافلے والوں کا قتلِ عام شروع ہوا تو دوسروں کی آنکھ کھل گئی لیکن راہزنوں نے انہیں سنبھلنے کی مہلت نہ دی۔ اس کے بعد ایک ہڑبونگ تھی۔ قیامت کا سماں تھا۔ جو کوئی ہڑبڑا کر اٹھتا تھا اس کے جسم میں برچھی اتر جاتی یا تلوار اس کی گردن صاف کاٹ دیتی۔ وہاں ان کی چیخ و پکار سننے والا اور سن کر مدد کو پہنچنے والا کوئی نہ تھا۔ لڑکیوں اور بچوں کی دلدوز چیخیں تھیں جو راہزنوں اور قاتلوں کے دلوں کو موم نہیں کر سکتی تھیں۔

کچھ زیادہ دیر نہ لگی کہ قافلے کا صفایا ہو گیا۔ لٹیروں نے سامان سمیٹنا شروع کر دیا۔ پھر انہوں نے یہ سامان اونٹوں' بیل گاڑیوں اور گھوڑا گاڑیوں پر لاد لیا۔ نوجوان لڑکیوں' بچیوں اور بچوں کو ہانک کر ایک طرف لے جانے لگے۔

قیامت کی اس خونریزی میں ایک دو اونٹ اور ایک دو گھوڑے کھل کر اِدھر اُدھر ہو گئے تھے۔ شاید چند انسان بھی زندہ بچ گئے ہوں۔ راہزن بڑی جلدی میں تھے۔ انہوں نے لڑکیوں اور بچوں کو ایک گھوڑا گاڑی پر سوار کر لیا اور چار پانچ آدمی ان کے ساتھ سوار ہو گئے اور وہ پہاڑیوں کے پیچھے غائب ہو گئے۔

○

صبح کا اجالا سفید ہوا تو آسمان نے اس میدان میں لاشوں پر لاشیں پڑی دیکھیں۔ لاشوں کے سوا وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ قریب کی ایک ٹیکری کے اوپر ایک بوڑھا آدمی لیٹا ہوا تھا۔ اس نے آہستہ

آہستہ سر اٹھایا اور ان کی طرف دیکھا۔ اس نے اپنی اتنی لمبی عمر میں ایسے منظر پہلے بھی دیکھے ہوں گے۔ وہ کوئی تجربہ کار آدمی تھا۔ وہ اسی قافلے کا ایک فرد تھا۔ رات کو جب قتلِ عام شروع ہوا تو وہ کسی طرح وہاں سے بھاگ نکلا اور ٹیکری پر چڑھ کر اونچی گھاس میں چھپ گیا تھا۔ وہ رات بھر اپنے ہمسفروں اور ان کے بچوں اور عورتوں کی چیخ و پکار سنتا رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اٹھا اور ٹیکری سے اترا۔ اسے یہ ڈر نہ تھا کہ ڈاکو پھر آ جائیں گے اور اسے قتل کر دیں گے۔

وہ آہستہ آہستہ ان لاشوں کو دیکھتا گیا۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے خواب میں چل رہا ہو۔ وہ اپنے کنبے کو ڈھونڈ رہا تھا۔ وہاں تو کوئی کہاں اور کوئی کہاں پڑا تھا۔ اسے بہت ہی چھوٹے سے ایک بچے کی لاش پڑی نظر آئی۔ بچے کی عمر چند مہینے ہی ہو گی۔ وہ کچھ دیر اس غنچے کو دیکھتا رہا جو بن کھلے مرجھا گیا تھا۔ بچے سے نظریں ہٹا کر اس نے ہر طرف دیکھا۔ اسے کچھ دور ایک اونٹ نظر آیا جو بڑی بے پروائی سے اس خونی منظر سے بے نیاز گھاس چر رہا تھا۔

بوڑھے نے آسمان کی طرف دیکھا جیسے خدا کو ڈھونڈ رہا ہو۔ اچانک اسے ایک خیال آیا۔ وہ بڑی تیزی سے اونٹ کی طرف چل پڑا۔ اونٹ کے پاس جا کر اس کی مہار پکڑی اور وہیں بٹھا دیا۔ پھر وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اسے ایک کجاوا ایک جگہ پڑا دکھائی دیا۔ وہ گیا اور کجاوا اٹھا کر اونٹ کے پاس لے گیا۔ اونٹ کی پیٹھ پر رکھ کر اس نے کجاوا کس دیا۔ پھر اس دودھ پیتے بچے کی خون آلود لاش اٹھا کر لے گیا۔ لاش کو کجاوے میں رکھا اور خود بھی اونٹ پر سوار ہو گیا اور اونٹ کو اٹھایا۔

اس نے اونٹ کا رخ مرو کی طرف کر دیا۔ اُس وقت مرو سلجوقی سلطنت کا دارالحکومت تھا۔ سلطان ملک شاہ وہیں ہوتا تھا۔

ملک شاہ روایتی بادشاہوں جیسا بادشاہ نہیں تھا لیکن جہاں وہ رہتا تھا وہ محل سے کم نہ تھا۔ ایک روز وہ اپنے مصاحبوں وغیرہ میں بیٹھا ہوا تھا۔

"میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں" ——— ملک شاہ نے کہا اور کچھ دیر سوچ کر بولا ——— "قافلوں کے لٹنے کا خطرناک سلسلہ ختم ہو گیا ہے۔ ہم کسی کو پکڑ تو نہیں سکے لیکن پکڑنے اور سزا دینے والا اللہ ہے۔ یہ اللہ ہی ہے جس نے میری مدد کی اور قافلے محفوظ ہو گئے۔"

"سلطان محترم!" ——— دربان نے اندر آ کر کہا ——— "ایک ضعیف العمر شتر سوار آیا ہے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"کہاں سے آیا ہے؟" ——— سلطان نے پوچھا ——— "کیا چاہتا ہے؟ کچھ پوچھا تم نے؟"

"نہیں سلطان عالی مقام!" ——— دربان نے جواب دیا ——— "اس کی حالت اچھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے بڑی لمبی مسافت طے کر کے آیا ہے۔ اُس نے بہت چھوٹے سے بچے کی لاش اٹھا رکھی ہے۔ لاش کو جیسے خون سے نہلایا گیا ہے۔"

"لاش؟" ——— ملک شاہ نے چونک کر کہا ——— "چھوٹے سے بچے کی لاش؟ اُسے فوراً اندر بھیجو۔ یہ فریادی معلوم ہوتا ہے۔"

وہ ضعیف العمر ہانپتا کانپتا، جھکا جھکا، بازوؤں پر چند ماہ عمر کے بچے کی خون آلود لاش اٹھائے ملک شاہ کے سامنے آیا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ اُس کی آنکھوں کا نور بجھ چکا تھا۔

"آؤ میرے بزرگ!" ——— ملک شاہ اٹھ کھڑا ہوا اور پوچھا ——— "کیا مشکل تمہیں یہاں لے آئی ہے؟"

"ایک بچے کی لاش لایا ہوں اے سلطان!" ——— بوڑھے نے کہا ——— "یہ آپ کا بچہ ہے" ——— اس نے آگے بڑھ کر لاش سلطان کے قدموں میں رکھ دی ——— "اونٹ کی پیٹھ پر تین دن اور تین راتیں سفر کیا ہے۔ نہ اونٹ نے کچھ کھایا ہے نہ میں نے۔ یہ اللہ کی امانت تھی جس میں سلجوقی سلطان نے خیانت کی..... دیکھ سلطان دیکھ۔ اس بن کھلی کلی کو دیکھ۔ اس ننھے سے بچے میں ابھی یہ احساس بھی پیدا نہیں ہوا تھا کہ یہ زندہ ہے اور مرتے وقت اسے یہ احساس نہیں ہوا ہو گا کہ موت نے اسے ماں کی آغوش سے اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا ہے۔"

سلطان ملک شاہ نے دربان کو بلوایا اور کہا کہ وہ بچے کی لاش لے جائے، اسے غسل دے کر کفن پہنایا جائے۔

"اے بزرگ انسان!" ——— سلطان نے بوڑھے سے کہا ——— "کیا یہ اچھا نہیں ہو گا کہ شکوے اور شکایت سے پہلے یہ بتا دو کہ یہ بچہ کس کا ہے اور اسے کس نے قتل کیا ہے؟"

"یہ میرے کسی ہمسفر کا بچہ تھا" ——— بوڑھے نے کہا ——— "میں اس کے باپ کو نہیں جانتا۔ اس کی ماں کو نہیں جانتا۔ انہیں میں کبھی بھی نہیں جان سکوں گا۔ وہ بھی قتل ہو گئے ہیں۔ وہ کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے؟ کہاں جا رہے تھے؟ میں نہیں جانتا۔ میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ ہمارے قافلے کے ساتھ تھے۔ قافلے پر ڈاکوؤں کا حملہ ہو گیا۔"

بوڑھے نے تفصیل سے سنایا کہ قافلہ کہاں سے چلا تھا، کس طرح اس میں مسافروں کا اضافہ ہوتا گیا اور پھر کس طرح اور کہاں قافلے پر اُس وقت حملہ ہوا جب سب گہری نیند سو رہے تھے۔

سلطان غصے کے عالم میں کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔ وہ بار بار ایک ہاتھ کا گھونسہ دوسرے کی ہتھیلی پر مارتا تھا۔ اُس کے چہرے پر قہر اور عتاب کے آثار گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

"کچھ عرصہ پہلے قافلوں پر حملے شروع ہوئے تھے" — بوڑھے نے کہا — "پھر یہ حملے خود ہی ختم ہو گئے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ آپ نے ڈاکوؤں کی سرکوبی کا کوئی بندوبست کر دیا تھا بلکہ لوگوں نے سفر کرنا چھوڑ دیا تھا۔ ہم بدقسمت اس خوش فہمی میں نکل کھڑے ہوئے کہ منزل پر پہنچ جائیں گے"۔

"اس بچے کی لاش یہاں کیوں لے آئے ہو؟" — سلطان ملک شاہ نے پوچھا۔

"سلطان کو یہ دکھانے کے لئے کہ سلطانوں کے گناہوں کی سزا رعایا کو ملا کرتی ہے" — بوڑھے نے کہا — "میں عقیدے کا سُنّی ہوں۔ آپ مجھے معاف کریں یا نہ کریں، مجھے اس کا کوئی ڈر نہیں، میں خلفاء راشدین کی بات کروں گا جن کے دور میں ہر طرف مسلمانوں کی ہی نہیں بلکہ ہر مذہب کے لوگوں کی عزت محفوظ ہو گئی تھی، جان محفوظ ہو گئی تھی اور لوگوں کے مال و اموال محفوظ ہو گئے تھے۔ وہ رعایا کو اور رعایا کے بچوں کو اللہ کی امانت سمجھتے تھے..... میں بچے کی لاش اس لئے یہاں لایا ہوں کہ سلطان اس معصوم کی کھلی اور ٹھہری ہوئی آنکھوں میں اپنے گناہوں کا عکس دیکھ لے"۔

"دیکھ لیا ہے میرے بزرگ!" — سلطان نے کہا — "ہم ان قزاقوں کو پکڑیں گے"۔

"ہمارے قافلے سے تمام نوجوان لڑکیوں اور بچیوں کو قزاق اپنے ساتھ لے گئے ہیں" — بوڑھے نے کہا — "وہ نہیں وہ قتل نہیں کریں گے، انہیں امراء کے گھروں میں فروخت کیا جائے گا۔ انہیں عیش و عشرت کا ذریعہ بنایا جائے گا۔ اُمتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بچیاں رقاصہ بنیں گی، عصمت فروش بنیں گی اور ساری عمر اپنے سلطان کے اس گناہ کی سزا بھگتتی رہیں گی کہ سلطان نے اپنے فرائض سے نظریں پھیرلی تھیں۔ سلطان کی نیندیں حرام ہو جانی چاہئیں..... میں قافلے والوں کی روحوں کا یہ پیغام لے کر آیا ہوں"۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سلجوقی سلطان اسلام کے سچے پیروکار تھے۔ ان میں روایتی بادشاہوں والی خُو نہیں تھی۔ اس بوڑھے نے ایسی سخت باتیں بھی کہہ ڈالی تھیں جو کوئی معمولی سا حاکم بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن سلطان ملک شاہ نے نہ صرف یہ کہ بوڑھے کا غصہ بھی برداشت کیا اور طنز بھی بلکہ حکم دیا کہ اسے مہمان خانے میں رکھا جائے اور جب تک یہاں قیام کرنا چاہے اُسے سلطان کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے رکھا جائے۔

ملک شاہ نے اُسی وقت فوج کے سپہ سالار اور کوتوال کو بلا کر انہیں وہ جگہ بتائی جہاں قافلہ لوٹا گیا اور قافلے والوں کا قتلِ عام ہوا تھا۔ اُس نے حکم دیا کہ ہر طرف، ہر شہر اور ہر آبادی میں جاسوس پھیلا دیئے جائیں۔

"یہ کوئی بہت بڑا اور منظم گروہ ہے" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "ہم جاسوسوں اور مخبروں کے بغیر اس کا سراغ نہیں لگا سکتے۔ مجھے ان چھوٹے چھوٹے قلعوں کے مالکوں اور قلعہ داروں پر بھی شک ہے۔ ان کے ساتھ ہمیں مروّت سے پیش آنا پڑتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ کسی بھی وقت خود مختاری کا اعلان کر سکتے ہیں۔ میں ان پر فوج کشی نہیں کرنا چاہتا ورنہ یہ سرکش اور باغی ہو جائیں گے"۔

"سلطان عالی مقام!" — سپہ سالار نے کہا — "میری نظر قلعہ شاہ در کے والی احمد بن عطاش پر بار بار اُٹھتی ہے۔ مجھے شک ہے کہ وہ کوئی زمین دوز کارروائیوں میں مصروف ہے۔ شاہ در ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں کی آبادی خاصی زیادہ ہے۔ احمد کو اس آبادی سے فوج مل سکتی ہے"۔

"اسے شاہ در کا والی میں نے ہی بنایا تھا" — سلطان نے کہا — "اور یہ شہر اس کے حوالے اس کی کچھ خوبیاں دیکھ کر کیا تھا۔ اس کی شہرت یہ ہے کہ وہ اہلِ سنت ہے اور وہ جب وعظ اور خطبہ دے رہا ہوتا ہے تو کفر کے پتھر بھی موم ہو جاتے ہیں۔ پہلے والی نے وصیت کی تھی کہ شاہ در کا والی احمد بن عطاش کو مقرر کیا جائے"۔

"گستاخی معاف سلطان محترم!" — کوتوال نے کہا — "کسی کی خطابت سے متاثر ہونا اور بات ہے لیکن ایسے خطیب کی نیت اور دل میں چھپے ہوئے عزائم کو سمجھنا بالکل ہی مختلف معاملہ ہے اور یہی ایک راز ہے جو جاننا ضروری ہوتا ہے۔ مجھے کچھ ایسی اطلاعیں ملتی رہی ہیں جن سے یہ شک پیدا ہوتا ہے کہ شاہ در میں اسماعیلی اکٹھے ہو رہے ہیں"۔

"یہ شک ایک اور وجہ سے بھی پختہ ہوتا ہے" — سپہ سالار نے کہا — "احمد نے قلعے کا والی بنتے ہی ان تمام اسماعیلیوں کو رہا کر دیا تھا جنہیں سُنّی عقیدے کے خلاف کام کرتے پکڑا گیا تھا، لیکن اب ہم اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ تین سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اب ہم صرف یہ کر سکتے ہیں اور ہمیں یہ کرنا بھی چاہئے کہ کسی ایسے جاسوس کو شاہ در بھیج دیتے ہیں جو بہت ہی ذہین، دانشمند اور ہر بات کی گہرائی میں اتر جانے والا ہو۔ وہ ذرا اونچی حیثیت کا آدمی

ہونا چاہئے جو والیٔ قلعہ کی محفلوں میں بیٹھنے کے قابل ہو"۔

"ایسا کوئی آدمی تمہاری نظر میں ہے؟" ___ سلطان نے پوچھا۔

"میرے پاس دو ایسے آدمی ہیں" ___ کوتوال نے کہا ___ "جن دونوں میں جو بہتر ہے' اگر آپ حکم دیں' تو میں اُسے شاہ در بھیج دوں گا۔ بھیجنے سے پہلے میں اسے کچھ دن تربیت دوں گا"۔

"بھیج دو" ___ ملک شاہ نے کہا ___ "اگر فوج کشی کی ضرورت پڑی تو میں حیل و حجت نہیں کروں گا۔ میں اپنی ذات کی توہین برداشت کر سکتا ہوں' اپنے عقیدے کے خلاف ایک لفظ بھی گوارا نہیں کروں گا"۔

اُس شخص کا نام یحیٰ ابن الہادی تھا۔ اس کی عمر تیس سال سے کچھ اوپر تھی۔ عراقی عرب تھا۔ خوبرو اتنا کہ ہجوم میں ہوتا تو بھی دیکھنے والوں کی نظریں اُس پر رک جاتی تھیں۔ جسم گٹھا ہُوا اور ساخت پُرکشش۔ ایسا ہی حُسن اُس کی زبان میں تھا۔ عربی اُس کی مادری زبان تھی۔ فارسی بھی بولتا اور سلجوقیوں کی زبان بھی سمجھ اور بول لیتا تھا۔ یہ تُرکی زبان تھی۔ شہسوار تھا۔ تیغ زنی اور تیر اندازی میں خصوصی مہارت رکھتا تھا۔

کوتوال نے اسے آٹھ دس دن اپنے ساتھ رکھا اور تربیت دیتا رہا۔

"ابن الہادی!" ___ کوتوال نے اسے شاہ در روانہ کرنے سے ایک روز پہلے کہا ___ "یہ تو تم جان چکے ہو کہ تم شاہ در جاسوسی کے لئے جا رہے ہو اور مجھے یقین ہے کہ تم کامیاب لوٹو گے لیکن ایک بار پھر سن لو کہ تمہارا مقصد کیا ہے۔ شک یہ ہے کہ احمد بن عطاش کی کچھ زمین دوز سرگرمیاں ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ اسماعیلیوں اور باغیوں کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہے۔ اگر ایسا نہیں تو یہ تم نے دیکھنا ہے کہ اُس کے درپردہ عزائم کیا ہیں۔ کیا یہ عزائم سلطنت کے حق میں ہیں یا احمد سرکشی اور خود مختاری کی طرف بڑھ رہا ہے"۔

"میں آپ تک خبریں کس طرح پہنچایا کروں گا؟" ___ یحیٰ ابن الہادی نے پوچھا۔

"سنان تمہارے ساتھ جا رہا ہے" ___ کوتوال نے اسے بتایا ___ "وہ تمہیں ملتا رہا کرے گا۔ میں تمہیں اللہ کے سپرد کرتا ہوں ابن الہادی!"

اگلی صبح یحیٰ ابن الہادی اور سنان شاہ در کو روانہ ہو گئے۔

○

احمد بن عطاش کو بتایا جا چکا تھا کہ قافلہ کامیابی سے لُوٹ لیا گیا ہے۔ آٹھ دس دنوں بعد وہ تمام زر و جواہرات جو قافلے سے ملے تھے' احمد کے حوالے کر دیئے گئے تھے' پھر باقی سامان بھی

تھوڑا تھوڑا اس کو پہنچایا جاتا رہا۔ کسی کو شک تک نہ ہُوا کہ قافلہ والیٔ شاہ در کے کہنے پر لُوٹا گیا تھا۔

"محترم استاد!" ___ ایک روز حسن بن صباح نے احمد بن عطاش سے پُرمسرت لہجے میں کہا ___ "کیا اتنا مال و دولت اور اتنی حسین نوخیز لڑکیاں پہلے بھی آپ کو کسی قافلے سے ملی تھیں؟"

"نہیں حسن!" ___ احمد نے کہا ___ "میں نے اب تک جتنے قافلوں پر حملے کروائے ہیں' ان سب کا لُوٹا ہُوا مال اکٹھا کیا جائے تو اتنا نہیں بنتا جتنا اس ایک قافلے سے حاصل ہُوا ہے" ___ احمد خاموش ہو گیا اور حسن بن صباح کو غور سے دیکھ کر بولا ___ "کیوں حسن! آج تم کچھ زیادہ ہی خوش نظر آ رہے ہو"۔

"ہاں استاد!" ___ حسن نے کہا ___ "میں اس لئے خوش نہیں کہ اس قافلے نے ہمیں مالا مال کر دیا ہے بلکہ میری خوشی کی وجہ یہ ہے کہ میری بتائی ہوئی ترکیب کامیاب رہی ہے.... میں کوئی اور بات کہنے لگا تھا... اس کامیابی کا جشن منانا چاہئے اور اس جشن میں شہر کے لوگوں اور ارد گرد کے لوگوں کو بھی شامل کیا جائے"۔

"کیا لوگوں کو کھانا کھلاؤ گے؟" ___ احمد بن عطاش نے پوچھا ___ "ناچ گانا کراؤ گے؟... جو کچھ بھی کرو گے وہ بعد کی بات ہے' پہلے تو سوچنے والی بات یہ ہے کہ لوگوں کو کیا بتاؤ گے کہ یہ کیسا جشن ہے؟"

"بتانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" ___ حسن نے کہا ___ "جشن تو ہم منائیں گے۔ لوگوں کو کسی اور طریقے سے شامل کرنا ہے۔ وہ اس طرح کہ کم از کم دو دن گھوڑ دوڑ' نیزہ بازی' تیغ زنی' تیر اندازی' کُشتی وغیرہ کے مقابلے کرائیں گے اور جیتنے والوں کو انعام دیں گے... ہم نے جشن تو اپنا منانا ہے لیکن اس سے ایک فائدہ یہ حاصل ہو گا کہ لوگ خوش ہو جائیں گے۔ لوگوں کے ساتھ آپ کا رابطہ بہت ضروری ہے لیکن یہ احتیاط ضروری ہو گی کہ میں لوگوں کے سامنے نہیں آؤں گا یا انہیں اپنا چہرہ نہیں دکھاؤں گا کیونکہ میں نے بعد میں کسی اور روپ میں سامنے آنا ہے۔ ... جشن آپ کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے ضروری ہے"۔

احمد بن عطاش کو یہ تجویز اتنی اچھی لگی کہ اُس نے اُسی وقت جشن کی تفصیلات طے کرنی شروع کر دیں پھر حکم دیا کہ شہر میں اور ارد گرد کے علاقے میں ایک ہی دن میں یہ منادی کرا دی جائے کہ فلاں دن شاہ در میں گھوڑ دوڑ' نیزہ بازی' تیغ زنی' کُشتی وغیرہ کے مقابلے ہوں گے جن میں جو چاہے شریک ہو کر انعام حاصل کر سکتا ہے۔

اس منادی سے شاہ در کے اِردگرد کے علاقے میں نئی جان پڑ گئی۔ لوگ ایک دو دن پہلے شاہ در پہنچنا شروع ہو گئے۔ شہر کے اردگرد خیموں کی ایک وسیع و عریض بستی آباد ہو گئی۔ گھوڑوں اور اونٹوں کا ہی کوئی شمار نہ تھا۔

مقابلے کے دن سے ایک دن پہلے خیموں کی بستی اتنی دُور دُور تک پھیل گئی تھی کہ اس کے درمیان شاہ در گاؤں سا لگتا تھا۔ سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے حسن بن صباح اپنے استاد اور پیرو مرشد احمد بن غطاش کے ساتھ محل نما مکان کے بالا خانے کی کھڑکی میں کھڑا باہر سے آئے ہوئے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔ ان کی تعداد سینکڑوں نہیں ہزاروں تھی۔

"میرے مُرشد!" ـــــ حسن بن صباح نے احمد سے کہا ـــــ "یہ ہے وہ مخلوقِ خدا جسے ہم نے اپنی مریدی میں لینا ہے... کیا یہ ممکن ہے؟"

"ناممکن بھی نہیں حسن!" ـــــ احمد نے کہا ـــــ "ہمارا کام آسان تو نہیں۔ ہم نے ناممکن کو ممکن کر دکھانا ہے۔ تمہارے ساتھ یہ باتیں پہلے ہو چکی ہیں۔ اگر حکومت ہماری ہوتی تو پھر کوئی مشکل نہیں تھی۔ ہمارے سامنے سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ حکمران سلجوقی ہیں اور وہ اہلِ سُنّت ہیں۔ ہم تعداد میں تھوڑے ہیں۔ ہم نے ان لوگوں کے دلوں پر قبضہ کرنا ہے۔ تم مجھ سے زیادہ عقلمند ہو۔ اس ہجوم کو دیکھ کر مجھے معلوم ہُوا ہے کہ تمہاری یہ تجویز کتنی قیمتی ہے۔"

"تفریح استادِ محترم!" ـــــ حسن نے کہا ـــــ "انسان کی فطرت تفریح چاہتی ہے۔ انسان حقیقت کا منفور ہے۔ لذت چاہتا ہے۔ آپ استاد ہیں۔ آفتاب ہیں آپ، میں آپ کے سامنے چراغ سے بڑھ کر کیا حیثیت رکھتا ہوں۔ مجھے آپ کا سبق یاد ہے۔ ہر انسان کی ذات میں کمزوریاں ہیں اور ہر انسان اپنی کمزوریوں کا غلام ہے۔ اس ہجوم میں بڑے امیر لوگ بھی ہیں۔ زر پرستی اور برتری ان کی کمزوری ہے اور جو غریب ہیں وہ ایسے خدا کی تلاش میں ہیں جو انہیں بھی امیر بنانے کی قدرت رکھتا ہے۔"

"وہ نہیں یہ خدا! ہم دیں گے" ـــــ احمد نے کہا ـــــ "وہ نہیں ہم اپنے عقیدے میں لے آئیں گے۔"

سورج غروب ہو گیا۔ شاہ در اور اس کے اردگرد خیموں کی دنیا کی گہما گہمی رات کی تاریکی اور سکوت میں دم توڑتی چلی گئی۔ باہر کے لوگ نیند کی آغوش میں مدہوش ہو گئے تو احمد اور حسن کی دنیا کی رونق عروج پر پہنچ گئی۔ شراب کا دور چل رہا تھا۔ نیک و بد کی تمیز ختم ہو چکی تھی۔

صبح طلوع ہوئی تو ہزارہا انسانوں کا انبوہِ بے کراں اس میدان کے اردگرد جمع ہو گیا جس میدان میں مختلف مقابلے منعقد ہونے تھے۔ یہ بہت ہی وسیع و عریض میدان تھا۔ مقابلے میں شرکت کرنے والوں کو منتظمین نے الگ جگہ دے دی تھی۔ اس طرف کسی تماشائی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

احمد بن غطاش کے بیٹھنے کی جگہ ایک چبوترے پر تھی جو اسی مقصد کے لئے بنایا گیا تھا۔ شاہی مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام بھی اسی چبوترے پر تھا۔ اس پر بڑا ہی خوبصورت شامیانہ تنا ہُوا تھا۔ برچھی بردار سنتری اور چوب دار چمکیلے اور رنگ دار لباس میں چبوترے کے نیچے اور اوپر چاک و چوبند کھڑے تھے۔ ہر لحاظ سے یہ اہتمام شاہانہ لگتا تھا۔ روم کے شہنشاہوں کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔

اچانک دو نقارے بجنے لگے۔ ایک طرف سے احمد بن غطاش شاہی مہمانوں، اپنے خاندان کے افراد اور مصاحبوں کے جلوس میں شاہانہ چال چلتا آیا۔ اُس کے ساتھ ایک باریش آدمی تھا جو سرتاپا ہلکے سبز رنگ کی عبا میں ملبوس تھا۔ اُس کا چہرہ پوری طرح نظر نہیں آتا تھا کیونکہ اُس نے سر پر جو کپڑا لے رکھا تھا، اس کپڑے نے اس کا آدھا چہرہ اس طرح ڈھکا ہُوا تھا کہ اس کی آنکھیں اور ناک ہی نظر آتی تھی۔ وہ حسن بن صباح تھا جس نے اپنے آپ کو لوگوں سے مستور رکھنا تھا۔

احمد بن غطاش حسن بن صباح کے ساتھ یوں چل رہا تھا جیسے حسن بن صباح کوئی بہت ہی معزز اور برگزیدہ بزرگ ہو۔ یہ سب لوگ چبوترے پر آ کر اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ احمد بن غطاش اٹھا اور چبوترے پر دو چار قدم آگے آیا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" ـــــ اُس نے بڑی ہی بلند آواز سے کہا ـــــ "میں نے ان مقابلوں کا اہتمام اس لئے کرایا ہے کہ اسلام کی پاسبانی کے لئے قوم کے ہر فرد کا مجاہد بننا لازمی ہے۔ جہاد کے لئے تیاری کرتے رہنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ہم میں کتنے لوگ جہاد میں دشمن کو تہِ تیغ کرنے کے قابل ہیں؟"

اُس نے ہاتھ بلند کر کے نیچے کیا جو اشارہ تھا کہ مقابلے شروع کر دیئے جائیں۔

گھوڑدوڑ شروع ہو گئی۔ لوگوں نے داد و تحسین کا شوروغل بپا کر دیا۔

اس کے بعد گھوڑسواری کے کرتبوں کے مقابلے ہوئے اور اس کے بعد شُتر سوار میدان میں اترے۔ جب اونٹوں کی دوڑ ختم ہو گئی تو اعلان ہُوا کہ اب تیر اندازی کا مقابلہ ہو گا۔ اس

اعلان کے ساتھ ہی چار آدمی ایک بہت بڑا پنجرا اٹھائے ہوئے میدان میں آئے۔ پنجرے میں ڈیڑھ دو سو کبوتر بند تھے۔ ایک آدمی نے اعلان کیا کہ ایک کبوتر اُڑایا جائے گا اور ایک تیرانداز اس کبوتر کو تیر سے گرائے گا۔ یہ بھی کہا گیا کہ کوئی تیرانداز پہلے تیر سے کبوتر کو نہ گرا سکے تو وہ دوسرا اور پھر تیسرا تیر بھی چلا سکتا ہے۔ اوّل انعام ان تیراندازوں کو دیئے جائیں گے جو پہلے ہی تیر سے کبوتر کو نشانہ بنالیں گے۔

کم و بیش ایک سو تیرانداز ایک طرف کھڑے تھے۔ پہلے تیرانداز کو بلایا گیا۔ پنجرے میں سے ایک کبوتر نکال کر اوپر کو پھینکا گیا۔ تیرانداز نے کمان میں تیر ڈالا اور جب کبوتر ذرا بلندی پر گیا تو اُس نے تیر چلایا لیکن کبوتر تیر کے راستے سے ہٹ گیا تھا۔ تیرانداز نے بڑی پھرتی سے ترکش سے دوسرا تیر نکال کر کمان میں ڈالا اور کبوتر پر چلایا۔ وہ بھی خطا گیا۔ تیسرا تیر بھی کبوتر کے دور سے گزر گیا۔

ایک اور تیرانداز کو بلایا گیا۔ میدان کے وسط میں کھڑے ہو کر اس نے کمان میں تیر ڈالا اور تیار ہو گیا۔ پنجرے سے ایک کبوتر نکال کر اوپر کو چھوڑا گیا۔ یہ تیرانداز بھی کبوتر کو نہ گرا سکا۔

دس بارہ تیرانداز آئے۔ کوئی ایک بھی کبوتر کو نہ گرا سکا۔ اگر پرندہ سیدھی اُڑان میں اُڑا جائے تو ماہر تیرانداز اسے نشانہ بنا سکتا ہے لیکن جو کبوتر پنجرے سے نکلتا تھا وہ اتنا ڈرا ہوا ہوتا تھا کہ بلندی پر بھی جاتا تھا اور بڑی تیزی سے دائیں اور بائیں بھی ہوتا تھا۔ اُس کی اُڑان کا کچھ پتہ نہیں چلتا تھا کہ اب یہ کس طرف گھوم جائے گا۔ ایسے پرندے کو تیر سے مارنا بہت ہی مشکل تھا۔

ایک اور تیرانداز آگے آیا اور ایک کبوتر اُس کے لئے چھوڑا گیا۔ اس تیرانداز نے بھی یکے بعد دیگرے تین تیر چلائے مگر تینوں خطا گئے۔ لوگوں نے شور و غل بلند کیا۔ تیر اوپر جاتے اور گرتے صاف نظر آتے تھے۔ یہ کبوتر تین تیروں سے بچ گیا اور تماشائیوں کے اوپر ایک چکر میں اُڑتا بلند ہوتا جا رہا تھا۔ ایک اور تیرانداز میدان میں آ رہا تھا۔

تماشائی ابھی اوپر اس کبوتر کو دیکھ رہے تھے جو تین تیروں سے بچ کر محوِ پرواز تھا۔ احمد بن غطاش کے چبوترے کے قریب جو تماشائی کھڑے تھے ان میں سے ایک کی کمان میں سے تیر نکلا جو کبوتر کے پیٹ میں اتر گیا اور کبوتر پھڑپھڑاتا ہوا نیچے آنے لگا۔ تماشائیوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ ان کی حیرت قدرتی تھی۔ کبوتر زیادہ بلندی پر چلا گیا تھا اور ابھی تک گھبراہٹ کے عالم میں یوں اُڑ رہا تھا جیسے پھڑپھڑا رہا ہو۔

"یہ تیرانداز کون ہے؟" — احمد بن غطاش نے اٹھ کر اور چبوترے پر آگے آ کر کہا — "سامنے آؤ۔ خدا کی قسم میں اس تیرانداز کو اپنے ساتھ رکھوں گا"۔

ایک گھوڑسوار تماشائیوں میں سے نکلا اور چبوترے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اُس کے ہاتھ میں کمان تھی اور کندھے کے پیچھے ترکش بندھی ہوئی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" — احمد بن غطاش نے اُس سے پوچھا — "کہاں سے آئے ہو؟ کیا تم شاہ در کے رہنے والے ہو؟"

"میرا نام یحییٰ ابن الہادی ہے" — تیرانداز نے جواب دیا — "بہت دُور سے آیا ہوں اور بہت دُور جا رہا ہوں۔ یہاں کچھ دیر کے لئے رُکا تھا۔ لوگوں کا ہجوم دیکھا تو ادھر آ گیا۔ اگر اجازت ہو تو میں دوڑتے گھوڑے سے تیراندازی کا مظاہرہ کر سکتا ہوں۔ میں دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن کوشش کروں گا کہ آپ کو کچھ بہتر تماشا دکھا سکوں"۔

"اجازت ہے" — احمد بن غطاش نے کہا۔

یحییٰ ابن الہادی نے گھوڑے کو دوڑایا اور میدان میں لے جا کر کہا کہ جب اس کا گھوڑا دوڑنے لگے تو ایک کبوتر چھوڑ دیا جائے۔ وہ گھوڑے کو ایک طرف لے گیا اور گھوڑا دوڑا دیا۔ پنجرے سے ایک کبوتر نکال کر چھوڑ دیا گیا۔ یحییٰ نے دوڑتے گھوڑے پر ترکش سے ایک تیر کمان میں ڈالا اور کبوتر کو نشانے میں لینے لگا۔ آخر اس کی کمان سے تیر نکلا جو کبوتر کے ایک پر کو کاٹتا ہوا اوپر چلا گیا اور کبوتر پھڑپھڑاتا ہوا نیچے آ پڑا۔

"آفرین!" — احمد بن غطاش نے اٹھ کر بے ساختہ کہا — "میں تمہیں آگے نہیں جانے دوں گا۔ شاہ در تمہاری منزل ہے"۔

"ایک خالی اونٹ میدان میں دوڑا دیا جائے" — یحییٰ نے بلند آواز سے کہا اور اُس نے گھوڑے کو روک لیا۔

ایک قوی ہیکل اونٹ کو میدان کے ایک سرے پر لا کر پیچھے سے مارا پیٹا گیا۔ اونٹ ڈر کر دوڑ پڑا۔ تین چار آدمی اس کے پیچھے پیچھے دوڑے تاکہ اس کی رفتار تیز ہو جائے۔ یحییٰ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور گھوڑے کو گھما پھرا کر اونٹ کے پہلو کے ساتھ کر لیا۔ گھوڑے کو اپنے ساتھ دوڑتا دیکھ کر اونٹ اور تیز ہو گیا۔ اونٹ کی پیٹھ پر کجاوا کسا ہوا تھا جو ایک آدمی کی سواری کے لئے تھا۔ اس کی مہار زین کے ساتھ بندھی ہوئی تھی۔ یحییٰ نے رکابوں سے پاؤں نکالے اور دوڑتے گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑا ہو گیا۔ وہاں سے اچھلا اور اونٹ کی پیٹھ پر پہنچ

گیا۔ اس نے اونٹ کی مہار پکڑ لی۔ گھوڑا اونٹ سے الگ ہو گیا تھا۔ یحییٰ اونٹ کو گھوڑے کے پہلو میں لے گیا اور اونٹ کی پیٹھ سے کود کر گھوڑے کی پیٹھ پر آ گیا۔ اس نے یہ کرتب دکھانے سے پہلے اپنی کمان پھینک دی تھی۔ اس نے گھوڑے کو موڑا اور چبوترے کے سامنے جا رکا۔

یہ وہی یحییٰ ابن الہادی تھا جسے سلطان ملک شاہ کے کوتوال نے جاسوسی کے لئے شاہ در بھیجا تھا۔ وہ دو روز پہلے شاہ در پہنچا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اپنا کام کس طرح شروع کرے۔ ان ہی دنوں مقابلوں کا ہنگامہ شروع ہو چکا تھا۔ پھر مقابلے کا دن آ گیا اور وہ تماشائیوں میں جا کھڑا ہوا۔ اس نے جب اُڑتے کبوتروں پر تیر چلتے اور خطا ہوتے دیکھے تو اس نے سامنے آئے بغیر ایک کبوتر پر تیر چلا دیا۔ اس طرح اس کا رابطہ براہِ راست احمد بن غطاش سے ہو گیا۔ موقع بہتر جان کر اس نے گھوڑ سواری کا کرتب بھی دکھا دیا۔

○

ایک ایک تیر انداز آگے آتا رہا، اُڑتے کبوتروں پر تیر چلتے رہے، کوئی ایک بھی تیر انداز کبوتر کو نشانہ نہ بنا سکا۔ یحییٰ ابن الہادی کی شکل و شباہت، قد کاٹھ، جسم کی ساخت، ڈیل ڈول اور انداز ایسا تھا کہ احمد بن غطاش نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے حسن بن صباح سے کہا کہ یہ جواں سال گھوڑ سوار کوئی معمولی آدمی نہیں لگتا۔

"اگر یہ مان جائے تو میں اسے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں" ـــ احمد بن غطاش نے حسن سے کہا ـــ "ہمیں اس قسم کے آدمیوں کی ضرورت ہے"۔

"پوچھ لیں" ـــ حسن نے کہا ـــ "لگتا تو مسلمان ہے۔ معلوم نہیں کون سے قبیلے اور کس فرقے کا آدمی ہے"۔

احمد بن غطاش نے ایک چوبدار کو بھیج کر یحییٰ کو بلایا۔ یحییٰ آیا تو احمد نے اسے چبوترے پر بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ یحییٰ کا گھوڑا ایک چوبدار نے پکڑ لیا تھا۔ میدان میں مختلف مقابلے یکے بعد دیگرے ہو رہے تھے لیکن احمد کی توجہ اُدھر سے ہٹ گئی تھی۔ وہ یحییٰ کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

پہلا اور قدرتی سوال یہ تھا کہ وہ کون ہے اور کہاں جا رہا ہے۔

"اپنی منزل کا مجھے کچھ پتہ نہیں" ـــ یحییٰ نے کہا ـــ "شاید میں بھٹک گیا ہوں"۔

"کیا تم بات صاف نہیں کرو گے؟" ـــ احمد بن غطاش نے کہا ـــ "مجھے تمہاری بات میں دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ کیا تم کچھ دن میرے مہمان رہنا پسند کرو گے؟"

"اگر میری روح کو یہاں تسکین مل گئی تو اسی" ـــ یحییٰ نے جواب دیا ـــ "رک جاؤں گا"

شہر کو اپنا ٹھکانہ بنا لوں گا..... لیکن آپ مجھے یہاں روک کر کریں گے کیا؟"

"میں چاہتا ہوں کہ لوگ تم سے تیر اندازی سیکھیں" ـــ احمد نے کہا ـــ "اور تم یہاں ایک محافظ دستہ تیار کرو۔ یہ دستہ گھوڑ سوار ہو گا۔ تم نے ہر ایک محافظ کو شہسوار بنانا ہے"۔

"کیا آپ اپنی فوج تیار کرنا چاہتے ہیں؟" ـــ یحییٰ نے پوچھا۔

یحییٰ نے یہ سوال جاسوس کی حیثیت سے کیا تھا۔ اُسے پوری طرح اندازہ نہیں تھا کہ اس کا سامنا کس قدر گھاگ اور کلیاں آدمی سے ہے۔

"اپنی فوج!" ـــ احمد بن عطاش نے چونک کر کہا ـــ "میں اپنی فوج نہیں بنا سکتا۔ میں تو یہاں کا والی ہوں۔ فوج تیار کرنا سلطان کا کام ہے۔ میں یہاں لوگوں کو جہاد کے لئے تیار کرنا چاہتا ہوں۔ تم نے دیکھا ہے کہ یہاں ایک بھی ایسا تیر انداز نہیں جو اُڑتے کبوتر کو نشانہ بنا سکے۔ گھوڑ سواری میں یہ لوگ اتنے ماہر نہیں جتنا انہیں ہونا چاہئے۔ اگر میں ایک دستے کی صورت میں کچھ لوگوں کو تیار کر لوں گا تو وہ سلطان کے ہی کام آئیں گے۔ تم یقیناً اہلِ سُنّت والجماعت ہو!"

"میں مسلمان ہوں" ـــ یحییٰ نے کہا ـــ "لیکن میں عقیدوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا ہوں۔ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا ہوں کہ کون سا عقیدہ خدا کا اُتارا ہوا ہے اور کون سا انسانوں نے خود گھڑ لیا ہے۔ کبھی کہتا ہوں کہ اسماعیلی صحیح راستے پر جا رہے ہیں اور پھر خیال آتا ہے کہ اہلِ سُنّت صراطِ مستقیم پر ہیں..... میں تو مرد میدان تھا۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے لیکن دماغ میں ان سوالوں نے سر اٹھا لیا اور مجھے منزل منزل کا بھٹکا ہوا مسافر بنا ڈالا۔ میری روح تشنہ اور بے چین ہے"۔

احمد نے حسن بن صباح کی طرف دیکھا جس کا آدھا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ حسن بن صباح نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ کہہ دیا۔

"ہم تمہیں بھٹکنے نہیں دیں گے یحییٰ!" ـــ احمد نے کہا ـــ "خدا نے ہم پر یہ کرم کیا ہے کہ یہ بزرگ ہستی ہمیں عنایت کی ہے۔ یہ دینی علوم کے بہت بڑے عالم ہیں۔ میں ان سے درخواست کروں گا کہ یہ تمہیں اپنی شاگردی میں بٹھا لیں اور تمہارے شکوک و شبہات رفع کر دیں۔ مجھے امید ہے کہ تمہاری روح کی تشنگی ختم ہو جائے گی"۔

"اے بھٹکے ہوئے مسافر!" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "مرد میدان ہو، تمہیں علم اور خصوصاً دینی علم کے جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اپنی صلاحیتیں ضائع نہ کرو۔ ہم تمہیں اپنے پاس بٹھائیں گے۔ کچھ روشنی دکھائیں گے اور تمہاری تسکین کر دیں گے"۔

تیغ زنی وغیرہ کے مقابلے ہو رہے تھے۔ تماشائیوں نے بے ہنگم شور و غوغا بپا کر رکھا تھا۔ میدان سے اتنی گرد اڑ رہی تھی کہ مقابلہ کرنے والے اچھی طرح نظر بھی نہیں آتے تھے۔

دوپہر کے بعد کا وقت ہو گیا تھا۔ احمد بن غطاش نے اعلان کروایا کہ باقی مقابلے کل صبح ہوں گے اور جو لوگ اس وقت تک مقابلوں میں کامیاب رہے ہیں انہیں مقابلے ختم ہونے کے بعد انعامات دیئے جائیں گے۔

احمد بن غطاش اٹھ کھڑا ہُوا۔ شاہی مہمان وغیرہ بھی اٹھے اور وہ سب چلے گئے۔ احمد نے یحیٰی کو اپنے ساتھ رکھا۔ گھر لے جا کر اس کا منہ ہاتھ دُھلوایا اور پھر وہ دسترخوان پر جا بیٹھے۔ کھانے کے دوران بھی ان کے درمیان باتیں ہوتی رہیں۔ یحیٰی نے اپنے متعلق یہ تاثر دیا کہ وہ اپنے قبیلے کے سردار خاندان کا فرد ہے اور اُس کا اثر و رسوخ صرف اپنے قبیلے پر ہی نہیں بلکہ دوسرے قبیلے بھی اُس کے خاندان کے رعب و دبدبے کو مانتے ہیں۔

یہ بڑا ہی اچھا اتفاق تھا کہ یحیٰی انہی لوگوں میں پہنچ گیا تھا جن کے متعلق اس نے معلوم کرنا تھا کہ ان کے اصل چہرے کیا ہیں اور کیا انہوں نے کوئی بہروپ تو نہیں چڑھا رکھا؟... اب یہ اس کی ذہانت اور تجربے کا امتحان تھا کہ وہ ان لوگوں سے کس طرح راز کی باتیں اگلوا سکتا ہے۔

چونکہ احمد بن غطاش حاکم تھا اس لئے اسے اپنے متعلق یہ جتانا ضروری تھا کہ وہ سرداری کی سطح کا آدمی ہے اور وہ چار قبیلوں پر اس کا اثر و رسوخ کام کرتا ہے۔ اس نے ان کے سامنے اپنی ایک مصنوعی کمزوری بھی رکھ دی تھی کہ وہ دینی علوم کے راز حاصل کرنے کے لئے بھٹکتا پھر رہا ہے۔

○

"تم آج بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو" ___ احمد بن غطاش نے کھانے کے کچھ دیر بعد یحیٰی سے کہا ___ "تمہارے لئے اسی مکان میں رہائش کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ شام کا کھانا وہیں پہنچے گا۔ آج آرام کر لو۔ کل کام کی باتیں ہوں گی"۔

"مسلسل سفر میں ہوں" ___ یحیٰی نے کہا ___ "آپ نے ٹھیک جانا ہے۔ میں بہت ہی تھکا ہُوا ہوں.... ایک درخواست ہے۔ میرا ملازم بھی میرے ساتھ ہے۔ اگر اُس کی رہائش کا بھی انتظام ہو جائے___"

"ہو جائے گا" ___ احمد نے کہا ___ "اُسے یہیں لے آؤ"۔

جسے یحیٰی نے اپنا نوکر کہا تھا وہ سنان تھا۔ سنان کو اس کام کے لئے اپنے ساتھ لایا تھا کہ کوئی ضروری اطلاع وغیرہ ہو گی تو وہ سنان لے کر موجائے گا۔

ایک ملازم کو بلا کر یحیٰی کو اس کے ساتھ اس کے کمرے میں بھیج دیا گیا۔ یحیٰی کمرہ دیکھ کر حیران رہ گیا وہ تو شاہانہ کمرہ تھا۔ یحیٰی بہت خوش تھا کہ وہ ٹھیک ٹھکانے پر پہنچ گیا ہے اور وہ چند دنوں میں اپنا کام مکمل کر لے گا۔

"اب بتاؤ حسن!" ___ احمد بن غطاش نے یحیٰی کے جانے کے بعد حسن بن صباح سے پوچھا ___ "اس شخص کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔ ایک تو ہم اس سے یہ فائدہ اٹھائیں گے کہ ہمیں تیرانداز اور شہہ سوار تیار کر دے گا۔ ہم نے قلعہ الموت تک جتنے قلعہ نما شہر سامنے آتے ہیں انہیں اپنے قبضے میں لینا ہے۔ یہ ہمیں لڑ کر ہی لینے پڑیں گے۔ اس کے لئے ہمیں جانباز فوج کی ضرورت ہے۔ اس کی نفری چاہے تھوڑی ہی ہو۔ یہ شخص خاصا عقل مند لگتا ہے۔ دو تین قبیلوں پر بھی اس کا اثر و رسوخ ہے۔ اسے اگر ہم اپنے سانچے میں ڈھال لیں تو یہ بڑے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا ہے"۔

"ہاں استادِ محترم!" ___ حسن بن صباح نے کہا ___ "آدمی تو کام کا لگتا ہے لیکن ہمیں اس پر نظر رکھنی پڑے گی کہ یہ قابلِ اعتماد بھی ہے یا نہیں۔ ایسا نہیں ہونا چاہئے کہ ہم اسے راز کی باتیں بتانی شروع کر دیں۔ جیسا کہ یہ کہتا ہے کہ یہ منزل منزل کا مسافر ہے' یوں بھی ہو سکتا ہے کہ کسی روز ہمیں بتائے بغیر غائب ہی ہو جائے۔ احتیاط لازمی ہے"۔

صورت یہ پیدا ہو گئی کہ جو جاسوس بن کر آیا تھا اُس کی بھی درپردہ جاسوسی ہونے لگی۔ اگلی صبح اسے کمرے میں ہی ناشتہ دیا گیا اور ناشتے کے بعد ایک چوبدار اُسے اپنے ساتھ لے گیا۔ ایک کمرے میں حسن بن صباح اُس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اُس کے اشارے پر یحیٰی اُس کے سامنے بیٹھ گیا۔

"اب بات کرو یحیٰی!" ___ حسن نے کہا ___ "کیا وہم ہے' کیا مسئلہ ہے جو تم اپنے دماغ میں لئے پھرتے ہو؟"

"کیا میں خدا کے بتائے ہوئے صراطِ مستقیم پر جا رہا ہوں؟" ___ یحیٰی نے پوچھا ___ "کیا میرا عقیدہ صحیح ہے؟"

"یہ بات نہیں یحیٰی!" ___ حسن نے کہا ___ "اصل سوال جو تمہارے دماغ میں تڑپ رہا ہے اور تمہارے لئے بے چینی کا باعث بنا ہُوا ہے وہ یہ ہے' کیا خدا کا وجود ہے؟ اگر ہے تو خدا کہاں ہے؟۔ خدا نظر ہی نہیں آتا تو یہ راستہ اور یہ عقیدہ کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟"

حسن بن صباح یحیٰی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح بات کر رہا تھا جیسے ندی کا

شفاف پانی پتھروں پر آہستہ آہستہ جل ترنگ بجاتا بہا جا رہا ہو۔ حسن کے ہونٹوں پر روح افزا مسکراہٹ تھی۔ یحییٰ کے ذہن میں ایسا کوئی سوال نہیں تھا۔ وہ تو ان لوگوں کی اصلیت معلوم کرنے کی کوشش میں تھا۔ اسے توقع تھی کہ احمد بن غطاش اسماعیلی ہوا تو اس کے سوال سن کر یہ لوگ اس کے ذہن میں اسماعیلیت ٹھونسنی شروع کردیں گے لیکن اس کی حالت ایسی ہوگئی تھی جیسے دشمن نے اسے تہہ تیغ کر کے نہتا کردیا ہو حالانکہ حسن بن صباح نے اپنی بات ابھی شروع ہی کی تھی۔

"خدا وہ نہیں جو انسان کو نظر آتا ہے"۔۔۔ حسن کہہ رہا تھا۔۔۔ "نظر آنے والا خدا ایک نہیں کئی ایک ہیں اور یہ سب انسان کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے خدا ہیں۔ کسی نے پتھر کو تراش کر خدا کو آدمی کی شکل دے دی، کسی نے خدا کو عورت بنا دیا، کسی نے شیر، کسی نے سانپ اور کسی نے دھڑ جانور کا اور چہرہ انسان کا بنا دیا۔۔۔

"بات یہ سمجھنے والی ہے یحییٰ! خدا انسان کی تخلیق نہیں بلکہ انسان خدا کی تخلیق ہے اور انسان کا ہر قول اور فعل خدا کے حکم کا پابند ہے۔ یہ صراطِ مستقیم ہی ہے کہ تم یہاں پہنچ گئے ہو۔ یہاں تمہارے سارے شکوک صاف ہو جائیں گے لیکن یہ ایک دن کا معاملہ نہیں۔ کچھ دن لگیں گے۔ تم اپنے آپ کو میرے حوالے کردو۔ انسان وہی کامل بنتا ہے جو اپنے آپ کو کسی کامل پیرو مرشد کے حوالے کر دیتا ہے"۔

"قابلِ تعظیم بزرگ!"۔۔۔ یحییٰ نے التجا کی۔۔۔ "مجھے اپنی مریدی اور شاگردی میں قبول فرما لیں"۔

"دین کی تبلیغ میرا فرض ہے"۔۔۔ حسن نے کہا۔۔۔ "میں تمہیں تمہارے متعلق ایک بات بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ تم مرد میدان ہو۔ خدا تمہیں منزل پر لے آیا ہے۔ تم نے لوگوں کو اپنے جیسا تیر انداز اور شہسوار بنانا ہے۔ انہیں کفر کے خلاف جہاد کے لئے تیار کرنا ہے۔ میں عالم ہوں، تم عامل ہو۔ خدا کی نگاہ میں تمہارا رتبہ مجھ سے زیادہ بلند ہے۔ یہاں سے جانے کی نہ سوچنا"۔

یحییٰ ابن الہادی تو چاہتا ہی یہی تھا۔ وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہا تھا کہ ذات باری نے اُس کا کام بہت ہی آسان کردیا تھا اور اُس کے آگے آگے راستہ صاف ہوتا چلا جارہا تھا۔

اُس کے ساتھی سنان کی رہائش وغیرہ کا انتظام کہیں اور کیا گیا تھا۔ اُس نے سنان کو بلا کر

اچھی طرح ذہن نشین کرادیا کہ اُس سے کوئی پوچھے کہ وہ کہاں سے آئے ہیں تو وہ کیا جواب دے اور وہ سیدھا سادا بلکہ بیوقوف سا نوکر بنا رہے جو معمولی سی بات سمجھنے میں بھی بہت وقت لگاتا ہے۔

○

کچھ دیر بعد یحییٰ احمد بن غطاش کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے احمد نے بلایا تھا۔ وہاں چار لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ چاروں نوجوان تھیں اور ایک سے ایک بڑھ کر خوبصورت۔ وہ بہت ہی شوخ اور چنچل تھیں۔ ایک دوسری کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھیں۔ یحییٰ کی موجودگی کا انہیں جیسے احساس ہی نہیں تھا۔

"یحییٰ!"۔۔۔ احمد بن غطاش یحییٰ سے کہہ رہا تھا۔۔۔ "تم خوش قسمت ہو کہ اتنے بڑے عالم دین نے تم پر کرم کیا ہے کہ تمہیں اپنی مریدی میں قبول کرلیا ہے اور تمہیں کہا ہے کہ یہیں رہو اور تیر اندازی اور شہسواری کا ہنر جو تم میں ہے وہ دوسروں کو بھی سکھادو۔۔۔ یہ تو کسی کے ساتھ بات ہی نہیں کرتے۔ خدا کی یاد میں ڈوبے رہتے ہیں اور خدا سے ہی ہمکلام ہوتے ہیں"۔

"ہر حکم بجا لاؤں گا"۔۔۔ یحییٰ نے کہا۔۔۔ "ان آدمیوں کو میرے حوالے کردیں جنہیں میں نے سکھلائی دینی ہے"۔

"بسم اللہ ان لڑکیوں سے کرو"۔۔۔ احمد نے کہا۔۔۔ "یہ میرے خاندان کی لڑکیاں ہیں۔ یہ جب تیر اندازی میں تم جیسی مہارت حاصل کرلیں گی تو دوسری لڑکیوں کی سکھلائی کریں گی۔ ہماری عورتوں کو تیر انداز ہونا چاہئے، پھر انہیں گھوڑسواری کی مشق کرانی ہے۔۔۔ میں تمہاری باقاعدہ تنخواہ مقرر کردوں گا"۔

"میں آج ہی یہ کام شروع کردوں گا"۔۔۔ یحییٰ نے کہا۔۔۔ "مجھے تیر اندازی کے لئے ایسی جگہ دکھادیں جہاں سامنے تیروں کے لئے رکاوٹ ہو ورنہ تیر ہر طرف اڑتے پھریں گے اور راہ چلتے لوگ زخمی ہوں گے"۔

احمد بن غطاش کے حکم سے سارے انتظامات کردیئے گئے اور یحییٰ چاروں لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے گیا۔ وہ کمانیں اور تیروں کا ایک ذخیرہ بھی ساتھ گیا تھا۔ یحییٰ نے لڑکیوں کی سکھلائی شروع کردی۔ پہلے دن وہ انہیں کمان کھینچنا اور بازوؤں کو سیدھا رکھنا سکھاتا رہا۔ کمانیں بہت سخت تھیں۔ لڑکیاں کمان کھینچتی تھیں تو ان کے بازو کانپتے تھے۔ یحییٰ انہیں بتا رہا تھا کہ بازوؤں کو اپنے قابو میں کس طرح رکھنا ہے کہ ان میں لرزہ پیدا نہ ہو۔

اُدھر میدان میں کشتیوں اور دوڑوں وغیرہ کے مقابلے ہو رہے تھے۔ احمد بن غطاش اور حسن بن صباح وہاں چلے گئے تھے۔ وہ دونوں بہت خوش تھے کہ انہوں نے اتنے زیادہ لوگ اکٹھے کر لئے تھے۔ وہ کھیل تماشوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے تھے، بلکہ وہ اپنے اس منصوبے پر گفتگو کر رہے تھے کہ اس مخلوقِ خدا کو اپنے عزائم میں استعمال کرنا ہے۔

ان چار لڑکیوں میں جو یحییٰ ابن الہادی سے تیر اندازی سیکھنے گئی تھیں، داستان گو دو کا ذکر پہلے بھی کر چکا ہے۔ ایک تھی فرح جو حسن بن صباح کی محبت سے مجبور ہو کر اس کے ساتھ گئی تھی۔ دوسری زرّیں تھی جس نے شاہ در کے مرحوم والی ذاکر کو اپنے حسن و جوانی اور بھولپن کے جال میں پھانسا اور اسے دھوکے سے شربت میں زہر ملا پلا کر ایسی بیماری میں مبتلا کر دیا تھا کہ کچھ دنوں بعد ذاکر مر گیا۔ طبیب سر پٹختے رہ گئے تھے کہ ذاکر کی بیماری کیا تھی۔

زرّیں غیر معمولی طور پر حسین اور نوجوان لڑکی تھی۔ احمد بن غطاش نے اُس کی تربیت ایسی کی تھی کہ تجربہ کار اور معمر استاد بھی اُس کے ہاتھوں میں عقل و ہوش سے ہاتھ دھو بیٹھتے تھے۔ یحییٰ خاص طور پر خوبرو اور پُرکشش جوان تھا، اور اس نے تیر اندازی اور گھوڑ سواری کے جو کرتب دکھائے تھے، ان سے اس نے لوگوں سے بے ساختہ داد و تحسین حاصل کی تھی اور کچھ دلوں میں اس نے ہلچل بپا کر دی تھی۔ اُس زمانے میں مرد ایسے ہی اوصاف اور کمالات سے باعزت اور قابلِ محبت سمجھے جاتے تھے۔

زرّیں نے اپنے استاد سے فریب کاری سیکھی تھی اور یہ مفروضہ اُس کا عقیدہ بن گیا تھا کہ عورت کا حُسن مردوں کو فریب دینے کے لئے ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ احمد نے اُس کے دل سے جذبات نکال دیئے تھے۔ وہ دانش مند تھا، خوب جانتا تھا کہ عورت ہو یا مرد، دونوں میں سے کوئی بھی جذبات میں الجھ جائے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا۔

"صرف یہ راز اپنے دل میں بند کر لو زرّیں!" —— احمد بن غطاش نے اُسے کئی بار کہا تھا —— "تم ایک ایسا حسین بلکہ طلسماتی پھندہ ہو جس میں انتہائی زہریلا ناگ بھی آ جائے گا اور جانداروں کو چیر پھاڑ دینے والا درندہ بھی تمہارے پھندے میں آ کر تمہارا غلام ہو جائے گا۔ تم نے اس کے لئے ایسا حسین فریب بنے رہنا ہے کہ وہ تمہاری فریب کاری کو بھی تمہارے حُسن کا حصہ سمجھے۔ اُسے یہ تاثر دیئے رکھو کہ تم اُس کی محبوبہ ہو اور تم اُسے خدا کے بعد کا درجہ دیتی ہو اور پھر عملی طور پر ایسے مظاہرے کرتی رہو جیسے تم اُس کے بغیر ایک لمحہ بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ اُس کے جذبات کے ساتھ کھیلو اور ناز و انداز کے علاوہ اُس کے قدموں میں یوں لوٹ پوٹ ہوتی

رہو جیسے تم اس کی زر خرید لونڈی ہو۔ اس طرح اُس پر اپنے حسن و جوانی اور فریب کاری کا نشہ طاری کر کے اُس کی کھال اتارتی رہو اور اُس کا خون چوستی رہو"۔

یہ ایک بنیادی سبق تھا جو احمد لڑکپن کے پہلے دن سے زرّیں کو دیتا چلا آیا تھا لیکن اس نے اُسے یہ سبق وعظ کی صورت میں ہی نہیں دیا تھا بلکہ عملی طور پر بھی اسے سمجھایا تھا۔ اُس کے پاس ذرا بڑی عمر کی تین چار عورتیں تھیں جنہوں نے زرّیں کو اس سبق کے عملی مظاہرے کر کے دکھائے تھے۔ ان عورتوں نے زرّیں کو بڑا ہی حسین اور روشنی میں رنگا رنگ شعاعیں دینے والا پتھر یا ہیرا بتا دیا تھا۔ اسے ایسا ہی ایک خوبصورت ہیرا دکھایا بھی گیا تھا۔

"یہ ہیرا دیکھ رہی ہو زرّیں!" —— اسے ہیرا دکھا کر کہا گیا تھا —— "کیا تم نہیں چاہو گی کہ یہ ہیرا تمہارے گلے کی یا انگلی کی زینت بنے؟"

"کیوں نہیں چاہوں گی!" —— زرّیں نے کہا تھا۔

"اگر تمہیں اس کی قیمت بتائی جائے تو تمہارے ہوش اُڑ جائیں" —— اُسے کہا گیا تھا —— "ایسے ایک ایک ہیرے پر بادشاہوں کے تختے اُلٹے ہیں لیکن اس کتنے دلکش اور قیمتی ہیرے کو تم نگل لو تو مر جاؤ گی۔ یہ اس ہیرے کے زہر کا اثر ہو گا.... تم نے یہ ہیرا بننا ہے۔ تمہیں کوئی جنگجو اور جابر بادشاہ بھی دیکھے تو وہ تمہیں حاصل کر لینے کے لئے اپنی بادشاہی کو بھی بازی پر لگا دے لیکن جو تمہیں نگل لے یعنی تمہیں زیر کر کے تم پر قبضہ کر لے وہ زندہ نہ رہے"۔

داستان گو آگے چل کر وہ واقعات سنائے گا جو ثابت کریں گے کہ عورت کتنی بڑی قوت، کتنا زبردست جادو اور کیسا طلسم ہے۔ حسن بن صباح کی کامیابی کا جو راز تھا اس راز کا نام عورت ہے۔ حسین عورت جسے چاہے قتل کروا سکتی ہے اور جسے چاہے اسے زندہ لاش بنا سکتی ہے۔ عورت قاتل کو تختۂ دار سے بھی اُتروا سکتی ہے۔

زرّیں کی ذات میں یہ سارا زہر بھر دیا گیا تھا۔ اس نے اپنا پہلا شکار بڑی کامیابی سے مار لیا تھا۔ وہ ذاکر تھا۔ کامیابی صرف یہی نہیں تھی کہ اس قلعہ نما شہر کا والی مر گیا تھا بلکہ زرّیں نے شاہ در جیسا شہر اپنے استاد احمد بن غطاش کی جھولی میں ڈال دیا تھا، پھر یہ احمد کی فریب کاری کا کمال تھا کہ سلجوقی سلطان نے اُسے اس قلعے کا والی مقرر کر دیا تھا۔

زرّیں اس کامیابی پر بہت خوش تھی اور وہ اگلے شکار کے انتظار میں تھی لیکن اُس نے یحییٰ ابن الہادی کو دیکھا تو اُس نے اپنے آپ میں کچھ ایسی ہلچل محسوس کی جسے وہ سمجھ نہ سکی۔ اُس کا دل چاہنے لگا کہ وہ یحییٰ کے پاس بیٹھ کر اُس سے پوچھے کہ اُسے دیکھ کر اُس کے اندر بھونچال کے

جو ہلکے ہلکے اور لطیف سے جو جھٹکے محسوس ہوتے ہیں یہ کیا ہیں۔

یحییٰ میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ وہ خوش طبع آدمی تھا۔ کسی بات میں تلخی ہوتی تو اس بات میں بھی وہ شگفتگی پیدا کر لیا کرتا تھا۔ چاروں لڑکیاں اُس کی اس زندہ مزاجی کو اتنا پسند کرتی تھیں کہ اُسے اُکساتی تھیں کہ وہ باتیں کرے۔ یحییٰ بھی ان لڑکیوں کو باتوں باتوں میں خوش رکھنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ لڑکیاں تیر اندازی میں دلچسپی لیتی رہیں لیکن زرّیں کی جذباتی حالت کچھ اور ہی تھی۔ کبھی تو وہ کچھ دُور بیٹھ کر یحییٰ کو دیکھتی رہتی تھی۔ زرّیں بھی کچھ طبعاً" اور کچھ خصوصی تربیت کے زیر اثر زندہ اور شگفتہ مزاج لڑکی تھی لیکن یحییٰ کو دیکھ کر اُس پر سنجیدگی سی طاری ہو جاتی تھی جسے وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔

یحییٰ ان لڑکیوں کو تیر اندازی اس طرح سکھاتا تھا کہ کمان لڑکی کے ہاتھ میں دیتا اور خود اُس کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا۔ سکھانے کا طریقہ بھی یہی تھا۔ وہ اپنا بازو لڑکی کے کندھے سے ذرا اوپر کر کے اُس کے ہاتھوں میں کمان کو سیدھا کرتا تھا۔ اس طرح اکثر یوں ہوتا کہ لڑکی کی پیٹھ یحییٰ کے سینے کے ساتھ لگ جاتی تھی۔ باقی لڑکیوں کی توجہ تیر اندازی میں ہوتی تھی۔ وہ شاید محسوس بھی نہیں کرتی تھیں کہ ان کا جسم ایک جوان آدمی کے ساتھ لگ رہا ہے لیکن زرّیں کا معاملہ کچھ اور تھا۔ وہ دانستہ اپنی پیٹھ یحییٰ کے ساتھ لگا لیتی تھی اور پھر اُس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ کچھ دیر یحییٰ کے ساتھ اسی حالت میں رہے۔ شاید یحییٰ بھی زرّیں کے ان جذبات کو سمجھنے لگا تھا۔

○

شام گہری ہو چکی تھی۔ یحییٰ سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اُس کے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ یحییٰ نے دروازہ کھولا۔ باہر زرّیں کھڑی تھی جو دروازہ کھلتے ہی فوراً اندر آگئی۔ یحییٰ اُسے یوں اندر آتا دیکھ کر ذرا سا بھی حیران یا پریشان نہ ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ والیٔ شہر کے خاندان کی لڑکی ہے۔ اسے اور دوسری لڑکیوں کو بھی وہ آزادی سے گھومتے پھرتے دیکھا کرتا تھا۔

"میں یہاں کچھ دیر بیٹھنا چاہتی ہوں" — زرّیں نے کہا — "تم بُرا تو نہ جانو گے؟"

"بُرا کیوں جانوں گا زرّیں!" — یحییٰ نے کہا — "نیت بُری نہ ہو تو بُرا جاننے کی کوئی وجہ نہیں ہوتی" — یحییٰ نے زرّیں کو کچھ غور سے دیکھا اور بولا — "تم کچھ بجھی بجھی سی اور اُکھڑی سی لگ رہی ہو۔ تم تو ان سب لڑکیوں سے زیادہ ہنس مُکھ ہو"۔

"میرے پاس بیٹھ جاؤ" — زرّیں نے سنجیدہ اور متین سے لہجے میں کہا — "یہاں.... میرے قریب بیٹھو"۔

یحییٰ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ زرّیں نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یحییٰ بھی آخر جوان آدمی تھا اور اُسے خدا نے ایسی عقل اور نظر دی تھی کہ وہ پردوں کے پیچھے کی بات بھی سمجھ جایا کرتا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو یحییٰ!" — زرّیں نے یحییٰ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں آہستہ آہستہ مسلتے ہوئے کہا — "میرے دل کی جو کیفیت ہے وہ میرے چہرے سے ظاہر ہو رہی ہے۔ میں اتنی سنجیدہ کبھی بھی نہیں ہوئی تھی۔ میں تو سمجھتی تھی کہ میں دنیا میں ہنسنے کھیلنے کے لئے ہی آئی ہوں لیکن تم میرے سامنے آئے ہو تو میں نے اپنے اندر ایسا انقلاب محسوس کیا ہے کہ میرے لئے اپنے آپ کو پہچاننا مشکل ہو گیا ہے۔ بار بار یہی جی میں آتی ہے کہ تمہارے پاس آ بیٹھوں اور تمہاری باتیں سنوں.... کیا تم نے محسوس نہیں کیا کہ تم جب میرے ہاتھ میں کمان دیتے ہو اور میرے پیچھے کھڑے ہو کر کمان میں تیر سیدھا رکھنے کو کہتے ہو تو میں تمہارے ساتھ لگ جاتی ہوں اور دانستہ کمان کو دائیں بائیں یا اوپر نیچے کر دیتی ہوں تاکہ تم کچھ دیر اسی طرح میرے ساتھ لگے رہو اور بار بار میرے ہاتھ پکڑ کر کمان اور تیر سیدھا کرتے رہو"۔

یحییٰ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ جس ہاتھ میں زرّیں نے اُس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اُس ہاتھ کو یحییٰ نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یک لخت یحییٰ کے دل میں یہ احساس بیدار ہو گیا کہ ان چاروں لڑکیوں میں یہ لڑکی اسے زیادہ اچھی لگتی تھی اور کبھی کبھی وہ تیر اندازی کی سکھلائی دیتے ہوئے اس لڑکی کو اپنے کچھ زیادہ ہی قریب کر لیا کرتا تھا۔ زرّیں نے جب اپنے جذبات کا اظہار کیا تو یحییٰ نے نمایاں طور پر محسوس کیا کہ زرّیں نے اپنے نہیں بلکہ اس کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔

"کیا تم میرے ان جذبات کی تسکین کر سکتے ہو؟" — زرّیں نے کہا — "میں تمہیں صاف بتا دوں کہ تم میری روح میں اُتر گئے ہو.... کیا تم میری محبت کو قبول کرو گے؟"

"سوچ لو زرّیں!" — یحییٰ نے کہا — "تم شہزادی ہو اور میں ایک مسافر ہوں جسے یہ بھی معلوم نہیں کہ اُس کی منزل کیا ہے' کہاں ہے۔ ہو سکتا ہے ہماری محبت کوئی قربانی مانگ بیٹھے جو تم نہ دے سکو.... میں تو اپنی جان بھی دے دوں گا"۔

"تم دیکھ لوگے" — زرّیں نے کہا — "کوئی ایسا خطرہ ہوا تو جہاں کہو گے تمہارے ساتھ چل پڑوں گی"۔

"میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں زرّیں!" — یحییٰ نے کہا — "تمہیں دیکھ کر میرے اندر بھی

ایسے ہی جذبات اُمنڈے تھے لیکن میں خاموش رہا۔ میرے دل کی بات تم نے کہہ دی ہے۔ صرف ایک بات کا خیال رکھنا کہ اس محبت کا تعلق جسموں کے ساتھ نہ ہو"۔

"یہ میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے" ۔۔۔ زرّین نے کہا ۔۔۔ "میں نے کہا ہے کہ تم میری روح میں اُتر گئے ہو۔ میں یہاں آتی رہا کروں گی"۔

"اور میں تمہارا انتظار کیا کروں گا" ۔۔۔ یحیٰی نے کہا۔

○

اُس رات کے بعد یحیٰی اور زرّین بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے وجود میں تحلیل ہوتے چلے گئے۔

تیراندازی، تیغ زنی وغیرہ کے مقابلوں کا جو میلہ لگا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ جیتنے والے انعام و اکرام لے کر چلے گئے تھے۔ خیموں کی بستی اُجڑ گئی تھی۔

یحیٰی ان چاروں لڑکیوں کو تیراندازی کی مشق کروا رہا تھا۔ لڑکیوں کے تیر اب ٹھکانے پر لگتے تھے۔ یحیٰی اور زرّین کے دلوں میں جو تیر اُتر گئے تھے ان سے ابھی دوسرے ناواقف تھے۔ زرّین کوئی پردہ دار لڑکی تو نہ تھی کہ اس کے باہر نکلنے پر پابندی ہوتی۔ وہ ہر رات یحیٰی کے کمرے میں پہنچ جاتی اور دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہو کر بیٹھے رہتے اور دلوں کی باتیں کرتے رہتے تھے۔

یحیٰی کی جذباتی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ وہ جب لڑکیوں کو تیراندازی کے لئے باہر لے جاتا تو صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ زرّین میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہا ہے۔

وہ جو کہتے ہیں کہ عشق اور مُشک چھپے نہیں رہ سکتے، وہ ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ زرّین کی ساتھی لڑکیاں بھانپ گئیں کہ یہ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔ انہوں نے احمد بن غطاش کو بتایا۔ احمد بن غطاش کچھ پریشان سا ہو گیا۔ احمد کو معلوم نہیں تھا کہ یحیٰی نے یہ راز چھپا کر نہیں رکھا۔ جس وقت لڑکیاں احمد بن غطاش کو یہ بتا رہی تھیں بالکل اُسی وقت یحیٰی حسن بن صباح کے پاس بیٹھا اُسے اپنے دل کی یہی بات بتا رہا تھا۔

یحیٰی حسن بن صباح سے متاثر ہی نہیں تھا بلکہ مرعوب تھا۔ اس مرعوبیت میں ڈر اور خوف نہیں تھا بلکہ احترام اور تقدس کا تاثر تھا جو اس پر طاری ہو جایا کرتا تھا۔ یہ مرعوبیت ایسی تھی جیسے حسن بن صباح نے اُس کو ہپناٹائز کر رکھا ہو۔ حسن اس کے ساتھ دینی امور پر باتیں کرتا تھا۔ ان باتوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ حسن راسخ العقیدہ مسلمان ہے اور اس کا درجہ نبیوں سے ذرا سا ہی کم

"پیرو مرشد!" ۔۔۔ یحیٰی نے ایک روز اُس کے سامنے بیٹھے ہوئے کہا ۔۔۔ "وادی شاہ در کے خاندان کی ایک لڑکی، زرّین، اسے دل و جان سے چاہتی ہے اور اُس کے اپنے دل میں بھی اس لڑکی کی محبت پیدا ہو گئی ہے، اور ہم دونوں تنہائی میں بیٹھ کر پیار و محبت کی باتیں کیا کرتے ہیں۔۔۔ کیا میں بددیانتی اور دھوکہ دہی کا ارتکاب تو نہیں کر رہا؟"

"نہیں؟" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "اگر اس محبت کا تعلق جسموں کی بجائے روحوں کے ساتھ ہے تو یہ گناہ نہیں"۔

"یہ ہماری روحوں کا معاملہ ہے پیرو مرشد؟" ۔۔۔ یحیٰی نے کہا۔

"پھر یہ ٹھیک ہے" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔

اِدھر احمد بن غطاش نے زرّین کو بلایا اور اُس سے پوچھا کہ یحیٰی کے ساتھ اُس کے تعلقات کس نوعیت کے ہیں اور ان کی ملاقاتیں کس قسم کی ہیں۔

"یہ شخص مجھے اچھا لگتا ہے" ۔۔۔ زرّین نے کہا ۔۔۔ "اور میرا اس کے ساتھ جو تعلق ہے وہ مرد عورت والا تعلق نہیں"۔

"میری بات غور سے سنو!" ۔۔۔ احمد بن غطاش نے کہا ۔۔۔ "میں سمجھ گیا ہوں۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ہم اس محبت کو گناہ کہا کرتے ہیں جو فرائض سے ہٹا دے"۔

"میں فرائض سے نہیں ہٹی" ۔۔۔ زرّین نے کہا ۔۔۔ "جہاں آپ مجھ میں یہ خامی دیکھیں کہ میں اپنا کوئی ایک بھی فرض بھول گئی ہوں تو مجھے جو سزا چاہیں دے دیں"۔

"تم نے شاید سزا کا نام رسمی طور پر لیا ہے" ۔۔۔ احمد بن غطاش نے قدرے بارعب آواز میں کہا ۔۔۔ "لیکن تمہیں بھولنا نہیں چاہئے کہ یہ سزا کیا ہو گی"۔

"میں جانتی ہوں" ۔۔۔ زرّین نے کہا ۔۔۔ "مجھے قتل کر دیا جائے گا"۔

"قتل نہیں کیا جائے گا" ۔۔۔ احمد بن غطاش نے کہا ۔۔۔ "تمہیں قید خانے میں ان قیدیوں میں پھینک دیا جائے گا جو کئی کئی سالوں سے وہاں بند ہیں۔ وہ سب وحشی ہو گئے ہیں۔ پھر تمہیں اُس کال کوٹھڑی میں بند رکھا جائے گا جہاں زہریلے کیڑے مکوڑے رہتے ہیں۔ یہ مت بھولنا کہ تم نے دوسروں کو پھانسا ہے، خود پھنس کے بیکار نہیں ہو جانا"۔

اُسی رات احمد بن غطاش اور حسن بن صباح نے اس مسئلے پر تبادلۂ خیال کیا۔ انہیں نقصان یہ نظر آ رہا تھا کہ محبت کے نشے میں ایک قیمتی اور تجربہ کار لڑکی ضائع ہو جائے گی۔ حسن

بن صباح نے اس لڑکی کو اپنے کمرے میں بلایا۔ زرّیں جب اُس کے کمرے سے نکلی تو اُس کے چہرے پر کچھ اور ہی تاثر تھا۔

○

دن گزرتے چلے گئے۔ یحییٰ اور زرّیں ایک دوسرے میں گم ہو گئے۔ یحییٰ نے ان لڑکیوں کو تیراندازی میں طاق کر دیا تھا اور اب اسے کہا گیا تھا کہ انہیں شہسوار بنا دے۔

شہر کے لوگ دیکھتے تھے کہ پانچ گھوڑے ہر صبح جنگل کو نکل جاتے ہیں۔ ایک پر یحییٰ اور باقی چار پر لڑکیاں سوار ہوتی تھیں۔ صبح کے گئے ہوئے یہ گھوڑے آدھا دن گزار کر واپس آتے تھے۔ یحییٰ کبھی کبھی زرّیں کو اپنے ساتھ رکھ کر باقی لڑکیوں سے کہتا کہ وہ دُور کا چکر لگا کر آئیں۔ لڑکیاں یہ رپورٹ احمد بن غطاش کو دے دیا کرتی تھیں۔

اُدھر مَرو میں سلطان ملک شاہ اور اُس کا کوتوال ہر روز انتظار کرتے تھے کہ یحییٰ کی طرف سے کوئی پیغام آئے گا لیکن ہر روز انہیں مایوسی ہوتی تھی۔

یحییٰ کے ذہن سے نکل ہی گیا تھا کہ وہ شاہ در کیوں آیا تھا اور اُسے ایک روز واپس بھی جانا ہے۔ وہ اپنے ساتھی سنان سے ہر روز ملتا اور اُسے کہتا تھا کہ ان لوگوں کا کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ یہ کیا ہیں۔ دو چار دنوں بعد کچھ پتہ چل جائے گا۔

زرّیں کے اظہارِ محبت میں اچانک دیوانگی پیدا ہو گئی۔ اُس نے یحییٰ کو یہ کہنا شروع کر دیا کہ اس میں اب انتظار کی تاب نہیں رہی اور یحییٰ اُسے اپنے ساتھ لے چلے۔ یحییٰ نے اُسے ابھی تک نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا تھا۔ زرّیں نے اس سے کئی بار پوچھا اور یحییٰ نے ہر بار اُسے جذبات میں الجھا کر ٹال دیا تھا۔

ایک رات زرّیں اس کے کمرے میں آئی تو اس نے اپنی چادر میں چھپائی ہوئی چھوٹی سی صراحی نکالی۔

"میں آج تمہارے لئے ایک خاص شربت لائی ہوں"—— زرّیں نے صراحی یحییٰ کے ہاتھ میں دے کر کہا—— "یہ احمد بن غطاش خود پیا کرتا ہے اور صرف یہ بزرگ عالم ہے جسے کبھی کبھی پلاتا ہے۔ میں اتنا ہی جانتی ہوں کہ اس میں شہد ملا ہوا ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس میں ایسے پھولوں کا رس ڈالا گیا ہے جو کسی دُور کے ملک میں ہوتے ہیں۔ احمد کی بیویاں کہتی ہیں کہ اُس نے اس شربت کا مشکیزہ بہت سے سونے کے عوض منگوایا ہے۔ سنا ہے یہ شربت پینے والا دو سو سال زندہ رہے تو بھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ میں چُرا کے لائی ہوں۔ پی کے دیکھو"۔

یحییٰ نے صراحی ہی منہ سے لگالی اور پھر آہستہ آہستہ اُس نے سارا شربت پی لیا۔ اس دوران زرّیں اس کے ساتھ پیار و محبت کی باتیں ایسے والہانہ انداز سے کرتی رہی جیسے وہ نشے میں ہو۔ زرّیں طلسم کی مانند یحییٰ پر طاری رہتی ہی تھی لیکن اُس رات یحییٰ کی جذباتی حالت کچھ اور ہی ہو گئی۔ وہ یوں محسوس کرنے لگا جیسے اُسے دنیا بھر کی حاکمیت مل گئی ہو۔

"آخر ہمارا انجام کیا ہو گا یحییٰ؟"—— زرّیں نے کہا—— "کیا تم میرے ساتھ یونہی محبت کا کھیل کھیلتے رہو گے؟ تم تو اتنا بھی نہیں بتاتے کہ تم ہو کہاں کے۔ میں کہتی ہوں کہ جہاں کہیں کے بھی ہو، یہاں سے نکلو اور مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ آج کی رات یہاں کی آخری رات ہونی چاہئے۔ میں تیار ہوں۔ مردانہ لباس پہن لوں گی"۔

یحییٰ نے قہقہہ لگا کر زرّیں کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ اُس نے اس طرح کا قہقہہ پہلے کبھی نہیں لگایا تھا۔ زرّیں نے مچل مچل کر اسے کہنا شروع کر دیا کہ وہ اُسے اپنے متعلق کچھ بتائے۔

"سن زرّیں!"—— یحییٰ نے شگفتہ سی سنجیدگی سے کہا—— "یہ بھی سن لے کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں۔ اب مجھے تم پر اعتبار آ گیا ہے..... میں یہاں ایک فرض ادا کرنے آیا تھا۔ وہ ابھی ادا نہیں ہُوا۔ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے"۔

"پھر مجھے بتاتے کیوں نہیں!"—— زرّیں نے بڑی پیاری سی جھنجلاہٹ سے کہا—— "میں کئی بار کہہ چکی ہوں کہ تمہاری محبت پر میں اپنی جان بھی قربان کر دوں گی"۔

"میں مَرو سے آیا ہوں"—— یحییٰ نے اپنے راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہا—— "میں سلجوقی سلطان ملک شاہ کا جاسوس ہوں۔ وہاں یہ شک پایا جاتا ہے کہ احمد بن غطاش اسماعیلی ہے اور یہاں شاہ در میں اہلِ سنّت سلطنت کے خلاف اسماعیلی مرکز بن گیا ہے۔ میں یہ معلوم کرنے آیا ہوں کہ اس شک میں حقیقت کتنی ہے یا کچھ حقیقت ہے بھی یا نہیں"۔

"کچھ پتہ چلا؟"—— زرّیں نے پوچھا۔

"میں ابھی شک میں ہوں"—— یحییٰ نے جواب دیا—— "یوں کہہ لو کہ میرا شک ابھی موجود ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ احمد بن غطاش اسماعیلی ہے لیکن میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص اہلِ سنّت ہے۔ اس کے ساتھ جو عالم ہے اُس نے دینی مسائل کے مجھے بہت سبق دیئے ہیں۔ اس میں مجھے اسماعیلیوں والی کوئی بات نظر نہیں آئی لیکن میں نے ان دونوں کو کبھی نماز پڑھتے بھی نہیں دیکھا۔ میں نے یہ دیکھا ہے کہ اس شہر میں اسماعیلیوں کی اکثریت ہے"۔

"تمہارا یہ ساتھی سنان بھی جاسوس ہی ہو گا!"—— زرّیں نے پوچھا۔

"ہاں!" ——— یحییٰ نے کہا ——— "اُسے میں نے دو تین دنوں بعد یہ بتا کر واپس بھیجنا ہے کہ میں نے اب تک یہاں کیا دیکھا ہے"۔

"یحییٰ!" ——— زرّیں نے یحییٰ کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے کر جذباتی لہجے میں کہا ——— "میری ایک بات مان لو.... مَرو واپس نہ جاؤ۔ یہاں بھی نہ رہو۔ چلو آگے۔ ایران چلے چلتے ہیں۔ تم جہاں جاؤ گے تمہیں وہاں کے حاکم ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ تم جیسا تیر انداز اور شہسوار کہاں ملتا ہے۔ مذہب اور فرقوں کے چکر سے نکلو"۔

"میں تمہیں ایک بات صاف بتا دیتا ہوں زرّیں!" ——— یحییٰ نے کہا ——— "میرے دل میں تمہاری جو محبت ہے' اس میں کوئی دھوکہ یا بناوٹ نہیں۔ تم میری پہلی اور آخری محبت ہو لیکن میں اپنے فرض کو محبت پر قربان نہیں کروں گا"۔

"اگر میں تمہارے سامنے کسی اور آدمی کے ساتھ چل پڑوں تو...." ——— زرّیں نے کہا۔

"تو میں نظریں پھیر لوں گا" ——— یحییٰ نے کہا ——— "اپنے فرض سے نظریں نہیں ہٹاؤں گا۔ سلجوقیوں نے ہزارہا جانیں قربان کر کے اور خون کے چڑھاوے چڑھا کر یہ سلطنت بنائی ہے۔ اسے وہ سلجوقی سلطنت نہیں اسلامی سلطنت کہتے ہیں۔ اسلام میں کوئی فرقہ نہیں۔ جو مسلمان یہ کہتا ہے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت سے ہے وہ اگر سنّت سے منحرف ہے تو وہ رسولؐ کا اُمتی نہیں' وہ کچھ اور ہے۔ سلجوقی سلاطین اہلِ سنّت والجماعت ہیں اس لئے وہ اللہ کے سچے دین کے پاسبان ہیں۔ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام اور سلجوقی سلطان کا نمک حلال ملازم ہوں۔ یہ میرا ایمان ہے۔ اگر تم اس دعوے میں سچی ہو کہ میری محبت تمہاری روح میں اُتری ہوئی ہے تو میرے فرض کی ادائیگی میں میری مدد کرو۔ مجھے ان لوگوں کی اصلیت بتاؤ"۔

"کل!" ——— زرّیں اٹھ کھڑی ہوئی اور یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی ——— "کل اسی وقت تمہیں راز معلوم ہو جائے گا اور تم اپنے فرض سے فارغ ہو جاؤ گے"۔

○

یحییٰ پر فاتحانہ کیفیت طاری تھی۔ وہ بہت خوش تھا کہ کل اُس کا کام ختم ہو جائے گا۔ وہ یہاں سے ایک قیمتی راز اور ایک حسین لڑکی ساتھ لے کر رخصت ہو گا"۔

زرّیں اپنے کمرے میں گئی تو پلنگ پر اوندھے منہ گر کر ایسی روئی کہ اُس کی ہچکی بندھ گئی۔ لڑکی ایک حسین اور نشہ آور دھوکہ تھی لیکن یحییٰ کے ساتھ اُس کی محبت دھوکہ نہیں تھا۔ اُس کی

محبت کا سرچشمہ اُس کی روح تھی۔ وہ روحانی محبت کے نشے سے سرشار ہو گئی تھی مگر محبت ایسے بھنور میں آ گئی تھی جس سے اُس کا سلامت نکل آنا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔

لڑکیوں نے احمد بن غطاش اور حسن بن صباح کو بتا دیا کہ زرّیں یحییٰ کے ساتھ عشق و محبت کا کھیل کھیل رہی ہے۔ احمد اور حسن نے اس اطلاع سے یہ رائے قائم کی کہ زرّیں کے اندر انسانی جذبات ابھی زندہ ہیں اور اس کی ذلت میں ابھی وہ عورت زندہ ہے جو مرد کی محبت کی پیاسی ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ کہ زرّیں ایک ایسے شخص کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی جو ابھی مشکوک تھا۔ حسن بن صباح عالمِ دین کے بہروپ میں یحییٰ کو ہر روز اپنے پاس بٹھاتا اور اسے دینی امور سمجھاتا تھا لیکن اُس سے باتیں کروا کے یہ جاننے کی کوشش کرتا تھا کہ یہ شخص ہے کون؟ سلجوقیوں کا ہی کوئی تو نہیں؟.... حسن کچھ جان تو نہ سکا تھا لیکن اُس نے وثوق سے کہہ دیا تھا کہ یہ شخص مشکوک ہے۔

اب حسن بن صباح کو پتہ چلا کہ زرّیں یحییٰ کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہے تو اُس نے زرّیں کو اپنے پاس بلایا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُس کے ذہن پر قابض ہو گیا۔ لڑکی کی جو تربیت آٹھ دس سال عمر سے شروع ہوئی اور جوانی میں آکر بھی جاری تھی' وہ اُبھر آئی اور زرّیں کی عقل پر غالب آ گئی۔

"تم اس سے اگلواؤ گی وہ کون ہے' یہاں کیوں آیا ہے" ——— حسن بن صباح نے کہا۔

"ہاں میں اُس سے اُگلواؤں گی وہ کون ہے' یہاں کیوں آیا ہے" ——— زرّیں نے یوں کہا جیسے اُس پر غنودگی طاری ہو۔

"وہ شربت تمہارے ساتھ ہو"۔

"وہ شربت میرے ساتھ ہو گا"۔

اس شربت میں جو زرّیں صراحی میں لے کر یحییٰ کے پاس گئی تھی' اس میں شہد تو ضرور ملا ہوا تھا لیکن اس میں کسی پھول کا رس نہیں تھا۔ اس میں حشیش ڈالی گئی تھی اور اس میں ایک خوشبو ملائی گئی تھی۔ یہ شربت پینے کے بعد یحییٰ نے جو قہقہہ لگایا تھا وہ حشیش کے زیرِ اثر تھا جسے وہ زرّیں کے حسن و شباب اور محبت کے والہانہ اظہارِ محبت کا خمار سمجھتا رہا۔ اس نشے نے اُس کے سینے سے راز نکال کر زرّیں کے آگے رکھ دیا۔

یحییٰ کا ایمان اتنا پختہ تھا کہ اُسے یہ یاد رہا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت سے

ہے اور اٹل سخت ہے' اور اُسے یہ بھی یاد رہا کہ اس کا فرض کیا ہے اور یہ جذبۂ ایثار بھی زندہ رہا کہ وہ محبت کو فرض پر قربان کر دے گا لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ اُس نے زرّیں کو اس کا فرض یاد دلا دیا ہے۔ وہ یہ عزم لے کر یحییٰ کے کمرے سے نکلی تھی کہ یہ شخص فرض کا اتنا پکا ہے تو میں اپنے فرض کو کیوں قربان کروں؟

زرّیں رات بہت دیر تک روتی رہی۔ اُس کے اندر خونریز معرکہ بپا تھا۔ یہ اُس کی ذات کے دو حصے تھے جو ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے تھے ــــ محبت اور فرض ــــ اور اُس کی تربیت!

صبح طلوع ہوتے ہی زرّیں نے پہلا کام یہ کیا کہ احمد بن غطاش اور حسن بن صباح کو بتایا کہ یحییٰ ابن الہادی جاسوسی کے لئے یہاں آیا ہے اور سنان اُس کا ساتھی ہے۔ زرّیں نے یحییٰ کی ساری باتیں سنائیں۔ یہ باتیں سناتے ہوئے زرّیں کی زبان بار بار ہکلاتی تھی اور اُس کے آنسو بھی نکل آئے۔ یہ یحییٰ کی محبت کا اثر تھا ورنہ یہ وہ لڑکی تھی جس نے ذاکر کو اپنے ہاتھوں زہر پلایا تھا۔

زرّیں کو اُس کے کمرے میں بھیج دیا گیا۔

کچھ دیر بعد ایک ملازم روز مرّہ کی طرح یحییٰ کے کمرے میں ناشتہ لے کر گیا۔ ساتھ شہد ملا دودھ تھا۔ سنان کو بھی ایسا ہی دودھ بھیجا گیا۔ دونوں نے دودھ پیا اور کچھ ہی دیر بعد دونوں کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا' پھر ان آنکھوں نے دنیا کا اجالا کبھی نہ دیکھا۔

"ادھر آؤ.... زرّیں کو آ کے دیکھو" ــــ ایک ملازمہ زرّیں کے کمرے سے چیختی چلّاتی نکلی ــــ "جلدی آؤ۔ زرّیں کو دیکھو"۔

احمد بن غطاش اور حسن بن صباح بھی زرّیں کے کمرے میں گئے۔ ایک تلوار زرّیں کے پیٹ میں داخل ہوئی اور پیٹھ سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ وہ ابھی زندہ تھی۔

"تمہیں کس نے مارا ہے زرّیں؟" ــــ احمد بن غطاش نے پوچھا۔

"میں نے خود!" ــــ زرّیں نے کہا ــــ "میں نے دو آدمی قتل کروائے ہیں.... یحییٰ اور سنان۔ ــ اور میں نے اپنی محبت کو بھی قتل کیا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو موت کی سزا دی ہے۔ میں خود ہی جلّاد بن گئی تھی"۔

زرّیں بھی مر گئی۔

یحییٰ اور سنان کی لاشیں بوریوں میں بند کر کے دریا میں بہا دی گئیں۔

"ہمیں کوئی اور ڈھنگ کھیلنا پڑے گا" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "سلطان کو شک ہو

گیا ہے۔ مجھے عبیدیوں کی مدد حاصل کرنے کے لئے مصر جانا چاہئے"۔

"نہیں حسن!" ــــ احمد بن غطاش نے کہا ــــ "پہلے ہم دو تین اور قلعوں پر قبضہ کر لیں پھر ہماری کوشش یہ ہو گی کہ تمہیں سلطان کی حکومت میں کوئی بڑا عہدہ اور رتبہ مل جائے پھر ہم اس سلطنت کی بنیادیں کمزور کر سکتے ہیں"۔

سلطان ملک شاہ نے مَرو میں اپنے سپہ سالار اور کوتوال کو بلا رکھا تھا اور باتیں یحییٰ ابن الہادی اور سنان کے متعلق ہو رہی تھیں۔

"میں کہہ رہا ہوں بہت دن گذر گئے ہیں" —— ملک شاہ کہہ رہا تھا —— "بلکہ مہینے گذر گئے ہیں۔ شاید یہ تیسرا چاند طلوع ہوا ہے۔ اُس نے کوئی اطلاع نہیں دی۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی گیا تھا"۔

"سنان!" —— کوتوال نے کہا —— "یہ دونوں میرے قابلِ اعتماد آدمی ہیں۔ زمین کے نیچے سے بھی راز نکال لاتے ہیں"۔

"یحییٰ کو چاہئے تھا کہ سنان کو ایک بار تو بھیج دیتا" —— سلطان ملک شاہ نے کہا —— "کہیں پکڑا نہ گیا ہو"۔

"ایک اور آدمی کو بھیج دیتے ہیں" —— سپہ سالار نے کہا —— "وہ انہیں ڈھونڈ لے گا"۔

"دو چار دن اور انتظار کر لو" —— ملک شاہ نے کہا۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ دربان نے اندر آ کر اطلاع دی کہ قلعہ شاہ در سے ایک آدمی آیا ہے۔

"فوراً" "اندر بھیج دو" —— ملک شاہ نے کہا۔

ایک ادھیڑ عمر آدمی اندر آیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ لمبے سفر سے آیا ہے۔ ملک شاہ نے سلجوقی اندازِ میزبانی کے مطابق اسے بٹھایا، دربان کو بلا کر اس کے لئے پھل اور مشروب منگوائے پھر پوچھا کہ وہ کیوں آیا ہے۔

"آپ کا ایک آدمی یحییٰ ابن الہادی شاہ در گیا تھا" —— اس آدمی نے کہا —— "وہ میرا دوست ہے۔ اُسے آپ نے سنان نام کے ایک آدمی کے ساتھ جاسوسی اور مخبری کے لئے بھیجا تھا"۔

"اس کی کیا خبر لائے ہو؟" —— کوتوال نے بیتابی سے پوچھا —— "فوراً" "بولو"۔

"ٹھیک خبر لایا ہوں" —— اُس نے کہا —— "اتنا پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں اُس نے اپنا کام بہت ہی محنت اور جانفشانی سے کیا ہے۔ وہ اور اُس کا ساتھی میرے گھر میں ٹھہرے تھے۔ میں نے یحییٰ کی بہت مدد اور راہنمائی کی تھی"۔

"وہاں کی خبر کیا ہے!" —— ملک شاہ نے کہا —— "اس کے بعد ہم کوئی اور بات

سنیں گے"۔

"خبر یہ ہے" —— اُس نے کہا —— "آپ نے یحییٰ کو یہ دیکھنے کے لئے بھیجا تھا کہ والئ شاہ در احمد بن غطاش اسماعیلی ہے اور شاہ در اسماعیلیوں کا مرکز بن گیا ہے..... سلطانِ عالی مقام! آپ کا یہ شک صحیح نہیں۔ احمد بن غطاش اسماعیلیوں کو بالکل پسند نہیں کرتا"۔

"کیا یہ غلط ہے کہ اس نے شاہ در کا والی بنتے ہی اُن تمام اسماعیلیوں کو رہا کر دیا ہے جو اہلِ سنت کا جینا حرام کئے رکھتے تھے؟" —— ملک شاہ نے پوچھا —— "کیا مرحوم والی ذاکر نے انہیں اسی جرم میں قید میں نہیں ڈالا تھا؟"۔

"یہ صحیح ہے سلطانِ محترم!" —— اس آدمی نے کہا —— "احمد بن غطاش نے قید خانے میں پڑے ہوئے تمام اسماعیلیوں کو رہا کر دیا تھا لیکن اُس نے ان سب سے کہا تھا کہ انہیں بے گناہ سمجھ کر رہا نہیں کیا جا رہا بلکہ انہیں موقع دیا جا رہا ہے کہ اپنے دلوں سے مذہبی تعصب نکال دیں اور سُنّی عقیدے کو سمجھنے اور اسے قبول کرنے کی کوشش کریں.. .....دراصل احمد بن غطاش پیار اور بھائی چارے کا حربہ استعمال کر رہا ہے اور اس حربے کے اثرات بھی دیکھنے میں آ رہے ہیں۔ احمد بن غطاش نے اسماعیلیوں میں اپنے مخبر چھوڑے ہوئے ہیں۔ ان مخبروں کی اطلاعیں امید افزا ہیں"۔

"اور یہ جو قافلے لوٹے جا رہے ہیں!" —— ملک شاہ نے پوچھا —— "کیا اس میں احمد بن غطاش کا ہاتھ نہیں؟"

"سلطانِ عالی مقام!" —— اس آدمی نے کہا —— "احمد بن غطاش عالمِ دین ہے۔ یہ وہی احمد بن غطاش ہے جسے آپ عالمِ دین کی حیثیت سے ہی جانتے ہیں۔ قافلے شاہ در سے بہت دور لوٹے گئے ہیں۔ احمد بن غطاش کے خلاف یہ افواہ اسماعیلیوں نے پھیلائی تھی کہ قافلوں کو احمد بن غطاش کے آدمی لوٹتے ہیں۔ ایسے تین اسماعیلی پکڑے گئے تھے۔ انہیں پہلے کوڑے مارے گئے پھر انہیں قید خانے میں ڈال دیا گیا تھا"۔

"یحییٰ کہاں ہے؟" —— سپہ سالار نے پوچھا —— "اُس نے سنان کو کیوں نہیں بھیجا؟ تمہیں کیوں بھیجا ہے؟ اگر شک رفع ہو گیا تھا تو وہ اتنا عرصہ شاہ در کیوں رہا اور واپس کیوں نہیں آیا؟"

"ہمیں شک تھا کہ احمد بن غطاش در پردہ اسماعیلیوں کی پشت پناہی کر رہا ہو گا" ——

اس آدمی نے کہا۔۔۔ "یہ شک رفع کرنے کے لئے میں اور یحییٰ احمد بن غطاش کے اندرونی حلقوں تک پہنچنے کی کوشش کرتے رہے۔ دو عورتوں کو ہاتھ میں لیا اور ان سے معلوم کروایا۔ اس کام میں بہت وقت لگا۔ بہرحال ہمارا یہ شک بھی رفع ہو گیا..... یحییٰ نے مجھے آپ کے پاس بھیجا ہے کہ میں آپ کو پوری اطلاع دے دوں۔ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے..... سلطانِ محترم! آپ کو شاہ در کی طرف سے مطمئن ہو جانا چاہئے۔ اگر احمد بن غطاش کی طرف سے آپ کے لئے کوئی خطرہ اٹھا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہاں اہلِ سنت کی اور آپ کے وفاداروں کی تعداد زیادہ ہے"۔

"ہم تو مطمئن ہو گئے"۔۔۔ سلطان ملک شاہ نے کہا۔۔۔ "لیکن یحییٰ نے سنان کو کیوں نہیں بھیجا؟ اگر اس کا کام ختم ہو گیا تھا تو وہ خود کیوں نہیں آیا؟"

"وہ خود ہی ایک اور کام کے پیچھے پڑ گیا ہے"۔۔۔ اس آدمی نے جواب دیا۔۔۔ "وہ کہتا تھا کہ اُسے ایک ایسا اشارہ ملا ہے جس کے پیچھے وہ گیا تو وہ ان ڈاکوؤں تک پہنچ جائے گا۔ جنہوں نے پہلے قافلوں کو لوٹا ہے اور شاید یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے اب ایک اور قافلے کو لوٹ لیا اور سب کو قتل کر دیا ہے..... سلطانِ عالی مقام! میں نے اُسے روکا تھا لیکن اس نے میری ایک نہیں سنی۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کتنے بڑے خطرے میں سنان کو ساتھ لے کر چلا گیا ہے۔ مجھے یہ بھی شک ہے کہ ایک جواں سال عورت بھی اُس کے ساتھ گئی ہے۔ یحییٰ نے میرے ساتھ اس عورت کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے مجھے شک ہو رہا ہے کہ وہ سیدھا کسی جال میں جا رہا ہے۔ میں حیران ہوں کہ اس عورت کو ساتھ لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ چونکہ اُس نے مجھ سے اس عورت کو چھپائے رکھا تھا اس لئے مجھے خطرہ محسوس ہو رہا ہے کہ وہ کسی سازش کا شکار ہو جائے گا"۔

"ایک بات بتاؤ"۔۔۔ کوتوال نے پوچھا۔۔۔ "یہ سازش احمد بن غطاش نے ہی نہ تیار کی ہو!"۔

"نہیں!"۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ "یہ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ سازش ہی ہے تو احمد بن غطاش کا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ مجھے ایک شک اور بھی ہے۔ یحییٰ نے مجھ سے بالا بالا کوئی اور تعلق پیدا کر لیا تھا۔ اگر ایسا ہی تھا تو اس سے صرف سنان واقف تھا"۔

"کیا تم بتا سکتے ہو وہ کہاں گیا ہے؟"۔۔۔ ملک شاہ نے پوچھا۔

"نہیں سلطانِ محترم!"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "اگر معلوم ہوتا تو میں چوری چھپے اس کے پیچھے چلا جاتا"۔

"تم یہ تو نہیں بتا سکتے کہ وہ کب تک واپس آئے گا"۔۔۔ ملک شاہ نے پوچھا۔

"نہیں سلطانِ عالی مقام!"۔۔۔ اُس نے جواب دیا۔۔۔ "ہمیں دعا کرنی چاہئے کہ وہ زندہ و سلامت واپس آ جائے..... کیا اب مجھے جانے کی اجازت ہے؟..... میں نے پیغام آپ تک پہنچانا تھا وہ پہنچا دیا ہے۔ آپ کہیں یا نہ کہیں میں شاہ در میں آپ کے جاسوس کی حیثیت سے کام کرتا رہوں گا"۔

"ہاں، تم جا سکتے ہو"۔۔۔ سلطان نے کہا۔۔۔ "اگر ہمارے لئے کام کرتے رہو گے تو ہم تمہیں اس کا پورا معاوضہ دیں گے"۔

"نہیں سلطانِ محترم!"۔۔۔ اس شخص نے کہا۔۔۔ "میں یہ کام بلا معاوضہ کروں گا اور اپنا فرض سمجھ کر کروں گا"۔

یہ آدمی چلا گیا۔

جس وقت شاہ در سے آیا ہوا یہ آدمی سلطان ملک شاہ کو یحییٰ ابن الہادی کا پیغام دے رہا تھا، اُس وقت یحییٰ اور اس کے ساتھی سنان کی لاشوں کو دریا بہت دُور لے گیا تھا۔ مچھلیوں نے بوری پھاڑ کر لاشوں کو کھانا شروع کر دیا ہو گا۔

اس شخص کو حسن بن صباح نے بھجوایا تھا۔ زرّیں نے خود کشی سے پہلے یحییٰ ابن الہادی کے متعلق بتا دیا تھا کہ وہ سلطان ملک شاہ کا جاسوس ہے اور یہاں کیا معلوم کرنے آیا تھا۔ یحییٰ اور سنان کو زہر دے کر مار دیا گیا تھا لیکن حسن بن صباح کا خیال تھا کہ یہ خطرہ دونوں کو مار ڈالنے سے ختم نہیں ہوا۔

"ہمیں ان دو جاسوسوں کا تو پتہ چل گیا اور ہم نے انہیں ختم کر دیا ہے"۔۔۔ احمد بن غطاش نے کہا تھا۔۔۔ "مجھے شک ہے یہاں سلجوقیوں کے اور جاسوس اور مخبر بھی ہوں گے۔ ان کا سراغ لگانا بہت ضروری ہے۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اپنے مخبروں سے کہہ دیا جائے کہ شہر میں کسی اجنبی کو دیکھیں تو اُس کا پیچھا کریں اور یقین کر لیں کہ وہ جاسوس نہیں اور یہ دیکھیں کہ وہ کس کام کے لئے یہاں آیا ہے"۔

"میں سلجوقیوں کو گمراہ کر سکتا ہوں"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا تھا۔۔۔ "ہم ایک

آدمی کو مَرو بھیجیں گے جو سلطان ملک شاہ کے پاس یحیٰ ابن الہادی کا پیغام لے کر جائے گا۔ اس آدمی کو پیغام میں بتاؤں گا۔ آدمی بڑا ہوشیار اور ذہین ہونا چاہئے"۔

"میں تمہیں ایک آدمی دوں گا" ــــ احمد بن غطاش نے کہا تھا ــــ "تم یہ بتاؤ کہ پیغام کیا دو گے!"

حسن بن صباح نے یہ سارا پیغام احمد بن غطاش کو سنایا۔

"زندہ باد" ــــ احمد بن غطاش نے بے اختیار کہا ــــ "تم میں اتنی اہلیت ہے کہ نبوّت کا دعویٰ کر سکتے ہو۔ یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی تھی"۔

"نہیں استادِ محترم!" ــــ حسن بن صباح نے کہا تھا ــــ "پیرو مرشد آپ ہی ہیں۔ میں جو کچھ بھی ہوں وہ آپ کی شخصیت کا معمولی سا عکس ہوں..... یہ پیغام میرے دماغ میں اس لئے آیا ہے کہ اس سے سلجوقیوں کو اطمینان ہو جائے گا کہ شاہ در میں سب ان کے وفادار ہیں اور یہاں سلجوقی سلطنت کے خلاف کوئی سازش یا کوئی گڑبڑ نہیں ہو رہی۔ ان دونوں جاسوسوں کی غیر حاضری کے متعلق سلطان ملک شاہ کو یہ شک نہیں ہو گا کہ انہیں غائب کر دیا گیا ہے۔ انہیں اس پیغام سے یقین ہو جائے گا کہ وہ آگے نکل گئے ہیں اور وہ شاہ در میں نہیں"۔

احمد بن غطاش نے اُسی وقت ایک آدمی کو بلا لیا تھا اور حسن بن صباح نے اُسے یہ پیغام دے کر کہا تھا کہ وہ احمد بن غطاش کو سلطان ملک شاہ سمجھے اور یہ پیغام اُسے دے۔

اس آدمی نے ویسے ہی کیا۔ حسن بن صباح نے کئی مقامات پر اس کی تصحیح کی اور اچھی طرح مشق کرائی اور اسے یہ بھی بتایا کہ چہرے پر کس طرح کا تاثر رکھے اور اس کی آواز کا اتار اور چڑھاؤ کس طرح ہو۔

یہ ایک بڑا ہی ذہین اور ہوشیار آدمی تھا جو اس پیغام کی غرض و غایت سمجھ گیا اور ایک دو دفعہ بولنے سے حسن بن صباح کی تسلی ہو گئی اور اس شخص کو اگلی صبح مَرو کو روانہ کر دیا گیا تھا۔

ایک روز یہ آدمی سلطان ملک شاہ کو حسن بن صباح کا یاد کرایا ہوا پیغام دے کر واپس آ گیا۔

"وہاں کیا تاثر چھوڑ آئے عابدین؟" ــــ احمد بن غطاش نے پوچھا۔

"وہی جو آپ پیدا کرنا چاہتے تھے" ــــ عابدین نے کہا ــــ "اگر آپ وہاں ہوتے!

آپ بھی اس پیغام کو سچ مان لیتے۔ میں انہیں یقین دلا آیا ہوں کہ اپنے جاسوس یحیٰ ابن الہادی اور اس کے ساتھی سنان کا انتظار نہ کریں۔ وہ مجھے یہ بتا گئے ہیں کہ انہیں ڈاکوؤں کا سراغ ملا ہے اور وہ دیکھیں گے کہ وہ کون ہیں اور کتنے ہیں لیکن مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ ایک عورت کو ساتھ لے گئے ہیں۔ میں نے سلطان ملک شاہ کو یہ بھی کہا ہے کہ وہ سیدھے کسی جال میں چلے گئے ہیں جہاں سے ان کی واپسی ممکن نظر نہیں آتی' اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں سلجوقی سلطنت کے لئے شاہ در میں جاسوسی کرتا رہوں گا..... سلطان ملک شاہ کے پاس ایک سپہ سالار اور کوتوال بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ ان دونوں نے بھی ہمارے پیغام کو سچ مان لیا ہے"۔

"ہاں عابدین!" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "اگر وہ ہمارے جھوٹ کو سچ نہ مان لیتے تو تم اس وقت یہاں نہ ہوتے۔ مَرو کے قید خانے میں ہوتے یا تمہارا یہ سر تمہارے جسم کے ساتھ نہ ہوتا"۔

حسن بن صباح نے احمد بن غطاش کی طرف دیکھا۔ احمد اشارہ سمجھ گیا۔ وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں گیا۔ واپس آیا تو اُس کے ہاتھ میں سونے کے چند ایک سکے تھے جو اس نے عابدین کو دیئے۔ عابدین نے اٹھ کر اور جھک کر یہ انعام وصول کیا۔

"اب تمہارے ذمے ایک کام اور ہے عابدین!" ــــ احمد بن غطاش نے کہا ــــ "اس شہر میں سلجوقیوں کے اور جاسوس بھی ہو سکتے ہیں۔ انہیں تلاش کرو۔ کوئی اجنبی یا مشکوک آدمی نظر آئے' اُس کے پیچھے اپنا ایک مخبر سائے کی طرح لگا دو۔ اپنے آدمیوں کو اچھی طرح سمجھا دو۔ میں اس کا کچھ اور انتظام بھی کروں گا"۔

"آپ اپنا انتظام کریں پیرو مرشد!" ــــ عابدین نے کہا ــــ "میرا اپنا انتظام ہے۔ میں ایسا جال بچھاؤں گا کہ اس میں سے کوئی مشکوک آدمی نکل کر نہیں جائے گا۔ سلجوقیوں کے ان دو جاسوسوں نے مجھے چوکنّا کر دیا ہے"۔

○

حسن بن صباح انسان سے ابلیس کس طرح بنا؟

اس سوال کا جواب تقریباً" تمام مؤرخوں نے اور اُس دَور کے بعد آنے والے تاریخ نویسوں نے اپنی اپنی بساط اور اپنی اپنی تحقیق کے مطابق دیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ احمد بن غطاش اور حسن بن صباح نے شاہ در سے آگے جو قلعے تھے' ان پر قبضہ

کرنے کا منصوبہ بنایا اور اس علاقے میں اپنے عقیدے کی اور اپنے فرقے کے نظریات کی
تبلیغ شروع کر دی اور لوگوں کو اپنا ہم خیال ہی نہیں بلکہ اپنا مرید بنالیا۔

کیا یہ کام اتنا سہل تھا کہ دو چار باتیں کہیں اور سننے والے اپنے باپ دادا کے عقیدوں سے منحرف ہو گئے اور نئے عقیدے اور ایک نئے ہی فرقے کے پیروکار بن گئے؟

داستان گو سے پوچھیے جو اُس دور کے داستان گوؤں کے حوالے سے بات کرے گا مؤرخوں میں ابنِ اثیر کی "تاریخ کامل" کو پڑھ لیں، ابو القاسم رفیق دلاوری کی "آئمہ تلبیس" کی، ابنِ جوزی کی "تلبیسِ ابلیس" کی ورق گردانی کر لیں، "دبستان مذاہب" کا، "سِیَرِ اسلام" کا اور ابنِ خلدون کی "تاریخ ابنِ خلدون" کا مطالعہ کر لیں۔ سب نے ایک دوسرے کی تصدیق اور تائید کی ہے کہ حسن بن صباح نے اپنے فرقے کے عقائد اور نظریات کی تبلیغ کر کے لوگوں کو اپنا پیروکار بنالیا تھا۔

لیکن کیسے؟

اللہ تبارک و تعالیٰ نے بھٹکی ہوئی انسانیت کو صراطِ مستقیم دکھانے کے لئے پیغمبر مبعوث کئے لیکن لوگوں نے ان کے مذاق اڑائے، ان پر پھبتیاں کسیں، بعض کو ذلیل و رسوا کیا، دھتکارا، اور پھر کچھ لوگ ان سے متاثر ہو گئے۔

حضرت موسیٰؑ پر کیا کیا ظلم و ستم نہ ہوئے۔

حضرت عیسیٰؑ کے پیروکاروں کو رومیوں نے شیروں کے آگے ڈال کر چیر پھڑوایا۔

حضرت عیسیٰؑ کو صلیب کے ساتھ کھڑا کر کے ہاتھوں اور پاؤں میں کیل گاڑ دیئے گئے۔

خاتم النبیین، محبوبِ خدا، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے اور سمجھنے کی بجائے آپؐ کے قتل کے منصوبے بنے۔ حضرت بلالؓ کو کوڑے مار مار کر تپتی ریت پر تڑپایا گیا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر بار چھوڑ کر ہجرت کرنی پڑی۔ اللہ کے عظیم دین کی مقبولیت کو کچھ وقت لگا تھا۔

پھر حسن بن صباح اتنی جلدی لوگوں کے دلوں میں کس طرح سما گیا؟

گذری ہوئی صدیوں کے کھنڈرات میں اُس دور کے قصہ گوؤں کی سرگوشیاں سنئے:

یہ تو سنایا جا چکا ہے کہ احمد بن غطاش حسن بن صباح کا استاد اور پیرو مرشد تھا اور عالم و فاضل تھا، دانشمندوں کا دانشمند تھا لیکن اُس نے علم و فضل کو خیر کی بجائے شر کے

لئے استعمال کیا۔ انسان کو نفس پر قابو پانے کے سبق دینے کی بجائے اسے نفس کا غلام بنایا۔ ابلیس سے بچنے کی بجائے اپنے آپ میں ابلیسی اوصاف پیدا کئے۔

وحی کی آواز سنئے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتے ہیں:

"بھلا دیکھو اُس شخص کو جس نے اپنی خواہشات کو پوجنا زیادہ پسند کیا۔ اے رسولؐ کیا تو ایسے شخص (کی نجات کی) ذمہ داری لے سکتا ہے؟ کیا تو یہ توقع رکھتا ہے کہ ایسے اشخاص میں بہت سے ایسے ہوں گے جو سنتے اور سمجھتے ہوں گے؟ نہیں۔ یہ حیوانوں کے برابر ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ بھٹکے ہوئے ہیں راہ سے"۔ (الفرقان-43، 44)

یہ تو اللہ کی آواز تھی کہ وہ لوگ انسان نہیں حیوان ہیں جو خواہشات کے پجاری ہوتے ہیں لیکن حسن بن صباح نے انسان کو نہایت دلکش خواہشات دے کر حیوان بنایا۔

یہ سبق اسے اس کے استاد نے دیا تھا۔

○

"اب بتاؤ حسن!" ـــ عابدین کے جانے کے بعد احمد بن غطاش نے حسن بن صباح سے پوچھا ـــ "اس صورتِ حال میں ہمیں کیا پیش بندی یا تحفظ کرنا چاہئے!"۔

"ہاں استادِ محترم!" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "ہمارے پاس کوئی فوج نہیں کہ ہم اپنا تحفظ کر سکیں۔ اگر آپ پسند کریں تو میں یہ کہوں گا کہ ہمیں اس علاقے پر چھا جانا چاہئے۔ تبلیغ کا سلسلہ صرف شروع ہی نہیں کرنا بلکہ اسے بہت تیز کرنا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہماری لڑکیوں میں ابھی جذبات زندہ ہیں۔ انہیں تربیت کی ضرورت ہے، لیکن اس سے زیادہ ضروری تبلیغ ہے۔ ہم لوگوں کو زیر اثر لے کر ان کی فوج بنائیں گے"۔

"لوگوں سے کیا کہو گے؟" ـــ احمد بن غطاش نے پوچھا۔

"ہم ان کے سامنے اپنے عقیدے رکھیں گے" ـــ حسن نے کہا ـــ "اور انہیں بتائیں گے کہ دوسرے تمام مذہب اور اُن کے نظریات باطل ہیں"۔

"پیغمبروں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا تھا" ـــ احمد بن غطاش نے کہا ـــ "ان کی کسی نے نہیں سنی تھی۔ ہمیں کوئی ایسا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جس سے لوگوں کے

دلوں پر قبضہ کیا جا سکے"۔

"کیا آپ کے سامنے کوئی ایسا طریقہ ہے؟" ــــ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ہاں حسن!" ــــ احمد بن غطاش نے کہا ــــ "تم مجسّم وہ طریقہ ہو۔ تم میں وہ اوصاف موجود ہیں جو کسی بھی انسان کو گرویدہ کر سکتے ہیں"۔

"ہاں استادِ محترم!" ــــ حسن نے کہا ــــ "یہ تو میں بھی جانتا ہوں کہ مجھ میں کوئی ایسی طاقت ہے جو ہر انسان میں نہیں ہوتی۔ میں نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ میں سیدھے راستے پر چلنے والے لوگوں کو جس راستے پر ڈالنا چاہوں ڈال سکتا ہوں"۔

"ضرورت یہ ہے کہ تمہاری اس قوت کو ابھارا جائے" ــــ احمد بن غطاش نے کہا ــــ "دوسرے مذاہب نے انسان کو بدی سے ہٹنے کے سبق دیئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں نے کسی بھی مذہب کو یا کسی بھی عقیدے کو قبول کرنے میں بہت دیر لگائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بدی میں لذت ہوتی ہے اور انسان میں خدا نے یہ کمزوری رکھ دی ہے کہ اسے لذت پرست اور عیش پسند بنا دیا ہے"۔

"لیکن استادِ محترم!" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "میرے استاد ابن عطاش نے مجھے بتایا تھا کہ انسان میں یہ کمزوری خدا نے نہیں بلکہ ابلیس نے پیدا کی ہے اور انسان کی بدنصیبی یہ ہے کہ اس کی ذات نیکی اور بدی کی معرکہ آرائی کا میدانِ جنگ بنی رہتی ہے"۔

"یوں ہی سہی!" ــــ احمد بن غطاش نے کہا ــــ "میرا مطلب یہ ہے کہ انسانوں میں بدی کو ابھارا جائے..... انسانی فطرت کا یہ بنیادی اصول یاد رکھو حسن! اسے تم انسان کی کمزوری بھی کہہ سکتے ہو۔ وہ یہ ہے کہ ہر انسان بہشت میں جانا چاہتا ہے لیکن مرنا کوئی بھی نہیں چاہتا..... ان کی ضرورت یہ ہے کہ انہیں دنیا میں ہی بہشت دکھا دی جائے۔ پھر دیکھنا کہ یہ لوگ کس طرح تمہیں نبی اور پیغمبر مانتے ہیں"۔

"میں انہیں دنیا میں بہشت دکھا سکتا ہوں" ــــ حسن نے کہا ــــ "یہ بہشت میرے خیالوں میں ہے جو میں سب کو دکھا دوں گا۔ میں اگر انسانی فطرت کو غلط نہیں سمجھا تو میری رائے یہ ہے کہ انسان اسراریت کے پیچھے زیادہ بھاگتا ہے۔ ایک چیز اس کے سامنے رکھ دی جائے تو وہ اسے ذرا مشکل سے ہی قبول کرتا ہے۔ اگر اسی چیز کو پُراسرار بنا دیا جائے تو انسان اس کی طرف لپکتا ہے، پردے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے، پردوں کے

پیچھے جھانکتا ہے اور جب یہ چیز اس کے سامنے آجاتی ہے تو وہ اسے گوہرِ نایاب سمجھ کر سینے سے لگا لیتا ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنا طریقہ استعمال کروں"۔

"ہاں حسن!" ــــ احمد بن غطاش نے کہا ــــ "اگر تم انسانی فطرت کی بنیادی کمزوریاں سمجھ گئے ہو تو اس میدان میں اُترو۔ میں اس شہر کا والی ہوں۔ مجھ سے جو بھی اور جیسی بھی مدد مانگو گے وہ میں دوں گا۔ تم کتنا ہی انتہائی اقدام کر گزرو مجھے اپنے ساتھ پاؤ گے..... یہ یاد رکھو کہ انسان خدا کے حکم کو نظرانداز کر کے ابلیس کی بات مان لیتا ہے۔ یہ انسانی فطرت کی کمزوری ہے کہ وہ شجرِ ممنوعہ کو زیادہ پسند کرتا ہے۔ میں نے تمہیں سحر کی طاقت بھی دے دی ہے۔ تم کسی بھی انسان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے لگو تو وہ آدمی مسحور ہو جائے گا۔ میں نے تمہیں علم نجوم بھی دیا ہے۔ تم ستاروں کی گردش اور چال دیکھ کر صحیح فیصلہ کر سکتے ہو کہ تمہارا اگلا قدم آگے بڑھنا چاہئے یا پیچھے ہٹنا چاہئے"۔

دونوں نے مل کر ایک ایسا منصوبہ تیار کیا جس نے انسانیت کو ہلا کر رکھ دیا اور تاریخ پر لرزہ طاری ہو گیا۔ تاریخ نے اس کی ہر ایک تفصیل کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا تاکہ رہتی دنیا تک انسان اپنی تاریخ کا یہ حیرت انگیز، سنسنی خیز اور شرمناک باب پڑھتا رہے۔ انسان نے آج تک عبرت حاصل نہیں کی۔ آج بھی انسان اسراریت اور بدی کی دلکشی کا رسیا ہے۔ وہ اپنے خیالوں میں حسن بن صباح کی جنّت آباد کئے رکھتا ہے اور اس کا زیادہ تر وقت اسی جنّت میں گزرتا ہے۔

○

قلعہ شاہ در سے آگے خلجان نام کا ایک اور قلعہ تھا۔ اس وسیع و عریض خطّے میں ایسے چند اور قلعے بھی تھے جن میں سب سے زیادہ مشہور قلعہ الموُت تھا جو کچھ عرصے بعد حسن بن صباح کا مرکز بنا اور یہیں اُس نے اپنی جنّت بنائی جس کی تفصیلات تاریخ میں آج تک محفوظ ہیں۔ احمد بن غطاش اور حسن بن صباح کے منصوبے کی پہلی کڑی یہ تھی کہ ان تمام قلعوں پر قبضہ کیا جائے۔ ان کے پاس کوئی فوج تو تھی نہیں۔ پھر بھی انہیں یقین تھا کہ وہ اپنے عزائم میں کامیاب ہو جائیں گے۔

قلعہ شاہ در سے بارہ چودہ کوس دُور ایک بڑا خوبصورت کوہستانی خطّہ تھا جس میں اونچی نیچی ٹیکریاں اور ان سے اونچی پہاڑیاں تھیں۔ یہ ایک سبزہ زار تھا جو قدرت کے

ہاتھوں نے بڑی محنت اور بڑی محبت سے تیار کیا تھا۔ اس میں ایسے درخت تھے جو کسی اور خطّے میں نظر نہیں آتے تھے۔ بعض ٹیکریوں اور پہاڑیوں پر شاہ بلوط کے گھنے درخت تھے۔ شفاف پانی کی ندیاں بہتی تھیں۔ درختوں میں سے گزرتی ہوئی ہوا اور ندیوں کا جل ترنگ یہاں سے گزرنے والوں پر سحر طاری کر دیا کرتا تھا۔

کچھ دنوں سے اس علاقے میں رہنے والے لوگوں میں یہ خبر پھیل گئی تھی کہ رات کے وقت کبھی کبھی شاہ بلوط کے ایک درخت میں سے ایک ستارہ سا چمکتا ہے جو بجھتا ہے اور کچھ دیر بعد پھر چمکتا ہے۔ یہ خبر شاہ در تک پہنچی اور پھر یہ اس تمام علاقے میں پھیل گئی۔

اس کی شہرت ایسی پھیلی کہ لوگ دور دور سے آنے لگے۔ وہ اس ہرے بھرے جنگل میں اس ستارے کی چمک کے انتظار میں تین تین چار چار دن وہاں قیام کرتے۔ ستارہ چمکتا تو کسی پر خوف اور کسی پر تقدّس کا تاثر طاری ہو جاتا۔ کوئی کہتا کہ یہ کسی پیغمبر کے ظہور کی نشانی ہے اور اکثر لوگ یہ کہتے تھے کہ اس خطّے پر خدا کی نوازشیں اور رحمتیں نازل ہوں گی۔ زیادہ تر کا خیال یہی تھا کہ یہ کوئی بُرا شگون نہیں۔

کچھ دن اور گزرے تو ستارے کی چمک سے پہلے نقارہ اور شہنائیاں بجتیں اور پھر شاہ بلوط کی گھنی شاخوں میں سے ستارے کی چمک دکھائی دیتی۔

کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ آگے بڑھتا اور دیکھتا کہ یہ چمک کیسی ہے۔ دن کے وقت لوگوں نے اس درخت سے دُور رہنا پسند کیا۔ بزرگوں اور دانشمندوں نے بھی لوگوں سے یہی کہا کہ اُدھر نہ جانا کیوں کہ یہ جنّات بھی ہو سکتے ہیں اور یہ کوئی خدائی اشارہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جنّات ناراض ہو کر اس سارے علاقے پر قہر نازل کریں یا خدا ہی ناراض نہ ہو جائے۔

کچھ دن اور گزرے تو سبز ریشمی چُغوں میں ملبوس آدمی لوگوں کے ہجوم میں نظر آنے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں تسبیحیں تھیں اور ان کے ہونٹ یوں ہلتے تھے جیسے کچھ پڑھ رہے ہوں۔ لباس، چال ڈھال اور انداز سے وہ عالم فاضل لگتے تھے۔ وہ جو کوئی بھی تھے، ایک ایک کر کے لوگوں میں بکھر گئے۔

"خدائے بزرگ و برتر اس علاقے کو بارانِ نعمت سے نواز رہا ہے" — ان میں سے ہر ایک آدمی یہی کہتا پھرتا تھا۔

"خدا کی طرف سے کوئی برگزیدہ ہستی اس جگہ اُتر رہی ہے"۔

"یہ حضرت عیسیٰؑ بھی ہو سکتے ہیں"۔

"ہو سکتا ہے حضرت موسیٰؑ ہی ہوں"۔

"یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہو سکتے ہیں"۔

"کوئی نبی یا پیغمبر نہ ہوا تو خدا کا ایلچی ہو گا"۔

"راتوں کو جاگتے رہو۔ ستارہ چمکے تو سجدے میں گر پڑو"۔

"چمک کی طرف دیکھتے نہ رہا کرو کہ یہ خدا کے مقدّس ایلچی کی توہین ہو گی"۔

اور اس قسم کی اور بھی بہت سی قیاس آرائیاں، پیشین گوئیاں اور ہدائتیں تھیں جو سبز چغوں والوں کی زبانوں کا ورد بن گئی تھیں۔ لوگ ان کے گرد اکٹھے ہونے لگے۔ انہوں نے بڑی ہی پُر اثر آواز میں وعظ شروع کر دیئے۔ ان کا انداز ایسا تھا کہ ہر کوئی ان سے متاثر ہو جاتا تھا۔

○

ایک رات نقارہ اور اس کے ساتھ شہنائیاں بجیں تو لوگوں نے اُدھر دیکھنا شروع کر دیا جدھر ستارے کی چمک دکھانے والا شاہ بلوط کا درخت تھا۔ رات تاریک تھی۔ نقارہ اور شہنائیاں بجتی رہیں لیکن ستارے کی چمک نظر نہ آئی۔

"بلند آواز سے کلمہ طیّبہ پڑھو" — سبز چغے والے ایک آدمی نے بلند آواز سے کہا۔

وہاں اب ہزاروں انسانوں کا ہجوم تھا۔ ان میں مسلمان زیادہ تھے۔ باقی عیسائی، یہودی اور دوسرے عقیدوں کے لوگ تھے۔ مسلمانوں نے کلمۂ طیّبہ کا ورد شروع کر دیا۔ دوسروں نے اپنے اپنے مذہب کے مطابق کچھ پڑھنا شروع کر دیا۔

"سجدے میں گر پڑو" — ایک آواز آئی۔

تمام لوگ سجدے میں چلے گئے۔ جو مسلمان نہیں تھے وہ بھی سر بسجدہ ہو گئے۔

"اے خدائے ذوالجلال!" — ایک بڑی ہی بلند آواز ابھری — "یہ سب تیرے گناہ گار اور عاجز بندے ہیں۔ ان کے گناہ بخش دے اور ہمیں اپنی خدائی کا جلوہ دکھا دے۔ ہم سے اپنے نور کے نزول کا اتنا انتظار نہ کرا"۔

پُر اسرار رات خاموش ہو گئی۔ لوگ جو کلمۂ طیّبہ کا ورد کر رہے تھے وہ اس آواز پر

خاموش ہو گئے تھے۔ ہر آدمی کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آجائے گا۔

"اٹھو اور دیکھو" ــــ ایک اور آواز ابھری۔

لوگوں نے شاہ بلوط کے درخت کی طرف دیکھا۔ وہاں ستارہ تو نہیں تھا لیکن ایک روشنی آہستہ آہستہ اوپر سے نیچے آئی جس میں درخت کی گھنی شاخوں کا کچھ حصہ نظر آتا تھا۔ یہ روشنی زیادہ پھیلی ہوئی نہیں تھی، یہ تقریباً تین فٹ لمبی اور اتنی ہی چوڑی تھی۔ یہ پہلے درخت پر گھومتی پھرتی رہی پھر نیچے آئی۔ دُور سے شاہ بلوط کا یہ درخت یوں لگتا تھا جیسے بہت بڑی چھتری ہو۔

روشنی اس وسیع و عریض چھتری پر گھومتے گھومتے آہستہ آہستہ نیچے آئی تو ایک انسان کا ہیولہ نظر آیا جو سر سے پاؤں تک سفید کپڑوں میں ملبوس تھا۔ کبھی تو یوں لگتا تھا جیسے یہ کفن میں لپٹی ہوئی لاش ہو۔ روشنی اس کے سر سے پاؤں تک آئی اور پھر پاؤں سے سر تک چلی گئی۔ غور سے دیکھنے سے معلوم ہُوا کہ اس نے بڑا لمبا سا سفید چغہ پہن رکھا ہے اور اس کے سر پر دستار ہے۔

اُس نے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ تھوڑی دیر بعد روشنی بجھ گئی اور یہ آدمی غائب ہو گیا۔

لوگوں پر خوف و ہراس بھی اور تقدّس بھی طاری ہُوا اور وہ پہلے سے زیادہ بے تاب ہونے لگے کہ کوئی انہیں بتائے کہ یہ کون ہے اور یہ سب کیا ہے۔

سبز چغوں والے آدمی رات ہی رات کہیں غائب ہو گئے۔ اگلی رات وہ پھر وہاں موجود تھے۔ لوگوں نے انہیں گھیر لیا اور ان سے پوچھنے لگے کہ یہ سب کیا ہے۔

"صرف ایک شخص ہے جو ہم سب کی راہنمائی کر سکتا ہے" ــ چغوں والوں میں سے ایک نے کہا ــــ "لیکن اسے یہاں لانا بہت مشکل ہے"۔

"ہمیں بتا وہ کون ہے!" ــــ ایک آدمی نے پوچھا اور اُس نے کہا ــــ "وہ جہاں کہیں بھی ہُوا ہم اُسے لے آئیں گے۔ ہمیں جو بھی قیمت دینی پڑی ہم دیں گے"۔

"وہ قلعہ شاہ در کا والی ہے" ــــ ایک سبز پوش نے کہا ــــ "اس کا نام احمد بن عطاش ہے۔ اُس کے پاس کوئی ایسا علم ہے جس کے زور پر وہ غیب میں چھپے ہوئے راز بھی بتا دیا کرتا ہے"۔

"ہمیں اس کے پاس لے چلو" ــــ لوگوں نے سبز پوشوں سے کہنا شروع کر دیا۔

"لیکن ایک بات سوچ لو" ــــ ایک بزرگ سبز پوش نے انہیں کہا ــــ "وہ تمہیں سب کچھ بتا دے گا لیکن تمہیں اس کی بات ماننی پڑے گی"۔

"وہ کیا بات منوائے گا؟"

"وہ تم سے جان کی قربانی نہیں مانگے گا" ــــ سبز پوش نے کہا ــــ "پہلے وہ یہ دیکھے گا کہ جس ہستی کا ہیولہ نظر آیا ہے، وہ کون تھا اور کیا تھا اور کیا وہ پھر بھی نظر آئے گا؟ اس کے بعد وہ بتائے گا کہ لوگوں کو کیا کرنا چاہئے"۔

"ہم اُس کے پاس جائیں گے" ــــ کئی ایک آوازیں اٹھیں۔

○

اس علاقے میں تھوڑے سے گھروں کی ایک بستی تھی جن میں زیادہ تر گھر عیسائیوں کے تھے اور دو یا تین گھر یہودیوں کے تھے۔ اس بستی کے لوگ بھی شاہ بلوط میں چمکنے والے ستارے کو دیکھنے جایا کرتے تھے اور ان میں کچھ تو ایسے تھے جو کئی دنوں سے وہیں جا بیٹھے تھے جہاں سے شاہ بلوط کا وہ درخت نظر آتا تھا۔

یہودیوں میں ایک بوڑھا مذہبی پیشوا بھی تھا اور عیسائیوں کا ایک بوڑھا پادری بھی تھا۔ ایک روز پادری یہودیوں کے رِبّی (مذہبی پیشوا) کے پاس گیا اور اسے بتایا کہ اس ستارے کے معاملے میں وہ خاصا پریشان ہے۔

"میں خود پریشان ہوں فادر!" ــــ رِبّی نے کہا ــــ "یہ کوئی شعبدہ بازی ہے اور یہ لوگوں کے عقیدے خراب کرنے کے لئے تخریب کاری ہو رہی ہے۔ نبی اور پیغمبر اس طرح ظاہر نہیں ہُوا کرتے نہ ہی خدا عام بندوں کو یوں اپنا نُور دکھایا کرتا ہے جس طرح ہم یہ تماشہ دیکھ رہے ہیں۔ خدا نے اپنا جلوہ حضرت موسیٰؑ کو کوہِ طور پر دکھایا تھا۔ وہ بھی صرف ایک بار۔ اسے آپ بھی مانتے ہیں، ہم بھی مانتے ہیں اور مسلمانوں کا بھی یہی عقیدہ ہے"۔

"کچھ سوچیں محترم رِبّی!" ــــ پادری نے کہا ــــ "مجھے شک ہے کہ یہ مسلمانوں کا ناٹک ہے۔ میرے خیال میں یہ ناٹک اس لئے کھیلا جا رہا ہے کہ اسلام کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دیا جا سکے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اسلام میں کتنے فرقے پیدا ہو گئے ہیں"۔

"میں بڑے غور اور دلچسپی سے دیکھ رہا ہوں فادر!" ——ربّی نے کہا—— "میرا خیال یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک فرقہ اور پیدا ہو رہا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہم اپنے آدمی مسلمانوں کے روپ میں اس فرقے میں داخل کریں گے تاکہ یہ نیا فرقہ پھلے پھولے اور اسلام مزید کمزور ہو۔ ہمارے آدمی مسلمان مولویوں اور خطیبوں کے بہروپ میں دُور دراز آبادیوں میں بکھر جائیں گے اور اس نئے فرقے کی حمایت میں قرآن اور احادیث کے حوالے دے دے کر مسجدوں میں وعظ کرتے پھریں گے، لیکن یہ معلوم کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ یہ کیسی شعبدہ بازی ہو رہی ہے"۔

"یہ پُراسرار سلسلہ مسلمانوں کا ہی معلوم ہوتا ہے" ——پادری نے کہا—— "یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ جس رات روشنی میں ایک سفید پوش آدمی دکھایا گیا، اُس رات سبز چغوں میں ملبوس کچھ آدمیوں نے لوگوں سے کہا تھا کہ وہ کلمہ پڑھیں اور سجدہ ریز ہو جائیں۔ یہ کلمہ مسلمانوں کا ہے اور سجدے بھی مسلمان ہی کیا کرتے ہیں..... لوگ پسماندہ ہیں اس لئے وہ شعبدہ بازی کو بھی خدا کا معجزہ سمجھ لیتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کو گمراہ کیا جا رہا ہے تو یہ ہمارا مسئلہ نہیں"۔

"بلکہ ہمیں خوش ہونا چاہئے کہ مسلمانوں کو گمراہ کیا جا رہا ہے۔ ہمیں اپنی قوم کا خیال رکھنا چاہئے کہ انہیں کوئی گمراہ نہ کرے"۔

"لیکن کیا کیا جائے!" ——پادری نے کہا—— "میں ایک دو عقل اور جرأت والے جوان دے سکتا ہوں جو دن یا رات کے وقت پہاڑیوں کے اندر جا کر دیکھ لیں گے کہ یہ روشنی مصنوعی دکھائی جا رہی ہے یا یہ کوئی مافوق الفطرت روشنی ہے"۔

"میں نے ستارے کی چمک خود جا کے دیکھی ہے" ——ربّی نے کہا—— "وہ چراغ کی یا مشعل کی روشنی نہیں۔ روشنی سفید ہوتی ہے جو چمکتی ہے اور یک لخت بجھ جاتی ہے۔ اگر مشعل ہو تو صاف پتہ چل جائے کہ یہ شعلہ ہے، اِدھر سے آیا ہے اور اُدھر چلا گیا۔ شاہ بلوط کی چمک میں شعلہ نہیں ہوتا..... آپ صرف ایک آدمی تیار کریں اور ایک آدمی میں تیار کر لوں گا۔ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ اسلام کا خاتمہ اور اس کے لئے ہر وقت مصروفِ عمل رہنا ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔ میں آپ کے آدمی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا، میں اپنے آدمی کے متعلق بتا سکتا ہوں کہ میرے حکم پر جان قربان کر دے گا"۔

"پھر ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے" ——پادری نے کہا۔

"آج رات اپنے آدمی کو ساتھ لے کر میرے پاس آ جائیں" ——ربّی نے کہا

○

رات کو جب ہزارہا لوگ شاہ بلوط سے دُور ستارے کی چمک کے انتظار میں گھروں سے دُور بیٹھے تھے، اُس وقت دو جواں سال آدمی یہودیوں کے مذہبی پیشوا کے گھر اُس کی اور پادری کی باتیں سن رہے تھے۔ ان دونوں نے بھی شاہ بلوط میں ستارے کو چمکتے دیکھا تھا اور وہ بھی قائل ہو گئے تھے کہ یہ آسمان کا ستارا ہے جو شاہ بلوط کے اس پرانے درخت کی گھنی شاخوں میں اتر آیا ہے۔

"آسمان کے ستارے زمین پر نہیں اُترا کرتے" ——ربّی نے ان دونوں سے کہا—— "اگر یہ مان لیا جائے کہ خدا اپنا جلوہ دکھا رہا ہے تو یہ سوچو وہ کسے دکھا رہا ہے۔ کیا حضرت موسیٰؑ پھر دنیا میں آ گئے ہیں یا حضرت عیسیٰؑ پھر زمین پر اُتر آئے ہیں؟..... نہیں... بار بار اپنا جلوہ دکھانے کی خدا کو کیا ضرورت پیش آ گئی ہے؟ کیا یہاں کے انسانوں نے خدا کو رَد کر کے کسی اور کی عبادت شروع کر دی ہے؟ کوئی مسلمان ہے یا عیسائی یا کوئی یہودی ہے، یہ سب اپنے اپنے طور طریقے سے خدا کو یاد کر رہے ہیں..... میری بات غور سے سنو میرے بچو! جس پہاڑی پر یہ درخت ہے اس کے پیچھے کہیں روشنی کا انتظام نہیں تو یہ کوئی شعبدہ بازی ہے۔ تم نے چُھپ چُھپ کر وہاں پہنچنا ہے اور دیکھنا ہے۔ اگر تمہیں کوئی ایسی چیز نظر آئے اور پتہ چل جائے کہ یہ کیا راز ہے تو تم نے وہاں کوئی کارروائی نہیں کرنی۔ خاموشی سے واپس آ جانا ہے"۔

"یہ ہمارا ذاتی کام نہیں" ——پادری نے کہا—— "یہ ہمارا مذہبی معاملہ ہے۔ یہ کوئی نیا فرقہ اٹھ رہا ہے جس سے لوگ بڑی تیزی سے متاثر ہوئے جا رہے ہیں۔ اگر لوگوں کی عقیدت مندی کا یہی حال رہا تو یہ عیسائیت اور یہودیت کے لئے بہت ہی نقصان دہ ہو گا۔ اگر یہ مسلمانوں کا کوئی فرقہ ہے تو ہم اسے مزید ہوا دیں گے۔ یہ اب تمہاری ذمہ داری ہے کہ ہمیں صحیح خبر لا کر دو"۔

"ہم کل سورج غروب سے کچھ پہلے روانہ ہو جائیں گے" ——یہودی جوان نے کہا۔

"جگہ دُور ہے" ——عیسائی جوان بولا—— "ہم سیدھے تو جا نہیں سکتے۔ سیدھے

جائیں تو ہمارے لئے یہ فاصلہ کچھ بھی نہیں۔ ہمیں پیدل جانا پڑے گا۔ گھوڑوں پر جائیں گے تو گھوڑوں کو چھپائیں گے کیسے! گھوڑا کہیں بھی ہنہنا کر اپنی نشاندہی کر دے گا"۔

"میں ایک بات صاف کر دوں" — یہودی جوان نے کہا — "میں یہ وعدہ نہیں کرتا کہ یہ کام ایک ہی رات میں ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے دو یا تین راتیں ہم واپس ہی نہ آسکیں"۔

"ایسی کوئی پابندی نہیں" — ربّی نے کہا — "تم نے اپنے آپ کو بچا کر رکھنا ہے اور پوری کوشش کرنی ہے کہ زندہ واپس آجاؤ تاکہ ہمیں صحیح صورتِ حال معلوم ہو جائے اور ہم اس کا کوئی سدّباب کر سکیں"۔

"آپ کو یہ وہم نہیں ہونا چاہئے کہ ہم آپ کو دھوکہ دیں گے" — یہودی جوان نے کہا — "ہم آپ کا مقصد سمجھ گئے ہیں"۔

"اب تم دونوں چلے جاؤ" — ربّی نے کہا — "پانی کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہو گا' کھانے کے لئے کھجوریں ساتھ لے جاؤ"۔

باہر آکر ان دونوں جوانوں نے آپس میں طے کر لیا کہ وہ کہاں ملیں گے۔ یہودی جوان اپنے گھر سیدھا جانے کی بجائے ایک اور طرف سے گیا۔ ایک گھر کے سامنے بچے کھیل رہے تھے۔ ایک بچے سے اس نے پوچھا کہ اُس کی بہن میرا کہاں ہے۔ بچے نے اسے بتایا کہ تھوڑی دیر ہوئی وہ بکریوں کو لے کر نکلی ہے۔

یہودی اپنے گھر جانے کی بجائے اُس طرف چلا گیا جس طرف میرا گئی تھی۔ گاؤں سے کچھ دور بڑی اچھی چراگاہ تھی جہاں چھوٹی گھاس بھی تھی اور اونچی بھی۔ یہ دونوں اسی جگہ ملا کرتے تھے۔ وہاں سے چھوٹی سی ایک ندی گزرتی تھی۔ ندی کے کنارے گھنی جھاڑیاں تھیں اور خودرو بیلیں درختوں پر چڑھی ہوئی تھیں۔ یہودی اُدھر جا رہا تھا کہ میرا نے اسے دیکھ لیا اور وہ اس کی طرف دوڑ پڑی۔ یہودی جوان نے بھی اپنے قدم تیز کر لئے اور دونوں اس طرح ملے جیسے بے خیالی میں ان کی ٹکر ہو گئی ہو۔ دونوں نے ایک دوسرے کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ انہیں ایسی کوئی پرواہ نہیں تھی کہ کوئی انہیں دیکھ رہا ہو گا۔ سب جانتے تھے کہ یہ ایک دوسرے کو چاہتے ہیں اور ان کی شادی ہو جائے گی۔ اس لئے بھی بے حجاب تھے کہ یہودی تھے۔ کسی کو بے حیا کہنے کی بجائے یہودی کہہ دینا ہی کافی ہوتا تھا۔ یہودی کی تمام تر تاریخ فتنہ و فساد' فریب کاری اور عیاری کی تاریخ ہے

اور یہودی نے ہمیشہ اسلام کو اپنا ہدف اور مسلمانوں کو دشمن نمبر ایک بنائے رکھا ہے۔ آج بھی یہ قوم اسلام کی بیخ کنی میں مصروف ہے۔

اپنے ان ابلیسی عزائم کی کامیابی کے لئے یہودی اپنی لڑکیوں کو بڑے فخر سے استعمال کیا کرتے تھے اور اپنی بیٹیوں کا شعور بیدار ہوتے ہی انہیں بے حیائی کے سبق دینے لگتے تھے۔ سرِعام فحش حرکتیں کرنا اور مردوں کے ساتھ قابلِ اعتراض اور شرمناک حالت میں دیکھے جانا ان کے ہاں معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اپنی بیٹی' بہن یا بیوی کو کسی غیر مرد کے ساتھ دیکھ کر اعتراض کرنا قابلِ اعتراض فعل سمجھا جاتا تھا۔ البتہ ایسی نوجوان لڑکی یا عورت کے پیشِ نظر ذاتی عیاشی نہیں بلکہ قومی مقصد ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا۔

اس جوان سال یہودی اور ایک نوجوان لڑکی کا یوں ملنا کہ ان کے جسموں کے درمیان سے ہوا بھی نہ گذر سکے' قابلِ اعتراض فعل نہیں تھا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے ندی تک گئے اور وہاں بیٹھ گئے۔

"میں تمہیں الوداع کہنے آیا ہوں میرا!" — یہودی جوان نے کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو اسحاق؟" — میرا نے بدک کر اس سے الگ ہوتے ہوئے پوچھا — "کہاں جا رہے ہو؟"

"ایک مہم پر!" — اسحاق نے کہا۔

"کیسی مہم؟ کون سی مہم؟" — میرا نے پوچھا — "کیا یہ کوئی خطرناک کام ہے؟"

"خطرناک ہو سکتا ہے" — اسحاق نے کہا — "اور آسان اتنا کہ ہو سکتا ہے میں کل ہی واپس آجاؤں..... تم نے وہ ستارہ دیکھا ہے نا جو دُور پہاڑی پر چمکتا ہے۔ ہم دونوں نے اکٹھے دو تین بار دیکھا ہے۔ میں دیکھنے جا رہا ہوں یہ کیا ہے۔ میرے ساتھ بنو ثعلب کا ایک عیسائی آسر بن جوہل بھی جا رہا ہے"۔

اسحاق نے میرا کو اپنے ربّی اور پادری کی ساری باتیں سنائیں اور بتایا کہ یہ راز معلوم کرنا کیوں ضروری ہے۔

"اگر یہ جنات ہوئے" — میرا نے کہا — "یا کوئی اور غیر انسانی مخلوق ہوئی تو پھر کیا کرو گے؟"

"ہم دُور سے دیکھ کر واپس آجائیں گے" — اسحاق نے کہا — "ہم نے ان پر حملہ تو نہیں کرنا' صرف دیکھنا ہے کہ وہاں ہم جیسے انسان ہیں یا یہ کوئی خدائی اشارہ ہے"۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی" ـــ میرا نے کہا ـــ "میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گی"۔

"جذباتی نہ بنو میرا!" ـــ اسحاق نے کہا ـــ "وہاں تمہارا کوئی کام نہیں۔ میں دو تین دنوں بعد واپس آجاؤں گا"۔

"مجھے ساتھ نہیں لے جانا تو تم بھی نہ جاؤ" ـــ میرا نے روتے ہوئے کہا ـــ "میں جذباتی بات نہیں کر رہی۔ میرا دل خوف کی گرفت میں آگیا ہے" ـــ اس نے اسحاق کے گلے میں باہیں ڈال کر رندھی ہوئی آواز میں کہا ـــ "نہ جاؤ اسحاق! جانا ہے تو مجھے بھی ساتھ لے چلو"۔

اسحاق کو اُس نے اتنا مجبور کر دیا کہ اسحاق نے اُسے کہا کہ وہ ربّی کے پاس جائے اگر ربّی اجازت دے دے تو وہ اسے ساتھ لے جائے گا۔

یہ لڑکی اسحاق کو اس قدر چاہتی تھی کہ اُسی وقت ربّی کے گھر کی طرف دوڑی گئی۔ اسے بھی جا کر کہا کہ وہ اسحاق کے ساتھ جانا چاہتی ہے۔

"اسحاق اپنے فرض کے لئے جا رہا ہے" ـــ ربّی نے کہا ـــ "اور تم محبت کے لئے جا رہی ہو۔ فرض آدمی کو آگے ہی آگے دھکیلتا ہے لیکن محبت پاؤں کی زنجیر بن جایا کرتی ہے..... نہیں میرا! تم ان لڑکوں کے ساتھ نہ جاؤ۔ یہ دو تین دنوں تک واپس آجائیں گے"۔

"مجھے معلوم ہے وہ کیوں جا رہے ہیں" ـــ میرا نے کہا ـــ "وہاں انہیں کسی عورت کی ضرورت ہوگی۔ اسحاق نے مجھے بتا دیا ہے کہ وہ مہم کیا ہے جس پر وہ جا رہے ہیں"۔

"نادان لڑکی!" ـــ ربّی نے کہا ـــ "یہ کام آدمی کر سکتے ہیں۔ یہ کسی عورت کے کرنے کا کام نہیں"۔

لڑکی ہنس پڑی۔ ربّی اور زیادہ سنجیدہ ہو گیا۔

"جو کام میں کر سکتی ہوں وہ اسحاق اور آسر نہیں کر سکتے" ـــ میرا نے کہا ـــ "دیکھنا یہ ہے کہ وہاں کوئی ہم جیسے انسان ہیں یا یہ کوئی مافوق الفطرت مظاہرہ ہے۔ اگر دو آدمی آگے گئے تو وہ مارے بھی جا سکتے ہیں۔ اگر میں آگے چلی گئی تو وہاں اگر آدمی ہوئے تو ایک خوبصورت اور نوجوان لڑکی کو دیکھ کر اس طرح دوڑے آئیں گے جس طرح پرندہ دانے کو دیکھ کر جال میں آتا ہے۔ پھر ہمارے آدمی انہیں پکڑ لیں گے۔

دیکھ کر واپس آجائیں گے کہ وہاں جنات یا کوئی آسمانی مخلوق نہیں بلکہ ہم جیسے انسان ہیں"۔

"وہ تمہیں پکڑ لیں گے" ـــ ربّی نے کہا ـــ "کیا تم نہیں جانتی کہ وہ تمہارے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟"

"جانتی ہوں ربّی!" ـــ میرا نے کہا ـــ "کچھ قربانی تو دینی پڑے گی لیکن میں انہیں دھوکہ دے کر وہاں سے نکل آؤں گی۔ میں اس مقصد کو سمجھتی ہوں جس مقصد کے لئے آپ ان دونوں آدمیوں کو بھیج رہے ہیں۔ یہ ہمارا قومی مقصد ہے..... اور محترم ربّی! جہاں تک جذبات کا تعلق ہے، میں اسحاق کا ساتھ نہیں چھوڑوں گی۔ اگر اس نے مرنا ہے تو میں بھی اس کے ساتھ مروں گی۔ اگر آپ مجھے نہیں جانے دیں گے تو میں اسحاق کو بھی نہیں جانے دوں گی"۔

ربّی کے بوڑھے چہرے کی لکیریں مسکرانے لگیں۔ وہ گہری سوچ میں کھو گیا تھا۔ میرا اسے چپ چاپ دیکھتی رہی۔ کچھ دیر بعد ربّی نے میرا کی طرف دیکھا۔

"ہاں لڑکی!" ـــ ربّی نے کہا ـــ "اگر تم محبت کی بجائے فرض کو ترجیح دیتی ہو تو اسحاق کے ساتھ چلی جاؤ۔ تم ان کی کامیابی کا باعث بن سکتی ہو اور تم انہیں ناکام بھی کر سکتی ہو۔ اگر تم نے عقل سے کام لیا اور ذاتی جذبات کو دبائے رکھا تو تم اس قومی مقصد میں کامیاب لوٹو گی"۔

میرا وہاں سے اٹھ دوڑی اور سیدھی اسحاق تک پہنچی۔

میرا کے باپ کو پتہ چلا تو وہ ربّی کے ہاں دوڑا گیا۔ ربّی نے اُسے مطمئن کر دیا۔

○

سورج غروب ہو گیا تھا جب اسحاق، آسر اور میرا گاؤں سے نکلے۔ وہ اکٹھے نہیں نکلے تھے۔ انہیں چوری چھپے نکلنا تھا کیونکہ گاؤں میں مسلمان بھی رہتے تھے جنہیں اس مہم سے بے خبر رکھنا تھا۔ وہ اکیلے اکیلے نکلے تھے اور بہت دور جا کر اکٹھے ہوئے تھے۔ تینوں کے پاس خنجر تھے۔ اسحاق اور آسر کے پاس تلواریں بھی تھیں۔ وہ بہت دُور کا چکر کاٹ کر جا رہے تھے۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ لوگ اُس جگہ اکٹھے ہونے شروع ہو گئے تھے جہاں سے شاہ بلوط کا درخت نظر آتا تھا۔ جس کم اونچی پہاڑی پر وہ درخت تھا، اُس تک وہ سیدھے

تھوڑے سے وقت میں پہنچ سکتے تھے لیکن انہیں اس پہاڑی کے پیچھے جانا تھا۔ وہ اس ہجوم سے دُور ہی دُور رہتے گئے جو اس انتظار میں وہاں جمع ہو گیا تھا کہ آج رات بھی ستارہ چمکے گا یا وہ سفید پوش آدمی روشنی میں نظر آئے گا جو ایک بار نظر آ چکا ہے۔

اسحاق، آسر اور میرا اُس ندی تک پہنچ گئے جو ان کے گاؤں کے قریب سے گزرتی تھی۔ وہاں یہ ندی گہری بھی تھی اور اس کا بہاؤ تیز بھی تھا کیونکہ یہ پہاڑی ندی تھی۔ وہاں کوئی پل نہیں تھا۔ تینوں ندی میں اُتر گئے اور بازو ایک دوسرے میں الجھا لئے۔ پانی یخ تھا اور بہت ہی تیز۔ ان کے پاؤں اٹھنے لگے۔ تینوں نے اپنا ایک ایک بازو ایک دوسرے سے آزاد کر کے تیرنا شروع کر دیا۔ پانی کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ اگلے کنارے کی بجائے پانی انہیں اپنے ساتھ لے جا رہا تھا اور پانی یخ اتنا کہ ان کے جسم اکڑنے لگے۔ ندی بہت چوڑی تو نہیں تھی لیکن یوں پتہ چلتا تھا جیسے یہ میلوں چوڑی ہو گئی ہو۔

وہ آگے جانے کی بجائے خاصا پیچھے کنارے پر لگے۔ تینوں نے کپڑے اتار دیئے اور انہیں نچوڑا۔ رات کی یخ ہوا نے ان کے جسموں کو لکڑیوں کی طرح اکڑا دیا۔ میرا کو ایسا کوئی خیال نہ آیا کہ وہ دو جواں سال آدمیوں کے سامنے برہنہ ہو گئی ہے۔ تینوں نے نچوڑے ہوئے کپڑے پہن لئے اور اسحاق کے کہنے پر تینوں نے ناچنا کودنا شروع کر دیا تاکہ جسم گرم ہو جائیں۔ میرا آخر عورت تھی۔ قدرتی طور پر اس کا جسم مردوں جیسا سخت جان نہیں تھا اس لئے اُس نے محسوس کیا کہ وہ چل نہیں سکے گی۔ اسحاق اور آسر نے اُسے اپنے درمیان کھڑا کر کے ٹخنوں سے کندھوں تک اُس کے جسم کو دبانا اور ملنا شروع کر دیا اور اس طرح کچھ دیر بعد وہ چلنے کے قابل ہو گئی۔

وہ تینوں ندی کے ساتھ ساتھ چلتے گئے۔ وہ پہاڑی قریب آ گئی تھی جس پر شاہ بلوط کا درخت تھا لیکن یہ اس پہاڑی کا ایک سرا تھا۔ شاہ بلوط کا درخت اس کے دوسرے سرے پر تھا۔ جو سرا ان تینوں کے قریب تھا وہاں یہ پہاڑی ختم ہو جاتی تھی۔ پھر وہاں سے ذرا پیچھے ہٹ کر ایک اور پہاڑی شروع ہوتی تھی۔ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سے یہ تینوں شاہ بلوط والی پہاڑی کے پیچھے جا سکتے تھے۔

وہ چلتے گئے۔ چونکہ ان کی رفتار تیز تھی اس لئے ان کے جسم گرم ہو گئے اور اکڑن ختم ہو گئی۔ انہیں یہ تو معلوم تھا کہ پہاڑی کے پیچھے جانا ہے لیکن اس علاقے میں وہ پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جس طرح دُور سے یہ خطّہ سرسبز اور خوبصورت

نظر آتا ہے اسی طرح سفر کے معاملے میں بھی یہ سہل اور خوبصورت ہو گا، لیکن آگے گئے تو انہیں پتہ چلا کہ اس خطے نے اپنے حسن میں کیسے کیسے خطرے چھپا رکھے ہیں۔

وہ جب دونوں پہاڑیوں کے درمیان پہنچے تو انہیں یوں محسوس کیا کہ وہ کسی اور ہی دنیا میں جا نکلے ہوں۔ ان کے سامنے تین طرف پہاڑیاں دیواروں کی طرح کھڑی تھیں۔ یہ دیواریں کسی پرانے قلعے کی پتھروں کی دیواروں جیسی تھیں۔ اندھیرے کے باوجود نظر آ رہا تھا کہ ان کے درمیان گدلا پانی جمع ہے۔ ایک طرف اس پانی اور دیوار کے درمیان اتنی جگہ خالی تھی کہ دو تین آدمی پہلو بہ پہلو آرام سے گزر سکتے تھے لیکن کچھ دُور آگے پتہ نہیں چلتا تھا کہ یہ راستہ آگے جاتا ہے یا پانی میں ہی کہیں ختم ہو جاتا ہے۔ یہ خوفناک سی جگہ تھی۔ صرف یہی ایک راستہ تھا جو پہاڑی کے پیچھے جاتا تھا۔ پہاڑی کے اوپر سے تو وہ جا ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ اوپر جا کر وہ نظر آ سکتے تھے۔

وہ اس راستے پر اس طرح چلے کہ میرا ان کے پیچھے تھی۔ ذرا ہی آگے گئے ہوں گے کہ انہیں اپنے پیچھے پانی میں ہلچل سی محسوس ہوئی۔ انہوں نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ اچانک میرا کی چیخ بلند ہوئی۔ اسحاق اور آسر نے پیچھے دیکھا۔ میرا گر پڑی تھی اور چیخ چلا رہی تھی۔ انہوں نے یہ دیکھ لیا کہ ایک مگرمچھ کا سر اور اگلی ٹانگیں پانی سے باہر ہیں اور میرا کا پاؤں ٹخنے تک مگرمچھ کے منہ میں ہے۔ مگرمچھ میرا کو پانی میں گھسیٹ رہا تھا۔

قدرت نے مگرمچھ کے دانت نوکیلے اور ایسے تیکھے نہیں بنائے کہ وہ انسان یا جانور کے گوشت میں اُتر جائیں۔ اُس کے دانتوں کے نیچے والے سرے گول ہوتے ہیں جو شکار کو صرف پکڑتے ہیں اور اوپر نیچے کے دانت بڑا مضبوط شکنجہ بن جاتے ہیں۔

اسحاق اور آسر نے صرف ایک بار مگرمچھ دیکھا تھا۔ وہ دونوں اُس وقت کم سن لڑکے ہوا کرتے تھے۔ دو آدمی ان کے گاؤں کے قریب سے گزرتے وہاں رک گئے تھے۔ انہوں نے ایک مرا ہوا مگرمچھ گھوڑے پر ڈال رکھا تھا۔ اسحاق اور آسر نے دیکھا تھا اور ان دونوں آدمیوں نے بتایا بھی تھا کہ مگرمچھ کے سر اور پیٹھ پر نہ برچھی اثر کرتی ہے نہ تلوار۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ اس کا پیٹ اتنا نازک ہوتا ہے کہ ایک خنجر بھی پیٹ میں اتر جاتا ہے۔ اس کا دوسرا نازک حصہ اس کا منہ ہے۔ اگر اس کے کھلے ہوئے منہ کے اندر برچھی ماری جائے تو مگرمچھ مرتا تو نہیں زخمی ہو کر بھاگ جاتا ہے یا اس کی آنکھوں میں برچھی یا تلوار ماری جائے تو بھی یہ بھاگ جاتا ہے۔

مگرمچھ میرا کو پانی میں گھسیٹ رہا تھا۔ اسحاق نے بڑی تیزی سے تلوار نکالی۔ اندھیرا تو تھا لیکن پانی کی چمک میں مگرمچھ کا ہیولا نظر آ رہا تھا۔ اسحاق نے مگرمچھ کی آنکھ کا اندازہ کر کے تلوار کا زور دار وار کیا۔ آسر نے یہ دلیری کر دکھائی کہ پانی میں اتر گیا جو اُس کے گھٹنوں تک گہرا تھا۔ اُس نے مگرمچھ کے قریب جا کر نیچے سے تلوار برچھی کی طرح مگرمچھ کے پیٹ میں اتار دی۔

یہ دونوں وار ایسے ٹھکانے پر پڑے کہ مگرمچھ کے منہ سے بڑی خوفناک آواز نکلی اور وہ میرا کا پاؤں چھوڑ تڑپتا پھڑ پھڑاتا ہوا پانی میں ڈبکی لگا گیا۔ میرا بڑی تیزی سے اٹھی۔ اسحاق اور آسر نے اسے ہاتھوں پر اٹھا لیا اور دوڑ پڑے۔ آگے انہیں راستہ ملتا گیا۔ پانی میں بڑی زور کی ہلچل ہو رہی تھی۔ یہ یقیناً زخمی مگرمچھ تھا جو تڑپ رہا تھا۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسرے مگرمچھ بھی ڈر کر اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ رہے تھے۔

یہ راستہ کچھ دُور تک چلا گیا۔ پانی پیچھے رہ گیا تھا۔ پانی سے کچھ دُور جا کر وہ رکے اور میرا کے پاؤں کا جائزہ لینے لگے۔ جس جگہ مگرمچھ نے اس کا ٹخنہ پکڑا تھا' وہاں ہاتھ پھیرا تو صاف پتہ چلتا تھا کہ خون بہہ رہا ہے۔ اگر مگرمچھ کے دانت درندوں کی طرح نوکیلے ہوتے تو میرا کی ہڈی بھی کٹ جاتی اور اُس کا پاؤں مگرمچھ کے ساتھ ہی چلا جاتا۔ چونکہ اس لڑکی کا پاؤں مگرمچھ کے جبڑوں کے شکنجے میں آیا تھا اور لڑکی زور لگا کر اپنا پاؤں کھینچ رہی تھی اور مگرمچھ اسے پانی میں کھینچ رہا تھا اس لئے لڑکی کے ٹخنے سے تھوڑی سی کھال اُتر گئی تھی اور ہڈی پر اچھی خاصی ضرب لگی تھی۔

اسحاق نے اپنے سر پر ڈالا ہوا کپڑا اتارا اور کس کر میرا کے ٹخنے پر باندھ دیا۔ میرا کے لئے درد ناقابلِ برداشت ہو رہا تھا اور وہ چلنے میں دشواری محسوس کر رہی تھی۔

"میری ایک بات غور سے سنو" — میرا نے کہا — "یہ اچھا شگون نہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ یہیں سے واپس چلے چلو"۔

"ہوش ٹھکانے رکھو میرا!" — اسحاق نے کہا — "یہاں تک آ کر ہم واپس نہیں جائیں گے"۔

"ربّی اور فادر ہمیں بزدل کہیں گے" — آسر نے کہا — "وہ کہیں گے کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں۔ بہتر تو یہ ہے کہ تم یہیں کہیں چھپ کر بیٹھ جاؤ اور ہم اپنا کام کر کے واپس آتے ہیں اور تمہیں اپنے ساتھ لے جائیں گے"۔

"نہیں!" — میرا نے خوفزدہ آواز میں کہا — "میں یہاں اکیلی نہیں رہوں گی۔ میں کہہ رہی ہوں واپس چلو۔ میں اتنا زیادہ کبھی بھی نہیں ڈری تھی"۔

"تمہیں مگرمچھ نے ڈرا دیا ہے" — اسحاق نے کہا — "یہ خوف دل سے اتار دو"۔

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں!" — میرا نے کہا — "میرے دل پر کوئی خوف نہیں۔ اگر ہم ویسے گھومنے پھرنے آئے ہوتے اور مگرمچھ مجھے یوں پکڑ لیتا تو میں اتنا نہ ڈرتی۔ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ یہ شگون اچھا نہیں۔ مگرمچھ نے کسی غیبی طاقت کے اشارے پر مجھے پکڑ لیا تھا۔ یہ تمہارے لئے اشارہ ہے کہ یہیں سے واپس چلے چلو ورنہ آگے موت ہے"۔

"اسحاق بھائی!" — آسر نے کہا — "وقت ضائع نہ کرو۔ اگر تم اس لڑکی کی باتوں میں آ گئے تو ہم اپنا کام کس طرح کریں گے۔ ربّی اور فادر کو کیا جواب دیں گے؟ تم جانتے ہو کہ انہیں ہم دونوں پر کتنا بھروسہ ہے"۔

"میری بات سنو میرا!" — اسحاق نے کہا — "تم نے ربّی کے ساتھ جو باتیں کی تھیں وہ نہ بھولو۔ تم نے کہا تھا کہ تم ہماری مدد کرو گی۔ تم نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر یہاں کوئی آدمی ہوئے تو تم انہیں اپنے حسن و جوانی کے جال میں لے لو گی۔ تمہاری ان باتوں سے متاثر ہو کر ربّی نے تمہیں ہمارے ساتھ آنے کی اجازت دی تھی۔ ربّی نے تمہیں کہا تھا کہ تم ہمارے پاؤں کی زنجیر بن جاؤ گی۔ تم وہی کام کر رہی ہو جس کا ربّی نے خدشہ پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ ہم تو اب اپنا فرض ادا کر کے ہی جائیں گے"۔

"مجھے صاف نظر آ رہا ہے اسحاق!" — میرا نے کہا — "تم یہاں سے زندہ واپس نہیں جاؤ گے"۔

اسحاق اور آسر جھنجلا اٹھے۔ اسحاق نے میرا کا بازو پکڑا اور اسے اٹھا کر کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلے۔

میرا اُس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ چلنے میں دشواری اور درد محسوس کر رہی تھی۔ [illegible] کہ ہلکی سی [illegible] کی وجہ سے اسحاق اور آسر کی رفتار بھی سست ہو گئی تھی۔ وہ اب [illegible]

میں وہ اوپر سے کسی کو نظر نہیں آ سکتے تھے۔ اس پہاڑی کے اوپر جو کچھ بھی تھا' اسے دیکھنے کے لئے پچھلی پہاڑی پر جانا ضروری تھا۔ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان کم و بیش ساٹھ قدم فاصلہ تھا۔ نیچے میدان تھا جس میں اونچی گھاس تھی اور درخت بھی تھے۔ پیچھے والی پہاڑی ایسی نہیں تھی کہ اس کی صرف ڈھلوان ہوتی۔ یہ پہاڑی اونچی نیچی چٹانوں کا جھرمٹ تھی جن پر چڑھنا ذرا دشوار تھا۔

تھوڑا اور آگے گئے تو انہیں دونوں پہاڑیوں کے درمیان روشنی سی نظر آئی جو سامنے والی پہاڑی پر کہیں اوپر تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ کسی نے آگ جلا رکھی ہے۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتے گئے، روشنی زیادہ ہوتی گئی اور اس کے ساتھ ہی انہیں کسی کی باتوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ کچھ آدمی بہت دور باتیں کر رہے تھے۔

اسحاق اور آسر نے آپس میں مشورہ کیا اور اس فیصلے پر پہنچے کہ وہیں سے پچھلی پہاڑی پر چڑھ جائیں کیونکہ پیچھے بلندی پر جا کر ہی پتہ چل سکتا تھا کہ یہ آگ کہاں جل رہی ہے اور باتیں کرنے والے کہاں ہیں۔ وہ کچھ اور آگے جا کر پچھلی پہاڑی پر چڑھنے لگے۔ وہ پہاڑی کچھ عجیب سی تھی۔ کہیں ننگی اور سیدھی کھڑی چٹان آ جاتی تھی اور کہیں دوسری پہاڑیوں کی طرح سبزہ زار اور درخت آ جاتے تھے۔ ایسی ایک چٹان پر چڑھتے چڑھتے اسحاق کا پاؤں پھسل گیا اور وہ چٹان سے گر کر نیچے والی چٹان پر جا پڑا اور وہاں سے لڑھکتا ہوا نیچے جا رکا۔

میرا اس کے پیچھے اُترنے لگی لیکن آسر نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔

"وہیں رہو!" — آسر نے کہا — "تم بھی پھسل کر گرو گی۔ وہ تو مرد ہے' برداشت کر لے گا۔ تم پہلے ہی زخمی ہو"۔

اسحاق اٹھا اُسے چوٹ تو آئی تھی لیکن وہ چوٹ سے بے نیاز پہاڑی پر چڑھنے لگا اور اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ میرا نے ایک بار پھر اپنے اسی وہم کا اظہار کیا کہ یہ دوسرا بُرا شگون ہے اور یہ کسی آسمانی مخلوق کے اشارے ہیں کہ واپس چلے جاؤ اور ان کے مظاہر میں دخل نہ دو...... اسحاق نے جیسے اُس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ وہ اس طرح پہاڑی کے اوپر اوپر چل پڑا جیسے اُس نے آسمانی مخلوق کا چیلنج قبول کر لیا ہو۔ اُس کے چلنے کے انداز میں تیر اور عتاب تھا۔

اُدھر پہاڑی سے کچھ دور لوگوں کا ہجوم اس امید پر پہاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا کہ آج پھر شاہ بلوط میں ستارہ چمکے گا یا وہ سفید پوش نظر آئے گا جو ایک بار نظر آ چکا ہے۔ تین چار دن نہ ستارہ چمکا تھا نہ سفید پوش نے جلوہ دکھایا تھا۔ یہ خبر اس علاقے میں دور دور تک پھیل گئی تھی اس لئے تماشائیوں کا ہجوم بہت ہی زیادہ ہو گیا تھا۔

اُس رات لوگوں کی مراد بر آئی۔ پہلے نقارہ بجا۔ اس کی آواز آہستہ آہستہ مدھم ہوتے ہوتے رات کی تاریکی میں تحلیل ہو گئی' پھر ایک سے زیادہ شہنائیوں کی ایسی لَے ابھری جس میں سحر انگیز سوز تھا۔ ہجوم کا شور و غل ایسے سکوت میں دم توڑ گیا جیسے وہاں کوئی ذی روح' کوئی جاندار زندہ ہی نہ ہو۔ زمین و آسمان پر' پیڑ پودوں اور پہاڑیوں پر جیسے وجد طاری ہو گیا ہو۔

لوگوں کو اندھیرے میں شاہ بلوط کیا نظر آتا' وہ پہاڑ بھی نظر نہیں آ رہا تھا جس پر وہ درخت کھڑا تھا۔ لوگ نغمے میں محو تھے کہ کئی آوازیں اٹھیں — "وہ چمکا" — اور اس کے ساتھ ہی لوگوں نے کلمہ طیبہ کا ورد شروع کر دیا۔ ایک گونج تھی جس میں وجد آفریں تاثر' محویت اور تقدس تھا۔ اس کے ساتھ رات کی تاریکی میں ہوا کی لہروں پر شہنائیوں کی تیرتی ہوئی لے ایسا سماں باندھ رہی تھی جس کا تعلق اس دنیا سے معلوم نہیں ہوتا تھا۔

ستارہ بجھ گیا اور پھر پہلے کی طرح ایک روشنی چھتری نما شاہ بلوط پر چلنے لگی' پھر یہ ایک مقام پر رک گئی اور نیچے آنے لگی۔ جیسا پہلے ایک رات ہوا تھا' روشنی نیچے آئی تو سفید پوش کا سر' کندھے اور سینہ نظر آیا۔ اُس کے بازو کچھ باہر کو اور کچھ آگے کو یوں پھیلے ہوئے تھے جیسے دعا مانگ رہا ہو۔ روشنی آہستہ آہستہ نیچے گئی اور سفید پوش کے پاؤں تک چلی گئی۔

ہجوم میں جو چند ایک سبز پوش تھے' انہوں نے کہنا شروع کر دیا — "سجدے میں چلے جاؤ..... ہمارا نجات دہندہ زمین پر اُتر آیا ہے"۔

کچھ لوگ تو پہلے ہی سجدے میں چلے گئے تھے۔ باقی بھی سجدہ ریز ہو گئے۔

لوگ سجدے سے اٹھے اور انہوں نے سامنے دیکھا۔ وہاں نہ ستارہ تھا نہ سفید پوش۔

"خدا کے ایلچی کا ظہور ہو گیا ہے" — پہاڑ کی طرف سے ایک بڑی ہی بلند آواز ہجوم تک پہنچی — "وہ دو چار دنوں میں تمہارے سامنے آ جائے گا..... خدا کا پیغام لائے

گا..... خدا کا شکر ادا کرو لوگو!"

اُس وقت جب ستارہ ابھی نہیں چمکا تھا' اسحاق ' آسر اور میرا پچھلی پہاڑی پر اتنا آگے چلے گئے تھے کہ انہیں شاہ بلوط والی پہاڑی کی پچھلی ڈھلان پر ایک خاصا کشادہ غار دکھائی دیا۔ اس کے اندر لکڑیوں کے ایک بہت بڑے ڈھیر کو آگ لگی ہوئی تھی۔ اس کے شعلے غار کی چھت تک پہنچ رہے تھے۔ اس آگ کی روشنی چونکہ پیچھے والی ڈھلان میں تھی اس لئے اس کی روشنی پہاڑی کی اُس جانب نہیں جاسکتی تھی جس جانب لوگوں کا ہجوم ستارہ دیکھنے کے لئے اکٹھا ہو گیا تھا۔

اسحاق اور اس کے ساتھیوں نے وہاں پانچ چھ آدمی گھومتے پھرتے دیکھے۔ ایک آدمی تھوڑے تھوڑے وقفے سے آگ میں لکڑیاں پھینک رہا تھا۔ غار سے کچھ دور تقریباً" ایک گز لمبی اور اسی قدر چوڑی کسی دھات کی ایک چادر سی رکھی ہوئی تھی۔ کبھی تو شک ہوتا تھا کہ یہ آئینہ ہے اور کبھی یوں لگتا جیسے یہ کسی ایسی دھات کا چادر نما ٹکڑا ہے جو آئینے کی طرح چمکتا ہے یا اس پر چاندی کا پانی چڑھایا گیا ہے یا ابرق جیسی چمکنے والی کوئی چیز چپکائی گئی ہے۔

اسحاق وغیرہ دو درختوں کے تنوں کے پیچھے کھڑے دیکھ رہے تھے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ انہیں ہر آدمی اور ہر چیز اچھی طرح نظر آرہی تھی۔

سامنے والی پہاڑی کی پچھلی ڈھلان پر شاہ بلوط کے درخت کے قریب وہ چمکتی چادر پڑی تھی۔ دو آدمیوں نے آکر یہ چادر اٹھائی اور ادھر اُدھر سے پکڑ کر ایسے زاویے پر کر لیا کہ اس کی چمک سیدھی پچھلی پہاڑی پر اُن دو درختوں پر پڑی جہاں اسحاق وغیرہ چھپے دیکھ رہے تھے۔ چمک فلڈ لائٹ جیسی تھی۔ اتنی تیز کہ ان تینوں کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ فوراً" تنوں کے پیچھے ہو گئے۔

یہ چادر رکھ دی گئی۔ ایک آدمی نہ جانے کہاں سے سامنے آیا۔ وہ سر سے پاؤں تک سفید لبادے میں ملبوس تھا۔

"چلو بھائی آجاؤ" — سفید پوش نے کہا — "اوپر کون جائے گا!؟"

ایک آدمی آگے آیا۔ اُس نے ایک جگہ سے ایک چیز اٹھائی یہ یقیناً" آئینہ تھا جس کی لمبائی تقریباً" ایک فٹ اور چوڑائی اس سے کچھ کم تھی۔ اُس نے پہلے تو یہ اپنے

سامنے کر کے یوں دیکھا جس طرح آئینہ دیکھا جاتا ہے' پھر اُس نے اسے آگ کی طرف کر کے اِدھر اُدھر ہلایا۔ اس کی چمک پہاڑی کی ڈھلان پر اسی طرح دکھائی دی جس طرح آئینہ سورج کے آگے رکھو تو سامنے کی اشیاء پر اس کی چمک دکھائی دیتی ہے۔

یہ آدمی آئینہ اٹھائے ہوئے پہاڑی پر شاہ بلوط کی طرف چڑھ گیا۔ اب وہ اندھیرے میں تھا۔ غار کی آگ کی روشنی اُس تک نہیں پہنچتی تھی۔ اسحاق اور اس کے ساتھیوں کا صرف اندازہ تھا کہ یہ آدمی درخت پر چڑھ گیا ہے۔ کچھ دیر بعد انہیں درخت کے اندر چمک دکھائی دی جو فوراً" ختم ہو گئی۔

"جانتے ہو درخت میں کیا ہو رہا ہے؟" — اسحاق نے آسر سے پوچھا۔

"تمہارے ربّی کا شک غلط نہیں نکلا" — آسر نے کہا — "میں بتا سکتا ہوں اوپر کیا ہو رہا ہے۔ اس آگ کی چمک اس آئینے پر پڑ رہی ہے جو وہ آدمی اوپر لے گیا ہے اور آئینے کی چمک اُن لوگوں کو دکھائی دے رہی ہے جو پہاڑی کے اُس طرف ہجوم کی صورت میں موجود ہیں"۔

"دیکھو آگ کتنی زیادہ ہے" — اسحاق نے کہا — "اگر اتنی آگ پہاڑی کی چوٹی پر جلائی جائے تو یہ سارا علاقہ روشن ہو جائے..... اب تصور میں لاؤ کہ شاہ بلوط کی شاخوں میں تم نے ستارہ چمکتا دیکھا ہے..... سمجھنا کوئی مشکل نہیں..... یہ سب انسان ہیں"۔

"لیکن یہ ہیں کون؟" — میرا نے پوچھا — "یہ کیسے معلوم کرو گے؟"

"ہم تین ہیں" — اسحاق نے کہا — "بلکہ ہم دو ہیں۔ میرا کو شامل نہ کرو۔ وہ پانچ چھ ہیں۔ ہم ان پر حملہ نہیں کر سکتے۔ اگر ہمارے ساتھ دو تین آدمی اور ہوتے تو کسی اور طرف سے اس پہاڑی پر جا کر ان میں سے ایک دو کو زندہ پکڑ لیتے"۔

"ٹھہرو اسحاق!" — آسر نے کہا — "وہ آدمی درخت سے اتر آیا ہے..... وہ دیکھو..... سفید پوش اوپر جا رہا ہے"۔

"میں بتاتا ہوں اب کیا ہو گا" — اسحاق نے کہا — "یہ سفید لبادے والا آدمی درخت کے نیچے جا کھڑا ہو گا اور اس پر چمکتی ہوئی دھات کی چادر کی روشنی ڈالی جائے گی۔ لوگ سمجھیں گے کہ کسی پیغمبر کا ظہور ہوا ہے"۔

ایسے ہی ہوا۔ وہ آدمی درخت کے نیچے چلا گیا۔ اُدھر وہ چادر آگ کے سامنے ایسے زاویے پر رکھی گئی کہ اس کی چمک اس آدمی پر پڑنے لگی۔ پہلے اس روشنی کو

درخت پر گھمایا گیا پھر اسے اُس آدمی پر مرکوز کر دیا گیا۔ اُدھر ہجوم نے کلمۂ طیبہ کا بلند ورد
شروع کیا تو اس کی گونج ان پہاڑیوں تک سنائی دینے لگی۔

کچھ دیر بعد یہ پلیٹ یا چادر رکھ دی گئی اور ایک آدمی انتہائی بلند آواز سے اعلان
کرنے لگا:

"خدا کے ایلچی کا ظہور ہو گیا ہے"۔

"وہ دو چار دنوں میں تمہارے سامنے آ جائے گا"۔

"خدا کا پیغام لائے گا"۔

خدا کا شکر ادا کرو لوگو"۔

○

پھر وہ سفید پوش واپس آ گیا۔

"ہم نے یہ تو دیکھ لیا ہے کہ یہ ہماری طرح انسان ہیں" ـــ اسحاق نے کہا ـــ "یہ
ہم ربّی اور فادر کو بتائیں گے۔ معلوم نہیں وہ کیا کریں گے۔ میں انہیں مشورہ دوں گا۔
جس طرح ہم تینوں یہاں تک پہنچ گئے ہیں اسی طرح کل شام بیس پچیس آدمی سامنے
والی پہاڑی کے ایک طرف چھپ کر بیٹھ جائیں اور ان سب کو موقعہ پر پکڑ لیں پھر لوگوں
کو رات کو ہی اس پہاڑی پر لے آئیں اور انہیں دکھائیں کہ یہ شیطان لوگ کس طرح
انہیں گمراہ کر رہے تھے..... مجھے یقین ہے یہ مسلمان ہیں"۔

اسحاق یہ بات کر ہی رہا تھا کہ میرا کی دلدوز اور بڑی ہی بلند چیخ سنائی دی۔ اسحاق اور
آسر نے گھبرا کر ادھر دیکھا۔ غار میں جلتی ہوئی آگ کی روشنی ان تک پہنچ رہی تھی۔ اس
روشنی میں انہوں نے دیکھا کہ جس درخت کی اوٹ میں میرا چھپی ہوئی تھی، اس کے
تنے پر ایک خاصا لمبا سانپ نیچے کو آ رہا تھا۔ میرا کا شاید ہاتھ سانپ کو لگ گیا۔ سانپ نے
اُسے بازو پر کاٹا تھا۔

اسحاق نے بڑی تیزی سے تلوار نکالی اور سانپ کے دو ٹکڑے کر دیئے۔ میرا اپنے
بازو پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئی۔ اُس کے منہ سے عجیب سی چیخیں نکل رہی تھیں۔ اسحاق اور
آسر اس کے پاس بیٹھ گئے اور دیکھنے لگے کہ سانپ نے کہاں کاٹا ہے۔ سانپ کی دہشت
نے اور میرا کی بگڑتی ہوئی حالت نے ان کے ہوش و حواس اس حد تک گم کر دیئے کہ
انہوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ سامنے والی پہاڑی پر سفید پوش اور اُس کے ساتھی ان کی

طرف دیکھ رہے ہیں اور انہوں نے ان تینوں کو دیکھ لیا ہے۔ میرا کی چیخ اتنی بلند تھی کہ
سامنے والی پہاڑی کے لوگوں نے سن لی تھی اور انہوں نے چونک کر اس طرف دیکھا
تھا۔

سانپ کا زہر میرا کے جسم میں سرایت کر رہا تھا۔ وہ تڑپنے لگی۔ تکلیف کی شدت
سے اٹھی اور چکرا کر گری اور ایسی گری کہ اوپر سے لڑھکتی ہوئی نیچے جا پڑی۔ اسحاق اور
آسر یہ فراموش کر کے کہ وہ کہاں ہیں، اس کے پیچھے بڑی تیزی سے پہاڑی سے اُترے۔
میرا تڑپ رہی تھی۔ اُس کے چہرے کا رنگ نیلا بلکہ سیاہ ہوتا جا رہا تھا اور وہ بُری طرح
تڑپ رہی تھی۔ اسحاق اور آسر اس پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"اسے اٹھاؤ اسحاق!" ـــ آسر نے کہا ـــ "کچھ تم اٹھاؤ کچھ میں اٹھاتا ہوں اور
یہاں سے نکلتے ہیں"۔

"یہ تو راستے میں مر جائے گی" ـــ اسحاق نے کہا ـــ "مر گئی تو اسے مگرمچھوں
والے پانی میں پھینک جائیں گے"۔

وہ دونوں میرا کو اٹھانے ہی لگے تھے کہ انہیں قدموں کی آہٹیں سنائی دیں۔ انہوں
نے بدک کر پیچھے دیکھا تو ان کے اوسان خطا ہو گئے۔ وہ سات آٹھ آدمیوں کے نرغے
میں آ گئے تھے۔ ان میں سفید پوش بھی تھا۔ ان میں سے کسی کے پاس تلوار تھی اور کسی
کے پاس برچھی۔ سفید پوش نے آگے بڑھ کر ان دونوں کی نیاموں میں سے تلواریں
نکال لیں۔ ان میں سے ایک اور آدمی آگے بڑھا اور اس نے ان کے کمر بندوں میں
اڑسے ہوئے خنجر بھی لے لئے۔

میرا کا تڑپنا خاصا کم ہو گیا تھا۔ اسے مرنا تھا۔ وہ ہوش میں نہیں تھی۔ غار کی آگ کی
روشنی نیچے تک آ رہی تھی۔

"انہیں اوپر لے چلو" ـــ سفید پوش نے کہا اور اسحاق اور آسر سے کہنے لگا ـــ
"اس لڑکی کو یہیں پڑا رہنے دو۔ یہ چند لمحوں کی مہمان ہے۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ اسے
سانپ نے ڈسا ہے۔ اس جگہ کے سانپ جسے ڈس لیں اسے زندہ نہیں رہنے دیا کرتے۔
یہ جوان تھی اس لئے ابھی تک اس کا جسم ذرا ذرا حرکت کر رہا ہے"۔

"کیا تم لوگ ہمیں رہا نہیں کر دیتے؟" ـــ اسحاق نے التجا کے لہجے میں کہا۔

"اگر ہم اتنے احمق ہوتے تو اتنی زیادہ مخلوقِ خدا سے یہ نہ منوا سکتے کہ شاہ بلوط کے

نیچے ایک نبی کا ظہور ہو رہا ہے"۔ — سفید پوش نے کہا — "جن کے پاس ہمارا اتنا نازک راز ہے انہیں ہم رہا نہیں کر سکتے"۔

"ہم دونوں آپ کے ساتھ ہو جائیں گے" — آسر نے کہا — "اور آپ جو بھی کام بتائیں گے کریں گے"۔

"تم کون ہو؟" — سفید پوش نے اسحاق سے پوچھا — "تمہارا مذہب کیا ہے؟ سچ سچ بتا دو تو شاید ہم تم پر رحم کر دیں"

"میرا نام اسحاق ہے" — اسحاق نے جواب دیا — "اور میں یہودی ہوں"۔

"میرا نام آسر ہے" — آسر نے کہا — "اور میں عیسائی ہوں"۔

"یہاں کیوں آئے تھے؟" — سفید پوش نے پوچھا اور کہا — "مجھے یہ نہ بتانا کہ تم دونوں اس لڑکی کو ساتھ لے کر یہاں سیر اور تفریح کے لئے آئے تھے۔ یہاں تک کوئی آدمی نہیں پہنچ سکتا۔ ایک طرف مگرمچھوں نے راستہ بند کر رکھا ہے اور دوسری طرف ایسی دلدل ہے جس میں سے کوئی گزر نہیں سکتا"۔

اسحاق نے اسے بالکل سچ بتا دیا کہ وہ دونوں یہاں کیوں آئے تھے اور یہ لڑکی کس طرح ساتھ چل پڑی تھی۔

"تمہارے ربی اور پادری کو ہم ایک سبق دیں گے" — سفید پوش نے کہا — "اب یہودیوں کا جادو نہیں چل سکتا۔ اب حسن بن صباح کا جادو چلے گا"۔

اسحاق اور آسر کو اوپر لے گئے۔ وہ اب بھی منت سماجت کر رہے تھے کہ انہیں چھوڑ دیا جائے۔ انہیں باتوں باتوں میں آگ کے قریب لے گئے۔ تپش اتنی زیادہ تھی کہ وہاں کھڑا نہیں رہا جا سکتا تھا۔ مشعلوں والے آدمی آگ پر پانی پھینکنے لگے تھے کیونکہ اب آگ کی ضرورت نہیں تھی۔ سفید پوش نے اشارہ کر کے انہیں پیچھے ہٹا دیا پھر اس نے دوسرے آدمیوں کو ایسا اشارہ دیا کہ دو تین نے اسحاق کو اور دو تین نے آسر کو پکڑ لیا اور انہیں دھکیلتے گھسیٹتے ہوئے آگ کے قریب لے گئے۔ دونوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ انہیں آگ میں دھکیلا جا رہا ہے۔ سفید پوش کے آدمیوں نے دونوں کو اتنی زور سے دھکے دیئے کہ وہ آگ میں جا پڑے۔ آگ اس قدر زیادہ تھی کہ وہ اس میں گرے اور پھر ان کی آواز بھی نہ نکلی۔

جب وہ جل کر کوئلہ ہو گئے تو سفید پوش نے مشعلوں والوں سے کہا کہ اب آگ

پر پانی پھینک دو۔ اس رات کا ناٹک ختم ہو چکا تھا اس لئے اب آگ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

○

اگلے روز شاہ در میں احمد بن عطاش اپنے خاص کمرے میں بڑی بے تابی سے حسن بن صباح کا انتظار کر رہا تھا۔ اُس نے دو بار اپنا آدمی اُسے بلانے کے لئے بھیجا تھا اور دونوں بار وہ یہ جواب لے کر آیا تھا کہ حسن رات بہت دیر سے آیا تھا اس لئے بڑی گہری نیند سویا ہوا ہے۔

وہ سفید پوش جو شاہ بلوط کے نیچے لوگوں کو نظر آتا تھا وہ حسن بن صباح ہی تھا۔ رات اسحاق اور آسر کی وجہ سے حسن کو وہاں زیادہ وقت رہنا پڑا تھا اس لئے صبح وہ دیر سے اٹھا۔ وہ جگہ شاہ در سے خاصی دور تھی۔ شاہ در سے وہاں تک یہ لوگ اونٹوں پر جاتے اور صبح طلوع ہونے سے پہلے واپس آ جاتے تھے۔ اونٹوں پر جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے قدموں کی آہٹ نہیں ہوتی۔ رات کے سناٹے میں گھوڑے کے ٹاپ دور دور تک سنائی دیتے ہیں اس لئے پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں جگہ سے ایک یا ایک سے زیادہ گھوڑ سوار گزرے تھے۔

سورج سر پر آ گیا تھا جب حسن بن صباح کی آنکھ کھلی اور وہ بڑی تیزی سے غسل وغیرہ کر کے احمد بن عطاش کے ہاں جا پہنچا۔

"آؤ حسن!" — احمد بن عطاش نے کہا — "مجھے تمہارے ساتھی بتا چکے ہیں کہ رات ایک یہودی اور ایک عیسائی نے نبی کے ظہور کا راز اپنی آنکھوں دیکھ لیا تھا...... تم نے اچھا کیا کہ دونوں کو آگ میں پھینک دیا"۔

"ان کی ساتھی لڑکی کو تو سانپ نے پہلے ہی ختم کر دیا تھا" — حسن بن صباح نے کہا — "ان دونوں آدمیوں میں جو عیسائی تھا اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس لڑکی کو پہلے ایک مگرمچھ نے پاؤں سے پکڑ لیا تھا اور ان دونوں نے تلواروں سے مگرمچھ کو زخمی کر کے لڑکی کو مگرمچھ کے منہ سے نکال لیا تھا"۔

"یہ اُس سحر کا اثر تھا جو میں نے تمہارے ہاتھوں کروایا تھا" — احمد بن عطاش نے کہا — "میں نے اس سحر میں یہ اثر پیدا کیا تھا کہ تمہارے راز تک پہنچنے والے خیریت سے نہ پہنچ سکیں اور اگر پہنچ جائیں تو تمہیں ان کی موجودگی کا اشارہ مل جائے۔ ہمارا جادو

کامیاب رہا"۔

"محترم استاد!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "میں نے اس ربّی اور پادری کا پتہ معلوم کر لیا ہے جنہوں نے ان دونوں آدمیوں کو بھیجا تھا۔ انہیں ہمیشہ کے لئے غائب کر دیا جائے تو بہتر ہے' ورنہ ان کا خطرہ موجود رہے گا کہ یہ کسی اور طرح ہمارا راز پا لیں گے۔ ہمیں یہ اطمینان ہوا ہے کہ یہ جاسوس سلجوقیوں کے نہیں تھے"۔

"ہاں حسن!" ۔۔۔ احمد بن عطاش نے کہا ۔۔۔ "ہمارا منصوبہ ایسا ہے کہ کسی سے ذرا سے بھی خطرے کا صرف شک ہی ہو' اسے بالکل ہی غائب کر دینا ضروری ہے۔ تمہارے پاس آدمی ہیں۔ انہیں استعمال کرو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم ان دونوں کو کس طرح غائب کرتے ہو"۔

"یہ میں کر کے بتاؤں گا کہ میں نے یہ کام کس طرح کیا ہے" ۔۔۔ حسن بن صباح نے ہنستے ہوئے کہا ۔۔۔ "آپ کی شاگردی میں مجھے اتنی سوجھ بوجھ مل گئی ہے کہ میں اس گاؤں کے بچوں سے بوڑھوں تک کو ایسا لاپتہ کر سکتا ہوں جیسے کبھی وہ دنیا میں آئے ہی نہیں تھے"۔

"اب میری ایک دو باتیں غور سے سنو" ۔۔۔ احمد بن عطاش نے کہا ۔۔۔ "ہمارا یہ طریقہ سو فیصد سے کچھ زیادہ کامیاب رہا ہے۔ اب تم نے ان لوگوں کے سامنے آنا ہے۔ یہ ہزاروں لوگ تمہارے مرید ہو چکے ہیں۔ اب ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ اگلے قلعے بھی ہمارے ہیں۔ یہ تمہیں میں بتاؤں گا کہ تم لوگوں کے سامنے کس طرح آؤ گے۔ دوسری بات یہ ذہن میں رکھ لو کہ سحر اور جادو پر بھروسہ نہیں رکھنا۔ بھروسہ اپنی عقل اور فہم و فراست پر کرنا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ طلسم سامری کو توڑنے والا اب کوئی موسیٰ نہیں رہا اور نہ ہی کوئی موسیٰ آئے گا لیکن یہ یاد رکھ لو کہ سحر اور جادو ہر قسم کے حالات میں تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔ اپنی عقل کا جادو چلاؤ۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو میں تمہیں بعد میں بھی سمجھاؤں گا......

"تم نے دیکھ لیا ہے کہ میری اس بات میں کتنی حقیقت ہے کہ لوگوں کو تم بدی کا سبق دو گے تو وہ تمہارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو ہم سے پہلی قوموں نے اپنے پیغمبروں کے ساتھ کیا تھا۔ لوگوں کو اپنا مرید بنانے کا طریقہ یہی ہے کہ بدی کے پُراسرار طریقے استعمال کرو جو مافوق الفطرت نظر آئیں اور جن میں ایسا تاثر ہو کہ لوگ بلا سوچے سمجھے تمہاری اسراریت سے متاثر ہو کر سجدہ ریز ہو جائیں۔ تم نے دیکھ لیا ہے ہزاروں لوگوں نے تمہارے آگے سجدہ کیا ہے...... میں پیغمبر نہیں حسن! لیکن میں آنے والے وقت کے متعلق پیشن گوئی کر سکتا ہوں کہ لوگ جادوگروں اور ساحروں کے پاس جایا کریں گے اور ان سے اپنی مشکلات حل کروائیں گے اور سحر کے ذریعے ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں گے اور کچھ لوگ لوگوں کو ساحری کا دھوکہ دے کر لوٹیں گے۔ آج کے لوگوں کی یہ کمزوری ان کی نسلوں در نسلوں تک جائے گی...... یہ باتیں بعد میں ہوں گی۔ تم اس یہودی ربّی اور عیسائی پادری کا بندوبست کرو"۔

دو ہی دن گزرے' سورج غروب ہونے کے بعد دو اجنبی اس یہودی ربّی کے ہاں گئے جس نے اسحاق کو بھیجا تھا۔ انہوں نے نہایت پُراثر انداز میں ربّی کو بتایا کہ اسحاق اور ابراہام کے دو آدمی اور میرا نام کی ایک لڑکی وہ راز معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جس کے لئے انہیں بھیجا گیا تھا لیکن ایک جگہ پھنس گئے ہیں۔ جہاں وہ پھنسے ہیں وہاں کے سرکردہ آدمی اپنے ہی ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ جب تک ربّی اور پادری خود نہیں آئیں گے' وہ ان تینوں کو نہیں چھوڑیں گے۔ وہ لوگ ہماری پوری مدد کریں گے لیکن ربّی اور پادری کا وہاں تک جانا ضروری ہے۔

ان دو آدمیوں نے زبان کے ایسے جادو چلائے کہ ربّی اور پادری اُن کے ساتھ چل پڑے۔ ان دو آدمیوں نے انہیں اپنے گھوڑوں پر سوار کر لیا تھا اور خود پیدل چل رہے تھے۔

وہ ایک اور راستے سے دو پہاڑیوں کے درمیان سے اُس جگہ پہنچے جہاں پانی جمع تھا اور ایک مگرمچھ نے میرا کا پاؤں پکڑ کر اسے پانی میں گھسیٹا تھا۔ اُس رات بھی ہزارہا لوگوں کا ہجوم شاہ بلوط والی پہاڑی سے کچھ دور اس امید پر بیٹھا تھا کہ ستارہ چمکے گا اور پیغمبر کا ظہور ہو گا لیکن اُس رات حسن بن صباح نے یہ ناٹک نہیں دکھانا تھا۔

پانی کے قریب جا کر ان دونوں آدمیوں نے ربّی اور پادری کو یہ کہہ کر گھوڑوں سے اتارا کہ گھوڑے پانی پی لیں۔ جونہی یہ دونوں مذہبی پیشوا گھوڑوں سے اترے ان دونوں آدمیوں میں سے ایک نے پادری کو اور دوسرے نے ربّی کو اتنی زور سے دھکا دیا کہ وہ پانی میں جا پڑے۔ دونوں بوڑھے تھے۔ دونوں آدمیوں کے دھکے سے وہ پانی میں خاصا دور جا پڑے تھے۔

بالکل مہمل... ست ڈوبنے لگی۔ تین چار مگرمچھ بڑی تیزی سے آئے اور ربی اور پادری کو جبڑوں میں جکڑ کر اس قدرتی تالاب کی تہہ میں لے گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ان دونوں کے جسموں کے ٹکڑے مگرمچھوں کے پیٹ میں جا چکے تھے اور وہ دونوں اجنبی گھوڑوں پر سوار شاہ در کے راستے پر جا رہے تھے۔

اس خطے کے لوگ ابلیسیت کے جال میں آ گئے تھے۔

یہودیوں کا ربّی اور عیسائیوں کا پادری جس بستی کے رہنے والے تھے اُس بستی میں ہر کسی کی زبان پر یہی سوال تھے:

"ربّی کہاں گیا؟"

"فادر کہاں گیا؟"

"اسحاق اور آسر کہاں گئے؟"

"میرا کہاں گئی؟"

چند گھروں کی یہ بستی تھی۔ ربّی اور پادری تو مذہبی پیشوا تھے، کوئی نہایت معمولی سا فرد بستی سے تھوڑی سی دیر کے لئے غیر حاضر ہوتا تو ساری بستی اُس کی غیر حاضری کو محسوس کر لیتی تھی۔ ربی اور فادر کا لاپتہ ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اسحاق، آسر اور میرا بھی اس بستی کے اہم نوجوان تھے۔ لوگ ان کے متعلق کچھ پریشان ہونے لگے۔

ایک صبح ایک مجذوب سا آدمی جس نے سبز چُغہ پہن رکھا تھا اور سر پر سبز پگڑی لپیٹی ہوئی تھی، بستی میں داخل ہُوا۔ وہ "حق ہُو، حق ہُو" کے دھماکہ خیز نعرے لگا رہا تھا۔ اُس کی داڑھی بڑی لمبی تھی سر کے بال بھی اتنے لمبے کہ شانوں سے نیچے چلے گئے تھے اور اس کی آنکھیں گوشت کی طرح سرخ تھیں۔ وہ بستی کے وسط میں جا کر رُک گیا۔ پہلے بچے اُس کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے پھر دوسرے لوگ بھی اس کے قریب آنے لگے۔

"کچھ نہیں رہے گا" ——اُس نے دایاں ہاتھ آسمان کی طرف کر کے کہا—— "سب گم ہو جائیں گے..... کچھ نہیں رہے گا..... نام و نشان مٹ جائے گا..... مانو اُسے جو روشنی دکھاتا ہے..... حق ہُو، حق ہُو"

وہ توہم پرستی اور ذہنی پسماندگی کا زمانہ تھا۔ داستان گو نے پہلے سنایا ہے کہ لوگ ہر اُس چیز کے پیچھے دوڑ پڑتے تھے جو اسراریت کے سیاہ پردوں میں ڈھکی ہوئی ہوتی تھی، اور لوگ اُسے مانتے تھے جس کی زبان میں چاشنی اور کشش ہوتی تھی۔ مانا اُسے جاتا تھا جو الفاظ اور اداکاری کا ماہر ہوتا تھا۔ اس مجذوب کے الفاظ اور اُس کا انداز ایسا تھا کہ ساری بستی اُس کے ارد گرد اکٹھی ہو گئی۔ وہ اور زیادہ اونچی آواز میں نعرے لگانے لگا۔ ایک بوڑھا آدمی آگے بڑھا۔

"کیا تو بتائے گا نہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے؟" ——بوڑھے نے اُس سے پوچھا۔

"جو مطلب نہیں سمجھے گا وہ نہیں رہے گا" ——مجذوب نے کہا۔ "سمجھو.....

لوگو! سمجھو"۔

"کیا تو ہمارے پاس بیٹھے گا نہیں؟" — بوڑھے نے پوچھا۔

"ہم سمجھنا چاہتے ہیں" — ایک اور بولا۔

"بیٹھ جا" — بوڑھے نے کہا — "ہمیں اپنی کچھ خدمت کرنے دے"۔

مجذوب وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ سب بیٹھ جائیں۔ سب اُس کے سامنے بیٹھ گئے۔

"حق ہُو، حق ہُو" — مجذوب نے آسمان کی طرف منہ کر کے ہُوک لگانے کے انداز سے نعرے لگائے اور بولا — "جو نہیں مانے وہ گم ہو گئے"۔

"تو کس کی کہہ رہا ہے کہ وہ گم ہو گئے؟" — بوڑھے نے پوچھا۔

"اس بستی کے باپ گم ہو گئے ہیں" — مجذوب نے کہا — "بچے بھی گم ہو گئے ہیں"۔

"کیا تو ہمارے پادری کی بات کرتا ہے؟" — ایک عیسائی نے پوچھا۔

مجذوب چپ چاپ آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔

"کیا تو ہمارے ربّی کی بات کرتا ہے؟" — ایک یہودی نے پوچھا۔

مجذوب پھر بھی چپ رہا۔

"کیا تیرا اشارہ میرے بیٹے اسحاق کی طرف ہے؟" — ایک آدمی نے پوچھا۔

مجذوب کچھ بھی نہ بولا۔

"کیا تو میرے بیٹے آسر کی بات کر رہا ہے؟" — ایک اور آدمی نے پوچھا۔

"میری بیٹی میرا بھی تو لاپتہ ہے" — پیچھے کھڑی ایک عورت بولی۔

"ان سب کی بات ایک ہے" — مجذوب بولا — "وہ نہیں مانتے تھے..... اور وہ جو تمہارے مذہبی باپ تھے، وہ بھی نہیں مانتے تھے..... سب گم ہو گئے ہیں"۔

"کیا نہیں مانتے تھے؟" — بوڑھے نے پوچھا۔

"اُسے نہیں مانتے تھے جو روشنی میں سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ اُس روشنی کو بھی نہیں مانتے تھے جو خدا اپنے بندوں کو دکھاتا ہے"۔

وہ یک لخت اٹھ کھڑا ہوا اور پھر "حق ہُو، حق ہُو" کے دھماکہ نما نعرے لگاتا ایک طرف چل پڑا۔

"وہ آ رہا ہے" — وہ کہتا جا رہا تھا — "وہ اُتر رہا ہے۔ جو نہیں مانے گا وہ گم ہو جائے گا"۔

لوگ کچھ دور تک اُس کے پیچھے گئے۔ وہ چلتا گیا۔ آگے ایک گھاٹی آ گئی جو ندی میں اترتی تھی۔ مجذوب گھاٹی اتر کر ندی میں چلا گیا اور پانی میں یوں چلتا گیا جیسے میدان میں جا رہا ہو۔ درمیان میں پہنچا تو پانی اس کے سینے تک گہرا ہو گیا پھر بھی وہ اس طرح چلتا گیا جیسے میدان میں چل رہا ہو۔ لوگ اوپر کھڑے اسے دیکھتے رہے اور وہ ندی پار کر کے چلا گیا۔ اپنے پیچھے وہ ایک دہشت اور تذبذب کی کیفیت چھوڑ گیا۔

وہ جب نظروں سے اوجھل ہو گیا تو لوگ واپس ہونے لگے۔ اُن پر خاموشی طاری تھی۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بات کرنے سے ڈر رہے تھے۔ اگر ان کے دونوں مذہبی پیشوا موجود ہوتے تو وہ ان سے پوچھتے کہ یہ سب کیا ہے لیکن مذہبی پیشوا ہی تو لاپتہ ہو گئے تھے۔

"ربّی اور فادر کہتے تھے کہ یہ جو روشنی نظر آتی ہے یہ سب ایک پُراسرار ڈھونگ ہے" — بستی میں آکر بوڑھے نے کہا — "میں تو کہتا ہوں کہ انہیں اسی کی سزا ملی ہے"۔

"میں راز کی ایک بات بتاتا ہوں" — ایک جواں سال آدمی بولا — "اسحاق میرا گہرا دوست تھا۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ میں کسی کو نہ بتاؤں۔ اُسے اور آسر کو ربّی اور فادر نے کہا تھا کہ وہ اس پہاڑی کے پیچھے جائیں جس پر یہ روشنی اور پھر روشنی میں ایک سفید پوش نظر آتا ہے۔ میرا بھی ان کے ساتھ گئی تھی"۔

"اس پہاڑی کے پیچھے؟" — ایک اور معمر آدمی نے کہا — "کیا کبھی کسی سے سنا ہے کہ کوئی اس پہاڑی کے پیچھے گیا ہے۔ کبھی کوئی گیا ہے تو اُسے کسی نے واپس آتا نہیں دیکھا۔ وہ موت کی وادی ہے۔ وہاں خونخوار اور آدم خور مگرمچھ ہیں، وہاں اتنے زہریلے سانپ ہیں کہ ڈستے ہیں تو پلک جھپکتے آدمی مر جاتا ہے۔ زمین پر سانپ، درختوں پر سانپ، پانی میں سانپ، وہاں تو کوئی جنگلی جانور اور کوئی درندہ بھی نہیں جاتا"۔

"اب بات سمجھ میں آتی ہے" — دوسرے بوڑھے نے کہا — "اگر روشنی انسان دکھاتے ہیں اور روشنی میں ظاہر ہونے والا سفید پوش بھی انسان ہے تو وہ اس پہاڑی پر جاتے کدھر سے ہیں؟..... نہیں..... وہ انسان نہیں ہو سکتے"۔

"میں مانتا ہوں" ـــ ایک اور آدمی بولا ـــ "وہ انسان نہیں ہو سکتے۔ کیا تم نے سنا نہیں کہ جس سانپ کی عمر ایک سو سال ہو جاتی ہے وہ انسان کے روپ میں آجاتا ہے؟... میں کہتا ہوں یہ انسانوں کے روپ میں سانپ ہیں' اور روشنی میں وہ جو سفید پوش نظر آتا ہے وہ شیش ناگ ہو گا"۔

کچھ لوگوں نے اس آدمی کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جن میں تائید تھی اور خوف بھی۔

"لوگ کہتے ہیں یہ ایک اور نبی ہے" ـــ معمر آدمی نے کہا ـــ "اُسے صرف ہم ہی نہیں دیکھ رہے' یہ ہزارہا لوگ اتنی دُور دُور سے آکر اسے دیکھ رہے ہیں۔ وہ ظاہر ہوتا ہے تو سب سجدے میں چلے جاتے ہیں۔ تم نے وہاں درویش صورت انسان دیکھے ہوں گے' وہ بھی سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ یہ سمجھ لو کہ یہ کوئی نیا عقیدہ یا نیا پیغام آرہا ہے۔ اس کی کوئی مخالفت نہ کرے ورنہ پوری بستی کو نقصان ہو گا"۔

○

یہ کیفیت صرف اس بستی میں ہی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ لوگ خوفزدہ بھی تھے اور "روشنی والے" کے منتظر بھی۔ ان علاقے میں جتنی بستیاں تھیں' ان سب میں یہی کیفیت تھی۔ یہ مجذوب جو اس بستی میں گیا تھا' کئی اور بستیوں میں گیا اور اپنے مخصوص مجذوبانہ انداز میں یہ خبر سناتا گیا کہ ایک عیسائی اور ایک یہودی مذہبی پیشوا نے روشنی والے کے خلاف بات کی تھی اور دونوں کو آسمان کی غیر مرئی مخلوق اٹھا کر لے گئی ہے۔

اور ایک روز "وہ" زمین پر اُتر آیا۔

داستان گو پہلے سنا چکا ہے کہ جس پہاڑی پر شاہ بلوط کا درخت تھا' اس کے سامنے وسیع و عریض میدان میں جو سرسبز تھا اور جہاں درختوں کی بہتات تھی' خیموں کی ایک بستی آباد ہو گئی تھی۔ یہ قبیلوں کے سرکردہ افراد اور سرداروں کے خیمے تھے۔ ہزاروں لوگ کھلے آسمان کے نیچے وہاں موجود رہتے تھے۔

ایک صبح لوگ جاگے تو انہوں نے دیکھا کہ پہاڑی کے دامن میں جو ٹیکری تھی' اس پر پلنگ کی طرح کا ایک تخت رکھا تھا۔ اس کے پائے رنگین اور خوشنما تھے۔ اس پر بڑا قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ ٹیکری ہری بھری تھی۔ تخت کے دائیں' بائیں اور پیچھے درخت تھے۔ ان درختوں کے ساتھ پھولدار بیلیں باندھ کر خوشنما چھت بنا دی گئی تھی۔

لوگوں نے دیکھا تو وہ آہستہ آہستہ اُس طرف چل پڑے۔ وہاں ابھی کوئی آدمی نظر نہیں آرہا تھا۔ لوگ جب قریب پہنچے تو ٹیکری پر ایک آدمی نمودار ہُوا۔ وہ عقب سے اوپر چڑھتا آرہا تھا۔ اُس کے ایک ہاتھ میں برچھی اور دوسرے ہاتھ میں سبز جھنڈا تھا۔ اُس کا لباس شاہی چوبداروں جیسا تھا۔ تخت کے ایک طرف سے گذرتا وہ تخت سے آگے آکر لوگوں کی طرف منہ کرکے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے جھنڈا ٹیکری پر گاڑ دیا۔

"وہ جو معبودِ برحق ہے' آرہا ہے" ـــ چوبدار نے بڑی ہی بلند آواز میں اعلان کیا۔ "خوش نصیب ہو تم کہ وہ تمہارے سامنے آرہا ہے۔ وہ آئے تو سجدے میں چلے جاؤ"۔

لوگوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔

"قبیلوں کے سردار آگے آجاؤ" ـــ چوبدار نے اعلان کیا ـــ "سرکردہ آدمی سب سے آگے آکر بیٹھ جاؤ"۔

لوگوں میں سے کئی ایک آدمی آگے چلے گئے اور بیٹھ گئے۔ ان کے لباس اور رنگ ڈھنگ بتا رہے تھے کہ وہ سرکردہ افراد ہیں۔

ہوا کچھ تیز چل رہی تھی۔ ٹیکری پر چھ آدمی نمودار ہوئے۔ ان کے لباس معمولی سے تھے۔ وہ ملازم لگتے تھے۔ ہر ایک نے ایک ایک دیگچہ نما برتن اٹھا رکھا تھا۔ وہ ٹیکری اتر آئے اور ہجوم کے اُس پہلو کو چلے گئے جدھر سے ہوا آرہی تھی۔ انہوں نے یہ برتن تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکھ دیئے۔ یہ لوگوں سے دور رکھے گئے تھے۔ پھر ان میں آگ لگا دی گئی لیکن شعلہ کسی میں سے بھی نہ نکلا۔ ہر برتن میں سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھنے لگا۔ ہوا کا رخ لوگوں کی طرف تھا اس لئے یہ دھواں ہجوم میں سے گذرنے لگا۔

وہ آدمی وہیں کھڑا رہے۔

"خدا کی رحمتیں نازل ہو رہی ہیں" ـــ ٹیکری سے چوبدار کی آواز آئی۔

لوگوں نے ایسی خوشبو محسوس کرنی شروع کر دی جو انہوں نے پہلے کبھی نہیں سونگھی تھی۔ پُرکیف اور روح پرور خوشبو تھی۔ یہ اُس دھوئیں کی خوشبو تھی جو برتنوں سے اٹھ رہا تھا۔

نقارہ بجنے لگا اور اس کے ساتھ تین چار شہنائیوں کی لَے اُبھری۔ یہ صحرائی نغمے کی لَے تھی جس میں وجد طاری کر دینے والا سوز تھا۔ تخت کے عقب سے ایک آدمی

بکھرنے لگا جو ایک شاہانہ کرسی پر بیٹھا تھا۔ کرسی اس آدمی کو اٹھائے اوپر ہی اوپر اٹھتی آئی پھر چار آدمیوں کے سر ابھرے اور فوراً ہی یہ چاروں آدمی پورے اوپر آ گئے۔ کرسی بڑی تھی اور چوڑی تھی۔ ان چار آدمیوں نے کرسی کو اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ چاروں آدمی عربی لباس میں ملبوس تھے اور جو کرسی پر بیٹھا تھا' لباس اُس کا بھی عربی تھا لیکن کپڑا ریشمی اور چمکدار تھا۔

"سجدہ!" — ایک آواز گرجی — "سجدہ!"

وہاں جتنے لوگ تھے' سب سجدہ ریز ہو گئے۔

چار آدمیوں نے بڑے آرام سے کرسی تخت پر رکھ دی جس پر قالین بچھا ہُوا تھا۔ کرسی پر جو بیٹھا ہُوا تھا' وہ بادشاہ لگتا تھا۔ داڑھی سلیقے سے تراشی ہوئی تھیں۔ اُن کے چہرے کا رنگ سفیدی مائل گندمی تھا۔ نقش و نگار میں مردانہ حسن' آنکھوں میں ایسی چمک اور ایسا تاثر کہ کوئی بڑی مضبوط شخصیت والا ہی ان آنکھوں کا سامنا کر سکتا تھا۔ زیرِ لب تبسم چہرے کی جاذبیت میں اضافہ کرتا تھا۔

اس نے سجدہ ریز ہجوم پر نگاہ دوڑائی۔ اس کا زیرِ لب تبسم مسکراہٹ کی صورت کھل گیا۔ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا کہ لوگ سجدے سے اٹھیں۔

"اللہ اکبر" — ایک آواز گرجی۔

ہجوم نے سجدے سے سر اٹھائے۔ ہجوم میں عیسائی بھی' یہودی بھی اور مسلمان بھی تھے اور چند ایک بے دین بھی تھے۔ اللہ اکبر کا مطلب یہ تھا کہ یہ جو شاہانہ مسند پر بیٹھا ہے' مسلمان ہے۔ پھر بھی سب لوگ اسے دیکھنے اور اسے سننے کو بیتاب ہوئے جا رہے تھے۔ اسلام کے سب سے بڑے دشمن یہودی تھے لیکن اللہ اکبر کی صدا پر ان کے دلوں میں تعصب نے سر نہیں اٹھایا تھا۔

لوگ اپنے آپ میں ایک پُرلطف سی تبدیلی محسوس کر رہے تھے۔ اُن کے دلوں سے خوف نکل گیا تھا۔ وہ ہلکے پھلکے ہو گئے تھے۔ اُن کے دلوں میں پیار اور محبت کی لہریں اٹھنے لگی تھیں۔

○

وہ جو شاہانہ کرسی پر بیٹھا ہُوا تھا وہ حسن بن صباح تھا۔ وہ اٹھا اور اپنے دونوں بازو پھیلا دیئے۔

"میں تم میں سے ہوں" — اُس نے کہا — "میری روح اُس نور سے پیدا ہوئی ہے جو تم شاہ بلوط کے درخت میں دیکھتے رہے ہو..... میں تم میں سے ہوں..... مجھے خدا نے اپنا ایلچی منتخب کیا ہے۔ میں تمہارے لئے خدا کا پیغام لے کر آیا ہوں لیکن ابھی پورا پیغام سنانے کا وقت نہیں آیا۔ ابھی اتنی سی بات بتاؤں گا کہ خدا کا منشا ہے کہ اُس کی زمین پر اُس کے بندوں کی حکومت ہو۔ جس طرح خدا نے فرعونوں کا خاتمہ کر دیا تھا اسی طرح خدا بادشاہوں کا خاتمہ کرنا چاہتا ہے۔ اللہ کی رضا اب اس میں ہے کہ کھیتی کا پورا حق اُسے ملے جو اس میں ہل چلاتا اور بیج پھینکتا ہے..... خدا نے مجھے اپنی رضا کی تکمیل کے لئے تمہارے درمیان اتارا ہے..... کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے جیسے بندوں کی غلامی سے آزاد ہو جاؤ؟"

"ہاں..... ہاں!" — ہجوم سے بے شمار آوازیں اٹھیں — "ہم آزاد ہونا چاہتے ہیں"۔

"لیکن یہ کام آسان نہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "تمہیں متحد ہو کر میرے پیچھے چلنا پڑے گا"۔

"ہم تمہارے پیچھے چلیں گے" — ہجوم سے پُرجوش آوازیں اٹھیں۔

"یاد رکھو" — حسن بن صباح نے کہا — "تم یہ وعدہ میرے ساتھ نہیں' اُس خدا کے ساتھ کر رہے ہو جس نے مجھے ایلچی بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے۔ تم وعدے سے پھر گئے تو تم پر خدا کا عذاب نازل ہو گا۔ اگر تم نے خدا سے وعدہ نبھایا تو تم دنیا میں جنت دیکھ لو گے"۔

"ہم خدا کو ناراض نہیں کریں گے" — ہجوم میں سے آوازیں اٹھیں۔

یہ حسن بن صباح کی رُونمائی تھی۔ اس روپ میں وہ پہلی بار لوگوں کے سامنے آیا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ اتنا بڑا ہجوم اُس کا ہمنوا ہو گیا ہے تو اُس نے نہایت پُراثر الفاظ میں وعظ شروع کر دیا۔ مؤرخوں کا بیان ہے کہ حسن بن صباح کی اس تقریر میں زبان کا جادو اور خطابت کا کمال تھا' علم و فضل کا نام و نشان نہ تھا۔ وہ لوگوں کے دلوں کی بات کر رہا تھا۔

لوگوں کو اُس کے اندازِ خطابت نے تو متاثر کرنا ہی تھا کیونکہ اس فن میں اُس نے کمال حاصل کیا تھا' لوگوں کے ذہنوں کو اُس نے اس دھوئیں کے ذریعے بھی اپنے قابو

میں کر لیا تھا جو دیگچہ نما برتنوں سے اٹھ رہا تھا۔ یہ ایک یا ایک سے زیادہ جڑی بوٹیوں کی دھونی تھی جن کے اثرات ویسے ہی تھے جیسے آج کل مسکّن (ٹرانکولائزر) گولیوں کے ہوتے ہیں۔ حسن بن صباح نے آگے چل کر قلعہ الموت میں جو جنت بنائی تھی اُس میں ان جڑی بوٹیوں کا بے دریغ استعمال ہوا تھا۔

بعض مؤرخوں نے یہی لکھا ہے کہ اُس نے ہجوم پر اس دھونی کا نشہ طاری کر دیا تھا لیکن دو مؤرخوں نے لکھا ہے کہ وہاں پانی کے بہت سے مٹکے رکھ دیئے گئے تھے جن میں تھوڑا سا سرور پیدا کرنے والی دوائی ملا دی گئی تھی اور لوگوں سے کہا گیا تھا کہ اس پانی میں آبِ کوثر ملا ہوا ہے' سب یہ پانی پئیں۔ لوگوں پر اس پانی نے ایسا نشہ طاری کر دیا تھا کہ ان کے ذہن حسن بن صباح کے ایک ایک لفظ کو دل و جان سے قبول کرتے جا رہے تھے۔

البتہ تاریخوں میں یہ واضح طور پر لکھا گیا ہے کہ حسن بن صباح نے قبیلوں اور بستیوں کے سرکردہ افراد اور سرداروں کو پہلے ہی الگ کر لیا تھا۔ اُس نے لوگوں کے ہجوم کو وہاں سے چلتا کیا اور سرداروں وغیرہ کو اوپر ٹیکری پر بلا لیا۔ ٹیکری کے اوپر جگہ اتنی سرسبز اور خوشنما تھی جیسے انسانوں نے اپنے بادشاہ کے بیٹھنے کے لئے یہ جگہ بڑی محنت سے تیار کی ہو۔

ان سرکردہ افراد کی تعداد کوئی زیادہ نہیں تھی' بارہ چودہ ہی تھے۔ انہوں نے حسن بن صباح کے سامنے جا کر اس طرح تنظیم دی کہ رکوع کی حالت میں چلے گئے۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ کی کہ یہ کوئی انسان ہے یا آسمان سے اُتری ہوئی مخلوق ہے یا یہ کوئی فریب کار ہی تو نہیں۔ یہ سب اس سے مرعوب ہو گئے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جڑی بوٹیوں کی دھونی کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں پر قبضہ کیا گیا تھا لیکن حسن بن صباح کے پاس لوگوں پر چھا جانے کا ایک ذریعہ اور بھی تھا۔ یہ تھا سحر یعنی جادو۔ اس کے استاد اور پیرو مرشد نے اسے سحر کاری کی خصوصی تربیت دی تھی۔ بعض مؤرخوں نے وثوق سے لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے لوگوں کے ہجوم پر نظر ڈالی تو تمام کا تمام ہجوم ہپناٹائز ہو گیا تھا۔ سردار وغیرہ اوپر گئے تو وہ بھی ہپناٹائز کر دیئے گئے تھے۔ اسے اجتماعی ہپناٹائزم کہا جاتا ہے۔

حسن بن صباح کی ابلیسیّت کی داستان کو بعض لوگ محض افسانہ سمجھتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں یقین نہیں آتا کہ ایک انسان کی ایسی فریب کاری جو لاکھوں انسانوں کو اپنی زد میں لے لے اور لوگ اسے پیغمبر تسلیم کر لیں' من گھڑت قصہ ہی ہو سکتی ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ حسن بن صباح اور اس کے گروہ کے بعض کارنامے اور کمالات ایسے ہیں جو قابلِ یقین نہیں لگتے لیکن حسن بن صباح نے جو ذرائع استعمال کئے تھے وہ حیران کن کمالات دکھا سکتے تھے۔ سحر کاری اُس دور میں کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ اتنا ضرور ہے کہ اُس دور میں سحر یا کسی بھی قسم کا جادو ہر کسی کے ہاتھ میں نہیں آ سکتا تھا۔ مثال کے طور پر فرعونوں کے پاس جادوگر موجود تھے۔ یہودیوں نے اس فن میں کمال حاصل کیا لیکن یہ فن ایسا عام اور سہل نہیں تھا کہ ہر کوئی سیکھ لیتا۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حسن بن صباح کے ہاتھ کوئی ایسی جڑی بُوٹی لگ گئی تھی جس کی بُو یا دھونی انسان کو بڑے دلکش تصورات میں لے جاتی تھی' مثلاً" اس بُوٹی کی بُو کے زیرِ اثر کوئی آدمی کنکریاں اور مٹی کھا رہا ہوتا تو وہ پورے یقین کے ساتھ یہ سمجھتا تھا کہ وہ من و سلویٰ کھا رہا ہے۔ پتھروں پر لیٹ کر اُسے نرم و گداز بستر کا لطف آتا تھا۔

آگے چل کر جب داستان کو آپ کو حسن بن صباح کی جنّت میں لے جائے گا تو آپ دیکھیں گے کہ وہ جنّت کس طرح آباد کی گئی تھی۔ وہ ایک جہنم تھا جسے لوگ جنّت سمجھتے تھے۔

یہ بھی انسانی فطرت کی ایک حقیقت ہے کہ انسانی ذہن نیکی کو سوچ سوچ کر اور خاصا وقت لگا کر قبول کرتا ہے لیکن بدی کی دلکشی کو وہ فوراً" قبول کر لیتا ہے۔ کوئی بھی انسان اپنے آپ میں ابلیسی اوصاف پیدا کرنے شروع کر دے اور ذرا سی بھی اچھائی کو قبول نہ کرے تو تھوڑے سے وقت میں وہ مکمل ابلیس بن جاتا ہے۔ اُس کی زبان میں ایسی چاشنی پیدا ہو جاتی ہے جو پتھروں سے بھی دودھ نکال لیتی ہے۔ ایسا شخص جھوٹ کا سہارا لیتا ہے اور اتنی خوبصورتی سے جھوٹ بولتا ہے کہ لوگ دل و جان سے اُس کے جھوٹ کو سچ مان لیتے ہیں۔ مختصریات یہ ہے کہ انسان انسانیت کے درجے سے دستبردار ہو جائے اور یہ ذہن میں بٹھا لے کہ وہ اشرف المخلوقات نہیں تو وہ شخص شیطانیت کے میدان میں معجزہ کر کے دکھا سکتا ہے۔ جو شخص اپنی ماں بہن' بہو بیٹی کی عزت اور آبرو سے دستبردار ہو جائے وہ حیران کن کارنامے کر کے دکھا سکتا ہے۔

اگر بات حسن بن صباح کی نفسیات کی لے بیٹھیں تو اسی پر ایک کتاب لکھی جا سکتی ہے لیکن بات سمجھانے کے لئے بہتر یہ ہے کہ واقعات بیان کر دیئے جائیں اور یہ پڑھنے والے پر چھوڑ دیا جائے کہ وہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ یہ سب کیا تھا۔ سمجھنے والی اصل بات یہ ہے کہ حسن بن صباح اور اُس کے استادوں اور اُس کے گروہ کا وجود اور ان کی یہ طلسماتی کارستانیاں اسلام کی سچائی پر بڑا ہی شدید حملہ تھا اور اسلام کے لئے یہ بڑا چیلنج جو صلیبیوں کے چیلنج سے بھی بڑا اور خطرناک تھا۔

صلیبی تو میدان میں آکر لڑے تھے' انہوں نے زمین دوز کارروائیاں اگر کی تھیں تو وہ اتنی سی تھیں کہ انہوں نے اپنی اور یہودیوں کی انتہائی خوبصورت لڑکیاں جاسوسی اور اخلاقی تخریب کاری کے لئے مسلمان امراء اور سالاروں کے درمیان مسلمان لڑکیوں کے روپ میں چھوڑ دی تھیں۔ اس کے برعکس حسن بن صباح جو اسماعیلی مسلک کا علمبردار تھا' اس لئے خطرناک تھا کہ وہ میدان میں لڑنے والا نہیں تھا۔ اُس کے حربے اتنے حسین تھے جنہیں نہ صرف عام لوگ بلکہ ذمہ دار لوگ بھی قبول کر لیتے تھے۔

○

اب داستان گو کے ساتھ آئیں وہ آپ کو اُس ٹیکری پر لے چلتا ہے جہاں بارہ چودہ سرکردہ افراد حسن بن صباح کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ لوگوں کے ہجوم کو حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ بہت دور چلے جائیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہ سرکردہ افراد مرعوبیت کی کیفیت میں تھے اور ان پر دھونی کا اور حسن بن صباح کی نظروں کا بھی اثر تھا۔ ان پر مجموعی طور پر ایسی کیفیت طاری تھی جیسے وہ اس لئے سانس لے رہے ہیں کہ حسن بن صباح سانس لے رہا تھا۔ اگر حسن بن صباح کے سانسوں کا سلسلہ رک جاتا تو یہ لوگ بھی اپنی سانسیں روک لیتے۔

"تم ان لوگوں کے سردار ہو" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "یہ گھوڑے ہیں اور یہ مویشی ہیں۔ تم جدھر چاہو انہیں ہانک کر لے جا سکتے ہو۔ میں تمہارے لئے اور خلوقِ خدا کے لئے خوش بختی اور خوش حالی لے کر آیا ہوں۔ آج تک جتنے مذہب آئے ہیں انہوں نے انسانوں کو نظریئے' عقیدے اور پابندیاں دی ہیں لیکن خوش بختی اور خوشحالی کوئی مذہب نہیں دے سکا۔ مذہب صرف اسلام ہے لیکن اسلام بھی تم تک صحیح شکل میں نہیں پہنچا۔ میں تمہیں اس عظیم مذہب کی صحیح شکل دکھا رہا ہوں۔ تم نے صرف یہ

کرنا ہے کہ اپنے اپنے قبیلے کو لگام ڈال کر اُس راستے پر چلانا ہے جو راستہ خدا نے مجھے دکھا کر زمین پر اتارا ہے"۔

حسن بن صباح نے اسماعیلی مسلک کی تبلیغ شروع کر دی اور ان سرداروں کو ایسے سبز باغ دکھائے کہ وہ اس کے قائل ہو گئے۔

"اب تمہارے پاس میرے مبلّغ آئیں گے" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "تمہارا فرض ہے ان مبلّغوں کی مدد کرنا اور لوگوں کو اس مسلک پر متحد کرنا ..... کیا تم یہ کام کرو گے؟"

"ہاں اے قابلِ احترام ہستی!" ـــــ ایک معمر سردار نے کہا ـــــ "ہم یہ کام کریں گے"۔

"ہم تمہارے حکم پر جانیں قربان کر دیں گے"۔

"ہمیں آزما کے دیکھ!"

ایسی ہی آوازیں تھیں جو ان بارہ چودہ سرداروں کے سینوں سے پُرجوش طریقے سے نکلیں۔ حسن بن صباح پہلی ہی بار بغیر کسی دِقّت کے کامیاب ہو گیا۔ یہ صرف اس علاقے اور چند ایک بستیوں کا معاملہ تھا۔ اگلے ہی روز اُس نے چند ایک مبلّغ جنہیں احمد بن عطاش نے پہلے ہی تیار کر رکھا تھا' ان بستیوں میں پھیلا دیئے اور ایک نئے فرقے کی تبلیغ شروع ہو گئی۔

لوگ یہ مطالبہ کرنے لگے کہ حسن بن صباح ان کے علاقے میں آئے' اپنی زیارت کرائے اور انہیں خدا کی باتیں سنائے۔ حسن بن صباح ایک اور علاقے میں اسی شان و شوکت سے جس شان و شوکت سے اس نے پہلی بار زیارت کروائی تھی ایک اور علاقے میں بڑے ہی ڈرامائی اور پُراسرار طریقے سے اپنی زیارت کروائی۔ اُس کی شہرت دُور دُور تک پہنچ گئی تھی۔ لوگوں نے حسبِ عادت اس کے متعلق ایسی ایسی باتیں مشہور کر دیں تھیں جو محض زیبِ داستان تھیں۔

بھولے بھالے لوگوں نے جب بھی دھوکہ کھایا ہے وہ اپنی اسی فطری عادت کی وجہ سے کھایا ہے کہ جس سے متاثر ہوئے اُسے پیغمبری کا درجہ دے دیا اور اُس کی عام سی باتوں کو اس طرح پھیلایا جیسے یہ باتیں ان سے براہِ راست خدا نے کی ہوں۔ لوگ ان کے من گھڑت معجزے بھی بیان کرتے ہیں۔ یہ پسماندگی کے اُس دور میں بھی ہوا اور یہ

آج بھی ہو رہا ہے جب انسان ترقی کی انتہائی بلندیوں پر پہنچ گیا ہے۔

پاکستان کے پیر اور عامل حسن بن صباح کے پیروکار ہیں۔ اپنے مریدوں اور اپنے سائلوں کو خیالی جنّت دکھا کر ان کے مال و دولت اور ان کی عزت و آبرو بھی لُوٹ لیتے ہیں۔

○

داستان گو پہلے سنا چکا ہے کہ قلعہ شاہ در پر احمد بن عطاش نے کس طرح قبضہ کیا تھا۔ اب آگے ایک اور قلعہ تھا جس کا نام خلجان تھا۔ اس قلعے کے امیر کا نام صالح نمیری تھا۔ اُس وقت اُس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ وہ بہت دنوں سے سن رہا تھا کہ اس علاقے میں ایک شخصیت کا ظہور ہُوا ہے۔ شاہ بلوط کے درخت میں چمکنے والے ستارے کے متعلق بھی خبریں صالح نمیری تک پہنچی تھیں۔

یہ ساری باتیں خلجان کے لوگوں تک بھی پہنچی تھیں اور کئی لوگ اس جگہ آئے بھی تھے جہاں ستارہ دیکھنے کے لئے لوگ موجود رہتے تھے۔ حسن بن صباح جب لوگوں کے سامنے آیا تو خلجان کے کچھ لوگ اُس کی زیارت کو آئے تھے۔ وہ بھی وہی مرعوبیت لے کر گئے تھے جو ہر کسی پر طاری ہو گئی تھی۔ انہوں نے خلجان میں جا کر لوگوں کو ایسے دلفریب انداز میں حسن بن صباح کا ظہور اور اس کی باتیں سنائیں کہ لوگ حسن بن صباح کو دیکھنے کے لئے بے تاب ہونے لگے۔ کچھ اور لوگ حسن بن صباح کی زیارت کو چل پڑے۔

صالح نمیری اپنے دوستوں اور مشیروں سے پوچھتا رہتا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ ابتدا میں اُسے یہی بتایا جاتا رہا کہ یہ کوئی ویسا ہی آدمی معلوم ہوتا ہے جیسے پہلے بھی نبی اور پیغمبر بن کر آ چکے ہیں۔ یہ کوئی نیا نبی ہو گا لیکن شہر میں حسن بن صباح کے چرچے اتنے زیادہ ہونے لگے کہ یہ آوازیں صالح نمیری کے کانوں تک پہنچیں۔ اُس نے اپنے مشیروں کو بلایا۔

"یہ میں کیا سن رہا ہوں" — صالح نمیری نے کہا — "مجھے اطلاع ملی ہے کہ شہر کے بچے بچے کی زبان پر اس کا نام ہے جو آسمان سے اُترا ہے اور اُس کی روح میں ستاروں کی روشنی ہے"۔

"ہاں آقا!" — ایک مشیر نے کہا — "آپ کو جو خبریں ملی ہیں وہ بالکل ٹھیک

ہیں۔ لوگ اُسے دیکھ بھی آئے ہیں۔ بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ زمین کی نہیں آسمان کی مخلوق ہے"۔

"ایک خبر میں نے بھی سنی ہے" — محفل میں بیٹھے ہوئے ایک اور آدمی نے کہا — "میں نے سنا ہے کہ اس کے مبلّغ اس سارے علاقے میں پھیل گئے ہیں، اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ اس کے دو تین مبلّغ کل یہاں بھی پہنچ رہے ہیں"۔

"خیال رکھو" — صالح نمیری نے حکم کے لہجے میں کہا — "یہ مبلّغ آئیں تو انہیں سیدھا میرے پاس لے آؤ۔ شہر کا کوئی شخص ان مبلّغوں کو اپنے گھر میں جگہ نہ دے۔ بہتر ہے اعلان کرا دو کہ مبلّغ سب سے پہلے والئ قلعہ سے ملے بغیر کسی کے ساتھ بات نہ کریں"۔

"حکم کی تعمیل ہو گی آقا!" — اس آدمی نے کہا — "ہم خود بھی ان مبلّغوں کو لوگوں سے دور رکھنا چاہیں گے۔ پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ یہ ہیں کون اور یہ کس عقیدے اور کس مسلک کی تبلیغ کر رہے ہیں"۔

"یہ اسلام کا ہی کوئی اور فرقہ پیدا ہو گیا ہو گا" — صالح نمیری نے کہا — "میں تمہیں سختی سے کہتا ہوں کہ کسی اور فرقے کو سر اٹھانے کی اجازت نہیں ہو گی۔ اسلام چھوٹے چھوٹے فرقوں میں تقسیم ہوتا جا رہا ہے اور سلطنتِ اسلامیہ چھوٹی چھوٹی بادشاہیوں میں تقسیم ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے جانتے ہو کہ میں بڑی سختی سے اہلِ سُنّت ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر یہ خوشی ہوتی ہے کہ سلجوقیوں نے اسلام کی گرتی ہوئی عمارت کو سہارا دے دیا ہے۔ ان کی سلطنت میں کوئی شخص سُنّی عقیدے کے خلاف بات بھی نہیں کر سکتا۔ مجھے ایک شک یہ بھی ہے کہ اسماعیلی درپردہ اپنے فرقے کی تبلیغ کر رہے ہیں۔ یہ ہم سب کا فرض ہے کہ اس تبلیغ کو روکیں"۔

"ہاں آقا!" — مشیر نے کہا — "ہم اسلام کی صداقت اور اسلام کی اصل روح کو قائم رکھنے کے لئے اپنی جان و مال قربان کر دیں گے۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہمارے پاس فوج نہیں"۔

"ہم فوج کیسے رکھ سکتے ہیں!" — صالح نمیری نے کہا — "فوج کو کھلائیں گے کہاں سے اور اسے تنخواہ کہاں سے دیں گے..... ہم نے کسی سے لڑنا نہیں۔ اگر ہم پر

حملہ ہو گیا تو سلجوقی ہماری مدد کو پہنچیں گے..... یہ بھی ذہن میں رکھو کہ کسی نئے عقیدے یا باطل نظریئے کو تلواروں اور برچھیوں سے نہیں روکا جا سکتا۔ باطل کی تبلیغ کا جواب حق کی تبلیغ سے ہی دیا جا سکتا ہے۔ اگر بہت سے لوگ سچ بولنے کے عادی ہوں تو ایک جھوٹا آدمی فوراً پکڑا جاتا ہے اور اس کا جھوٹ نہیں چل سکتا..... ان مبلغوں کو آنے دو اور انہیں سیدھا میرے پاس لے آؤ"۔

○

دوسرے ہی دن صالح نمیری کو اطلاع ملی کہ دو مبلّغ آ گئے ہیں۔ اُس نے انہیں اُسی وقت اندر بلا لیا۔ ان کے ساتھ صالح نمیری کا اپنا ایک اہل کار تھا۔ مبلغوں کی وضع قطع شریفانہ اور پُروقار تھی۔ چال ڈھال اور بات چیت سے وہ خاصے معزز لگتے تھے۔ صالح نمیری نے انہیں بڑے احترام سے بٹھایا اور ان سے پوچھا کہ وہ کس عقیدے کی تبلیغ کر رہے ہیں۔

"اس کا نام حسن بن صباح ہے" ــــ ایک مبلّغ نے بتایا ــــ "وہ اسلام کا علمبردار ہے"۔

"کیا وہ نبوّت کا دعویٰ کرتا ہے؟" ــــ صالح نمیری نے پوچھا۔

"نہیں!" ــــ مبلّغ نے جواب دیا ــــ "وہ اللہ کا ایلچی بن کر آیا ہے۔ وہ پہلے ایک ستارے کی طرح شاہ بلوط کے درخت میں چمکتا رہا پھر آسمان کی ایک روشنی میں اس کا ظہور ہوا اور ایک روز وہ زمین پر اُتر آیا"۔

"میری ایک بات غور سے سن لو" ــــ صالح نمیری نے کہا ــــ "جس علاقے میں تم تبلیغ کرتے پھر رہے ہو اور جس علاقے میں تمہارے خدا کے اس ایلچی کا ظہور ہُوا ہے اُس علاقے پر میرا کوئی عمل دخل نہیں لیکن ایک اہلِ سُنت مسلمان کی حیثیت سے میں خدا کے اس ایلچی کا راستہ روکنے کی پوری کوشش کروں گا۔ اس وقت تم دونوں کے لئے میرا حکم یہ ہے کہ اس شہر میں جس طرح داخل ہوئے تھے اسی طرح اس شہر سے نکل جاؤ۔ کبھی کوئی نبی یا خدا کا کوئی ایلچی شاہ بلوط کے درخت کے ذریعے آسمان سے نہیں اُترا۔ نبوّت کا سلسلہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو چکا ہے۔ اگر تم یہ کہو کہ یہ حسن بن صباح کوئی درویش، دانشور یا عالم ہے تو میں آگے بڑھ کر اُس کا استقبال کروں گا"۔

"امیرِ قلعہ!" ــــ ایک مبلّغ نے کہا ــــ "اگر آپ صرف ایک بار تھوڑی سی دیر

کے لئے اسے مل لیں تو آپ کا شک رفع ہو جائے گا۔ یہ تو ہم کہہ رہے ہیں کہ وہ خدا کا ایلچی ہے۔ ہم اُس کے اس پیغام سے متاثر ہوئے ہیں جو اُس نے ہمیں دیا ہے۔ وہ مسلمان ہے اور اہلِ سُنّت ہے۔ ہو سکتا ہے آپ انہیں ملیں تو آپ کو صحیح اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کوئی دانا عالم ہے یا اس کے دل و دماغ میں کوئی باطل نظریہ ہے"۔

"اور یہ بھی ہو سکتا ہے" ــــ دوسرا مبلّغ بولا ــــ "آپ جیسا عالم اور دانشمند امیرِ قلعہ اس کے ساتھ گفتگو کرے تو ہمیں بھی اس کی اصلیت معلوم ہو جائے گی ہو سکتا ہے ہم ہی غلطی پر ہوں اور ویسے ہی اس کی شخصیت سے متاثر ہو گئے ہوں"۔

"کیا وہ یہاں آئے گا؟" ــــ صالح نمیری نے پوچھا۔

"شاید نہیں!" ــــ ایک مبلّغ نے جواب دیا ــــ "ہم ابھی چلے جاتے ہیں اور اُن سے بات کر کے آپ کو بتائیں گے کہ وہ آپ کے پاس آئیں گے یا آپ کو اُن کے پاس جانا پڑے گا..... اگر وہ آپ کو کسی جگہ بلائیں تو کیا آپ وہاں آ جائیں گے؟"

"ہاں!" ــــ صالح نمیری نے کہا ــــ "میں آؤں گا"۔

دونوں مبلّغ چلے گئے۔

○

اُن دنوں حسن بن صباح قلعہ شاہ در میں تھا۔ شاہ در میں بھی وہ لوگوں کے سامنے خدا کے ایلچی کے روپ میں آ گیا تھا۔ دونوں مبلّغ ایک دن اور ایک رات کی مسافت طے کر کے شاہ در پہنچے اور حسن بن صباح سے ملے۔ یہ مبلّغ اُس کے اپنے گروہ کے آدمی تھے۔ انہیں خصوصی تربیت دی گئی تھی۔ انہوں نے حسن بن صباح کو خلجان کے امیر قلعہ صالح نمیری کی باتیں سنائیں اور بتایا کہ وہ اسے ملنا چاہتا ہے۔

"میں اُسے بلوں گا" ــــ حسن بن صباح نے کہا۔

"میں صالح نمیری کو کچھ کچھ جانتا ہوں" ــــ پاس بیٹھے ہوئے احمد بن غطاش نے کہا۔

اکھڑ سا آدمی ہے اور بڑا پکا اہلِ سنّت ہے۔ وہ ذرا مشکل سے ہی مانے گا۔

"استادِ محترم!" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اس کے اکھڑپن کو توڑ نہیں سکوں گا؟"

"میں تمہاری حوصلہ شکنی نہیں کر رہا حسن!" ــــ احمد بن غطاش نے کہا ــــ "میں

یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ شخص ایک پتھر ہے جسے ذرا طریقے سے ہی توڑنا پڑے گا"۔

"آپ نے اچھا کیا کہ مجھے بتا دیا ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے یہ معلوم ہونا چاہئے تھا کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے..... ہمیں اس شخص کی نہیں بلکہ اس کے قلعے کی ضرورت ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ میں خلجان کا قلعہ اور یہ پورے کا پورا شہر آپ کی جھولی میں ڈال دوں گا"۔

"اُسے ملو گے کہاں؟" — احمد بن عطاش نے پوچھا

"نہ میں اُسے یہاں ملوں گا نہ اُس کے پاس جاؤں گا" — حسن بن صباح نے کہا

"میں اسے چشمے پر ملوں گا جہاں میں دوسری بار لوگوں سے ملا تھا"۔

وہ علاقہ بہت ہی سرسبز اور روح افزا تھا وہاں ایک چشمہ تھا اور چھوٹی سی ایک جھیل تھی۔ پانی اتنا شفاف کہ تہہ میں پڑی ہوئی کنکریاں بھی نظر آتی تھیں۔ چشمے کے اردگرد تھوڑا سا کھلا میدان تھا جس میں مخمل جیسی قدرتی گھاس تھی۔ چشمے کی نمی کی وجہ سے وہاں پھولدار پودوں کی بہتات تھی۔ بعض پھول بھینی بھینی خوشبو دیتے تھے۔ ذرا پیچھے ہٹ کر چھوٹی چھوٹی ٹیکریاں تھیں جو اونچی نیچی گھاس سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ ان ٹیکریوں پر بڑے خوبصورت درخت تھے۔ بڑے خوشنما درخت چشمے کے اردگرد بھی تھے۔ یہ چھوٹا سا خطہ اس قدر دلنشیں اور عطر بیز تھا کہ جاں بلب مریض بھی وہاں جا کر اپنے وجود میں روحانی تازگی محسوس کرتا تھا۔

حسن بن صباح اس جگہ آ چکا تھا اور اُسے یہ جگہ بہت ہی اچھی لگی تھی۔ اُس نے احمد بن عطاش سے کہا کہ اُس جگہ وہ بڑے خیمے لگا دے اور کھانا پکانے کا انتظام بھی وہیں کر دے۔ اس نے بتایا کہ خیمے کس ترتیب میں گاڑے جائیں۔

یہ جگہ شاہ در سے کم و بیش تیس میل دُور تھی۔ وہاں سے خلجان بھی کچھ اتنا ہی دُور تھا۔ احمد بن عطاش نے اُسی وقت خیمے اور دیگر ساز و سامان وہاں تک پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ تمام سامان اونٹوں پر لاد کر بھیج دیا گیا۔ رات کے وقت حسن بن صباح گھوڑے پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔

وہ اکیلا نہیں گیا تھا۔ اُس کے ساتھ اپنے گروہ کے چند ایک آدمی تھے۔ یہ سب اُس کے بانکے اور چیلے چانٹے تھے۔ انہیں مختلف رول دیئے گئے تھے۔ وہ علمائے دین کے روپ میں تھے۔ وہ خاص مرید اور حاشیہ بردار تھے اور باقی ایسے معتقد تھے جو یہ ظاہر کرتے تھے کہ وہ حسن بن صباح کی خدمت میں حاضر رہنے کو اپنی روح کی ضرورت سمجھتے ہیں۔

تین لڑکیاں بھی ساتھ تھیں جن میں ایک فرح تھی۔ یہ وہ لڑکی تھی جو حسن بن صباح کی محبت میں دیوانی ہو گئی تھی۔ محبت بھی ایسی کہ جب حسن بن صباح شاہ در کے لئے روانہ ہوا تھا تو فرح گھر سے بھاگ آئی اور حسن بن صباح کے راستے میں کھڑی ہو گئی تھی۔ اُس نے حسن بن صباح کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ جہاں بھی جا رہا ہے اسے ساتھ لے چلے۔

فرح بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ جسمانی اور ذہنی لحاظ سے چست اور تیز تھی۔ احمد بن عطاش نے اسے دیکھا تو اس نے اس کی خصوصی تربیت شروع کر دی تھی۔ حسن بن صباح تو جیسے اسے دیکھ دیکھ کر جیتا تھا۔

چشمے پر پہنچ کر حسن بن صباح نے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق خیمے نصب کرائے۔ یہ عام سی قسم کے خیمے نہیں تھے۔ یہ بڑے سائز کے چوکور خیمے تھے۔ اندر سے یہ خیمے لگتے ہی نہیں تھے، خوشنما، سجے سجائے کمرے لگتے تھے۔ اندر کی طرف ریشمی کپڑے لگائے گئے تھے۔ ان کی بلندی بھی کمروں جیسی تھی۔

حسن بن صباح نے اپنے اور صالح نمیری کے خیموں کے درمیان فاصلہ زیادہ رکھا تھا ان کے درمیان لڑکیوں کا خیمہ اور تین چار خیمے اس کے چیلوں چانٹوں کے تھے۔ ایک ٹیکری کے پیچھے باورچی خانہ بنا دیا گیا تھا۔

حسن بن صباح نے ان ہی دو مبلغوں کو جو پہلے خلجان گئے تھے، صالح نمیری کے نام یہ پیغام دے کر بھیجا کہ وہ تین چار دنوں کے لئے اُس کے ساتھ رہے۔

○

اگلی ہی شام صالح نمیری ان دو مبلغوں کے ساتھ آ گیا۔ حسن بن صباح نے آگے جا کر اس کا استقبال کیا اور پورے احترام سے اسے خیموں تک لایا۔ صالح نمیری کے ساتھ اس کے چار محافظ تھے جو اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ صالح نمیری جب چشمے کے قریب پہنچا تو تینوں لڑکیوں نے اس کے آگے پھول پھینکنے شروع کر دیئے جو انہوں نے چھوٹی چھوٹی ٹوکریوں میں اٹھا رکھے تھے۔

"نہیں!" — صالح نمیری نے آگے بڑھ کر لڑکیوں سے کہا — "میں اتنا بڑا آدمی

نہیں ہوں۔ مجھے پھولوں کو روندنے کا گناہ گار نہ کرو"۔

"آپ کے ہاں رواج کچھ اور ہو گا" ۔۔۔ فرح نے جانفزا مسکراہٹ سے کہا۔۔۔ "ہمارے ہاں کوئی معزز مہمان آتا ہے تو ہم اس کے راستے میں پھول بچھاتے ہیں"۔

"ہمارا بھی ایک رواج ہے" ۔۔۔ صالح نمیری نے کہا ۔۔۔ "ہمارے ہاں آپ جیسا کوئی مہمان آتا ہے تو ہم اُس کے راستے میں آنکھیں بچھاتے ہیں"۔

حسن بن صباح نے زوردار قہقہہ لگایا۔ صالح نمیری لڑکیوں کے قریب سے گذرتے انہیں دیکھتا رہا اور اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

صالح نمیری کی خاطر تواضع یوں کی گئی جیسے وہ کسی ملک کا بادشاہ ہو۔ وہ بادشاہ تو نہیں تھا لیکن وہ لگتا بادشاہ ہی تھا۔ خوبرو آدمی تھا۔ چہرے کا رنگ سرخی مائل سفید تھا اور اُس کے انداز اور چال ڈھال میں تمکنت تھی۔

رات کھانے کے بعد وہ اور حسن بن صباح اکیلے بیٹھ گئے۔

"کیا آپ نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے؟" ۔۔۔ صالح نمیری نے پوچھا۔

"نہیں تو!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے جواب دیا ۔۔۔ "مجھے کچھ حاصل ضرور ہوا ہے لیکن یہ نبوّت نہیں۔ میں کچھ سمجھ نہیں سکا یہ کیا ہے۔ میں یہ پورے یقین سے کہتا ہوں کہ میرا درجہ عام انسانوں سے ذرا اوپر ہو گیا ہے۔ یہ مجھے آپ بتائیں گے کہ میں کیا ہوں اور خدا نے مجھے کیوں یہ درجہ بخشا ہے"۔

"پہلے تو مجھے یہ بتائیں" ۔۔۔ صالح نمیری نے پوچھا ۔۔۔ "آپ آسمان سے کس طرح اُترے ہیں اور آپ کی روح میں ستاروں کا نور کہاں سے آ گیا ہے؟ لوگ شاہ بلوط کے درخت میں جو ستارہ دیکھتے رہے ہیں یہ کیا تھا اور اس کی حقیقت کیا ہے؟"

"میں کچھ نہیں بتا سکتا" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "میں بھی سنا کرتا تھا کہ ایک درخت میں دوسری تیسری رات ایک ستارہ نظر آتا ہے۔ میری بھی خواہش تھی کہ یہ ستارہ دیکھوں لیکن ستارے کے ظہور کے وقت مجھ پر غشی طاری ہو جاتی تھی۔ میں یہ ستارہ دیکھنے گیا تو لوگوں کے ہجوم کے ساتھ میں بھی انتظار ہی کرتا رہا' ستارہ نظر نہ آیا"۔

"یہ غشی کیسی ہوتی تھی؟" ۔۔۔ صالح نمیری نے پوچھا۔

"اس سوال کا جواب دینا مشکل ہے" ۔۔۔ حسن بن صباح نے جواب دیا ۔۔۔ "غشی میں یہ ہوتا تھا کہ ایک بڑی ہی نورانی صورت والا بزرگ مجھے اپنے پاس بٹھا لیتا اور بتاتا تھا

کہ لوگوں کی راہنمائی کی سعادت خدا نے مجھے دی ہے۔ معلوم نہیں یہ بزرگ کون تھے جو مجھے سبق دیا کرتے تھے کہ میں لوگوں کی راہنمائی کس طرح کروں گا' پھر ایک روز کسی غیبی طاقت نے مجھے......"

"حسن بن صباح!" ۔۔۔ صالح نمیری نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ۔۔۔ "کوئی نئی کہانی سناؤ۔ تم سے پہلے بھی ایسے ہی نبی ہو گذرے ہیں جنہیں غشی میں ایک بزرگ آ کر بتایا کرتے تھے کہ خدا نے تمہیں اپنا ایلچی منتخب کر لیا ہے..... دیکھو حسن! خدا نے اپنے ایلچی بھیجنے کا سلسلہ غار حرا سے اپنا آخری ایلچی بھیج کر بند کر دیا ہے"۔

حسن بن صباح نے صالح نمیری کے ساتھ بحث نہ کی بلکہ وہ اس طرح کی باتیں کرتا رہا جیسے وہ تذبذب میں ہو کہ وہ کیا محسوس کر رہا ہے اور اس تبلیغ کا سلسلہ کیوں شروع کر دیا ہے۔

"اگر میں غلط راستے پر چل نکلا ہوں تو مجھے راہِ راست پر لائیں" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "آپ کچھ دن میرے پاس ٹھہریں۔ میں اپنے متعلق یہ بتا سکتا ہوں کہ میں سحری طاقت رکھتا ہوں اور زمین میں دبے ہوئے راز بتا سکتا ہوں۔ مجھ میں کوئی مافوق الفطرت طاقت موجود ہے۔ احمد بن غطاش میرا پیرو مرشد ہے۔ اُس نے مجھے ایک پُراسرار علم دیا ہے"۔

"شاہ در کا والی احمد بن غطاش؟" ۔۔۔ صالح نمیری نے پوچھا۔

"ہاں!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "وہی احمد بن غطاش!"

"میں نے پہلے بھی سنا ہے" ۔۔۔ صالح نمیری نے کہا ۔۔۔ "ہاں حسن! میں نے پہلے بھی سنا ہے کہ وہ سحر کا یا کسی اور پُراسرار علم کا ماہر ہے اور وہ مستقبل کے پردوں میں جھانک سکتا ہے..... کیا تم نے اُس سے کچھ سیکھا ہے؟"

"بہت کچھ!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے جواب دیا ۔۔۔ "ستاروں کی چال بھانپ سکتا ہوں۔ ہاتھوں کی لکیریں پڑھ سکتا ہوں"۔

صالح نمیری نے کچھ کہے بغیر اپنا ہاتھ پھیلا کر حسن کے آگے کر دیا۔

"تمہارا امتحان ہے" ۔۔۔ صالح نمیری نے کہا۔

صالح نمیری سمجھ نہ سکا کہ حسن بن صباح نے بات کا رخ پھیر دیا ہے۔ وہ اس بات کو گول کر گیا کہ وہ خدا کا ایلچی ہے اور اُس نے وسیع پیمانے پر اپنے عقیدے کی تبلیغ

شروع کر دی ہے۔ وہ کمال استادی سے گفتگو کو سحر، نجوم اور دست شناسی کی بھول بھلیّوں میں لے گیا تھا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ صالح نمیری واقعی پتھر ہے جسے توڑنا آسان کام نہیں۔

○

حسن بن صباح نے صالح نمیری کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اُس کی ہتھیلی کو پھیلایا اور ہاتھ کی لکیریں دیکھتا رہا۔ کچھ دیر بعد اُس نے ہتھیلی پر اپنا سر اس طرح جھکا لیا جیسے لکیروں کو اور زیادہ غور سے دیکھ رہا ہو۔

اُس نے یوں تیزی سے اپنا سر اوپر کر لیا جیسے صالح نمیری کی ہتھیلی سے سانپ نے اُس پر حملہ کر دیا ہو، پھر اُس نے اپنے چہرے پر حیرت کا تاثر پیدا کر کے صالح نمیری کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں۔

"کیا نظر آیا ہے؟" — صالح نمیری نے پوچھا

حسن چپ رہا۔ اس نے قلم دوات منگوا کر کپڑے کی طرح کے ایک کاغذ پر خانے بنائے۔ کسی خانے میں ایک دو ہندسے اور کسی میں ایک دو حروف لکھے۔ بعض خانوں میں ٹیڑھی سیدھی لکیریں ڈالیں اور بہت دیر انہیں دیکھتا اور سوچتا رہا۔

"کچھ بتاؤ گے؟" — صالح نمیری نے پوچھا۔

"چار دن ہمیں انتظار کریں" — حسن نے کہا — "بات ابھی دھندلکے میں ہے"۔

"بات اچھی ہے یا بُری؟"

"اچھی بھی ہو سکتی ہے بُری بھی!" — حسن نے کہا — "اچھی ہے یا بُری، بات معمولی نہیں۔ شاہی بھی ہو سکتی ہے گدائی بھی..... چار دن دیکھوں گا۔ پانچویں دن لکیروں اور ستاروں کا بھید آپ کے سامنے آجائے گا"۔

صالح نمیری اذیّت ناک تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ حسن بن صباح کے کہنے پر وہ اپنے خیمے میں جا کر سو گیا۔

علی الصبح فرح اُس کے خیمے میں ناشتہ لے کر گئی۔ اُسے ناشتہ رکھ کر واپس آجانا چاہئے تھا لیکن وہیں کھڑی رہی۔

"کچھ اور چاہئے؟" — فرح نے پوچھا۔

"میں تو یہ ناشتہ دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں" — صالح نمیری نے کہا — "اور تم پوچھتی ہو کچھ اور چاہئے؟"۔

"نہیں کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھ جاؤں؟" — فرح نے شرمیلی سی آواز میں پوچھا۔

"پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟" — صالح نمیری نے مسکراتے ہوئے کہا — "یہاں میرے پاس بیٹھو..... تم کون ہو؟ حسن بن صباح کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟"

"میں والیٔ شاہ در احمد بن غطاش کی بھانجی ہوں" — فرح نے جھوٹ بولا — "انہوں نے مجھے ان کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے بھیجا ہے"۔

"شادی ہو چکی ہے؟"

"نہیں!" — فرح نے جواب دیا۔

"اب تک تو تمہاری شادی ہو جانی چاہئے تھی" — صالح نمیری نے کہا۔

"میرے والدین فوت ہو گئے ہیں" — فرح نے دوسرا جھوٹ بولا — "ماموں احمد بن غطاش نے مجھے اجازت دے رکھی ہے کہ میں جس کسی کو پسند کروں، انہیں بتا دوں اور وہ اس کے ساتھ میری شادی کر دیں گے۔ انہوں نے شرط صرف یہ رکھی ہے کہ وہ آدمی اچھی حیثیت والا ہونا چاہئے"۔

"تو کیا ابھی تک تمہیں اپنی پسند کا آدمی نہیں ملا؟"

"اب ملا ہے" — فرح نے جواب دیا۔

"وہ خوش نصیب کون ہے؟"

فرح نے صالح نمیری کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔

"اتنا زیادہ شرمانے کی کیا ضرورت ہے؟" — صالح نمیری نے کہا اور پوچھا — "کیا اُس آدمی کو معلوم ہے کہ تم نے اسے پسند کیا ہے؟"

"نہیں!"

"اُسے بتا دینا تھا" — صالح نمیری نے کہا۔

"ڈرتی ہوں" — فرح نے کہا — "وہ یہ نہ کہہ دے کہ میں اُسے پسند نہیں"۔

"وہ کوئی جنگلی جانور ہو گا جو تمہیں پسند نہیں کرے گا!" — صالح نمیری نے کہا۔

"کیا آپ مجھے پسند کریں گے؟" — فرح نے جھینپتے شرماتے پوچھا۔

"کیا تم مجھے قبول کر لو گی؟" — صالح نمیری نے اُس کے جواب میں سوال کیا۔

فرح نے آہستہ آہستہ اپنا ہاتھ صالح نمیری کی طرف سرکایا۔ دوسرے لمحے اُس کی انگلیاں صالح نمیری کی انگلیوں میں الجھی ہوئی تھیں۔ پھر صالح نمیری کو یاد ہی نہ رہا کہ اُس کے آگے ناشتہ پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔

اُس روز فرح کو ذرا سا بھی موقع ملتا وہ صالح نمیری کے خیمے میں چلی جاتی اور ہنس کھیل کر واپس آجاتی۔

○

اگلی رات حسن بن صباح اور صالح نمیری کھانے کے بعد الگ بیٹھے اس موضوع پر باتیں کرتے رہے کہ حسن بن صباح صحیح ہے یا غلط یا اسے وہم ہو گیا ہے کہ وہ خدا کا ایلچی ہے۔ حسن بن صباح کا اندازِ گفتگو یہ تھا کہ وہ بحث میں نہیں الجھتا تھا اور اُس کی کوشش یہ تھی کہ کوئی ایسی بات نہ کہہ بیٹھے جس سے صالح نمیری خفا ہو جائے۔ صالح نمیری کا گذشتہ رات کا انداز بڑا جارحانہ تھا لیکن اگلی رات اُس کے مزاج میں وہ برہمی نہیں تھی۔ اس کی بجائے وہ خاصا نرم تھا اور کسی وقت یوں پتا چلتا تھا جیسے وہ حسن بن صباح کا قائل ہوتا جا رہا ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ صالح نمیری کے مزاج کی یہ تبدیلی اس وجہ سے نہیں تھی کہ حسن بن صباح نے اسے متاثر کر لیا تھا بلکہ اصل وجہ یہ تھی کہ وہ فرح کی محبت میں گرفتار ہو گیا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ حسن بن صباح نے اُس کا ہاتھ دیکھا اور ستاروں کی گردش کا کچھ حساب لگایا تھا اور وہ یوں چپ ہو گیا تھا جیسے اُس نے کوئی بڑی ہی خاص بات چھپا لی ہو۔ قدرتی امر ہے کہ وہ یہ راز معلوم کرنے کو بے تاب تھا۔

اُس رات صالح اور حسن خاصی دیر بیٹھے باتیں کرتے رہے پھر صالح اپنے خیمے میں جا کر سو گیا۔ آدھی رات کا وقت ہو گا، صالح نے اپنے چہرے پر کوئی نرم اور ملائم سی چیز رینگتی ہوئی محسوس کی۔ وہ بڑی گہری نیند سویا ہوا تھا۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ خیمے میں تاریکی تھی۔ صالح نے اپنے منہ پر ہاتھ مارا تو ایک نرم و ملائم ہاتھ اس کے ہاتھ میں آیا۔ اُس نے اندھیرے میں بھی اس ہاتھ کو پہچان لیا۔ اس نے اس ہاتھ کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور دوسرا ہاتھ اس کی کمر پر ڈال دیا جس کا یہ ہاتھ تھا۔

فرح اُس کے اوپر گری اور اُس کی ہنسی نکل گئی۔ صالح نمیری کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی اور فرح پچیس چھبیس سال کی تھی لیکن جسمانی صحت کے لحاظ سے صالح

نمیری فرح جیسا ہی جوان لگتا تھا۔ اس کا انداز بھی پُرشباب تھا۔ اُس نے فرح کو اس طرح اپنے بازوؤں میں لے کر بھینچا جیسے اسے اپنے وجود میں سمیٹ لینا چاہتا ہو۔

"ابھی نہیں!" — کچھ دیر بعد فرح نے کہا — "پہلے شادی..... ابھی بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں سب سوئے ہوئے ہیں"۔

صالح اٹھ کر بیٹھ گیا اور فرح کو اپنے پاس اس طرح بٹھائے رکھا کہ فرح اس کے ایک بازو میں تھی اور فرح کا سر صالح کے سینے پر تھا۔ وہ کچھ دیر اسی حالت میں پیار و محبت کی باتیں کرتے رہے۔ وہ دلی اور زبانی طور پر ایک دوسرے میں جیسے تحلیل ہو گئے تھے۔

"ایک کام کرو فرح!" — صالح نے فرح کو پلنگ پر اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے کہا —

"حسن بن صباح نے میرا ہاتھ دیکھا تھا اور اُس نے ستاروں کی گردش بھی دیکھی تھی۔ پھر وہ یوں چپ ہو گیا تھا جیسے اُس نے میری قسمت میں کوئی ایسی بات دیکھ لی ہو جو وہ مجھے نہیں بتانا چاہتا۔ میں نے اُس کے چہرے پر کچھ اور ہی تاثر دیکھا تھا..... وہ مجھے کچھ نہیں بتا رہا۔ کہتا ہے چار روز انتظار کرو۔ میں یہاں اتنا رکنے کے لئے نہیں آیا تھا۔ میں اس شخص سے متاثر نہیں ہُوا نہ میں اُس کے اس دعوے کو مانتا ہوں کہ یہ خدا کا ایلچی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں یہ راز معلوم کرنے کے لئے رکا ہوں کہ اس نے میرے ہاتھ کی لکیروں میں کیا دیکھا ہے..... کیا تم اس سے معلوم کر سکتی ہو؟"

"ہاں!" — فرح نے جواب دیا — "اگر کوئی بہت ہی خطرناک بات نہ ہوئی تو وہ مجھے بتا دے گا"۔

"کبھی خیال آتا ہے کہ میں چلا جاؤں" — صالح نمیری نے کہا — "میں کٹر اہلِ سنت ہوں۔ قسمت میں جو لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا لیکن تم میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی ہو"۔

"اب آپ جہاں بھی جائیں گے یہ زنجیر آپ کے ساتھ رہے گی" — فرح نے بڑے ہی جذباتی لہجے میں کہا اور اس طرح بولی جیسے اسے اچانک یاد آگیا ہو — "اوہ! میں آپ کے لئے پھول لائی تھی"۔

اُس نے پلنگ پر ہاتھوں سے ٹٹولا اور پھول اُس کے ہاتھ آگئے۔ یہ بڑے بڑے تین پھول تھے جنہیں اس نے گلدستے کی طرح ایک دھاگہ لپیٹ کر باندھ رکھا تھا۔ اُس نے

پھول صالح نمیری کی ناک کے ساتھ لگا دیئے۔

"اتنی پیاری خوشبو!" ــــ صالح نے کہا ــــ "میں نے اس علاقے کے وہ پھول بھی سونگھے ہیں جو دور دراز جنگلوں میں کھلتے ہیں لیکن اس پھول کی خوشبو میرے لئے بالکل نئی ہے"۔

اُس نے بار بار ان پھولوں کو سونگھا اور جوں جوں لمحے گزرتے گئے، صالح پر ایک کیفیت طاری ہوتی گئی کہ وہ محسوس کرنے لگا کہ وہ فرح کے لئے پیدا ہُوا تھا اور باقی عمر اس کی غلامی میں گزارے گا۔

"میرا ایک مشورہ مانیں" ــــ فرح نے کہا ــــ "حسن بن صباح کو یہ دعوت دیں کہ وہ کچھ دن خلجان میں آپ کا مہمان رہے۔ اگر یہ یہیں سے واپس چلا گیا تو پھر یہ آپ کے ہاتھ کی لکیریں اور ستاروں کا راز اپنے ساتھ لے جائے گا۔ دوسرا فائدہ یہ ہو گا کہ یہ یہاں سے واپس گیا تو مجھے بھی ساتھ لے جائے گا۔ ہم خلجان چلے گئے تو میں اسے کہہ سکتی ہوں کہ میں واپس نہیں جاؤں گی..... میں نے اب باقی عمر آپ کے ساتھ ہی رہنا ہے"۔

"میں ایسے ہی کرتا ہوں" ــــ صالح نے کہا ــــ "میں اسے کہوں گا۔ میرے ساتھ خلجان چلو اور مجھے قائل کرو کہ تم خدا کی بھیجی ہوئی برگزیدہ شخصیت ہو اور میں تمہیں صرف مان ہی نہیں لوں گا بلکہ تمہارے عقیدے کی اتنی تبلیغ کروں گا کہ تم حیران رہ جاؤ گے"۔

فرح بہت دیر بعد اُس کے خیمے سے نکلی۔ صالح نمیری کو وہ اس جذباتی کیفیت میں چھوڑ آئی کہ اُس نے باقی رات کروٹیں بدلتے گزار دی۔ وہ رہ رہ کر یہی چاہتا تھا کہ فرح کے پاس چلا جائے یا اُسے اپنے خیمے میں لے آئے۔

○

ایک روز بعد ایک قافلہ خلجان کی طرف جا رہا تھا۔ صالح نمیری نے حسن بن صباح کو خلجان کی دعوت دی تھی جو اُس نے بخوشی قبول کر لی تھی۔ اُس نے دونوں لڑکیوں کو واپس شاہ در بھیج دیا تھا صرف فرح کو ساتھ رکھا تھا۔ باورچیوں کو بھی واپس بھیج دیا تھا۔ تمام خیمے اور دیگر سامان بھی واپس چلا گیا اور حسن بن صباح کے ساتھ فرح کے علاوہ چند آدمی رہ گئے تھے۔

صالح نمیری خلجان کا والی اور امیر تھا۔ اُس کی رہائش گاہ محل جیسی تھی۔ رہن سہن

امیرانہ تھا۔ اُس نے وہاں پہنچتے ہی حسن بن صباح اور فرح کے کمرے الگ کر دیئے اور دوسرے آدمیوں کی رہائش کا بھی بڑا اچھا انتظام کیا۔

اُس نے فرح کو وہ کمرہ دیا جو اُس کی اپنی خواب گاہ کے بہت قریب تھا۔ اُس کی دو بیویاں تھیں جو اپنے اپنے کمروں میں رہتی تھیں۔ یہ وہ زمانہ تھا جب امیر کبیر آدمی چار چار بیویاں رکھتے تھے اور ان بیویوں کی حیثیت بیوی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتی تھی۔ ہر بیوی کا یہ فرض تھا کہ خاوند کو تفریح اور جسمانی آسودگی مہیا کرے۔ اُس زمانے میں سوکن کا تصور ناپید تھا۔ ہر بیوی کو اُس کے حقوق ملتے تھے۔

صالح نمیری کے لئے ایک اور بیوی لے آنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

خلجان میں پہلی رات فرح نے وہی حرکت کی جو وہ پہلے کر چکی تھی۔ وہ آدھی رات کے وقت صالح کے کمرے میں چلی گئی۔ صالح کو توقع تھی کہ فرح آئے گی اس لئے اُس نے دونوں بیویوں میں سے کسی ایک کو بھی اپنے کمرے میں نہیں رکھا تھا۔

"ایک راز تو مل گیا ہے" ــــ فرح نے کہا ــــ "بڑی مشکل سے حسن نے بتایا ہے کہ آپ کی قسمت میں ایک خزانہ لکھا ہے بلکہ ایک خزانہ آپ کی راہ دیکھ رہا ہے"۔

"اُس نے یہ راز مجھ سے چھپایا کیوں ہے؟"

"میں اس سوال کا جواب بھی لے آئی ہوں" ــــ فرح نے کہا ــــ "وہ کہتا ہے کہ خزانہ ایسی جگہ ہے جہاں تک پہنچنے کے لئے جان کی بازی لگانی پڑے گی! پھر جس جگہ یہ خزانہ ہے وہاں بھی بڑا ہی خوفناک خطرہ ہے۔ ہو سکتا ہے وہاں ایک یا ایک سے زیادہ بڑے زہریلے اور بڑے لمبے سانپ ہوں۔ اگر سانپ نہ ہوئے تو صحرائی بچھو ہوں گے جو سانپوں جیسے ہی زہریلے ہوتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہوئے تو وہاں درندے ہوں گے ..... ان تمام خطروں سے نمٹنے کا انتظام ہو تو کامیابی ہو سکتی ہے"۔

"خزانہ کتنا کچھ ہے؟" ــــ صالح نے پوچھا ــــ "خزانے میں کیا ہے؟..... کیا اُس نے یہ نہیں بتایا؟"

"اُس نے تفصیل نہیں بتائی" ــــ فرح نے کہا ــــ "اُس نے یہ کہا ہے کہ خزانہ اتنا زیادہ ہے کہ اس سے خلجان جیسے دس بارہ شہر خریدے جا سکتے ہیں اور یہ خزانہ اتنے شہر خرید کر بھی سات پشتوں تک ختم نہ ہو"۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے فرح" ــــ صالح نے کہا ــــ "حسن بن صباح خود اس خزانے

تک پہنچ جائے۔ اُس کے ہاتھ میں سحر اور نجوم کی طاقت ہے"۔

"نہیں میرے آقا!" ــــ فرح نے کہا ــــ "اُسے دنیا کے مال و دولت اور ان خزانوں کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں۔ اس وقت آپ اسے جا کر دیکھیں تو وہ آپ کو عبادت میں مصروف نظر آئے گا۔ اُس کا دھیان خدا کی خوشنودی پر مرکوز رہتا ہے۔ دنیاوی لطف اور لذّت سے وہ دُور رہتا ہے"۔

"پھر اُس نے تمہیں اپنے ساتھ کیوں رکھا ہُوا ہے؟" ــــ صالح نمیری نے پوچھا۔

"میرے ساتھ اس کا وہ تعلق نہیں جو آپ سمجھ رہے ہیں" ــــ فرح نے کہا۔ ــــ "میں اپنے ماموں کی اجازت سے سیرو تفریح کے لئے اس کے ساتھ آئی ہوں لیکن اس سے مجھے انکار نہیں کہ یہ شخص میرے ساتھ بہت پیار کرتا ہے۔ یہ پیار کسی اور نوعیت کا ہے۔ مجھے اپنے پاس بٹھالیتا ہے اور میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہتا ہے کہتا ہے کہ تمہارے یہ نرم و ملائم ریشمی بال مجھے بہت ہی اچھے لگتے ہیں۔ یہ تو اُس نے کئی بار کہا ہے کہ میں تمہیں ایک پھول سمجھتا ہوں' پھول کو سونگھا جاتا ہے اسے ناپاک نہیں کیا جاتا اور اسے مسلا نہیں جاتا..... میں آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ اس کے دل میں میرے لئے ایسا پیار ہے جو آبِ کوثر جیسا مقدس ہے۔ آپ کوئی وہم دل میں نہ رکھیں"۔

"میں دل میں وہم نہیں رکھوں گا فرح!" ــــ صالح نمیری نے کہا ــــ "تم اسے کہو کہ مجھے وہ جگہ اور اس جگہ کا راستہ بتا دے جہاں وہ خزانہ ہے۔ میں ایسا انتظام کر کے جاؤں گا کہ کوئی بھی خطرہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ میرے ساتھ اتنے برچھی بردار اور تیغ زن ہوں گے جو سینکڑوں سانپوں کو ختم کر دیں گے۔ ذرا سوچو فرح اگر ہمیں یہ خزانہ مل جائے تو ہماری زندگی کس قدر خوبصورت اور شاہانہ ہو گی"۔

"اس خزانے کے ساتھ میری دلچسپی بھی اتنی ہی ہے جتنی آپ کی ہے" ــــ فرح نے کہا ــــ "میں تو پوچھ کر ہی دم لوں گی"۔

جب فرح صالح کے کمرے میں سے آنے لگی تو صالح نے اسے روک لیا۔

"فرح!" ــــ صالح نے کہا ــــ "وہ پھول جو تم اُس رات خیمے میں میرے لئے لائی تھیں' وہ یہاں سے نہیں مل سکتا؟"

"مل سکتا ہے" ــــ فرح نے جواب دیا ــــ "آپ کو وہ خوشبو پسند ہے تو میں اس

پھول کی بجائے وہ خوشبو تھوڑی سی رُوئی پر لگا کر آپ کو دے سکتی ہوں لیکن یہ مجھے چوری کرنی پڑے گی۔ یہ عطر حسن بن صباح کے پاس ہے جسے وہ چھپا کر رکھتا ہے۔ یہ اُس پھول کا عطر ہے۔ وہ تو اتفاق سے وہاں مجھے دو تین پھول نظر آ گئے تھے جو میں نے آپ کو دے دیئے تھے"۔

○

اگلی شام صالح نمیری اور حسن بن صباح کھانے کے لئے بیٹھے تو صالح نمیری نے اپنی مونچھوں پہ یہی عطر لگا رکھا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے فرح موقعہ دیکھ کر تھوڑی سی رُوئی پر ایک قطرہ عطر کا لگا کر صالح نمیری کو دے آئی تھی۔ صالح نمیری نے کھانے سے پہلے یہ عطر اپنی مونچھوں پر لگا لیا تھا۔

صالح نمیری نے اپنے مزاج میں ایک نمایاں تبدیلی محسوس کی۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ ہنسے اور مسکرائے اور اس زندگی سے پورا لطف اٹھائے۔

"فرح کو بھی نہ بلالیں؟" ــــ کھانے کے بعد صالح نے حسن سے کہا ــــ "وہ بھی آخر ایک امیرِ شہر کی بھانجی ہے"۔

"بلالینا چاہئے" ــــ حسن نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد فرح آ گئی۔

"میری ایک بات مان لیں" ــــ فرح نے حسن بن صباح سے کہا ــــ "امیرِ خلجان بہت پریشان ہیں۔ آپ نے ان کا ہاتھ دیکھا اور نجوم کا بھی حساب کتاب دیکھا لیکن انہیں آپ نے کچھ بتایا نہیں"۔

"ہاں حسن!" ــــ صالح نمیری نے کہا ــــ "اس سے بہتر تھا کہ آپ میرا ہاتھ نہ دیکھتے۔ اگر کوئی خطرناک معاملہ ہے تو وہ بھی مجھے بتا دیں۔ آپ کی خاموشی نے مجھے اذیّت میں مبتلا کر رکھا ہے"۔

"بتا دیں" ــــ فرح نے بچوں کے سے انداز سے کہا ــــ "اب بتا دیں"۔

حسن بن صباح خاموش رہا۔ اُس نے سر جھکا لیا وہ کچھ دیر اسی حالت میں رہا۔ صالح اور فرح سراپا سوال بنے اسے دیکھتے رہے۔

تھوڑی دیر بعد حسن بن صباح نے سر اٹھایا اور صالح نمیری کی طرف دیکھا۔

"آپ کے ہاتھ کی لکیروں میں ایک خزانہ ہے" ــــ حسن بن صباح نے انتہائی

سنجیدہ لہجے میں کہا۔۔۔ "لیکن یہ خزانہ ایسا نہیں کہ آپ وہاں جائیں گے اور وہ خزانہ وہاں سے اٹھا لائیں گے۔ اس میں جان جانے کا خطرہ ہے۔ ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ آپ وہ پورے کا پورا خزانہ اٹھا لائیں۔ اس خزانے کا ایک حصہ الگ کرنا پڑے گا"۔

"آپ جتنا حصہ مانگیں گے میں دوں گا" ۔۔۔ صالح نمیری نے کہا۔

"یہ بات نہیں" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "مجھے حصہ نہیں چاہئے۔ یہ بھی ایک وجہ ہے کہ میں آپ کو اس خزانے کی خبر دے ہی نہیں رہا تھا۔ یہ میرے علم کی کچھ شرطیں ہیں جو آپ کو پوری کرنی پڑیں گی۔ اگر نہیں کریں گے تو پھر آپ کا انجام ایسا ہو گا جو میں آپ کو بتاؤں تو اس کے تصور سے ہی آپ کانپ اٹھیں"۔

"اگر حصہ لینا ہی ہے تو یہ فرح لے سکتی ہے" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "میں نہیں لے سکتا۔ آپ کا اور کوئی قریبی عزیز لے سکتا ہے..... بات یہ ہے امیرِ خلجان! یہ خزانہ اس علم کے ذریعے مجھے نظر آیا ہے۔ میں اسی علم کے ذریعے یہ کر سکتا ہوں کہ آپ کو خزانہ مل جائے اور آپ کی جان بھی محفوظ رہے۔ مجھے حکم ملا ہے کہ جب تک اس قلعے کا کوئی قائم مقام والی مقرر نہ ہو جائے آپ اس خزانے تک نہیں پہنچ سکتے"۔

"میری بات سنو حسن!" ۔۔۔ صالح نمیری نے کہا۔۔۔ "آپ مجھے کچھ نہ بتائیں۔ آپ کا یہ علم اور عمل جو کچھ بھی کہتا ہے، اس کی پابندی کریں۔ مجھے صرف خزانہ چاہئے"۔

"پھر آپ میری ہر بات کی پابندی کریں" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "خزانہ لینے آپ جائیں گے۔ یہ سارا انتظام آپ کا ہو گا۔ خزانہ مل جائے گا تو اس کا ایک چوتھائی حصہ اُسے ملے گا جو آپ کی جگہ یہاں قائم مقام والیٔ قلعہ ہو گا"۔

"والیٔ قلعہ تو کوئی میرا ہی عزیز ہو گا" ۔۔۔ صالح نمیری نے کہا۔

"نہیں!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "میں یہ بھی اپنے علم کی روشنی میں دیکھ چکا ہوں۔ پہلے میں آپ کو یہی بتا دیتا ہوں۔ قلعے اور اس شہر کے ہر فردو شہر کی ذمہ داری میرے سپرد کی گئی ہے لیکن میں یہ ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ میرے لئے حکم ہے کہ قلعے کا قائم مقام میں مقرر کروں۔ میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ قائم مقام کون ہو گا۔ میں یہ قلعہ کسی کو بغیر سوچے تو نہیں دے سکتا۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ شاہ در کا والی احمد بن عطاش آپ کی جگہ عارضی طور خلجان کا بھی والی ہو گا اور جب آپ واپس

آئیں گے تو آپ خزانے کا چوتھا حصہ اسے دیں گے اور وہ شہر آپ کے حوالے کر کے شاہ در چلا جائے گا"۔

"مجھے منظور ہے" ۔۔۔ صالح نمیری نے بلا سوچے کہا۔

"اس کی آپ کو تحریر دینی پڑے گی" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "آپ کو خزانے کا راستہ اور خزانے کی جگہ اُس وقت بتائی جائے گی جب آپ یہ تحریر دے دیں گے۔ یہ ایک معاہدہ ہو گا جس پر آپ کے دستخط اور آپ کی مُہر ہو گی۔ احمد بن عطاش کی جگہ میں دستخط کروں گا اور گواہوں کے طور پر یہاں کی دو مسجدوں کے امام اور اسی شہر کے قاضی کے دستخط ہوں گے۔ اگر آپ زندہ واپس نہ آ سکے تو خلجان کا امیرِ شہر احمد بن عطاش ہی ہو گا۔ وہ جسے چاہے گا یہ شہر دے گا۔ نہیں دینا چاہے گا تو اس سے کوئی بھی یہ شہر نہیں لے سکے گا"۔

"کیا موت کا خطرہ یقینی ہے؟" ۔۔۔ صالح نمیری نے پوچھا۔

"خطرہ یقینی ہے" ۔۔۔ حسن بن صباح نے جواب دیا۔۔۔ "لیکن موت یقینی نہیں۔ زندہ واپس آنے کا امکان موجود ہے۔ آپ کے انتظامات جتنے مضبوط ہوں گے موت کا خطرہ اتنا ہی کم ہو گا"۔

صالح نمیری کی ایک طرف ذہنی پختگی کا یہ عالم تھا کہ وہ حسن بن صباح کی اس حیثیت کو تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ وہ ایک روشنی کے ذریعے آسمان سے اُترا ہے لیکن دوسری طرف اُس کی شخصی کمزوری کا یہ عالم تھا کہ حسن بن صباح اُسے جو کچھ بھی کہے جا رہا تھا وہ اُسے تسلیم کر رہا تھا۔ وہ اتنا بھی نہیں سوچ رہا تھا کہ خزانے کا حصول یقینی نہیں لیکن لالچ کا یہ حال کہ وہ اتنا بڑا شہر ایک غیر آدمی کو لکھ کر دینے پر آمادہ ہو گیا تھا۔

اُس زمانے میں بلکہ اس سے بہت پہلے سے یوں ہوتا تھا کہ ڈاکوؤں اور راہزنوں کے بہت بڑے بڑے گروہ جو بہت ہی بڑے بڑے قافلوں کو لوٹتے تھے، لوٹ مار کا قیمتی سامان مثلاً ہیرے اور جواہرات کسی ایسی جگہ رکھ دیتے تھے جو دشوار گزار ہوتی تھی اور وہاں تک کوئی اور انسان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ بادشاہوں میں بھی یہ رواج تھا کہ وہ اپنا خزانہ کسی خفیہ مقام پر دفن کر دیتے تھے۔ کچھ بادشاہ ایسے ہو گزرے تھے جو ساری دنیا کو فتح کرنے کے لئے نکلے تھے۔ وہ شہروں اور بستیوں کو لوٹتے اور بادشاہوں کے خزانے صاف کرتے چلے جاتے تھے۔ جب اُن کے پاس اتنا زیادہ خزانہ اکٹھا ہو جاتا جو سنبھالا نہیں جاتا تھا تو

راستے وہ کسی بڑے ہی دشوار گزار علاقے میں اس توقع پر دفن کر جاتے تھے کہ واپس آکر نکال لے جائیں گے"۔

اُن زمانوں سے اب تک یہ عقیدے یا روایتیں چلی آ رہی ہیں کہ کوئی عامل یا جوتشی یا پُراسرار علوم کا کوئی ماہر اس قسم کے خزانے کی نشان دہی کر سکتا ہے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ جو کوئی اس قسم کا خزانہ نکالنے کے لئے جاتا ہے وہ زندہ واپس نہیں آ سکتا۔ یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس قسم کے مدفون خزانوں کی حفاظت بڑے زہریلے سانپ کرتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس قسم کے خزانوں کی حفاظت جنات کیا کرتے ہیں۔

ان تمام خطرات کے باوجود اس قسم کی کہانیاں مشہور تھیں کہ فلاں شخص کو مدفون خزانہ ملا اور وہ بادشاہ بن گیا۔ ایسے لوگ بھی ہو گذرے ہیں جنہوں نے ایسے خزانوں کی تلاش میں ہی زندگی گزار دی تھی۔

دولت اور عورت دو ایسی چیزیں ہیں جن کی خاطر انسان نے اپنے مذہب تک کو خیرباد کہا ہے۔ خزانے کا لالچ ایک نشے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نشے میں اگر عورت کا نشہ شامل ہو جائے تو انسان کی عقل پر سیاہ پردہ پڑ جاتا ہے۔

صالح نمیری اسی کیفیت کا شکار ہو گیا تھا۔ چالیس سال کی عمر میں ایک نوجوان لڑکی اُس کی محبت کا دم بھرنے لگی تھی اور وہ اس کی محبت میں اس قدر بے چین اور بے تاب تھی کہ راتوں کو چھُپ کر اس کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ اس لڑکی نے اُسے پھر سے جوان کر دیا تھا۔ پھر اس لڑکی نے اُسے ایسے خزانے کی خبر دے دی جس سے وہ خلجان جیسے دس شہر خرید سکتا تھا اور باقی خزانہ اس کی سات پشتوں کے لئے کافی ہو سکتا تھا۔

وہ صالح نمیری جو اپنے آپ کو اہلِ سنت اور بڑا پکا مسلمان کہتا تھا روز مرہ کی نمازیں ہی بھول گیا تھا۔ فرح اور خزانہ اُس کے ذہن میں عقیدے کی صورت اختیار کر گئے تھے۔

یہ تو انسانی فطرت کی کمزوریاں تھیں جنہوں نے صالح نمیری کی عقل پر پردے ڈال دیئے تھے اور وہ ذہنی طور پر اس طرح مفلوج ہو گیا تھا کہ اپنے آپ کو وہ بہت بڑا دانا سمجھنے لگا تھا۔ اُن مؤرخوں نے جنہوں نے اس قسم کے واقعات ذرا تفصیل سے لکھے ہیں' ایک اور راز سے پردہ اٹھایا۔ انہوں نے لکھا ہے کہ فرح نے صالح نمیری کو رات کی ایک ملاقات میں تین پھول دیئے تھے۔ جنہیں سونگھ کر صالح نے پوچھا تھا کہ یہ پھول کہاں

سے آئے ہیں! اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اس علاقے کا کوئی پھول ایسا نہیں جو اس نے نہ سونگھا ہو لیکن اس پھول کی خوشبو سے وہ نا آشنا تھا۔

یہ پھول سونگھنے کے بعد اُس نے اپنے مزاج میں اور ذہنی کیفیت میں بڑی ہی خوشگوار تبدیلی محسوس کی تھی جس کے زیرِ اثر اس پر خود سپردگی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ خلجان میں آکر جب فرح اُس کے کمرے میں گئی تو اس نے فرح سے پوچھا تھا کہ وہ پھول یہاں کہیں ملتا ہے یا نہیں۔ فرح نے اسے بتایا تھا کہ پھول تو نہیں ملے گا' اس کا عطر مل جائے گا۔ اگلی شام فرح نے اس عطر کا ایک قطرہ تھوڑی سی رُوئی پر لگا کر صالح نمیری کو دے دیا تھا۔ صالح نے یہ عطر اپنی مُونچھوں پر مل لیا تھا۔ اس کے بعد وہ حسن بن صباح سے کھانے پر ملا تھا۔

حسن بن صباح نے جب خزانے کی بات شروع کی تو وہ جو کچھ بھی کہتا رہا' صالح بلا سوچے سمجھے قبول کرتا رہا یہاں تک کہ اُس نے اپنا شہر بھی احمد بن عطاش کے نام لکھ دینے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ یہ خزانے کا لالچ اور فرح کی محبت کا خمار نہیں تھا بلکہ یہ اس عطر کے اثرات تھے جو اس نے مونچھوں کو لگایا تھا۔ تاریخوں میں آیا ہے کہ فرح اُس کے پاس جو تین پھول لے گئی تھی اُن پر بھی یہی عطر ملا ہوا تھا۔ اس عطر کے اثرات دماغ پر اس طرح کے ہوتے تھے کہ انسان حقیقت سے لاتعلق ہو جاتا اور جو کچھ بھی اُس کے ذہن میں ڈالا جاتا اسے وہ حقیقت سمجھتا تھا۔ یوں کہہ لیں کہ اُس کا دماغ اُس شخص کے قبضے میں آجاتا تھا جو اُس کے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہوتا تھا۔

داستان گو پہلے سنا چکا ہے کہ حسن بن صباح کی ابلیسی قوتیں اپنے کرشمے دکھاتی تھیں لیکن اُس نے سحرکاری کے علاوہ ایسی جڑی بوٹیاں اور پھول وغیرہ دریافت کر لئے تھے جن کی دُھونی یا خوشبو انسانی ذہن کو حقیقت سے ہٹا کر بڑے حسین تصورات میں لے جاتی تھی۔ یہی اس شخص کی قوت تھی جس نے اپنے دور کے لاکھوں انسانوں کو دنیا میں جنت دکھا دی تھی۔

صالح نمیری بے تاب تھا کہ اسے خزانے کا راستہ بتایا جائے۔ وہ تو دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ حسن بن صباح نے قلم دوات منگوا کر نقشہ بنانا شروع کر دیا۔ ساتھ وہ صالح نمیری کو بتاتا جا رہا تھا کہ اس راستے پر کیا کیا دشواریاں پیش آئیں گی اور فلاں جگہ کیا خطرہ ہو سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

"آپ یہ علاقے دیکھ کر حیران رہ جائیں گے" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "آپ سمجھیں گے کہ یہ کوئی اور ہی دنیا ہے اور یہ وہ زمین نہیں جس پر انسان آباد ہیں۔ مثلاً ایک جگہ ایسا جنگل آئے گا جو آپ کو ٹھنڈک پہنچائے گا۔ آپ وہیں رک جانا چاہیں گے۔ زمین کا تھوڑا سا ٹکڑا ایسا آئے گا جہاں آپ کو ہلکا ہلکا کیچڑ نظر آئے گا۔ آپ گھوڑوں پر سوار اس کیچڑ میں سے گزریں گے تو آپ کے گھوڑے دھنس جائیں گے۔ دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اس دلدل سے نہیں نکال سکے گی۔ آپ گھوڑوں سمیت اس دلدل میں ڈوب کر ہمیشہ کے لئے گم ہو جائیں گے"۔

"میں ایسی جگہوں پر نظر رکھوں گا" ــــ صالح نمیری نے کہا ــــ "ایسی جگہ دیکھ کر پہلے وہاں پتھر پھینکوں گا۔ اس سے پتہ چل جائے گا کہ یہ دلدل ہے"۔

"پھر آپ کو ایسی ریت ملے گی جو آپ کو دلدل کی طرح اپنے اندر غائب کر دے گی" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "راستے میں ایسا صحرا آئے گا جہاں سے کبھی کوئی انسان نہیں گزرا۔ وہاں صحرائی جانور اور کیڑے مکوڑے بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ آپ کو اپنے ساتھ پانی کا بے شمار ذخیرہ لے جانا پڑے گا۔ جس علاقے میں یہ خزانہ ہے وہاں ایسی چٹانیں کھڑی ہوں گی جیسے دیواریں کھڑی ہوں ۔ ان پر سے گھوڑوں کے پاؤں پھسلیں گے۔ بہتر یہ ہو گا کہ گھوڑے پیچھے چھوڑ کر پیدل جائیں۔ بعض چٹانوں پر آپ یوں چلیں گے جیسے دیوار پر چل رہے ہوں۔ وہاں پاؤں پھسلنے کا امکان زیادہ ہو گا"۔

"میں اپنے ساتھ جانباز اور عقل والے آدمی لے جاؤں گا" ــــ صالح نمیری نے کہا ــــ "آپ مجھے جگہ اچھی طرح سمجھا دیں"۔

حسن بن صباح نے اسے وہ جگہ بڑی اچھی طرح سمجھا دی۔

"آپ کے ساتھ ایک اونٹنی ہونی چاہئے" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "اونٹنی دودھ دینے والی ہونی چاہئے۔ جب آپ خزانے والی جگہ پہنچ جائیں تو اونٹنی کا دودھ دوہ کر ایک پیالے میں ڈال دیں اور پیالہ خزانے کی اصل جگہ سے کچھ دور رکھ دیں۔ اس سے یہ ہو گا کہ وہاں جتنے بھی سانپ ہوں گے وہ دودھ پر ٹوٹ پڑیں گے اور آپس میں لڑیں گے۔ سانپ دودھ کا عاشق ہوتا ہے۔ اتنی دیر میں آپ خزانہ نکال لیں... میں نہیں بتا سکتا کہ اس غار کے اندر کیا چیز ہو گی جو اس خزانے کی حفاظت کے لئے بیٹھی ہو گی۔ میں یہ بتا سکتا ہوں کہ آپ کے ہاتھ میں جلتی ہوئی مشعلیں ہونی چاہئیں۔ وہ چیز

آگ سے ڈر کر بھاگ جائے گی۔ اگر وہاں بچھو ہوئے تو انہیں جلتی ہوئی مشعلوں سے جلایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور ہوا تو وہ آپ اپنی عقل اور ہمت سے سنبھال سکتے ہیں"۔

"میں خدا کی مدد مانگوں گا" ــــ صالح نمیری نے کہا ــــ "میں صبح سے ہی جانے کی تیاری شروع کر دوں گا"۔

"ایک ضروری بات رہ گئی ہے" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "آپ کو اس جگہ سے آدھی رات کے وقت اس طرح روانہ ہونا چاہئے کہ کوئی آپ کو دیکھ نہ سکے"۔

"شہر کے چوکیدار تو دیکھ لیں گے" ــــ صالح نمیری نے کہا ــــ "انہیں کیا کہا جائے؟"

"اگر کوئی دیکھ لے تو اسے اصل بات نہ بتائیں" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "آپ امیر شہر ہیں۔ آپ سے کوئی نہیں پوچھے گا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں۔ کوئی پوچھے تو خاموش رہیں"۔

○

صالح نمیری نے اسی رات ان آدمیوں کا انتخاب کر لیا جنہوں نے اس کے ساتھ جانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اس سامان کی فہرست تیار کر لی جو اس کے لئے ضروری تھا جو اس نے ساتھ لے جانا تھا۔

صبح فجر کی نماز کے فوراً بعد اس نے ان تمام آدمیوں کو جن کی تعداد دس گیارہ تھی، اپنے ہاں بلایا اور انہیں صرف یہ بتایا کہ ایک سفر پر جانا ہے جو اگر بخیر و خوبی طے ہو گیا تو سب کو سونے اور جواہرات کی شکل میں انعام ملے گا۔ انہیں یہ بھی بتایا کہ کسی کے ساتھ یہ ذکر نہ ہو کہ وہ کہیں جا رہے ہیں۔ اگر کسی کی زبان سے ایسی بات نکل گئی تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔

اس نے ان آدمیوں کو بہت سی ہدایات دیں اور کہا کہ وہ آدھی رات کے وقت کوچ کریں گے۔ صالح نمیری کا حکم چلتا تھا۔ اس کے حکم سے تمام ضروری سامان، اونٹ اور دودھ والی ایک اونٹنی شام سے پہلے پہلے تیار ہو گئے۔ صالح نمیری نے اس تمام سامان کا معائنہ کیا اور مطمئن ہو گیا۔

رات جب لوگ سو گئے تو فرح چوری چھپے اس کے کمرے میں آئی۔ اس نے تو آنا

ہی تھا کیوں کہ وہ حسن بن صباح کی اس سازش میں شامل تھی کہ صالح نمیری قلعے کی تحریر لکھ دے اور یہاں سے چلا جائے۔ انہیں یقین تھا کہ صالح نمیری اس خوفناک سفر سے زندہ واپس نہیں آسکے گا۔ انہوں نے صالح نمیری سے شہر احمد بن عطاش کے نام لکھوا لیا تھا۔

فرح نے حسبِ معمول صالح کے ساتھ پیار و محبت کی باتیں اور حرکتیں شروع کر دیں۔ اُس نے رونے کی بھی اداکاری کی اور اس قسم کے الفاظ کہے کہ وہ اس کی جدائی کو برداشت نہیں کر سکے گی۔ صالح نمیری کی فرح کی محبت میں جذباتی کیفیت ایسی ہو چکی تھی جو اُس کی برداشت سے باہر تھی۔ اُس نے فرح سے کہا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ چلے۔

”میں چلی تو چلوں لیکن ایسا نہ ہو کہ ساتھ جانے سے آپ کی مہم کو کوئی نقصان پہنچے“۔

”کوئی نقصان نہیں پہنچے گا“ ـــ صالح نمیری نے کہا ـــ ”تم ساتھ ہو گی تو میری ہمت قائم رہے گی“۔

”پھر آپ مجھے اجازت لے دیں“ ـــ فرح نے کہا ـــ ”لیکن میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ مجھے اجازت نہیں ملے گی“۔

صالح نمیری اجازت لینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ وہ جان گیا تھا کہ حسن بن صباح سحر اور علم نجوم کا عامل ہے اور اس سے بڑھ کر اُس کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ حسن بن صباح کے اس علم اور عمل کا قائل ہو گیا تھا۔ اُس نے سچ مان لیا تھا کہ خزانہ موجود ہے اور اس کا وہی راستہ ہے جو حسن بن صباح نے اسے بتایا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس قسم کے جادوگر اپنے ساتھ ایک دو خوبصورت لڑکیاں رکھتے ہیں۔ فرح کو بھی اُس نے ایسی ہی لڑکی سمجھا تھا اور اُس نے یہ بھی مان لیا تھا کہ فرح امیرِ شاہ در احمد بن عطاش کی بھانجی ہے اور اس نے یہ بھی تسلیم کر لیا تھا کہ فرح اُسی کی محبت میں مبتلا ہو گئی ہے۔

یہ سب کچھ جانتے ہوئے اُس نے اپنے آپ کو یقین دلا لیا تھا کہ فرح کو ساتھ لے جانے سے اس کی مہم پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑے گا۔ فرح اُس کا جذباتی معاملہ بھی بن گئی تھی لیکن یہ لڑکی اُس کے ساتھ جانے کو تیار نہیں تھی۔

صالح نمیری آخر اتنے بڑے شہر کا حکمران تھا۔ وہ برداشت نہ کر سکا کہ ایک لڑکی اُس

کی بات نہیں مان رہی۔ اُس نے اُسی وقت دو آدمیوں کو بلایا اور انہیں حکم دیا کہ اس لڑکی کے منہ پر کپڑا باندھ کر اسے لکڑی کے تابوت جیسے بکس میں ڈال دیا جائے اور اس بکس میں ہر طرف سے سوراخ کر دیئے جائیں تاکہ ہوا کا گزر ہوتا رہے۔

صبح طلوع ہوئی۔ حسن بن صباح جاگا تو وہ اچھل کر بستر سے نکلا۔ اُس نے اپنے دو آدمیوں کو بلایا اور ان سے پوچھا کہ صالح نمیری کا قافلہ چلا گیا ہے یا نہیں۔

”آپ کا تیر کبھی خطا نہیں گیا“ ـــ ایک آدمی نے ہنستے ہوئے کہا ـــ ”ہم اُس کی روانگی کو دیکھنے کے لئے جاگتے رہے ہیں“۔

”تم دونوں شاہ در چلے جاؤ“ ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ ”احمد بن عطاش سے کہو کہ میں نے خلجان لے لیا ہے۔ تم یہاں آجاؤ۔ اُسے ساری بات بتا دینا کہ صالح نمیری کو ہم نے کس طرح غائب کیا ہے۔ اُسے یہ بھی بتانا کہ اس میں فرح کا بھی کمال شامل ہے..... تم ابھی روانہ ہو جاؤ۔ فرح ابھی سوئی ہوئی ہو گی۔ اُسے سویا رہنے دو“۔

حسن بن صباح نے بہت دیر فرح کا انتظار کیا۔ اُسے ہر طرف تلاش کیا۔ وہ کہیں بھی نہ ملی۔

اُس وقت فرح سوراخوں والے تابوت میں بند نہ جانے کتنے میل خلجان سے دُور پہنچ چکی تھی۔ صالح نمیری کا قافلہ اُس جنگل میں داخل ہو چکا تھا جس میں حسن بن صباح کے کہنے کے مطابق بڑی خطرناک دلدل تھی۔

کیا حسن بن صباح پریشان ہو گیا تھا کہ فرح لاپتہ ہو گئی ہے؟

کیا اُس نے اپنے بالکوں کو حکم دیا تھا کہ صالح نمیری کے پیچھے جاؤ' فرح اُس کے ساتھ چلی گئی ہوگی!

کیا وہ فرح کے فراق میں دیوانہ ہُوا جا رہا تھا؟

نہیں..... اُس نے فرح کے تعاقب میں اپنے آدمی بھیجنے کی بجائے انہیں شلہ در احمد بن عطاش کے نام یہ پیغام دے کر بھیج دیا کہ میں نے خلجان کا شہر لے لیا ہے' فوراً یہاں آجائیں۔ اُس کی نگاہ میں ایک لڑکی کوئی ایسی اہمیت نہیں رکھتی تھی کہ اُس کے جذبات میں ہلچل بپا ہو جاتی۔ وہ ایک حسین لڑکی کو دوسروں کے جذبات میں ہلچل بپا کرنے اور دوسروں کو اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنے کا ذریعہ سمجھتا تھا۔

اس کی دنیا کی سرحد صرف ایک فرح کی محبت پر ختم نہیں ہو جاتی تھی۔ وہ ستاروں پر کمندیں ڈالنے والا انسان تھا۔

حسن بن صباح تھا تو انسان ہی لیکن اُس کی تاریخ کے واقعات گواہی دیتے ہیں کہ وہ انسانیت کی سرحدوں سے نکل کر ابلیسیّت کی سرحدوں میں داخل ہو گیا تھا۔

اُس کی نگاہیں افق کے اُس لامحدود گول دائرے تک دیکھ رہی تھیں جہاں آسمان جُھک کر زمین کو چومتا ہے۔ ایک فرح اُس کی نگاہوں کے آگے رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی۔

حسن بن صباح ایک آتش فشاں پہاڑ تھا اور وہ اپنے ابلیسی وجود میں ایسا لاوا پکا رہا تھا جس نے بڑی ہی اہم تاریخی شخصیات کو صفحہ ہستی سے غائب کر دینا تھا اور بستیاں اجاڑ دینی تھیں۔

حسن بن صباح نے وہ مقام حاصل کیا کہ اُس نے کسی بادشاہ کے قتل کا حکم دیا تو اُس کے فدائین نے اُسے قتل کر دیا۔ اس نے جو فدائین تیار کئے تھے وہ پاگل پن کی حد تک جنونی تھے۔ داستان گو آگے چل کر سنائے گا کہ حسن بن صباح نے ان پر یہ جنون کس طرح طاری کیا تھا کہ ان میں سے بعض خود بھی قتل ہو جاتے تھے لیکن اپنے شکار کو قتل کر کے قتل ہوتے تھے۔

داستان گو کو حسن بن صباح کے حکم سے قتل ہونے والی جن اہم شخصیتوں اور حکمرانوں کے نام فوری طور پر یاد آئے ہیں' وہ یہ ہیں:

1092ء میں حسن بن صباح نے جو سب سے پہلی نہایت اہم شخصیت قتل کروائی' وہ سلجوقی سلطان ملک شاہ کا وزیرِ خواجہ حسن طوسی تھا جسے غیر معمولی قابلیت اور حسنِ کارکردگی کی بدولت نظام الملک کا خطاب دیا تھا۔ نظام الملک حسن بن صباح کا محسن تھا۔

1092ء میں ہی حسن بن صباح نے نظام الملک کے دو بیٹوں کو قتل کروایا تھا۔

1102ء میں حمس کے ایک شہزادے کو اُس وقت قتل کروایا جب وہ جامع مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا۔

1113ء میں مُوصل کے شہزادہ مودُود کو جامع مسجد میں نماز پڑھتے قتل کروایا۔

1114ء میں سلجوقی سلطان سنجر شاہ کے وزیر عبدا لمظفر علی اور اس کے داواچکر بیگ کو قتل کروایا۔

1121ء میں فارس کے ایک سلطان کی موجودگی میں مرغ کے ایک شہزادے کا کام بغدلو میں تمام کروایا۔

1121ء میں ہی قاہرہ میں ایک مصری وزیر کو حسن بن صباح کے فدائیں نے قتل کیا۔

1126ء میں حلب اور مُوصل کے ایک شہزادے کو مسجد میں قتل کیا گیا۔

1127ء میں سنجر شاہ کے وزیر معین الدین کو فدائین نے قتل کیا۔

1129ء میں مصر کا خلیفہ حسن بن صباح کے فدائین کا شکار ہُوا۔

1134ء میں دمشق کا ایک شہزادہ فدائین کے ہاتھوں مارا گیا۔

1135ء سے 1138ء کے عرصے میں خلیفہ موسترشید' خلیفہ رشید اور آذربائی جان کا سلجوقی شہزادہ داوَد قتل ہوئے۔

1149ء میں طرابلس کا حکمران ریمانڈ فدائین کے ہاتھوں قتل ہُوا۔

1174ء سے 1176ء کے عرصے میں حسن بن صباح کے فدائین نے سلطان صلاح الدین ایوبی پر چار قاتلانہ حملے کئے اور سلطان ایوبی ہر بار بچ نکلا۔[1]

یہ تمام قتل حسن بن صباح کی زندگی میں نہیں ہوئے تھے۔ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے فدائین نے جو حشیشین کے نام سے مشہور ہوئے' اہم شخصیتوں کے قتل کا

ء[1] ان قاتلانہ حملوں کی سنسنی خیز تفصیلات مکتبہ داستان کی شہرۂ آفاق کتاب "داستان ایمان فروشوں کی" (پانچ جلدوں) میں پڑھیں۔

سلسلہ جاری رکھا تھا' پھر آہستہ آہستہ یہ لوگ کرائے کے قاتل بن گئے تھے۔ انہیں عیسائی بادشاہوں اور جرنیلوں نے بھی ایک دوسرے کو قتل کرنے کے لئے استعمال کیا تھا۔

○

یہ بہت بعد کی باتیں ہیں..... بہت بعد کے واقعات ہیں جب حسن بن صباح بے تاج بادشاہ اور ایک ہیبت کی علامت بن گیا تھا۔ قتل کے یہ تمام واقعات اپنے اپنے مناسب اور موزوں موقع پر سنائے جائیں گے۔ داستان گو ابھی داستان کے اس ابتدائی مرحلے میں ہے جہاں حسن بن صباح اپنے ابلیسی عزائم کی تکمیل کے لئے زمین ہموار کر رہا تھا۔ اُس نے اس خطے کا ایک اور قلعہ بند شہر خلجان لے لیا تھا۔

اُس کی نظر اب قلعہ الموت پر تھی جسے اُس نے اپنا مرکز اور مستقر بنانا تھا۔ اتنے بڑے عزائم اور اتنے بڑے منصوبے میں فرح کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

"یا مُرشد!" ـــ حسن بن صباح کے ایک خاص آدمی نے اُسے کہا ـــ "یہ تو معلوم کر لینا چاہئے وہ گئی کہاں؟ اگر وہ صالح نمیری کے ساتھ چلی گئی ہے تو خطرہ ہے کہ اُسے بخیر و عافیت واپس لے آئے گی"۔

"وہ اُسی کے ساتھ گئی ہے" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "اور اُسی کے ساتھ مرے گی۔ صالح نمیری کے دماغ پر جس طرح خزانہ سوار ہُوا ہے وہ واپس نہیں آئے گا"۔

اُس وقت صالح نمیری اُس جنگل میں داخل ہو چکا تھا جس کے اندر کہیں کہیں کچھ حصہ دلدلی تھا۔

فرح تابوت میں بند تھی۔ تابوت میں ہوا کے لئے سوراخ رکھے گئے تھے۔ تابوت ایک اونٹ پر لدا ہُوا تھا۔ فرح کے منہ پر کپڑا بندھا ہُوا تھا۔ صالح نمیری نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ ہم بہت دور آ گئے ہیں۔ اگر اس لڑکی کو واپس لے جانے کے لئے ہمارے پیچھے کوئی آتا تو وہ اب تک یہاں پہنچ چکا ہوتا۔ اب اس لڑکی کو تابوت سے نکال لیا جائے تو کوئی خطرہ نہیں۔

"ہاں امیر خلجان!" ـــ اُس کے ایک آدمی نے کہا ـــ "خطرہ کیسا؟ یہ بھاگ کر جائے گی کہاں؟"

تابوت کھول کر فرح کو نکال لیا گیا۔ ایک تو وہ تابوت میں گذشتہ رات سے بند تھی، اس کے ساتھ اونٹ کے ہچکولے' اُس کی ہڈیاں بھی دُکھ رہی تھیں۔ تابوت سے نکل کر کچھ دیر تو وہ بول ہی نہ سکی۔ صالح نمیری کے آدمی ان دونوں سے دور ایک اوٹ میں بیٹھ گئے تھے۔

"مجھے اپنے ساتھ کیوں لے آئے ہو؟" ـــ فرح نے ایسی آواز میں کہا جو رندھی ہوئی تھی اور غصیلی بھی تھی۔

"محبت کی خاطر!" ـــ صالح نمیری نے کہا۔

"اگر تمہیں میرے ساتھ اتنی ہی محبت ہے تو مجھے اتنی خطرناک مہم میں اپنے ساتھ نہ لے جاؤ" ـــ فرح نے کہا ـــ "کیا میں اتنی مشکلات اور اتنی زیادہ دشواریاں برداشت کر سکوں گی؟"

"محبت کی ابتدا تو تم نے کی تھی فرح!" ـــ صالح نمیری نے کہا ـــ "کیا تم میرے پاس محبت کا پیغام لے کر نہیں آئی تھیں؟ تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم میرے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہو"۔

فرح کی محبت کی جو حقیقت تھی وہ فرح جانتی تھی۔ اُسے تو جال میں دانے کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ وہ صالح نمیری کو جال میں لے آئی تھی۔ وہی جانتی تھی کہ اس خزانے کا وجود ہے ہی نہیں جس کی تلاش میں صالح نمیری جا رہا ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ حسن بن صباح نے صالح نمیری کو موت کے منہ میں ڈال دیا ہے اور اس کا زندہ واپس آ جانا کسی صورت ممکن نہیں، لیکن اُس کے اپنے زندہ واپس آ جانے کے امکانات بھی ختم ہو چکے تھے۔

وہ تو اب یہ سوچ رہی تھی کہ حسن بن صباح سے وفا کرے یا اپنی زندگی سے۔ یہ عمر مرنے کی نہیں تھی جب اُس کا شباب عروج پر تھا۔ صالح نمیری کے ساتھ اُس نے بات کر کے دیکھ لی تھی۔ یہ شخص تو ایک چٹان تھا جسے اپنی جگہ سے سرکانا فرح کے بس کی بات نہیں تھی۔

اُس کے سامنے ایک راستہ یہ تھا کہ صالح نمیری کو بتا دے کہ وہ ایسے دھوکے کا شکار ہو رہا ہے جس کا انجام موت ہے اور وہ وہیں سے واپس چلا جائے' اور اگر وہ واپس نہ گیا تو وہ صرف مرے گا ہی نہیں بلکہ اس کا اتنا بڑا شہر خلجان اور قلعہ ہاتھ سے نکل جائے گا اور

اس کا خاندان بھکاری بن جائے گا۔

اُس نے اس پر غور کیا تو اُسے صاف نظر آنے لگا کہ اُسے حسن بن صباح غداری کے جرم میں قتل کرا دے گا۔ اُسے معلوم تھا کہ حسن بن صباح کا دل رحم اور بخشش کے جذبات سے خالی ہے۔ کسی کو قتل کرا دینے سے اُسے روحانی تسکین ملتی تھی۔

فرح کے لئے اِدھر بھی موت تھی اُدھر بھی موت۔ اسے یہ دیکھنا تھا کہ کون سی موت آسان ہے۔

اگر وہ حسن بن صباح سے وفا کرتی ہے تو وہ آگے آنے والے صحرا میں جھلس کر' پیاس سے تڑپ تڑپ کر بڑی ہی اذیّت ناک موت مرے گی۔ جل جل کر مرے گی..... ایسی موت کے تصوّر سے ہی اُس نے اپنے وجود میں لرزہ محسوس کیا۔

پھر اسے دوسرا خیال آیا۔ وہ صالح نمیری کو واپس لے جاتی ہے اور حسن بن صباح کو اس کی غداری کا پتہ چل جاتا ہے تو وہ اپنے ہاتھوں یا اپنے کسی آدمی کے ہاتھوں اُس کا سر تن سے جدا کرا دے گا۔ یہ موت سہل ہو گی۔

وہ تو زندہ رہنا چاہتی تھی۔ حسن بن صباح نے اُسے آلۂ کار بنایا تھا اور اُسے شہزادی بنا کے رکھا ہُوا تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ حسن بن صباح اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ حسن بادشاہوں کا بادشاہ بنتا جا رہا تھا' لیکن زندگی بڑی پیاری ہوتی ہے۔ وہ تو سوچ سوچ کر بے حال ہوئی جا رہی تھی۔

○

"کس گہری سوچ میں کھو گئی ہو فرح!" ——صالح نمیری نے کہا—— "واپس جانے کا خیال دل سے نکال دو۔ دل میں اس خزانے کو رکھو جو ہم لینے جا رہے ہیں۔ میں واپس آ کر باقاعدہ فوج بناؤں گا اور اس علاقے کے تمام قلعے فتح کر لوں گا۔ میں بادشاہ ہوں گا' تم ملکہ ہو گی"۔

"اگر ہم زندہ واپس نہ آئے تو!" ——فرح نے کہا۔

"ہم زندہ واپس آئیں گے" ——صالح نمیری نے کہا۔

"اگر میں کہوں کہ آپ جہاں جا رہے ہیں وہاں کوئی خزانہ نہیں تو کیا آپ مان لیں گے؟" ——فرح نے پوچھا۔

"بالکل نہیں!" ——صالح نمیری نے کہا۔

فرح نے دیکھا کہ صالح نمیری کے دماغ پر خزانہ ایسا سوار ہُوا ہے کہ اُس کا دماغی توازن صحیح نہیں رہا۔ اُس نے ایک اور دلیل سوچ لی۔

"آپ تو بڑے پکے مسلمان ہُوا کرتے تھے" ——فرح نے کہا—— "پتہ چلا تھا کہ آپ زاہد اور پارسا ہیں' اہلِ سُنّت ہیں لیکن اس خزانے نے تو آپ کے دل سے خدا کو نکال دیا ہے۔ میں آپ کی کچھ نہیں لگتی لیکن آپ مجھے اپنے ساتھ لے آئے ہیں' صرف اس لئے کہ میں خوبصورت اور جوان لڑکی ہوں"۔

"میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتی ہو" ——صالح نمیری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا—— "مجھے آگے جانے سے روکنے کے لئے تم یہ کہو گی کہ مسلمان اپنے دلوں میں خزانے کا لالچ نہیں رکھا کرتے۔ تم مجھے خلفائے راشدین کی سادگی کی باتیں سناؤ گی..... میری بات غور سے سن لو فرح! وہ وقت اور تھا' وہ مسلمان اور تھے۔ آج کے وقت کا تقاضا کچھ اور ہے۔ آج طاقت اُس کے پاس ہے جس کے پاس خزانہ ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ آج خدا بھی اُسی کا ہے جس کے پاس خزانہ ہے۔ میں نے خدا کے آگے رکوع و سجود کرتے ایک عمر گذار دی ہے لیکن خدا نے مجھے اس خزانے کا اشارہ نہیں دیا"——

اچانک اُس کی آواز اونچی اور تحکمانہ ہو گئی۔ اُس نے کہا—— "تم میری ملکیت ہو۔ تم اس سفر کی صعوبتوں اور خطروں کے اور موت کے خوف سے مجھے آگے بڑھنے سے روک رہی ہو۔ میں قلعہ خلجان کا والی اور امیرِ شہر ہوں۔ میرا حکم چلتا ہے۔ یہ گیارہ آدمی جو میرے ساتھ جا رہے ہیں' یہ میرے حکم کے غلام ہیں۔ تم بھی میرے حکم کی پابند ہو"۔

خزانے کے تو اپنے اثرات تھے' لیکن صالح نمیری کو فرح نے ایک پھول دیا تھا جس کی خوشبو کی اُس نے بہت تعریف کی تھی۔ پھر فرح نے اُسے رُوئی پر اسی خوشبو کا عطر لگا کر دیا جو اُس نے اپنی مونچھوں پر مل لیا تھا۔ وہ نہ جان سکا کہ یہ خوشبو حسن بن صباح کی ایجاد ہے اور یہ خوشبو انسان کے خیالات کو بدل دیتی ہے۔ تصوّر کو انسان حقیقت اور حقیقت کو تصوّر سمجھنے لگتا ہے۔

فرح خاموش ہو گئی۔

دن ابھی آدھا گذرا تھا۔ صالح نمیری نے اپنے قافلے کو کوچ کا حکم دیا اور یہ حکم بھی کہ تابوت کو توڑ دیا جائے۔ انہوں نے چار گھوڑے فالتو ساتھ لے لئے تھے۔ سفر ایسا تھا

کہ گھوڑے مر سکتے تھے۔ یہ چار گھوڑے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ساتھ لے جائے جا رہے تھے۔ ایک گھوڑے پر فرح کو سوار کر دیا گیا۔

○

جنگل زیادہ گھنا ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں اونچی نیچی ٹیکریاں اور سلوں والی چٹانیں بھی تھیں۔ جگہ جگہ پانی جمع تھا۔ چلنے کا راستہ مشکل سے ہی ملتا تھا۔ ہر آٹھ دس قدموں کے بعد دائیں یا بائیں مڑنا پڑتا تھا۔ اس طرح فاصلہ زیادہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

سورج افق کے پیچھے چلا گیا۔ جنگل اتنا گھنا تھا کہ شام بہت جلد تاریک ہو گئی۔ صالح نمیری وہیں رک گیا اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ رات گذارنے کے لئے جگہ دیکھیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک جگہ دیکھ لی گئی جو قدرے وسیع اور ہموار تھی۔ اس کے اردگرد ہری سرسبز ٹیکریاں تھیں۔ گھنے درختوں نے شامیانے تان رکھے تھے۔

دو مشعلیں جلا کر زمین میں گاڑ دی گئیں۔ صالح نمیری کا خیمہ نصب ہونے لگا تو فرح بگڑ گئی۔

"میں الگ خیمے میں سوؤں گی" ——— اُس نے کہا ——— "اپنے ساتھ چھوٹے خیمے بھی ہیں"۔

"آخر تم نے میری بیوی بننا ہے" ——— صالح نمیری نے کہا ——— "یہ تمہارا اپنا فیصلہ ہے۔ اگر تم میرے خیمے میں سوؤ گی تو یہ معیوب فعل نہیں ہو گا"۔

"بیوی بن جانے تک آپ میرے لئے غیر مرد ہیں" ——— فرح نے کہا ——— "میں مسلمان کی بیٹی ہوں۔ میں اسلام کی پوری پابندی کروں گی"۔

"ایک چھوٹا خیمہ اور لگا دو" ——— صالح نمیری نے حکم کے لہجے میں کہا۔

خیمہ گاہ میں دو چھوٹے اور دو بڑے خیمے کھڑے ہو گئے۔ بڑے خیمے گیارہ آدمیوں کے لئے تھے جو چھوٹے خیموں سے دور نصب کئے گئے تھے۔ دونوں چھوٹے خیموں کے درمیان فرح نے خاصا فاصلہ رکھوایا تھا۔ اُس نے صالح نمری کے ساتھ ایسی باتیں کی تھیں کہ یہ شخص اس سے متاثر ہو گیا اور وہ فرح کو شرم و حجاب والی با اخلاق لڑکی سمجھ بیٹھا۔ اُسے بتانے والا کوئی نہ تھا کہ یہ لڑکی حسن بن صباح کی شاگرد ہے اور زبان کا جادو چلانے میں مہارت رکھتی ہے۔ فرح نے اُسے اپنی محبت کا بھی یقین دلا دیا تھا۔

کھانا کھا کر سب سو گئے۔ دن بھر کی گھوڑ سواری نے ان کی ہڈیاں توڑ دی تھیں۔

انہیں بیہوشی جیسی نیند نے خوابوں کی دنیا میں پہنچا دیا۔ صرف فرح تھی جو جاگ رہی تھی اور نیند پر غلبہ پانے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ وہ دوسروں کے سو جانے اور بہت سا وقت گذر جانے کی منتظر تھی۔ اُس نے کچھ سوچ کر صالح نمیری کے ساتھ وہ باتیں کی تھیں جن سے وہ متاثر بلکہ مسحور ہو گیا تھا۔

چاند اوپر آ گیا تھا۔ مشعلیں سونے سے پہلے بجھا دی گئی تھیں۔ جنگل اور صحرا کی چاندنی بڑی ہی شفاف ہوا کرتی ہے۔ چاندنی کی کرنیں درختوں سے چھن چھن کر آ رہی تھیں۔ رات دبے پاؤں گذرتی جا رہی تھی۔

فرح اُس دَور کی لڑکی تھی جب عورتیں بھی اپنے مردوں کے دوش بدوش لڑنے کے لئے میدانِ جنگ میں پہنچ جایا کرتی تھیں۔ یہ الگ بات ہے کہ مرد انہیں پیچھے رکھتے لڑاتے نہیں تھے۔ اُس وقت عورتیں بھی گھوڑ سواری، تیغ زنی وغیرہ میں مہارت رکھتی تھیں۔ فرح تو خاص طور پر پھرتیلی اور چست و چالاک لڑکی تھی۔

نصف شب سے کچھ دیر پہلے فرح خیمے سے نکلی اور قریب کے ایک درخت کی اوٹ میں ہو گئی۔ خیموں کو باری باری دیکھا۔ ہر خیمے کے پردے گرے ہوئے تھے۔ وہ پیچھے ایک اور درخت کی اوٹ میں چلی گئی۔ وہاں اونچی گھاس تھی۔ وہ اس گھاس کے پیچھے ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چل پڑی۔

گھوڑے اور اونٹ خیموں سے کچھ دور ایک ٹیکری کے پیچھے باندھے گئے تھے۔ فرح خیموں سے دور چلی گئی تھی۔ گھاس، جھاڑیوں اور درختوں کی اوٹ میں وہ چکر کاٹ کر گھوڑوں تک پہنچی۔ زینیں وغیرہ گھوڑوں کے قریب پڑی تھیں۔ فرح نے ایک زین بغیر آواز پیدا کئے اٹھائی اور ایک گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ کر کس دی پھر گھوڑے کے منہ پر لگام بھی چڑھا دیا۔ رکاب میں پاؤں رکھا اور گھوڑے پر سوار ہو گئی۔

اُس نے گھوڑے کو فوراً ایڑ نہ لگائی تاکہ قدموں کی آہٹ نہ ہو لیکن وہ زمین پتھریلی تھی، آواز پیدا ہو ہی گئی۔ رات کے سناٹے میں ہلکی سی یہ آواز اتنی اونچی سنائی دی کہ ایک آدمی کی آنکھ کھل گئی۔ اُسے گھوڑے کے ٹاپ سنائی دینے لگے جو دور ہٹتے جا رہے تھے۔

وہ اپنے کسی ساتھی کو جگائے بغیر خیمے سے نکلا اور اپنے گھوڑوں کی طرف گیا۔ ایک گھوڑا کم تھا۔ زینیں دیکھیں۔ ایک زین کم تھی۔

"ایک گھوڑا کوئی لے گیا ہے اوئے!" — اُس نے بلند آواز سے کہا۔

اُس کے ساتھی ہڑبڑا کر اُٹھے اور باہر کو دوڑے۔ اُدھر کچھ دور گھوڑے کے سرپٹ دوڑتے ٹاپ سنائی دیئے۔ فرح نے اس خیال سے گھوڑے کو ایڑ لگادی تھی کہ وہ خاصی دُور نکل آئی ہے۔ اسے واپسی کے راستے کا اندازہ تھا۔

ان سب کی آوازوں پر صالح نمیری بھی جاگ اٹھا۔ خیمے سے نکل کر اس نے وہیں سے پوچھا یہ کیا شور ہے۔

"ایک گھوڑا چوری ہو گیا ہے" — ایک آدمی نے کہا۔

صالح نمیری یہ سنتے ہی فرح کے خیمے کی طرف دوڑا۔ خیمے میں دیکھا۔ فرح وہاں نہیں تھی۔

"بدبختو!" — صالح نمیری نے کہا — "وہ بھاگ گئی ہے۔ دو آدمی فوراً اس کے پیچھے جاؤ۔ وہ موت کے ڈر سے میرا ساتھ چھوڑ گئی ہے۔ اُسے پکڑ کر لے آؤ۔ میں اُسے یہیں درخت کے ساتھ الٹا لٹکا کر آگے چلا جاؤں گا"۔

دو آدمیوں نے بہت تیزی سے گھوڑوں پر زینیں کسیں اور سوار ہو کر ایڑ لگادی۔

○

فرح دُور نکل گئی تھی اور وہ صحیح راستے پر جارہی تھی۔ گھوڑا اس کا خوب ساتھ دے رہا تھا۔ شفاف چاندنی اسے راستہ دکھا رہی تھی۔ وہ تین میل سے زیادہ فاصلہ طے کر گئی۔ ایک جگہ درخت کم ہو گئے تھے اور ایک دوسرے سے دور دور تھے۔

اُس نے بڑی زور سے باگ کھینچی۔ طاقتور گھوڑا فوراً رک گیا۔ فرح کو بیس پچیس گھوڑ سوار دکھائی دیئے جو دائیں سے بائیں طرف جارہے تھے یعنی فرح کا راستہ کاٹ رہے تھے۔ فاصلہ ایک سو گز سے کچھ کم ہی ہوگا۔ فرح ان کے گذر جانے کا انتظار کرنے لگی۔ اُس کا راستہ یہی تھا۔ فرح اگر مرد ہوتی تو اسے رکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ رات کو مسافر چلتے ہی رہتے ہیں لیکن فرح جوان اور بڑی ہی خوبصورت لڑکی تھی اور اس جنگل میں تنہا تھی۔ اُسے کسی آدمی نے بخشنا نہیں تھا۔

ان سواروں میں سے کسی نے فرح کو دیکھ لیا اور ایک آدمی کو بتایا جو اس قافلے کے آگے آگے جارہا تھا۔ اُس نے حکم دیا کہ جاؤ دیکھو کون ہے، مجھے تو عورت لگتی ہے۔

ایک سوار نے فرح کی طرف گھوڑا دوڑایا۔ فرح نے اپنا گھوڑا ایک اور طرف دوڑا

دیا۔ حکم دینے والے آدمی نے کہا کہ دو تین اور آدمی جاؤ..... تین اور سواروں نے گھوڑے دوڑا دیئے۔ فرح نے ان سے بچنے کی بہت کوشش کی۔ گھوڑے کو بہت موڑا اور گھمایا لیکن وہ چار سواروں کے گھیرے میں آگئی اور پکڑی گئی۔

اُدھر سے صالح نمیری کے دو سوار آگئے۔ انہوں نے فرح کو دیکھا تو رک گئے۔

"یہ ہمارے امیر کی لڑکی ہے" — ایک سوار نے کہا — "اُس سے بھاگ آئی ہے۔ اسے ہمارے حوالے کر دو"۔

"نہیں!" — فرح نے کہا — "یہ جھوٹ کہتے ہیں۔ ان کے امیر کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔ یہ مجھے اغوا کر کے لے جارہے تھے اور میں بھاگ آئی۔ مجھے خلجان پہنچا دو"۔

"تم بھائیو جاؤ" — صالح نمیری کے ایک سوار نے کہا — "یہ جس کی لڑکی ہے وہ خلجان کا امیر اور والیٔ قلعہ ہے۔ ہم اسے اُس کے حوالے کریں گے"۔

فرح نے ان کے ساتھ جانے سے صاف انکار کر دیا۔ چار سواروں نے صالح نمیری کے سواروں سے کہا کہ وہ واپس چلے جائیں اور اس لڑکی کو بھول جائیں۔ دونوں سواروں نے ان چار سواروں کو عام مسافر سمجھ کر تلواریں نکال لیں۔ ان چاروں نے بھی تلواریں نکال لیں، پھر تلواروں سے تلواریں ٹکرانے لگیں۔ تب ان دو سواروں کو پتہ چلا کہ یہ تو بڑے ماہر تیغ زن ہیں۔ انہوں نے مقابلہ تو کیا لیکن وہ چار تھے۔ ان کی تلواروں نے ان دونوں کو بُری طرح کاٹ پھینکا۔

ان سواروں نے صالح نمیری کے سواروں کی تلواریں اٹھائیں، نیامیں اتار کر تلواریں ان میں ڈالیں، ان کے گھوڑے پکڑے اور فرح کو ساتھ لے کر چل پڑے۔

"تم کون لوگ ہو؟" — فرح نے ان سے پوچھا — "کہاں جارہے ہو؟"

"غلط فہمی میں نہ رہنا لڑکی!" — ایک نے کہا — "ہم کسی کو دھوکے میں نہیں رکھا کرتے۔ ہم صحرائی قزاق ہیں۔ اپنے سردار کے پاس جارہے ہیں"۔

"کیا تم لوگ مجھے خلجان پہنچا دو گے؟" — فرح نے کہا — "مجھے خلجان کے راستے پر ڈال دینا، میں اکیلی چلی جاؤں گی"۔

"تمہارے اس سوال کا جواب ہمارا سردار ہی دے سکتا ہے" — ایک سوار نے کہا۔

"جواب مجھ سے سن لو" — ایک اور سوار بولا — "تم بہت حسین لڑکی ہو۔ ہیروں کی قدر صرف ہمارا سردار ہی کر سکتا ہے۔ وہ تمہیں نہیں جانے دے گا"۔

فرح کے لئے یہ خبر بہت ہی بری تھی۔ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی سوائے اس کے کہ ان کے ساتھ چلی جاتی۔ اُس نے کیا بھی یہی۔ مزاحمت تو دُور کی بات ہے' اُس نے زبان بھی نہ ہلائی اور اس طرح ان کے ساتھ چل پڑی جیسے وہ اپنی خوشی اور مرضی سے جا رہی ہو لیکن اُس کا دماغ بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔

اُس کے دل و دماغ پر حسن بن صباح طاری رہتا تھا اس لئے اُس کے سوچنے کا انداز حسن بن صباح جیسا ہی تھا..... اور یہ انداز ابلیسی تھا..... ایسے اندازِ فکر میں یہ پابندی نہیں ہُوا کرتی کہ کسی کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچے اور اپنا مفاد حاصل کرتے کرتے کسی اور کی حق تلفی نہ ہو جائے۔ اس لڑکی کے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ باپ بیٹے کو ذبح کر دے' بہن بھائی کا گلا کاٹ دے' بیٹا ماں کا پیٹ چاک کر دے' میرا بھلا ہو جائے۔

قزاقوں کے سردار تک پہنچتے فرح کے دماغ نے اُسے راہِ نجات دکھا دی۔

○

"اوہ!" — سردار نے چاندنی میں فرح کا چہرہ دیکھ کر حیرت زدگی کے عالم میں کہا — "کیسے مان لوں کہ تُو نسلِ انسانی سے ہے اور تُو جہانِ دِگر کی پُراسرار مخلوق میں سے نہیں؟"

سردار لب و لہجے اور انداز تکلّم سے عربی لگتا تھا۔ عرب یوں بات کیا کرتے تھے جیسے آزاد نظم سنا رہے ہوں۔

"یہ کہتی ہے اسے امیرِ خلجان اغوا کر کے لے جا رہا تھا" — ایک سوار نے کہا۔

"دو سوار اس کے پیچھے آئے تھے" — ایک اور سوار بولا — "ہم نے دونوں کو مار ڈالا ہے"۔

"امیر خلجان؟" — سردار نے سوالیہ انداز سے پوچھا — "یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ یہ چاند نہیں سورج ہے۔ امیرِ خلجان کو کیا پڑی ہے کہ وہ ایک لڑکی کو اغوا کر کے لے جا رہا ہو؟..... کیا وہ تجھے کہیں سے زبردستی اٹھوا کر خلجان لے جا رہا تھا؟..... گھوڑے سے اُترو' آؤ' ہمارے پاس بیٹھو اور گلاب کی ان پنکھڑیوں کو ذرا حرکت دو کہ ہم تیری اصلیت جان سکیں"۔

"پہلے ان پنکھڑیوں کی قدر و قیمت پہچانو" — فرح نے سردار کا اندازِ تکلّم بھانپ کر کہا — "تم پتھروں کے سوداگر ہو' ہیروں کی قدر کیا جانو!..... پہلے میں ایک امیرِ شہر کی داشتہ تھی' اب ایک قزاق کی لونڈی بن گئی ہوں۔ میری اصلیت کو قزاقوں کا سردار نہیں سمجھ سکتا"۔

"ہاہا' ہاہا!" — سردار نے فرمائشی قہقہہ لگا کر کہا — "میں چاندنی میں ہیروں کی طرح چمکتی ہوئی تیری آنکھوں کو دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ انسان کے نطفے سے پیدا ہونے والی کسی عورت کی آنکھیں اس قدر مخمور اور سحر انگیز ہو سکتی ہیں؟ لیکن تیری زبان کا حُسن ان نشیلی آنکھوں کے سحر سے زیادہ اثر انگیز ہے"۔

"میرے حُسن کو ہی نہ دیکھ اے سردار!" — فرح نے کہا — "میں تجھے ہفت اقلیم کا شہنشاہ بنا سکتی ہوں تیری ذرا سی ہمت کی ضرورت ہے۔ اب اپنی حالت دیکھ' اپنے آپ کو پہچان۔ کیا تُو شکار کی تلاش میں جنگل جنگل' صحرا صحرا مارا مارا نہیں پھر رہا؟ کسی بہت بڑے قافلے کو لُوٹ کر تُو بہت بڑا خزانہ حاصل کر لیتا ہے لیکن رہتا قزاق کا قزاق ہی ہے۔ میں تجھے ایک خزانے کا راستہ دکھاتی ہوں۔ وہ تیرے ہاتھ آ جائے تو تُو ایک فوج تیار کر کے سلطنتِ سلجوق پر قبضہ کر سکتا ہے' عرب اور مصر کو اپنی سلطنت میں شامل کر سکتا ہے"۔

"کیا تو اپنے ہوش و حواس میں ہے لڑکی؟" — سردار نے کہا — "اگر تو دہشت زدگی سے دماغی توازن کھو نہیں بیٹھی تو یوں بول کہ میں کچھ سمجھ سکوں"۔

فرح نے ایک پتھر سے دو پرندے مارنے کی جو ترکیب سوچی تھی وہ اُس نے قزاقوں کے سردار کو سنا دی۔

"امیر خلجان ایک بڑا خزانہ نکال لانے کے لئے جا رہا ہے" — فرح نے کہا۔

"کہاں سے؟"

"نقشہ اُس کے پاس ہے" — فرح نے کہا — "اس پر راستہ دکھایا گیا ہے۔ واضح نشانیاں بھی موجود ہیں اور جن خطروں کا امکان ہے وہ بھی نقشے میں دکھائے گئے ہیں اور اس جگہ کی نشانیاں صاف دکھائی ہوئی ہیں جہاں خزانہ ایک غار میں رکھا ہُوا ہے"۔

"خزانے کی نشاندہی کس نے کی ہے؟"

"ایک درویش نے!" — فرح نے جھوٹ بولا — "امیر خلجان صالح نمیری نے

اس کی بہت خدمت کی تھی۔ میں نے سنا تھا کہ اس درویش کی کوئی خواہش تھی یا ضرورت تھی جو امیرِ خلجان نے بسروچشم پوری کردی تھی"۔

"اور یہ بتا" —— سردار نے پوچھا —— "تو مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہوگئی ہے کہ اتنا بڑا راز مجھے دے رہی ہے؟"

"اس کی وجہ بھی سن لے!" —— فرح نے کہا —— "میرے دل میں خزانے کی ذرا سی بھی محبت نہیں۔ اس دل میں ایک آدمی کی محبت ہے۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں امیرِ خلجان کی داشتہ تھی۔ کچھ وقت ملتا تو اُس آدمی سے مل لیتی تھی۔ امیرِ خلجان درویش کے بتائے ہوئے خزانے کی تلاش میں چلا تو میں بہت خوش ہوئی کہ یہ جارہا ہے تو میں اپنے محبوب کے پاس چلی جاؤں گی اور ہماری شادی ہو جائے گی لیکن امیرِ خلجان مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے آیا۔ سفر میں آج ہماری پہلی رات ہے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور بھاگ نکلی۔ اگر تیرے آدمی مجھے پکڑ نہ لیتے تو میں کل اُس کے پاس ہوتی جو مجھے چاہتا ہے"۔

"کیا تو یہ چاہتی ہے کہ میں تجھے چھوڑ دوں؟" —— سردار نے پوچھا۔

"ہاں!" —— فرح نے کہا —— "تو خزانوں کا متلاشی ہے، میں محبت کی پیاسی ہوں"۔

"لیکن تجھے امیرِ خلجان تک چلنا پڑے گا" —— سردار نے کہا —— "تیری یہ بات دھوکہ بھی تو ہو سکتی ہے۔ مجھے نقشہ مل جائے گا تو تجھے آزاد کردوں گا"۔

"تو تو مجھے آزاد کردے گا" —— فرح نے کہا —— "امیرِ خلجان کو تو نے زندہ چھوڑ دیا تو وہ مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا"۔

"وہ زندہ نہیں رہے گا" —— سردار نے کہا —— "اٹھو، اپنے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ"۔

○

"وہ ابھی تک نہیں آئے" —— صالح نیمری کئی بار کہہ چکا تھا۔

"وہ اسے جانے نہیں دیں گے" —— ہر بار اُس کا کوئی نہ کوئی آدمی اُسے کہتا، یا —— "جنگل میں بھٹک گئی ہوگی" —— یا یہ —— "جا نہیں سکتی۔ وہ اُسے لے کے ہی آئیں گے"۔

پھر انہیں گھوڑوں کے ٹاپ سنائی دینے لگے۔

"وہ آرہے ہیں" —— دو تین آدمیوں نے کہا۔

"اب میں اُسے ہر رات باندھ کے رکھا کروں گا" —— صالح نیمری نے کہا۔

"نہیں امیرِ محترم!" —— ایک آدمی نے کہا —— "ہم اور آگے نکل جائیں گے تو یہ بھاگنے کی جرأت نہیں کرے گی۔ میں جانتا ہوں۔ کل کے سفر میں یہ جنگل ختم ہو جائے گا اور بے آب و گیاہ پہاڑی علاقہ شروع ہو جائے گا"۔

"ٹھہرو!" —— صالح نیمری نے کہا —— "سنو..... گھوڑے دو یا تین نہیں لگتے۔ کیا یہ بہت سے گھوڑے نہیں؟"

"ہاں امیرِ محترم!" —— ایک آدمی نے کہا۔

وہ ابھی سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ آنے والے گھوڑے دو ہیں، تین ہیں یا زیادہ ہیں کہ گھوڑوں کے ٹاپوں کا طوفان آگیا اور اس کے ساتھ یہ للکار —— "جو جہاں ہے وہیں کھڑا رہے"۔

وہ تقریباً پچیس قزاق تھے جنہوں نے صالح نیمری کی اس چھوٹی سی خیمہ گاہ کو گھیرے میں لے لیا۔

"امیرِ خلجان! نقشہ میرے حوالے کردے" —— سردار نے کہا —— "وہ خزانہ ہمارا ہے"۔

صالح نیمری چپ چاپ اپنے خیمے میں چلا گیا۔ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں تلوار تھی۔

"دیکھتے کیا ہو" —— اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا —— "ہتھیار اٹھاؤ۔ وہ خزانہ ہمارا ہے"۔

"ایک بار پھر سوچ لے صالح نیمری!" —— سردار نے کہا —— "ہم قزاق ہیں اور ہم زیادہ ہیں۔ نقشہ میرے حوالے کردو اور زندہ واپس چلے جاؤ"۔

صالح نیمری کچھ جواب دیئے بغیر سردار کی طرف تیزی سے بڑھا۔ سردار کا گھوڑا اس کی طرف بڑھا۔ صالح نیمری تیزی سے بیٹھ گیا اور سردار کے گھوڑے کے پیٹ میں تلوار اتار دی۔ گھوڑا بڑی زور سے ہنہنایا اور اچھلنے کودنے لگا۔ سردار گھوڑے سے کود آیا۔

صالح نیمری کے ساتھ اب نو آدمی رہ گئے تھے۔ وہ جانباز قسم کے آدمی تھے۔ ان

میں سے بعض نے تلواریں اٹھائی تھیں اور بعض کے پاس برچھیاں تھیں۔ ان سب نے جانوں کی بازی لگادی لیکن تو پیادے تھے، پچیس سواروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

معرکہ بڑا ہی خونریز تھا۔ فرح الگ کھڑی دیکھ رہی تھی اور اپنی چال کی کامیابی پر بہت ہی خوش تھی۔ وہ اب بھاگ نکلنے کا موقع دیکھ رہی تھی۔ اُس نے صرف یہ دیکھنا تھا کہ صالح نمیری مارا جاتا ہے یا نکل بھاگتا ہے۔ اُسے اتنے گھمسان کے معرکے اور اِدھر اُدھر بھاگتے دوڑتے، گھومتے مڑتے گھوڑوں میں صالح نمیری اور قزاقوں کا سردار نظر نہیں آ رہے تھے۔

"لڑکی اِدھر آجا!" — فرح کو آواز سنائی دی — "اپنے امیر کے خیمے تک آجا لڑکی!"

فرح گھوڑے سے اُتری اور صالح نمیری کے خیمے تک دوڑتی گئی۔ چاند سر پر آیا ہُوا تھا۔ چاندنی بہت ہی صاف ہو گئی تھی۔ اُس نے خیمے کے قریب صالح نمیری کی لاش پڑی دیکھی۔

"میرے ساتھ خیمے میں آ" — سردار نے فرح سے کہا — "اور بتا وہ نقشہ کہاں ہے"۔

سردار اور فرح اندر چلے گئے۔ فرح نے چمڑے کا ایک تھیلا اٹھا کر سردار کے حوالے کیا اور بتایا کہ نقشہ اس میں ہے۔ سردار تھیلا اٹھائے خیمے سے باہر آ گیا۔ تھیلے میں کچھ اور چیزیں پڑی تھیں جو سردار نے باہر پھینک دیں پھر اس میں سے نقشہ نکلا۔

فرح نے کہا یہی ہے اور وہ وہاں سے چل پڑی۔

"کہاں جا رہی ہے تُو؟" — سردار نے اس سے پوچھا۔

"تجھے خزانے کا نقشہ مل گیا ہے" — فرح نے چند قدم دُور رُک کر کہا — "سمجھ لے کہ تجھے خزانہ مل گیا ہے اور مجھے آزادی مل گئی ہے"۔

"ٹھہر جا!" — سردار نے کہا — "میں اتنی جلدی تجھے آزادی نہیں دوں گا۔ تو مرجھایا ہُوا پھول تو نہیں کہ بغیر سونگھے پھینک دوں"۔

وہ قزاقوں کا سردار تھا۔ کوئی شریف اور معزز آدمی نہیں تھا کہ اپنے وعدے کا پاس کرتا۔ اتنی خوبصورت لڑکی کو وہ کیونکر چھوڑ دیتا۔ فرح اپنے گھوڑے کی طرف دوڑی تو سردار اُس کے راستے میں آ گیا۔ فرح دوسری طرف دوڑ پڑی۔ لڑائی ابھی لڑی جا رہی

تھی۔ صالح نمیری کے آدمی مارے جا رہے تھے۔ انہوں نے مرنے سے پہلے کچھ قزاقوں کو بھی مار ڈالا تھا۔

فرح دوسری طرف دوڑی تو سردار اُس کے پیچھے گیا۔ فرح اس کوشش میں تھی کہ وہ مرے ہوئے کسی آدمی کے گھوڑے تک پہنچ جائے۔ سواروں کے بغیر گھوڑے اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے لیکن سردار فرح کو کسی گھوڑے کے قریب نہیں جانے دے رہا تھا۔ فرح پھرتیلی تھی۔ وہ تیز دوڑتی خیمہ گاہ سے کچھ دُور چلی گئی۔ سردار بھی تیز دوڑا۔

آگے اونچی اور گھنی جھاڑیاں تھیں جو باڑ کی طرح ایک دوسری سے ملی ہوئی تھیں۔ فرح ان میں سے گذر گئی لیکن آگے دلدل تھی۔ وہ راستہ بدلنے ہی لگی تھی کہ سردار پہنچ گیا۔ فرح دلدل میں چلتی آگے چلی۔ چند ہی قدم آگے گئی ہو گی کہ اُسے ایسے لگا جیسے اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی ہو۔ وہ نیچے جانے لگی۔

سردار چیتے کی طرح اُس پر جھپٹا اور وہ بھی نیچے ہی نیچے جانے لگا۔ یہ دلدل تھی جو ہر چیز کو اپنے اندر غائب کر دیا کرتی ہے۔ فرح اور سردار نے ایک دوسرے کو پکڑ لیا۔ فرح چیخ اور چلّا رہی تھی۔ سردار اپنے آدمیوں کو نام لے لے کر پکار رہا تھا اور وہ دونوں دلدل میں دھنستے چلے جا رہے تھے۔ سردار کے ہاتھ سے خزانے کا نقشہ چھوٹ گیا تھا۔ یہ نقشہ بے بنیاد تھا اور خزانہ ایک فریب اور ایک مفروضہ تھا۔

سردار کے تین چار آدمی پہنچ گئے۔ انہیں اپنے سردار اور فرح کے سر نظر آئے اور یہ بھی دلدل میں غائب ہو گئے۔

○

تیسرے یا چوتھے روز احمد بن غطاش شاہ در سے خلجان پہنچ گیا۔

"خلجان کا قلعہ مبارک ہو پیرو مُرشد!" — حسن بن صباح نے اُس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

"کیا صالح نمیری کی واپسی کا کوئی امکان نہیں؟" — احمد بن غطاش نے پوچھا۔

"نہیں!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "خزانہ وہ اژدہا ہے جو آج تک نہ جانے کتنے انسانوں کو نگل چکا ہے۔ اس نے بڑے جابر بادشاہوں کو بھی نگلا ہے اور اس نے مومنین کو، زاہدوں اور پارساؤں کو بھی نگلا ہے۔ وہ صالح نمیری جو مجھ پر لعن طعن کرنے آیا تھا کہ تم خدا کے ایلچی کیسے بن گئے، اور وہ صالح نمیری جو دعویٰ کرتا تھا کہ اللہ

کے واحد عقیدے کے پیروکار صرف اہلِ سنت ہیں اور وہی اللہ کے قریب ہیں، وہ صالح نمیری خدا اور اپنے عقیدے کو فراموش کر کے خزانے کی تلاش میں چلا گیا..... فرح بھی اُس کے ساتھ چلی گئی ہے"۔

"کیا تمہیں اس کا افسوس ہے؟" — احمد بن غطاش نے پوچھا۔

"نہیں مرشد!" — حسن بن صباح نے کہا — "میں حیران ہوں کہ یہ جانتے ہوئے کہ ہم صالح نمیری کو خزانے کا دھوکہ دے کر غائب کر رہے ہیں، وہ اُس کے ساتھ کیوں چلی گئی"۔

اتنے میں دربان نے اندر آکر بتایا کہ والیٔ خلجان صالح نمیری کا ایک آدمی بہت بُری حالت میں آیا ہے۔ حسن بن صباح نے کہا کہ اُسے فوراً اندر لے آؤ۔

ایک آدمی دربان کے سہارے اندر آیا۔ اُس کے کپڑے خون سے لال تھے اور خون خشک ہو چکا تھا۔ اُس کے سر، بازوؤں پر اور ران پر کپڑے لپٹے ہوئے تھے۔ احمد بن غطاش کے کہنے پر اُسے پانی پلایا گیا۔ وہ تو جیسے آخری سانسیں لے رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" — احمد بن غطاش نے پوچھا — "کہاں سے آئے ہو؟"

"ایک دن کی مسافت چار دنوں میں طے کی ہے" — اُس نے ہانپتی سانسوں کو سنبھال کر بڑی ہی مشکل سے کہا۔

وہ ان گیارہ آدمیوں میں سے تھا جو صالح نمیری کے ساتھ گئے تھے۔ یہ آدمی قزاقوں کے ساتھ لڑائی میں زخمی ہوا اور اسے وہاں سے نکل آنے کا موقع مل گیا تھا۔ وہ صالح نمیری کے نمک حلال اور وفادار ملازموں میں سے تھا۔ وہ صرف اطلاع دینے کے لئے خلجان آگیا تھا۔ راستے میں کئی بار بیہوش ہوا۔ گھوڑے سے گرا، اٹھا اور چوتھے روز خلجان پہنچ گیا۔

اُس نے بتایا کہ صالح نمیری مارا گیا ہے اور خزانے کا نقشہ قزاقوں کے سردار نے لے لیا ہو گا۔ فرح کے متعلق اُس نے بتایا کہ وہ قزاقوں کے قبضے میں تھی۔ اس نے فرح اور سردار کو دلدل میں ڈوبتے نہیں دیکھا تھا۔

یہ وفادار شخص باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گیا اور اُس کا سر ایک طرف لڑھک گیا۔ وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا تھا۔ حسن بن صباح نے کہا کہ اس کی لاش لے جاؤ اور دفن کر دو۔

"اب یہ قلعہ ہمارا ہے" — احمد بن غطاش نے کہا — "اب بتاؤ حسن! اس کامیابی سے تم نے کیا سبق حاصل کیا ہے؟"

"یہ کہ انسان نفسانی خواہشات کا غلام ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "کسی بھی انسان کی ان خواہشات کو ابھار دو اور اُسے یقین دلا دو کہ اُس کی یہ خواہشات پوری ہو جائیں گی تو اُسے جس راستے پر ڈال دو وہ اُسی راستے پر چل پڑے گا"۔

"میں تمہیں یہ سبق پہلے دے چکا ہوں" — احمد بن غطاش نے کہا — "ہر انسان کی ذات میں ابلیس موجود ہے اور ہر انسان کی ذات میں خدا بھی موجود ہے۔ یوں کہہ لو کہ انسان بیک وقت نیک بھی ہے بد بھی ہے۔ عبادت کیا ہے؟"

"بدی پر غلبہ پائے رکھنے کا ایک ذریعہ!" — حسن بن صباح نے کہا — "اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا ایک وسیلہ!"

"ہم نے ہر انسان میں ابلیس کو بیدار کرنا ہے" — احمد بن غطاش نے کہا — "صالح نمیری پکا مومن تھا، زاہد اور پارسا تھا۔ تم نے اُسے ایسے خزانے کا راستہ دکھایا جس کا وجود ہی نہ تھا۔ اس دھوکے میں فرح جیسی حسین لڑکی شامل تھی۔ تم نے دیکھا کہ اس شخص کی پارسائی اس طرح اُڑ گئی جس طرح سورج کی تمازت سے شبنم اُڑ جاتی ہے"۔

○

"تلبیس ابلیس"، "آئمۂ تلبیس" اور "تاریخِ ابنِ خلدون" میں تفصیل سے لکھا ہے کہ احمد بن غطاش اور حسن بن صباح نے راتوں کو آئینوں کی چمک دکھا کر جس طرح لوگوں کو دکھایا تھا کہ خدا کا ایلچی زمین پر اُترا ہے، اس کا اس وسیع و عریض علاقے کے لوگوں پر وہی اثر ہوا تھا جو پیدا کرنا مقصود تھا۔

حسن بن صباح نے لوگوں کو اپنی زیارت بھی کرائی تھی اور ایک خاص جڑی بوٹی کی دھونی اتنے بڑے مجمعے کو دے کر لوگوں کے ذہنوں پر غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ یہ تاریخ کی پہلی اجتماعی ہپناٹزم تھی۔

اگر یہ ڈھنگ اختیار نہ کیا جاتا تو بھی لوگ اُس کے قائل ہو جاتے کیونکہ لوگوں میں توہم پرستی اور افواہ پسندی جیسی کمزوریاں موجود تھیں۔ حسن بن صباح نے قبیلوں کے سرداروں کو خصوصی اہمیت دی تھی۔ حسن بن صباح کے مبلّغوں یعنی پروپیگنڈہ کرنے والوں کا بھی ایک گروہ پیدا ہو گیا۔ اس گروہ کے آدمی فقیروں اور درویشوں کے بھیس

میں بستی بستی پھرتے اور "خدا کے ایلچی" کے نزول اور اس کے برحق ہونے کا پرچار کرتے تھے۔

غلجان کا قلعہ بھی حسن بن صباح کے قبضے میں آ گیا تو یہ مشہور کر دیا گیا کہ امیر صالح نمیری خدا کے ایلچی سے اتنا متاثر ہوا ہے کہ اُس نے قلعہ خدا کے ایلچی کی نذر کر دیا ہے اور خود تارک الدّنیا ہو کر کہیں چلا گیا ہے۔

مختصر یہ کہ حسن بن صباح اور احمد بن غطاش نے باطنی نظریات اور عقیدے پھیلانے کے لئے زمین کا خاصا خطّہ حاصل کر لیا اور فضا اور ماحول کو اپنے سانچے میں ڈھال لیا۔

اب داستان گو اس داستان کو واپس اُس مقام پر لے جا رہا ہے جہاں حسن بن صباح خواجہ طوسی نظام الملک کے پاس اُسے ایک وعدہ یاد دلانے گیا تھا۔ اُس وقت نظام الملک نیشاپور میں سلطان ملک شاہ کا وزیر اعظم مقرر کیا جا چکا تھا۔ داستان گو یاد دہانی کی خاطر ایک بار پھر مختصراً بتا رہا ہے کہ یہ وعدہ کیا تھا اور یہ کس طرح پورا ہوا۔

خواجہ حسن طوسی جو بعد میں نظام الملک کے نام سے مشہور ہوا' تاریخ کی ایک اور مشہور شخصیت عمر خیام اور حسن بن صباح ایک مشہور عالم امام مؤافق کے مدرسے میں پڑھتے تھے۔ مدرسے میں ایک روز حسن بن صباح نے اپنے ان دونوں ہم جماعتوں سے کہا کہ امام مؤافق کے شاگرد بڑے اونچے مقام پر پہنچا کرتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہم تینوں یہاں سے فارغ ہو کر اونچے مقام پر پہنچیں گے۔ آؤ وعدہ کریں کہ ہم میں جو کوئی کسی اونچے مقام پر پہنچ گیا وہ دوسرے دو دوستوں کی مدد کرے گا۔

تینوں دوستوں نے ہاتھ ملا کر یہ وعدہ کیا۔ نظام الملک اور عمر خیام کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ حسن بن صباح نے بڑے ہی مذموم مقاصد کی خاطر یہ وعدہ یا معاہدہ کیا ہے۔

پھر ایسے ہوا کہ تینوں تعلیم سے فارغ ہو کر اپنی اپنی راہ لگ گئے۔ کچھ عرصے بعد نظام الملک سلطان ملک شاہ کے ہاں گیا اور ملازمت مانگی۔ اُس کی قابلیت اور فہم و فراست کو دیکھتے ہوئے سلطان ملک شاہ نے اُسے اپنا وزیر بنا لیا اور کچھ ہی عرصے بعد اُسے وزیر اعظم بنا دیا اور اس کے ساتھ ہی اُسے نظام الملک کا خطاب دے دیا۔

عمر خیام کو پتہ چلا کہ اُس کا ہم جماعت اور دوست وزیر اعظم بن گیا تو وہ اُس سے جا ملا اور مدرسے کے زمانے کا وعدہ یاد دلایا۔ نظام الملک نے عمر خیام کو ملازمت دلانی چاہی

لیکن عمر خیام نے کہا کہ وہ تحقیق کے میدان میں جانا چاہتا ہے پھر وہ کتابیں لکھے گا۔ نظام الملک نے اُسے سلطان سے اچھی خاصی رقم دلوا دی۔ عمر خیام نے حکمت میں نام پیدا کیا اور ایسی کتابیں لکھیں جو آج تک سند کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔

اس کے بعد حسن بن صباح نظام الملک کے پاس گیا اور اُسے بتایا کہ وہ تلاش روزگار میں مارا مارا پھر رہا ہے اور ذلیل و خوار ہو رہا ہے۔ آخر مجبور ہو کر اس کے پاس آیا ہے۔

"کیا تم اتنے لمبے لمبے سال بے روزگار پھرتے رہے ہو؟" ــــ نظام الملک نے پوچھا تھا۔

"اگر کہیں روزی کا ذریعہ ملا بھی تو کچھ دنوں بعد ختم ہو گیا" ــــ حسن بن صباح نے کہا تھا ــــ "مجھے تاجر بننے کا مشورہ دیا گیا لیکن تجارت کے لئے سرمایہ کہاں سے لاتا۔ دکان داری مجھ سے ہوتی نہیں۔ میں تو روزگار کی تلاش میں مصر تک چلا گیا تھا لیکن قسمت نے کہیں بھی ساتھ نہ دیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم نے اتنا زیادہ علم حاصل کر لیا ہے کہ تم سرکاری عہدے پر ہی کام کر سکتے ہو"۔

نظام الملک شریف النفس اور مخلص انسان تھا۔ اُس نے اپنے دوست اور ہم جماعت کو اس افسردگی' مایوسی اور تنگ دستی کے عالم میں دیکھا تو اُس نے سلطان ملک شاہ کو بتایا کہ اُس کا ایک دوست آیا ہے جو غیر معمولی فہم و فراست کا مالک ہے اور اس کی تعلیمی سند یہ ہے کہ امام مؤافق کے مدرسے کا پڑھا ہوا ہے۔

"ہمارے لئے صرف آپ کی رائے سند ہے" ــــ سلطان نے کہا تھا ــــ "اسے آپ جس عہدے کے لئے مناسب سمجھتے ہیں' رکھ لیں"۔

نظام الملک کو صرف سلطان کی منظوری درکار تھی۔ وہ مل گئی تو نظام الملک نے اسے ایک اونچے عہدے پر فائز کر دیا۔ یہ شک تو اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا تھا کہ حسن بن صباح کچھ اور ہی مقاصد دل میں لے کر حکومت کی انتظامی مشینری میں شامل ہوا ہے۔

○

داستان گو نے ابتدا میں یہاں تک ہی سنایا تھا کہ حسن بن صباح سلجوقی سلطنت کی انتظامیہ میں کس طرح داخل ہوا تھا۔ وہ جو اُس نے نظام الملک کو درد بھری داستان سنائی تھی' وہ جھوٹ تھا۔ وہ مصر نہیں گیا تھا نہ اُس نے ذریعہ معاش کی تلاش کی تھی نہ وہ تنگ

دست رہا تھا۔ یہ سنایا جا چکا ہے کہ وہ اپنے استاد عبدالملک بن عطاش کے ہاں چلا گیا، جس نے اُس کی تربیت شروع کر دی تھی پھر اُسے احمد بن عطاش کے پاس بھیج دیا تھا۔ فرح اُس کے ساتھ گئی تھی۔

اُس نے خلجان کا شہر لے لیا تھا اور یہ کامیابی حاصل کی تھی کہ لوگوں نے اُسے خدا کا ایلچی یا خدا کی بھیجی ہوئی برگزیدہ شخصیت مان لیا تھا۔ اس کے بعد وہ نظام الملک کے ہاں گیا اور اس کے آگے یہ رونا رویا تھا کہ وہ اتنا عرصہ بیروزگار اور تنگ دست رہا ہے۔

حسن بن صباح کو نظام الملک کس طرح یاد آیا تھا؟

ہر مستند تاریخ میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ احمد بن عطاش نے شاہ در کا شہر اور قلعہ دھوکے میں لے لیا تھا، پھر حسن بن صباح نے فریب کاری سے خلجان کے امیر صالح نمیری سے تحریر لے کر اسے خزانے کا رستہ دکھا دیا اور وہ موت کے منہ میں چلا گیا۔ یہ شہر بھی ان باطنیوں کے قبضے میں آ گیا۔ اب یہ دونوں باطنی سوچنے لگے کہ اس سے آگے کیا کیا جائے۔

"تم نے دیکھ لیا ہے حسن!" — احمد بن عطاش نے کہا — "لوگوں کو اپنے جال میں لانا کوئی مشکل نہیں۔ لوگ افواہ، سنسنی اور پُراسراریت سے متاثر ہوتے ہیں۔"

"اور وہ زبان کے ہیر پھیر کا اثر قبول کرتے ہیں" — حسن بن صباح نے کہا۔

"اور ان لوگوں کے امراء اور سرداروں وغیرہ کا معاملہ ذرا الگ ہے" — احمد بن عطاش نے کہا — "انہیں یہ تاثر دے دو کہ تم لوگوں کے روزی رساں ہو، اور انہیں دولت اور عورت کی جھلک دکھاؤ، پھر یہ تمہارے غلام ہو جائیں گے لیکن لوگوں کو ساتھ لے کر ہم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہمیشہ ذہن میں رکھو کہ حکومت سلجوقیوں کی ہے اور سلجوقی اہلِ سُنّت ہیں!!"

"ہم لوگوں کو اپنے اثر میں لے کر انہیں سلجوقیوں کے خلاف بغاوت پر اکسا سکتے ہیں" — حسن بن صباح نے کہا۔

"نہیں حسن!" — احمد بن عطاش نے کہا — "اس کے لئے کم از کم دو سال کا عرصہ چاہئے..... اور اس حقیقت کو کبھی نہ بھولنا کہ سلجوقی ترک ہیں اور بڑے ظالم اور جنگجو ہیں۔ ان کے پاس فوج ہے۔ اس وقت ضرورت یہ ہے کہ جس طرح ہم نے شاہ در اور خلجان لے لیا ہے اسی طرح سلجوقیوں کی سلطنت پر قبضہ کر لیں۔"

"یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ناممکن کچھ بھی نہیں ہوتا حسن!" — احمد بن عطاش نے کہا — "عزم پختہ، مقصد واضح اور دماغ حاضر ہونا چاہئے..... ہمیں ان سلاطین کی انتظامیہ میں گھس جانا چاہئے۔ یہ کام تم کر سکتے ہو۔ میں تمہیں ایک نیا محاذ دے رہا ہوں۔"

"میں آپ کے حکم کا منتظر ہوں استادِ محترم!" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے یہ بتائیں میں نے کرنا کیا ہے!"

"میرے جاسوسوں نے مجھے ایک اطلاع دی ہے" — احمد بن عطاش نے کہا — "خواجہ حسن طوسی سلطان ملک شاہ کا وزیراعظم بن گیا ہے۔ یہ تو مجھے بھی معلوم تھا کہ اسے سلطان ملک شاہ نے اپنا وزیر بنا لیا ہے لیکن یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ وزیراعظم بن جانا بہت بڑی بات ہے۔ یہی نہیں، مجھے اطلاع ملی ہے کہ سلطان ملک شاہ اس سے اتنا متاثر ہوا ہے کہ اسے نظام الملک کا خطاب دیا ہے۔"

"استادِ محترم!" — حسن بن صباح نے پوچھا — "وہ تو وزیراعظم بن گیا ہے۔ یہ بتائیں میں نے کیا کرنا ہے..... کیا اُسے قتل کرانا ہے؟"

"قتل بعد کی بات ہے" — احمد بن عطاش نے کہا — "ہمارے راستے میں جو آئے گا وہ قتل ہو گا۔ ابھی یہ کرنا ہے کہ اس کی جگہ لینی ہے۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ خواجہ حسن طوسی تمہارا ہم جماعت تھا؟"

"ہاں میرے مُرشد!" — حسن بن صباح نے اُچھل کر کہا — "یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔"

"میں یہ بھی جانتا ہوں تم کیوں بھول گئے تھے" — احمد بن عطاش نے کہا — "مدرسے سے نکلتے ہی تمہیں عبدالملک بن عطاش کے حوالے کر دیا گیا تھا، پھر تمہاری سرگرمیاں ایسی رہیں کہ تمہیں اور کچھ یاد آ ہی نہیں سکتا تھا۔"

"مجھے کچھ اور بھی یاد آ گیا ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "مدرسے میں ہم تین دوست تھے۔ عمر، خواجہ حسن اور میں۔ ہم نے معاہدہ کیا تھا کہ مدرسے سے فارغ ہو کر ہم میں سے کسی کو کہیں بڑا عہدہ مل گیا تو وہ دونوں کو کسی اچھے عہدے پر فائز کرائے گا..... میرا کام تو آسان ہو گیا ہے۔ میں کل صبح روانہ ہو جاؤں گا اور خواجہ حسن کو اس کا وعدہ یاد دلاؤں گا۔"

"دیکھا حسن!" ۔۔۔ احمد بن غطاش نے کہا ۔۔۔ "ہمارا ہر کام آسان ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ ثبوت ہے کہ ہم حق پر ہیں اور خدا ہماری مدد کر رہا ہے..... یہ بھی یاد رکھو کہ سلطان ملک شاہ اب نیشاپور میں نہیں۔ اب اس کا دارالحکومت مَرو میں ہے"۔

○

اگلی صبح کا دھندلکا ابھی خاصا گہرا تھا جب حسن بن صباح اپنے اعلیٰ عربی نسل کے گھوڑے کی بجائے معمولی سے ایک گھوڑے پر سوار ہوا۔ اُس کا لباس بھی ایک عام آدمی کا لباس تھا۔ ایسے گھوڑے اور ایسے لباس میں وہ غریب آدمی لگتا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک گھوڑا اور تھا جس پر ایک جوان اور بڑی ہی دلکش لڑکی تھی۔ اُس کا لباس بھی غریبانہ تھا۔

"یاد رکھنا حسن!" ۔۔۔ احمد بن غطاش نے کہا ۔۔۔ "اپنے آپ کو اہلِ سُنّت ظاہر کرنا اور جمعہ کے روز مسجد میں چلے جایا کرنا۔ اگر تمہیں وہاں کوئی اچھا رتبہ مل گیا تو سلطان ملک شاہ کا منظورِ نظر بننے کی کوشش کرنا اور اس کے ساتھ یہ بھی دیکھتے رہنا کہ نظام الملک کو تم سلطان کی نظروں سے کس طرح گرا سکتے ہو۔ ایک بار وزارت کا عہدہ لے لو پھر سلجوقی سلطنت میں ہماری زمین دوز کارروائیاں شروع ہو جائیں گی۔ جاسوسوں کے ذریعے میرا تمہارے ساتھ رابطہ قائم رہے گا۔ ایک بار پھر سوچ لو کہ اس لڑکی کو تم نے اپنی بیوہ بہن ظاہر کرنا ہے۔ یہ بات تو ہو چکی ہے کہ اس لڑکی کو کس طرح استعمال کرنا ہے"۔

احمد بن غطاش اور حسن بن صباح کی سازش یہ تھی کہ نظام الملک کے خلاف غلط فہمیاں پیدا کر کے اسے معزول کرانا اور اس کی جگہ حسن بن صباح نے لینی ہے اور پھر بڑے عہدوں پر اپنے آدمی فائز کروانے ہیں اور سلطنتِ سلجوق کی جڑیں کھوکھلی کر کے عالمِ اسلام کو اپنے فرقے کے تابع کرنا ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی کی وضاحت ہو جائے تو بہتر ہے۔ ایک مقام تک ان لوگوں کی تبلیغ سے پتہ چلتا تھا کہ یہ اسماعیلی عقیدے کے لوگ ہیں لیکن شاہ در سے نکل کر انہوں نے جب خلجان کا رخ کیا اور نئی سے نئی تخریب کاریاں کرنے لگے تو واضح ہو گیا کہ یہ لوگ فرقہ باطنیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اپنا ہی ایک فرقہ بناتے چلے جا رہے تھے' لہٰذا حسن بن صباح اور اس کے پیروکاروں کو کسی فرقے سے منسوب کرنا صحیح نہیں۔

داستان گو ایک بات اور کہنا چاہتا ہے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقے میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ حسن بن صباح ایک افسانوی کردار ہے اور قلعہ الموت میں اُس کی خود ساختہ جنت کا بھی حقیقت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں اور یہ الف لیلہ کی ایک داستان ہے۔

ان حضرات کی خدمت میں گزارش ہے کہ یہ داستان اگر خیالی ہوتی تو ابنِ خلدون جیسا مؤرخ اسے تاریخ کے دامن میں نہ ڈالتا۔ ابنِ اثیر اور ابن جوزی اس کا ذکر نہ کرتے۔ درجنوں مستند مؤرخوں نے حسن بن صباح اور اس کی جنّت کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ یورپی مؤرخوں نے تو اور زیادہ تحقیق کر کے یہ حالات قلمبند کیے ہیں۔

اس باب میں اُن عظیم شخصیتوں کے نام دیئے گئے ہیں جو حسن بن صباح کے پیروکاروں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ اس فہرست کو دیکھ کر بتائیں کہ یہ شخصیتیں افسانوی ہیں؟

○

داستان گو آپ کو مَرو لے چلتا ہے جہاں حسن بن صباح پہنچ چکا ہے اور نظام الملک کے پاس بیٹھا ہے۔ وہ نظام الملک کو بتا چکا ہے کہ فاطمہ اُس کی بہن ہے جو جوانی کی عمر میں ہی بیوہ ہو گئی ہے۔ نظام الملک نے اُس کی بہن کو اپنی بیوی کے پاس بھیج دیا ہے۔

حسن بن صباح نے نظام الملک کو مدرسے کے زمانے کا وعدہ یاد دلایا اور بڑے ہی دردناک اور اثر انگیز لہجے میں اپنی بے روزگاری اور بدحالی کا قصہ سنایا۔

"میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتا خواجہ!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "تم وزیرِاعظم ہو اور میں تمہاری رعایا کا ایک نادار آدمی ہوں۔ میں یہ ضرور کہوں گا کہ تم ان مومنین میں سے ہو جو زہد اور تقویٰ کو اپنی زندگی سمجھتے ہیں۔ تم جیسے زاہد اور متقی اپنے وعدے پورے کیا کرتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ وعدہ خلافی گناہ ہے..... یہ بھی سوچو کہ میں نے اتنا ہی علم حاصل کیا ہے جتنا تم نے کیا ہے لیکن تم وزیرِاعظم ہو اور میں دو وقت کی روٹی بھی نہیں کھا سکتا"۔

"اللہ کی ذات سے مایوس نہ ہو حسن!" ۔۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔۔ "میں اپنا صرف وعدہ ہی پورا نہیں کروں گا بلکہ تمہیں اپنی ذاتی املاک کا بھی برابر کا حصہ دار سمجھوں گا"۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ نظام الملک نے سلطان ملک شاہ کو حسن بن صباح کی شخصیت اور علمی قابلیت کی ایسی تصویر دکھائی کہ سلطان نے اسے معتمدِ خاص کا رتبہ

دے دیا۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ یہ عہدہ وزیر کے برابر تھا لیکن حسن بن صباح کوئی ایسا رتبہ چاہتا تھا جس میں وہ آزادانہ فیصلے کر سکتا۔

نظام الملک اپنی آستین میں ایک سانپ پالنے لگا۔

تقریباً" تمام تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے نظام الملک کو سلطان کی نظروں میں گرانے کے لئے یہ طریقہ سوچا کہ اُن اہم رتبوں والے عہدیداروں کو ہاتھ میں لیا جائے جن کی بات سلطان توجہ اور دلچسپی سے سنتا ہے۔ ان میں ایک احتشام مدنی تھا جو سلطان کے تین مشیروں میں سے تھا۔ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ پابندِ صوم و صلوٰۃ بھی تھا۔

احتشام مدنی شام کے وقت شہر کے ایک باغ میں چہل قدمی کے لئے جایا کرتا تھا۔

ایک شام وہ حسب معمول ٹہل رہا تھا کہ ایک جواں سال لڑکی اُس کے سامنے اچانک آگئی اور جھجک کر ایک طرف ہو گئی۔ یہ باغ خاص قسم کے لوگوں کے لئے مخصوص تھا۔

اس لڑکی کو احتشام مدنی نے پہلی بار دیکھا تھا۔ لڑکی کسی عام سے گھرانے کی نہیں لگتی تھی۔ احتشام مدنی نے دیکھا کہ لڑکی اچانک سامنے آجانے سے کچھ گھبرا گئی تھی اور اس پر حجاب طاری ہو گیا تھا۔ ویسے بھی یہ لڑکی اُسے بہت اچھی لگی۔ اُس نے لڑکی کو بلا کر پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیوں آئی ہے؟

"میں حسن بن صباح کی بہن ہوں" ــــ لڑکی نے جواب دیا۔

"حسن بن صباح؟" ــــ احتشام مدنی نے پوچھا اور خود ہی بولا ــــ "اچھا' اچھا' وہ حسن بن صباح جو چند دن پہلے سلطان کے معتمدِ خاص مقرر ہوئے ہیں"۔

یہ احتشام مدنی اور اس لڑکی کی پہلی ملاقات تھی۔ بیان ہو چکا ہے کہ یہ لڑکی حسن بن صباح کی بہن نہیں تھی نہ اُس کا نام فاطمہ تھا نہ ہی وہ بیوہ تھی۔ اُس نے باتوں باتوں میں احتشام مدنی کو بتایا کہ وہ بیوہ ہے اس لئے بھائی اسے ساتھ لے آیا ہے۔ اس سے احتشام مدنی کے دل میں اس لڑکی کی ہمدردی پیدا ہو گئی۔ لڑکی نے ایسے انداز سے باتیں کیں جیسے وہ احتشام مدنی کی شخصیت سے متاثر ہو گئی ہو۔ احتشام مدنی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ لڑکی حسن بن صباح اور احمد بن غطاش جیسے ابلیسی باطنیوں کی تربیت یافتہ ہے اور یہ انسان کے روپ میں آئی ہوئی بڑی ہی زہریلی ناگن ہے۔

وہ جب وہاں سے چلی تو احتشام مدنی جیسے زاہد اور پارسا نے اپنے دل میں دھچکا سا محسوس کیا اور اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہو گئی کہ یہ لڑکی اُسے ایک بار پھر ملے۔

لڑکی اُسے پھر مل گئی اور پہلے روز سے زیادہ بے تکلفی کی باتیں کیں۔ وہ ظاہر یہ کرتی تھی کہ بیوگی نے اُسے مغموم اور رنجیدہ کر رکھا ہے۔ اس طرح اُس نے احتشام مدنی کے دل میں اپنی ہمدردی پیدا کر لی۔

پھر اسی باغ میں شام کا اندھیرا پھیلنے کے بعد ان دونوں کی کئی بار ملاقات ہوئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ لڑکی نے احتشام مدنی کو ایک روز اپنے گھر بلا لیا۔ لڑکی نے اُسے کہا تھا کہ حسن بن صباح صبح چلا جاتا ہے اور شام کو واپس آتا ہے۔ یہ لڑکی تربیت کے مطابق احتشام مدنی پر ایک نشہ بن کر غالب آگئی تھی۔ اس حد تک کہ صوم و صلوٰۃ کا پابند یہ معزز شخص اپنا آپ فراموش کر بیٹھا۔

دن کے وقت وہ اس لڑکی کے گھر میں اس کے حسن و شباب سے مخمور اور مدہوش ہُوا جا رہا تھا کہ صحن میں کسی کے قدموں کی آہٹ نے اُسے چونکا دیا۔

"یہ کون ہے؟" ــــ احتشام مدنی نے گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔

"غلام ہو گا" ــــ لڑکی نے بڑے اطمینان سے کہا ــــ "میں دیکھتی ہوں"۔

پیشتر اس کے کہ لڑکی باہر نکلتی' حسن بن صباح کمرے میں داخل ہُوا۔ احتشام مدنی جیسے مومن آدمی کو اپنی بہن کے پاس دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا۔ احتشام مدنی اُس کے سامنے کھڑا کانپ رہا تھا۔

"میں تم دونوں کو سنگسار کراؤں گا" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "میں باہر دروازہ بند کر کے سلطان کے پاس جا رہا ہوں"۔

حسن بن صباح دروازے کی طرف مڑا تو لڑکی اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی اور رو رو کر کہنے لگی کہ اُس نے اس شخص کو نہیں بلایا تھا۔

"پھر یہ میرے گھر میں کس طرح آگیا؟" ــــ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"یہ خود ہی آیا تھا" ــــ لڑکی نے جواب دیا ــــ "اور اس نے میرے ساتھ پیار اور محبت کی باتیں شروع کر دیں۔ اچھا ہُوا کہ تم آگئے اور میں اس کی دست درازی سے بچ گئی"۔

احتشام مدنی نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس لڑکی نے اسے خود بلایا تھا۔ کچھ دیر یہی جھگڑا چلتا رہا۔

"حقیقت کچھ بھی ہے" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم

میرے گھر میں میری بہن کے پاس بُری نیت سے آئے بیٹھے ہو۔ میں سلطان کو ضرور بتاؤں گا"۔

احتشام مدنی صرف معزز آدمی ہی نہیں تھا بلکہ وہ سلطان ملک شاہ کا پسندیدہ مشیر بھی تھا۔ اُس کی جان چلی جاتی تو وہ قبول کر لیتا لیکن یہ بھی ہو سکتا تھا کہ سلطان اسے معزول کر کے نکال دے۔ اس صورت میں اُس کی جو بے عزتی اور بدنامی ہونی تھی' اس کے تصور سے ہی وہ کانپ اٹھا۔ اُس نے حسن بن صباح کی منت سماجت شروع کر دی کہ وہ اسے معاف کر دے۔ لڑکی نے بھی حسن بن صباح سے کہا کہ یہ آخر معزز آدمی ہے' اسے بخش دیا جائے۔

حسن بن صباح گہری سوچ میں چلا گیا جو دراصل اداکاری تھی۔ سوچ سے بیدار ہو کر اُس نے احتشام مدنی کا بازو پکڑا اور اسے دوسرے کمرے میں لے گیا۔ جب وہ دونوں باہر نکلے تو احتشام مدنی کے چہرے پر رونق عود کر آئی تھی۔ حسن بن صباح نے اس کے ساتھ سودا بازی کر لی تھی جو مختصراً یہ تھی کہ احتشام مدنی نظام الملک کے خلاف حسن بن صباح کا ساتھ دے گا۔

یہ شخص حسن بن صباح کا پہلا شکار تھا جسے اُس نے نظام الملک کو سلطان کی نظروں سے گرانے میں استعمال کرنا تھا۔

ابلیس نے اللہ کی حکم عدولی کی اور انسان کے آگے سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اُس نے اللہ سے کہا تھا' مٹی کا بنا ہوا یہ انسان زمین پر اپنے ہی بھائیوں کا خون بہائے گا' فتنہ اور فساد بپا کرے گا اور تیری عطا کی ہوئی اس عظمت کو بھول جائے گا کہ تیرے حکم سے فرشتوں نے اس کے آگے سجدہ کیا تھا۔

"اسے ہم نے اشرف المخلوقات بنایا ہے" ــــ یہ اللہ کی آواز تھی۔

"یہ حشرات الارض سے بدتر ہو گا" ــــ یہ ابلیس کی آواز تھی۔

"یہ میرے بتائے ہوئے راستے پر چلے گا" ــــ اللہ نے کہا ــــ "میں اس کی رہنمائی کے لئے نبی اور پیغمبر بھیجتا رہوں گا"۔

"میں اسے اپنے راستے پر چلاؤں گا" ــــ ابلیس نے کہا ــــ "جو طاقت مجھ میں ہے وہ اس میں نہیں۔ میں آگ سے بنا ہوں۔ یہ مٹی کا پتلا ہے۔ میں اسے بڑی حسین اور دلفریب خواہشوں کا غلام بنا دوں گا"۔

"یہ میری عبادت کرے گا"۔

"میں اسے دنیا کی چمک دمک کا شیدائی بنا دوں گا" ــــ ابلیس نے کہا ــــ "یہ تیری عبادت کرے گا لیکن اس کا دل دولت کا پجاری ہو گا۔ یہ ہر اُس چیز کی پرستش کرے گا جس سے ذہنی اور جسمانی لذّت حاصل ہو گی' اور یہ ہر وہ کام کرے گا جس سے اسے روکا جائے گا۔ یہ بدی سے لطف اندوز ہو گا"۔

"جا' تُو تاقیامت ملعون رہے گا" ــــ اللہ نے کہا اور ابلیس کو دھتکار دیا۔

پھر یوں ہوا کہ اللہ کا پہلا ہی بندہ جنت سے نکالا گیا۔

پھر جوں جوں وقت گزرتا گیا' وہ عورت جو آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی تھی' وہ آدمی کی جڑوں میں بیٹھتی چلی گئی اور آدمی کی ایسی کمزوری بن گئی کہ وہ مجبور اور بے بس ہو گیا۔

عورت آدمی کے لئے نشہ بن گئی۔

آدمی عورت کے دام میں آ کر ابلیس کا پجاری بن گیا۔

داستان گو اپنے آپ کو فنِ داستان گوئی تک ہی محدود رکھنا چاہتا ہے۔ ابلیس کے متعلق ایک پیرِ طریقت شیخ ابن عربیؒ کی ایک تحریر کا اقتباس پیش کرتا ہے:

"ابلیس اہلِ خلوت کو راہِ راست سے منحرف کرنے میں ایسے ایسے

کمال رکھتا ہے کہ انسانی علم و عمل کے بڑے مضبوط قلعے اس کی ادنیٰ فسوں طرازیوں سے "آناً فاناً" زیر و زبر ہو جاتے ہیں۔ اگر توفیقِ الٰہی اور ہدایتِ ازلی رفیقِ حال ہو تو انسان اس کی معنویانہ دست بُرد سے ہر وقت محفوظ ہے ورنہ جو بختِ خفتہ اور طالع گم گشتہ اپنی قسمت کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں' وہ ان کو ایسی بُری طرح پٹختا ہے کہ اس کا جھٹکا مشرق و مغرب تک محسوس ہوتا ہے"۔

○

سلجوقی سلطان ملک شاہ کا مشیرِ خاص اور منظورِ نظر احتشام مدنی پابند صوم و صلوٰۃ تھا' زاہد و پارسا اور معزز انسان تھا۔ کوئی ایسا جواں سال بھی نہ تھا کہ جوشِ شباب میں ایک حسین لڑکی کو دیکھ کر بے قابو ہو جاتا مگر وہ فاطمہ کو دیکھ کر اپنے آپ کو اور اللہ کو بھی بھلا بیٹھا اور حسن بن صباح کے جال میں آ گیا۔

وہ اس کمرے سے جس میں حسن بن صباح اسے لے گیا تھا' نکلا تو اس کے چہرے سے شرمساری اور گھبراہٹ دُھل گئی تھی اور رونق عود کر آئی تھی۔ یہ تو واضح ہے کہ حسن بن صباح نے اس کے ساتھ سودا بازی کر لی تھی کہ وہ وزیرِ اعظم نظام الملک کو سلطان ملک شاہ کی نظروں میں گرانے میں اس کی مدد کرے گا لیکن ان کے درمیان باتیں کیا ہوئی تھیں؟

تاریخوں میں جو اشارے ملتے ہیں' ان سے یہ باتیں سامنے آتی ہیں کہ حسن بن صباح نے احتشام کو اندر لے جا کر یوں نہیں کہا تھا کہ احتشام اسے نظام الملک کی جگہ وزیرِ اعظم بنوا دے۔

"تم بے شک سلطان کے مشیر ہو احتشام!"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا تھا۔۔۔ "لیکن میرا رتبہ بھی تم سے کم نہیں۔ میں جو بات کرنا چاہوں گا وہ براہِ راست سلطان کے ساتھ کر لوں گا لیکن تمہاری اس حرکت سے مجھے مایوسی ہوئی ہے۔ فوری طور پر مجھے جو خیال آتا ہے وہ یہ ہے کہ میں یہاں سے چلا جاؤں۔ میں تو دل میں سلطنتِ سلجوق کی بھلائی لے کر آیا تھا۔ میں اہلِ سنت والجماعت ہوں۔ مجھے کسی عہدے اور کسی رتبے کی ضرورت نہیں۔ قلعہ شاہ در سے قلعہ خلجان تک کے علاقے کے لوگ مجھے اپنا مُرشد اور عالمِ دین مانتے ہیں لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ سلطنتِ سلجوق اور اسلام کے خلاف کچھ

فتنے اٹھ رہے ہیں۔ میں یہاں ان خطروں کے انسداد کے لئے یہاں آیا تھا لیکن میں نے یہاں کچھ اور ہی دیکھا ہے"۔

"میں اپنی اس حرکت پر نادم ہوں میرے بھائی!"۔۔۔ احتشام مدنی نے کہا۔

"صرف یہی ایک حرکت نہیں ہوئی"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "میں نے یہ دور سنبھالا تو نظام الملک نے سلطان کے اور تمہارے خلاف کان بھرنے شروع کر دیئے۔ تمہیں شاید معلوم ہو گا کہ میں اور نظام الملک امام موافق کے مدرسے میں اکٹھے پڑھے ہیں۔ ہم گہرے دوست ہُوا کرتے تھے۔ اس نے خود مجھے یہاں بلایا اور اس دورے پر یہاں لگوا لیا ہے۔ یہ سرکاری خزانے پر ہاتھ صاف کر رہا ہے اور اس کے ارادے بڑے خطرناک ہیں۔ یہ خلیفہ سے مل کر ایک فوج تیار کرنے کی کوشش میں ہے اور یہ سلجوقی سلطنت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے"۔

"میں سلطان کو خبردار کر دوں گا"۔۔۔ احتشام مدنی نے کہا۔۔۔ "سلطان صرف میری بات سنتا ہے"۔

"ایسی حماقت نہ کر بیٹھنا"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "نظام الملک پہلے ہی تمہیں یہاں سے ذلیل و خوار کر کے نکلوانا چاہتا ہے۔ یہ تو لڑکپن میں مدرسے میں اسی طرح جوڑ توڑ کرتا رہتا تھا۔ اس کا ذہن سازشی ہے۔ سلطان اگر تمہاری سنتا ہے تو سلطان اس کی بھی سنتا اور مانتا ہے۔ اگر تم نے جلد بازی سے کام لیا تو یہ شخص تمہیں یہاں سے نکلوائے گا نہیں بلکہ قید خانے میں بھجوا دے گا..... میں باہر کے خطروں کو تو بھول ہی گیا ہوں احتشام! سب سے بڑا خطرہ تو یہ ہے۔ یہ بڑا ہی زہریلا سانپ ہے جو سلطان کی آستین میں پرورش پا رہا ہے"۔

"مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟"۔۔۔ احتشام نے پوچھا۔

"پہلے میری بات پوری ہونے دو"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "میں اس وزیرِ اعظم کی سازشوں سے پریشان ہو رہا تھا اور یہی سوچا تھا کہ تمہارے ساتھ بات کروں لیکن تم نے جو حرکت کی ہے' اس سے میں بالکل ہی مایوس ہو گیا ہوں۔ اگر مشیرِ خاص یہ طرح کرے کہ حاکموں کے گھروں میں داخل ہو کر ان کی عزت کے ساتھ کھیلے تو اس سلطنت کا اللہ ہی حافظ ہے۔ میں سلطان کو یہ تو ضرور بتاؤں گا کہ اس کی ناک کے عین نیچے کیا ہو رہا ہے"۔

اعتشام مدنی نے حسن بن صباح کے آگے ہاتھ جوڑے اور منت سماجت شروع کر دی کہ وہ اسے معاف کر دے اور یہ بات سلطان تک نہ پہنچائے۔

"اگر میں نے تمہاری اس حرکت کی شکایت سلطان کو کر دی تو" —— حسن بن صباح نے کہا —— "تو تم نہیں جانتے کیا ہو گا۔ سلطان نظام الملک سے مشورہ لے گا۔ نظام الملک جس موقع کی تلاش میں ہے وہ اسے مل جائے گا' پھر تم سیدھے قید خانے میں جاؤ گے" —— حسن بن صباح سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ دیر بعد بولا —— "اگر تم میرا ساتھ دو تو ہم دونوں نظام الملک کو سلطان کی نظروں سے گرانے کی کوشش کریں گے"۔

"مجھے اپنے ساتھ سمجھو" —— اعتشام نے کہا۔

"لیکن نظام الملک کے ساتھ پہلے کی طرح دوستانہ رویہ رکھنا" —— حسن بن صباح نے کہا —— "اُسے شک نہ ہو کہ ہم دونوں اُس کے خلاف کچھ کر رہے ہیں"۔

حسن بن صباح کے بولنے کا انداز ایسا تھا جو ایک خاص تاثر پیدا کرتا تھا۔ اعتشام مدنی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ اُس شخص کے جال میں آ گیا ہے جس نے بڑی محنت سے اپنے آپ میں ابلیسی اوصاف پیدا کیے ہیں اور دو استادوں نے اُس میں ابلیس کی قوتیں پیدا کر کے اسے مکمل ابلیس بنا دیا ہے۔

نفسیاتی فطرت کے عالم کہتے ہیں کہ ایسے انسان میں جو اپنے آپ میں ابلیسی اوصاف پیدا کر لیتا ہے' ایک ایسی کشش پیدا ہو جاتی ہے کہ ہر کوئی اُس کی طرف کھچا چلا جاتا ہے۔ اس کے بولنے کے انداز میں چاشنی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے ہونٹوں پر ہر وقت بڑا ہی دلفریب تبسم کِھلا رہتا ہے۔ ضرورت پڑے تو وہ اپنے اوپر ایسی اداسی' غمزدگی اور مظلومیت طاری کر لیتا ہے کہ دوسروں کو رُلا دیتا ہے' اور وہ جب کسی کے ساتھ خیر سگالی! محبت کے جذبات کا اظہار کرتا ہے تو دل موہ لیتا ہے لیکن یہ محض اداکاری اور فریب کاری ہوتی ہے۔

اعتشام مدنی نے نظام الملک کے خلاف حسن بن صباح کی باتیں اپنے دل میں اتار لیں اور اس کے ساتھ اس طرح بے تکلف ہو گیا جیسے بچپن کے ہمجولی ہوں۔ حسن بن صباح نے تو اُس پر طلسماتی اثر پیدا کر دیا تھا۔ بے تکلفی یہاں تک بڑھی کہ اعتشام مدنی نے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"میری ایک درخواست پر غور کرو گے حسن؟" —— اعتشام نے پوچھا۔

"دوستوں میں یہ تکلف نہیں ہونا چاہیے اعتشام!" —— حسن بن صباح نے کہا —— "درخواست نہ کہو' بات کرو اور مجھ پر اپنا حق سمجھ کر بات کرو"۔

"کیا تم پسند کرو گے کہ میں تمہاری بہن کے ساتھ شادی کر لوں؟" —— اعتشام نے پوچھا۔

"میرے سامنے مسئلہ اور ہے" —— حسن بن صباح نے جواب دیا —— "سوال یہ نہیں کہ میں پسند کروں گا یا نہیں' سوال یہ ہے کہ فاطمہ پسند کرے گی یا نہیں۔ تمہیں شاید میری یہ بات عجیب لگے کہ میں نے یہ فیصلہ اپنی بہن پر چھوڑ دیا ہے۔ بات یہ ہے اعتشام! اس بہن سے مجھے بہت ہی پیار ہے۔ میں کوئی ایسا کام نہیں کرتا جو اسے اچھا نہ لگے۔ اس کی پہلی شادی میری پسند پر ہوئی لیکن وہ آدمی ٹھیک نہ نکلا۔ فاطمہ کے ساتھ بہت بُرا سلوک کرتا تھا۔ اسے شاید اسی کی بددعا لگی کہ وہ ایک ہی سال بعد مر گیا۔ شادی سے یہ ایسی متنفر ہوئی ہے کہ شادی کا نام نہیں سننا چاہتی"۔

"میں اسے کیسے یقین دلاؤں کہ میں اسے سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھوں گا" —— اعتشام مدنی نے کہا —— "میرے دل میں اس لڑکی کی محبت پیدا ہو گئی ہے"۔

"میں ایک کام کر سکتا ہوں" —— حسن بن صباح نے کہا —— "فاطمہ سے کہوں گا کہ تمہیں پسند کر لے۔ میں اسے تمہارے ساتھ ملنے سے روکوں گا نہیں"۔

"تو کیا اب میں جا سکتا ہوں؟" —— اعتشام نے پوچھا۔

"ہاں اعتشام!" —— حسن نے کہا —— "ہم دشمنوں کی طرح ملے تھے' اللہ کا شکر ہے کہ تم بھائیوں کی طرح جا رہے ہو"۔

"اللہ کرے ہم ہمیشہ کے لئے بھائی بن جائیں" —— اعتشام نے کہا۔

"میں پوری کوشش کروں گا میرے بھائی!" —— حسن نے کہا —— "میں فاطمہ کو منوا لوں گا"۔

O

اعتشام مدنی حسن بن صباح کے گھر سے نکل گیا تو لڑکی ساتھ والے کمرے سے نکلی۔

"شکار مار لیا یا نہیں؟" —— لڑکی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"جال میں تم جیسا دانہ پھینکا جائے تو شکار کیوں نہیں پھنسے گا" —— حسن بن صباح نے بازو پھیلا کر فاتحانہ لہجے میں کہا۔

لڑکی لپک کر اس کے بازوؤں میں چلی گئی اور حسن بن صباح نے اسے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

"وہ میرے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے" —— لڑکی نے کہا —— "میں دروازے کے ساتھ کان لگا کر سن رہی تھی"۔

"یہ یاد رکھنا کہ تم اب فاطمہ ہو" —— حسن نے کہا —— "اپنا اصل نام بھول جاؤ.... ہاں' یہ شخص تمہارے ساتھ شادی کرنے کو بیتاب ہے۔ تم اسے ملتی رہنا اور اس کے لئے بڑا ہی حسین سراب بنی رہنا۔ تم نے یہ کہتے رہنا ہے کہ مجھے آپ سے پیار ہے لیکن میں شادی کا نام سنتی ہوں تو مجھ پر غشی طاری ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ اس پر پیار کا ایسا نشہ طاری کئے رکھنا کہ یہ مدہوش رہے۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس سے ملاقات کے وقت تم نے اپنے کپڑوں اور بالوں پر کون سی خوشبو لگائی ہے۔ اسے پیار دو' اس کا پیار لو اور اپنے جسم کو اس سے بچائے رکھو"۔

"کیا مجھے یہ باتیں بتانا ضروری ہیں؟" —— لڑکی نے کہا —— "بارہ سال عمر سے میں آپ لوگوں سے جو تربیت لے رہی ہوں' یہ میری روح میں شامل ہو گئی ہے۔ یہ میرا عقیدہ بن گئی ہے"۔

"میں تمہیں اُس روز خراجِ تحسین پیش کروں گا جس روز میں اس سلطنت کا وزیرِ اعظم بن جاؤں گا" —— حسن نے کہا —— "تمہیں ایک خاص سبق دیا جاتا رہا ہے۔ یہ نہ بھولنا۔ میں تمہیں پھر بتا دیتا ہوں۔ تم حسین و جمیل لڑکی ہو۔ تمہارے جذبات بھی ہیں اور یہاں ایک سے بڑھ کر ایک خوبرو اور دلکش جسموں والے شہزادے اور امیر زادے موجود ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کی محبت میں مبتلا ہو جاؤ"۔

"ایسا نہیں ہو گا آقا!" —— لڑکی نے کہا۔

"اگر ایسا ہو گیا تو اس کی سزا سے تم واقف ہو" —— حسن بن صباح نے کہا —— "سزائے موت...... یہ موت اتنی سہل نہیں ہو گی کہ سر تن سے جدا کر دیا اور بات ختم ہو گئی۔ یہ بڑی اذیت ناک موت ہو گی"۔

"اس تک نوبت نہیں پہنچے گی آقا!" —— لڑکی نے کہا۔

○

دوسرے ہی دن احتشام مدنی سلطان ملک شاہ کے پاس بیٹھا کاروبارِ سلطنت کی باتیں

کر رہا تھا۔

"سلطانِ معظم!" —— احتشام نے پوچھا —— "اس نئے معتمدِ خاص حسن بن صباح کے متعلق آپ کی ذاتی رائے کیا ہے؟"

"جو رائے تمہاری ہو گی وہی میری ہو گی" —— سلطان نے کہا —— "میں اپنے اتنے سارے کارندوں اور امراء کے متعلق الگ الگ کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ مجھے خواجہ حسن طوسی نے کہا کہ حسن بن صباح اُس کا مدرسے کے زمانے کا دوست ہے' علم و فضل سے مالا مال' باریک بین' دور اندیش اور دیانتدار ہے تو میں نے حسن طوسی کی رائے کو سند مانا۔ مجھے اس وزیرِ اعظم پر اعتماد ہے۔ اسی لئے میں نے اسے نظام الملک کا خطاب دیا ہے..... تم میرے مشیرِ خاص ہو اور میں تمہیں قابلِ اعتماد سمجھتا ہوں۔ تم کسی کے متعلق جو رائے دو گے میں اسے صحیح مانوں گا..... تم میری رائے کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"مجھے حسن بن صباح میں کوئی ایسا وصف نظر آیا ہے جو ہم میں سے کسی میں بھی نہیں" —— احتشام نے کہا —— "آپ نے وزیرِ اعظم خواجہ حسن طوسی کو نظام الملک کا خطاب تو دے دیا ہے لیکن میں جو وصف حسن بن صباح میں دیکھ رہا ہوں وہ نظام الملک میں بھی نہیں"۔

"کیا تم میرے ساتھ صاف بات نہیں کرنا چاہو گے؟" —— سلطان نے پوچھا —— "تم حسن بن صباح کے متعلق میری ذاتی رائے کیوں معلوم کرنا چاہتے ہو؟"

"آپ نے مجھے بہت بڑا اعزاز بخشا ہے" —— احتشام مدنی نے کہا —— "مجھے آپ نے اپنا مشیرِ خاص بنایا ہے۔ یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ میں نے یہ ثابت کرنا ہے کہ میں اس اعزاز کے قابل ہوں۔ میں آپ کا نمک اسی طرح حلال کر سکتا ہوں کہ جو اچھی یا بُری چیز میں دیکھوں وہ آپ کو بھی دکھاؤں اور جو اچھی یا بُری بات میں سنوں وہ آپ کو بھی دکھاؤں..... آپ کسی وقت حسن بن صباح کو شرفِ باریابی بخشیں اور اس کی عقل و دانش کا امتحان لیں"۔

"اسے ابھی میرے پاس بھیج دو" —— سلطان ملک شاہ نے کہا۔

تھوڑی ہی دیر بعد حسن بن صباح سلطان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ سلطان اس کی فہم و فراست کا امتحان لینا چاہتا تھا۔

"حسن!" — سلطان نے پوچھا — "کوئی بادشاہ اپنی تمام تر رعایا کو کس طرح خوش اور راضی رکھ سکتا ہے؟"

"اپنے دل کو ناراض کر کے!" — حسن نے جواب دیا۔

"اس کی تشریح کرو گے؟"

"بادشاہ اپنے دل سے شاہانہ خواہشات نکال دے" — حسن نے کہا — "ہر بادشاہ عیش و عشرت کا دلدادہ ہوتا ہے۔ خزانہ اپنے اوپر لٹاتا ہے۔ رعایا کے محصولات میں اضافہ کر کے اپنا خزانہ بھرتا ہے اور رعایا کے خون پسینے کی کمائی پر فرعون بن جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے دل کو ایک عام انسان کا دل سمجھے تو عقل اُسے اُس راستے پر ڈال دے گی جس راستے کے دونوں طرف رعایا اُس کے دیدار کو کھڑی ہو گی"۔

"تم ہمارے معتمدِ خاص ہو" — سلطان نے پوچھا — "کیا تم بتا سکتے ہو ہمارا سب سے بڑا دشمن کون ہے جو ہماری سلطنت پر کسی بھی روز حملہ کر سکتا ہے؟"

"آپ کے دربار کے خوشامدی!" — حسن بن صباح نے جواب دیا۔

سلطان چونک پڑا۔

"میں دوسرے دشمن کی بات کر رہا ہوں!" — سلطان نے کہا — "کوئی دوسرا ملک، کوئی دوسری قوم!"

"سلطانِ عالی مقام!" — حسن بن صباح نے کہا — "جنگل میں یا کہیں اور آپ کے سامنے سانپ آجائے تو آپ اسے مار سکتے ہیں یا بھگا سکتے ہیں لیکن جو سانپ آپ کی آستین میں پل رہا ہو، اس کے ڈنک سے آپ نہیں بچ سکتے۔ وہ کسی بھی وقت حملہ کر سکتا ہے"۔

"کیا تم نے ہمارے کاروبارِ سلطنت میں کوئی خطرناک کمزوری یا خامی دیکھی ہے؟" — سلطان نے پوچھا۔

"ہاں سلطانِ عالی مقام!" — حسن بن صباح نے کہا — "یہاں میں نے جو سب سے بڑی خامی دیکھی ہے وہ ہے اپنے وزیر اور دیگر اہلکاروں پر اندھا اعتماد"۔

"کیا تم ہمارے وزیرِ اعظم میں کوئی خامی دیکھ رہے ہو؟" — سلطان نے پوچھا۔

"سلطانِ عالی مقام!" — حسن بن صباح نے کہا — "اگر میں وزیرِ اعظم یا کسی مشیر یا کسی اور حاکم کی خامیاں بیان کرنے لگوں تو یہ غیبت ہو گی۔ غیبت ایک ایسا گناہ ہے جو

بادشاہوں کی جڑیں کھوکھلی کر دیتا ہے۔ میں اُس وقت کوئی خامی بتاؤں گا جب کوئی ٹھوس ثبوت موجود ہو گا اور جو آپ کو صاف نظر آئے گا"۔

سلطان ملک شاہ دراصل یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ شخص کتنا ذہین ہے اور اس کی عقل میں باریک بینی اور دُور اندیشی ہے بھی یا نہیں۔

"کاروبارِ سلطنت سے ہٹ کر ایک بات پوچھتا ہوں" — سلطان نے پوچھا — "کیا تم نے کبھی شیر یا چیتے وغیرہ کا شکار کھیلا ہے؟"

"نہیں سلطانِ عالی مقام!"

"تو اس کا مطلب یہ ہُوا" — سلطان نے کہا — "کہ تم ان درندوں سے ڈرتے ہو..... کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ان درندوں سے ڈرنا چاہئے؟"

"نہیں سلطانِ محترم!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "درندوں سے کسی کو بھی نہیں ڈرنا چاہئے۔ میں صرف ایک درندے سے ڈرتا ہوں اور آپ کے دل میں بھی اس کا ڈر پیدا کرنا چاہتا ہوں"۔

"ایسا کون سا درندہ ہے؟"

"دیمک!" — حسن بن صباح نے جواب دیا۔

سلطان ملک شاہ ہنس پڑا۔

"تم میں بذلہ سنجی بھی ہے" — سلطان نے کہا — "مجھے یہ وصف اچھا لگتا ہے۔ میں نے پہلی بار کسی کو دیمک کو درندہ کہتے سنا ہے"۔

"نہیں سلطانِ معظم!" — حسن بن صباح نے کہا — "میں اس وقت ہر بات پوری سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ یہ موقع ہنسی مذاق کا نہیں..... درندہ آپ کے سامنے آتا ہے تو آپ اس پر تیر چلاتے ہیں یا اس سے بچنے کے لئے راستہ بدل لیتے ہیں یا درخت پر چڑھ جاتے ہیں لیکن دیمک وہ درندہ ہے جو سامنے نہیں آتا، آپ اس پر تیر نہیں چلا سکتے نہ آپ درخت پر چڑھ جانے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ آپ کو اُس وقت پتہ چلتا ہے جب دیمک اندر ہی اندر کھا کر سب کچھ کھوکھلا اور بے جان کر چکی ہوتی ہے۔ دیمک بادشاہ کے تخت کو لگ جائے تو بادشاہ کو اُس وقت پتہ لگتا ہے جب تخت بیٹھ جاتا ہے..... میں نے اب تک جو کچھ کہا ہے اس کا لبِ لباب یہ ہے کہ ڈرو درباری خوشامدی سے، آستین کے سانپ سے اور اُن کارندوں اور درباریوں سے جو دیمک کی

طرح اندر ہی اندر سلطنت کو کھا رہے ہیں"۔

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ ہم نے تمہاری یہ باتیں سن کر کیا رائے قائم کی ہے؟" سلطان نے پوچھا۔

"رائے اچھی نہیں ہو سکتی" — حسن بن صباح نے کہا — "کیونکہ میں نے خوشامد نہیں کی بلکہ خوشامد کے خلاف بات کی ہے"۔

"نہیں حسن!" — سلطان نے کہا — "تمہاری یہ باتیں سن کر ہمیں خوشی ہوئی ہے کہ تم صاف گو اور صداقت پسند ہو..... تم جا سکتے ہو"۔

سلطان ملک شاہ حسن بن صباح کے جانے کے بعد کچھ دیر سوچ میں گم رہا۔ اُس کے ذہن میں حسن بن صباح کی باتیں گونج رہی تھیں۔ یہ باتیں بے مقصد اور بے معنی نہیں تھیں۔ اس نے احتشام مدنی کو بلایا۔

"احتشام!" — سلطان نے کہا — "میرا یہ معتقدِ خاص مجھ پر بڑا اچھا تاثر چھوڑ گیا ہے۔ یہ عمر کے لحاظ سے زیادہ جہاندیدہ اور عالم لگتا ہے"۔

احتشام مدنی جیسے اسی انتظار میں تھا کہ سلطان حسن بن صباح کے متعلق یہ رائے دے۔ سلطان کی اتنی اچھی رائے سن کر احتشام مدنی نے حسن بن صباح کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے اور دبی زبان میں نظام الملک کے خلاف بھی ایک دو باتیں کہہ دیں۔

○

احتشام مدنی نے حسن بن صباح سے جو قیمت وصول کرنی تھی وہ تقریباً طے ہو چکی تھی لیکن یہ قیمت اُس نے اپنی کوشش سے حاصل کرنی تھی۔ اُس شام کا دھندلکا جب تاریک ہو گیا تو احتشام فاطمہ کے ساتھ باغ کے ایک ایسے گوشے میں بیٹھا تھا جہاں انہیں دیکھنے والا کوئی نہ تھا۔ وہ جسم تو دو تھے لیکن اس طرح باہم پیوست کہ ان کے درمیان سے ہوا بھی نہیں گزر سکتی تھی۔

"کل رات تو تم نے مجھے مروا ہی دیا تھا فاطمہ!" — احتشام نے کہا — "تم نے تو صاف کہہ دیا تھا کہ تم مجھے جانتی پہچانتی ہی نہیں"۔

"تو میں اور کیا کرتی!" — فاطمہ نے ہنستے ہوئے کہا — "اگر میں یہ کہہ دیتی کہ آپ کو میں نے خود بلایا تھا تو میرا بھائی میری گردن کاٹ دیتا۔ آپ مرد ہیں۔ سب کچھ کر سکتے ہیں۔ میں جانتی تھی کہ آپ میرے بھائی کو ٹھنڈا کر لیں گے۔ وہ آپ نے کر لیا"۔

"میں تو اس سے بھی زیادہ اکھڑ اور جابر آدمیوں کو ٹھنڈا کر لیا کرتا ہوں" — احتشام مدنی نے کہا — "میرا تو خیال تھا کہ اب تم مجھے کبھی بھی نہیں ملو گی"۔

"یہ وہم دل سے نکال دیں" — فاطمہ نے کہا — "میں نے آپ سے محبت کی ہے اور یہ محبت وقتی اور جسمانی نہیں"۔

"محبت میری بھی وقتی نہیں" — احتشام نے کہا — "میں تمہیں اپنی زندگی کی رفیقہ بناؤں گا۔ کہو گی تو اپنی دونوں بیویوں کو طلاق دے دوں گا"۔

"نہیں!" — فاطمہ نے کہا — "ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کے دل میں میری محبت ہے تو میں دو عورتوں کو کیوں اجاڑوں"۔

اُس زمانے کے مسلمان معاشرے میں ایک آدمی چار نہیں تو دو یا تین بیویاں ضرور رکھتا تھا۔ ابھی سوکنوں کی رقابت کا تصور پیدا نہیں ہُوا تھا۔ عرب کی چار دیواری کی دنیا میں تو یہ دستور بھی چلتا تھا کہ کوئی بیوی اپنی کسی خوبصورت سہیلی کو اپنے خاوند کو تحفے کے طور پر پیش کرتی تھی اور خاوند اس کے ساتھ شادی کر لیتا تھا۔ سلجوقیوں کے ہاں یہ رواج ذرا مختلف تھا لیکن احتشام نسلاً عربی تھا۔

"معلوم نہیں میرے بھائی حسن نے آپ کو بتایا ہو گا کہ میں شادی کے نام سے بھی بھاگتی ہوں" — فاطمہ نے کہا۔

"ہاں فاطمہ!" — احتشام نے کہا — "حسن نے مجھے تمہارے متعلق سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ میں خود تمہیں شادی کے لئے تیار کروں..... دیکھو فاطمہ! تمام آدمی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ تمہارا پہلا خاوند ہوش و حواس میں نہیں تھا۔ اُس کا تو دماغی توازن بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا جو تم جیسے پھول کی قدر نہیں کر سکا"۔

"میں حیران ہوں کہ میں آپ کے پاس بیٹھی ہوئی ہوں" — فاطمہ نے کہا — "بیٹھی ہوئی بھی نہیں بلکہ آپ کے بازوؤں میں ہوں۔ حیران اس لئے ہوں کہ مجھے مرد کے تصور سے ہی نفرت ہو گئی ہے۔ آپ نے مجھے بڑے کڑے امتحان میں ڈال دیا ہے۔ ایک طرف آپ کی شادی کی پیشکش ہے جو میں قبول کرنے سے ڈرتی ہوں، دوسری طرف آپ کی محبت ہے جس سے میں دستبردار نہیں ہو سکتی"۔

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں تمہارے پہلے خاوند جیسا آدمی نہیں" — احتشام نے کہا — "میں اپنی محبت کا کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتا"۔

"مجھے سوچنے کا موقع دیں" ۔۔۔ فاطمہ نے کہا ۔۔۔ "میں عجیب سی حالت میں پڑی ہوئی ہوں۔ میرے بھائی کو میرا خیال پریشان رکھتا ہے اور میں اپنے اس بھائی کے متعلق سوچتی رہتی ہوں"۔

"مجھے بتاؤ فاطمہ!" ۔۔۔ احتشام نے کہا ۔۔۔ "بھائی کے متعلق تم کیا سوچتی ہو؟"

"میرا بھائی بہت ہی قابل اور عالم فاضل ہے" ۔۔۔ فاطمہ نے کہا ۔۔۔ "یہ جتنا قابل ہے اتنا ہی سادہ آدمی ہے۔ وزیرِاعظم نظام الملک میرے بھائی کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ میں دیکھ رہی ہوں کہ وہ میرے بھائی سے مشورے لے کر سلطان کے ساتھ اس طرح بات کرتا ہے جیسے یہ مشورے اُس کے اپنے دماغ سے نکلے ہیں۔ میں سلطان کو یہ بات بتا نہیں سکتی۔ سلطان کو اصل حقیقت کا علم ہونا چاہئے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس سلطنت کا وزیرِاعظم میرا بھائی ہو تو آپ اس سلطنت میں ایسی تبدیلیاں دیکھیں جو آپ کو حیرت میں ڈال دیں"۔

"مجھے کچھ وقت چاہئے فاطمہ!" ۔۔۔ احتشام نے کہا ۔۔۔ "حسن نے مجھے نظام الملک کے متعلق کچھ باتیں بتائی ہیں۔ میں نے آج ہی سلطان کے ساتھ بات کی ہے۔ معلوم نہیں حسن نے تمہیں بتایا ہے یا نہیں' سلطان نے حسن کو بلایا تھا اور ان کے درمیان خاصی دیر باتیں ہوئی تھیں۔ اس کے بعد سلطان نے مجھے بلایا اور اس نے صاف لفظوں میں بتایا کہ وہ حسن سے بہت متاثر ہُوا ہے۔ مجھے موقع مل گیا۔ میں نے سلطان کے آگے حسن کو اتنا چڑھایا کہ انتظامی قابلیت اور عقل و دانش کے لحاظ سے اسے آسمان تک پہنچا دیا"۔

"کیا میں دل کی بات صاف صاف نہ کہہ دوں؟" ۔۔۔ فاطمہ نے کہا۔

"کیوں نہیں!" ۔۔۔ احتشام نے اسے اپنے اور زیادہ قریب کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ "دل کی بات صاف لفظوں میں کہہ دو گی تو یہ مجھ پر احسان ہو گا"۔

"ایسی صورت پیدا کریں کہ سلطان نظام الملک کی جگہ میرے بھائی کو وزیرِاعظم مقرر کر دے" ۔۔۔ فاطمہ نے کہا ۔۔۔ "اگر ایسا ہو جائے تو میں اُسی روز آپ کو اپنا خاوند تسلیم کر لوں گی"۔

"ایسا ہو کر رہے گا" ۔۔۔ احتشام نے کہا ۔۔۔ "لیکن کچھ وقت چاہئے۔ کسی کے دماغ کو ایک دو دنوں میں بدلا نہیں جا سکتا پھر بھی میں سلطان کو نظام الملک کے خلاف کر دوں

-۲

کیا احتشام مدنی جس کی عمر پینتیس چالیس سال کے درمیان تھی اور جو ایک اتنی بڑی سلطنت کے سلطان کا مشیرِ خاص تھا' اتنا سیدھا اور کم فہم تھا کہ ایک جواں سال لڑکی کے ہاتھوں اُلّو بن گیا تھا؟

وہ سیدھا تھا نہ کم فہم۔ وہ ذہنی طور پر بالغ آدمی تھا۔ سلطنت کے انتظامی امور کا خصوصی تجربہ رکھتا تھا۔ فنِ حرب و ضرب کی بھی سُوجھ بُوجھ تھی لیکن وہ انسان تھا' مرد تھا اور ہر مرد کی طرح عورت اس کی فطری کمزوری تھی۔ فاطمہ کوئی عام سی عورت نہیں بلکہ حسین و جمیل لڑکی تھی۔ اپنے حسن کے استعمال کی اسے تربیت دی گئی تھی۔ اسے بڑی ہی خرانٹ اور عمر رسیدہ عورتوں نے عملاً" بتایا تھا کہ آدمی پر کس طرح حسن کا طلسم طاری کیا جاتا ہے۔

اس معاشرے میں جس میں مرد دو دو' تین تین اور چار چار بیویوں سے بھی مطمئن نہیں ہوتے تھے' احتشام کا ایک حسین لڑکی کے نشے میں مبتلا ہو جانا کوئی عجوبہ نہیں تھا۔

ایک تو اس لڑکی کا حسن اور اس کے خصوصی انداز تھے جنہوں نے احتشام کی عقل پر پردہ ڈال دیا' دوسرے وہ خوشبو تھی جو حسن بن صباح نے اس لڑکی کو اپنے کپڑوں اور بالوں پر لگانے کے لئے دی تھی۔ اس خوشبو نے احتشام کی سوچنے کی صلاحیت کو سُلا دیا تھا۔ احتشام کو محسوس ہی نہ ہُوا کہ وہ اپنے گھر اپنی دو بیویوں کے پاس پہنچ چکا ہے۔ اُس پر فاطمہ نشے کی طرح طاری تھی۔

O

یہ سلسلہ کچھ دن اسی طرح چلا کہ فاطمہ اور احتشام مدنی کی ملاقاتیں اسی باغ میں اسی جگہ ہوتیں۔ ہر ملاقات میں فاطمہ احتشام کی آغوش اور بازوؤں میں ہوتے ہوئے بھی اس سے بہت ہی دُور ہوتی۔ فاطمہ کی خوشبو احتشام کو مسحور کر لیتی اور وہ ایسی باتیں کرتا جیسے وہ ہوش و حواس میں نہ ہو یا نشے میں ہو۔

حسن بن صباح کی ہدایت کے مطابق فاطمہ احتشام کے لئے بڑا ہی حسین اور دلکش سراب بنی رہی۔

احتشام مدنی کو جب موقع ملتا' سلطان کے پاس جا بیٹھتا اور نظام الملک کے خلاف ایک دو باتیں کر کے حسن بن صباح کی تعریف کر دیتا۔

اس دوران ایک روز حسن بن صباح کے پاس غلجان سے ایک آدمی آیا۔ وہ احمد بن غطاش کا قاصد تھا۔

"قلعہ دار احمد بن غطاش نے پوچھا ہے کہ یہاں کے حالات کیا ہیں"۔۔۔ قاصد نے کہا۔۔۔ "کیا ہم اُس مقصد میں کامیاب ہو سکیں گے جس کے لئے آپ کو یہاں بھیجا گیا ہے؟"

"میں تحریری جواب نہیں دے سکتا"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "میرے مرشد احمد بن غطاش جانتے ہیں کہ ایسی باتیں تحریر میں نہیں لائی جا سکتیں۔ انہیں میرا سلام کہنا۔ پھر کہنا کہ آپ کا یہ ناچیز شاگرد کبھی ناکام نہیں ہوا' ہر مشکل سے بخیر و خوبی نکلا ہے اور اسے پوری امید ہے کہ وہ یہ مہم بھی سر کر لے گا۔ انہیں بتانا کہ آپ نے جو چیز میرے ساتھ بھیجی ہے اس نے بڑی کامیابی سے اپنا راستہ بنا لیا ہے۔ میری بات سلطان تک پہنچ گئی ہے اور باقاعدگی سے پہنچائی جا رہی ہے۔ اب میں عملی طور پر کچھ کروں گا۔۔۔ اب تم بتاؤ کہ وہاں غلجان میں کیا ہو رہا ہے"۔

"وہاں اتنی زیادہ کامیابی حاصل ہو رہی ہے کہ اتنی متوقع نہیں تھی"۔۔۔ قاصد نے کہا۔۔۔ "لوگ ابھی تک خدا کے ایلچی کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ خدا کا ایلچی لوگوں کو خدا کا پیغام اور اپنا دیدار دے کر واپس چلا گیا ہے اور کسی روز اچانک واپس آئے گا۔ احمد بن غطاش نے کسانوں کے محصولات اور مالیہ وغیرہ بہت کم کر دیا ہے جس سے لوگ بہت خوش ہیں۔ وہ احمد بن غطاش کو خدا کے ایلچی کا خاص مرید اور نمائندہ سمجھتے ہیں۔ وہ جدھر جاتا ہے' لوگ اسے رکوع کی حالت میں جا کر سلام کرتے ہیں"۔

"میرے پیر استاد احمد بن غطاش خود دانش مند ہیں"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "پھر بھی انہیں میری طرف سے کہہ دینا کہ ابھی اسلام اور اہلِ سنت کے خلاف کوئی بات نہ کریں' اور یہ بھی کہنا کہ ایک لشکر تیار کرنا شروع کر دیں جو تنخواہ دار نہیں ہو گا بلکہ ضرورت کے وقت اسے استعمال کیا جائے گا"۔

"یہ کام شروع ہو چکا ہے"۔۔۔ قاصد نے کہا۔۔۔ "لوگوں میں گھوڑ سواری' تیغ زنی اور تیر اندازی کا شوق پیدا کیا جا رہا ہے۔ عنقریب مقابلے منعقد کئے جائیں گے۔۔۔۔ محترم قلعہ دار نے آخری بات یہ کہی ہے کہ آپ اگر یہاں کامیاب نہ ہو سکے اور کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو ہمیں اطلاع دینا۔ ہم نظام الملک کو قتل کروانے کا انتظام کر

لیں گے یا اسے اغوا کر کے غائب کر دیں گے اور یہ ظاہر کریں گے کہ وہ خود ہی کہیں روپوش ہو گیا ہے"۔

"ابھی ایسی کوئی ضرورت نہیں"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔ "مجھے امید ہے کہ میں مطلوبہ کامیابی حاصل کر لوں گا"۔

حسن بن صباح نے قاصد کو رخصت کر دیا۔

داستان گو سنا چکا ہے کہ حسن بن صباح نے جب ایسی سرگرمیاں شروع کی تھیں تو یوں پتہ چلتا تھا جیسے یہ شخص اور اس کا استاد اسماعیلی فرقے کے پیروکار ہیں اور اس فرقے اور مکتبۂ فکر کی تبلیغ کر کے اسلام کے دوسرے فرقوں خصوصاً "سنی عقیدے" کو ختم کر دیں گے لیکن آگے چل کر تاریخ صاف گواہی دیتی ہے کہ یہ فرقہ باطنیہ کے لوگ تھے اور یہ اپنا ہی کوئی عقیدہ پھیلا رہے تھے۔ چونکہ ان کے پاس اللہ کی اتاری ہوئی کوئی کتاب تو تھی نہیں نہ ان کی کوئی علمی' عقلی یا دینی بنیاد تھی اس لئے وہ فریب کاری اور قتل کا سہارا لے رہے تھے۔ یہ بھی پہلے بیان ہو چکا ہے کہ یہ لوگ انسانی فطرت کی کمزوریوں کو ماہرانہ طریقے سے استعمال کر رہے تھے۔

○

تاریخوں میں دو اہم واقعات ملتے ہیں جن میں حسن بن صباح کو موقع ملتا ہے کہ وہ کھلم کھلا نظام الملک کو نالائق ثابت کرے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ خود بڑا ہی دانشمند ہے۔ ایک واقعہ "تقریباً" ہر مورخ نے لکھا ہے جو یوں ہے کہ ایک بار سلطان ملک شاہ حلب گیا۔ وہاں ایک خاص قسم کا پتھر پایا جاتا تھا جو سنگِ رخام کہلاتا تھا۔ اس پتھر سے برتن اور گلدان وغیرہ بنائے جاتے تھے۔ سلطان نے حکم دیا کہ پانچ سو من سنگِ رخام اصفہان پہنچایا جائے۔

یہ ذہن میں رکھیں کہ اُس زمانے میں اس علاقے کا من چالیس تولے اور آٹھ ماشے ہوتا تھا۔

دو عربی شتربان اصفہان جا رہے تھے۔ ایک کے چھ اور دوسرے کے چار اونٹ تھے۔ ان دونوں کے اونٹوں پر پہلے ہی پانچسو من سامان لدا ہوا تھا۔ انہوں نے پانچسو من سنگِ رخام بھی آپس میں تقسیم کر کے اونٹوں پر لاد لیا۔ اگر خالی اونٹ تلاش کئے جاتے تو کئی دن گزر جاتے۔ اتفاق سے یہ دو شتربان اصفہان کو ہی جا رہے تھے۔

سلطان واپس اپنے دارالحکومت میں پہنچ گیا۔ اُسے اطلاع ملی کہ سنگِ رخام پہنچ گیا ہے تو وہ حیران ہُوا اور خوش بھی کہ اس کے حکم کی تعمیل اتنی جلدی ہو گئی ہے۔ اُس نے حکم دیا کہ ان شتربانوں کو ایک ہزار دینار انعام کے طور پر دے دیئے جائیں۔

"خواجہ طوسی!" ——— سلطان نے نظام الملک سے کہا ——— "یہ رقم ان دونوں میں تقسیم کر دو"۔

نظام الملک نے چھ اونٹوں والے شتربان کو چھ سو اور چار اونٹوں والے کو چار سو دینار ادا کر دیئے۔

"یہ تقسیم غلط ہے" ——— حسن بن صباح جو وہاں موجود تھا' بول پڑا ——— "وزیرِاعظم کو سوچ سمجھ کر یہ رقم تقسیم کرنی چاہیئے"۔

"تم اس غلطی کو صحیح کر دو حسن!" ——— سلطان نے کہا ——— "لیکن یہ بتا دو کہ اس تقسیم میں وزیرِاعظم نے کیا غلطی کی ہے؟"

"چھ اونٹوں والے شتربان کی حق تلفی ہوئی ہے" ——— حسن بن صباح نے کہا ——— "چھ اونٹوں والے کو آٹھ سو اور چار اونٹوں والے کو دو سو دینار ملنے چاہئیں"۔

"وہ کیسے؟" ——— سلطان نے پوچھا۔

"سلطانِ محترم!" ——— حسن بن صباح نے کہا ——— "غور فرمائیں' اونٹ دس ہیں اور وزن پندرہ سو من' اس لئے ہر اونٹ نے ڈیڑھ ڈیڑھ سو من وزن اٹھایا۔ جس کے چھ اونٹ ہیں وہ نو سو من وزن لایا ہے۔ وہ اس طرح کہ پانچسو من سامان اس کے اونٹوں نے پہلے ہی اٹھا رکھا تھا پھر چار سو من سنگِ رخام اس کے اونٹوں پر لادا گیا۔ دوسرے شتربان کے چار اونٹ تھے۔ اس کے اونٹوں پر چھ سو من وزن تھا جس میں سے پانچسو من پہلے ہی اونٹوں پر لدا ہوا تھا اور ایک سو من سنگِ رخام اس کے اونٹوں پر لادا گیا۔ آپ نے ایک ہزار دینار پانچ سو من وزن کے لئے دیا ہے۔ حساب یہ بنا کہ دو سو دینار فی سو من کا انعام ہوا۔ اس حساب سے چھ اونٹوں والے کو آٹھ سو دینار اور چار اونٹوں والے کو دو سو دینار ملنے چاہئیں..... یہ ہے ہمارے محترم وزیرِاعظم کی غلطی"۔

تاریخوں میں لکھا ہے کہ سلطان ملک شاہ نظام الملک کا بہت احترام کرتا تھا اور اُس کی قابلیت سے متاثر تھا۔ وہ حسن بن صباح کا حساب سمجھ گیا لیکن وہ نظام الملک کو شرمسار کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ اُس نے حسن بن صباح کا حساب ہنسی مذاق میں ٹال دیا

لیکن نظام الملک پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔ اُسے پہلی بار محسوس ہُوا کہ حسن بن صباح اُسے اور اُس کی حیثیت کو نقصان پہنچانے پر اُتر آیا ہے۔

اس سے پہلے نظام الملک کو اس کے کارندوں نے کچھ اس قسم کی اطلاعیں دی تھیں کہ حسن بن صباح اور احتشام مدنی اکثر راز و نیاز کی باتیں کرتے دیکھے جاتے ہیں۔ اسے ایک اطلاع یہ بھی ملی تھی کہ احتشام مدنی کو باغ میں حسن بن صباح کی بہن کے ساتھ دیکھا گیا ہے۔ تاریخوں کے مطابق' نظام الملک شریف النفس اور بڑے اونچے کردار کا آدمی تھا۔ یہ خبریں سن کر بھی اس کے دل میں حسن بن صباح کے خلاف شک پیدا نہ ہُوا۔ وہ کہتا تھا کہ اس نے حسن بن صباح کو جو رتبہ دلایا ہے' یہ ایسا احسان ہے جسے حسن بن صباح کبھی نہیں بھولے گا اور اسے گزند نہیں پہنچائے گا۔

○

نظام الملک اپنی فطرت کے مطابق مطمئن رہا لیکن حسن بن صباح اپنی فطرت کے مطابق نظام الملک کو ذلیل و خوار کرنے کے موقع کی تلاش میں رہا۔ حسن بن صباح کے سامنے صرف یہ مقصد تھا کہ وہ وزیرِاعظم بن جائے۔ اس کے بعد ان باطنیوں نے خفیہ قتل و غارت کا سلسلہ شروع کر کے سلجوقی سلطنت پر قبضہ کرنا تھا۔

حسن بن صباح کو ایک موقع مل ہی گیا جو اُس نے خود پیدا کیا تھا۔ وہ اس طرح کہ ایک روز سلطنت کے کچھ حاکم بیٹھے آپس میں تبادلۂ خیالات کر رہے تھے۔ کسی نے کہہ دیا کہ سلطان ملک شاہ عرصہ بیس سال سے سلطان ہے۔ اسے کچھ پتہ نہیں کہ اس عرصے میں رعایا سے محصولات وغیرہ کے ذریعے کتنی رقم وصول کی گئی ہے اور یہ رقم کہاں کہاں خرچ ہوئی ہے۔

"کون کہتا ہے کہ ساری رقم خرچ ہوئی ہے!" ——— حسن بن صباح نے کہا ——— "میں کہتا ہوں کہ اس میں سے بہت سی رقم خورد بُرد اور غبن ہوئی ہے۔ اگر سلطان مجھے اجازت اور سہولت مہیا کرے تو میں بیس سال کا حساب کتاب تیار کر کے سلطان کے آگے رکھ دوں گا"۔

احتشام مدنی بھی وہاں موجود تھا۔ اس نے سلطان کو بتایا کہ حسن بن صباح نے بڑی عقل مندی کی بات کی ہے۔ احتشام نے سلطان کو پوری بات سنائی جو حاکموں کی اس محفل میں ہوئی تھی۔ احتشام نے خصوصی مشیر کی حیثیت سے سلطان کو مشورہ دیا کہ بیس

برسوں کا حساب ہونا چاہئے۔

"اس سے ہمیں کیا حاصل ہوگا؟" ـــــ سلطان نے پوچھا۔

"اگر کچھ رقم خورد بُرد ہوئی ہے تو وہ واپس نہیں ملے گی" ـــــ اعتشام نے کہا ـــــ "حاصل یہ ہوگا کہ یہ پتہ چل جائے گا کہ ہمارے حکام میں بددیانت کون کون ہیں"۔

سلطان اور اعتشام میں اس مسئلے پر کچھ دیر تبادلۂ خیالات ہُوا۔ اعتشام نے سلطان کو قائل کر لیا کہ گذشتہ بیس برسوں کا حساب ہونا چاہئے۔ سلطان اپنے وزیراعظم نظام الملک کے مشورے کے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کیا کرتا تھا۔ اس نے نظام الملک کو بلایا اور یہ نیا مسئلہ اس کے آگے رکھا۔

"بیس سالوں کا حساب کتاب کتنے دنوں میں تیار ہو سکتا ہے؟" ـــــ سلطان نے نظام الملک سے پوچھا۔

"دنوں میں؟" ـــــ نظام الملک نے حیرت زدگی کے عالم میں جواب دیا ـــــ "برسوں کی بات کریں۔ پہلے اپنی سلطنت کی وسعت دیکھیں پھر بیس برسوں کے عرصے پر غور کریں، پھر دیکھیں کہ وہ جگہیں کتنی ہیں جہاں محصولات وصول کر کے سرکاری خزانے میں جمع کرائے جاتے ہیں۔ اگر حساب تیار کرنا ہی ہے تو اس کے لئے مجھے دو سال چاہئیں"۔

اُس وقت اعتشام مدنی اور حسن بن صباح بھی وہاں موجود تھے۔

"سلطانِ معظم!" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "میں حیران ہوں کہ محترم وزیراعظم نے دو سال کا عرصہ مانگا ہے۔ میں صرف چالیس دنوں میں یہ حساب بنا کر دے سکتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ میں جتنا عملہ مانگوں وہ مجھے دیا جائے اور ہر سہولت مہیا کی جائے"۔

سلطان ملک شاہ نے احکام جاری کر دیئے اور حسن بن صباح نے کام شروع کر دیا۔

تاریخ دان ابوالقاسم رفیق دلاوری نے مختلف مؤرخوں کے حوالوں سے لکھا ہے کہ خواجہ حسن طوسی نظام الملک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ کبھی وہ پریشان ہو جاتا کہ حسن بن صباح نے یہ کام چالیس دنوں میں مکمل کر لیا تو وہ سلطان کی نظروں میں گر جائے گا اور کوئی بعید نہیں کہ سلطان اسے وزارتِ عظمیٰ سے معزول ہی کر دے، اور کبھی نظام الملک یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتا کہ حسن بن صباح یہ کام چالیس دنوں میں تو دور کی بات

ہے، چالیس مہینوں میں بھی نہیں کر سکے گا اور خود ہی سلطان کی نظروں میں ذلیل ہو گا۔

البتہ ایک دکھ تھا جو نظام الملک کو اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ یہ دکھ حسن بن صباح کی احسان فراموشی کا تھا۔ اب تو تصدیق ہو گئی تھی کہ حسن بن صباح اسے معزول کرا کے خود وزیراعظم بننا چاہتا ہے۔

○

پھر حسن بن صباح نے معجزہ کر کے دکھا دیا۔ اس نے کاغذات کا ایک انبار سلطان ملک شاہ کے آگے رکھ دیا۔

"سلطانِ عالی مقام!" ـــــ حسن نے سلطان سے کہا ـــــ "میں نے چالیس دن مانگے تھے۔ آج اکتالیسواں دن ہے۔ یہ رہا بیس برسوں کا حساب۔ کیا وہ شخص وزیراعظم بننے کا حق رکھتا ہے جو کہتا ہے کہ یہ حساب مکمل کرنے کے لئے دو برس درکار ہیں؟..... اگر سلطانِ معظم کے دل پہ گراں نہ گذرے تو میں وثوق سے کہتا ہوں کہ وزیراعظم حسن طوسی جسے آپ نے نظام الملک کا خطاب دے رکھا ہے، محصولات کی رقمیں غبن کرتا رہا ہے۔ اپنی لُوٹ کھسوٹ پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ آپ کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ حساب تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ہو گا تو دو سال لگیں گے"۔

سلطان نے نظام الملک اور اعتشام مدنی کو بلا لیا۔

"خواجہ طوسی!" ـــــ سلطان نے نظام الملک سے کہا ـــــ "یہ ہے وہ حساب جو آپ دو سالوں سے کم عرصے میں نہیں کر سکتے تھے۔ یہ دیکھیں۔ حسن چالیس دنوں میں کرا لایا ہے"۔

نظام الملک پر خاموشی طاری ہو گئی۔ اُس کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ وہ وہاں بیٹھ گیا اور معزولی کے حکم کا انتظار کرنے لگا۔

سلطان نے کاغذات کی ورق گردانی شروع کر دی، اور ایک ورق پر رک گیا۔

"حسن!" ـــــ سلطان نے کہا ـــــ "اس ورق پر آمدنی اور اخراجات مشکوک سے نظر آتے ہیں۔ یہ مجھے سمجھا دو"۔

حسن بن صباح بغلیں جھانکنے لگا۔

سلطان نے ایک اور ورق پر رک کر کچھ پوچھا۔ حسن نے اس کا بھی جواب نہ دیا۔ سلطان نے کئی اور وضاحتیں پوچھیں۔ حسن کسی ایک بھی سوال کا جواب نہ دے سکا۔

"تم نے یہ اتنا لمبا چوڑا حساب تیار کیا ہے؟" ——— سلطان نے کہا ——— "لیکن تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ یہ کیا ہے؟"۔

"سلطانِ معظم!" ——— نظام الملک بولا ——— "میں نے ویسے ہی نہیں کہہ دیا تھا کہ اتنی وسیع و عریض سلطنت کے بیس برسوں کے اخراجات اور آمدنی کے گوشوارے تیار کرنے کے لئے کم از کم دو برس درکار ہیں"۔

"آپ میرے پاس رہیں حسن طوسی!" ——— سلطان نے نظام الملک سے کہا ——— "تم دونوں جاؤ۔ میں یہ تمام لین دین اور شمار دیکھ کر تمہیں بلاؤں گا" ——— ان کے جانے کے بعد سلطان نے پوچھا ——— "یہ سب کیا ہے حسن طوسی؟ مجھے شک ہے کہ مجھے دھوکہ دیا گیا ہے"۔

"سلطانِ معظم!" ——— نظام الملک نے کہا ——— "یہ میرا ایمان ہے کہ کسی کو میرے ہاتھ سے نقصان نہ پہنچے لیکن جہاں میری اپنی حیثیت اور میرا اعتماد خطرے میں پڑ گیا ہے، میں حقیقت سے پردہ اٹھانا ضروری سمجھتا ہوں..... یہ حساب کتاب تیار کرنے میں آپ کے مشیرِ خاص اختشام مدنی کا ہاتھ زیادہ ہے۔ حسن بن صباح کے ساتھ اس کی ایک جوان سال بہن رہتی ہے جو اسی عمر میں بیوہ ہو گئی ہے۔ مجھے اطلاعیں ملی ہیں کہ اختشام اور اس لڑکی کو شام کے بعد باغ میں دیکھا گیا ہے اور یہ بھی کہ اختشام حسن بن صباح کے گھر زیادہ جاتا اور خاصا وقت وہاں گزارتا ہے..... جہاں تک مجھے یاد آتا ہے، حسن بن صباح کی کوئی بہن نہیں۔ میں اس کے خاندان کو مدرسے کے زمانے سے جانتا ہوں"۔

"طوسی!" ——— سلطان نے کہا ——— "میں یہ ساری سازش سمجھ گیا ہوں۔ کچھ عرصے سے اختشام میرے پاس بیٹھ کر حسن بن صباح کی تعریفیں کر رہا ہے، اور یہ شخص ذرا اپنی زبان میں آپ کے خلاف بھی ایک آدھ بات کہہ جاتا ہے" ——— سلطان بولتے بولتے گہری سوچ میں چلا گیا۔ ذرا دیر بعد سر اٹھایا اور بولا ——— "آپ حسن پر ایسا ظاہر کریں کہ میں نے اس کا تیار کیا ہوا حساب سمجھ لیا ہے اور یہ بالکل صحیح ہے..... باقی کام مجھ پر چھوڑ دیں۔ میرے سامنے کوئی اور ہی عکس آ رہا ہے"۔

داستان گو پہلے سنا چکا ہے کہ سلجوقی جو ترک تھے اور جو اسلام کے دشمن ہوا کرتے تھے، مسلمان ہوئے تو اسلام کے شیدائی اور سرفروش بن گئے۔ وہ جنگجو تھے اور فہم و فراست کے لحاظ سے اتنے باریک بیں کہ ان کی نظریں جیسے پردوں کے پیچھے بھی دیکھ

سکتی ہوں۔ ان کے سلطان اپنی سلطنت میں کسی کی حق تلفی اور سلطنت کے امور میں کوتاہی اور بد دیانتی برداشت نہیں کرتے تھے"۔

نظام الملک باہر نکلا۔ حسن بن صباح اور اختشام مدنی باہر سر جوڑے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ نظام الملک کو دیکھ کر دونوں چونکے۔

"حسن! مبارک ہو" ——— نظام الملک نے کہا ——— "تمہارا تیار کیا ہوا حساب بالکل ٹھیک ہے۔ تم جن سوالوں کے جواب نہیں دے سکے تھے، وہ میں نے دے دیئے ہیں۔ میں نے سلطان سے کہا ہے کہ حسن ابھی نیا ہے اس لئے اسے پچھلے امور وغیرہ کا علم نہیں..... سلطان تم پر بہت خوش ہیں۔ کہتے ہیں میں حسن کو انعام دوں گا"۔

"میں تمہارا یہ احسان ساری عمر نہیں بھولوں گا خواجہ!" ——— حسن بن صباح نے نظام الملک سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا ——— "تم نے میرا وقار محفوظ کر دیا ہے"۔

"تم دونوں چلے جاؤ" ——— نظام الملک نے کہا ——— "سلطان تمہیں کل بلائیں گے"۔

○

اُس رات اختشام اور فاطمہ کی ملاقات ایسی تھی جیسے وہ جشن منانے کے لئے اکٹھے ہوئے ہوں۔ گزرے ہوئے دنوں میں زیادہ تر باغ میں ملتے رہے تھے۔ تین مرتبہ وہ الگ الگ جنگل میں چلے گئے اور بہت وقت اکٹھے گذار کر آئے۔ فاطمہ یہ ظاہر کرتی تھی کہ وہ حسن سے چوری گھر سے نکلتی ہے۔ اختشام کو معلوم نہیں تھا کہ حسن خود اسے بھیجتا ہے۔

فاطمہ ابھی تک اختشام کے لئے سراب بنی ہوئی تھی۔ اس نے ابھی تک اختشام کے ساتھ شادی کا فیصلہ نہیں کیا تھا اور انکار بھی نہیں کیا تھا۔ اُس نے ایسا والہانہ انداز اختیار کر لیا تھا جس سے اختشام پر دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ وہ تو اب حسن بن صباح اور فاطمہ کے اشاروں پر ناچنے لگا تھا۔ حسن بن صباح سے اُس نے کہا تھا کہ وہ اسے وزیرِ اعظم بنا کر دم لے گا۔

جس روز نظام الملک نے حسن بن صباح کو یہ خوشخبری سنائی اُس روز اختشام مدنی نے اپنے گھر کے قریب ہی چھوٹا سا ایک مکان جو خالی پڑا تھا، صاف کروا لیا اور ایک کمرے میں پلنگ اور نرم و گداز بستر بچھوا دیا تھا۔ اپنی خاص ملازمہ کے ذریعے اُس نے

فاطمہ کو پیغام بھیج دیا تھا کہ رات وہ فلاں طرف سے اس مکان میں آجائے۔
فاطمہ وہاں پہنچ گئی۔ احتشام پہلے ہی وہاں موجود تھا۔

"میرا ایک کمال دیکھ لیا فاطمہ؟" ـــ احتشام نے فاطمہ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹتے ہوئے کہا ـــ "جعلی حساب کتاب لکھ کر سلطان سے منوالیا ہے کہ یہ حساب بالکل صحیح ہے"۔

"آپ کو مبارک ہو" ـــ فاطمہ نے اپنے گال احتشام کے سینے سے رگڑتے ہوئے کہا ـــ "اب میرے بھائی کو وزیرِاعظم بنوا دیں"۔

"اب یہ کام آسان ہو گیا ہے" ـــ احتشام نے کہا ـــ "کل سلطان ہمیں بلائے گا۔ میں نظام الملک کے خلاف اُس کے ایسے کان بھروں گا کہ وہ اُسی وقت اسے معزول کر دے گا"۔

احتشام نے فاطمہ کو پلنگ پر بٹھالیا۔

"سلطان کل حسن کو انعام دے رہا ہے" ـــ احتشام نے کہا ـــ "میں نے آج تم سے انعام لینا ہے"۔

فاطمہ نے جھینپنے اور شرمانے کی ایسی اداکاری کی کہ احتشام نشے کی سی کیفیت میں بدمست ہو گیا۔ اُس نے فاطمہ کو لٹا دیا۔

"روحانی طور پر تو ہم میاں بیوی بن چکے ہیں" ـــ احتشام نے کہا ـــ "نکاح تو ایک رسم ہے۔ یہ بعد میں بھی ادا ہو سکتی ہے"۔

کمرے کا دروازہ بند تھا۔ زنجیر چڑھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی کیونکہ باہر کا دروازہ بند تھا۔ مکان کا صحن کشادہ تھا۔ احتشام مدنی جب فاطمہ کے طلسماتی حسن، ناز و انداز اور دکھاوے کے شرم و حجاب میں مدہوش ہو چکا تھا، فاطمہ چونکی۔

"ذرا ٹھہریں" ـــ فاطمہ نے کہا ـــ "میں نے قدموں کی آہٹ سنی ہے"۔

"بلّی ہو گی" ـــ احتشام نے نشے سے لڑکھڑاتی آواز میں کہا ـــ "کسی انسان میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی کہ اس گھر میں قدم رکھے"۔

چار آدمی اس گھر میں قدم رکھ چکے تھے۔ وہ چھت کی طرف سے آئے تھے اور سیڑھیاں اُتر کر صحن میں آگئے تھے۔ فاطمہ نے ایک بار پھر احتشام کو پرے ہٹنے کو کہا، اسے ہلکا سا دھکا بھی دیا لیکن احتشام پر بدمستی طاری تھی

کمرے کا دروازہ کھلا۔ احتشام نے اُدھر دیکھا۔ دو آدمی اندر آئے۔ احتشام ان دونوں کو جانتا تھا۔ یہ دونوں کوتوال کے ماتحت تھے۔ ان کے پیچھے دو آدمی تھے۔ وہ بھی کوتوال کے کارندے تھے۔

"نکل جاؤ یہاں سے!" ـــ احتشام مدنی نے سلطان کے مشیرِ خاص کی حیثیت سے حکم کے لہجے میں کہا ـــ "تمہیں میرے گھر میں آنے کی جرأت کیسے ہوئی!"

"ہم سلطان کے حکم سے آئے ہیں عالی جاہ!" ـــ ایک نے کہا ـــ "آپ کو اور اس لڑکی کو سلطان کے پاس لے جانا ہے"۔

"چلو، تم نکلو یہاں سے!" ـــ احتشام نے کہا ـــ "میں تیار ہو کر آتا ہوں"۔

"آپ خود نہیں جائیں گے عالی جاہ!" ـــ کوتوال کے آدمی نے کہا ـــ "ہم آپ کو لے جائیں گے..... اس لڑکی کو بھی!"

"تیار ہونے کی ضرورت نہیں عالی جاہ!" ـــ دوسرا آدمی بولا ـــ "ہمیں حکم ملا ہے کہ آپ اور یہ لڑکی جس حالت میں ہوں اسی حالت میں ساتھ لے آنا ہے"۔

وہ دونوں نیم برہنہ حالت میں تھے۔ احتشام پر دو نشے طاری تھے۔ ایک اپنی سرکاری حیثیت کا۔ وہ سلطان کا مشیرِ خصوصی تھا، اور دوسرا نشہ فاطمہ کے حسن و شباب کا اور نفسانی جذبات کے اُبال کا تھا۔ یہ سب نشے ایک ہی بار ہوا ہو گئے۔

"منہ مانگا انعام دوں گا" ـــ احتشام نے کہا ـــ "چاروں کو..... جا کر سلطان سے کہہ دو کہ تم نے مجھے اور اس لڑکی کو کہیں بھی نہیں دیکھا"۔

فاطمہ کپڑے پہننے لگی تھی۔

"اس لڑکی کو پکڑ کر باہر لے چلو" ـــ اُس آدمی نے احتشام کی پیشکش کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے آدمیوں کو حکم دیا ـــ "اسی حالت میں گھسیٹ کر باہر لے جاؤ"۔

"میرے عہدے اور رتبے سے تم واقف ہو" ـــ احتشام مدنی نے کہا ـــ "میں تمہیں اتنی ترقی دلواؤں گا کہ حاکم بن جاؤ گے"۔

"مجھے چاہتے ہو تو حاضر ہوں" ـــ فاطمہ بولی۔

"ہاں بھائیو!" ـــ احتشام نے بڑے خوشگوار لہجے میں کہا ـــ "دیکھو کتنی خوبصورت لڑکی ہے"۔

"سلطان کے حکم کی تعمیل کرو" ـــ کوتوال کے آدمی نے کہا ـــ "انہیں پکڑو اور

لے چلو" ــــ وہ احتشام سے مخاطب ہُوا ــــ "عالی جاہ! ہمیں حکم ملا ہے کہ آپ اگر مزاحمت کریں تو آپ کے سر پر ضرب لگا کر بیہوش کر دیا جائے اور اٹھا کر زندان میں پھینک دیا جائے"۔

احتشام مدنی سر جھکائے ہوئے چل پڑا۔ دو آدمی پہلے ہی فاطمہ کو گھسیٹتے دھکیلتے باہر لے گئے تھے۔ اُس کے لئے نیم برہنگی یا مکمل برہنگی کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ وہ آبرو باختہ اور تربیت یافتہ لڑکی تھی۔

ان دونوں کو کوتوالی میں لے گئے اور انہیں الگ الگ کمرے میں بند کر دیا گیا۔

○

سلطان کا اپنا جاسوسی اور مخبری کا نظام تھا۔ اسے احتشام مدنی اور فاطمہ کی خفیہ ملاقاتوں کی اطلاعیں ملی تھیں لیکن یہ کوئی اہم یا نازک خبر نہیں تھی۔ یہ احتشام کا ذاتی معاملہ تھا۔ سلطان کو اس صورت میں ان دونوں کی ملاقاتوں میں خطرہ محسوس ہوتا کہ لڑکی مشکوک اور مشتبہ ہوتی۔ شک یہ ہوتا کہ یہ لڑکی عیسائی یا یہودی ہے اور جاسوس ہے۔ یہ پتہ چل گیا تھا کہ یہ معتمدِ خاص حسن بن صباح کی بہن ہے۔

درمیان میں معاملہ بیس برسوں کے حساب کتاب کا آگیا تو پتہ چلا کہ حسن بن صباح اور احتشام مدنی نے سلطان کو دھوکہ دیا ہے۔ نظام الملک اور سلطان ملک شاہ کی آپس میں باتیں ہوئیں تو نئے شکوک پیدا ہو گئے۔ سلطان ملک شاہ عقل و دانش والا آدمی تھا۔ نظام الملک نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ حسن بن صباح کی کوئی بہن ہے ہی نہیں۔

سلطان نے نظام الملک سے کہا کہ وہ حسن بن صباح کو خوشخبری سنا دے کہ اُس نے بیس برسوں کا آمدنی اور اخراجات کا جو حساب تیار کیا ہے' وہ سلطان نے منظور کر کے اسے بالکل صحیح تسلیم کر لیا ہے۔ اس سے سلطان کا مقصد یہ تھا کہ حسن بن صباح اور احتشام مدنی بے فکر اور مطمئن ہو جائیں۔

سلطان نے اُسی وقت کوتوال کو بلایا اور اسے یہ ساری صورتِ حال بتا کر کہا کہ احتشام اور اس لڑکی کو اکٹھے پکڑنا ہے۔

"ابھی جا کر مخبر مقرر کر دو" ــ سلطان نے کہا ــــ "وہ شام کے بعد ملتے ہیں۔ ایک آدمی احتشام کی نگرانی کرے اور ایک آدمی اس لڑکی کو دیکھتا رہے۔ یہ کہیں باہر اکٹھے ہوں تو احتشام کے رتبے کا خیال کئے بغیر دونوں کو کوتوالی میں بند کر دو۔ انہیں اسی حالت

میں لانا ہے جس حالت میں پائے جائیں۔ ضروری نہیں کہ یہ آج ہی مل جائیں گے۔ کل ملیں' پرسوں ملیں' دس دنوں بعد ملیں' انہیں چھوڑنا نہیں"۔

کوتوال یہ ساری کارروائی اور اس کا پس منظر سمجھ گیا۔ اس نے اُسی وقت چار آدمی اس کام پر لگا دیئے۔ انہیں ضروری ہدایات اور احکام دے کر رخصت کر دیا۔

ایسی توقع نہیں تھی کہ وہ اُسی رات پکڑے جائیں گے لیکن احتشام مدنی نے اُس رات فاطمہ سے انعام وصول کرنا تھا۔ اُس نے فاطمہ کے بھائی حسن کی مدد کی تھی اور سلطان کو بڑی کامیابی سے دھوکا دیا گیا تھا۔

سورج غروب ہوتے ہی کوتوال کے دو آدمی بھیس بدل کر چلے گئے۔ ایک احتشام کے گھر کو دُور سے دیکھتا رہا اور دوسرا حسن بن صباح کے گھر کی نگرانی کرتا رہا۔ ان دونوں کے ساتھ ایک ایک اور آدمی تھا۔ یہ دونوں دور دور کھڑے تھے۔ پہلے احتشام گھر سے نکلا اور اُس مکان میں چلا گیا جو اُس نے اُس رات کے جشن کے لئے تیار کیا تھا۔ اُس کی نگرانی والا آدمی چھپ کر کھڑا رہا۔

پھر فاطمہ گھر سے نکلی۔ اُس کی نگرانی والا آدمی اُس کے پیچھے چل پڑا۔ فاطمہ بھی اسی مکان میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔ کوتوال کے دونوں مخبر آپس میں مل گئے۔ انہوں نے اپنے دوسرے دونوں ساتھیوں کو بھی بلا لیا۔ ان میں ایک عہدیدار تھا۔ انہوں نے کچھ وقت انتظار کیا پھر ساتھ والے گھر کے بڑے آدمی کو باہر بلا کر بتایا کہ وہ کوتوالی کے آدمی ہیں اور اس ساتھ والے گھر میں اترنا ہے۔

"آجائیں" ــــ اُس آدمی نے کہا ــــ "میری چھت سے اس چھت پر چلے جائیں۔ میں آپ کو بتاؤں گا اس مکان کی سیڑھیاں کہاں ہیں"۔

چار آدمی اس شخص کی راہنمائی میں اس مکان میں اتر گئے جس کے ایک کمرے میں احتشام مدنی اور فاطمہ جشن منا رہے تھے۔

○

رات کوئی زیادہ نہیں گذری تھی۔ کوتوال کو اطلاع دی گئی کہ دونوں جس حالت میں تھے اُسی حالت میں پکڑ لائے ہیں۔ کوتوال کو سلطان نے کہا تھا کہ تحقیقات کر کے اسے بتائے کہ اس لڑکی کی حقیقت کیا ہے۔ کوتوال اُسی وقت کوتوالی پہنچا اور اُس کمرے میں چلا گیا جس میں لڑکی بند تھی۔

"نام کیا ہے لڑکی؟" — کوتوال نے پوچھا۔

"فاطمہ!" — لڑکی نے جواب دیا — "میں سلطان کے معتمدِ خاص حسن بن صباح کی بہن ہوں"۔

"ہمیں معلوم ہے حسن بن صباح کہاں کا رہنے والا ہے" — کوتوال نے کہا — "ہم وہاں سے معلوم کریں گے کہ اس کی کوئی بہن ہے بھی یا نہیں..... میری ایک بات سن لو۔ بہت ہی اذیت ناک موت مروگی۔ اپنے متعلق ہر بات سچ بتادو"۔

"کیا آپ اس جسم کو اذیت دیں گے؟" — لڑکی نے جذبات کی حرارت سے کھلی ہوئی مسکراہٹ سے کہا — "ہاتھ لگا کر دیکھیں۔ گلاب کی پتیوں جیسی ملائمت ہے اس جسم کی!" — وہ نیم برہنہ تھی۔ اس نے اپنے آپ کو اور زیادہ برہنہ کر دیا۔ اس کی مسکراہٹ اور زیادہ نشیلی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں سفلی جذبات کا خمار تھا۔ کہنے لگی — "مرد اتنا زیادہ تو نہیں سوچا کرتے..... میرے قریب آجائیں"۔

اس کے سر پر اوڑھنی نہیں تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے۔

"ان بالوں کو ہاتھ لگا کر دیکھیں" — اس نے کہا — "ان پر ہاتھ پھیر کر دیکھیں۔ ریشم اور مخمل جیسے ملائم ہیں"۔

کوتوال آخر مرد تھا' فرشتہ نہیں تھا۔ اس لڑکی کے جسم اور بالوں کو دیکھ کر اس کے جسم نے جھرجھری لی اور اس پر خاموشی طاری ہو گئی۔ وہ آہستہ آہستہ لڑکی کی طرف بڑھا۔ اس کا دایاں ہاتھ اوپر اٹھ رہا تھا۔ قریب جا کر اس کا ہاتھ لڑکی کے سر پر چلا گیا اور اس کی انگلیاں لڑکی کے بالوں میں رینگنے لگیں۔ اس کا دوسرا ہاتھ لڑکی نے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ کوتوال فرائض کی دنیا سے ایک ہی اڑان میں رومانوں کی کہکشاں میں جا پہنچا۔

"خدام!" — اسے کوئی آواز سنائی دی۔ کسی نے اسے پکارا تھا۔

اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بند تھا۔

"ایک خیال رکھنا خدام!" — اسے کمرے میں وہی آواز پھر سنائی دی — "سنا ہے لڑکی بہت ہی حسین ہے۔ اگر تحقیقات تک نوبت آگئی تو یہ یاد رکھنا کہ تم کوتوال ہو..... یہ بھی یاد رکھنا کہ دھوکہ مجھے دیا گیا ہے۔ میں اس سلطنت کا سلطان ہوں۔ میں فرائض میں بددیانتی اور بدمعاشی برداشت نہیں کیا کرتا"۔

یہ الفاظ سلطان ملک شاہ کے تھے جو اس نے احتشام مدنی اور لڑکی کو اکٹھے پکڑنے کی ہدایات دیتے ہوئے کہے تھے۔

کوتوال خدام کی انگلیاں لڑکی کے ریشم جیسے ملائم بالوں میں رینگ رہی تھیں اور لڑکی اس کے دوسرے ہاتھ کو اپنے دونوں ہاتھوں میں مسل رہی تھی۔ کوتوال کے ذہن میں سلطان ملک شاہ کے الفاظ ایسے گونجے جیسے سلطان اس بند کمرے میں کھڑا بول رہا ہو۔

کوتوال کی آنکھوں کے آگے بجلی سی چمکی پھر تاریکی آگئی۔ کوتوال کا وہی ہاتھ جو لڑکی کے نرم و ملائم بالوں میں رینگ رہا تھا' مٹھی بن گیا۔ اس مٹھی میں لڑکی کے بال تھے۔ کوتوال نے بالوں کو اتنی زور سے کھینچا کہ لڑکی کی چیخ نکل گئی۔ درد کی شدت سے اس کا منہ کھل گیا۔

"سچ بتا تو کون ہے!" — کوتوال نے بالوں کو مٹھی سے مروڑتے اور کھینچتے ہوئے کہا — "تیرے بال چھت کے ساتھ باندھ کر تجھے لٹکا دوں گا"۔

درد سے لڑکی کے دانت بجنے لگے۔ کوتوال نے لڑکی کو بالوں سے پکڑے ہوئے اوپر اٹھایا اور فرش پر پٹخ دیا۔

"مر جا یہاں!" — کوتوال نے کہا — "تیری کوئی نہیں سنے گا..... سچ بتا تو کون ہے"۔

کوتوال کو اس پر بھی غصہ تھا کہ لڑکی نے اسے بھٹکا دیا تھا۔ وہ بول نہیں رہی تھی۔ کوتوال نے اس کے ایک ہاتھ کی انگلیاں ایک شکنجے میں جکڑ دیں اور شکنجے کو تنگ کرنا شروع کر دیا۔ لڑکی کی چیخوں سے چھت لرزتی محسوس ہوتی تھی۔ وہ آخر لڑکی تھی' کہاں تک برداشت کرتی۔ اسے مردوں کو انگلیوں پر نچانے کی ٹریننگ دی گئی تھی' یہ تو اسے کسی نے بتایا ہی نہیں تھا کہ کبھی وہ پکڑی بھی جائے گی۔

اس پر غشی طاری ہو رہی تھی جب کوتوال نے اس کی انگلیاں شکنجے سے نکال دیں۔ اسے پانی پلایا لیکن وہ ابھی تک انکار کر رہی تھی۔ کوتوال نے اس کا دوسرا ہاتھ شکنجے میں دینے کے لئے پکڑا تو وہ بلبلا اٹھی اور سچ بولنے پر آگئی۔ اس نے بتا دیا کہ وہ حسن بن صباح کی بہن نہیں اور اسے وہ شاہ در سے لایا تھا۔

اس نے یہ بھی بتا دیا کہ حسن بن صباح اسے اس مقصد کے لئے ساتھ لایا تھا کہ ایسے حاکموں کو اپنے ہاتھ میں لینا ہے جن کا سلطان پر اثر و رسوخ چلتا ہے۔ انہیں نظام الملک

کے خلاف استعمال کرتا ہے۔ لڑکی نے بتایا کہ حسن بن صباح وزیراعظم بننا چاہتا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ احتشام مدنی کو اس نے کس طرح اپنے جال میں پھانسا تھا اور اسے شاہی کا لالچ دیئے رکھا تھا۔

"احتشام مدنی حسن بن صباح کی کس طرح مدد کر رہا تھا؟" ۔۔۔ کوتوال نے پوچھا۔

"کہتا تھا میں نظام الملک کے خلاف سلطان کے دل میں کدورت پیدا کر رہا ہوں" ۔۔۔ لڑکی نے کہا ۔۔۔ "یہ حساب کتاب کا جو مسئلہ کھڑا ہُوا تھا' اس کے پیچھے احتشام ہی تھا اور اُسی نے حسن بن صباح سے یہ حساب تیار کرایا تھا۔ احتشام کہتا تھا کہ اب ایسا موقع پیدا ہو گیا ہے کہ میں آسانی سے نظام الملک کو معزول کرا دوں گا"۔

مختصر یہ کہ لڑکی نے اپنی اصلیت اور حسن بن صباح کی نیت بے نقاب کر دی لیکن اُس نے یہ نہ بتایا کہ حسن بن صباح اور کیا کر رہا ہے اور شاہ در اور خلجان کے علاقے میں اس نے کیا ناٹک کھیلا اور آئندہ کے لئے اس کے کیا منصوبے ہیں۔

○

حسن بن صباح کو تو معلوم تھا کہ فاطمہ احتشام مدنی سے ملنے گئی ہے لیکن اُسے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی زیادہ دیر سے واپس آئے گی۔ آدھی رات ہو گئی تو اس نے اپنے ملازم کو جگا کر کہا کہ وہ احتشام مدنی کے ملازموں سے پوچھ آئے کہ وہ گھر ہے یا کہیں باہر گیا ہُوا ہے۔

ملازم گیا اور یہ خبر لایا کہ دربان احتشام کے انتظار میں جاگ رہا ہے۔ وہ ابھی نہیں آیا۔

حسن بن صباح مطمئن ہو گیا کہ احتشام واپس نہیں آیا تو فاطمہ اُس کے ساتھ ہی ہو گی۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دونوں اس وقت کوتوالی میں بند ہوں گے۔ اس روز حسن بن صباح بہت خوش تھا۔ اُس نے نظام الملک کے مقابلے میں میدان مار لیا تھا۔

فجر کی اذان کے کچھ دیر بعد حسن بن صباح کے دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ سمجھا فاطمہ آ گئی ہے لیکن ملازم نے اسے بتایا کہ کوتوالی سے دو آدمی آئے ہیں۔ حسن نے انہیں اندر بلایا اور پوچھا وہ کیوں آئے ہیں۔

"حکم ملا ہے کہ آپ گھر سے باہر نہ نکلیں" ۔۔۔ ایک آدمی نے کہا۔

"کیوں؟" ۔۔۔ حسن بن صباح نے پوچھا ۔۔۔ "یہ حکم کس نے دیا ہے؟"

"وجہ ہمیں معلوم نہیں" ۔۔۔ اُس آدمی نے کہا ۔۔۔ "ہمیں یہ حکم کوتوال نے دیا ہے"۔

"آپ یہ سمجھ لیں کہ آپ اپنے گھر میں قید ہیں" ۔۔۔ دوسرے آدمی نے کہا۔

کوتوال سلطان ملک شاہ کے گھر چلا گیا۔ سلطان فجر کی نماز کے لئے جلدی جاگا کرتا تھا۔ کوتوال نے اسے رات کی روداد سنائی۔ یہ بھی بتایا کہ اس نے احتشام مدنی سے بیان نہیں لیا اور حسن بن صباح کو اُس نے اُس کے گھر میں نظر بند کر دیا ہے۔

سلطان نے حکم دیا کہ احتشام اور لڑکی کو فوراً اُس کے سامنے لایا جائے۔ سلطان نے نظام الملک اور حسن بن صباح کو بھی بلوا لیا۔

یہ سب آ گئے تو سلطان نے لڑکی سے کہا کہ گذشتہ رات اس نے کوتوال کو جو بیان دیا ہے وہ سب کے سامنے ایک بار پھر دے۔ لڑکی نے روتے ہوئے بیان دے دیا۔

کیا یہ سچ ہے احتشام؟" ۔۔۔ سلطان نے احتشام سے پوچھا ۔۔۔ "اگر یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے تو بتاؤ سچ کیا ہے' میں اس لڑکی کو جلّاد کے حوالے کر دوں گا' اور اگر تم نے جھوٹ بولا تو....."

"نہیں سلطانِ معظم!" ۔۔۔ احتشام نے کہا ۔۔۔ "لڑکی کا بیان بالکل سچ ہے۔ میں سزا کا حقدار ہوں۔ میں نے آپ سے نمک حرامی کی ہے۔ اگر آپ مجھے معاف کر دیں گے تو بھی میں آپ کے زیرِ سایہ نہیں رہوں گا۔ میرا یہاں رہنا آپ کے سائے کی بھی توہین ہے"۔

"احتشام!" ۔۔۔ سلطان نے کہا ۔۔۔ "مجھے دکھ اس بات پر ہو رہا ہے کہ آپ جیسا دانشمند انسان ایک لڑکی کے فریب میں آ گیا"۔

"سلطانِ معظم!" ۔۔۔ احتشام مدنی نے بڑی پختہ آواز میں کہا ۔۔۔ "میں بھی اپنے آپ کو دانشمند سمجھا کرتا تھا۔ مجھے اپنی عقل و دانش پر اس لئے ناز تھا کہ میں نے آپ کو جو بھی مشورہ دیا وہ آپ نے قبول کیا اور عملاً وہ مشورہ کامیاب اور کارآمد ثابت ہُوا لیکن میں اب محسوس کرتا ہوں کہ میرا علم اور میرا تجربہ خام تھا۔ میں نے سنا تھا کہ عورت مرد کی سب سے بڑی اور بڑی ہی خطرناک کمزوری ہوتی ہے لیکن اس کا مجھے عملی تجربہ نہیں ہُوا تھا۔ نسوانی حُسن میں ایک جادو ہے لیکن میں اس جادو سے واقف نہ تھا۔ اب میرا علم اور تجربہ مکمل ہو گیا ہے۔ اس تلخ اور شرمناک تجربے سے میں نے یہ سبق

حاصل کیا ہے کہ فریب کار عورت زیادہ دلفریب ہوتی ہے اور اس کے حسن و شباب سے بچنا ممکن نہیں ہوتا۔ اگر اس قسم کی ایک لڑکی مجھ جیسے جہاندیدہ اور دانشمند آدمی کو دامِ فریب میں لے سکتی ہے تو ان جوان سال آدمیوں کا کیا حشر ہوتا ہو گا جو عورت کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عورت نے بادشاہیوں کے تختے اُلٹے ہیں۔ میں یہی سبق لے کر آپ کے دربار میں سے ہی نہیں بلکہ آپ کی سلطنت سے ہی نکل جاؤں گا۔ اگر آپ سزا دینا چاہتے ہیں تو میرا سر حاضر ہے"۔

"اس کا فیصلہ میں بعد میں کروں گا" ــــ سلطان نے کہا ــــ "آپ بیٹھیں" ــــ سلطان حسن بن صباح سے مخاطب ہُوا ــــ "کیوں حسن! تم کیا کہتے ہو۔ اگر اس لڑکی کو جھٹلا سکتے ہو تو بولو لیکن بہتر یہ ہے کہ خاموش رہو۔ جھوٹ بولو گے تو بہت بُری سزا دوں گا"۔

"یہ لڑکی میری بہن نہیں" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "میں اسے ایک یتیم اور بیوہ لڑکی سمجھ کر اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ اگر آپ کا کوئی حاکم اس لڑکی کو غلط راستے پر چلانے کی کوشش کرتا ہے تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ اس لڑکی کی حالت دیکھیں، اس کا چہرہ دیکھیں، صاف پتہ چلتا ہے کہ اس پر تشدد کیا گیا ہے اور اس پر دہشت طاری کر کے یہ بیان دینے پر مجبور کیا گیا ہے"۔

حسن بن صباح کوئی ایسا کچا آدمی نہیں تھا کہ احتشام کی طرح فوراً اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیتا۔ وہ بولتا رہتا اور سلطان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رکھتا تو سلطان پر غالب آجاتا اور سلطان اُس کے حق میں فیصلہ دے دیتا لیکن اُس کے خلاف شہادت ایسی تھی جس میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ گیا تھا۔ احتشام مدنی کا اعترافِ جرم لڑکی کے بیان کی تائید کرتا تھا۔

"خاموش!" ــــ سلطان گرج کر بولا ــــ "میں نے تمہیں پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ سچے ہو تو زبان کھولنا لیکن تم نے میرے اس حکم کی پرواہ نہ کی" ــــ سلطان نے کوتوال سے کہا ــــ "اسے اور اس لڑکی کو قید خانے میں پھینک دو۔ یہ دونوں قید خانے سے اُس وقت نکالے جائیں گے جب ہمیں یقین ہو جائے گا کہ ان کے دماغ صحیح راستے پر آگئے ہیں..... احتشام مدنی! میں تمہیں قید خانے کی ذلت سے بچا رہا ہوں۔ تم آزاد ہو لیکن میں سوچ کر کوئی فیصلہ کروں گا"۔

"سلطانِ معظم!" ــــ خواجہ حسن نظام الملک اٹھ کھڑا ہُوا اور بولا ــــ "عفو اور درگزر کا جذبہ اللہ کو عزیز ہے۔ اسلام کی یہ شان ہے کہ دشمن کو بھی بخشا جا سکتا ہے۔ انہوں نے مجھے نقصان پہنچانے کا ایک منصوبہ بنایا تھا اور مجھے اُس عزت اور اس بلند مقام سے گرانے کی کوشش کی تھی جو مجھے اللہ نے عطا کیا ہے۔ میں انہیں اللہ کے نام پر معاف کرتا ہوں"۔

"میں انہیں معاف نہیں کر سکتا" ــــ سلطان نے غصے کے عالم میں کہا۔

"سلطانِ عالی مقام!" ــــ نظام الملک نے کہا ــــ "میں نے آج پہلی بار آپ سے ایک ذاتی درخواست کی ہے اور یہ میری آخری درخواست ہو گی۔ حسن بن صباح اور میں امام موافق جیسے عالم دین کے شاگرد رہیں۔ حسن کسمپرسی کی حالت میں میرے پاس آیا اور میں نے اسے روزگار اور وقار مہیا کیا تھا۔ میں اسے گناہ سمجھتا ہوں کہ یہ گناہ گار ہی سہی لیکن میری وجہ سے اسے قید میں پھینک دیا جائے"۔

سلطان کچھ دیر نظام الملک کے منہ کو دیکھتا رہا۔ وہ شاید سوچ رہا تھا کہ کوئی انسان اتنے بلند کردار والا بھی ہو سکتا ہے۔

"میں تمہاری قدر کرتا ہوں خواجہ حسن طوسی!" ــــ سلطان نے کہا ــــ "لیکن میں انہیں یہاں دیکھ نہیں سکتا۔ میں حسن بن صباح اور اس لڑکی کو زنداں میں بند نہیں کروں گا..... حسن بن صباح اور یہ لڑکی ابھی اس شہر سے نکل جائیں" ــــ سلطان نے کوتوال سے کہا ــــ "اپنے آدمی بھیجو جو انہیں شہر سے نکال کر آئیں"۔

حسن بن صباح اور اس لڑکی کو اُسی روز شہربدر کر دیا گیا۔ نظام الملک کو روحانی اطمینان محسوس ہُوا کہ اس نے اتنے بڑے فریب کار کو معاف کر کے خداوند تعالیٰ کو راضی کر لیا ہے لیکن نظام الملک کو معلوم نہیں تھا کہ اُس نے ایک بڑے ہی زہریلے ناگ کو بخش دیا ہے اور وہ وقت بھی تیزی سے چلا آ رہا ہے جب نظام الملک ایک لشکر کے ساتھ حسن بن صباح کے لشکر کے مقابل آئے گا اور ایک ہی امام کے دو شاگرد تلواریں لہراتے ہوئے ایک دوسرے کو میدانِ جنگ میں للکاریں گے۔

تاریخوں میں اس حساب کتاب کے متعلق جو حسن بن صباح نے تیار کیا تھا، مختلف روایات ملتی ہیں۔ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ نظام الملک نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا نام تھا "دستور الوزراء" اس کتاب میں نظام الملک نے لکھا تھا کہ حسن بن صباح

نے بڑا ہی کمال کیا تھا کہ صرف چالیس دنوں میں اتنے زیادہ علاقوں کے محصولات وغیرہ
کی آمدنی اور اخراجات کا حساب تیار کر لیا تھا۔ نظام الملک نے یہ بھی لکھا ہے کہ حسن
بن صباح کے دل میں حسد اور بغض تھا اس لئے خداوند تعالیٰ نے اُسے ذلیل و خوار کیا
اگر وہ یہی کام نیک نیتی سے کرتا تو سلطان سے اسے انعام و اکرام ملتا۔

چونکہ یہ حساب کتاب ایک تاریخی واقعہ ہے اس لئے بہت سے مؤرخوں نے اسے
قلمبند کیا ہے۔ "دبستان مذاہب" میں یہ روایت ملتی ہے کہ حسن بن صباح یہ حساب
کتاب تیار کر چکا تو یہ تمام کاغذات نظام الملک نے دیکھنے کے لئے منگوائے اور ان کے
کئی ورق بے ترتیب کر دیئے۔ یہ کاغذات جب سلطان کے پاس گئے تو اُس نے حسن بن
صباح سے کچھ پوچھا تو وہ صحیح جواب نہ دے سکا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ نظام الملک نے اپنے رکابدار کو اس طرح استعمال کیا تھا
کہ رکابدار نے حسن بن صباح کے ملازم کو کچھ لالچ دے کر پھانس لیا اور اُس سے ان
کاغذات میں سے چند ایک کاغذات ضائع کروا دیئے تھے لیکن یہ روایات صحیح معلوم نہیں
ہوتیں کیونکہ نظام الملک بڑا ہی ایماندار تھا۔ اُسے یہ کاغذات دکھائے ہی نہیں گئے تھے۔

حسن بن صباح اس لڑکی کے ساتھ رے پہنچا جہاں کا وہ رہنے والا تھا۔ اُس نے اپنے
باپ کو سنایا کہ سلطان کے ہاں کیا واقعہ ہو گیا ہے۔

"تمہاری عقل ابھی خام ہے"۔۔۔ باپ نے حسن بن صباح سے کہا۔۔۔ "تم تمام
کام بیک وقت اور بہت جلدی ختم کرنا چاہتے ہو۔ جلد بازی سے بچو۔ تم نے اپنی
ملازمت ہی نہیں کھو دی بلکہ سلجوقی سلطنت کھو دی ہے۔ اب میں تمہیں مصر بھیجوں
گا۔ وہاں کے کچھ لوگ یہاں آرہے ہیں"۔

رے کا امیر ابو مسلم رازی تھا جو کٹر اہلِ سنت والجماعت تھا۔ اُسے خفیہ رپورٹیں
مل رہی تھیں کہ حسن بن صباح کے باپ کے ہاں مصر کے عبیدی آتے رہتے ہیں۔
سلجوقی عبیدیوں کو اپنا اور اسلام کا بہت بڑا دشمن سمجھتے تھے کیونکہ عبیدیوں کا اپنا ہی ایک
فرقہ تھا جو ایک جنگی طاقت بنتا جارہا تھا۔ اُن دنوں مصر پر عبیدیوں کی حکومت تھی۔

سلطان ملک شاہ کی طرف سے ابو مسلم رازی کو ایک تحریری حکم نامہ ملا کہ اس کے
شہر رے کے باشندے حسن بن صباح کو سرکاری عہدے سے سبکدوش کر کے نکال دیا گیا
ہے۔ اس شخص پر نظر رکھی جائے کیونکہ یہ شخص بڑا ہی فریب کار ہے اور اپنے سابقہ

عہدے کو فریب کاری میں استعمال کر سکتا ہے۔

ابو مسلم رازی کو مخبروں سے کچھ ایسی رپورٹیں بھی ملی تھیں کہ حسن بن صباح
رے سے دور دراز علاقوں میں اپنا ہی ایک فرقہ تیار کر رہا ہے اور اس فرقے کے عزائم
خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔ ابو مسلم رازی نے حکم دے دیا کہ حسن بن صباح کو گرفتار کر
لیا جائے۔

حسن بن صباح اور اس کے باپ نے مخبری اور جاسوسی کا اپنا ایک نظام قائم کر رکھا
تھا۔ ان کا کوئی آدمی ابو مسلم رازی کے عملے میں ملازم تھا۔ اس آدمی نے فوراً حسن بن
صباح کو اطلاع دے دی کہ اس کی گرفتاری کا حکم جاری ہو گیا ہے۔ حسن بن صباح نے
اُسی وقت شتربانوں کا لباس پہنا اور ایک اونٹ کی مہار پکڑ کر شہر سے نکل گیا۔ اُس کی
گرفتاری کے لئے کوتوال کے آدمی اس کے گھر گئے تو اُس کے باپ نے کہا کہ وہ کچھ
بتائے بغیر کہیں چلا گیا ہے۔

اُس وقت حسن بن صباح اونٹ پر سوار، شہر سے بہت دور چلا گیا تھا۔ اس کے قریب
سے گزرنے والے اسے غریب سا شتربان سمجھتے تھے۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا
کہ شتربان کے لباس میں چھپا ہوا یہ شخص ایسے کارنامے کر دکھائے گا جو الف لیلیٰ کی
داستانوں سے زیادہ سنسنی خیز، ناقابلِ یقین ہوں گے اور یہ شخص انسانیت اور تاریخ کے
رونگٹے کھڑے کر دے گا

حسن بن صباح تو بھیس بدل کر نکل گیا لیکن وہ لڑکی جسے وہ اپنے ساتھ مرو سے لایا اور سب کو بتایا کہ یہ اُس کی بہن ہے اور اس کا نام فاطمہ رکھا تھا' وہ ایک بڑے ہی بے رحم شکنجے میں آگئی تھی۔ سلطان ملک شاہ نے اسے بھی حسن بن صباح کے ساتھ اپنے دارالسلطنت سے نکال دیا تھا۔ حسن بن صباح تو وہاں وزیرِاعظم بنے گیا تھا اور اس لڑکی کو اس نے اس مقصد کے لئے استعمال کیا تھا لیکن اسی لڑکی کی زبان نے اُس کا وزیرِاعظم بنے کا خواب چکنا چُور کر دیا۔

اس لڑکی کا اصل نام شمونہ تھا — احمد بن عطاش کے آدمیوں نے ایک قافلہ لوٹا تھا اور دیگر مال و دولت کے ساتھ چند ایک لڑکیوں کو بھی پکڑ لائے تھے جن کی عمر چار گیارہ سے چودہ سال عمر تک کی تھیں۔ انہیں شاہ در لے آئے تھے جہاں انکو شہزادیوں کی طرح رکھا گیا اور انہیں اپنے مذموم مقاصد کے مطابق تربیت دی گئی تھی۔ انہیں بڑی محنت سے یہ تربیت دی گئی تھی کہ جس آدمی سے کام نکلوانا ہو اُس کے لئے کس طرح ایک بڑا ہی حسین سراب بنا جاتا ہے۔ انہیں ذہن نشین کرایا گیا تھا کہ اپنے جسموں کو کس طرح بچا کر رکھنا اور اپنے جال میں پھانسے ہوئے آدمی پر نشہ بن کر طاری ہو جانا ہے۔

شمونہ انہی لڑکیوں میں سے تھی۔ وہ بارہ تیرہ سال کی عمر میں قافلے سے اغوا ہوئی تھی۔ اب اُس کی عمر بیس سال سے تجاوز کر گئی تھی۔ اُس نے کامیابی سے سلطان ملک شاہ کے مشیرِ خاص احتشام مدنی کو مسحور کر لیا تھا۔ یہ اُس کا پہلا شکار تھا۔ وہ اس معزز اور باوقار شخصیت پر طلسم ہو شربا بن کر طاری ہو گئی اور اپنا دامن بھی بچا کے رکھا تھا لیکن حسن بن صباح نے یہ نہیں سوچا تھا کہ یہ نازک اندام لڑکی ہے' ایک جابر سلطان کو انگلیوں پر نچا سکتی ہے مگر یہی انگلیاں جابر سلطان کے شکنجے میں آگئیں تو یہ ایک لمحے کے لئے بھی برداشت نہیں کرے گی اور تمام راز اُگل دے گی۔

حسن بن صباح اتنا کچا آدمی نہیں تھا کہ اُسے یہ احساس بھی نہ ہوتا کہ کمزور دل لڑکی ایذا رسانی برداشت نہیں کر سکے گی۔ وہ بے رحم انسان تھا۔ اُس کے جذبات اتنے نازک اور رومانی نہیں تھے کہ کسی کو اذیت میں دیکھ کر اُس کے دل میں ہمدردی پیدا ہوتی۔ اُس نے شمونہ جیسی ہر لڑکی کو اور اپنے گروہ کے تمام آدمیوں کو بتا رکھا تھا کہ اپنی جان دے دینا' راز نہ دینا۔ اگر راز دے کر آؤ گے تو اس کے عوض تمہاری جان لے لی جائے گی'۔

حسن بن صباح نے شمونہ کی جان اپنے ہاتھوں لینی تھی لیکن اُسے مہلت نہ ملی۔ امیرِ شہر ابو مسلم رازی کے حکم سے کوتوالی کے آدمیوں نے چھاپہ مارا۔ اگر اُسے پہلے اطلاع نہ مل چکی ہوتی تو وہ گرفتار ہو جاتا۔ وہ بروقت فرار ہو گیا تھا لیکن شمونہ کی قسمت کا فیصلہ سنا گیا تھا۔

"اس بدبخت لڑکی نے تھوڑا سا نقصان نہیں پہنچایا" — اُس نے فرار سے کچھ دیر پہلے اپنے دو خاص مصاحبوں سے کہا تھا — "اسے قلعان پہنچاؤ۔ میں وہاں پہنچ چکا ہوں گا۔ لے میں تمام لڑکیوں کے سامنے ایسی سزائے موت دوں گا جو ان لڑکیوں کے لئے باعثِ عبرت ہو گی۔ لڑکیوں کو بتاؤں گا کہ اس کا جرم کیا ہے۔ اسے ابھی کسی گھر میں قید میں رکھو۔ پانچ چھ دنوں بعد اسے یہاں سے نکالنا۔ ابھی کوتوالی کے جاسوس میرے گھر کے اردگرد گھوم پھر رہے ہوں گے..... اگر یہ لڑکی اپنا حوصلہ ذرا مضبوط رکھتی تو میں وزیرِاعظم بن جاتا"۔

شمونہ کو انہی آدمیوں میں ایک کے گھر رکھا گیا اور اسے کہا گیا کہ وہ باہر نہ نکلے اور چھت پر بھی نہ جائے۔ اُسے وجہ یہ بتائی گئی کہ امیرِ شہر نے اُس کی اور حسن بن صباح کی گرفتاری کا حکم دے رکھا ہے۔

○

شمونہ کو ذرا سا بھی شبہ نہ ہوا کہ اُس کی زندگی کے دن گنے جا چکے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اس گھر میں مہمان سمجھنے لگی۔ اُس کے ساتھ بڑے ہی معزز مہمانوں جیسا سلوک روا رکھا گیا اور اُسے الگ کمرہ دیا گیا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ وہ اس کمرے کی قیدی اور دو دنوں کی مہمان ہے۔

اس گھر میں ایک آدمی اور اُس کی دو بیویاں تھیں اور ایک ادھیڑ عمر نوکرانی تھی۔ شام کے کھانے کے بعد شمونہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ گھر کا آدمی ایک بیوی کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ دیر بعد دوسری بیوی شمونہ کے کمرے میں چلی گئی۔ اُس نے پوچھا کہ مرو میں کیا ہوا تھا..... شمونہ نے اسے سارا واقعہ سنا دیا۔

"کیا تمہارے آقا نے تمہیں معاف کر دیا ہے؟" — عورت نے پوچھا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی" — شمونہ نے کہا — "یہ بتا سکتی ہوں کہ اُس نے مرو سے یہاں تک میرے ساتھ کوئی بات نہیں کی۔ صرف ایک بار اُس نے کہا تھا کہ تم نے

میرا ہی نہیں اپنی جماعت کا مستقبل تباہ کر دیا ہے...... میں نے اُسے پہلے بھی کہا تھا، ایک بار پھر کہا کہ میں مجبور ہو گئی تھی" — اُس نے اپنے ایک ہاتھ کی انگلیاں دکھا کر کہا — "یہ نشان دیکھو۔ یہ انگلیاں لوہے کے شکنجے میں جکڑ دی گئی تھیں اور شکنجہ آہستہ آہستہ بند کیا جا رہا تھا۔ میری انگلیوں کی ہڈیاں چٹخنے اور پھر ٹوٹنے لگی تھیں۔ شکنجے کو اور زیادہ کسا جا رہا تھا اور مجھ پر غشی طاری ہو رہی تھی....."

"اب میری سُن لڑکی!" — عورت نے کہا — "آگے مت سنا۔ میں تیرے درد کو اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں..... تُو اپنے ماں باپ کے پاس کیوں نہیں جاتی؟"

"کہاں ہیں وہ؟" — شمونہ نے کہا — "کون ہیں وہ؟..... مجھے یاد نہیں۔ خواب کی طرح یاد ہے کہ ایک قافلہ جا رہا تھا۔ اسے ڈاکوؤں نے روک کر لُوٹ لیا تھا۔ میرے ماں باپ شاید مارے گئے تھے۔ وہ مجھے یاد نہیں آتے۔ یاد آئیں بھی تو مجھے ان کی جدائی کا ذرا سا بھی افسوس نہیں ہوتا۔ ان سے جدا ہوئے صدیاں تو نہیں گزریں، چھ سات سال ہی گزرے ہیں۔ مجھے ڈاکو اپنے ساتھ لے آئے تھے"۔

"تجھے معلوم نہیں" — عورت نے کہا — "تجھے ایسی چیزیں پلائی اور کھلائی جاتی رہی ہیں کہ تیرے دماغ سے خون کے رشتے دُھل گئے ہیں، اور میں جانتی ہوں تیری تربیت کس پیار سے ان لوگوں نے کی ہے۔ تو نہیں جانتی"۔

یہ حسن بن صباح اور احمد بن عطاش کا وہ طریقۂ کار تھا جسے آج کی صدی میں برین واشنگ کا نام دیا گیا ہے۔

"تم اتنی دلچسپی سے یہ باتیں کیوں پوچھ رہی ہو؟" — شمونہ نے پوچھا — "کیا تمہیں مجھ سے ہمدردی ہے؟"

"ہاں لڑکی!" — عورت نے کہا — "مجھے تجھ سے ہمدردی ہے۔ میرا خاوند انہی لوگوں میں سے ہے۔ یہ لوگ میری چھوٹی بہن کو ورغلا کر لے گئے ہیں۔ بہت حسین لڑکی ہے۔ میں اُسے اس جال سے نہیں نکال سکی، تجھے نکال سکتی ہوں لیکن تُو اب ان لوگوں کے نہیں بلکہ موت کے جال میں آ گئی ہے"۔

"موت کے جال میں؟"

"ہاں لڑکی!" — عورت نے کہا — "تیری زندگی چار نہیں تو پانچ دن رہ گئی ہے"۔

"یہ کیسے؟"

"حسن بن صباح کسی کو معاف نہیں کیا کرتا" — عورت نے کہا — "میں جانتی ہوں تُو نے کس مجبوری کے تحت راز مَرو کے کوتوال کو دے دیا تھا لیکن یہ لوگ کہتے ہیں کہ تجھے اپنی جان دے دینی چاہیے تھی، راز نہ دیتی۔ حسن بن صباح کہہ گیا ہے کہ تجھے قلعہ پہنچا دیا جائے۔ حسن بن صباح وہاں پہنچ جائے گا پھر تمہیں تم جیسی لڑکیوں کے سامنے بڑے ہی اذیت ناک طریقے سے قتل کیا جائے گا تاکہ لڑکیوں کو عبرت حاصل ہو"۔

شمونہ کو غشی آنے لگی۔

"میں ابھی مرنا نہیں چاہتی" — شمونہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"اور چاہتی میں بھی یہی ہوں کہ تُو زندہ رہے" — عورت نے کہا — "اگر میری یہ خواہش نہ ہوتی تو میں تمہارے پاس آتی ہی نہ"۔

"لیکن میں کروں کیا؟" — شمونہ نے پوچھا — "کہاں جا پناہ لوں"۔

"میں تمہیں یہاں سے نکال سکتی ہوں"۔

"کیا تم اس کی کچھ اُجرت لو گی؟"

"نہیں!" — عورت نے جواب دیا — "میرے لئے یہی اُجرت بڑی کافی ہو گی کہ تُو یہاں سے نکل جائے اور زندہ رہے۔ مجھ سے کچھ اور نہ پوچھنا، نہ کسی کو یہ بتانا کہ میں نے تمہیں یہاں سے نکالا ہے۔ صرف اتنا بتا دیتی ہوں کہ تجھے دیکھ کر مجھے اپنی بہن یاد آئی ہے۔ تُو معصوم لڑکی ہے۔ خدا کرے تُو کسی گھر میں آباد ہو جائے"۔

"مجھے نکال تو دو گی" — شمونہ نے پوچھا — "میں جاؤں گی کہاں؟"

"رات ابھی زیادہ نہیں گزری" — عورت نے کہا — "میں تجھے راستہ بتا دوں گی۔ یہ راستہ تجھے امیرِ شہر ابو مسلم رازی کے گھر پہنچا دے گا۔ دروازے پر دستک دینا۔ دربان روکے تو کہنا کہ میں مظلوم لڑکی ہوں اور امیرِ شہر کے آگے فریاد کرنے آئی ہوں... تجھے کوئی نہیں روکے گا۔ امیر شہر خدا کا نیک بندہ ہے۔ وہ تجھے فوراً اندر بلا لے گا۔ اُسے ہر بات صحیح صحیح بتا دینا اور یہ مت کہنا کہ میں نے تجھے یہاں سے نکالا ہے، یہ کہنا کہ تو خود یہاں سے بھاگی ہے"۔

"پھر وہ کیا کرے گا؟"

تو جو کچھ بھی کرے گا تیرے لئے اچھا ہی کرے گا" — عورت نے کہا۔ "ہو سکتا ہے وہ تجھے کسی نیک آدمی کے سپرد کر دے ..... میں تجھے میلی سی ایک چادر دیتی ہوں۔ اس میں اپنے آپ کو ڈھانپ لینا۔ کوئی آدمی آگے آجائے تو ڈر نہ جانا۔ بڑی دلیری سے چلتی جانا۔ تو ہوشیار لڑکی ہے۔ تجھے تربیت بھی ایسی ہی دی گئی ہے۔ اس کے مطابق اپنی عقل استعمال کرنا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا..... اٹھو"۔

○

اس عورت کا خاوند دوسرے کمرے میں گہری نیند سو گیا تھا۔ یہ لوگ شراب اور حشیش کے عادی تھے۔ ان میں نشے کی علت حسن بن صباح نے پیدا کی تھی۔ اس اتنی بڑی حویلی کا مالک اپنی ایک جواں سال بیوی کو ساتھ لئے' نشے میں بدمست حقیقی دنیا سے بے خبر سو گیا تھا۔

اس حویلی کے ایک کمرے میں اس کی پرانی بیوی شمونہ کو چادر میں لپیٹ کر حویلی کی ڈیوڑھی میں لے گئی تھی۔ شمونہ کو اس نے امیر شہر کے گھر کا راستہ سمجھا دیا تھا۔ اس نے شمونہ سے یہ بھی کہا تھا کہ وہ راستے سے بھٹک جائے تو کسی سے پوچھ لے۔ اس نے شمونہ کو یقین دلایا تھا کہ ابو مسلم رازی سے لوگ اتنے ڈرتے ہیں کہ اکیلی دکیلی عورت پر کوئی ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔

اس نے شمونہ کو حویلی سے نکال دیا۔ شمونہ گلی کا موڑ مڑ گئی تو اس عورت نے حویلی کا دروازہ بند کیا اور اپنے کمرے میں جا کر سو گئی۔ وہ مسرور اور مطمئن تھی کہ اس نے ایک نوخیز لڑکی کو گناہوں کی بڑی ہی خطرناک دنیا سے نکال دیا تھا۔

شمونہ امیر شہر ابو مسلم رازی کے گھر تک پہنچ گئی۔ باہر دو دربان کھڑے تھے۔ انہوں نے اسے روکا اور پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیوں آئی ہے۔

"مجھے فوراً امیر شہر تک پہنچا دو" — شمونہ نے بڑی پختہ آواز میں کہا۔ "دیر نہ لگانا ورنہ پچھتاؤ گے"۔

"آخر بات کیا ہے؟" — ایک دربان نے پوچھا۔

"انہیں اتنا ہی کہہ دو کہ ایک مظلوم لڑکی کہیں سے بھاگ کر آئی ہے" — شمونہ نے کہا — "اور یہ بھی کہنا کہ وہ رازی کی ایک بات بتائے گی"۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ابو مسلم رازی پکا مرد مومن تھا۔ اسلام کے وہی نظریات اور

عقیدے جو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کو دے گئے تھے' ان کی پاسبانی ابو مسلم رازی کی زندگی کا بہت بڑا نصب العین تھا۔ جس وقت شہر نیند کی آغوش میں مدہوش ہو گیا تھا' اس وقت رازی دین کی ایک کتاب کھولے ہوئے مطالعہ میں مصروف تھا۔

دربان نے اس کے کمرے کے دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔ دربان کو ایسا ڈر نہیں تھا کہ امیر شہر خفا ہو گا اور اسے ڈانٹے گا کہ رات کے اس وقت اسے نہیں آنا چاہئے تھا۔ اس نے حکمنامہ جاری کر رکھا تھا کہ کوئی مظلوم شخص رات کے کسی بھی وقت اس سے ملنے آئے تو اسے جگا لیا جائے۔ اس رات دربان کی دستک پر اس نے دربان کو اندر بلا لیا۔ دربان سے اس نے صرف یہ الفاظ سنے کہ ایک لڑکی آئی ہے تو اس نے کہا کہ اسے فوراً اندر بھیج دو۔

چند لمحوں بعد ایک بڑی ہی حسین اور پرکشش جسم والی نوخیز لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ ابو مسلم رازی نے اسے بٹھایا۔

"کیا ظلم ہوا ہے تجھ پر جو تو اس وقت میرے پاس آئی ہے؟" — ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"بات ذرا لمبی ہے" — شمونہ نے کہا — "کیا امیر شہر کے دل میں اتنا درد ہے کہ اتنی لمبی بات سنے گا؟"

"ہاں لڑکی!" — ابو مسلم رازی نے کہا — "ہم دونوں کے درمیان اللہ کی ذات موجود ہے۔ میں اللہ کے ہاتھ میں پابند اور مجبور ہوں کہ ہر اس بندے کی پوری بات سنوں جس پر ظلم کیا گیا ہے۔ تم بولو' میں سنوں گا..... امیر شہر نہیں سنے گا تو وہ اللہ کو کیا جواب دے گا"۔

"مجھے ڈاکوؤں نے تین چار سال پہلے ایک قافلے کو لوٹتے ہوئے میرے ماں باپ سے چھینا اور مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے" — شمونہ نے کہا — "مجھ پر کوئی ظلم نہیں ہوا' تشدد نہیں ہوا' زیادتی نہیں ہوئی۔ ظلم یہ ہوا ہے کہ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میرے ماں باپ کون تھے۔ میں اغوا کے وقت دودھ پیتی بچی تو نہ تھی۔ مجھے اغوا کرنے والوں نے ایسی خوبصورت فضا دی اور ایسے شاہانہ ماحول میں میری تربیت کی کہ میں شہزادی بن گئی لیکن یہ تربیت ویسی نہیں تھی جیسی بچوں کو دی جاتی ہے۔ میری ذہنیت میں ابلیسی

اوصاف پیدا کئے گئے۔ ایسا نہیں ہُوا کہ میرے آقا میرے جسم کے ساتھ کھیلتے رہتے اور مجھے ہوس کاری کے لئے استعمال کرتے بلکہ انہوں نے تربیت یہ دی کہ اپنے جسم کو مردوں سے کس طرح بچا کر رکھنا ہے"۔

"کون ہے وہ؟" — ابو مسلم رازی نے پوچھا — "کہاں ہے وہ؟"

"کیا آپ نے حسن بن صباح کا نام نہیں سنا؟" — شمونہ نے کہا — "میں اُس کے ساتھ سلطان ملک شاہ کے زیرِ سایہ رہ چکی ہوں"۔

"وہ گیا کہاں؟" — ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"یہ میں نہیں بتا سکتی" — شمونہ نے جواب دیا — "میں اپنے متعلق سب کچھ بتا سکتی ہوں"۔

شمونہ نے ابو مسلم رازی کو تفصیل سے بتایا کہ وہ کس طرح اغوا ہوئی تھی اور پھر اُسے پہلے شاہ در پھر خلجان لے جا کر کس طرح کی تربیت دی گئی تھی۔ یہ بھی بتایا کہ اُس جیسی اور لڑکیوں کو بھی اسی قسم کی تربیت دی جاتی ہے۔ پھر اُس نے بتایا کہ وہ حسن بن صباح کے ساتھ مَرو گئی تو وہاں اُسے حسن نے کس طرح استعمال کیا تھا۔

ابو مسلم رازی گہری سوچ میں کھو گیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے سوچ سے بیدار ہو کر شمونہ سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتی ہے۔

"سب سے پہلے تو میں پناہ چاہتی ہوں" — شمونہ نے کہا — "اگر آپ نے مجھے پناہ نہ دی تو یہ لوگ مجھے قتل کر دیں گے"۔

"تم میری پناہ میں ہو لڑکی!" — ابو مسلم رازی نے کہا۔

"میں اپنی ذات میں بہت بڑا خطرہ محسوس کر رہی ہوں" — شمونہ نے کہا — "میرے اندر، میرے دل اور میرے دماغ میں ابلیسیت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ میں آپ کو صاف الفاظ میں بتا رہی ہوں کہ میں ایک ناگن ہوں اور ڈسنا میری سرشت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں آپ کو ہی ڈس لوں۔ میں انسان کے روپ میں آنا چاہتی ہوں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میری ذات میں کوئی انسانی جذبات ہیں ہی نہیں..... کیا آپ ایسا بندوبست کر سکتے ہیں کہ میری ایسی تربیت ہو جائے جس سے میں انسانوں کے روپ میں آ جاؤں؟"

"کیوں نہیں ہو سکتا" — ابو مسلم رازی نے کہا — "میں فوری طور پر کسی بھلے

آدمی کے ساتھ تمہاری شادی کروا دوں گا"۔

"نہیں!" — شمونہ نے تڑپ کر کہا — "کسی بھلے آدمی پر یہ ظلم نہ کرنا۔ میں ابھی کسی کی بیوی بننے کے قابل نہیں۔ بیوی وفادار ہوتی ہے لیکن میں فریب کاری کے سوا کچھ بھی نہیں جانتی۔ مجھے پہلے انسان بنائیں"۔

"تم آج رات آرام کرو" — ابو مسلم رازی نے کہا — "میں کل تمہارا کچھ بندوبست کر دوں گا"۔

ابو مسلم رازی نے شمونہ کو زنان خانے میں بھجوا دیا۔

○

اس شہر کے مضافات میں ایک آدمی رہتا تھا جو مذہب میں ڈوبا ہُوا تھا اور تقریباً تارک الدنیا تھا۔ اُس کی عمر تقریباً چالیس برس ہو گئی تھی۔ اُس کے متعلق مشہور تھا کہ اُس نے شادی نہیں کی تھی، اور یہ بھی مشہور تھا کہ وہ عورت کے وجود کو پسند ہی نہیں کرتا تھا۔ معلوم نہیں کس عمر میں اُس کے دل میں مذہب سے لگاؤ پیدا ہُوا تھا۔ وہ زیادہ تر عبادت اور کتابوں میں گُم رہتا تھا۔

اُس کے متعلق یہ بھی مشہور تھا کہ وہ کئی فرقے بدل چکا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ صحیح عقیدے کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ اُس وقت تک مسلمان 72 فرقوں میں بٹ چکے تھے اور یہ شخص ان 72 فرقوں میں بھٹک رہا تھا۔ اب لوگ کہتے تھے کہ وہ سنی عقیدے کو قبول کر چکا ہے لیکن یقین کے ساتھ کہنا مشکل تھا کہ وہ کس عقیدے کو قبول کئے ہوئے ہے۔

وہ علمِ روحانیت میں بھی سر کھپاتا رہتا تھا۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ وہ راتوں کو جاگتا ہے اور جنات کو حاضر کر لیتا ہے۔ بہرحال لوگوں کے لئے وہ پُراسرار سی شخصیت بنا ہُوا تھا۔ اُس کے معتقد اُس کے پاس جاتے رہتے اور وہ انہیں درس دیا کرتا تھا۔ وہ زیادہ تر زور اس پر دیتا تھا کہ عورت ایک حسین فریب ہے اور عورت گناہوں کی علامت ہے۔

ابو مسلم رازی اس بزرگ سے بہت متاثر تھا۔ اس کا نام نور اللہ تھا۔ ابو مسلم رازی اکثر اُس کے ہاں جاتا تھا۔ شمونہ نے جب ابو مسلم رازی سے یہ کہا کہ وہ بھٹکی ہوئی ایک لڑکی ہے اور جب تک دینی تربیت کے ذریعے اس کی ذات سے ابلیسیت نہیں نکالی جائے گی اُس وقت تک وہ کسی کی بیوی نہیں بنے گی، رازی کو نور اللہ یاد آیا تھا۔

اگلے روز کا سورج ابھی طلوع ہوا ہی تھا کہ ابو مسلم رازی نے شمونہ کو بلوایا۔ شمونہ آئی تو وہاں ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا تھا۔ اُس کی داڑھی ابھی بالکل سیاہ تھی۔ چہرہ پر نور، سر پر سبز دستار اور اُس نے سبز رنگ کا چغہ زیب تن کر رکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک تھی۔ اُس کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔

امیرِ شہر ابو مسلم رازی نے اسے فجر کی نماز کے کچھ دیر بعد بلوا لیا تھا اور اسے بتایا تھا کہ باطنیہ فرقے کی ایک لڑکی اس کے پاس آئی ہے جو خود محسوس کرتی ہے کہ اُس کے وجود میں ابلیس حلول کر آیا ہے۔ ابو مسلم رازی نے نور اللہ کو شمونہ کے متعلق تمام تر باتیں بتائی تھیں جو نور اللہ انہماک سے سنتا رہا تھا لیکن ابو مسلم نے جب یہ کہا کہ اس لڑکی کی تربیت کرنا ہے تو نور اللہ پریشان اور بے چین ہو گیا۔

"کیا میں کچھ دیر کے لئے اس کے پاس آیا کروں گا؟" —— نور اللہ نے پوچھا۔

"نہیں!" —— ابو مسلم رازی نے کہا —— "میں یہ لڑکی ایک امانت کے طور پر آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ یہ ہر وقت آپ کے زیرِ سایہ اور زیرِ تربیت رہے گی"۔

"میرے متعلق شاید آپ ایک بات نہیں جانتے!" —— نور اللہ نے کہا —— "میں آج تک عورت کے سائے سے بھی دور رہا ہوں اور میں نے شادی بھی نہیں کی۔ آپ اس لڑکی کو میرے حوالے کرنے کی بجائے اپنے پاس رکھیں' میں ہر روز یہاں آ جایا کروں گا"۔

"میں آپ کا احترام کرتا ہوں" —— ابو مسلم رازی نے کہا —— "اس احترام کی وجہ یہ ہے کہ آپ مذہب کے رنگ میں رنگے ہوئے انسان ہیں اور آپ کو اپنے نفس پر پورا پورا قابو حاصل ہو گا۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آپ کس بنا پر عورت کے وجود سے گھبراتے ہیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ ایک اور باطنی فرقہ بن چکا ہے جو لڑکیوں کو اپنی تبلیغ اور تشہیر کے لئے استعمال کر رہا ہے۔ میں حکومت کی سطح پر اس کے انسداد کا کچھ بندوبست تو ضرور کروں گا لیکن میں نے اس کے ساتھ ہی یہ بھی سوچا ہے کہ اس لڑکی جیسی گمراہ کی ہوئی لڑکیوں کو آپ جیسے عالموں کے حوالے کر کے ان کی صحیح تربیت کی جائے۔ آپ اس لڑکی سے بسم اللہ کریں اور اسے اپنے ساتھ لے جائیں"۔

یہ حکمِ حاکم تھا جس کے آگے نور اللہ بول نہ سکا۔ ابو مسلم رازی نے شمونہ کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ کچھ دن نور اللہ کے ساتھ رہے گی۔

"تم نے وہاں مہمان بن کے نہیں رہنا" —— ابو مسلم رازی نے شمونہ سے کہا —— "تمہارا کام گھر میں جھاڑو دینا' اپنے اور ان کے کپڑے دھونا اور گھر کے دیگر کام تم نے کرنے ہیں۔ تم ان کی بیوی نہیں ہو گی بلکہ نوکرانی ہو گی اور تم ان کی خدمت کرو گی۔ جب تم خود کہو گی کہ تمہاری ذات سے ابلیسی اثرات دھل گئے ہیں تو کسی کے ساتھ تمہاری شادی کروی جائے گی"۔

ابو مسلم رازی نے نور اللہ سے کہا کہ وہ لڑکی کو ساتھ لے جائے۔ نور اللہ اُسے ساتھ لے گیا۔

○

اپنے ہاں لے جا کر نور اللہ نے شمونہ سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے کہ وہ سمجھتی ہے کہ اُس کی ذات میں شیطان حلول کر آیا ہے یا یہ کہ اُس پر شیطان غالب ہے۔ شمونہ نے اُسے اپنی زندگی کی اُس وقت تک کی رُوداد سنا ڈالی۔

"اپنا من مار ڈالو" —— نور اللہ نے کہا۔

"یہ کیسے ہو گا؟"

"اپنے آپ کو مٹی میں ملا دو" —— نور اللہ نے کہا —— "یہ بھول جاؤ کہ تمہارا رہن سہن شہزادیوں جیسا رہا تھا۔ اس گھر میں جھاڑو دو۔ میں نے یہیں چھوٹی سی مسجد بنا رکھی ہے۔ اسے صاف ستھرا رکھو۔ دھیان ہر وقت اللہ کی ذات پر رکھو اور اپنے دماغ میں اس حقیقت کو بٹھا لو کہ تم نے ایک نہ ایک دن اس مٹی میں مل کر مٹی ہو جانا ہے۔ اپنی نفسانی خواہشات کو اور جنسی جذبات کو قتل کر ڈالو"۔

اس طرح نور اللہ نے اس کی تعلیم و تربیت شروع کر دی۔ نور اللہ کے ہاں جب اس کے معتقد اور مرید آتے تھے' اُس وقت شمونہ کمرے میں چلی جاتی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے نور اللہ شمونہ کو اپنے سامنے بٹھاتا اور اسے مذہب کے سبق دیتا تھا۔ اس کے بعد وہ شمونہ کو الگ کمرے میں بھیج کر اسے کہتا کہ اندر سے دروازہ بند کر لے۔ صبح فجر کے وقت وہ شمونہ کے دروازے پر دستک دیتا اور اسے جگا کر نماز پڑھاتا تھا۔

دن گزرتے چلے گئے۔ نور اللہ نے محسوس کیا کہ اُس کے دل میں عورت کی جو بیزاری یا نفرت تھی وہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ شمونہ نے محسوس کیا کہ اُس کے استاد کا رویہ تبدیل ہوتا جا رہا ہے۔ اس رویئے میں کچھ ایسا تاثر تھا جسے نور اللہ نے اُسے قبول کر

لیا ہو۔

ایک روز شمونہ گھر کے سارے کاموں سے فارغ ہو کر ایسی تھکن سی محسوس کرنے لگی جیسے اُسے نیند آ رہی ہو۔ وہ لیٹ گئی۔ نور اللہ کہیں باہر چلا گیا تھا۔ وہ آیا شمونہ کو نہ دیکھ کر اُس کے کمرے کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ شمونہ بڑی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ وہ پیٹھ کے بل پڑی تھی۔ اُس کے سر سے اوڑھنی سرک گئی تھی۔ اُس کے چند ایک بال اُس کے گورے چٹے گالوں پر آ گئے تھے۔ اُس کا شباب بے نقاب تھا۔

نور اللہ کا ایک قدم دہلیز کے اندر چلا گیا تھا۔ اُس نے وہ قدم پیچھے کو اٹھایا لیکن اُس کی ذات سے ہی ایک قوت بیدار ہوئی جس نے اُسے پیچھے ہٹنے سے روک دیا اور اُس کا دوسرا پاؤں اٹھا کر دہلیز کے اندر کر دیا۔ نور اللہ کمرے میں داخل ہو گیا لیکن ایک ہی قدم آگے بڑھا کر رک گیا۔

شمونہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیسا خواب تھا کہ اُس کے ہونٹوں پر تبسم آ گیا۔ نور اللہ کچھ دیر شمونہ کے تبسم کو دیکھتا رہا۔ اُس نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ شمونہ کا تبسم ایسی مسکراہٹ کی صورت اختیار کر گیا جس سے اُس کے دانت ذرا ذرا سے نظر آنے لگے۔ اس مسکراہٹ نے شمونہ کے حسن میں طلسماتی سا تاثر پیدا کر دیا۔

نور اللہ ایک دو قدم اور آگے چلا گیا اور پھر رک گیا۔ اُس کے آگے بڑھنے اور رُکنے میں اُس کے اپنے ارادے اور اختیار کا کوئی دخل نہیں تھا۔ اُس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ ایک ایسی حرکت تھی جو اُس نے اپنے ارادے سے کی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس لڑکی کو نہیں دیکھنا چاہتا تھا لیکن وہ پیچھے نہ ہٹا۔ اُس کی ذات میں ایک کشمکش سی شروع ہو گئی تھی جسے وہ سمجھ نہ پایا۔

"آپ وہاں کیوں کھڑے ہیں!" — نور اللہ کے کانوں سے شمونہ کی مخمور سی آواز ٹکرائی۔

وہ چونک کر اس کیفیت سے بیدار ہو گیا جو اُس پر طاری ہو چکی تھی۔ وہ بوکھلایا اور فوری طور پر یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ آگے بڑھے، شمونہ کو کوئی جواب دے یا باہر چلا جائے۔

شمونہ بڑی تیزی سے اٹھی۔ اُس کے دل میں نور اللہ کا احترام اور تقدس اتنا زیادہ تھا

کہ اُس پر مرعوبیت طاری رہتی تھی۔

"آپ کس وقت آئے؟" — شمونہ نے لونڈیوں اور غلاموں جیسے لہجے میں پوچھا اور کہنے لگی — "میں ذرا سو گئی تھی..... آپ چپ کیوں ہیں؟..... کیا آپ مجھ سے خفا ہو گئے ہیں؟"

"نہیں، نہیں!" — نور اللہ نے بوکھلائی ہوئی سی آواز میں کہا — "میں تمہیں دیکھنے اِدھر آ گیا تھا..... نہیں، نہیں میں خفا نہیں ہوں" — وہ پیچھے مُڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے سے نکل گیا۔

دو تین دنوں بعد نور اللہ شمونہ کو سامنے بٹھائے کچھ پڑھا رہا تھا۔ شمونہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ اُس کی اوڑھنی سر سے ذرا سرک گئی۔ اُس کے ریشم جیسے ملائم بال بے نقاب ہو گئے۔ شمونہ نے محسوس کیا کہ اُس کا قابلِ احترام استاد بولتے بولتے چپ ہو گیا ہے۔ اُس نے آہستہ سے سر اٹھایا تو دیکھا کہ استاد کی نظریں اُس کے ماتھے پر اس طرح مرکوز تھیں جیسے وہ آنکھیں جھپکنا بھول گیا ہو۔ ایک دو لمحوں بعد اُس کی نظریں شمونہ کی نظروں سے ٹکرائیں۔ نور اللہ پر بے خودی کی جو کیفیت طاری تھی وہ ذرا سے جھٹکے سے ختم ہو گئی۔

شمونہ کوئی سیدھی سادی دیہاتن یا نادان بچی نہیں تھی۔ اُسے جو تربیت دی گئی تھی اُس میں خاص طور پر بتایا گیا تھا کہ مرد کسی خوبصورت عورت کو کیسی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اُن کے چہرے کا تاثر کیا ہوتا ہے۔

شمونہ نے وہ تاثر اپنے استاد کے چہرے پر دیکھا اور اُس نے اپنے استاد کی آنکھوں میں بھی ایک تاثر دیکھا جسے وہ اچھی طرح سمجھتی تھی لیکن وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھی کہ مذہب میں ڈوبا ہوا یہ شخص جس کا دل عورت کو گناہوں کی علامت سمجھتا ہے اُسے ہوس کی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"اٹھو شمونہ!" — نور اللہ نے کہا — "آج اتنا ہی کافی ہے۔ اب تم کھانا تیار کرو"۔

شمونہ تو چولہے پر جا کر مصروف ہو گئی لیکن نور اللہ اپنی ذات میں ہلکے ہلکے جھٹکے محسوس کرتا رہا۔ شمونہ کا ذہن بھی پُر سکون نہ تھا۔ وہ اس سوچ میں کھوئی ہوئی تھی کہ اتنے معزز اور مقدس انسان کے چہرے پر اور آنکھوں میں ایسے تاثرات کیوں آئے

تھے۔ اُس نے اپنے آپ کو یہ دھوکا دینے کی بھی کوشش کی کہ یہ اُس کی اپنی غلط فہمی ہے اور یہ اُس کے استاد کا اثر نہیں تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کا استاد ایک ایسی کشمکش میں مبتلا ہو چکا ہے جو اُس کی روح کو بھی لذت سے پکار رہی ہے۔

○

جس قدرتی رفتار سے شب و روز گزرتے جا رہے تھے اس سے زیادہ تیز رفتار سے شمونہ اپنی ذات میں ایک پاکیزہ اور پُراثر تبدیلی دیکھ رہی تھی۔ وہ اُن دنوں کو بھولتی جا رہی تھی جو دن اُس نے حسن بن صباح کے گروہ میں گزارے تھے۔ وہ صاف طور پر محسوس کر رہی تھی کہ وہ ابلیس کے جال سے نکلتی آ رہی ہے۔

چند دن اور گزرے، دوپہر کے وقت شمونہ کچھ دیر کے لئے سو گئی۔ یہ اُس کا روز کا معمول تھا۔ اس کی آنکھ کھلی تو اُس نے اپنے استاد کو اپنی چارپائی کے قریب کھڑے دیکھا۔ اُسے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے استاد نے اُس کے سر پر اور شاید گالوں پر بھی ہاتھ پھیرا تھا۔ وہ ہاتھ کے لمس کو ابھی تک محسوس کر رہی تھی لیکن اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہاتھ اُس کے مقدس استاد کا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا آپ نے مجھے جگایا ہے؟" — شمونہ نے نور اللہ سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

نور اللہ نے بوکھلائے ہوئے لہجے میں ایسا جواب دیا جس میں ہاں بھی تھی نہیں بھی۔ شمونہ کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ نور اللہ سر جھکائے آہستہ آہستہ چلتا کمرے سے نکل گیا۔ شمونہ اُس روز کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہو گئی۔ اُس نے دیکھا کہ نور اللہ شام تک چپ چاپ رہا۔ چپ رہنا اس کا معمول نہیں تھا۔

عصر اور مغرب کی نماز کے درمیان نور اللہ کے پاس ہر روز کی طرح اُس کے شاگرد اور معتقد وغیرہ آئے تو اس نے طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کر کے درس نہ دیا۔ وہ سب چلے گئے۔ نور اللہ وہیں بیٹھا رہا۔ شمونہ نے اسے دیکھا اور چپ رہی۔

عشاء کی نماز کے بعد جب نور اللہ ایک کتاب کھول کر پڑھنے لگا تو شمونہ اُس کے سامنے جا بیٹھی۔

"کیوں؟" — نور اللہ نے پوچھا — "آج سوؤ گی نہیں؟"

"نہیں!" — شمونہ نے بڑی نرم آواز میں کہا — "میں آج آپ کے پاس بیٹھوں گی"۔

"تم نے دیکھا نہیں کہ میں نے شام کو درس نہیں دیا تھا؟" — نور اللہ نے کہا — "میرے سر میں گرانی ہے۔ اس وقت تمہیں بھی سبق نہیں دے سکوں گا۔ اگر میری پڑھائی ہوئی کوئی بات تمہاری سمجھ میں نہ آئی ہو تو وہ پوچھ لو اور جا کے سو جاؤ"۔

"ہاں میرے مرشد!" — شمونہ نے کہا — "ایک بات ہی پوچھنی ہے۔ یہ بات آپ نے پہلے کبھی نہیں بتائی۔ یہ مسئلہ میرے اپنے ذہن میں آیا ہے"۔

"پوچھو" — نور اللہ نے شگفتہ لہجے میں کہا اور کتاب بند کر کے الگ رکھ دی۔

"میں آپ میں ایک تبدیلی دیکھ رہی ہوں" — شمونہ نے کہا — "آپ روز بروز خاموش ہوتے چلے جا رہے ہیں"۔

"یہ میری عادت ہے" — نور اللہ نے کہا — "کبھی کبھی میں خاموش ہو جایا کرتا ہوں۔ کچھ دن اور میری یہی حالت رہے گی"۔

"نہیں میرے مرشد!" — شمونہ نے کہا — "میں گستاخی کی جرأت نہیں کر سکتی لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ آپ کی زبان نے جو کہا ہے یہ آپ کے دل کی آواز نہیں.... آپ مجھ سے خفا ہیں۔ آپ کے دل میں میرے لئے ناپسندیدگی ہے"۔

"ایک بات کہوں شمونہ!" — نور اللہ نے کہا — "میرے لئے مشکل یہ پیدا ہو گئی ہے کہ میرے دل میں تمہارے لئے ناپسندیدگی نہیں۔ تم جس پیار سے میری خدمت کر رہی ہو اس نے میری سوچیں بدل ڈالی ہیں"۔

"میں کچھ اور بھی کہنا چاہتی ہوں میرے مرشد!" — شمونہ نے کہا — "میری عمر نہ دیکھیں، میری تربیت دیکھیں۔ میں سلطان ملک شاہ کے ہاں اس تربیت کا عملی تجربہ کر آئی ہوں۔ سلطان کا مشیرِ خاص احتشام مدنی جو زاہد اور پارسا تھا، میرے سامنے موم کی طرح پگھل گیا تھا..... میں نے یہ بات اس لئے کہی ہے کہ آپ مجھے نادان، ناتجربہ کار اور کم عمر لڑکی نہ سمجھتے رہیں۔ میں کسی بھی آدمی کے دل کی بات اُس کے چہرے اور اُس کی آنکھوں سے پڑھ لیا کرتی ہوں"۔

"شمونہ!" — نور اللہ نے کہا — "تم فوراً وہ بات کیوں نہیں کہہ دیتیں جو تمہارے دل میں ہے؟"

"ڈرتی ہوں میرے آقا!"

"مت ڈرو" — نور اللہ نے کہا — "اللہ سچ بولنے والوں کو پسند کرتا ہے"۔

"لیکن اللہ کے بندے بچ سننے کی تاب نہیں رکھتے" — شمونہ نے کہا — "اگر آپ اللہ کی خوشنودی کے طلب گار ہیں تو میں بے خوف ہو کر بات کروں گی..... میں بہت دنوں سے دیکھ رہی ہوں کہ میں آپ کے سامنے بیٹھتی ہوں تو آپ کی آنکھوں میں وہی تاثر ہوتا ہے جو میں عام سے لوگوں کی آنکھوں میں دیکھا کرتی ہوں..... پھر میں نے تین بار آپ کو اس حالت میں دیکھا ہے کہ میں دن کے وقت سوئی ہوں اور آپ میرے پاس کھڑے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے میرے سر اور میرے منہ پر ہاتھ بھی پھیرا ہے"۔

"کیا تمہیں یہ اچھا نہیں لگا؟" — نور اللہ نے پوچھا۔

"اگر آپ کو یوں ہی اچھا لگا ہے تو میں کچھ نہیں کہوں گی" — شمونہ نے کہا۔ "لیکن میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ میں آپ کو کتنی کچھ اچھی لگتی ہوں؟"۔

"شمونہ!" — نور اللہ نے لپک کر شمونہ کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا — "تم نے میری آنکھوں میں جو پڑھا ہے ٹھیک پڑھا ہے اور تم نے غلط نہیں کہا کہ تمہیں سویا ہوا دیکھ کر میں تین چار دن تمہارے پاس جا کھڑا ہوا اور تمہیں دیکھتا رہا تھا"۔

"کس نیت سے؟"

"اس نیت سے کہ تمہیں اپنی زندگی کی رفیقہ بنا لوں" — نور اللہ نے کہا — "کیا تم مجھے قبول کر لو گی؟"

"نہیں میرے مرشد!" — شمونہ نے جواب دیا۔

"کیا میں چالیس برس کی عمر میں بوڑھا ہو گیا ہوں؟"

"نہیں اے مقدس ہستی!" — شمونہ نے کہا — "میں آپ کے تقدس کو اپنے ناپاک وجود سے پامال نہیں کروں گی۔ یہ بات بھی ہے کہ میں نے آپ کو کبھی اپنی خاطر لا کر دیکھا ہی نہیں۔ میرا دل خاوند کے روپ میں آپ کو قبول نہیں کرے گا"۔

"مجھے شک ہے تم مجھ سے اپنی قیمت وصول کرنا چاہتی ہو" — نور اللہ نے قدرے غصیلے لہجے میں کہا — "میں تمہیں شادی کے لئے تیار کرنا چاہتا ہوں، ہوس کاری کے لئے نہیں"۔

"اپنی محنت پر پانی نہ پھیریں میرے آقا!" — شمونہ نے کہا — "میں بھٹک گئی تھی، آپ نے مجھے صراط مستقیم دکھائی ہے..... میں نے تو سنا تھا کہ آپ تارک الدنیا ہیں..... میں بھول گئی تھی میں کون ہوں، آپ نے میری آنکھوں کے آگے سے پردے ہٹا دیے ہیں۔ میں نے اپنے آپ کو پہچان لیا ہے۔ میری نگاہ میں آپ فرشتہ ہیں"۔

"جاؤ شمونہ!" — نور اللہ نے کہا — "جاؤ، سو جاؤ..... صرف ایک بات کہوں گا..... میں نے دنیا کو ترک نہیں کیا تھا، دنیا نے مجھے ترک کر دیا تھا"۔

شمونہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ نور اللہ کی بات سننے کے لئے پھر بیٹھنے لگی تھی لیکن نور اللہ نے اسے کہا، جاؤ، سو جاؤ، تو وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔

○

شمونہ کو اس کے کمرے میں بھیج کر وہ خود وہیں بیٹھا رہا۔ اس کا ذہن پیچھے کو چل پڑا اور وہاں جا رکا جہاں اس کا شعور بیدار ہوا اور وہ بھاگنے دوڑنے کی عمر کو پہنچ گیا۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ بچوں کے ساتھ پیار بھی کیا جاتا ہے۔ اسے کوئی عورت یاد نہ آئی جس نے اسے گود میں لیا ہو۔ صرف ایک یاد تھی جو اس کے ذہن کے ساتھ چپکی ہوئی تھی۔ جہاں تک اس کی یاد ماضی کے دوسرے افق تک جاتی تھی، وہ اپنے آپ کو دریا کے کنارے ایک کشتی کو صاف کرتا، اس میں سے پانی نکالتا، کشتی میں مسافروں کا سامان رکھتا اور ساحل کی ہر قسم کی مشقت کرتا دیکھتا تھا۔ اس وقت اس کی عمر چھ سات سال تھی جب اسے ان کاموں پر لگا دیا گیا تھا۔ اس مشقت کے عوض اسے دو وقت کی روٹی اور اپنے آقاؤں کی پھٹکار اور دھتکار ملتی تھی۔

دس گیارہ سال کی عمر میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہ اس جھونپڑی میں پیدا نہیں ہوا تھا جس جھونپڑی میں وہ رہتا تھا اور جس کے رہنے والوں کو وہ اپنے والدین سمجھتا تھا۔ یہ لوگ ملاح تھے جو مسافروں کو کشتی کے ذریعے دریا پار کراتے تھے۔ ایک روز اس پر یہ انکشاف ہوا کہ کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے یہ دریا سیلابی تھا اور ایک کشتی پار والے کنارے سے اس طرف آ رہی تھی اور یہ مسافروں سے اٹی پڑی تھی۔ کشتی اتنے زیادہ مسافروں کا بوجھ سہارنے کے قابل نہیں تھی۔ کشتی دریا کے وسط میں پہنچی تو اچانک سیلاب کا زور بڑھ گیا۔ کشتی الٹ گئی۔

ملاحوں نے مسافروں کو بچانے کے لئے اپنی اپنی کشتیاں دریا میں ڈال دیں لیکن سیلاب اتنا تیز و تند تھا کہ مسافر تنکوں کی طرح سیلاب میں گم ہوتے چلے جا رہے تھے۔ ایک کشتی کو اس کے ملاح ذرا آگے لے گئے۔ انہوں نے ایک عورت کو دیکھا جس نے

دودھ پیتے ایک بچے کو اپنے ہاتھوں میں لئے اس طرح اوپر اٹھا رکھا تھا کہ بچہ ڈوب نہ جائے۔ ملاحوں نے کشتی اُس کے قریب کر کے بچے کو پکڑ لیا۔ دوسرے ملاح نے اچھل کیا کہ عورت کو بھی سیلاب میں سے نکال لے لیکن عورت میں اتنی تاب نہیں رہی تھی کہ وہ دو گز اور تیر سکتی۔ اُس نے دیکھا کہ بچہ بچ گیا ہے تو اُس نے اپنے آپ کو سیلاب کے حوالے کر دیا اور ملاحوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

اس بچے کو ملاحوں نے اس طرح پالا کہ اسے کبھی بکری کا دودھ پلایا اور کبھی اونٹنی کا۔ وہ چار پانچ سال کا ہُوا تو اُسے کشتی رانی کی مشقت پر لگا دیا۔

ان ملاحوں نے اس بچے کا نام نور اللہ رکھا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلمان تھے۔

نور اللہ کو دس گیارہ سال کی عمر میں پتہ چلا کہ اُس کے ماں باپ دریا میں ڈوب گئے تھے اور اسے ملاحوں نے پالا تھا تو اُس کے دماغ میں جو دھماکہ ہُوا وہ اسے چالیس برس کی عمر میں بھی یاد تھا۔ وہ اسی کو زندگی سمجھتا تھا جس میں ملاحوں نے اسے ڈال رکھا تھا لیکن اس انکشاف نے اس پر ایسی کیفیت طاری کر دی جیسے وہ بھٹکا ہُوا راہی ہو اور اپنی منزل کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہو۔

ایک روز کشتی سے مسافر اترے تو ایک امیر کبیر آدمی نے اُسے کہا کہ اس کا سامان اٹھا کر وہاں تک پہنچا دے جہاں سے اونٹ مل جاتے ہیں۔ نور اللہ نے اس کا سامان وہاں تک پہنچا دیا اور واپس چل پڑا۔ اُس آدمی نے اسے بلایا اور ایک دینار اُجرت دی۔ دس گیارہ سال عمر کا نور اللہ دینار کو ہاتھ لگاتے ڈرتا تھا۔ اس آدمی نے اُسے کہا کہ یہ اس کا حق ہے۔

"دنیا میں میرا کوئی حق نہیں" — نور اللہ نے کہا — "کسی پر میرا حق نہیں۔ میں مشقت کرتا ہوں اور روٹی اور رات کو جھونپڑی کی چھت مل جاتی ہے۔ ذرا سی سُستی کروں تو مجھے مارا پیٹا جاتا ہے۔ میں یہ اُجرت لے کر جاؤں گا تو وہ لوگ مجھ سے چھین لیں گے"۔

"تمہارا باپ ہے؟"

"نہیں..... اسی دریا میں ڈوب گیا تھا"۔

"ماں ہے؟"

"نہیں..... وہ بھی ڈوب گئی تھی"۔

"کوئی بھائی..... کوئی چچا' ماموں؟"

نور اللہ نے اسے وہ سارا واقعہ سنا دیا جو کچھ دن پہلے اسے سنایا گیا تھا۔

"میرے ساتھ چلو گے؟" — اس امیر کبیر آدمی نے پوچھا اور اُس کے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا — "تنخواہ بھی ملے گی' روٹی بھی ملے گی' کپڑے بھی ملیں گے اور رہنے کو بہت اچھی جگہ ملے گی"۔

نور اللہ نے یہ پہلا شخص دیکھا جس نے اُس کے ساتھ پیار سے بات کی تھی اور اُسے اس قابل سمجھا تھا کہ اسے اچھی جگہ رکھا جائے' اچھی قسم کا روٹی کپڑا دیا جائے اور اجرت بھی دی جائے۔ وہ وہیں سے اس شخص کے ساتھ چل پڑا۔

○

دونوں کرائے کے ایک ہی اونٹ پر سوار ہوئے اور شام کو شتربان نے انہیں ایک بڑے شہر میں پہنچا دیا۔ یہ شہر نیشاپور تھا۔ یہ آدمی وہیں کا رہنے والا تھا۔ اس کی حویلی بڑی ہی شاندار تھی۔ وہاں اس شخص کی دو بیویاں رہتی تھیں۔ ایک ادھیڑ عمر اور دوسری نوجوان تھی۔ نور اللہ کو اس گھر میں نوکر رکھ لیا گیا۔ وہاں ایک عورت پہلے سے ملازم تھی۔

نور اللہ روز مرہ کے کام کاج کرتا رہا۔ اُسے اتنی زیادہ سہولتیں میسر آ گئی تھیں کہ وہ یوں سمجھتا تھا جیسے جہنم سے نکل کر جنت میں آ گیا ہو۔ کھانے پینے کو اتنا اچھا ملتا تھا کہ گیارہ بارہ سال کی عمر میں وہ سولہ سترہ سال کا نوجوان نظر آنے لگا۔

ایک سال سے کچھ زیادہ عرصہ گزر گیا۔

ایک روز اُس کا آقا اپنی ادھیڑ عمر بیوی اور بچوں کو ساتھ لے کر کچھ دنوں کے لئے شہر سے باہر چلا گیا۔ پیچھے اس کی نوجوان بیوی رہ گئی۔ اس سے اگلی رات کا واقعہ ہے۔ ملازمہ اپنا کام کاج ختم کر کے جا چکی تھی۔ نور اللہ کو ایسے شک ہُوا جیسے کوئی آدمی حویلی کے صحن میں سے گزرا ہے۔ اُس نے اٹھ کر دیکھا۔ ایک آدمی اُس کی نوجوان مالکن کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔ نور اللہ دوڑ کر گیا۔ دروازہ اندر سے بند ہو چکا تھا۔ اُس نے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ کھلا اور مالکن باہر آئی۔

"کیا ہے؟" — مالکن نے پوچھا۔

"یہ کون ہے جو اندر آیا ہے؟" ــــ نور اللہ نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے پوچھا۔

"تم کون ہو پوچھنے والے؟" ــــ حسین اور نوجوان مالکن نے بڑے رعب سے پوچھا۔

"میں آقا کے حکم کی تعمیل کر رہا ہوں" ــــ نور اللہ نے کہا ــــ "آقا کہہ گئے ہیں کہ گھر میں تم ہی ایک مرد ہو' گھر کا خیال رکھنا"۔

مالکن نے اُس کے منہ پر بڑی زور سے تھپڑ مارا۔ تھپڑ کی آواز پر وہ آدمی جو کمرے میں گیا تھا' باہر نکل آیا۔

"کون ہے یہ؟" ــــ اس شخص نے پوچھا۔

"میرا پہرہ دار بن کے آیا ہے" ــــ لڑکی نے کہا ــــ "میں اس کی زبان ہمیشہ کے لئے بند کر دوں گی"۔

اس شخص نے نور اللہ کو بازو سے پکڑا' گھسیٹ کر اندر لے گیا اور اسے دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر فرش پر پٹخ دیا۔ پھر اُس کی شہ رگ پر پاؤں رکھ کر دبایا اور خنجر نکال کر اس کے اوپر جھکا۔

"میں اس کا پیٹ چیر دوں گا" ــــ اس شخص نے خنجر کی نوک نور اللہ کے پیٹ پر رکھ کر کہا ــــ "اس کی لاش باہر کتوں کے آگے پھینک دوں گا"۔

"آج اسے معاف کر دو" ــــ نوجوان مالکن نے اپنے آشنا کو پرے ہٹاتے ہوئے کہا ــــ "یہ زبان بند رکھے گا۔ اس نے کبھی بھی زبان کھولی تو اس کے دونوں بازو کاٹ کر اسے جنگل میں پھینک دیں گے پھر اسے گیدڑ اور بھیڑیے کھائیں گے"۔

نور اللہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

"وعدہ کر کہ تو زبان بند رکھے گا" ــــ اس شخص نے خنجر کی نوک نور اللہ کی شہ رگ پر رکھ دی اور کہا ــــ "خاموشی سے چلا جا اور خاموش رہنا"۔

نور اللہ ظلم و تشدد سے بہت ڈرتا تھا۔ وہ چپ چاپ' خوفزدگی کی حالت میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

اس کے بعد اُس کے آقا کی واپسی تک یہ آدمی دو تین مرتبہ رات کو اس کی مالکن کے پاس آیا اور نور اللہ اپنے کمرے میں دبکا پڑا رہا۔ اُس کا آقا واپس آیا تو نور اللہ کو جرأت نہ ہوئی کہ وہ اپنے آقا کو بتاتا کہ اُس کی غیر حاضری میں یہاں کیا ہوتا رہا ہے۔

ایک بار چھوٹی مالکن نے نور اللہ کو اپنے کمرے میں بلایا اور پیار سے بات کرنے کی بجائے اُسے پھر وہی دھمکی دی کہ اس کا پیٹ پھاڑ کر یا بازو کاٹ کر اسے بھیڑیوں' کتوں اور گیدڑوں کے آگے پھینک دیا جائے گا۔

نور اللہ کا کوئی مذہب نہیں تھا نہ اُس نے کبھی سوچا تھا کہ مذہب کے لحاظ سے وہ کون اور اس کا آقا کون ہے۔ نہ اُس نے خود کبھی عبادت کی تھی نہ اُس نے اپنے آقا یا اُس کی بیوی کو عبادت کرتے دیکھا تھا۔ اُس میں یہ احساس بیدار ہو گیا تھا کہ مذہب انسان کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ اُس سے تین چار آدمی پوچھ چکے تھے کہ وہ مسلمان ہے یا عیسائی۔ وہ کسی کو بتاتا کہ وہ مسلمان ہے اور کسی کو عیسائی بتاتا۔ ایک بار ایک آدمی نے اسے کہا' تمہارا آقا تو باطنی معلوم ہوتا ہے..... اُسے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ باطنی کیا ہوتے ہیں۔

ایک رات اُس کے آقا نے اُسے شراب لانے کو شراب خانے بھیجا۔ وہ مسجد کے قریب سے گزرا۔ عشاء کی نماز ہو چکی تھی اور خطیب درس دے رہا تھا۔ نور اللہ کے کانوں میں خطیب کے یہ الفاظ پڑے ــــ "ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں..... ہمیں اُن لوگوں کا سیدھا راستہ دکھا جن پر تیرا انعام نازل ہوا ہے نہ کہ ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا" ــــ خطیب سورۂ فاتحہ کی تفسیر بیان کر رہا تھا۔ نور اللہ کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ قرآن کی آیت ہے اور قرآن اللہ کا کلام ہے۔ اُسے صرف یہ احساس ہوا کہ وہ بھی اُن لوگوں میں سے ہے جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا ہے۔

نور اللہ جلدی میں تھا۔ اُس کا آقا شراب کے انتظار میں تھا۔ وہ دوڑا گیا' شراب خریدی اور اپنے آقا کو جا دی۔ اُس کے ذہن میں خطیب کے یہ الفاظ اٹک کے رہ گئے تھے جو اس نے مسجد کے دروازے میں کھڑے ہو کر سنے تھے۔ وہ بھی مدد کا اور سیدھے راستے کی رہنمائی کا طلب گار تھا۔

○

اگلی رات نور اللہ روز مرہ کام کاج سے فارغ ہو کر مسجد کے دروازے پر جا پہنچا۔ خطیب روز مرہ کی طرح درس دے رہا تھا۔ نور اللہ دروازے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔ خطیب نے اسے دیکھا تو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ ڈرتے جھجکتے خطیب کے پاس چلا گیا۔

"دروازے میں کھڑے کیا کر رہے تھے؟" ــــ خطیب نے پوچھا۔

"آپ کی باتیں سُن رہا تھا" — نور اللہ نے جواب دیا — "کل باہر کھڑا سنتا رہا ہوں"۔

"مسلمان ہو؟"

"معلوم نہیں" — نور اللہ نے بڑی سادگی سے جواب دیا — "میں یہی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ میں کون ہوں..... اس وقت ایک شیخ کے گھر ملازم ہوں"۔

خطیب نے اسے اپنے پاس بٹھا لیا اور اسے بتایا کہ جس شیخ کا اس نے نام لیا ہے وہ بے دین ہے۔ اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہے لیکن کسی کو بھی معلوم نہیں کہ وہ کس فرقے کا آدمی ہے اور اس کا عقیدہ کیا ہے۔

"کل سے تم میرے پاس آ جایا کرو" — خطیب نے اُسے بڑے پیار سے کہا — "اب تم چلے جاؤ"۔

اگلے روز سے نور اللہ نے خطیب کے پاس جانا شروع کر دیا۔ اُس نے خطیب کو بتایا کہ اُس کے ماں باپ سیلاب میں ڈوب گئے تھے اور اُسے ملاحوں نے سیلاب سے نکالا تھا۔ اُس نے خطیب کو اپنی گذری ہوئی زندگی کا ایک ایک لمحہ سنایا۔ خطیب نے اُسے پڑھانا لکھانا شروع کر دیا۔ یہ خالصتاً دینی تعلیم تھی۔ نور اللہ نے اس تعلیم میں گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ تقریباً ایک سال بعد اُس نے خطیب سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اس شیخ کی نوکری چھوڑ کر خطیب کی اور مسجد کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ خطیب نے خندہ پیشانی سے اُسے اپنے پاس رکھ لیا۔

نور اللہ نے پندرہ سال اس خطیب کے ساتھ گذارے اور دین کے امور میں خاصی دسترس حاصل کر لی۔ خاص بات یہ ہوئی کہ اُس کے ذہن میں ابلیس اٹک گیا۔ اُس کا عقیدہ بن گیا کہ ہر بُرا کام ابلیس کرواتا ہے۔

دوسری خاص بات یہ ہوئی کہ خطیب کی ایک ہی بیوی تھی جو صرف تین سال کی رفاقت کے بعد مر گئی اور خطیب نے دوسری شادی نہ کی۔ خطیب نے کسی کو بھی نہ بتایا کہ اُس نے دوسری شادی کیوں نہیں کی۔ ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ اُسے اس بیوی سے اتنا زیادہ پیار تھا کہ اُس نے کسی اور عورت کو قبول ہی نہ کیا، یا یہ بات تھی کہ اس بیوی سے وہ اس قدر نالاں تھا کہ وہ مر گئی تو خطیب نے شادی سے توبہ کر لی۔

وجہ جو کچھ بھی تھی، خطیب نے اپنے شاگرد نور اللہ کو عورت سے متنفر کر دیا اور

اُس کے ذہن میں یہ عقیدہ ڈال دیا کہ عورت گناہوں کی علامت ہوتی ہے اور ابلیس عورت کے زیادہ قریب ہوتا ہے۔

چند برس اور گزرے تو خطیب فوت ہو گیا۔ نور اللہ ایسا دلبرداشتہ ہوا کہ وہ مسجد کو بھی چھوڑ گیا اور جنگل میں ایک کُٹیا سی بنا کر وہاں جا ڈیرہ لگایا۔ اب وہ عالمِ دین کہلانے کے قابل ہو چکا تھا۔ خطیب کے جو شاگرد تھے وہ نور اللہ کے پاس جنگل میں پہنچنے لگے اور نور اللہ نے انہیں درس دینا شروع کر دیا۔ اُس کی شہرت سینہ بہ سینہ پھیلتی چلی گئی اور اُس کا نام ابو مسلم رازی تک پہنچا۔ ابو مسلم رازی رَے کا امیرِ شہر تھا۔ دینی علوم سے اُسے دلی لگاؤ تھا۔ وہ اتنی دُور جنگل میں جا کر نور اللہ سے ملا اور اُس سے متاثر ہوا۔ متاثر بھی اتنا ہوا کہ ایک روز اُس کے لئے سواری ساتھ لے کر اُسے اس میں بٹھایا اور اپنے شہر میں لے آیا۔ شہر میں اُسے بڑا اچھا مکان دیا اور کہا کہ یہاں وہ جو جی چاہے کرے اور لوگوں کو دین کی تعلیم دے۔

لوگ اُس کے پاس آنے لگے۔ بعض لوگ اُس سے اتنے زیادہ متاثر ہو گئے تھے کہ اُس سے غیب کا حال معلوم کرتے تھے۔ وہ زیادہ تر ابلیس اور عورت پر زور دیا کرتا تھا اور کہتا تھا کہ ان دو چیزوں سے اپنے جسم اور اپنی روح کی حفاظت کرو۔

○

آج نور اللہ اُسی مکان میں بیٹھا تھا جو اُسے ابو مسلم رازی نے دیا تھا لیکن اُس پر جو کیفیت طاری تھی وہ کوئی اجنبی دیکھتا تو یہ تسلیم نہ کرتا کہ یہ شخص عالم فاضل ہے۔ وہ اُسے ذہنی مریض سمجھتا۔ اُسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔ شمونہ اپنے کمرے میں گہری نیند سو گئی تھی۔ اُسے احساس ہی نہیں تھا کہ نور اللہ کے وجود میں اور جذبات میں وہ کیسے زلزلے برپا کر آئی ہے۔

اُسی نور اللہ نے جس نے ہمیشہ یہ سبق دئیے تھے کہ عورت سے دُور رہو، شمونہ سے کہا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے لیکن شمونہ جو گناہگاروں کی پروردہ تھی گناہوں کی دنیا سے نکل کر پارسائی میں داخل ہو گئی تھی، اُس شمونہ نے نور اللہ سے کہہ دیا تھا — "میں آپ کے تقدس کو اپنے ناپاک وجود سے پامال نہیں کروں گی" — شمونہ نے یہ بھی کہا تھا — "میرا دل خاوند کے روپ میں آپ کو قبول نہیں کرے گا۔"

نور اللہ کی آنکھوں کے آگے سے اُس کا پورا ماضی تیز رفتار گھوڑا گاڑیوں کی قطار

کی مانند گذر گیا۔ وہ اپنے وجود میں پیاس کی تلخی محسوس کر رہا تھا۔ ایک عجیب سی تلخی تھی، محرومیاں تھیں جو کانٹوں کی طرح اُس کے حلق میں چُبھ رہی تھیں۔

تلخی بڑھتی چلی گئی۔

دیکھتے ہی دیکھتے اُس کی ذات سے ایک شعلہ اٹھا جس نے اُس کے علم و فضل کے خرمن کو جلا ڈالا۔

وہ اپنے لئے اجنبی بن گیا۔

وہ بڑی تیزی سے اٹھا اور اُس کمرے میں داخل ہو گیا جس میں شمونہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ اُس رات شمونہ نے دروازہ بند نہیں کیا تھا کیونکہ اُسے توقع تھی کہ نوراللہ اسے بلائے گا۔ وہ لیٹی اور نیند نے اُسے دبوچ لیا۔

نوراللہ اُس کے پلنگ پر جا بیٹھا۔ کمرہ تاریک تھا۔ برآمدے میں جلتے ہوئے دیئے کی ہلکی ہلکی روشنی دروازے سے اندر آ رہی تھی جس میں سوئی ہوئی شمونہ کا سراپا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔

شمونہ گہری سانسیں لے رہی تھی۔ نوراللہ کی سانسیں بے قابو سی ہو گئیں اور اُس کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ اُس نے ہاتھ شمونہ کی طرف بڑھایا۔ یہ ہاتھ کچھ لرزتا ہوا آہستہ آہستہ شمونہ کے پُرشباب جسم کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہاتھ جب شمونہ کے جسم کے قریب گیا تو آسمان پر اچانک گھٹاؤں کی گرج سنائی دی۔ نوراللہ نے یک لخت ہاتھ پیچھے کھینچ لیا جیسے چوری کرتے عین موقع پر پکڑا گیا ہو۔ جب اُسے احساس ہوا کہ یہ گھٹاؤں کی گرج تھی تو اُس کے دل کو حوصلہ ملا۔

اُس نے اب ذرا دلیری سے ہاتھ آگے بڑھایا اور شمونہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا.... اب کے گھٹا پہلے سے زیادہ زور سے گرجی۔ نوراللہ نے ہاتھ پیچھے کھینچنے کی بجائے شمونہ کا ہاتھ اور زیادہ زور سے پکڑ لیا اور اُس نے شمونہ کے ہاتھ کو اتنی زور سے دبایا کہ شمونہ کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے نوراللہ کو اپنے پلنگ پر بیٹھے اور اپنا ہاتھ نوراللہ کے ہاتھ میں دیکھا تو وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"آپ؟" — شمونہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا — "یہاں کیوں؟"

"مت گھبراؤ شمونہ!" — نوراللہ نے شمونہ کا ہاتھ چھوڑے بغیر کہا — "آج یہ پیاس مجھے جلا کر راکھ کر رہی ہے جسے میں نے پہلے کبھی محسوس ہی نہیں کیا تھا.... میری

ایک بات سن لو"۔

شمونہ کچھ ایسی ڈری کہ وہ پلنگ پر بیٹھے بیٹھے پیچھے کو سرکنے لگی۔ نوراللہ نے اُس کا دوسرا ہاتھ بھی پکڑ لیا اور اُسے اپنی طرف بڑے آرام سے کھینچا۔

"مجھے ماں کا پیار نہیں ملا" — نوراللہ نے ایسی آواز میں کہا جو اُس کی قدرتی آواز نہیں تھی — "مجھے بہن کا پیار نہیں ملا۔ میں بیٹی کے پیار سے بھی محروم رہا۔ میں نے کبھی کسی عورت کو ہاتھ لگا کر بھی نہیں دیکھا لیکن تم میرے قریب آئیں تو مجھ پر یہ راز کھلا کہ جس عورت کو میں نفرت کی علامت سمجھتا رہا ہوں وہ پیار کا سرچشمہ ہے.... تم ہو وہ سرچشمہ.... مجھ سے دُور نہ ہٹو" — اُس نے شمونہ کو ذرا زور سے اپنی طرف کھینچا۔

"نہیں میرے مُرشد!" — شمونہ نے رندھی ہوئی سی آواز میں کہا — "میں بدی سے نیکی کی طرف، شر سے خیر کی طرف آئی ہوں۔ مجھے اس راستے پر آپ نے ہی ڈالا تھا۔ آپ اُس طرف نہ جائیں جدھر سے میں واپس آئی ہوں۔ مجھے اللہ اور ابلیس کے درمیان بھٹکتا نہ چھوڑیں"۔

"میری بات سمجھنے کی کوشش کرو شمونہ!" — نوراللہ نے ایسی ڈگمگاتی ہوئی آواز میں کہا جیسے وہ نشے میں ہو — "تھوڑی سی دیر کے لئے مجھے بھٹک جانے دو۔ مجھے پیاسا نہ لوٹاؤ"۔

آسمان پر بجلی بڑی زور سے کڑکی، پھر گھٹا گرجی اور اس کے ساتھ ہی طوفانی بادوباراں شروع ہو گیا۔ دروازے کے کھلے کواڑ زور زور سے بجنے لگے۔ برآمدے میں دیا بجھ گیا۔ نوراللہ نے شمونہ کو اپنی طرف کھینچا۔ شمونہ کا سینہ بڑی زور سے نوراللہ کے سینے سے ٹکرایا۔ نوراللہ اُس کے ہاتھ چھوڑ کر اُسے اپنے بازوؤں میں لینے لگا تو شمونہ اچھل کر پیچھے ہٹی اور بڑی زور سے ایک تھپڑ نوراللہ کے منہ پر مارا۔

"تم لوگوں کو جس ابلیس سے ڈراتے ہو" — شمونہ نے بڑے ہی غضبناک لہجے میں کہا — "وہ ابلیس تم خود ہو"۔

شمونہ اچھل کر پلنگ سے اٹھی اور فرش پر کھڑی ہو گئی۔ اُسے توقع ہو گی کہ نوراللہ اُس پر جھپٹے گا لیکن اندھیرے میں نوراللہ کے قدموں کی آہٹ ابھری جو شمونہ کی طرف بڑھنے کی بجائے دروازے کی طرف جا رہی تھی۔ شمونہ وہیں دبکی کھڑی رہی۔ نوراللہ

باہر نکل گیا۔ شمونہ کو اب یہ خوف محسوس ہونے لگا کہ نور اللہ رسی لینے گیا ہے اور اسے باندھ لے گا یا چھری چاقو لا کر اسے قتل کر دے گا۔ ڈر کے مارے وہ پلنگ کے نیچے چھپ گئی۔

○

نور اللہ صحن میں چلا گیا۔ بارش بہت ہی تیز تھی اور اس کے ساتھ جھکڑ اور زبان نو دینگر تھا۔

"مجھے سکون دو" — نور اللہ نے بڑی بلند آواز میں کہا — "مجھے انسان کا ل ما دو"۔

شمونہ نے یہ آواز سنی اور وہ پلنگ کے نیچے دبکی رہی۔

نور اللہ پر دیوانگی طاری ہو چکی تھی۔ وہ اسی حالت میں باہر نکل گیا۔ شہر کے لوگوں نے طوفان باد و باراں کے بھیانک شور و غل میں بڑی بلند آوازیں سنیں — "مجھے سکون دو..... میں جل رہا ہوں..... میرے اللہ! باد و باراں کو اور تیز کر دے..... میری روح کو تلخیوں سے نجات دلا دے"۔

شہر کے لوگوں نے یہ آوازیں مسلسل سنیں اور یہ دور ہٹتی گئیں اور پھر طوفان کے شور و غل میں تحلیل ہو گئیں اور لوگ یہ سمجھ کر ڈر گئے کہ یہ کسی کی بھٹکی ہوئی مظلوم بدروح ہے جو فضا میں چیختی چلاتی چلی جا رہی ہے۔

شمونہ پلنگ کے نیچے چھپی کانپ رہی تھی۔

نور اللہ شہر سے نکل کر جنگل میں چلا گیا تھا اور وہ بازو پھیلائے چلتا چلا جا رہا تھا کہ مجھے سکون دو۔ شہر سے کچھ دور چھوٹی سی ایک ندی تھی جس میں سے بچے بھی گزر جایا کرتے تھے لیکن اوپر اتنی زور کا مینہ برسا تھا کہ ندی میں طغیانی آگئی تھی۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ ندی پانی میں ہی کہیں چھپ گئی تھی۔ نور اللہ کچھ دور آگے گیا تو ایک ٹہن درخت سے ٹوٹ کر اس طرح گرا کہ نور اللہ کے سر پر لگا۔ وہ تو پہلے ہی دیوانگی کی حالت میں تھا اسے یہ احساس بھی نہ تھا کہ جا کہاں رہا ہے۔ سر پر ٹہن گرا تو اس پر غشی طاری ہونے لگی۔ وہ گرا تو چند قدم آگے ندی کے کنارے پر گرا۔ کنارہ سیلاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ سیلاب نور اللہ کو اپنے ساتھ ہی بہا لے گیا۔

اسے اللہ نے سیلاب میں نئی زندگی دی تھی اور یہ زندگی سیلاب نے ہی واپس لے

لی۔

شمونہ صبح تک پلنگ کے نیچے چھپی رہی۔ صبح ڈرتے ڈرتے باہر نکلی تو نور اللہ وہاں نہیں تھا۔ طوفان ختم ہو چکا تھا۔ شمونہ گھر سے نکلی اور ابو مسلم رازی کے ہاں چلی گئی اور اسے رات کی واردات سنائی۔

"ابلیس ہر انسان کی ذات میں موجود ہوتا ہے" — ابو مسلم رازی نے شمونہ سے کہا — "ایک خوبصورت عورت میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ کسی کے بھی ایمان کو سلا کر ابلیس کو بیدار کر سکتی ہے لیکن جن کے ایمان مضبوط ہوتے ہیں ابلیس ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا..... تمہارا اب کیا ارادہ ہے؟"

"میں آپ کی پناہ میں آئی تھی" — شمونہ نے التجا کی — "مجھے اپنی پناہ میں رکھیں..... یہ تو میرا ایک ارادہ ہے۔ میرا ایک ارادہ اور بھی ہے۔ آپ نے کہا ہے کہ ایک خوبصورت عورت کسی کے بھی ایمان کو سلا کر ابلیس کو بیدار کر سکتی ہے..... یہ آپ نے ٹھیک کہا ہے۔ حسن بن صباح لوگوں کو اور امراء وزراء کو اپنا مرید بنانے کے لئے عورت کی یہی طاقت استعمال کر رہا ہے۔ میں اس کی اس طاقت کو زائل کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔ اس ارادے کی تکمیل کے لئے میں آپ کے زیر سایہ رہنا چاہتی ہوں"۔

اسی روز شہر میں مشہور ہو گیا کہ رات کو ایک بے چین بدروح طوفان باد و باراں میں چلاتی گزر گئی تھی 'مجھے سکون دو' 'مجھے سکون دو'..... یہ باتیں امیر شہر تک پہنچیں تو شمونہ نے بھی سنیں۔ اس نے بتایا کہ یہ الفاظ نور اللہ نے اپنے گھر کے صحن میں کہے تھے پھر وہ باہر نکل گیا تھا۔ وہی باہر بھی یہ نعرے لگاتے گیا ہو گا۔

تیسرے چوتھے دن شہر سے کچھ دور آگے ایک جگہ نور اللہ کی لاش مل گئی تو کڑیاں ملتے یہ کہانی سامنے آئی جو داستان گو نے سنائی ہے۔ یہ تاریخ کا ایک قصہ بن گیا۔

یہ آگے چل کر سنایا جائے گا کہ شمونہ نے اس داستان میں کیا رول ادا کیا تھا۔

○

حسن بن صباح اپنی گرفتاری کی اطلاع قبل از وقت مل جانے سے رے سے فرار ہو گیا تھا۔ اس نے خلجان پہنچنا تھا۔ وہ اپنے خاص آدمیوں کو کہہ گیا تھا کہ شمونہ کو بھی خلجان پہنچا دینا۔ وہاں وہ اسے سزائے موت دینا چاہتا تھا وہ خود بھی خلجان نہ پہنچ سکا۔ تاریخ

میں اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ خلجان کی طرف اونٹ پر جا رہا تھا۔ وہ شتربانوں کے بھیس میں تھا۔ اُس کی رفتار معمول کے مطابق تھی تاکہ کسی کو شک نہ ہو۔ اُس نے ابھی آدھا فاصلہ طے کیا ہو گا کہ پیچھے سے ایک تیز رفتار گھوڑ سوار گیا اور اُسے جا لیا۔ وہ حسن کے اپنے گروہ کا آدمی تھا۔

"کیا خبر لائے ہو!" — حسن نے اُس سے پوچھا۔

"خلجان نہ جائیں" — گھوڑ سوار نے کہا — "ہمارا خیال ہے سلجوقی امیر کو شک ہو گیا ہے کہ آپ خلجان جا رہے ہیں۔ شاید وہ لوگ آپ کے تعاقب میں آئیں گے۔ کسی اور طرف کا رخ کر لیں"۔

حسن رک گیا۔ کچھ دیر سوچا۔

"میں اصفہان چلا جاتا ہوں" — اُس نے کہا — "تم خلجان چلے جاؤ۔ وہاں کے امیر احمد بن غطاش کو ساری بات سنا کر بتانا کہ میں اصفہان جا رہا ہوں۔ وہاں میرا ایک پرانا دوست رہتا ہے۔ نام ابوالفضل ہے۔ ہم امام موافق کے مدرسے میں اکٹھے پڑھے تھے۔ اب اس کا شمار شہر کے رئیسوں میں ہوتا ہے۔ وہ مجھے پناہ دے گا اور مدد بھی کرے گا۔ احمد بن غطاش سے کہنا کہ میں کچھ دنوں بعد خلجان پہنچ جاؤں گا' اور یہ بھی کہنا کہ شہر میں کوئی مشکوک آدمی نظر آئے تو اُس کے پیچھے اپنے جاسوس ڈال دے۔ وہ سلجوقیوں کا جاسوس ہو سکتا ہے۔ اُسے زندہ نہیں چھوڑنا"۔

"میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں" — گھوڑ سوار نے کہا — "ہمیں یہاں زیادہ دیر رکنا نہیں چاہئے"۔

گھوڑ سوار خلجان کی طرف اور حسن بن صباح اصفہان کی طرف چلا گیا۔

تاریخ سے پتہ نہیں چلتا وہ کتنے دنوں بعد اصفہان پہنچا۔ ابوالفضل اصفہانی کے گھر کا راستہ پوچھا اور اُس کے گھر جا پہنچا۔ ابوالفضل کو ملازم نے اندر جا کر اسے بتایا کہ ایک شتربان آیا ہے۔ ابوالفضل نے کہا کہ اُس نے کسی شتربان کو نہیں بلایا نہ کسی شتربان کی اُجرت اس کے ذمے ہے۔

"اس سے پوچھو کیوں آیا ہے!" — ابوالفضل نے ملازم سے کہا۔

"آقا پوچھتے ہیں کیوں آئے ہو!" — ملازم نے باہر جا کر حسن سے کہا — "ان کا کسی شتربان سے کوئی کام نہیں ہو سکتا"۔

"آقا سے کہو یہ شتربان آپ سے ملے بغیر نہیں جائے گا" — حسن بن صباح نے کہا۔

ملازم اندر گیا اور واپس آکر وہ حسن کو اندر لے گیا۔ معمولی سے ایک کمرے میں بٹھایا۔ ایک تو وہ شتربانوں کے لباس میں تھا' دوسرے وہ بڑی مسافت طے کر کے آیا تھا۔ چہرے پر تھکن کے آثار بھی تھے۔ ابوالفضل اصفہانی اس کمرے میں گیا۔ وہ حسن کو پہچان نہ سکا۔ حسن نے تعارف کرایا تو ابوالفضل نے اُسے پہچانا اور اُسے اس کمرے میں لے گیا جس میں اعلیٰ رتبے کے مہمانوں کو بٹھایا جاتا تھا۔

وہ کچھ دیر مدرسے کے زمانے کی باتیں کرتے رہے' پھر ابوالفضل نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آیا ہے اور کہاں جا رہا ہے۔

"یوں سمجھو آسمان سے گرا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "میں مرو سے آیا ہوں۔ سلطان ملک شاہ نے مجھے اپنا معتمد خاص بنا لیا تھا۔ یہ تو تم جانتے ہو کہ ہمارا پرانا دوست نظام الملک سلطان ملک شاہ کا وزیراعظم ہے" — حسن بن صباح نے جھوٹ بولا — "سلطان مجھے اپنا وزیراعظم بنا رہا تھا لیکن نظام الملک نے خفیہ طریقے سے سلطان کو میرا دشمن بنا دیا اور پھر مجھے عہدے سے معزول کرا کے شہر بدر کروا دیا"۔

"دبستان مذاہب" کے حوالے سے "آئرہ تلیس" میں لکھا ہے کہ ابوالفضل نے حسن سے پوچھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔

"میں سلجوقی سلطنت کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے تم جیسے دو دوست مل جائیں تو میں اس تُرک ملک شاہ اور خواجہ حسن طوسی کا جو نظام الملک بنا پھرتا ہے' پہلے خاتمہ کر دوں"۔

ابوالفضل چپ رہا۔ اتنے میں ملازموں نے دسترخوان چُن دیا۔ ابوالفضل نے ایک الماری سے ایک شیشی نکالی اور اس میں جو سفوف پڑا ہوا تھا' اس میں ذرا سا سفوف ایک پیالے میں پانی ڈال کر گھولا۔

"لو حسن!" — اُس نے پیالہ حسن کو دیتے ہوئے کہا — "یہ پی لو"۔

"یہ کیا ہے؟" — حسن نے پوچھا۔

"یہ دماغی تقویت کے لئے ایک دوائی ہے" — ابوالفضل نے کہا — "تم نے اتنا لمبا سفر کیا ہے کہ تھکان نے تمہارا دماغ شل کر دیا ہے ورنہ تم ایسی بہکی بہکی باتیں نہ

کرتے کہ تم سلطان ملک شاہ اور اس کے وزیر اعظم نظام الملک کا خاتمہ کر دو گے، حالانکہ تمہیں پوری طرح احساس ہے کہ سلجوقی نہ آتے تو اسلام کی بنیادیں جو کھوکھلی ہوتی جا رہی تھیں، پوری عمارت کو لے بیٹھتیں۔ مسلمان 72 فرقوں میں بٹ چکے ہیں اور ان فرقوں کے اندر فرقے بن رہے ہیں۔ اسلام کی توڑ پھوڑ شروع ہو چکی ہے۔ سلجوقیوں نے آکر اسلام کی بنیادیں مضبوط کر دی ہیں اور قرآن کے اس فرمان کے مطابق کہ امت ایک جماعت ہے، ایک جماعت کی حکومت قائم کر دی ہے..... تم جیسا مسلمان یہ کہے کہ وہ سلطنتِ سلجوق کا خاتمہ کر دے گا تو یہ ثبوت ہے کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھا ہے! کسی وجہ سے اس کے دماغ پر عارضی اثر ہو گیا ہے..... تمہارے دماغ پر سفر کی تھکن کا اثر ہے۔ یہ دوائی پی لو۔ دماغ تر و تازہ ہو جائے گا"۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے جو ہر مؤرخ نے لکھا ہے۔ حسن بن صباح اپنے پرانے دوست ابوالفضل اصفہانی کے ہاں پناہ اور مدد امداد کے لئے گیا تھا لیکن اس کے دوست نے اسے دماغی خرابی کا مریض قرار دے دیا۔ حسن کو ایک مایوسی تو یہ ہوئی کہ اس کا دوست سلجوقیوں کا حامی ہی نہیں بلکہ پیروکار نکلا۔ اس کے ساتھ ہی اسے خطرہ محسوس ہوا کہ ابوالفضل کو اس کی اصلیت اور گرفتاری سے فرار کا پتہ چل گیا تو وہ اسے گرفتار کرا دے گا۔

حسن بن صباح نے اپنے متعلق یہ مشہور کر رکھا تھا کہ وہ اہلِ سنت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شیدائی ہے۔ اسماعیلیوں میں جاتا تو اپنے آپ کو اسماعیلی بتاتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنا ہی ایک فرقہ بنا رہا تھا اور اس نے نبوت کا دعویٰ کرنا تھا۔

اس نے ابوالفضل کے ہاتھ سے پیالہ لے کر دوائی پی لی، کھانا کھا لیا اور باتوں میں مگن ہو گیا۔ ابوالفضل نے اسے جلدی سُلا دیا۔

وہ صبح بہت جلدی جاگ اٹھا۔ اپنے میزبان سے کہا کہ وہ اس سے رخصت چاہتا ہے۔ وہ وہاں سے بھاگنے کی فکر میں تھا۔ ابوالفضل کے گھر سے نکل کر وہ خلجان کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں گرفتاری کا خطرہ تو تھا لیکن وہ احمد بن عطاش سے مل کر آئندہ کا پروگرام بنانا چاہتا تھا۔

○

دو تین دنوں کی مسافت طے کر کے وہ خلجان پہنچ گیا۔ اس کا بہروپ اتنا کامیاب تھا کہ

احمد بن عطاش بھی اسے نہ پہچان سکا۔ اس نے پہلی بات یہ پوچھی کہ گرفتاری کا خطرہ ابھی ہے یا ٹل گیا ہے۔ دوسری بات یہ پوچھی کہ شمونہ آئی ہے یا نہیں۔ شمونہ کے متعلق اسے بتایا گیا کہ نہیں آئی، البتہ یہ اطلاع آئی ہے کہ وہ فرار ہو گئی ہے۔

"اس صورت میں اسے قتل کرنا ضروری ہے"— حسن بن صباح نے کہا— "اسے یہاں لا کر قتل ہی کرنا تھا لیکن اب وہ ہمارے لئے زیادہ خطرناک ہو گئی ہے۔ اگر وہ سلجوقیوں کے پاس چلی گئی تو ہمارا سارا کھیل بے نقاب ہو جائے گا"۔

"تمہیں یہاں سے نکلنے کی ایک بڑی اچھی صورت پیدا ہو گئی ہے"— احمد بن عطاش نے کہا— "مصر کے دو عالم آئے ہیں۔ تم جانتے ہو کہ مصر پر اسماعیلیوں کی حکومت ہے۔ وہ میرے مہمان اس طرح ہوئے کہ ہمیں وہ اسماعیلی سمجھتے ہیں۔ میں نے انہیں یقین دلا رہا ہے کہ ہم اسماعیلی فرقے کے لوگ ہیں۔ یہ دونوں تبلیغ کے لئے آئے ہیں۔ ان میں ایک داعی الکبیر کہلاتا ہے۔ اس نے مجھے کہا ہے کہ اسے ایسے ذہین اور پُراثر گفتار والے آدمی دیئے جائیں جو اسماعیلی عقائد اور مسلک کی تبلیغ کریں اور لوگوں کو اس فرقے میں لائیں"۔

"میں ان میں شامل ہو جاتا ہوں"— حسن بن صباح نے کہا— "مصر جانے کے ارادے سے! یہ تو میں پہلے ہی سوچ رہا تھا کہ مصر جاؤں اور وہاں کے حکمرانوں کو قائل کروں کہ وہ سلجوقیوں پر حملہ کریں اور ہم انہیں نفری اور دیگر ضروریات کی مدد دیں گے..... ہمارا پہلا شکار سلجوقی سلطنت ہے۔ اس کا ہم نے خاتمہ کر دیا تو اس پر قابض ہونے والوں کے ہم پاؤں نہیں ٹکنے دیں گے"۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ مصر پر عبیدیوں کی حکمرانی تھی جن کے متعلق مشہور تھا کہ وہ اسماعیلی ہیں لیکن وہ باطنی تھے۔ یہ جو دو عالم خلجان گئے اور احمد بن عطاش سے ملے اسماعیلی ہی تھے جو اپنے فرقے کے مبلغ تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انہیں بھی معلوم نہیں تھا کہ مصر کے حکمران اسماعیلی نہیں بلکہ باطنی ہیں۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ دونوں عالم دراصل باطنی تھے اور اسماعیلیت کے پردے میں اپنے عقائد کی تبلیغ کرتے پھرتے تھے۔ داستان گو کے لئے یہ عالم کوئی ایسے اہم نہیں کہ ان کے متعلق حتمی طور پر کہے کہ وہ کس فرقے کے لوگ تھے۔ اہم بات یہ ہے کہ

حسن بن صباح مصر جانا چاہتا تھا۔ اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ ان عالموں سے ملا اور تبلیغ کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ دوسروں پر اپنا طلسم طاری کرنے کا ڈھنگ تو اسے آتا تھا۔ اس کی زبان میں جادو کا اثر تھا۔ اس نے عالموں کو متاثر کر لیا اور انہوں نے اسے تبلیغ کے لئے رکھ لیا۔

حسن نے انہیں کہا کہ وہ اپنے علاقے میں تبلیغ کرنے کی بجائے مصر چلا جائے تو زیادہ بہتر ہے۔ اس نے ایسے دلائل دیئے جن سے یہ عالم متاثر ہو گئے اور اسے مصر جانے کے لئے تمام سہولتیں اور رقم وغیرہ دے دی۔

حسن مصر کو روانہ ہو گیا۔ اپنے دو آدمیوں کو ساتھ لے گیا۔

O

دو مہینوں کے سفر کے بعد حسن بن صباح مصر پہنچ گیا اور سیدھا اس وقت کے حکمران کے پاس گیا۔ اس نے حکمران کو بھی متاثر کر لیا لیکن اسے یہ نہ بتایا کہ وہ اسماعیلی عقائد کی تبلیغ کے لئے آیا ہے۔ اس نے حکمران پر دھاک بٹھانی شروع کر دی کہ وہ بہت بڑا عالم ہے اور وہ وزارت کے درجے کا آدمی ہے۔ اس نے اپنے متعلق یہ بھی بتایا کہ وہ غیب دان بھی ہے اور آنے والے وقت کی پیشگوئی بھی کر سکتا ہے۔

عبیدی حکمران اتنے "کچے" نہیں تھے کہ فوراً ہی ایک اجنبی کی باتوں میں آجاتے۔ انہوں نے ظاہر یہ کیا کہ وہ اس سے متاثر ہو گئے ہیں لیکن اس کے ساتھ اپنے جاسوس لگا دیئے۔ ان میں ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی تھی جس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ پہلی نظر میں ہی حسن کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔ حسن جان نہ سکا کہ وہ خود جو حربہ دوسروں کو ہاتھ میں لینے کے استعمال کیا کرتا ہے وہی حربہ اس پر استعمال ہو رہا ہے۔

حسن بن صباح کی حکمرانوں نے ایسی پذیرائی کی جیسے وہ آسمان سے اترا ہوا فرشتہ ہو۔ اس نے وہاں در پردہ اپنا ایک گروہ بنانا شروع کر دیا اور اس لڑکی کو بھی اپنے مقاصد اور مفادات کے لئے استعمال کیا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے حکمرانوں کو یہ مشورے دینے شروع کر دیئے کہ وہ سلجوقی سلطنت پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں۔ انہیں وہ اس قسم کی پیشگوئیاں سناتا تھا کہ وہ کامیاب ہو جائیں گے اور وہ خود ایک فرشتہ بن کر مصر میں آیا ہے۔

عبیدی حکمران یہی تو دیکھ رہے تھے کہ یہ شخص کیا کرنے آیا ہے۔ وہ دو عالم جنہوں

نے اسے مصر بھیجا تھا وہ بھی واپس مصر آگئے۔ وہ اسماعیلی مبلغ تھے جن کا عبیدی حکومت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا کیونکہ وہ اسماعیلی نہیں تھے۔ ایک روز حسن بن صباح ان عالموں کے بلاوے پر ان سے ملنے چلا گیا۔ جاسوسوں نے حکمرانوں کو بتا دیا۔ اس دوران جاسوسوں نے حکمرانوں کو یہ بھی اطلاعیں دی تھیں کہ اس شخص کی کارروائیاں صرف مشکوک ہی نہیں بلکہ خطرناک بھی معلوم ہوتی ہیں۔

حسن بن صباح کے متعلق صحیح اطلاعیں تو اس لڑکی نے دیں جسے اس کے ساتھ لگایا گیا تھا اور جس نے یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ حسن بن صباح کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے۔

حکمرانوں کے لئے یہی کافی تھا اور وہ یہی معلوم کرنا چاہتے تھے۔ ایک رات حسن اس لڑکی کو پاس بٹھائے شراب پی رہا تھا کہ اس کے کمرے کا دروازہ بڑی زور سے کھلا اور دو آدمی اندر آئے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں تھیں۔ انہوں نے حسن بن صباح کو ہتھکڑیوں میں جکڑ لیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے اور پھر اسے پیادہ چلاتے قید خانے تک لے گئے۔ تب اسے بتایا گیا کہ سلطان وقت کے حکم سے اسے قید خانے میں ڈالا جا رہا ہے اور یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ اسے کب رہائی ملے گی یا رہائی ملے گی بھی یا نہیں۔

مؤرخ لکھتے ہیں کہ اس نے قید خانے کے دروازے پر کھڑے ہو کر نعرہ لگایا —

"مجھے قید کرنے والو! تمہاری تباہی اور بربادی کا وقت آگیا ہے"۔

اسے قید خانے میں تو دھکیل دیا گیا اور پھر ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا لیکن جس طرح اس نے تباہی کا نعرہ لگایا تھا وہ ایسا تھا کہ سننے والوں پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ یہ خبر حکمران تک پہنچ گئی۔

وہ جو کہتے ہیں کہ مقدر شیطان کو بڑی ڈھیل دیتا ہے وہ حسن بن صباح کے معاملے میں بالکل صحیح ثابت ہوئی۔ اسے جس قید خانے میں بند کیا گیا تھا اس کا نام قلعہ دمیاط تھا۔ یہ ایک قدیم قلعہ تھا۔ ہوا یوں کہ جس رات حسن بن صباح کو اس قید خانے میں پھینکا گیا، اسی رات اس قلعہ کا سب سے بڑا برج گر پڑا۔ یہ تو کسی نے بھی نہ دیکھا کہ برج کے گرنے کی وجہ کیا ہے، سب پر یہ خوف طاری ہو گیا کہ یہ حسن بن صباح کی بددعا کا نتیجہ ہے۔ سلطان مصر کو اطلاع ملی تو اس نے حکم دیا کہ اس شخص کو مصر سے نکال دیا جائے۔

اتفاق سے ایک بحری جہاز کسی دور کے سفر پر روانہ ہو رہا تھا۔ تاریخ کے مطابق،

اس کے تمام مسافر عیسائی تھے۔ حسن بن صباح کے ساتھ اُس کے دو آدمی بھی تھے جو اُس کے ساتھ ہی آئے تھے۔ جہاز ساحل سے بہت دُور سمندر کے درمیان پہنچا تو بڑا ہی تیز و تند طوفان آگیا۔ بادبان اُڑنے لگے پانی جہاز کے اندر آنے لگا اور ہر لمحہ یہ خطرہ تھا کہ جہاز ڈوب جائے گا۔

جہاز کے عملے اور مسافروں میں بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ ہر کوئی جہاز میں سے پانی باہر نکالنے میں مصروف تھا۔ کچھ لوگ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھائے جہاز اور مسافروں کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ صرف حسن بن صباح تھا جو ایک جگہ بڑے آرام سے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔ جہاز کے کپتان نے اسے دیکھ لیا۔

"کون ہو تم!" — کپتان نے حسن بن صباح کو ڈانٹتے ہوئے کہا — "سب لوگ مصیبت میں گرفتار ہیں اور تم یہاں بیٹھے ہنس رہے ہو۔ اٹھو اور کوئی کام کرو"۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں" — حسن بن صباح نے بڑے آرام سے کہا — "طوفان گذر جائے گا۔ نہ جہاز کو کوئی نقصان پہنچے گا نہ کوئی مسافر زخمی یا ہلاک ہو گا۔ مجھے خدا نے بتا دیا ہے"۔

کچھ ہی دیر بعد طوفان تھم گیا۔ جہاز کو کوئی نقصان نہ پہنچا۔ تمام مسافر زندہ اور سلامت تھے۔ جہاز کے کپتان کے لئے یہ ایک معجزہ تھا۔

"تم کون ہو؟" — کپتان نے حسن بن صباح سے پوچھا۔

"میں طوفان لا بھی سکتا ہوں روک بھی سکتا ہوں" — حسن بن صباح نے جواب دیا۔

"میں جہاز رانی میں بوڑھا ہو گیا ہوں" — کپتان نے کہا — "میں نے ایسے شدید طوفان میں سے کبھی کوئی جہاز ٹھیک ٹھاک نکلتے نہیں دیکھا۔ یہ ایک معجزہ ہے کہ میرا جہاز اس طوفان سے نکل آیا ہے"۔

"یہ معجزہ میرا ہے" — حسن بن صباح نے کہا۔

"میں تمہیں کچھ انعام دینا چاہتا ہوں" — کپتان نے کہا — "کہو کیا انعام دوں!"

"اگر انعام دینا ہے تو ایک کام کرو" — حسن بن صباح نے کہا — "جہاز کا رخ موڑ دو اور مجھے حلب پہنچا دو۔ ایسا ہو سکتا ہے کہ میں جہاز میں موجود رہا تو ایک بار پھر طوفان

آجائے۔"

کپتان بہت ہی خوف زدہ تھا۔ اُس نے جہاز کا رخ موڑا اور حلب کا رخ کر لیا۔ حلب پہنچ کر حسن بن صباح اور اُس کے دو ساتھیوں کو اتار دیا۔

"یہ بتاؤ حسن!" — اُس کے ساتھی نے پوچھا — "تمہیں کس طرح پتہ چل گیا تھا کہ جہاز طوفان سے خیریت سے نکل آئے گا؟"

"یہ تو ذرا عقل سے کام لو" — حسن بن صباح نے کہا — "اگر جہاز ڈوب جاتا تو مجھے یہ کہنے کے لئے کوئی بھی زندہ نہ رہتا کہ میری پیشگوئی غلط نکلی ہے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ طوفان گزر گیا تو سب پر میری دھاک بیٹھ جائے گی اور پھر میں کپتان سے اپنی یہ بات منوا لوں گا کہ مجھے ملک شام کی بندرگاہ حلب پہنچا دے۔ ایسے ہی ہُوا۔ ہمارا کام ہو گیا۔"

حسن بن صباح حلب سے بغداد گیا اور ایک پھر اصفہان جا پہنچا۔ وہاں سے اس کا جو سفر شروع ہُوا وہ ایسے پُراسرار واقعات کا تسلسل ہے جس پر تاریخ آج تک محو حیرت ہے۔

داستان گو نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح جہاز سے حلب اترا اور وہاں سے بغداد اور بغداد سے اصفہان پہنچا۔

کوئی غلط فہمی نہ رہے اس لئے داستان گو داستان کو ذرا پیچھے لے جاتا ہے۔ پہلی بات یہ ہے کہ حلب بندرگاہ نہیں۔ بندرگاہ انطاکیہ تھی جہاں جہاز لنگر انداز ہوا اور حسن بن صباح وہاں اترا تھا۔ حلب وہاں سے ساٹھ میل دور ہے۔ حلب سے وہ بغداد گیا۔ یہ چار سو میل کی مسافت ہے۔ بغداد سے وہ اصفہان گیا۔ یہ فاصلہ بھی چار سو میل ہے۔ اس طرح حسن بن صباح نے انطاکیہ سے اصفہان تک آٹھ سو میل سفر کیا تھا۔

گھوڑے یا اونٹ کی پیٹھ پر عام رفتار سے چلنے سے یہ ایک مہینے کا سفر تھا۔ تیز رفتار سے جلدی بھی طے ہو سکتا تھا لیکن حسن بن صباح اپنی منزل اصفہان تک چھ ماہ بعد پہنچا تھا۔

اسے اصفہان تک پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ اسے جلدی صرف یہ تھی کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے زیر اثر لے لے اور ان کی عقل پر اس طرح قابض ہو جائے کہ بلا سوچے سمجھے وہ اس کے اشاروں پر ناچیں۔ آگے چل کر حالات بتائیں گے کہ حسن بن صباح کے ذہن میں "اشاروں پر ناچنا" مشہور عام محاورہ ہی نہیں تھا، وہ اپنے پیروکاروں کو دیوانگی یا پاگل پن کے اس مقام پر لے جانا چاہتا تھا جہاں وہ کسی سے کہے کہ اپنے آپ کو ہلاک کر دو تو وہ اپنا خنجر اپنے ہی دل میں اتار لے۔ حسن بن صباح اپنے پیروکاروں کو جو فدائین کہلاتے تھے اس مقام پر لے آیا تھا اور اس نے یہ مظاہرے کر کے بھی دکھا دیئے اور اپنے دشمنوں کو حیرت میں ہی نہیں بلکہ خوف میں مبتلا کر دیا تھا۔

حسن بن صباح کی سوانح حیات افسانے سے زیادہ دلچسپ اور طلسم ہوشربا سے زیادہ حسین اور پُراسرار ہے۔

کوئی بھی انسان صرف اس صورت میں سنسنی خیز، پُراسرار اور چونکا دینے والی داستان کا ہیرو بنتا ہے جب بنی نوع انسان کی محبت میں وہ دیوانہ ہو جاتا ہے یا وہ انسان ایسا بنتا ہے جس کے دل میں بنی نوع انسان کی محبت کا شائبہ تک نہ رہے اور اسے صرف اپنی ذات سے محبت ہو اور وہ آسمان میں اور زمین پر، سورج، چاند اور ستاروں میں صرف اپنی ذات کو دیکھ رہا ہو اور ساری کائنات کو اپنے تابع کرنا چاہتا ہو۔

ابتداء میں بیان ہو چکا ہے کہ ایسا انسان، عورت ہو یا مرد، خیر سگالی اور پیار و محبت کے

جذبے سے عاری ہوتا ہے۔ اس کا دل ابلیس کا آشیانہ ہوتا ہے لیکن وہ اپنے شکار کے لئے پیار و محبت کا جال پھیلاتا، خیر و برکت اور جذبہ ایثار کی ایسی اداکاری کرتا ہے کہ بتوں کو بھی موم کر لیتا ہے۔

یہ ہے ابلیسیت کا حسن اور شر کی سحر انگیزی!

اللہ تبارک و تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا ہے:

"انہیں باطل (اور بیہودہ باتوں) میں پڑا رہنے دو اور انہیں اپنا کھیل کھیل لینے دو اس دن تک جس دن کا ان کے ساتھ وعدہ کیا گیا ہے" —

(سورہ المعارج۔ آیت 42)

حسن بن صباح اس دن سے پہلے پہلے جس دن کا اللہ نے وعدہ کیا ہے، اپنے عزائم پورے کرنے کی کوشش میں تھا۔ وہ جانتا تھا یہ حساب کا اور عذاب کا دن ہو گا۔

O

حسن بن صباح کو جس طرح مصر سے عبیدیوں نے نکالا اور جس طرح بحری جہاز طوفان کی لپیٹ میں آ کر نکلا اور جس طرح جہاز کے کپتان نے حسن بن صباح کو انعام کے طور پر شام کے ساحل پر اتارا، وہ پچھلے باب میں تفصیل سے بیان ہو چکا ہے۔ وہاں سے تاریخ کی یہ پُراسرار اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان یوں آگے چلتی ہے کہ انطاکیہ کی بندرگاہ میں اترنے والا اکیلا حسن بن صباح نہیں تھا۔ اس کے ساتھ وہ اس کے اپنے ساتھی تھے جو اس کے رازدار، ہمدرد اور بہی خواہ تھے، اور سات آٹھ آدمی جن میں ایک جوان عورت بھی تھی، حسن بن صباح کے ساتھ انطاکیہ اتر گئے تھے۔

ان سات آٹھ آدمیوں نے اس بندرگاہ پر اترنا تھا جو جہاز کی منزل تھی اور وہاں سے ملک شام جانا تھا۔ ان کی خوش قسمتی کہ حسن بن صباح نے جہاز کا رخ شام کی طرف کروا لیا اور وہ پیدل سفر سے بچ گئے۔

ان کے ساتھ جو عورت تھی وہ اپنا چہرہ نقاب میں رکھتی تھی۔ اس کی صرف پیشانی اور آنکھوں پر نقاب نہیں ہوتا تھا۔ اس کی پیشانی سفیدی مائل گلابی تھی جس پر ریشم کی باریک تاروں جیسے چند ایک بے ترتیب بال بہت ہی بھلے لگتے تھے۔ اس کی آنکھیں غزال جیسی تھیں جن میں خمار کا سا تاثر تھا جو ان آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے والے کو مسحور کر لیتا تھا۔ اس کے کھڑے قد میں اور چال ڈھال میں جاذبیت تھی جو ایسا

تاڑ کر یہ کوئی عام عورت نہیں اور اس کا تعلق کسی قبیلے کے سردار خاندان سے یا کسی بڑے ہی امیر کبیر تاجر خاندان سے ہے۔

یہ سب آدمی سفر کی بندرگاہ سکندریہ سے انطاکیہ تک حسن بن صباح کے ہمسفر رہے تھے۔ انہوں نے اتنے زیادہ طوفان میں حسن بن صباح کو پرسکون بیٹھے اور مسکراتے دیکھا تھا اور وہ اسے پاگل سمجھتے تھے جسے یہ احساس تھا ہی نہیں کہ جہاز ڈوبنے والا ہے اور کوئی بھی زندہ نہیں رہے گا۔ پھر انہوں نے حسن بن صباح کی یہ پیش گوئی سنی تھی کہ جہاز اس طوفان سے بخیر و خوبی گزر جائے گا۔

جہاز بپھرے ہوئے سمندر کی پہاڑوں جیسی طوفانی موجوں پر اوپر کو اٹھتا گرتا آخر اس طوفان سے نکل گیا۔ حسن بن صباح کے دونوں آدمیوں نے تمام مسافروں کو بتایا کہ جہاز کو اس برگزیدہ درویش نے طوفان سے نکالا ہے۔ مسافروں نے حسن بن صباح کے ہاتھ چومے اور اس کے آگے رکوع میں جاکر تعظیم و تکریم پیش کی تھی۔

یہ سات آٹھ آدمی تو حسن بن صباح کے گرویدہ ہو گئے تھے۔ سب سے زیادہ فائدہ تو انہیں پہنچا تھا۔ یہ لوگ [illegible] سے بچ گئے تھے۔

○

انطاکیہ میں انہیں رکنا پڑا۔ یہ سرائے میں چلے گئے۔ حسن بن صباح اور اس کے دونوں ساتھیوں نے الگ کمرہ لے لیا اور باقی کوئی ایک بڑے کمرے میں چلے گئے۔ اس عورت اور اس کے خاوند کا کمرہ الگ تھا۔

حسن بن صباح اور اس کے ساتھی نہا چکے تھے اور اب انہوں نے سرائے کے لنگر سے کھانا لینے جانا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ ایک آدمی نے دروازہ کھولا۔ سرائے کا مالک آیا تھا۔

"کیا میں خوش نصیب نہیں کہ آپ نے مجھے میزبانی کی سعادت عطا کی ہے؟" سرائے کے مالک نے کہا — "میں سرائے کا مالک ابو عکار ثقفی ہوں۔ ابھی آپ کے مسافروں نے مجھے اپنے بحری سفر کی داستان سنائی ہے۔ خدا کی قسم! جہاز میں آپ نہ ہوتے تو یہ لوگ مجھے اس طوفان کی کہانی سنانے یہاں نہ آتے"۔

"اوہ ثقفی!" — حسن بن صباح نے کہا — "بیٹھ کر بات کرو..... یہ تو بتاؤ ایک ثقفی اپنے وطن سے اتنی دور کیوں چلا آیا ہے؟"

"سنا ہے میرے آباؤ اجداد حجاج بن یوسف سے بدسلوکی مول لے بیٹھے تھے" — ابو عکار نے جواب دیا — "ان میں سے کچھ قتل کر دیے گئے، کچھ بھاگ کر وطن سے دور چلے گئے اور میرا کوئی بزرگ ادھر آنکلا۔ یہ سرائے اس نے تعمیر کی تھی جو ورثے میں مجھ تک پہنچی ہے"۔

"کیا اس سرائے میں صرف مسلمان ٹھہرا کرتے ہیں؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"نہیں پیرو مرشد!" — ابو عکار نے جواب دیا — "اس سرائے کے دروازے ہر کسی کے لئے کھلے ہیں۔ یہ سرائے دنیا کی مانند ہے۔ یہاں ہر مذہب، ہر رنگ اور ہر نسل کے لوگ آتے ہیں، کچھ دن گزارتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ دنیا کی طرح اس سرائے میں بھی آمدورفت لگی رہتی ہے۔ آپ جیسا ولی اللہ اور غیب کا بھید جاننے والا مدتوں بعد آیا ہے..... کیا میں مطلب کی بات نہ کر لوں؟"

"اجازت کی ضرورت نہیں" — حسن بن صباح نے کہا۔

"آج رات کا کھانا میری طرف سے قبول فرمائیں" — ابو عکار نے کہا — "اور میں نے آپ کے لئے الگ کمرہ تیار کیا ہے۔ آپ اسی کمرے میں آجائیں"۔

کچھ دیر بعد حسن بن صباح اسی کمرے میں اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھا تھا۔ کھانا بہت ہی پرتکلف تھا۔ تین چار اور اجنبی بھی مدعو تھے۔ یہ ایک کشادہ کمرہ تھا جسے رنگا رنگ ریشمی پردوں اور فانوسوں سے سجایا گیا تھا۔ آدھے سے زیادہ کمرہ خالی تھا۔ دیوار سے دیوار تک دلکش رنگوں والا قالین بچھا ہوا تھا۔ دسترخوان کمرے کے وسط میں نہیں بلکہ ایک طرف چوڑائی والی دیوار کے ساتھ بچھایا گیا تھا۔ دیوار کے ساتھ گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ پیچھے دیوار کے ساتھ ایک قالین لٹک رہا تھا جس پر ہرے بھرے جنگل کا منظر بنا ہوا تھا اور اس میں ایک شفاف ندی بہتی دکھائی گئی تھی۔

مختصر یہ کہ یہ شاہانہ انتظام اور یہ عالیشان ضیافت ایک اعزاز تھا جو حسن بن صباح کو دیا گیا تھا۔

"میں آپ کے مزاج سے واقف نہیں" — سرائے کے مالک نے حسن بن صباح سے کہا — "آپ کے ذوق کا بھی مجھے کچھ پتہ نہیں۔ گستاخی ہی نہ کر بیٹھوں۔ کیا آپ رقص، گانا یا صرف سازوں کی موسیقی پسند کریں گے؟"

"تم نے مجھے کیا سمجھ کر یہ بات پوچھی ہے؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ایک برگزیدہ ہستی....!" — سرائے کے مالک نے جواب دیا — "اللہ کے اتنا قریب آپ ہیں ا، ہم جیسے گنہگار تصور میں بھی نہیں لا سکتے"۔

"اللہ نے کسی بندے پر کوئی نعمت حرام نہیں کی" — حسن بن صباح نے کہا۔ "رقاصہ کے فن سے لطف اندوز ہونا گناہ نہیں' اس کے جسم کو اپنے قبضے میں لے کر اس سے لطف اور لذت حاصل کرنا بہت بڑا گناہ ہے"۔

"کیا اسلام نیم برہنہ رقاصہ کا رقص دیکھنے کی اجازت دیتا ہے؟" — سرائے کے مالک نے پوچھا۔

"ہاں!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "اسلام جہاد میں ہر مسلمان سے جان کی قربانی مانگتا ہے اور مسلمان نعرے لگاتے ہوئے جانوں کی قربانی دیتے ہیں اس لئے اسلام ہر مسلمان کو دنیا کی ہر نعمت اور ہر تفریح سے لطف اٹھانے کی اجازت دیتا ہے"۔

"ہم نے آج تک جو سنا ہے....."

"وہ اسلام کے دشمنوں نے مشہور کیا ہے" — حسن بن صباح نے اپنے میزبان کی بات کاٹتے ہوئے کہا — "یہودیوں اور نصرانیوں نے دیکھا کہ اسلام تھوڑے سے عرصے میں آدھی دنیا میں مقبول ہو گیا ہے تو انہوں نے امام اور خطیب بن کر یہ بے بنیاد بات پھیلا دی کہ اسلام صرف قربانیاں مانگتا ہے اور دیتا کچھ بھی نہیں اور اسلام میں سوائے پابندیوں کے اور کچھ بھی نہیں"۔

تاریخ میں آیا ہے کہ حسن بن صباح اپنے آپ کو اسلام کا علمبردار کہلاتا تھا۔ وہ مسلمانوں کو اسلام کے نام پر مشتعل کر کے انہیں اسلام کے خلاف استعمال کرتا تھا۔ یہ ضرورت اُسے اس لئے پیش آئی تھی کہ اُس نے اپنی سرگرمیوں اور اپنے عزائم کے لئے جو علاقہ منتخب کیا تھا وہ مسلمانوں کی غالب اکثریت کا علاقہ تھا۔

سرائے کے مالک نے حسن بن صباح کی یہ باتیں سنیں تو اُس نے کھانے پر حاضری دینے والے ایک ملازم کی طرف اشارہ کیا۔ ملازم بڑی تیزی سے باہر چلا گیا۔ فوراً ہی وہ واپس آگیا۔ اُس کے پیچھے چار پانچ سازندے ساز اٹھائے کمرے میں آئے اور قالین پر بیٹھ گئے۔

سازوں کی آواز ابھری تو نیم برہنہ رقاصہ یوں کمرے میں داخل ہوئی جیسے جل پری

خلاف ندی میں تیرتی آرہی ہو۔ سازوں کی دھیمی دھیمی آواز سحر بکھار رہی تھی اور نوجوان رقاصہ کا مرمریں جسم ناگن کی طرح بل کھا رہا تھا۔ اُس کے بازو رقص کی اداؤں میں یوں اوپر نیچے اور دائیں بائیں ہو رہے تھے جیسے فردوس بریں کے ایک بڑے ہی حسین پودے کی ڈالیاں ہوا کے جھونکوں سے ہل رہی ہوں۔ فانوسوں کی رنگارنگ روشنیوں کا اپنا ہی ایک حسن تھا۔

دسترخوان پر بیٹھے ہوئے مہمان کھانا بھول گئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نوجوان رقاصہ نے سب کو مسحور کر لیا ہو لیکن حسن بن صباح اس لڑکی کو کسی اور ہی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی جوہری کے اُس وقت کا تاثر تھا جب وہ ہیرا یا کوئی قیمتی پتھر پرکھ رہا ہوتا ہے۔

اس ضیافت' اس رقاصہ پھر ایک مغنیہ اور سازندوں نے اس رات کو الف لیلہ کی ایک ہزار ایک راتوں جیسی ایک رات بنا دیا تھا۔

○

رات آدھی گذر گئی تھی جب حسن بن صباح ضیافت سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں داخل ہوا۔ سرائے کا مالک بھی اس کے پیچھے کمرے میں چلا گیا۔ حسن بن صباح پلنگ پر بیٹھ گیا۔

"پیر و مرشد!" — سرائے کے مالک نے نماز کی طرح اپنے دونوں ہاتھ پیٹ پر باندھ کر کہا — "کیا میں آپ کی خدمت میں کوتاہی تو نہیں کر رہا؟"

"یہ میرا مطلب نہیں تھا" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے تم بوریئے پر بٹھا کر اور روٹی پر دال رکھ کر دے دیتے تو بھی میں اللہ کا شکر ادا کرتا کہ اس کے ایک بندے نے مجھ پر کتنا بڑا کرم کیا ہے..... اب یہ بتا دو کہ تمہارے دل میں کوئی خاص مراد ہے یا تم کسی پریشانی میں مبتلا ہو!"

"اے طوفانوں کا منہ پھیر دینے والے امام!" — سرائے کے مالک نے کہا — "پہلے اس شہر میں صرف میری سرائے تھی اور تمام مسافر میری سرائے میں آتے تھے۔ تھوڑے عرصے سے دو یہودیوں نے ایک سرائے کھول لی ہے۔ وہ مسافروں کو شراب بھی پیش کرتے ہیں لڑکیاں بھی۔ اس سے میری آمدنی بہت کم ہو گئی ہے۔ آپ کو اللہ نے ایسی طاقت عطا کی ہے....."

"فن کا بیڑہ غرق کرتا ہے یا اپنا بیڑہ پار لگاتا ہے؟" — حسن بن صباح نے اُس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"یہ فیصلہ آپ ہی کر سکتے ہیں حضور؟" — سرائے کے مالک نے کہا — "میں تو چاہتا ہوں کہ میری آمدنی پہلے جتنی ہو جائے"۔

"ہو جائے گی" — حسن بن صباح نے کہا — "کل ایک کالا بکرا ذبح کر دو جو چھوٹا سا ہو۔ اس کے دونوں شانوں کی ہڈیاں میرے پاس لے آنا..... اور مجھے یہ بتاؤ کہ یہ رقاصہ کس کی ملکیت ہے؟"

"ایک بوڑھی رقاصہ کی بیٹی ہے یا ولی!" — سرائے کے مالک نے جواب دیا — "زیادہ تر میں ہی اسے اپنی سرائے میں خاص مہمانوں کے لئے بلایا کرتا ہوں..... کیا حضور کے دل کو یہ اچھی لگی ہے؟"

"ہاں!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "لیکن اس مقصد کے لئے نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ اگر تم اس کی ماں کو بلاؤ تو میں اُسے اس لڑکی کے متعلق کچھ بتانا بہت ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ اس لڑکی کو صرف جسم سمجھتی ہو گی لیکن یہ کمسن لڑکی جسم سے کہیں زیادہ کچھ اور ہے"۔

سرائے کے مالک نے ایک ملازم کو بلا کر کہا کہ رقاصہ اور اس کی ماں کو یہاں لے آئے۔ وہ دونوں ابھی گئی نہیں تھیں۔ اطلاع ملتے ہی آ گئیں۔ سرائے کا مالک انہیں پہلے ہی حسن بن صباح کے متعلق بتا چکا تھا کہ یہ کوئی امام یا ولی ہے اور اس کے ہاتھ میں کوئی ایسی روحانی طاقت ہے جو طوفانوں کو روک دیتی ہے۔ رقاصہ اور اس کی ماں نے بے تابی سے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ حسن بن صباح سے ملنا چاہتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ رہی تھیں کہ امام نے خود ہی انہیں بلا لیا تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوئیں تو حسن بن صباح نے دیکھا کہ رقاصہ ابھی رقص کے لباس میں تھی۔ یہ کوئی لباس نہیں تھا کمر سے اس نے ریشم کی رنگا رنگ رسیاں لٹکا رکھی تھیں۔ ان رسیوں نے اس کا کمر سے نیچے جسم ڈھانپ رکھا تھا لیکن وہ چلتی تھی یا ناچتی تھی تو اس کی ٹانگیں رسیوں سے باہر آ جاتی تھیں۔ اُس کے سینے کا کل لباس ایک انگیا تھی۔ اُس کے شانوں اور پیٹھ کو اُس کے نرم و ملائم بالوں نے ڈھانپ رکھا تھا جو اُس سنو کھلے چھوڑے ہوئے تھے۔

[ستمے جسم کا طلبگار] — حسن بن صباح نے کہا — "میں تیرے جسم کا طلبگار ہو کر آ لڑکی!" — حسن بن صباح نے کہا — "میں تیرے جسم کا طلبگار

مستور ہو کر آ لڑکی!" — حسن بن صباح نے کہا — "میں تیرے جسم کا طلبگار
نہیں میں تیری روح کو برہنہ کر کے دیکھوں گا اور تجھے بھی دکھاؤں گا۔ تو اپنی روح سے
انجان ہے" — اُس نے رقاصہ کی ماں سے کہا — "جا اسے ایسے کپڑے پہنا کے لا کہ
اس کے صرف ہاتھ نظر آئیں اور کچھ چہرہ نظر آئے"۔
ماں بیٹی چلی گئیں۔ سرائے کا مالک وہیں بیٹھا رہا۔
"تمہارا کام ہو جائے گا" — حسن بن صباح نے اُسے کہا — "جب یہ ماں بیٹی
چلی جائیں تو تم چلے جانا اور صبح میرے پاس آنا"۔
سرائے کا مالک بھی چلا گیا۔

○

رقاصہ اور اُس کی ماں آ گئیں۔ رقاصہ نے ویسا ہی لباس پہن رکھا تھا جیسا حسن بن صباح نے اسے کہا تھا۔ اس لباس نے اس کے چہرے کے نقش و نگار میں سحر انگیز نکھار پیدا کر دیا تھا۔ وہ نوجوان تھی لیکن اب وہ کمسن لگتی تھی..... معصوم سی لڑکی!

"کیا تجھے یہ اس لباس میں اچھی نہیں لگتی؟" — حسن بن صباح نے رقاصہ کی ماں سے پوچھا۔

"ہاں مرشد" — ماں نے جواب دیا — "یہ مجھے اسی لباس میں اچھی لگتی ہے"۔

"اس لئے یہ اچھی لگتی ہے کہ یہ ایک پاک روح ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "پاک جسم نہیں۔ اس کی قیمت پہچان"۔

"میرے مرشد!" — رقاصہ کی ماں نے کہا — "میں بھٹکی ہوئی ایک بے آسرا عورت کیا جانوں، ہم ماں بیٹی کا کل کیسا ہو گا۔ ہم نے آپ کی کرامت سنی تو سرائے کے مالک سے التجا کی یہ مجھے آپ کے حضور پیش کر دے اور میں آپ سے پوچھوں کہ بیٹی کو اسی پیشے میں رکھوں یا کوئی اور راستہ دیکھوں۔ مجھے آنے والے وقت کی کچھ خبر دے دیں"۔

حسن بن صباح نے سحر اور علم نجوم میں دسترس حاصل کر لی تھی۔ اُس نے نوجوان رقاصہ کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پھیلایا اور اس کی آڑی ترچھی لکیریں دیکھنے لگا۔ رقاصہ نے اس انتظار میں حسن بن صباح کے چہرے پر نظریں گاڑ دی تھیں کہ خدا کا یہ برگزیدہ انسان جو بحری جہاز کو ایک خوفناک طوفان کے جبڑوں سے صحیح و

سلامت نکال لایا تھا' وہ اس کے ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر کیا پیش گوئی کرتا ہے۔

حسن بن صباح کے چہرے کے تاثرات میں تبدیلیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک بار اُس نے اپنا سر یوں پیچھے کیا جیسے رقاصہ کی ہتھیلی کی کوئی لکیر سانپ بن گئی ہو۔ رقاصہ اُس کی ماں بھی چونک پڑیں۔

"کیا دیکھا ہے میرے مُرشد!" — سلمیٰ نے سہمی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"پردے اُٹھ رہے ہیں" — حسن بن صباح نے اس عورت کی طرف دیکھے بغیر زیر لب کہا۔

پھر اس نے رقاصہ کا ہاتھ چھوڑ دیا اور اس کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لے کر ذرا اوپر اُٹھایا۔

"آنکھیں پوری کھلی رکھو" — اُس نے رقاصہ سے کہا۔

اُس کی آنکھوں نے رقاصہ کی آنکھوں کو جکڑ لیا۔ حسن بن صباح نے دونوں انگوٹھوں سے رقاصہ کی کنپٹیاں آہستہ آہستہ ملنی شروع کر دیں۔ وہ زیر لب کچھ کہہ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد رقاصہ نے دھیمی سی آواز میں کہا — "میں نے سیاہ پردے کے پیچھے دیکھ لیا ہے..... میں جاؤں گی..... یہ جسم نہ گیا تو میں اس سے آزاد ہو کر وہاں پہنچ جاؤں گی"۔

"یہ جسم تمہارے ساتھ جائے گا" — حسن بن صباح نے کہا۔

"یہ جسم میرے ساتھ جائے گا" — رقاصہ نے کہا۔

"کیا کرو گی اس جسم کو؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"یہ جسم بکنے کا نہیں" — رقاصہ نے کہا — "یہ دو سروں کو نچائے گا"۔

"تمہیں ایک قلعہ نظر آ رہا ہے" — حسن بن صباح نے کہا۔

رقاصہ خاموش رہی۔ حسن بن صباح نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے چھ سات مرتبہ کہا — "تمہیں ایک قلعہ نظر آ رہا ہے"۔

"ہاں!" — رقاصہ نے کہا — "مجھے ایک قلعہ نظر آ رہا ہے"۔

"اس قلعے میں تم اپنے آپ کو دیکھ رہی ہو" — حسن بن صباح نے خوابناک سی آواز میں کہا اور یہ الفاظ چند مرتبہ دہرائے۔

"دیکھ رہی ہوں" — رقاصہ نے بچوں کی طرح چہکتے ہوئے کہا — "میں اپنے آپ کو دیکھ رہی ہوں"۔

"اپنے آپ کو کس شکل میں دیکھ رہی ہو؟"

"چار لڑکیاں ہیں" — رقاصہ نے کہا — "شہزادیاں لگتی ہیں۔ میں انہی جیسے لباس میں ہوں اور ہم سب ایک خوشنما باغ میں اٹکھیلیاں کرتی پھر رہی ہیں"۔

حسن بن صباح نے رقاصہ کا چہرہ چھوڑ دیا اور کچھ دیر اُس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ رقاصہ نے اپنی آنکھیں تیزی سے جھپکیں اور سر جھکا لیا۔ اُس نے جب سر اٹھایا تو اُس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے کبھی حسن بن صباح کو اور کبھی اپنی ماں کو دیکھتی تھی۔ حسن بن صباح مسکرا رہا تھا۔

"میں کہاں چلی گئی تھی؟" — رقاصہ نے حیرت زدہ آواز میں پوچھا — "میں ایک تاریکی میں سے گزری تھی اور آگے کوئی اور ہی دنیا آ گئی تھی"۔

"تمہاری اصل جگہ اُس دنیا میں ہے جو تم نے دیکھی ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "اب تم جہاں ہو یہ ایک فریب اور حسین دھوکہ ہے۔ یہاں تمہارا انجام بہت بُرا ہو گا۔ میرے خدا نے تمہاری قسمت میں بہت اونچا مقام لکھا ہے۔ میں نے تمہیں وہ مقام دکھا دیا ہے..... ماں کو بتاؤ تم نے کیا دیکھا ہے"۔

رقاصہ نے اپنی ماں کو بتایا۔

"لیکن پیرو مُرشد!" — رقاصہ کی ماں نے پوچھا — "ہم اُس مقام تک پہنچ کس طرح سکتی ہیں؟ کیا آپ ہماری راہنمائی اور مدد کر سکتے ہیں؟"

"کر سکتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "لیکن کروں گا نہیں..... میں تمہیں اس کی وجہ بھی بتا رہا ہوں۔ انسان کی فطرت ایسی ہے کہ میں تو انسان ہوں' انسان اللہ کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے بھی مطمئن نہیں ہوتا۔ میں نے دو تین آدمیوں کو اسی طرح ان کے اصل مقام دکھائے اور انہیں وہاں تک پہنچا بھی دیا تھا لیکن تھوڑے ہی عرصے بعد انہوں نے میرے خلاف باتیں شروع کر دیں۔ اب تو میں کسی کو اس کے متعلق کچھ بتاتا نہیں۔ تم عورت ہو اور مجبوریوں نے یا درہم و دینار کے لالچ نے تمہیں غلط اور خطرناک راستے پر ڈال رکھا ہے۔ پھر مجھے تمہاری اس بیٹی کا خیال آتا ہے۔ میں نے اس کا اصل روپ دیکھ لیا ہے۔ تم نے اس پر بہروپ چڑھا دیا ہے۔ میں اسے اس کے

مقام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ تم اس کے ساتھ ہو تو اور تمہیں ہماری کھوئی ہوئی تعظیم اور تکریم ملے گی"۔

"پھر ہم پر کرم کیوں نہیں کرتے یا مرشد!" — ماں نے التجا کی۔

"صرف ایک صورت میں کرم ہو سکتا ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "اپنی سوچیں میرے حوالے کر دو۔ اپنے آپ کو بھی میرے حوالے کر دو"۔

"کر دیا مرشد!" — ماں نے کہا — "آپ جو حکم دیں گے ہم ماں بیٹی مانیں گی"۔

"پھر سن لو!" — حسن بن صباح نے کہا ... "میں جب یہاں سے جاؤں گا تو تم دونوں میرے ساتھ چلو گی"۔

"چلیں گی یا مرشد!" — رقاصہ کی ماں نے کہا۔

"آج کا رقص تمہارا آخری رقص تھا" — حسن بن صباح نے نوجوان رقاصہ سے کہا — "اب تمہاری نئی اور حقیقی زندگی شروع ہو گئی ہے ..... جاؤ اور سو جاؤ ..... صبح سے بیمار پڑ جانا۔ سر کپڑے سے باندھ لینا۔ اس سرائے والا یا دوسرے سرائے کے یہودی تمہیں رقص کے لئے بلانے آئیں تو ہائے ہائے شروع کر دینا جیسے تم اس بیماری سے مری جا رہی ہو۔ میری کہنا کہ انہیں بلاؤ میرا علاج کریں۔ میں آکر کوئی بیماری بتا کر سب کو ڈرا دوں گا کہ اس لڑکی کے قریب کوئی نہ آئے ورنہ اسے بھی یہ بیماری لگ جائے گی"۔

ماں بیٹی چلی گئیں۔ انہیں بتانے والا کوئی نہ تھا کہ اس شخص نے انہیں ایک عمل سے مسحور کر لیا تھا۔ یہ تھا عمل تنویم جسے مغربی دنیا نے اپنی زبان میں ہپناٹزم کا نام دیا ہے۔

حسن بن صباح نے رقاصہ کو اپنے کام کی چیز سمجھ کر اسے ہپناٹائز کر لیا تھا اور رقاصہ کو وہی کچھ نظر آ رہا تھا جو حسن بن صباح اسے دکھانا چاہتا تھا۔

عمل تنویم کا تو اپنا اثر تھا' حسن بن صباح کے بولنے کے انداز کا اپنا ایک اثر تھا جو سننے والے کو مسحور کر لیتا تھا۔ یورپی تاریخ نویسوں نے بھی لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے اپنے آپ میں ایسے اوصاف پیدا کر لئے تھے جو دوسروں کو اپنا گرویدہ بنا لیتے تھے۔ یہ ابلیسی اوصاف تھے۔

رقاصہ اور اس کی ماں کے جانے کے بعد حسن بن صباح کے دونوں ساتھی اس کے کمرے میں آئے۔

"میں نے اپنی ترکش میں ایک اور تیر ڈال لیا ہے" — حسن بن صباح نے فاتحانہ لہجے میں اپنے ساتھیوں سے کہا — "یہ رقاصہ ایسا دانہ ہے کہ عقابوں اور شہبازوں کو بھی جال میں لے آئے گا"۔

"ہمارے ساتھ جا رہی ہے؟" — اس کے ایک ساتھی نے پوچھا۔

"دونوں ہمارے ساتھ جا رہی ہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "انہیں کسی طرح چھپا کر ساتھ لے جانا پڑے گا"۔

"یہ انتظام ہو جائے گا" — دوسرے نے کہا۔

○

دوسرے دن حسن بن صباح کے کمرے کے باہر اسے ملنے والوں کا ایک ہجوم جمع ہو گیا تھا لیکن کسی کو کمرے میں جانے نہیں دیا جا رہا تھا۔ لوگوں کو بتایا گیا تھا کہ "امام" عبادت میں مصروف ہیں۔

کچھ دیر بعد ایک آدمی اور ایک عورت کو اندر جانے کی اجازت دی گئی۔ یہ میاں بیوی تھے اور یہ سکندریہ سے اتفاقیہ تک حسن بن صباح کے ہمسفر تھے۔ یہ وہی عورت تھی جس کا پہلے ذکر آیا ہے کہ چہرہ نقاب میں رکھتی تھی۔ صرف پیشانی اور آنکھوں پر نقاب نہیں تھا۔ پیشانی اور آنکھوں سے پتہ چلتا تھا کہ عورت حسین ہے۔ اس کے کپڑے قد میں کشش تھی۔ اس کی چال ڈھال میں ایسا جلال سا تھا جس سے لگتا تھا جیسے یہ کسی سردار خاندان کی خاتون ہو۔ بہرحال وہ کوئی معمولی عورت نہیں لگتی تھی۔

کمرے میں جا کر اس عورت کے خاوند نے حسن بن صباح کے آگے رکوع میں جا کر مصافحہ کیا۔ وہ پیچھے ہٹا تو عورت نے آگے بڑھ کر حسن بن صباح کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پہلے آنکھوں اور پھر ہونٹوں سے لگایا پھر اس کا ہاتھ احترام سے اس کی گود میں رکھ دیا۔

"بیٹھ جاؤ میرے ہمسفرو!" — حسن بن صباح نے کہا اور خاوند سے پوچھا — "تم لوگ کہاں گئے تھے اور کس منزل کے مسافر ہو؟"

"ہماری منزل رے ہے" — خاوند نے جواب دیا — "میں اصلاً اصفہانی ہوں... خلق اصفہانی میرا نام ہے ..... رزق کے پیچھے بہت سفر کیا ہے اور اللہ نے جھولی بھر کے رزق دیا ہے ..... دوسری تلاش علم کی ہے۔ علم کے حصول کے لئے بہت سفر کیا ہے

تھا مصر میں دو عالم ہیں جن کے پاس علم کا سمندر ہے۔ میں اپنی اس بیوی کو ساتھ لے کر مصر گیا تھا۔ ان علماء سے ملا لیکن انہوں نے علم کو اپنے ہی ایک نظریئے میں ڈھال دیا ہے"۔

"وہ عبیدی ہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "اور ظاہر کرتے ہیں کہ اہلِ بیت ہیں.... تم کس فرقے اور کس عقیدے کے آدمی ہو؟"

"یا ولی!" — حافظ اصفہانی نے کہا — "میں ایک اللہ کو مانتا ہوں جو وحدہٗ لاشریک ہے' اس کے آخری کلام کو مانتا ہوں جو قرآن ہے اور اللہ کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو مانتا ہوں جن کے ذریعے اللہ کا کلام ہم تک پہنچا۔ اس سے زیادہ مجھے کچھ علم نہیں کہ میں کون سے فرقے سے تعلق رکھتا ہوں"۔

"اور اب رے کیوں جا رہے ہو؟"

"ابو مسلم رازی سے ملوں گا" — حافظ اصفہانی نے جواب دیا — "وہ وہاں امیر ہے۔ اللہ کو ماننے والا حاکم ہے"۔

"اس سے تمہیں کیا حاصل ہو گا؟"

"میں نے اسے کچھ بتانا ہے" — حافظ اصفہانی نے جواب دیا — "میں خلجان گیا تھا۔ وہاں ایک بڑا ہی خطرناک فرقہ سر اٹھا رہا ہے۔ ایک شخص احمد بن عطاش نے خلجان پر قبضہ کر لیا ہے۔ سنا ہے وہ شعبدہ بازی اور سحر کا ماہر ہے۔ سنا تھا کہ قلعہ شاہ در اور خلجان کے درمیان علاقے میں ایک پہاڑی پر اللہ کا ایلچی اُترا تھا اور اس علاقے کے لوگوں نے اسے دیکھتے ہی اللہ کا ایلچی مان لیا ہے۔ اس ایلچی کا نام حسن بن صباح ہے..... وہ آپ کا ہم نام ہے..... بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ آپ کے نام کی توہین ہے۔ آپ اللہ کے محبوب اور برگزیدہ بندے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ کو ولی کہوں یا امام کہوں"۔

"تم نے اُس کا نام غلط سنا ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "اُس کا نام احسن ابن سبا ہے۔ لوگوں نے اسے حسن بن صباح بنا دیا ہے"۔

"یہ تو بہت ہی اچھا ہے" — حافظ اصفہانی نے کہا — "اس کا صحیح نام سن کر مجھے روحانی اطمینان ہو گیا ہے۔ آپ کے نام کی بے ادبی نہیں ہو رہی۔ سنا ہے اس احسن ابن سبا کی زبان میں اور بولنے کے انداز میں ایسا جادو ہے کہ پتھروں کو بھی موم کر لیتا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اُس نے اور احمد بن عطاش نے لوگوں کی ایک فوج تیار کر

لی ہے۔ یہ باقاعدہ فوج نہیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں رہتے ہیں۔ انہیں تیغ زنی' تیر اندازی' برچھی بازی اور گھوڑ سواری کی تربیت دی جاتی ہے"۔

"کیا تم ان لوگوں کے متعلق ابو مسلم رازی کو بتاؤ گے؟" — حسن بن صباح نے پوچھا

"ہاں یا ولی!" — حافظ اصفہانی نے جواب دیا — "میں تو سلطان ملک شاہ تک بھی پہنچوں گا اور اسے احساس دلاؤں گا کہ وہ اس باطل فرقے کو طاقت سے ختم کرے..... مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بڑی مدت سے یہ لوگ قافلوں کو لوٹ رہے ہیں۔ وہ زر و جواہرات لوٹتے ہیں اور لڑکیوں کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ آٹھ دس سال عمر کی بچیوں کو بھی لے جاتے ہیں۔ انہیں اپنے مذموم مقاصد اور عزائم کے مطابق تربیت دیتے ہیں۔ زر و جواہرات کا استعمال بھی یہی ہوتا ہے"۔

"میں جانتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "وہ بہت خطرناک لوگ ہیں"۔

○

حافظ اصفہانی کو معلوم نہ تھا کہ اس نے جس حسن بن صباح کی باتیں سنی ہیں وہ یہی شخص ہے جسے وہ ولی اور امام کہہ رہا ہے اور احمد بن عطاش اس کا استاد ہے۔ حسن بن صباح حافظ اصفہانی سے یہ باتیں سن کر ذرا سا بھی نہ چونکا نہ اُس نے کسی ردِ عمل کا اظہار کیا' بلکہ حافظ اصفہانی کی باتوں کی تائید کرتا اور احمد بن عطاش پر لعنتیں بھیجتا رہا۔

"اب ایک عرض سن لیں یا ولی!" — حافظ اصفہانی نے کہا — "اجازت ہو تو کہوں"۔

"اجازت کی کیا ضرورت ہے؟" — حسن بن صباح نے کہا — "کہو جو کہنا ہے"۔

"اولاد سے محروم ہوں" — حافظ اصفہانی نے کہا — "پہلی بیوی سے بھی اولاد نہیں ہوئی۔ وہ فوت ہو گئی تو کچھ عرصے بعد میں نے اس کے ساتھ شادی کر لی"۔

"اس کے ساتھ کب شادی کی ہے؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"بارہ تیرہ سال ہو گئے ہیں" — حافظ اصفہانی نے جواب دیا — "اس کا پہلا خاوند ایک قافلے میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا گیا تھا"۔

"کیا اُس سے اس کا کوئی بچہ تھا؟"

"ایک بچی تھی!" — [illegible] نے جواب دیا — "نو دس سال کی تھی۔ ڈاکو اسے اٹھا

لے گئے تھے"۔

"بہت خوبصورت بچی تھی" ـــ حافظ کی بیوی نے کہا ـــ "مجھے اُس سے بہت پیار تھا۔ شاید یہ اُسی کے غم کا اثر ہے کہ میں کوئی بچہ پیدا نہ کر سکی"۔

"اور مجھے اس بیوی سے اتنا پیار ہے کہ میں صرف اولاد کی خاطر دوسری شادی نہیں کروں گا" ـــ حافظ اصفہانی نے کہا ـــ "آپ کو اللہ نے کرامت عطا کی ہے"۔

"چہرے سے نقاب ہٹا دو" ـــ حسن بن صباح نے عورت سے کہا۔

عورت نے چہرہ بے نقاب کیا تو حسن بن صباح کو ایسا دھچکا لگا کہ وہ بدک گیا اور اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ ہو گی کہ یہ عورت غیر معمولی طور پر حسین تھی۔ اس کی عمر زیادہ تھی لیکن اُس کے چہرے پر معصومیت ایسی کہ وہ چوبیس پچیس سال کی جوان لڑکی لگتی تھی۔

حسن بن صباح کے بدک جانے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اسے یوں لگا جیسے شمونہ نے اس کے سامنے اپنا چہرہ بے نقاب کر دیا ہو۔ شمونہ وہ لڑکی تھی جسے حسن بن صباح لے گیا تھا اور اسے اپنی بیوہ بہن بتایا اور نام فاطمہ بتایا تھا۔ وہ نظام الملک کی جگہ وزیراعظم بننے کے لئے اس لڑکی کو استعمال کر رہا تھا کہ بھانڈہ پھوٹ گیا اور اسے اس لڑکی کے ساتھ شہربدر کر دیا گیا تھا۔

اب اس کے سامنے جو چہرہ بے نقاب ہوا تھا وہ اسی لڑکی کا چہرہ تھا جس کا نام شمونہ تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" ـــ حسن بن صباح نے اس سے پوچھا۔

"میمونہ!" ـــ عورت نے جواب دیا۔

حسن بن صباح عام سے دماغ والا انسان نہیں تھا۔ اس نے اپنے دماغ میں ایک طاقت پیدا کر لی تھی جسے تین مؤرخوں نے مافوق العقل کہا ہے۔

"میمونہ!" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "تمہیں واقعی اپنی بیٹی سے بہت محبت تھی۔ اسی لئے تم نے اس کا نام شمونہ رکھا تھا۔ یہ نام تمہارے نام سے ملتا ہے"۔

یہ حسن بن صباح کی قیاس آرائی یا قیافہ شناسی تھی۔ اس عورت کی بیٹی تھوڑے سے اغوا ہوئی تھی اور اس کی بیٹی کی شکل اس کے ساتھ ملتی تھی اس لئے حسن بن صباح نے بڑی گہری سوچ سے ہوا میں تیر چلایا جو ٹھیک نشانے پر جا لگا۔

"یا امام!" ـــ میمونہ نے حیرت زدگی کے عالم میں کہا ـــ "میں نے تو آپ کو اپنی بیٹی کا نام نہیں بتایا تھا!"

"نہیں میمونہ!" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "اگر تمہارے بتانے سے مجھے تمہاری بیٹی کا نام معلوم ہوتا تو پھر میرا کیا کمال ہوا!"

"یا امام!" ـــ میمونہ نے کہا ـــ "میں نے آپ کو امام مان لیا ہے..... آپ کو یہ بھی معلوم ہو گا کہ وہ زندہ ہے یا نہیں' اگر زندہ ہے تو کہاں ہے"۔

حسن بن صباح نے اپنے آپ پر مراقبے کی کیفیت طاری کر لی۔ آنکھیں بند کر لیں۔ ہاتھوں سے عجیب طرح کی حرکتیں کرنے لگا پھر ایک بار اُس نے تالی بجائی۔

"کہاں مر گئے تھے؟" ـــ اُس نے کہا ـــ "میرے سوالوں کے جواب دو..... ہوں..... اچھا..... وہ ہے کہاں؟..... ٹھیک ہے..... ہاں..... تم جا سکتے ہو"۔

"وہ زندہ ہے" ـــ حسن بن صباح نے مراقبے سے بیدار ہو کر میمونہ سے کہا ـــ "اور اُسے رے میں دیکھا گیا ہے"۔

"کیا یہ پتہ چل سکتا ہے کہ رے میں وہ کہاں مل سکتی ہے؟" ـــ میمونہ نے پوچھا۔

"امیر شہر ابو مسلم رازی سے اس کا سراغ مل سکتا ہے" ـــ حسن بن صباح نے جواب دیا ـــ "شمونہ کے ساتھ مجھے ابو مسلم رازی کا چہرہ بھی نظر آیا ہے"۔

کیا حسن بن صباح کو عالم غیب سے اشارہ ملا تھا کہ شمونہ زندہ ہے اور رے میں ہے؟ کیا اس نے کسی پُراسرار عمل کے ذریعے معلوم کر لیا تھا؟

نہیں..... داستان گو پچھلے باب میں اصل حقیقت بیان کر چکا ہے۔ حسن بن صباح نے رے سے مفرور ہوتے وقت حکم دیا تھا کہ شمونہ کو خلجان پہنچا دیا جائے جہاں دوسری لڑکیوں کے سامنے اسے قتل کیا جائے گا لیکن حسن بن صباح کو فرار ہو کر مصر جانا پڑا۔ فرار سے پہلے اسے اطلاع مل گئی تھی کہ شمونہ کہیں بھاگ گئی ہے' پھر اسے یہ اطلاع بھی ملی تھی کہ شمونہ ابو مسلم رازی کے پاس چلی گئی ہے۔

میمونہ یہ سمجھ رہی تھی کہ حسن بن صباح کو مراقبے میں یہ جنات نے بتایا ہے کہ شمونہ اس وقت کہاں ہے۔

"کیا میری بیٹی مجھے مل جائے گی؟" ـــ میمونہ نے پوچھا۔

"ہاں" ـــ حسن بن صباح نے جواب دیا ـــ "مل جائے گی"۔

"یا اللہ!" — میمونہ نے کہا — "آپ یہ بتا دیں کہ میرا کوئی اور بچہ ہو گا یا نہیں"۔

حسن بن صباح ایک بار پھر مراقبے میں چلا گیا۔

"نہیں، نہیں!" — کچھ دیر بعد آنکھیں بند کئے ہوئے وہ اپنے آپ سے باتیں کرنے کے انداز سے بولا — "کچھ کرو..... کوئی طریقہ، کوئی ذریعہ بتاؤ۔ میں انہیں اللہ بچے دینا چاہتا ہوں..... اچھا..... ہاں، بتاتے چلو..... قبر کی نشانی بتاؤ..... ٹھیک ہے"۔

حسن بن صباح نے خاصی دیر بعد آنکھیں کھولیں۔

"ایک بچے کی امید بندھ گئی ہے" — حسن بن صباح نے میمونہ کے خاوند سے کہا — "لیکن میرے جنات نے جو طریقہ بتایا ہے وہ ذرا خطرناک ہے۔ ضروری نہیں کہ اس میں جان چلی جائے۔ میں تمہاری حفاظت کا انتظام کر دوں گا لیکن خطرے کے لئے بھی تمہیں تیار رہنا چاہئے"۔

"آپ طریقہ بتائیں" — حافظ اصفہانی نے کہا۔

"یہ کام تمہیں ہی کرنا پڑے گا" — حسن بن صباح نے کہا — "میں کاغذ پر لکھ کر اور یہ کاغذ تہہ کر کے تمہیں دوں گا۔ دن کے وقت قبرستان میں جا کر کوئی ایسی قبر دیکھنا جو بیٹھ گئی ہو۔ ایک کدال ساتھ لے جانا۔ قبر میں اُتر جانا اور کدال سے اتنی مٹی نکال کر باہر پھینکنا جو تمہارے اندازے کے مطابق تمہارے جسم کے وزن جتنی ہو۔ مٹی دو بالشت چوڑی جگہ سے نکالنا تاکہ گڑھا بنتا چلا جائے۔ یہ گڑھا اُس طرف سے کھودنا ہے جس طرف مُردے کا سر ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے مُردے کی کھوپڑی نظر آ جائے۔ کھدائی ختم کر دینا اور یہ کاغذ کھوپڑی پر رکھ کر کھودی ہوئی مٹی سے گڑھا بھر دینا اور واپس آ جانا۔ اگر کھوپڑی نظر نہ آئے تو یہ اندازہ کر لینا کہ تمہارے جسم کے وزن جتنی مٹی نکل آئی ہے۔ یہ کاغذ گڑھے میں رکھ کر گڑھا مٹی سے بھر کر آ جانا۔ گیارہ دنوں بعد تمہیں میمونہ خوشخبری سنائے گی"۔

حسن بن صباح کے دونوں ساتھی اُس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔

"تم دونوں کو معلوم ہے کون سی قبر موزوں ہے" — اس نے ان دونوں ساتھیوں سے کہا — "صبح اسے ساتھ لے جانا اور قبرستان میں کوئی بہت پرانی اور بیٹھی ہوئی قبر اسے دکھا دینا۔ زرات کو یہ اکیلا جائے گا"۔

حسن بن صباح نے کاغذ کے ایک پرزے پر کچھ لکھا۔ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ کر

پھونکیں ماریں، کاغذ کی کئی تہیں کر کے حافظ اصفہانی کو دیا اور کہا کہ اسے کھول کر نہ دیکھے۔

حافظ اور اس کی بیوی میمونہ چلے گئے۔

○

"تم نے اس شخص کی باتیں سنی ہیں" — حسن بن صباح نے اپنے ساتھیوں سے کہا — "یہ کوئی معمولی آدمی نہیں۔ عہدار اور سردار ہے۔ یہ ابو مسلم رازی کے پاس جا رہا ہے۔ اُسے بتائے گا کہ خلجان میں کیا ہو رہا ہے"۔

"ہمارے خلاف طوفان کھڑا کرے گا" — ایک ساتھی نے کہا — "آپ حکم دیں کیا کرنا ہے"۔

"کیا یہ بتانے کی ضرورت ہے؟" — حسن بن صباح نے کہا — "کل رات یہ قبرستان سے زندہ واپس نہ آئے۔ میں نے اسے سب کچھ تمہاری موجودگی میں بتایا ہے۔ تمہیں قبرستان میں پہلے سے موجود ہونا چاہئے"۔

"اب یہ ہم پر چھوڑ دیں" — اُس کے ساتھی نے کہا — "اس کی لاش اُسی قبر میں پڑی ملے گی جس میں کھدائی کر کے وہ تعویذ رکھنے جائے گا"۔

"اس کی اس بیوی کا کیا بنے گا؟" — دوسرے ساتھی نے پوچھا۔

"یہ ہمارے ساتھ جائے گی" — حسن بن صباح نے کہا — "ہمارے کام کی عورت ہے۔ ہو سکتا ہے اس کے ذریعے اس کی بیٹی شمونہ واپس آ جائے"۔

اگلے روز ابھی سورج طلوع ہوا ہی تھا کہ حافظ اصفہانی حسن بن صباح کے ساتھیوں کے کمرے میں گیا۔ وہ انہیں قبرستان لے جانا چاہتا تھا۔ دونوں تیار تھے۔ اُس کے ساتھ چلے گئے۔

وہ ایک وسیع و عریض قبرستان تھا جس میں نئی قبریں بھی تھیں اور پرانی بھی اور کچھ اتنی پرانی کہ ان کے ذرا ذرا سے نشان باقی رہ گئے تھے۔ ضرورت ایسی قبر کی تھی جو بیٹھ گئی ہو یعنی جو اندر کو دھنس گئی ہو۔ قبرستان کا یہ حصہ ایسا تھا جو بارشوں کے بہتے پانی کے راستے میں آتا تھا۔ وہاں دھنسی ہوئی چند قبریں نظر آ گئیں۔ ایک قبر اتنی زیادہ دھنس گئی تھی کہ اس میں مدفون مُردے کی کھوپڑی اور کندھوں کی ہڈیاں نظر آ رہی تھیں۔

"یہ قبر آپ کا کام کرے گی" — حسن بن صباح کے ایک ساتھی نے کہا —

آپ کو کھدائی نہیں کرنی پڑے گی۔ رات کو اس میں اُتریں اور امام کا دیا ہوا کاغذ اس کھوپڑی کے منہ میں رکھ دیں پھر اس پر کدال سے مٹی ڈال دیں"۔

"مٹی بہت ساری ڈالنا بھائی صاحب!" —— دوسرے ساتھی نے کہا —— "اپنے وزن کے برابر مٹی ہو...... میں آپ کو ایک خطرے سے خبردار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ آپ کو نئی کھوپڑی مل گئی ہے۔ یہ آپ کی مراد پوری کر دے گی اور بہت جلدی کر دے گی لیکن آپ نے ذرا سی بھی بدپرہیزی یا بے احتیاطی کی تو یہ کھوپڑی آپ کی جان لے لے گی"۔

"پھر بھی اس موقع سے ضرور فائدہ اٹھائیں" —— دوسرا ساتھی بولا —— "امام نے آپ کی حفاظت کا انتظام کر دیا ہے۔ اللہ کا نام لے کر رات کو آجائیں"۔

"میں ضرور آؤں گا" —— حافظ اصفہانی نے پُرعزم لہجے میں کہا۔

اُسے بتانے والا کوئی نہ تھا کہ یہ دن اس کی زندگی کا آخری دن ہے اور اُس کی آنکھیں کل کا سورج نہیں دیکھ سکیں گی۔

○

آدھی رات کے وقت وہ کدال اٹھائے قبرستان میں پہنچ گیا۔

چاندنی اتنی سی تھی جس میں دن میں دیکھی ہوئی قبر تک پہنچنا مشکل نہ تھا۔ وہ جب گھر سے چلا تھا تو میمونہ نے اُسے روک لیا تھا۔

"معلوم نہیں میرے دل پر بوجھ سا کیوں آپڑا ہے" —— میمونہ نے کہا تھا —— "کیا میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکتی؟"

"نہیں میمونہ!" —— حافظ نے کہا —— "تمہارے سامنے امام نے کہا تھا کہ میں قبرستان میں اکیلا جاؤں۔ یہ شرط ہے جس کی خلاف ورزی ہوئی تو ہماری جانیں خطرے میں آسکتی ہیں"۔

"میری ایک بات مانیں" —— میمونہ نے کہا تھا —— "مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ آپ ہیں تو سب کچھ ہے۔ اس وقت قبرستان میں نہ جائیں"۔

"تم تو بڑے مضبوط دل والی تھیں میمونہ!" —— حافظ نے بڑے پیارے انداز میں کہا تھا —— "میں میدانِ جنگ میں نہیں جا رہا، میں طوفانی سمندر میں نہیں جا رہا۔ مجھے اللہ حافظ کہو میمونہ! میرے جانے کا وقت ہو رہا ہے"۔

"اللہ حافظ!" —— میمونہ نے کہا تھا۔

حافظ اصفہانی جب میمونہ کو اللہ حافظ کہہ کر اُس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا تو میمونہ کو ہچکی سی آئی اور اُس کا دل ڈوب گیا تھا جیسے اُسے غیب سے اشارہ ملا ہو کہ کوئی انہونی ہونے والی ہے۔

وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ کھلا رکھا۔ اسے نیند آجانی چاہیے تھی لیکن اس کے جسم کا رواں رواں، ریشہ ریشہ بیدار تھا۔ بے کلی بڑھتی جا رہی تھی۔ رات گزرتی جا رہی تھی۔

رات کا آخری پہر شروع ہو گیا۔ میمونہ کو ذرا سی آہٹ سنائی دیتی تو دوڑ کر دروازے تک جاتی اور مایوس لوٹ آتی۔

اسے مؤذن کی آواز سنائی دی تو میمونہ کے دل سے ہُوک اٹھی۔ مؤذن نے اذان کے الفاظ میں اعلان کر دیا تھا کہ رات گزر گئی ہے۔

"اتنا وقت نہیں لگنا چاہیے تھا" —— اس کے دل نے کہا۔

دل کانپ رہا تھا۔ اس کا پورا وجود کانپ رہا تھا۔

اُس نے وضو کیا اور مصلے پر کھڑی ہو گئی۔ فجر کی پوری نماز پڑھ کر اُس نے نفل پڑھنے شروع کر دیے۔ ہر چار نفلوں کے بعد ہاتھ پھیلا کر اپنے خاوند کی سلامتی کی دعا مانگی تھی۔

آنسو اُس کا حسن دھوتے رہے۔ اُس کا دل اتنی زور سے دھڑکنے لگا تھا کہ وہ اس کی آواز سن سکتی تھی۔

جب صبح کا اجالا سپید ہو گیا تو وہ حسن بن صباح کے ساتھیوں کے کمرے کی طرف اٹھ دوڑی۔ دونوں ہاتھ زور سے دروازے پر مارے اور کواڑ دھماکے سے کھلے۔ دونوں آدمی ناشتہ کر رہے تھے۔ انہوں نے بدک کر دیکھا۔

"حافظ آدھی رات کے وقت قبرستان میں گئے تھے" —— میمونہ نے کہا —— "ابھی تک نہیں آئے..... انہیں دیکھو"۔

"ہم دیکھنے جائیں گے" —— ایک نے کہا —— "ذرا دل مضبوط کریں۔ وہ آجائیں گے"۔

اس شخص نے دراصل یہ کہنا تھا کہ حافظ اصفہانی کبھی واپس نہیں آئے گا۔

گزشتہ رات یہ دونوں حافظ اصفہانی سے پہلے قبرستان میں پہنچ گئے اور اس قبر سے کچھ دور ایک گھنی جھاڑی کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔ چاندنی میں انہوں نے حافظ کو آتا دیکھ لیا۔ وہ قبر میں اُترا اور جھک کر کھوپڑی پر حسن بن صباح کا دیا ہوا تعویذ رکھنے لگا تو دونوں اٹھے اور حافظ کے عقب میں جا پہنچے۔

حافظ نے تعویذ کھوپڑی پر رکھ دیا۔ وہ جونہی سیدھا ہوا' پیچھے سے دو ہاتھوں نے اس کی گردن شکنجے میں جکڑ لی۔ دوسرے آدمی نے اس کے پیٹ میں پوری طاقت سے گھونسے مارنے شروع کر دیئے۔

تھوڑی سی دیر میں حافظ کا جسم ساکت و جامد ہو گیا۔ دونوں نے اچھی طرح تسلی کر لی کہ وہ مر گیا' اسے دھنسی ہوئی قبر میں لٹا دیا اور واپس آ گئے۔

صبح میمونہ ان کے کمرے میں گئی اور بتایا کہ اس کا خاوند واپس نہیں آیا۔ دونوں نے جلدی جلدی ناشتہ کیا اور قبرستان کی طرف چل دیئے۔ میمونہ نے کہا کہ وہ بھی ساتھ جائے گی۔ انہوں نے اسے ساتھ لے لیا۔

قبرستان میں پہنچے تو دُور سے انہیں اس قبر کے ارد گرد چند ایک آدمی کھڑے نظر آئے۔ وہ میمونہ کے ساتھ پہنچے تو میمونہ کو دھنسی ہوئی قبر میں اپنے خاوند کی لاش پڑی دکھائی دی۔ میمونہ کی چیخ نکل گئی۔

لوگوں کی مدد سے لاش اٹھا کر سرائے میں لے آئے۔ حسن بن صباح کو اطلاع ملی تو دوڑا باہر آیا۔ اُسے تو اُس کے ساتھیوں نے رات کو آ کر بتا دیا تھا کہ وہ اس کے حکم کی تعمیل کر آئے ہیں۔ حسن بن صباح نے انہیں خاص شراب پلائی تھی۔

"یاد رکھو دوستو!" — حسن بن صباح نے انہیں کہا تھا — "جس پر ذرا سا بھی شک ہو اُسے ختم کر دو۔ یہ شخص ہمارے لئے خطرناک ہو سکتا تھا۔ اس کی بیوی اب ہمارے ساتھ رہے گی۔ اس کے پاس مال و دولت بھی ہے۔ یہ بھی اب ہمارا ہے..... جاؤ اور صبح کا انتظار کرو"۔

صبح اسے اطلاع ملی کہ قبرستان سے حافظ اصفہانی کی لاش آئی ہے تو وہ کمرے سے دوڑتا نکلا اور لاش تک پہنچا۔ اُس نے لاش کو ہر طرف سے دیکھا' دونوں ہتھیلیاں دیکھیں اور گھبراہٹ کی ایسی اداکاری کی کہ دیکھنے والوں پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ اُس نے میمونہ کو دیکھا جس کی آنکھیں رو رو کر سوج گئی تھیں۔

"میمونہ!" — حسن بن صباح نے کہا — "میرے ساتھ آؤ..... جلدی..... ایک دیر نہ لگانا" — اُس نے اپنے ایک ساتھی سے کہا — "تم بھی میرے ساتھ آؤ۔ وقت بہت تھوڑا رہ گیا ہے"۔

وہ میمونہ اور اپنے ساتھی کو اپنے کمرے میں لے گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

"رونا بند کرو میمونہ!" — اُس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا — "فرش پر بیٹھ جاؤ۔ تمہارا خاوند کوئی غلطی کر بیٹھا ہے۔ ایک بڑی ہی خبیث بدروح نے اس کی جان لی ہے۔ یہ بدروح ابھی تک غصے میں ہے۔ میں نے اس کی سرگوشی سنی ہے۔ تمہاری جان بھی خطرے میں ہے۔ چونکہ یہ عمل اس لئے کیا گیا تھا کہ تمہاری کوکھ سے بچہ پیدا ہو اس لئے یہ بدروح تمہیں بھی اسی طرح مارنا چاہتی ہے۔ میں ابھی تمہاری حفاظت کا انتظام کر رہا ہوں"۔

اُس نے میمونہ کا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کچھ بڑبڑانا شروع کر دیا۔ وقفے وقفے سے وہ میمونہ کی آنکھوں میں پھونک مارتا تھا۔ میمونہ جو بلک بلک کر رو رہی تھی اور ایسی بے چین کہ ہاتھ نہیں آتی تھی' پُرسکون ہونے لگی۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اُس نے سکون اور اطمینان کی لمبی آہ بھری جیسے اُس کا خاوند زندہ ہو گیا ہو۔ حسن بن صباح نے اسے فرش سے اٹھا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔

"میں نے حافظ کو خبردار کر دیا تھا" — حسن بن صباح نے کہا — "لیکن اُسے ایک بچے کا اتنا شوق تھا کہ اُس نے میری پوری بات توجہ سے نہ سنی۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے تمہیں دیکھ لیا اور اس بے رحم بدروح کو بھی دیکھ لیا۔ وہ ابھی تک منڈلا رہی تھی اور بار بار تمہاری طرف دیکھتی تھی..... میں نے تمہیں محفوظ کر لیا ہے لیکن تمہیں دو چاند میرے ساتھ رہنا پڑے گا۔ اگر تم اس سے پہلے میرے سائے سے دُور ہو گئیں تو تمہارا انجام اپنے خاوند سے زیادہ بُرا ہو گا"۔

"یہ آپ کا کرم ہے یا امام!" — میمونہ نے کہا — "میں آپ کے سائے میں نہیں رہوں گی تو جاؤں گی کہاں۔ میری منزل اصفہان ہے"۔

"وہاں تک میں تمہیں بخیر و خوبی پہنچاؤں گا" — حسن بن صباح نے کہا — "میرے محافظ تمہاری منزل تک تمہارے ساتھ جائیں گے..... لیکن تمہارا خاوند کہ

رہا تھا کہ وہ سلجوقی سلطنت کے حکمران سلطان ملک شاہ سے ملنے مرو جائے گا"۔

"اس نے آپ کو یہ بھی بتایا تھا کہ وہ مرو کیوں جائے گا"۔۔۔ میمونہ نے کہا۔۔۔"اس نے خلجان، شاہ در اور اس علاقے میں جو دیکھا ہے وہ سلطان ملک شاہ کو بتانا تھا۔ خصوصاً خلجان میں کوئی ایسا فرقہ تیار ہو گیا ہے جس کے عقیدے لوگوں کے دلوں میں اتر گئے ہیں۔ یہ لوگ اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں لیکن ان کے اعمال نہ صرف یہ کہ غیر اسلامی ہیں بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ فرقہ اسلام کو بالکل ہی مسخ کر دے گا۔ سنا ہے اس فرقے نے جانبازوں کا ایک گروہ تیار کر لیا ہے جو اپنی جانوں کی بازی لگا کر اپنے مخالفوں کی جانیں لیتا ہے"۔

"تمہارے خاوند نے مجھے یہ ساری باتیں بتائی تھیں"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔"تم یہ بتاؤ کہ تم اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتی ہو؟"

"کچھ بھی نہیں"۔۔۔ میمونہ نے کہا۔۔۔"وہ خاوند ہی نہیں رہا جو اسلام کا شیدائی تھا۔ میں تو چاہتی ہوں اصفہان پہنچ جاؤں اور سوچوں کہ مجھے اب اپنے مستقبل کے لئے کیا کرنا چاہئے"۔

"کیا تمہارے گھر میں سونا یا درہم و دینار ہیں؟"

"حافظ اصفہانی ایک جاگیر کا مالک تھا"۔۔۔ میمونہ نے جواب دیا۔۔۔"سونا بھی ہے درہم و دینار بھی ہیں جو گھر کی ایک دیوار میں چھپا کر رکھے ہوئے ہیں۔ یہ تو ایک ذاتی خزانہ ہے لیکن زندگی کا ساتھی ہی نہ رہا تو میں اس خزانے کو کیا کروں گی..... کوشش کروں گی کہ اپنی بیٹی شمونہ کی تلاش میں مرو اور رے جاؤں۔ آپ ہی نے بتایا ہے کہ وہ امیرِ شہر ابو مسلم رازی کے پاس ہو گی"۔

حسن بن صباح کو دھچکہ سا لگا۔ وہ ایک رات پہلے اس عورت کو بتا چکا تھا کہ اس کی بیٹی کہاں ہے۔ اب اسے خیال آیا کہ اس عورت کو سلطان ملک شاہ اور ابو مسلم رازی کے پاس نہیں جانا چاہئے ورنہ وہ خلجان پر حملہ کرا دے گی یا اسے گرفتار کرا دے گی۔

"پہلے اپنی منزل پر پہنچو"۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا۔۔۔"مجھ سے پوچھے بغیر کہیں نہ جانا۔ تمہاری بیٹی زندہ ہے اور تمہیں مل جائے گی لیکن اپنے آپ اس کی تلاش میں چل پڑنا"۔

میمونہ جذبات کی ماری ہوئی تن تنہا عورت تھی۔ خاوند کی موت کے صدمے نے اس پر ڈوبنے کی کیفیت طاری کر دی تھی۔ وہ تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہی تھی۔ حسن بن صباح سے بہتر سہارا اور کیا ہو سکتا تھا۔ اسے وہ امام مانتی تھی جو غیب کے پردوں کے پیچھے جھانک کر بتا سکتا تھا کہ کیا ہو چکا ہے اور کیا ہونے والا ہے۔

میمونہ نے مان لیا تھا کہ حسن بن صباح نے اس کے خاوند کو ٹھیک عمل بتایا تھا لیکن ایک بدروح نے اس کی جان لے لی۔ اس مجبور اور مجبور عورت کو یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ جسے وہ غیب دان امام مانتی ہے، اس نے اسے ہپناٹائز کر لیا ہے اور اب وہ اس کے اشاروں پر چلے گی۔

وہ اس عورت کو ہپناٹائز نہ کرتا تو بھی وہ اس کے جال میں سے نکل نہیں سکتی تھی۔ تمام مؤرخوں نے خصوصاً یورپی تاریخ نویسوں اور شخصیت نگاروں نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے اپنے آپ میں ایسے اوصاف پیدا کر لئے تھے کہ اس کے سامنے اس کا کوئی خونی دشمن اسے قتل کرنے کی نیت سے آ جاتا تو وہ بھی اس کا مرید ہو جاتا تھا..... یہ ابلیسیت کا طلسم تھا۔

میمونہ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ حسن بن صباح کے ساتھ رہے گی۔

اس کے خاوند کی لاش اس کے کمرے میں پڑی ہوئی تھی۔ حسن بن صباح نے سرائے کے مالک کو بلا کر کہا کہ وہ میت کے غسل اور کفن دفن کا انتظام کرے، اس کے اخراجات میمونہ ادا کرے گی۔

سہ پہر کے وقت حافظ اصفہانی کا جنازہ سرائے سے اٹھا۔ قبرستان میں جا کر حسن بن صباح نے نماز جنازہ پڑھائی۔ وہ جس قبرستان میں بچہ لینے گیا تھا اسی قبرستان میں دفن ہو گیا اور اپنے پیچھے یہ کہانی چھوڑ گیا کہ اسے ایک بدروح نے مارا ہے۔

میمونہ اپنے کمرے میں تنہا ڈرتی تھی۔ اس نے حسن بن صباح سے پوچھا کہ وہ اس کے کمرے میں رہ سکتی ہے؟ حسن بن صباح نے اسے اجازت دے دی۔ میمونہ اپنا سامان اٹھوا کر اس کے کمرے میں چلی گئی۔

اس سرائے میں مسافر اس مجبوری کے تحت رکے ہوئے تھے کہ کوئی قافلہ تیار نہیں ہو رہا تھا۔ لوگ قافلوں کی صورت میں سفر کیا کرتے تھے۔ اکیلے دکیلے مسافروں کو رہزن لوٹ لیتے تھے۔

انہیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا۔ چودہ پندرہ دنوں بعد ایک قافلہ تیار ہو گیا۔ یہ بہت بڑا قافلہ تھا۔ کچھ تاجر تھے، کچھ پورے پورے کنبے تھے۔ زندگی کے ہر شعبے کے لوگ اس قافلے میں شامل تھے۔ عورتیں بھی تھیں، بچے بھی تھے۔

سرائے میں اطلاع آئی تو سرائے خالی ہو گئی۔ حسن بن صباح، اس کے دو ساتھیوں اور میمونہ نے سامان باندھا اور قافلے سے جا ملے۔ انہوں نے ایک گھوڑا اور دو اونٹ کرائے پر لے لئے۔ ایک اونٹ پر بڑی خوبصورت پالکی بندھوائی۔ یہ میمونہ کے لئے تھی۔ قافلے کی روانگی سے پہلے میمونہ کو پالکی میں بٹھا دیا گیا اور حسن بن صباح اپنے ساتھیوں کے ساتھ ذرا پرے جا کھڑا ہوا۔

"اس عورت پر نظر رکھنا" — حسن بن صباح نے اپنے ساتھیوں سے کہا — "یہ اپنے خاوند سے زیادہ خطرناک ہو سکتی ہے۔ میں نے اس کا راستہ بند تو کر دیا ہے پھر بھی یہ دوسرے مسافروں سے نہ ہی ملے تو اچھا ہے۔ اس کا گھر اصفہان میں ہے۔ اپنے مکان کی ایک دیوار میں اس کے خاوند نے اچھا خاصا خزانہ چھپا کر رکھا ہوا ہے۔ اس سے یہ خزانہ نکلوانا ہے اور اس کے گھر میں ہی اس عورت کو دفن کر دینا ہے۔ اگر اسے زندہ رہنے دیا گیا تو یہ کسی بھی دن اپنی بچی سے ملنے ابو مسلم رازی کے شہر کو روانہ ہو جائے گی"۔

○

قافلہ چل پڑا۔

بہت دنوں کی مسافت کے بعد قافلہ بغداد جا پہنچا۔ لوگ دو چار دن آرام کرنا چاہتے تھے۔ بہت سے مسافروں کی منزل بغداد ہی تھی۔ اتنے ہی مسافر بغداد سے قافلے سے آ ملے۔

حسن بن صباح اپنے ساتھیوں کو ایک سرائے میں لے گیا جس میں انہیں کمرے مل گئے۔ وہاں چند ایک عورتیں بھی ٹھہری ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ ان کے آدمی بھی تھے۔

دوسری صبح تھی۔ میمونہ اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ اسے اپنا خاوند بہت یاد آ رہا تھا اور وہ بہت ہی اداس ہو گئی تھی۔ حسن بن صباح نے خود ہی اسے کہا تھا کہ وہ باہر گھومے پھرے، سرائے کے باہر نہ جائے اور عورتوں میں جا بیٹھے۔

وہ باہر نکلی تو اسی کی عمر کی ایک عورت سامنے آ گئی۔ وہ بھی حلب کی سرائے سے اپنے

بچے کے ساتھ قافلے میں شامل ہوئی تھی اور وہاں سرائے میں ٹھہری تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میمونہ کا خاوند قبرستان میں ایک بدروح کے ہاتھوں مارا گیا تھا لیکن یہ عورت میمونہ سے پوچھ نہیں سکی تھی کہ اس کا خاوند کس طرح مارا گیا تھا۔ بغداد میں میمونہ اس کے سامنے آ گئی۔

"معنر ہو کے ہم ایک دوسرے سے بیگانہ ہیں" — اس عورت نے میمونہ سے کہا — "عورت کا درد عورت ہی سمجھ سکتی ہے۔ کچھ دیر کے لئے میرے پاس نہیں آؤ گی؟..... میرے ساتھ میرا خاوند اور اس کا ایک بھائی ہے۔ دو بچے ہیں"۔

میمونہ اداس سی مسکراہٹ سے اس کے ساتھ اس کے کمرے میں چلی گئی۔ مرد ایک طرف ہو کر بیٹھ گئے۔

"یہ تو بتاؤ بہن!" — اس عورت کے خاوند نے میمونہ سے پوچھا — "تمہارا خاوند رات کے وقت قبرستان میں کیا کرنے گیا تھا؟"

"امام نے اسے بھیجا تھا" — میمونہ نے کہا — "کہتا تو یہ تھا کہ اسے موت لے گئی تھی..... وہ ایک بچے کا خواہشمند تھا"۔

میمونہ نے ساری بات لفظ بلفظ سنا دی۔

"کیا تمہارے خاوند نے کوئی اور باتیں بھی کی تھیں؟" — اس شخص نے پوچھا — "میں دراصل یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تمہارا خاوند اس شخص کو جانتا تھا جسے تم امام کہتی ہو؟"

"باتیں تو بہت ہوئی تھیں" — میمونہ نے جواب دیا — "میرا خاوند امام کو پہلے نہیں جانتا تھا۔ ہم مصر سے جہاز میں آ رہے تھے۔ بڑا ہی تیز و تند طوفان آ گیا۔ جہاز کا ڈوب جانا یقینی تھا لیکن اس امام نے کہا کہ جہاز نہیں ڈوبے گا، طوفان سے نکل جائے گا..... جہاز نکل گیا"۔

یہاں سے بات چلی تو بہت سی باتیں ہوئیں۔ اس عورت کا خاوند کرید کرید کر باتیں پوچھ رہا تھا۔ میمونہ کو شک ہوا کہ یہ آدمی کوئی خاص بات معلوم کرنا چاہتا ہے۔

"میرے بھائی!" — میمونہ نے پوچھا — "معلوم ہوتا ہے آپ کوئی خاص بات معلوم کرنا چاہتے ہیں"۔

"ہاں بہن!" — اس نے کہا — "میرا خیال ہے کہ میں نے خاص بات معلوم کر لی

ہے۔ میں تمہیں اس آدمی سے خبردار کرنا چاہتا ہوں۔ اس شخص کا نام حسن بن صباح ہے اور یہ ایک شیطانی فرقے کا بانی ہے۔ اسے تم امام کہتی ہو۔ یہ اگر امام ہے تو اسی شیطانی فرقے کا امام ہے۔ اس کا استاد احمد بن عطاش ہے اور ان لوگوں نے خلجان کو اپنے فرقے کا مرکز بنایا ہے۔ یہ دونوں شیطان کا نام لئے بغیر لوگوں کو شیطان کا پجاری بنا رہے ہیں اور نام اسلام کا لیتے ہیں"۔

"میرے خاوند نے اس کے ساتھ یہ بات کی تھی" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "کہ رکا تھا کہ وہ سلطان ملک شاہ اور حاکم رے ابو مسلم رازی کے پاس جا رہا ہے اور انہیں کہے گا کہ احمد بن عطاش اور حسن بن صباح کے خلاف جنگی کارروائی کریں اور اسلام کی اصل روح کو بچائیں۔ میرے خاوند نے جب اسے یہ کہا کہ وہ آپ کا ہمنام ہے تو حسن بن صباح نے کہا کہ اُس کا نام الحسن بن سبا ہے حسن بن صباح نہیں۔ میرے خاوند نے حسن بن صباح اور اُس کے فرقے کے خلاف بہت باتیں کی تھیں اور یہ اس نے دو تین بار کہا تھا کہ میں اس فرقے کو نیست و نابود کرا دوں گا"۔

"میری عزیز بہن!" ــــ اس آدمی نے جو خاصا دانشمند لگتا تھا، کہا ــــ "تمہارا خاوند قتل ہوا ہے۔ اتنی اچھی حیثیت اور عقل و ہوش والا آدمی یہ نہ سمجھ سکا کہ مُردے کسی زندہ انسان کو کچھ نہیں دے سکتے اور حسن بن صباح جیسے شیطان فطرت انسان کی لکھی ہوئی پرچی پر اللہ تبارک و تعالیٰ کسی کی مراد پوری نہیں کیا کرتا۔ حسن بن صباح نے تمہارے خاوند کی دلی مراد سنی تو اس نے فوراً سوچ لیا کہ اپنے اس خطرناک مخالف کو وہ کس طرح قتل کرا سکتا ہے۔ اُس نے تمہارے خاوند کو آدھی رات کے وقت قبرستان میں بھیجا اور پیچھے اپنے آدمی بھیج کر اسے قتل کروا دیا"۔

"میں بھی اُس کے ساتھ یہی باتیں کر چکی ہوں" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "تو مجھے اب خیال آتا ہے کہ اس نے مجھ سے یہ بھی اگلوا لیا ہے کہ میرے خاوند نے اصفہان میں اپنے رہائشی مکان کی ایک دیوار میں بہت سا سونا اور اچھی خاصی رقم چھپا کر رکھی ہوئی ہے"۔

"اُس نے کیا کہا تھا؟"

"اُس نے کہا کہ میں تمہیں اصفہان تک اپنے آدمیوں کی حفاظت میں پہنچاؤں گا" میمونہ نے کہا۔

"وہ تمہارے ساتھ اپنے آدمی ضرور بھیجے گا" ــــ اُس شخص نے کہا ــــ "پھر جانتی ہو کیا ہو گا؟ ..... تمہارے خاوند کا خزانہ دیوار سے باہر آ جائے گا اور تم دیوار کے اندر ہو گی۔ کسی کو پتہ ہی نہیں چلے گا کہ تم کہاں غائب ہو گئیں۔ اس حسن بن صباح کے حکم سے یہ فرقہ کئی سالوں سے قافلوں کو لوٹ رہا ہے۔ قافلوں سے یہ زر و جواہرات اور رقمیں لوٹتے ہیں اور خوبصورت کمسن اور نوجوان لڑکیوں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں"۔

"میں ایک قافلے میں لُٹ چکی ہوں" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "میرا پہلا خاوند ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا گیا تھا اور وہ میری اکلوتی بیٹی کو اٹھا لے گئے تھے"۔

"تمہاری بیٹی انہی کے پاس ہو گی" ــــ اس آدمی نے کہا۔

"سب باتیں ہو چکیں" ــــ میمونہ نے کہا ــــ "میں نے سب باتیں سمجھ لی ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ یہ شخص حسن بن صباح جب آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے تو اس کا ایک ایک لفظ دل میں یوں اُتر جاتا ہے جیسے یہ الفاظ آسمان سے اُتر رہے ہوں..... میں حیران ہوں کہ سلجوقی سلطان اور ان کے امراء جو اپنے آپ کو صحیح العقیدہ مسلمان سمجھتے ہیں اور اسلام کی پاسبانی کا بھی دعویٰ کرتے ہیں، وہ بے خبر ہیں کہ ان کی سرحد کے ساتھ ساتھ کیا ہو رہا ہے"۔

"ان کے بے خبر ہونے کی ایک وجہ ہے" ــــ اس شخص نے کہا ــــ "ان کے جاسوس ان باطل پرستوں کے علاقے میں جاتے ہیں لیکن وہاں ان پر ایسا نشہ طاری ہو جاتا ہے کہ وہ وہیں کے ہو کے رہ جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض ان باطنیوں کے گرویدہ ہو کر ان کے جاسوس بن کے واپس آ جاتے ہیں۔ وہاں کی باتیں غلط بتاتے ہیں اور سلجوقی حکمرانوں کی صحیح خبریں باطنیوں کو دے کر ان کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں۔ ان میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو غداری نہیں کرتے، دیانتداری سے جاسوسی کرتے ہیں، وہ وہاں پُراسرار طریقوں سے قتل ہو جاتے ہیں۔ حسن بن صباح نے جاسوسوں اور مشکوک لوگوں کو پکڑنے کا جو نظام بنا رکھا ہے، اس میں اتنی گہری نظر رکھتے ہیں کہ باہر کے جاسوس کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔ انہیں حکم ملا ہوا ہے کہ ایسا کوئی بھی آدمی نظر آنے اسے قتل کر دو"۔

"آپ یہ ساری باتیں جانتے ہیں" ــــ میمونہ نے پوچھا ــــ "پھر آپ یہ سلطان

ملک شاہ تک کیوں نہیں پہنچاتے؟"

"ان بچوں کی خاطر!" — اس نے کہا — "میں مارا گیا تو ان کا کیا بنے گا؟"

"میں مَرو یا رے تک کیسے پہنچ سکتی ہوں؟" — میمونہ نے پوچھا — "پتہ چلا ہے میری بچی وہاں ہے۔ معلوم نہیں یہ کہاں تک سچ ہے لیکن مجھے اس بچی سے اتنی محبت ہے کہ میں اس کی تلاش میں جاؤں گی ضرور۔ مشکل یہ ہے کہ میں اس شخص حسن بن صباح کی قیدی ہوں۔ ہماری منزل کا راستہ دور سے گزرتا ہے۔ اگر میں وہاں تک پہنچ جاؤں تو سلطان تک بھی پہنچ جاؤں گی"۔

"تمہیں ویسے بھی یہاں سے نکل جانا چاہئے" — اس آدمی نے کہا — "یہ شخص آخر تمہیں قتل کرا دے گا"۔

"میں اس عورت کے لئے ایک قربانی دے سکتا ہوں" — اس آدمی کے بھائی نے جو ابھی تک خاموش بیٹھا تھا کہا — "اگر یہ یہاں سے بھاگنے کے لئے تیار ہو تو آج ہی رات بھاگ چلے۔ میں اس کا ساتھ دوں گا۔ میرے پاس گھوڑا ہے۔ اس کے لئے کسی کا گھوڑا چوری کر لیں گے"۔

"ہمارے پاس کرائے کا گھوڑا ہے؟" — میمونہ نے کہا — "اور میں پکی سوار ہوں۔ گھوڑا کیسا ہی منہ زور کیوں نہ ہو، زمین کیسی ہی ناہموار کیوں نہ ہو، میں سنبھل کر ہر چال اور ہر رفتار پر سواری کر سکتی ہوں"۔

"کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں بھائی جان؟" — اس جوان سال آدمی نے اپنے بھائی سے پوچھا۔

"یہ ایک جہاد ہے" — بڑے بھائی نے کہا — "میں تجھے کیسے روک سکتا ہوں مزمل!"

انہوں نے میمونہ کو فرار کرا کے رے پہنچانے کا بڑا ہی دلیرانہ منصوبہ تیار کر لیا۔

O

میمونہ اپنے کمرے میں حسن بن صباح کے پاس چلی گئی۔

"یہ کیسے لوگ ہیں جن کے ہاں تم اتنا وقت گزار آئی ہو؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"کوئی عام سے لوگ ہیں" — میمونہ نے کہا — "اصفہان جا رہے ہیں۔ حافظ

اصفہانی کو جانتے تھے۔ اسی کی باتیں کرتے رہے"۔

"اب میں باہر جا رہا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "تم آرام کر لو"۔

حسن بن صباح کے جانے کے بعد میمونہ نے اپنی قیمتی چیزیں اور کپڑے چھوٹی سی ایک گٹھڑی میں باندھ کر پلنگ کے نیچے رکھ دیئے۔ رات کو حسن بن صباح گہری نیند سو گیا تو میمونہ نہایت آہستہ سے اٹھی، پلنگ کے نیچے سے گٹھڑی نکالی اور دبے پاؤں باہر نکل گئی۔ سب کے گھوڑے باہر بندھے ہوئے تھے۔ ان کی زینیں وغیرہ ان کے پاس ہی تھیں۔ میمونہ کا ہمسفر مزمل آفندی بہت پہلے باہر نکل گیا تھا۔ دن کے وقت اس نے میمونہ کا گھوڑا دیکھ لیا تھا۔ مزمل نے دونوں گھوڑوں پر زینیں کس دی تھیں۔

میمونہ پہنچ گئی۔ گٹھڑی اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھی اور گھوڑے پر سوار ہو گئی۔ مزمل آفندی بھی گھوڑے پر سوار ہوا اور دونوں گھوڑے چل پڑے۔ پہلے وہ آہستہ آہستہ چلے پھر تیز ہو گئے اور جب شہر کے دروازے سے نکلے تو اور تیز ہو گئے۔ کچھ دور جا کر انہوں نے ایڑ لگائی اور گھوڑے سرپٹ دوڑ پڑے۔

صبح حسن بن صباح کی آنکھ کھلی تو اس نے میمونہ کو غائب پایا۔ اپنے ساتھیوں کے کمرے میں جا کر انہیں کہا کہ اسے ڈھونڈیں۔ اس وقت تک میمونہ بغداد سے میل دور پہنچ چکی تھی۔

"وہ سلجوقیوں کے پاس چلی گئی ہے" — حسن بن صباح نے اس وقت کہا جب اسے پتہ چلا کہ گھوڑا غائب ہے۔ اس نے کہا — "ہم قافلے کا انتظار نہیں کریں گے۔ ہمیں فوراً اصفہان پہنچنا چاہئے۔ وہاں سے قلجان کی صورتِ حال معلوم کر کے وہاں جائیں۔ احمد بن عطاش کو خبردار کرنا ضروری ہے"۔

ان کے پاس دو اونٹ تھے۔ انہوں نے ایک اچھی نسل کا گھوڑا کرائے پر لے لیا اور اسی وقت روانہ ہو گئے۔ دونوں اونٹوں کا مالک اور گھوڑے کا مالک بھی ان کے ساتھ تھے۔

مزمل آفندی اور میمونہ اتنی تیز گئے تھے اور انہوں نے اتنے کم پڑاؤ کئے تھے کہ تین دنوں بعد رے پہنچ گئے۔ وہ سیدھے امیرِ شہر ابو مسلم رازی کے ہاں چلے گئے۔ دربان سے کہا کہ وہ امیرِ شہر سے ملنا چاہتی ہے۔

"کام کیا ہے؟" — دربان نے پوچھا — "کہاں سے آئی ہو؟ تم ہو کون؟"

"کیا ہمارے گھوڑوں کا پسینہ نہیں بتا رہا کہ ہم بہت دور سے آئے ہیں؟"

میمونہ نے کہا — "ہمارے چہرے دیکھو، ہمارے کپڑوں پر گرد دیکھو۔ امیرِ شہر! ایک ماں اپنی بیٹی کی تلاش میں آئی ہے"۔

کچھ ہی دیر بعد وہ اور مزمل ابو مسلم رازی کے کمرے میں اُس کے سامنے کھڑے تھے۔

"بہت دور سے آئے لگتے ہو" — ابو مسلم رازی نے کہا۔

"بغداد سے!" — مزمل نے جواب دیا۔

"دربان نے بتایا ہے تم اپنی بیٹی کی تلاش میں آئی ہو" — ابو مسلم رازی نے کہا — "کون ہے تمہاری بیٹی؟ یہاں اُس کا کیا کام؟"

"اُس کا نام شمونہ ہے" — میمونہ نے کہا — "کسی نے بتایا تھا یہاں ہے"۔

"ہاں!" — ابو مسلم رازی نے کہا — "وہ یہیں ہے" — اُس نے دروازے کے باہر کھڑے خدمت گار کو بلا کر کہا — "شمونہ کو لے آؤ"۔

جب ماں بیٹی کا آمنا سامنا ہوا تو کچھ دیر دونوں چپ چاپ ایک دوسری کو دیکھتی رہیں۔

"اپنی ماں کو پہچانتی ہو شمونہ؟" — ابو مسلم رازی نے کہا۔

ماں بیٹی یوں ملیں جیسے ایک دوسری کے وجود میں سما جانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ماں اپنی بیٹی کے بازوؤں سے نکل آئی اور ابو مسلم رازی کی طرف دیکھا۔

"میں صرف اپنی بیٹی کی تلاش میں نہیں آئی تھی امیرِ شہر!" — میمونہ نے کہا — "میرا اصل مقصد کچھ اور ہے..... کیا آپ حسن بن صباح کو جانتے ہیں؟"

"حسن بن صباح؟" — ابو مسلم رازی نے کہا — "کیوں؟..... اسے جانتا ہوں..... سلطانِ معظم نے اُسے زندہ پکڑ لانے کے لئے ایک سالار امیر ارسلان کو حکم دے دیا ہے"۔

سلطان ملک شاہ نے سالار امیر ارسلان کو حکم تو دے دیا تھا کہ حسن بن صباح کو زندہ پکڑ لائے لیکن حسن بن صباح کا سراغ نہیں مل رہا تھا کہ وہ ہے کہاں۔ سلطان نے امیر ارسلان سے یہ کہا تھا کہ حسن بن صباح کا سراغ لگاؤ اور اسے پکڑو۔

"کیا آپ کو معلوم ہے وہ ہے کہاں؟" — مزمل آفندی نے جو میمونہ اور شمونہ کے ساتھ تھا ابو مسلم رازی سے پوچھا۔

"نہیں!" — ابو مسلم رازی نے جواب دیا — "یہی ایک سوال ہے جس کا جواب کسی کے بھی پاس نہیں۔ ایک خبر ملی تھی کہ وہ مصر چلا گیا ہے اور یہ خبر بھی ملی ہے کہ مصر سے واپس آ گیا ہے"۔

"ہم اسے بغداد چھوڑ آئے ہیں" — مزمل آفندی نے کہا۔

"اور یہ میں آپ کو بتا رہی ہوں" — میمونہ نے کہا — "کہ وہ مصر سے واپس آ گیا ہے اور اصفہان جا رہا ہے۔ میں سکندریہ سے اپنے خاوند کے ساتھ اُس کی ہم سفر تھی۔ یہ میرا خاوند تھا۔ اسے حلب میں حسن بن صباح نے قتل کروا دیا تھا"۔

"قتل کروا دیا تھا؟" — ابو مسلم رازی نے چونک کر پوچھا — "وہ کیسے؟"

میمونہ نے اسے سارا واقعہ سنا دیا۔

"اور پھر اس نے مجھے اپنے اثر میں لے لیا" — میمونہ نے کہا — "اس نے ایسے انداز اور ایسے طریقے سے میرے ساتھ باتیں کیں کہ میں اسے خدا کی طرف سے زمین پر اترا ہوا فرشتہ سمجھنے لگی۔ میں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا کہ میرے خاوند کی جان ایک بدروح نے لی ہے اور یہ بدروح میری بھی جان لے گی اور اس بزرگ و برتر شخصیت حسن بن صباح نے مجھے اس بدروح سے محفوظ کر لیا ہے"۔

"کیا اس نے تمہیں اپنے ساتھ رکھ لیا تھا؟" — ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"سرائے میں وہ الگ کمرے میں رہتا تھا" — میمونہ نے جواب دیا — "میں اس کے ساتھ اس کمرے میں رہنے لگی تھی"۔

"میں حیران ہوں کہ تم اُس کے چنگل سے نکل کس طرح آئیں" — ابو مسلم رازی نے کہا۔

"مزمل آفندی اور اس کے بڑے بھائی کی راہنمائی اور مدد سے وہاں سے نکلی ہوں" — میمونہ نے کہا۔

میمونہ نے تفصیل سے سنایا کہ وہ کس طرح مزمل آفندی اور اس کے بڑے بھائی سے اتفاقیہ ملی تھی اور بڑے بھائی نے اسے حسن بن صباح کی اصلیت بتائی تھی۔

"امیرِ شہر!" — مزمل آفندی نے کہا — "ہم اصفہان کے رہنے والے ہیں۔ تجارت ہمارا پیشہ ہے۔ ہم شہر شہر، قصبہ قصبہ جاتے ہیں، لوگوں سے ملتے ملاتے ہیں، ان کی باتیں سنتے ہیں اور چونکہ ہم اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے راستے پر چلنے والے مسلمان ہیں اس لئے ہم جہاں بھی جاتے ہیں وہاں غور سے دیکھتے ہیں کہ کہیں اسلام کی روح کو مسخ تو نہیں کیا جا رہا"۔

"ان قلعوں کے علاقوں میں تم نے کیا دیکھا ہے؟" — ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"ان علاقوں میں لوگ حسن بن صباح کو خدا کا ایلچی سمجھتے ہیں" — مزمل آفندی نے کہا — "ان کا عقیدہ ہے حسن بن صباح آسمان سے زمین پر اُترا تھا اور پھر آسمان پر چلا گیا ہے اور ایک بار پھر اس کا ظہور ہو گا"۔

"ہمیں معلوم ہو چکا ہے" — ابو مسلم رازی نے کہا — "لیکن ہم لوگوں کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔ لوگ تو کھیتی کی مانند ہیں۔ کھیتی ہر بیج کو قبول کر لیتی ہے۔ حشیش کا پودا بھی کھیتی اگاتی ہے اور حنا بھی کھیتی ہی دیتی ہے۔ ہم اسے پکڑیں گے جو حنا پیدا کرنے والی زمین میں حشیش کا بیج بوتا ہے"۔

"مجھے ایک شک ہے امیرِ شہر!" — مزمل آفندی نے کہا — "ایسے لوگوں کو آپ فوج کہہ لیں یا احمد بن عطاش اور حسن بن صباح کے جانباز پیروکار کہہ لیں، انہیں حشیش پلائی جاتی ہے اور نشے کی حالت میں ان کے دماغوں میں وہ لوگ اپنے بے بنیاد عقیدے ڈالتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کی تو انہوں نے کایا پلٹ دی ہے۔ محصولات اور مالیہ اس قدر کم کر دیا گیا ہے جو انتہائی غریب کسان نہایت آسانی اور خوشی سے دیتا ہے"۔

"وہ محصولات اور مالیہ بالکل معاف کر سکتے ہیں" — ابو مسلم رازی نے کہا — "قافلے لوٹ لوٹ کر انہوں نے قارون جیسے خزانے اکٹھے کر لئے اور ابھی تک ان کی لوٹ مار جاری ہے۔ قتل و غارت گری ان لوگوں کا دستور ہے۔ اس عورت کو دیکھو۔ اس کی اس بچی شمونہ کو حسن بن صباح کے ڈاکوؤں نے چھوٹی سی عمر میں اغوا کر لیا تھا۔ اس کی ماں کو دیکھو۔ اس کے وارث خاوند ان لوگوں کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں"۔

"امیرِ محترم!" — مزمل آفندی نے پوچھا — "آپ کے سالار امیر ارسلان حسن

بن صباح کی گرفتاری کے لئے کب روانہ ہو رہے ہیں"؟

"میں ضروری نہیں سمجھتا کہ تمہیں اس سوال کا جواب دوں" — ابو مسلم رازی نے کہا — "مجھے یہ بتاؤ کہ بغداد سے اس قافلے نے کب روانہ ہونا تھا؟"

"ابھی اس کی روانگی کے کوئی آثار نہیں تھے" — مزمل آفندی نے جواب دیا — "اگر روانہ ہو بھی چکا ہو تو ابھی راستے میں ہی ہو گا"۔

"تم یقیناً اپنے بھائی کے پاس جانا چاہو گے؟" — ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"یقیناً!" — مزمل آفندی نے کہا — "وہ میرے لئے پریشان بھی ہوں گے مگر میں ایک خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔ میں اس خاتون کو وہاں سے لایا ہوں۔ یہ دراصل حسن بن صباح کے قبضے میں تھی۔ اسے میں اس کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچا کر لایا ہوں۔ ہو سکتا ہے حسن بن صباح پر یہ راز کھل جائے تو وہ مجھے قتل نہیں کرا دے گا؟"

"تم اکیلے نہیں جاؤ گے" — ابو مسلم رازی نے کہا — "میں مرو جا رہا ہوں۔ سلطان سے کہوں گا کہ سالار امیر ارسلان کو فوراً بغداد بھیج دے۔ اگر قافلہ اصفہان کی طرف روانہ ہو گیا ہو تو اس کا تعاقب کرے اور حسن بن صباح کو پکڑ کر لے آئے۔ تمہیں اس کے ساتھ جانا پڑے گا۔ میرا خیال ہے امیر ارسلان حسن بن صباح کو نہیں پہچانتا۔ یہ تم اسے بتاؤ گے۔ وہ تمہیں اپنی پناہ میں رکھے گا..... تمہیں یہاں تین یا چار دن رکنا پڑے گا۔ امیر ارسلان یہاں آ کر روانہ ہو گا"۔

○

ابو مسلم رازی اُسی روز مرو کو روانہ ہو گیا۔ اُس کے حکم سے مزمل آفندی کی رہائش کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ شمونہ کو ابو مسلم رازی نے اپنے مکان میں ٹھہرا لیا ہوا تھا۔ میمونہ اس کے ساتھ چلی گئی۔

مزمل آفندی نے جس وقت سے شمونہ کو دیکھا تھا اس کی نظریں شمونہ سے ہٹ نہیں رہی تھیں۔ شمونہ بہت ہی حسین لڑکی تھی لیکن اس کے چہرے پر ایک تاثر اور بھی تھا۔ مزمل آفندی محسوس کر رہا تھا کہ اس لڑکی کا حُسن صرف جسمانی نہیں۔ اس لڑکی میں اسے کوئی اور ہی پرتو نظر آ رہا تھا۔

مزمل آفندی اپنے کمرے میں گیا تو وہ اپنے آپ میں ایسی ہلچل محسوس کر رہا تھا جو اُس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ بے قرار سا ہو گیا اور سوچنے لگا کہ کس

بہانے وہ ماں بیٹی کے کمرے میں جائے۔ وہ تین چار بار اس توقع پر نکلا شاید ماں یا بیٹی باہر نکلے تو اس کے پاس آجائے یا اسے بلا لے۔ اس نے میمونہ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔

شام گہری ہونے کے بعد مزمل آفندی کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ شمونہ اس کے کمرے میں آگئی۔ مزمل آفندی کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ شمونہ اس کے کمرے میں آئی ہے۔

"میں تمہارے چہرے پر حیرت کا تاثر دیکھ رہی ہوں" ۔۔۔ شمونہ نے کہا ۔۔۔ "کیا تمہیں عجیب لگا ہے کہ میں رات کے وقت تمہارے کمرے میں آئی ہوں؟"

"ہاں شمونہ!" ۔۔۔ مزمل آفندی نے کہا ۔۔۔ "مجھے تمہارا یہاں آنا عجیب لگا تھا لیکن جس بیباکی سے تم نے پوچھا ہے اس سے میری حیرت ختم ہو گئی ہے۔ میں تمہیں حرم کی ایک عام سی لڑکی سمجھا جو بچپن میں اغوا ہو کر یہاں تک پہنچی ہے"۔

"میں اغوا ہوئی تھی" ۔۔۔ شمونہ نے کہا ۔۔۔ "لیکن میں کسی کے حرم میں قید نہیں ہوئی نہ مجھے جسمانی تفریح کا ذریعہ بنایا گیا تھا بلکہ مجھے ایسی تربیت دی گئی کہ میں پتھر دل آدمی کو موم کی طرح پگھلا کر اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال سکتی ہوں"۔

"تمہیں یہ تربیت کس نے دی تھی؟" ۔۔۔ مزمل آفندی نے پوچھا۔

"حسن بن صباح کے ٹولے نے!" ۔۔۔ شمونہ نے جواب دیا ۔۔۔ "لیکن مزمل! میں تمہیں یہ داستان سنانے نہیں آئی کہ میں کیا تھی اور اب کیا ہوں"۔

"ساری داستان نہ سہی" ۔۔۔ مزمل آفندی نے کہا ۔۔۔ "میں کچھ نہ کچھ تو ضرور معلوم کرنا چاہوں گا..... جس طرح تم نے میرے ساتھ بیباکی سے بات کی ہے اسی طرح میں بھی تھوڑی سی بیباکی کا حق رکھتا ہوں۔ اگر تمہیں اچھا نہ لگے تو مجھے روک دینا"۔

"آفندی!" ۔۔۔ شمونہ نے کہا ۔۔۔ "مجھے وہ انسان اچھا لگتا ہے جس کی زبان پر وہی ہو جو اس کے دل میں ہے"۔

"شمونہ!" ۔۔۔ مزمل آفندی نے کہا ۔۔۔ "میری زبان پر تمہارا نام ہے اور میرے دل میں بھی تم ہی ہو۔ میں نے تمہیں آج ہی دیکھا ہے اور میرے دل نے کہا ہے کہ اس لڑکی کا حسن جسمانی نہیں روحانی ہے اور 'خدا کی قسم' میں نے یقین کی حد تک محسوس کیا کہ میں تمہیں بچپن سے جانتا ہوں اور بچپن سے تم میرے دل میں موجود ہو۔ اگر تمہیں میری نیت پر شک ہو تو یہ سوچ لینا کہ میں اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر تمہاری

ماں کو یہاں لایا ہوں' اور اسے میں اس لئے نہیں لایا کہ تم خوش ہو جاؤ گی۔ تمہیں تو میں پہچانتا بھی نہ تھا۔ میں ایک مظلوم اور فریب خوردہ عورت کو ایک ابلیس کے جال سے نکال کر لایا ہوں۔ یہ کہتی تھی کہ میری بیٹی سلجوقی سلطان یا کسی امیر کے پاس ہے۔ میں اسے محض خواب اور خیال سمجھتا تھا۔ میں تو یہ سوچ کر اسے لے آیا تھا کہ اسے ابو مسلم رازی کی پناہ میں چھوڑ کر لوٹ جاؤں گا"۔

"میں تمہاری بات سمجھ گئی ہوں آفندی!" ۔۔۔ شمونہ نے کہا ۔۔۔ "مجھے یقین ہے کہ تم میری خاطر نہیں آئے"۔

"یہ تو اتفاق ہے" ۔۔۔ مزمل آفندی نے کہا ۔۔۔ "اسے معجزہ کہوں تو بھی غلط نہیں ہوگا کہ تم یہاں مل گئیں"۔

"یہ اللہ کا انعام ہے" ۔۔۔ شمونہ نے کہا ۔۔۔ "اللہ نے میری توبہ قبول کر لی ہے.... میرے دماغ میں ابلیسیت ڈالی گئی تھی اور میرے خیالات اور میرے کردار کو ابلیسیت کے سانچے میں ڈھال دیا گیا تھا لیکن ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ میں ہوش میں آگئی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اپنے آپ کو ابلیسی اوصاف سے پاک کر کے انسانیت کے دائرے میں داخل ہو سکوں گی لیکن مجھ پر یہ راز کھلا ہے کہ انسان آخر انسان ہے اور وہ اول آخر انسان رہتا ہے۔ کبھی حالات ایسے ہو جاتے ہیں کہ انسان ابلیسیت کی طرف مائل ہو جاتا ہے یا ایسے انسانوں کے نرغے اور اثر میں آجاتا ہے کہ اسے ابلیسیت میں لذت حاصل ہوتی ہے اور وہ ابلیس کا پجاری بن جاتا ہے لیکن وہ رہتا انسان ہی ہے' وہ ابلیس نہیں بن جاتا۔ یہ سوچنے اور سمجھنے کی بات ہے۔ اللہ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ وہ ارادہ کر لے اور یہ سمجھ لے کہ اللہ نے اپنی نگاہ میں انسان کو کتنا اونچا مقام دیا ہے تو وہ ایک جھٹکے سے ابلیس کے چنگل سے نکل کر اللہ کے قریب ہو سکتا ہے..... یہ میں نے کیا اور اللہ نے یہ انعام دیا کہ مجھے میری بچھڑی ہوئی ماں دے دی"۔

"یہ عمر اور یہ حسن!" ۔۔۔ مزمل آفندی نے کہا ۔۔۔ "اور یہ سنجیدگی؟"

"کیا تمہیں یہ سنجیدگی اچھی نہیں لگی؟" ۔۔۔ شمونہ نے پوچھا۔

"لگی تو مجھے اچھی لگی ہے" ۔۔۔ مزمل آفندی نے کہا ۔۔۔ "تم چاہتی ہو کہ جو دل میں ہو وہی زبان پر آئے..... میرے دل کی آواز سن لو شمونہ! میرے دل میں تمہاری وہ محبت پیدا ہو گئی ہے جس کا تعلق روح کے ساتھ ہے اور تم نے ایسی محبت کے قصے سنے ہوں

گے"۔

شمونہ چونک پڑی۔ اُس کے چہرے کا رنگ بدل گیا جیسے وہ خوفزدہ ہو گئی ہو۔ وہ آنکھیں پھاڑے مزمل آفندی کو دیکھنے لگی جیسے اس جواں سال اور خوبرو آدمی نے اسے کہہ دیا ہو کہ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔

"کیوں شمونہ!" — مزمل آفندی نے کہا — "کیا میں نے تمہارے دل کو تکلیف پہنچائی ہے؟"

"نہیں آفندی!" — شمونہ نے کہا — "مجھے شک ہے کہ میری محبت اور موت میں کوئی زیادہ فرق نہیں"۔

مزمل آفندی سراپا سوال بن گیا۔

"آج میں کچھ اور کہنے آئی تھی" — شمونہ نے کہا — "میں تمہاری شکرگزار ہوں کہ تم میری ماں کو لے آئے ہو..... اور اس سے زیادہ اللہ کی شکرگزار ہوں کہ ماں نے مجھے انسان کے روپ میں دیکھا ہے۔ اس سے پہلے دیکھتی تو وہ کہتی 'نہیں' یہ میری بیٹی نہیں"۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"تم جا رہی ہو" — مزمل آفندی نے کہا — "میں کیا سمجھوں؟..... ناراض ہو کر جا رہی ہو؟....."

"کل آؤں گی آفندی!" — شمونہ نے قدرے خوشگوار لہجے میں جواب دیا — "میں ناراض نہیں ہوں۔ تمہاری نیت سمجھ گئی ہوں۔ میں چہرے سے نیت معلوم کر لیا کرتی ہوں..... میں نے تمہارے ساتھ کچھ اور باتیں بھی کرنی ہیں"۔

شمونہ چلی گئی۔

○

اگلے روز کا سورج طلوع ہوا۔ مزمل آفندی ناشتے سے فارغ ہو چکا تھا۔ شمونہ اپنی ماں میمونہ کے ساتھ اس کے کمرے میں آگئی۔

"مزمل!" — میمونہ نے کہا — "میری بیٹی نے بتایا ہے کہ تم نے اسے اپنے لئے پسند کیا ہے"۔

"نہیں!" — مزمل آفندی نے کہا — "اپنے لئے پسند کرنے کا مطلب کچھ اور

ہوتا ہے۔ شمونہ بازار کی کوئی چیز نہیں کہ یہ مجھے پسند آگئی ہے اور میں یہ چیز خرید لوں گا۔ صاف بات یہ ہے کہ میں اس کی محبت کا اسیر ہو گیا ہوں اور یہ محبت میری روح میں اُتر گئی ہے اگر شمونہ مجھے قبول نہیں کرے گی تو میری روح سے اس کی محبت نکل نہیں سکے گی"۔

"تمہیں قبول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ شمونہ کرے گی" — میمونہ نے کہا اور پوچھا — "کیا تم اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہو؟"

"شادی صرف اس صورت میں کروں گا کہ یہ میری محبت کو قبول کر لے" — مزمل آفندی نے کہا — "لیکن اے قابلِ احترام خاتون! میں ابھی شادی کی بات ہی نہیں کروں گا۔ پہلے وہ مہم سر کروں گا جس کے لئے میں یہاں رکا ہوں..... حسن بن صباح کی گرفتاری..... سلطان نے حکم دیا ہے کہ حسن بن صباح کو زندہ اس کے سامنے لایا جائے لیکن وہ میرے سامنے آگیا تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ میری تلوار اس کے خون کی پیاسی ہے"۔

"اس لئے کہ اس نے میرے پہلے خاوند کو ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل کروا دیا تھا؟" — میمونہ نے پوچھا — "اور اس لئے کہ اس نے میرے دوسرے خاوند کو بھی قتل کروا دیا ہے؟..... کیا تم ہم ماں بیٹی کو خوش کرنا چاہتے ہو؟"

"نہیں!" — مزمل آفندی نے جواب دیا — "میں اللہ کو اور اللہ کے رسولؐ کی روحِ مقدس کو خوش کرنا چاہتا ہوں۔ حسن بن صباح نے بے شمار عورتوں کو بیوہ اور بے شمار بچوں کو یتیم کیا ہے اور وہ اسلام کی روح کو قتل کر رہا ہے"۔

"آفندی!" — شمونہ بے اختیار بولی — "اگر تم اس ابلیس کو قتل کر دو تو خدا کی قسم' اپنا جسم اور اپنی روح تمہارے قدموں میں ڈال دوں گی"۔

"میں نے اس سے اپنے دو خاوندوں کے قتل کا انتقام لینا ہے" — میمونہ نے کہا — "اور اس نے میری بیٹی کو جو تربیت دی اور اس سے جو قابلِ نفرت کام کروائے ہیں' میں نے اس کا بھی انتقام لینا ہے"۔

"لیکن ماں!" — شمونہ نے کہا — "کیا آپ محسوس نہیں کر رہیں کہ آپ بھی اور آفندی بھی جذباتی باتیں کر رہے ہیں؟ کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ حسن بن صباح کو قتل کرنا اتنا ہی آسان ہے جتنی آسانی سے آپ قتل کے اور لونے کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں

اُس کے ساتھ رہی ہوں۔ کوئی شخص اُس کے پاس اُسے قتل کرنے کے ارادے سے جائے گا تو وہ سوچ میں پڑ جائے گا کہ اس شخص کو قتل کروں یا نہ کروں"۔

"میں اُس کی یہ طاقت دیکھ چکی ہوں" — میمونہ نے کہا۔ "میں اسے طاقت نہیں جادو کہوں تو غلط نہیں ہو گا"۔

"طاقت کہو یا جادو!" — شمونہ نے کہا — "اُسے جتنا میں جانتی ہوں اتنا تم دونوں نہیں جانتے۔ میں کہہ رہی ہوں کہ اسے قتل کرنے کا کوئی اور طریقہ سوچنا پڑے گا۔ اب سلطان اسے پکڑ لانے کے لئے فوج بھیج رہا ہے۔ میں آپ کو بتاتی ہوں وہ نہیں پکڑا جائے گا۔ اگر پکڑا گیا تو بڑا ہی خوبصورت دھوکہ دے کر نکل جائے گا۔ اسے قتل کرانے کے لئے قرامطیوں کو استعمال کیا جائے تو کامیابی کی امید رکھی جا سکتی ہے"۔

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟" — مزمل آفندی نے پوچھا۔

"یہ میں اس لئے کہہ سکتی ہوں کہ میں حسن بن صباح کے ساتھ رہی ہوں" — شمونہ نے جواب دیا — "اس نے تین چار بار یہ الفاظ کہے تھے کہ صرف قرامطی ہیں جن سے میں خطرہ محسوس کرتا ہوں..... میں نے اس سے وجہ پوچھی تو اس نے کہا تھا کہ قرامطی خونخوار لوگ ہیں اور ان کی تاریخ قتل و غارت گری سے بھری پڑی ہے۔ حسن بن صباح نے مجھے بتایا تھا کہ قرامطیوں نے خانہ کعبہ میں بھی مسلمانوں کا قتل عام کیا تھا"۔

"لیکن اب قرامطیوں میں وہ بات نہیں رہی" — میمونہ نے کہا۔

"میں حسن بن صباح کی بات کر رہی ہوں" — شمونہ نے کہا — "وہ کسی سے نہیں ڈرتا۔ خدا سے بھی نہیں ڈرتا لیکن اُس کے دل میں قرامطیوں کا خطرہ موجود رہتا ہے۔ ایک بار اُس نے مجھے ایک ماں بیٹے کا قصہ سنایا اور کہا تھا کہ یہ سچا واقعہ ہے۔ اس کا راوی بغداد کا ایک مشہور طبیب ابوالحسین ہے جو عرصہ ہوا فوت ہو گیا ہے۔ اس کا سنا ہوا یہ واقعہ کاتبوں نے تحریر کر لیا تھا.....

"اس طبیب کے پاس ایک عورت آئی جس کے شانے پر تلوار کا گہرا اور لمبا زخم تھا۔ وہ زخم کی مرہم پٹی کرانے آئی تھی۔ طبیب نے پوچھا کہ یہ زخم کیسے آیا ہے۔ عورت نے زار و قطار روتے ہوئے کہا کہ اس کا اکلوتا اور نوجوان بیٹا کچھ عرصے سے لاپتہ ہے وہ شہروں اور قصبوں کی خاک چھانتی پھری مگر بیٹے کا کھوج نہ ملا.....

وہ قریہ قریہ میں تھی۔ بیٹا وہاں بھی نہیں تھا۔ کسی نے اسے کہا کہ وہ بغداد چلی جائے شاید بیٹا وہاں مل جائے۔ ماں بغداد کو روانہ ہو گئی۔ تھکی ہاری بغداد کے قریب پہنچی تو اسے اپنا بیٹا نظر آ گیا۔ وہ قرامطیوں کے ایک لشکر کے ساتھ جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ماں کی تھکن ختم ہو گئی۔ اس نے بیٹے کو پکارا۔ بیٹا اسے دیکھتے ہی لشکر سے نکل آیا۔ ماں نے اسے گلے لگا لیا۔ پھر اس سے خیر خیریت پوچھی اور گلے شکوے کرنے لگی کہ وہ ماں کو بھول گیا ہے.....

"بیٹا بولا 'فضول باتیں بند کرو ماں' یہ بتاؤ تمہارا دین کیا ہے؟..... ماں نے حیرت زدگی کے عالم میں کہا 'کیا باہر گھوم گھوم کر' دیس سے پردیسی ہو کر تیرا دماغ صحیح نہیں رہا؟ میں اسی دین کو مانتی ہوں جسے پہلے مانتی تھی۔ یہ دین اسلام ہے' سب مذہبوں میں سچا مذہب اسلام ہے..... بیٹا پھٹ کر بولا 'مت غلط بات کہہ ماں! وہ باطل ہے جس کو ہم سچا دین مانتے رہے ہیں۔ سچا دین یہ ہے جس کا اب میں پجاری ہوں۔ یہ ہے قرامطی دین۔ اگر تم اسلام کو مانتی ہو تو قرامطی اسلام کو مانو.....

"ماں کے تو جیسے ہوش ہی اُڑ گئے۔ بیٹے نے صحابہ کرامؓ کے خلاف ایک بیہودہ بات کہہ دی۔ ماں نے اس کے منہ پر تھپڑ مارا اور کہا' کانوں کو ہاتھ لگا' توبہ کر اور اللہ سے معافی مانگ!..... بیٹے نے ماں کو غصے سے گھورا اور اپنے لشکر سے جا ملا۔ ماں کو جس بیٹے کی جدائی نے پاگل کر رکھا تھا اور جو بستی بستی' قریہ قریہ بیٹے کو ڈھونڈتی پھرتی تھی' بیٹے کو لشکر کے ساتھ جاتا دیکھتی رہ گئی.....

"شہر بغداد قریب تھا' ماں بغداد چلی گئی۔ وہ روتی اور فریادیں کرتی تھی۔ اسے اپنے جیسی ایک عورت مل گئی۔ اس نے اس مجبور ماں سے پوچھا کہ وہ کون سا دکھ ہے جو اسے لئے رلا رہا ہے۔ ماں نے حال دل کہہ سنایا۔ عورت نے اسے بتایا کہ وہ ہاشمی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور قرامطیوں کی قید میں بھی رہ چکی ہے جس کی وجہ یہ ہوئی کہ وہ دینِ اسلام سے منحرف نہیں ہوئی.....

"ہاشمی خاندان کی یہ خاتون اس غمزدہ ماں کو اپنے گھر لے جا رہی تھی کہ قرامطی بیٹا پھر سامنے آ گیا۔ اس نے ماں سے پوچھا' تو نے دینِ اسلام کو ترک کرنے کا فیصلہ کیا ہے یا نہیں؟..... ماں نے کہا' میں نے اپنے گمراہ بیٹے کو ترک کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے..... بیٹے نے بڑی تیزی سے تلوار نیام سے نکالی اور للکار کر کہا' میں اپنی ماں کو قرامطی دین پر قربان

کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر اُس نے ماں پر تلوار کا زوردار وار کیا۔ ماں وار بچا تو گئی لیکن کچھ
اُس کے شانے پر پڑی اور زخم گہرا آیا۔ کچھ لوگوں نے دوڑ کر بیٹے کو پکڑ لیا۔ ماں قتل
ہونے سے بچ گئی اور طبیب ابوالحسین کے ہاں جا پہنچی"۔

یہ واقعہ ابنِ اثیر نے "تاریخِ کامل" کی ساتویں جلد کے صفحہ 173 پر لکھا ہے۔ اس کی
تحریر کے مطابق اس واقعہ کا اختتام یوں ہوا تھا کہ قرامطی تعداد میں تو بہت زیادہ ہو گئے
تھے لیکن بغداد میں ابھی ان کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ اپنی ماں پر قاتلانہ حملہ
کرنے والا بیٹا پکڑا گیا۔ ایک روز ماں طبیب سے مرہم پٹی کرا کے آ رہی تھی۔ اُس نے
قیدیوں کی ایک ٹولی دیکھی۔ ہر قیدی کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ ان میں زخمی ماں کا بیٹا بھی
تھا۔ ماں نے بیٹے کو دیکھا اور چلا کر بولی ـــ "اللہ تجھ سے بھلائی نہ کرے جس نے اپنے
سچے دین کو باطل کہا اور رسولؐ کے ساتھیوں کی توہین کی۔ اس قید سے تو کبھی آزاد نہ
ہو"۔

"حسن بن صباح نے مجھے یہ واقعہ سنایا تھا" ـــ شمونہ نے یہ واقعہ سنا کر کہا ـــ "وہ
کہتا تھا کہ میں اس قسم کے پیروکار چاہتا ہوں جو اپنے عقیدے پر خواہ یہ عقیدہ باطل ہی
ہو، اپنی ماں کو، اپنے باپ کو اور اپنے بچوں کو بھی ذبح کر دیں"۔

"ہم قرامطیوں کو کہاں سے لائیں؟" ـــ مزمل آفندی نے کہا۔

"مل جائیں گے" ـــ شمونہ نے کہا ـــ "میں امیرِ شہر سے بات کروں گی لیکن ابھی
نہیں۔ ابھی وہ فوج بھیج رہے ہیں۔ خدا کرے وہ پکڑا جائے۔ اگر نہ پکڑا گیا تو میں
قرامطیوں کا انتظام کروں گی"۔

"شمونہ!" ـــ مزمل آفندی نے کہا ـــ "اگر میں وہی کام کر دوں جو تم سمجھتی ہو کہ
قرامطیوں کے سوا اور کوئی نہیں کر سکتا تو....."

"تو جو انعام مانگو گے امیرِ شہر سے دلواؤں گی" ـــ شمونہ نے اُس کی بات کاٹ کر
کہا۔

"نہیں شمونہ!" ـــ مزمل آفندی نے جذباتی سے لہجے میں کہا ـــ "میں نے کسی
امیر، کسی وزیر اور کسی سلطان سے انعام نہیں لینا" ـــ اُس نے شمونہ کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

شمونہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے کمرے سے نکل گئی۔

○

امیرِ شہر کے محل نما مکان کے عقب میں کچھ دُور بڑا ہی خوشنما باغ تھا جس میں شہر
کے لوگ داخل نہیں ہو سکتے تھے۔ اس میں گھنے پھولدار پودے تھے۔ گھنی بیلیں اور
سارے باغ پر سایہ کئے ہوئے درخت بھی تھے، اور یہ درخت تعداد میں بہت زیادہ تھے۔
بعض بیلیں اس طرح درختوں پر چڑھی ہوئی تھیں کہ سبزے کے غار سے بنے ہوئے
تھے۔

اس دن کا پچھلا پہر تھا، شمونہ مزمل آفندی کے کمرے میں آئی اور یہ کہہ کر چلی گئی
ـــ "میں باغ میں جا رہی ہوں۔ وہاں آ جاؤ"۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہ دونوں باغ کے ایک بہت ہی دلنشیں اور ڈھکے چھپے گوشے میں
بیٹھے ہوئے تھے۔

"کیا میں یہ سمجھوں کہ تم نے میری محبت کو قبول کر لیا ہے شمونہ؟" ـــ مزمل
آفندی نے پوچھا۔

"میں نے تمہاری محبت کو ٹھکرایا تو نہیں" ـــ شمونہ نے کہا ـــ "لیکن مزمل! میں
تمہیں خبردار کرنا ضروری سمجھتی ہوں کہ میری محبت تمہیں راس نہیں آئے گی۔ حسن
بن صباح کے ہاں مجھے ایک بڑا ہی خوبصورت دھوکہ بنایا گیا تھا اور مجھے یہ تربیت دی گئی
تھی کہ جس آدمی کو جال میں لیتا ہو اس پر نشہ بن کر طاری ہو جاؤ اور اسے ہوش ہی نہ
آنے دو کہ وہ ایک بڑے ہی خطرناک دھوکے میں آ گیا ہے..... میں نے یہ کمال حاصل
کیا اور مرو میں اپنے اس کمال کو آزمایا اور ایک ایسے آدمی کی عقل کو اپنی مٹھی میں لے
لیا جو ہلاشک و شبہ زاہد، پارسا اور دانشمند تھا۔ میرا راز فاش ہونے کی وجہ کچھ اور تھی میں
نے حسن بن صباح کا راز بھی فاش کر دیا.....

"میں یہاں آ گئی اور امیرِ شہر ابو مسلم رازی سے پناہ مانگی۔ انہوں نے مجھے پناہ میں
لے لیا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ میرے اندر انسانیت زندہ ہے۔ میں نے اپنی فطرت
کو ابلیسی اوصاف سے پاک کرنے کا عزم کر لیا۔ ابو مسلم رازی نے مجھے ایک ایسے عالمِ
دین کے حوالے کر دیا جو واقعی عالمِ دین تھا۔ میں نے اسے اپنا پیر و مُرشد مان لیا۔ وہ تو
تارک الدنیا تھا۔ میں نے اس کی بہت خدمت کی لیکن ہوا یہ کہ میری روح کی پیاس
بجھتی گئی اور میرے پیر و مرشد کی روح میں تشنگی پیدا ہوتی گئی"۔

شمونہ نے مزمل آفندی کو نوراللہ کا سارا واقعہ سنایا۔

"میں جانتی ہوں اُس نے اپنے آپ کو سزائے موت دی تھی" ۔۔۔ شمونہ نے کہا ۔۔۔ "وہ تو مر گیا لیکن میری ذات میں یا میری روح میں عجیب سی بے چینی اور تلخی پیدا ہو گئی۔ مجھے اپنے وجود سے نفرت ہو گئی۔ میرے دماغ پر یہ خیال غالب آگیا کہ ہر عورت یا ہر خوبصورت عورت کے ساتھ شیطان کا تعلق ضرور ہوتا ہے۔ ابو مسلم رازی نے کہا تھا کہ ایک خوبصورت عورت میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی مرد کے ایمان کو شہ کر اُس میں ابلیس کو بیدار کر سکتی ہے لیکن جن کے ایمان مضبوط ہوتے ہیں ان کا ابلیس کچھ نہیں بگاڑ سکتا"۔

"تم نے مجھے یہ واقعہ کیوں سنایا ہے؟" ۔۔۔ مزمل آفندی نے پوچھا۔

"اس لئے کہ میرے دل نے تمہاری محبت کو قبول کر لیا ہے" ۔۔۔ شمونہ نے کہا ۔۔۔ "تم عام سے امیرزادے ہوتے تو اور بات تھی لیکن میں تم میں کوئی ایسا جذبہ دیکھ رہی ہوں جو ہر کسی میں نہیں ہوتا۔ میں ڈرتی ہوں کہ تم نے مجھے خوبصورت لڑکی سمجھ کر میری محبت کا نشہ اپنے دل پر طاری کر لیا تو میں اپنے آپ کو اس گناہ کی گنہگار سمجھوں گی۔ کبھی تو خدا سے گلہ شکوہ بھی کرتی ہوں کہ مجھے عورت کیوں بنایا تھا..... اگر میں تمہیں تفصیل سے سناؤں کہ میں بچپن میں اغوا ہوئی تھی تو اس عمر سے لے کر جوان ہونے تک مجھے کیسی تربیت ملی اور میں نے کیسی زندگی گزاری ہے تو تم آج بھی مجھ پر اعتبار نہ کرو۔ تم آج بھی مجھے ایک دلکش دھوکہ کہو گے، لیکن میں تمہیں بتاتی ہوں کہ میری ذات میں جو انقلاب آیا ہے اس میں میرا کوئی عمل دخل نہیں' یہ ایک معجزہ ہے۔ میں نے یہ راز پالیا ہے کہ خدا مجھ سے اپنے عظیم اور سچے دین کے لئے کوئی کام کروانا چاہتا ہے"۔

"معلوم نہیں تم نے یہ راز بھی پایا ہے یا نہیں!" ۔۔۔ مزمل آفندی نے کہا ۔۔۔ "اللہ کی ذاتِ باری نے تمہارے گناہ بخش دیئے ہیں..... اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ میری تمہارے ساتھ یہ ملاقات جو غیر متوقع طور پر اور انوکھے طریقے سے ہوئی ہے' اس کا کوئی خاص مقصد ہے اور یہ مقصد اللہ کی ذاتِ باری نے متعین کیا ہے..... تم نے ٹھیک کہا ہے کہ میں اپنے دل پر تمہیں صرف خوبصورت لڑکی سمجھ کر محبت کا نشہ طاری نہ کروں..... نہیں شمونہ! میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے تمہیں پہلے کہا تھا کہ میں نے

تم میں کوئی خاص بات دیکھی ہے"۔

"میں تمہیں وہ خاص بات بتا دیتی ہوں" ۔۔۔ شمونہ نے کہا ۔۔۔ "میں حسن بن صباح کو قتل کرنا چاہتی ہوں۔ اس نے میرے دو باپ قتل کروائے ہیں۔ ایک سگا دوسرا سوتیلا۔ اس نے میری ماں کو دو بار بیوہ کیا ہے۔ یہ تو میرا ذاتی معاملہ ہے۔ دوسرا معاملہ اسلام کا ہے۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان اور اسلام کا شیدائی ظاہر کر رہا ہے لیکن وہ اسلام کی جڑیں کاٹ رہا ہے..... ایک بات اور بھی ہے۔ اُس نے میرے قتل کا حکم دے رکھا ہے۔ اُس نے مجھے ایک شخص کے گھر میں قیدی کی حیثیت سے رکھا تھا۔ اس شخص کی بیوی کو پتہ چل گیا کہ مجھے قتل کیا جائے گا۔ اس نے مجھے رات کو فرار کرا دیا اور میں امیرِ شہر ابو مسلم رازی کے پاس آگئی"۔

"یہی عزم میرا ہے" ۔۔۔ مزمل آفندی نے کہا ۔۔۔ "یہ کام میں نے کرنا ہے۔ اگر میں اس مہم میں ناکام رہا اور مارا گیا تو یہ کام کرنے کی کوشش کرنا۔ میں اپنی زندگی میں تمہیں آگے نہیں جانے دوں گا۔ میں فوج کے ساتھ جا رہا ہوں۔ سالار امیر ارسلان حسن بن صباح کو سلطان کے حکم کے مطابق زندہ پکڑنے کی کوشش کرے گا اور پکڑ بھی لے گا لیکن میں اُسے وہیں قتل کر دوں گا"۔

حسن بن صباح کے قتل کی باتیں کرتے کرتے وہ ایک دوسرے میں مکمل مل گئے اور جذباتی باتوں پر آگئے۔ شمونہ جب وہاں سے نکلی تو وہ مزمل آفندی کی محبت سے سرشار تھی۔

O

تین چار دنوں بعد ابو مسلم رازی نے مزمل آفندی کو بلایا۔ سالار امیر ارسلان آگیا تھا۔

"پانچ سو سواروں کا دستہ آگیا ہے" ۔۔۔ ابو مسلم رازی نے مزمل آفندی کو بتایا ۔۔۔ "آج ہی جتنی جلدی ہو سکے روانہ ہونا ہے۔ اگر قافلہ بغداد سے نکل گیا ہو تو اس کے تعاقب میں جانا ہے۔ تم حسن بن صباح کو پہچانتے ہو۔ امیر ارسلان نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔ تم ہمارے مہمان ہو اور ہمارے لشکری یا ملازم نہیں ہو اس لئے یہ فرض تم پر عائد نہیں ہوتا کہ وہاں اگر لڑائی ہو جائے تو تم بھی لڑو"۔

"کیا آپ کو توقع ہے کہ وہاں لڑائی ہو گی؟" ۔۔۔ مزمل آفندی نے پوچھا۔

"ہاں!" — ابو مسلم رازی نے جواب دیا — "تم شاید نہیں سمجھتے۔ جسے تم قافلہ کہہ رہے ہو اس میں حسن بن صباح کے باقاعدہ لڑنے والے آدمی بھی ہوں گے"۔

"میں ایک بات کہوں گا امیرِ شہر!" — مزمل آفندی نے کہا — "اگر بات لڑائی تک آ گئی تو پھر میں یہ نہیں دیکھوں گا کہ لڑنا میرا فرض ہے یا نہیں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ سلطانِ معظم نے حسن بن صباح کو زندہ پکڑنے کا حکم دیا ہے لیکن امیرِ شہر! حسن بن صباح میرے سامنے آ گیا تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میں اسے زندہ ہی پکڑوں گا"۔

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں" — ابو مسلم رازی نے کہا — "اس شخص کو میں بھی زندہ نہیں دیکھنا چاہتا۔ بہرحال میری طرف سے تمہارے لئے کوئی حکم اور کوئی پابندی نہیں"۔

دن کا پچھلا پہر تھا جب سالار امیر ارسلان کی قیادت میں پانچ سو سواروں کا دستہ رے سے کوچ کر گیا۔

انہیں بتانے والا کوئی نہ تھا کہ حسن بن صباح بغداد سے اس قافلے کو چھوڑ کر اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اُسی روز اصفہان کی طرف روانہ ہو گیا تھا جس روز مزمل آفندی میمونہ کو ساتھ لے کر وہاں سے نکلا تھا۔

یہ بتانا مشکل ہے کہ پانچ سو سواروں کا یہ دستہ کتنے پڑاؤ کر کے اور کتنے دنوں بعد بغداد پہنچا۔ اس دستے کی رفتار بہت ہی تیز تھی۔ دستہ جب بغداد پہنچا تو پتہ چلا کہ قافلے کو یہاں سے روانہ ہوئے تین دن گزر گئے ہیں۔ امیر ارسلان نے دستے کو کچھ دیر آرام دیا، کچھ کھلایا پلایا اور وہاں سے قافلے کے تعاقب میں کوچ کر گئے۔

جو قافلہ تین دن پہلے روانہ ہوا تھا اُس تک سوار دستے کو پہنچنے کے لئے کم از کم دو دن تو ضرور ہی لگنے تھے۔ امیر ارسلان نے اپنے دستے کو صرف ایک پڑاؤ کرایا اور بڑی تیز رفتار سے قافلے کے تعاقب میں گیا۔

اُس روز جس روز سواروں کا دستہ قافلے تک پہنچا سورج سر پر آ گیا تھا اور قافلہ ایک ہرے بھرے، سرسبز علاقے میں سے گزر رہا تھا۔ دو اونچی پہاڑیاں تھیں جن کے درمیان کشادہ وادی تھی۔

امیر ارسلان اور مزمل آفندی دستے کے آگے آگے جا رہے تھے۔ ان کا راستہ ایک پہاڑی کی ڈھلان پر تھا۔ وہ ایک موڑ مڑے تو نیچے انہیں قافلہ جاتا نظر آیا۔ قافلے میں ایک ہزار سے زیادہ لوگ تھے۔ چند ایک گھوڑے اور کچھ اونٹ بھی تھے۔ بعض اونٹوں

پر کجاوے تھے۔ ان میں بھی مسافر سوار تھے۔ یہ مسافر یقیناً مالدار خاندانوں کی عورتیں تھیں۔ سالار امیر ارسلان نے اپنے دستے کو روک لیا۔

"تم بھی سوچو آفندی!" — امیر ارسلان نے مزمل آفندی سے کہا — "اگر ہم قافلے کے عقب سے گئے تو قافلے والے ہمیں ڈاکو سمجھ کر آگے کو بھاگ اٹھیں گے۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ حسن بن صباح اور اس کے ساتھی اتنے ہوشیار اور چالاک ہیں کہ وہ پہاڑیوں میں بکھر کر غائب ہو جائیں گے"۔

"یہ تو میں بھی جانتا ہوں" — مزمل آفندی نے کہا — "حسن بن صباح لومڑی کی خصلت کا انسان ہے۔ مجھے تو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ دیکھتے ہی دیکھتے غائب ہو جاتا ہے۔ قافلے کو گھیرے میں لیا جائے"۔

سالار امیر ارسلان تجربہ کار سالار تھا۔ اس نے اپنے دستے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک حصے کے کمانڈر کو قافلہ دکھایا اور اسے کہا کہ وہ دور کا چکر کاٹ کر اس وادی کے اگلے حصے میں پہنچے اور قافلے کو اس طرح روک لے کہ کسی کو اِدھر اُدھر بھاگنے یا چھپنے کا موقع نہ ملے۔

امیر ارسلان خود دوسرے حصے کے ساتھ رہا۔ اُس نے ان سواروں کو اُس وقت آگے لے جانا تھا جب دوسرے حصے نے قافلے کا راستہ روک لینا تھا۔ دوسرے حصے کے کمانڈر نے بلندی پر کھڑے ہو کر قافلے کے اِرد گِرد کے علاقے کو دیکھا۔ وہ اپنے لئے راستہ دیکھ رہا تھا۔

○

قافلے کو دیکھنے والے سوار پیچھے مڑے اور جس پہاڑی کے ڈھلانی راستے پر وہ آ رہے تھے، اسی پہاڑی سے اترے۔ پہاڑیوں کے اندر اندر وہ دور تک چلے گئے۔ امیر ارسلان نے اپنے سواروں کو اس پہاڑی سے اتار لیا۔ وہ بلند راستے پر اس خیال سے نہ چلے کہ قافلے میں سے کسی نے گھوم کے دیکھ لیا تو وہ سارے قافلے کو خبردار کر دے گا اور حسن بن صباح کو نکل بھاگنے کا موقع مل جائے گا۔ قافلہ اپنی رفتار سے جا رہا تھا۔

اس پہاڑی علاقے میں داخل ہونے سے پہلے قافلے کے چار پانچ آدمیوں نے قافلے کو روک لیا تھا اور کہا تھا کہ اب ہم بڑی خطرناک جگہ پر آ گئے ہیں۔ یہاں تین قافلے لٹ چکے ہیں۔ ڈاکو مال و دولت کے ساتھ جوان عورتوں کو بھی لے گئے تھے۔

"تمام جوان آدمی چوکس ہو جاؤ" — ایک آدمی نے اعلان کیا — "جس کے پاس جو بھی ہتھیار ہے وہ ہاتھ میں رکھے اور اگر ڈاکوؤں کا حملہ ہو گیا تو لڑنے والے تمام آدمی قافلے کے باہر باہر رہیں اور عورتوں اور بچوں کو ایک جگہ اکٹھا کر لیں اور لوگ انہیں اپنے نرغے میں لے لیں..... اپنے آپ پر ڈاکوؤں کا خوف طاری نہ کر لینا۔ دیکھا گیا ہے کہ لوگوں پر ڈاکوؤں اور رہزنوں کی دہشت طاری ہو جاتی ہے اور یہ دہشت اتنا کمزور کر دیتی ہے کہ دہشت زدہ لوگ ڈاکوؤں کے آگے بھاگ نکلتے ہیں یا ہتھیار ڈال دیتے ہیں"۔

دیکھتے ہی دیکھتے چار سو سے کچھ زیادہ نوجوان' جوان سال اور ادھیڑ عمر آدمی قافلے سے الگ ہو گئے۔ یہ سب لڑنے والے تھے۔ اُس دَور میں لوگ تلواریں اس طرح اپنے ساتھ رکھتے تھے جیسے عورتیں زیور پہنتی ہیں۔ ان میں زیادہ آدمیوں کے پاس تلواریں تھیں اور باقی جو تھے' ان میں سے کچھ برچھیوں سے مسلح تھے اور بعض کے پاس خنجر تھے۔ یہ سب آدمی قافلے کے پہلوؤں کے ساتھ' کچھ قافلے کے آگے اور باقی قافلے کے پیچھے ہو گئے۔ اس طرح قافلے کو اپنے حفاظتی حصار میں لے کر انہوں نے کہا کہ اب چلو۔

دو پہاڑیوں کے درمیان کشادہ وادی سے گزرتے قافلے کی ترتیب یہی تھی۔ قافلہ لڑنے والوں کے حصار میں تھا۔

عصر کا وقت تھا جب اچانک قافلے کے سامنے سے چند ایک سوار نمودار ہوئے۔ قافلہ بہت ہی لمبا تھا۔

"ہوشیار ہو جاؤ" — یہ بڑا ہی بلند اعلان تھا جو قافلے میں سے ایک آدمی نے کیا — "ڈاکو آ گئے ہیں..... ڈرنا نہیں۔ ہم لڑیں گے"۔

"ہم ڈاکو نہیں" — سواروں کے کمانڈر نے بڑی ہی بلند آواز میں کہا — "بے خوف ہو کر رک جاؤ"۔

"بزدلو' ڈاکوؤ!" — قافلے میں سے للکار سنائی دی — "آگے بڑھو' ہم تیار ہیں"۔

سواروں کے کمانڈر نے تمام سواروں کو سامنے لانے کی بجائے یہ عقلمندی کی کہ سواروں کو دو حصوں میں تقسیم کر کے دونوں پہاڑیوں کی ڈھلانوں پر چڑھا دیا اور ساتھ ساتھ اعلان کیا کہ کوئی لڑنے کی حماقت نہ کرے' ہم سلطان کی فوج کے سپاہی ہیں' تمہیں حفاظت میں رکھنا ہماری ذمہ داری ہے۔

اتنے میں امیر ارسلان اپنے سواروں کو لے کر قافلے کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس نے جب اپنے دوسرے کمانڈر کی یہ عقلمندی دیکھی کہ اس نے گھوڑے ڈھلانوں پر چڑھا دیئے تھے تو امیر ارسلان نے بھی اپنے سواروں کو قافلے کے پہلوؤں پر لے جانے کی بجائے ڈھلانوں کی بلندی پر رکھا۔ قافلے میں قیامت برپا ہو گئی۔ عورتوں اور بچوں کی چیخیں زمین و آسمان کو ہلانے لگیں۔ سواروں کی طرف سے بار بار اعلان ہو رہا تھا کہ وہ ڈاکو نہیں لیکن قافلے میں جو لڑنے والے جوان تھے وہ سواروں کو للکار رہے تھے۔ سالار امیر ارسلان اور مزمل آفندی بلندی پر چلے گئے۔

"میں سالار امیر ارسلان ہوں" — اُس نے اعلان کیا — "حسن بن صباح اپنے تمام ساتھیوں کے ساتھ میرے سامنے آ جائے..... حسن بن صباح! تم خود میرے سامنے آ جاؤ گے تو زندہ رہو گے اور اگر میں نے تمہیں خود ڈھونڈ کر پکڑا تو پھر میں تمہاری زندگی کی ضمانت نہیں دے سکتا"۔

اس اعلان کے جواب میں بھی دو تین جوشیلے جوانوں نے للکار کر کہا کہ وہ دھوکے میں نہیں آئیں گے اور پورا مقابلہ کریں گے۔

"قافلے والو!" — مزمل آفندی نے بلندی سے اعلان کیا — "مجھے دیکھو اور پہچانو۔ میں نے تمہارے ساتھ بغداد تک سفر کیا ہے۔ میرا بڑا بھائی' اس کی بیوی اور بچے اس قافلے میں شامل ہیں۔ کیا تم مجھے بھی ڈاکو سمجھتے ہو؟"

مزمل آفندی کا بڑا بھائی ان میں سے نکلا اور دوڑتا ہوا ڈھلان پر چڑھا۔ مزمل آفندی گھوڑے سے کود کر اُترا اور اپنے بڑے بھائی سے بغلگیر ہو کر ملا۔ اس نے بھائی کو بتایا کہ یہ سلطان ملک شاہ کے فوجی ہیں اور حسن بن صباح کی گرفتاری کے لئے آئے ہیں۔

"وہ اس قافلے میں نہیں ہے" — مزمل کے بڑے بھائی نے کہا — "سالار محترم! میرا یہ بھائی ایک خاتون کو حسن بن صباح کے جال سے نکال کر بغداد سے نکلا تھا تو اس کے فوراً بعد حسن بن صباح بغداد سے نکل گیا تھا"۔

"کیا کوئی یہ بتا سکتا ہے کہ وہ کس طرف گیا تھا؟" — امیر ارسلان نے پوچھا۔

"اس قافلے کے بہت سے لوگ اس کے معتقد اور مرید ہو گئے تھے" — مزمل کے بھائی نے جواب دیا — "یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ اللہ کی برگزیدہ ہستی ہے اور غیب کی خبر دینے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس نے جہاز کو بڑے ہی تیز و تند سمندری طوفان سے نکال لیا

تھا۔ وہ جب بغداد سے روانہ ہونے لگا تو اس کے مریدوں نے اسے گھیر لیا اور پوچھا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کچھ لوگ تو اس کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے تھے لیکن اُس نے سب کو روک دیا اور کہا تھا کہ اُسے آسمان سے اشارہ ملا ہے کہ وہ فوراً اصفہان پہنچے۔ اُس نے یہ بھی کہا تھا کہ اصفہان جا کر اسے اللہ کی طرف سے ایک اور اشارہ ملے گا۔ پھر وہ چلا گیا تھا"۔

سالار امیر ارسلان نے اپنے چند ایک سواروں کو ساتھ لیا اور نیچے اتر آیا۔ وہ قافلے کے سامنے گیا۔ مزمل آفندی اور اس کا بڑا بھائی اس کے ساتھ تھے۔ اُس نے قافلے کے ہر ایک آدمی کو دیکھا اور قافلے کے ساتھ ساتھ چلا گیا۔ قافلہ تقریباً ایک میل لمبا تھا۔ حسن بن صباح کو پہچاننے کے لئے مزمل اور اس کا بھائی ساتھ تھے۔ امیر ارسلان نے اونٹوں کے کجاووں اور پالکیوں کے پردے ہٹا کر دیکھا اور اس طرح دیکھتے دیکھتے قافلے کے دوسرے سرے تک چلا گیا۔ چند اور آدمیوں سے حسن بن صباح کے متعلق پوچھا۔ ان سب نے بتایا کہ حسن بن صباح اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ کرائے کے گھوڑوں اور ایک اونٹ کے ساتھ ان جانوروں کے مالکوں سمیت بغداد سے چلا گیا تھا اور اس کی منزل اصفہان تھی۔

سواروں نے قافلے کو ایسے گھیرے میں لے لیا تھا کہ کسی کو نکل بھاگنے کا موقع مل ہی نہیں سکتا تھا۔

سالار امیر ارسلان نے اعلان کروایا کہ قافلہ جا سکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کروایا کہ قافلے پر ڈاکوؤں کا کوئی گروہ حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرے گا کیونکہ یہ پانچ سو سوار اسی علاقے میں اصفہان تک موجود رہیں گے۔

امیر ارسلان نے اپنے سواروں کو بلا کر کوچ کی ترتیب میں کر لیا اور اصفہان کی طرف روانہ ہو گیا۔ ان کے پیچھے پیچھے قافلہ بھی چل پڑا۔

○

سواروں کو اصفہان جلدی پہنچنا تھا اس لئے وہ قافلے سے دور آگے نکل گئے اور کچھ دیر بعد بڑی پہاڑیوں کے درمیان سے بھی نکل گئے۔ علاقہ تو آگے بھی پہاڑی ہی تھا لیکن پہاڑیاں زیادہ اونچی نہیں تھیں۔ بعض تو ٹیکریوں جیسی تھیں اور بکھری ہوئی تھیں۔

ان ٹیکریوں میں سے ایک گھوڑے کے سرپٹ دوڑنے کی آوازیں سنائی دیں جو

گھوڑے کی رفتار سے دور ہٹتی جا رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک گھوڑا قافلے کی طرف سے سوار دستے کی طرف دوڑتا آیا اور سالار امیر ارسلان کے پہلو میں جا رکا۔

"محترم سالار!" ـــ سوار نے کہا ـــ "قافلے میں سے ایک سوار نکلا اور اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ مجھے شک ہے کہ وہ حسن بن صباح کے آدمیوں میں سے تھا اور اصفہان جا کر یا جہاں کہیں بھی وہ ہے اطلاع دینے گیا ہے کہ اس کی گرفتاری کے لئے ایک سالار آ رہا ہے"۔

اس سوار کو پکڑنا ممکن نہیں تھا۔ اس کے گھوڑے کے ٹاپ بھی اب سنائی نہیں دیتے تھے۔ امیر ارسلان اپنے سوار دستے کو سرپٹ تو نہیں دوڑا سکتا تھا کہ وہ اس سوار کے ساتھ ساتھ اصفہان پہنچ جاتا۔ اس نے سوار دستے کو ذرا تیز چلنے کا حکم دیا۔

اصفہان میں ایک بہت بڑا مکان تھا جس کی شکل و صورت ایک قلعے جیسی تھی۔ حسن بن صباح کچھ دن پہلے وہاں پہنچا تھا اور اس نے احمد بن عطاش کو اپنی آمد کی اطلاع دی تھی۔ احمد بن عطاش خلجان میں تھا۔ اطلاع ملتے ہی وہ بڑی لمبی مسافت تھوڑے سے وقت میں طے کر کے اصفہان پہنچ گیا۔ حسن بن صباح نے اسے سنایا کہ مصر میں اس کے ساتھ کیا بیتی تھی اور اسے قید میں ڈال دیا گیا تھا اور کس طرح وہ قید سے رہا ہوا اور جس طرح وہ مصر سے حلب پہنچا تھا وہ ساری روداد سنائی پھر پوچھا کہ اب وہ خلجان آئے یا نہیں۔

"تمہیں آخر آنا ہی ہے حسن!" ـــ احمد بن عطاش نے کہا ـــ "لیکن ہمارے جاسوسوں نے جو اطلاعیں دی ہیں وہ یہ ہیں کہ سلطان ملک شاہ تمہیں گرفتار کرنے کی کوشش میں ہے۔ تم ابھی یہیں رہو"۔

"میرے پیر استاد!" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "مجھے یہ بتائیں کہ لوگ مجھے بھول تو نہیں گئے؟ کیا آپ نے اس سلسلے میں کوئی اور کام کیا ہے؟"

"تم بھول جانے کی بات کرتے ہو حسن!" ـــ احمد بن عطاش نے کہا ـــ "لوگ تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ میں نے جو کامیابی حاصل کی ہے وہ تم وہاں آ کر دیکھو گے۔ ہم لوگوں کو یہ بتا رہے ہیں کہ خدا کا ایلچی اب پہلے کی طرح اسی علاقے میں کہیں آسمان سے اترے گا اور جو بھی اس کا پیروکار بنے گا اُسے اس دنیا میں جنت مل جائے گی۔ لوگ تمہارے نام پر جانیں دینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ میں نے جانبازوں کا ایک گروہ تیار کر

لیا ہے جو ایک اشارے کا منتظر رہتا ہے۔ ہم بہت جلدی سلجوقیوں کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔ اس علاقے کی تقریباً تمام مسجدوں میں جو امام یا خطیب ہیں وہ سب ہمارے آدمی ہیں۔ وہ لوگوں کو قرآن اور احادیث کی جو تفسیریں سنا رہے ہیں ان میں ہمارے عقیدے اور خدا کے ایلچی کے نزول کی پیش گوئیاں ہوتی ہیں۔ لوگ اسی کو صحیح اسلام سمجھ رہے ہیں"۔

"لڑکیوں کا گروہ تیار ہوا ہے یا نہیں؟" — حسن بن صباح نے پوچھا — "اور کیا جانبازوں کو حشیش دی جا رہی ہے یا نہیں؟"

"حشیش نے ہی تو ہمارا کام آسان کیا ہے" — احمد بن عطاش نے کہا — "لوگوں کو خصوصاً" لڑنے والے لشکریوں کو معلوم ہی نہیں کہ ہم انہیں کھانے پینے کی اشیاء میں حشیش دے رہے ہیں۔ ہماری لڑکیوں نے جو کام کئے ہیں وہ تم وہاں آکر دیکھو گے۔ بعض قبیلوں کے سردار جو ہماری باتوں کا اثر قبول نہیں کر رہے تھے بلکہ ہمارے خلاف ہو گئے تھے، انہیں ہماری لڑکیوں نے ایسا رام کیا ہے کہ اب وہی سردار ہماری طاقت بن گئے ہیں"۔

تمام مؤرخوں نے تفصیل سے لکھا ہے کہ ان لوگوں نے انسانی فطرت کی کمزوریوں اور فطری مطالبات کے عین مطابق لوگوں کے ذہنوں میں اپنا باطل عقیدہ ڈالا تھا۔ داستان گو پہلے بیان کر چکا ہے کہ لوگوں کو اکٹھا کر کے آگ میں ایسی کوئی جڑی بوٹی ڈال دی جاتی تھی جس کا دھواں اور جس کی بو انسانی ذہن پر نشہ سا طاری کر دیتی تھی لیکن لوگ محسوس نہیں کرتے تھے کہ ان کے دماغوں پر کس طرح قبضہ کیا جا رہا ہے۔ وہ بظاہر ذہنی طور پر نارمل رہتے تھے لیکن ان جڑی بوٹیوں کی وجہ سے حسن بن صباح کے ٹولے کے قبضے میں چلے جاتے تھے پھر اس ٹولے کے بڑے لوگ جب باطل کی بھی کوئی بات کرتے تھے تو ان کے دماغ باطل کو بھی قبول کر لیتے تھے۔

دراصل وہ پسماندگی کا دور تھا۔ لوگ جو مسلمان تھے وہ اس لئے مسلمان تھے کہ دین اسلام ان کے ورثے میں چلا آ رہا تھا۔ جو اگر کسی کی باتوں میں نہیں آتے تھے تو وہ عیسائی اور یہودی تھے۔ اسلام کے دائرے میں رہ کر مسلمانوں کو کوئی نئی چیز بتائی جاتی تو وہ غور سے سنتے اور اسے اسلامی سمجھ کر قبول کر لیتے تھے۔ اگر آج کی زبان میں بات کی جائے تو یوں کہا جا سکتا ہے کہ کسی خاص جڑی بوٹی کے دھوئیں اور قرآن کی نئی تفسیروں کے

ذریعے سیدھے سادے لوگوں کو ہپناٹائز کر لیا گیا تھا۔ لوگوں کو کچھ شعبدے بھی دکھائے گئے تھے۔ لوگ نہ سمجھ سکے کہ ان کے ذہنوں میں شیطانی نظریات ٹھونسے جا رہے ہیں۔ لوگوں کو انہیں بتائے بغیر جس جڑی بوٹی کا دھواں دیا جاتا تھا وہ مؤرخوں کے کہنے کے مطابق، حشیش کا پودا تھا۔ سینکڑوں جانبازوں کا جو گروہ تیار کیا گیا اسے انہیں بتائے بغیر حشیش پلائی جاتی تھی۔

○

احمد بن عطاش ابھی وہیں تھا کہ اطلاع دی گئی کہ ایک سوار آیا ہے جس کی حالت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی..... اُسے فوراً" اندر بلا لیا گیا۔ اُس کی حالت بہت ہی بری تھی۔ اصفہان تک جلدی پہنچنے کے ارادے سے اس نے اتنے لمبے سفر میں پڑاؤ کیا ہی نہیں تھا گھوڑے کو چند جگہوں پر روک کر پانی پلایا اور سفر جاری رکھا۔ اُس سے بولا بھی نہیں جاتا تھا۔

"سلطان کے پانچ چھ سو سوار آ رہے ہیں" — اس نے بڑی مشکل سے کہا — "آپ کو گرفتار کریں گے۔ اچھا ہوا آپ پہلے نکل آئے تھے۔ کسی نے بتا دیا ہے کہ آپ اصفہان چلے گئے ہیں..... وہ اِدھر آ رہے ہیں" — اور وہ بیہوش ہو گیا۔

"مجھے یہاں سے نکل جانا چاہئے" — حسن بن صباح نے کہا — "لیکن جاؤں کہاں؟..... خلجان؟..... شاہ در؟"

"نہیں!" — احمد بن عطاش نے کہا — "کسی بھی بڑے شہر میں جانا خطرناک ہو گا۔ قلعہ تبریز گمنام سا قلعہ ہے، دور بھی نہیں۔ وہاں اپنے آدمی ہیں۔ سب قابلِ اعتماد ہیں اور ضرورت پڑی تو جانیں قربان کر دیں گے"۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حسن بن صباح کو رات کے سیاہ پردے میں قلعہ تبریز پہنچا دیا گیا۔ صرف ایک دن اور گزرا تو سالار امیر ارسلان پانچ سو سواروں کے ساتھ پہنچ گیا۔ یہ دستہ طوفان کی طرح اصفہان کی گلیوں میں بکھر گیا۔ سوار اعلان کرتے پھر رہے تھے کہ حسن بن صباح باہر آ جائے۔ ہم ہر گھر کی تلاشی لیں گے۔ جس گھر سے حسن بن صباح برآمد ہو گا اُس گھر کے ہر مرد اور عورت کو ساری عمر کے لئے قید میں ڈال دیا جائے گا۔

اُس وقت اصفہان سلجوقیوں کے زیرِ نگیں تھا۔ کوئی خاندان کسی مشکوک آدمی کو پناہ نہیں دے سکتا تھا۔ اس قلعہ نما مکان پر کوئی شک نہیں کر سکتا تھا جہاں حسن بن صباح

نصرا اور احمد بن عطاش اسے آکر ملا تھا۔ اس مکان میں مذہب پرست لوگ رہتے تھے لیکن وہ تجارت پیشہ تھے۔ وہ مسلمان تھے۔ احمد بن عطاش اب بھی وہاں موجود تھا لیکن اس نے اپنا حلیہ بدل لیا تھا۔ وہ اس مکان کے اصطبل کا سائیس بن گیا تھا۔ سر کے اور داڑھی کے بال بکھیر لئے تھے۔ کپڑے بوسیدہ سے پہن لئے اور ان پر گھوڑوں کی لید کے داغ دھبے لگا لئے تھے۔ وہ ذرا اکھڑا بن گیا تھا۔

بہت دیر کے بعد جب کسی نے بھی نہ کہا کہ حسن بن صباح اس کے گھر میں ہے، ایک ضعیف بڑھیا امیر ارسلان کے پاس آئی۔

"میں گزشتہ رات قلعہ تمریز سے آئی ہوں" ۔۔۔ بڑھیا نے کہا ۔۔۔ "میرا ایک نوجوان پوتا وہاں رہتا ہے۔ اس سے مجھے بہت پیار ہے۔ کبھی کبھی اپنی گھوڑی پر اسے دیکھنے جاتی ہوں۔ وہاں وہ کوئی کام نہیں کرتا لیکن رہتا بڑی شان سے ہے۔ میں اسے ملنے گئی تھی۔ رات سے پہلے واپسی سفر کو روانہ ہوئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں دروازے سے نکلنے لگی تو چھ گھوڑ سوار دروازے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے مجھے روک لیا اور پوچھا کون ہو.....

"میں نے کہا' خود ہی دیکھ لو۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھی ہوں۔ پوتے سے ملنے گئی تھی' واپس اصفہان جا رہی ہوں..... ان میں سے ایک نے کہا' جانے دو اسے۔ اسے تو اپنی ہوش نہیں..... اندر سے سات آٹھ آدمی دوڑتے آئے۔ میں دروازے سے باہر آگئی۔ ان میں سے ایک آدمی نے کہا' خوش آمدید حسن بن صباح' آج ہماری قسمت جاگ اٹھی ہے..... ایک اور آدمی کی آواز سنائی دی' نام مت لو احمق' تمہاری آواز اصفہان تک پہنچ سکتی ہے..... معلوم نہیں یہ وہی حسن بن صباح ہے جسے تم ڈھونڈ رہے ہو یا یہ کوئی اور ہے"۔

امیر ارسلان نے اس بڑھیا کے بیٹوں کو بلایا اور پوچھا کہ ان میں سے کس کا بیٹا قلعہ تمریز میں ہے۔

"وہ میرا بیٹا ہے" ۔۔۔ ایک آدمی نے کہا۔

"وہ وہاں کیا کر رہا ہے؟"

"گمراہ ہو گیا ہے" ۔۔۔ اس نے جواب دیا ۔۔۔ "باطنیوں کے جال میں آگیا ہے اور خدا کے ایلچی کا جانباز بن گیا ہے۔ ہم صحیح العقیدہ مسلمان ہیں۔ معلوم نہیں ہمارے بیٹے

ایسا سبز باغ دکھائے گئے ہیں کہ وہ حسن بن صباح کے نام کا ہی ورد کرتا رہتا ہے"۔

اس طرح کڑی سے کڑی ملاتے یہ یقین ہو گیا کہ حسن بن صباح قلعہ تمریز میں ہے۔ سالار امیر ارسلان نے اسی وقت کوچ کا اور قلعہ تمریز کو محاصرے میں لینے کا حکم دے دیا۔

○

یہاں ایک دو وضاحتیں ضروری ہیں۔ یہ قلعہ تمریز ایران کا آج والا شہر تبریز نہیں۔ یہ ایک گمنام سی بستی تھی جس کا نام و نشان ہی مٹ گیا ہے۔

دوسری وضاحت یہ کہ بعض مؤرخوں نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح قلعہ الموت میں جا چھپا تھا اور امیر ارسلان نے وہاں حملہ کیا تھا۔ یہ صحیح نہیں۔ اس وقت حسن بن صباح کے فرقے نے قلعہ الموت پر قبضہ ہی نہیں کیا تھا۔ قلعہ الموت پر اس فرقے کا قبضہ دس سال بعد ہوا تھا اور وہاں خواجہ حسن طوسی نظام الملک نے حملہ کیا تھا۔

بعد کے اکثر تاریخ نویسوں نے قلعوں کے نام لکھنے میں غلطیاں کی ہیں۔ وہاں بہت سے چھوٹے بڑے قلعے تھے۔ ان میں سے بیشتر پر حسن بن صباح کے فرقے کا قبضہ ہو گیا تھا۔

تو یہ تھا قلعہ تمریز جسے سالار امیر ارسلان کے پانچ سو سواروں نے محاصرے میں لے لیا۔ انہوں نے دیواروں پر کمندیں پھینکنے کے لئے رسے اور دیواریں توڑنے کے لئے سامان' کمانیں اور تیروں کا ذخیرہ اصفہان سے لے لیا تھا۔

"آثرو تلبیس" اور "سنین اسلام" کے مطابق حسن بن صباح کے پاس لڑنے والے صرف ستر آدمی تھے اور یہ سب جانباز تھے۔ چھوٹے سے اس قلعے کے دو دروازے کھلے ہوئے تھے جو اس وقت بند ہونے لگے جب امیر ارسلان کا سوار دستہ بالکل قریب پہنچ گیا تھا۔ چند ایک سواروں نے گھوڑوں کو ایڑ لگا دی کہ وہ دونوں دروازوں سے اندر چلے جائیں۔

دروازے بند ہو رہے تھے۔ اندر کے جانبازوں نے ایسی بے خوفی اور بے جگری سے مقابلہ کیا کہ سوار دروازوں میں داخل نہ ہو سکے اور دروازے بند ہو گئے۔ یہ کوئی بڑا قلعہ نہیں تھا کہ اس کے دروازے لوہے اور شاہ بلوط کی لکڑی کے بنے ہوتے اور ٹوٹ ہی نہ سکتے۔ عام سی لکڑی کے دروازے تھے۔ سواروں نے گھوڑوں سے اتر کر دروازے

توڑنے شروع کر دیئے۔

اُدھر سواروں نے دیوار پر کمندیں پھینکیں۔ کوئی کمند دیوار سے اٹک جاتی تو حسن بن صباح کے جانباز رسّہ کاٹ دیتے اور اوپر سے تیر بھی برساتے تھے۔ تیروں کے جواب میں سواروں نے بھی تیراندازی شروع کر دی۔ تیروں کے سائے میں چند ایک سپاہی اوپر چلے گئے۔ دیوار اتنی چوڑی نہیں تھی کہ اس پر لڑا جا سکتا۔ وہ اندر کود گئے۔ جانبازوں نے انہیں نرغے میں لے لیا لیکن ایک آواز نے ان کا نرغہ توڑ دیا۔

"دروازے ٹوٹ گئے ہیں" — دونوں دروازوں سے للکار اٹھ رہی تھی — "دروازوں پر آجاؤ۔ دشمن اندر نہ آجائے"۔

حسن بن صباح کے جانباز دروازوں کی طرف اٹھ دوڑے۔ امیر ارسلان کے آدمیوں نے جو اب سوار نہیں پیادے بن گئے تھے' ان جانبازوں پر تابڑ توڑ حملے کئے حالانکہ وہ قلعے کے اندر تھے اور ان کی تعداد بہت ہی تھوڑی تھی۔

باطنی جانبازوں نے باہر کے سواروں کو اندر تو نہ آنے دیا ' انہوں نے جانوں کی بازی لگا دی تھی لیکن یہ بھی نظر آرہا تھا کہ وہ زیادہ دیر اسی طرح جم کر نہیں لڑ سکیں گے۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ یہ چھوٹی سی لڑائی تھی جو چھوٹی سی ایک بستی میں لڑی گئی تھی لیکن اس کی اہمیت اس وجہ سے ایک بڑی لڑائی جتنی تاریخی ہے کہ یہ حسن بن صباح کے باطنی فرقے اور سلجوقی مسلمانوں کا پہلا مسلح تصادم تھا اور اسی تصادم میں اندازہ ہو گیا تھا کہ حسن بن صباح کے پاس کتنی طاقت ہے اور یہ طاقت کس قسم کی ہے۔

○

حسن بن صباح دیکھ رہا تھا کہ اس کے ستر جانباز اتنے بڑے سوار دستے کو روک نہیں سکیں گے۔ ان کی تعداد کم ہوتی جارہی تھی۔ حسن بن صباح ایک بلند چبوترے پر چڑھ گیا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی ہی بلند آواز سے کہہ رہا تھا — "تیرا ایلچی مشکل میں آگیا ہے اللہ!..... فرشتوں کو بھیج اللہ..... اپنے نام پر جانیں قربان کرنے والوں کو اتنے سخت امتحان میں نہ ڈال اللہ!..... فرشتے اتار اللہ..... کفّار کے طوفان سے بچا اللہ!"

وہ چُپ ہو گیا اور آسمان کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس کے بہت سے جانبازوں نے اسے دیکھا۔

"یا حسن!" — اُس کے ایک آدمی نے قریب آکر گھبراہٹ سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا — "اپنے فدائین دل چھوڑ بیٹھے ہیں۔ وہ باہر کو بھاگنے کا راستہ دیکھ رہے ہیں"۔

حسن بن صباح نے اس شخص کو دیکھا۔ اس کے کپڑے خون سے لال ہو گئے تھے۔

حسن بن صباح نے آنکھیں بند کر کے آسمان کی طرف دیکھا۔

"وحی نازل ہو گئی ہے" — اُس نے بلند آواز سے کہا — "اللہ کا حکم آیا ہے کوئی شخص باہر نہ نکلے۔ جو نکلے گا وہ دنیا میں جلے گا اور جو ہمارے ساتھ رہے گا وہ دنیا میں فردوسِ بریں دیکھے گا۔ حوریں اتر رہی ہیں۔ فرشتے اُتر رہے ہیں۔ ہمارا ساتھ چھوڑنے والوں کے لئے آگ اُتر رہی ہے..... مدد آرہی ہے"۔

یہ "وحی" تمام جانبازوں تک پہنچا دی گئی۔ وہ فوراً" ثابت قدم ہو گئے اور جم کر لڑنے لگے۔

"ہم حسن بن صباح کے ساتھ رہیں گے" — باطنیوں نے نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

لڑائی میں نیا ہی جوش اور قہر پیدا ہو گیا۔ امیر ارسلان کے جو آدمی کمندوں کے ذریعے اندر اُتر گئے تھے انہیں باطنیوں نے کاٹ ڈالا۔

اور آسمان سے فرشتے بھی اتر آئے۔

یہ تین سو سوار اچانک کہیں سے نکلے۔ ان کے سرپٹ ٹاپوں کی آوازیں دُور سے سنائی دی تھیں۔ امیر ارسلان کو ذرا سا بھی شبہ نہیں ہُوا تھا کہ یہ ان کے دشمن سوار ہیں۔ اسے یہ توقع بھی نہیں تھی کہ اس کے لئے کہیں سے کمک آئے گی۔ اسے کمک کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ پھر یہ بھی تو کسی کو معلوم نہیں تھا کہ امیر ارسلان کہاں ہے۔ بہرحال اُس کے ذہن میں یہ خدشہ آیا ہی نہیں کہ یہ سوار جو چلے آرہے ہیں یہ اس کے لئے ایسی مصیبت چلی آرہی ہے جس کا وہ سامنا نہیں کر سکے گا۔ ان تین سو سواروں کی رفتار اتنی تیز تھی کہ امیر ارسلان کو کچھ سوچنے کا موقع ہی نہ ملا۔ گھنے جنگل کی ہری بھری جھاڑیوں' درختوں اور اونچی گھاس سے یہ سوار بے ترتیب سے گروہوں کی صورت میں سیلاب کی طرح چلے آرہے تھے۔ وہ جُوں جُوں قریب آتے گئے' پھیلتے گئے۔ بعض کے ہاتھوں میں برچھیاں تھیں اور باقیوں کے پاس تلواریں تھیں۔ انہوں نے یہ ہتھیار آگے کر کر رکھے تھے جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ حملہ کرنے آرہے ہیں۔

اُس وقت بھی امیر ارسلان نے کوئی دفاعی اقدام نہ کیا۔ حتیٰ کہ وہ سوار اُن کے سر پر آگئے اور انہوں نے نعرہ لگایا ــــ "حسن بن صباح زندہ باد" ــــ اُس وقت امیر ارسلان اور اس کے سواروں کو ہوش آئی لیکن سنبھلنے اور سنبھل کر مقابلے میں آنے کا وقت گزر چکا تھا۔ ان سواروں نے امیر ارسلان کے پانچ سو سواروں کو بے بس کر دیا۔ سلجوقیوں نے مقابلے میں جمنے کی بہت کوشش کی لیکن حملہ آوروں کے انداز میں ایسا قہر اور غضب تھا کہ انہوں نے سلجوقی سواروں کو بالکل ہی بے بس کر کے کاٹ ڈالا۔ انہیں پتہ ہی نہ چلا کہ ان کا سالار امیر ارسلان مارا جا چکا ہے۔

امیر ارسلان کے سواروں میں سے چند ایک سوار نکل بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ سب زخمی حالت میں تھے۔ ان میں مزمل آفندی بھی تھا۔ وہ بھی زخمی تھا۔ باقی زخمی اِدھر اُدھر چھپ گئے۔ ان میں بھاگنے کی بھی ہمت نہیں تھی لیکن مزمل آفندی نے گھوڑے کا رخ مَرو کی طرف کر دیا اور ایڑ لگا دی۔

O

ذہن میں قدرتی طور پر سوال اٹھتا ہے کہ کیا یہ تین سو سوار واقعی فرشتے تھے جو اللہ نے حسن بن صباح کی مدد کے لئے بھیجے تھے؟ اور کیا واقعی اُس پر وحی نازل ہوئی تھی؟ نہیں..... یہ پہلے سے کیا ہوا ایک انتظام تھا اور یہ انتظام احمد بن غطاش نے کیا تھا۔ داستان گو سارا قصہ پہلے سنا چکا ہے۔ قافلے سے نکلے ہوئے ایک سوار نے اصفہان پہنچ کر حسن بن صباح کو خبردار کر دیا تھا کہ سلجوقی سلطان نے اس کی گرفتاری کے لئے پانچ چھ سو گھوڑ سواروں کا دستہ بھیجا ہے اور یہ دستہ اصفہان کی طرف آ رہا ہے۔

احمد بن غطاش بھی حسن بن صباح کے ساتھ تھا۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ حسن بن صباح قلعہ تبریز میں چلا جائے۔ وہ چلا گیا۔ ان لوگوں کو خداوند تعالیٰ نے بڑے ہی تیز اور بہت دُور تک سوچنے والے دماغ اور بہت دُور تک دیکھنے والی نگاہیں دی تھیں۔ انہوں نے اُسی وقت سوچ لیا تھا کہ آگے کیا ہو گا۔ خطرہ یہی تھا کہ امیر ارسلان اصفہان میں آ کر حسن بن صباح کو ڈھونڈے گا اور کسی نہ کسی طرح اسے پتہ چل جائے گا کہ حسن بن صباح قلعہ تبریز میں چلا گیا ہے۔

یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ احمد بن غطاش نے اسی مکان میں جہاں وہ اور حسن بن صباح ٹھہرے تھے، سائیس کا بہروپ دھار لیا تھا۔ یہ ایک قبیلے کے سردار کا مکان تھا اور یہ

سردار حسن بن صباح کا پیروکار باطنی تھا۔

احمد بن غطاش نے اس سردار سے کہا تھا کہ حسن بن صباح کو بچانے کے لئے زیادہ سے زیادہ ایسے سواروں کی ضرورت ہے جو شہسوار ہوں، تیغ زنی اور برچھی بازی کی مہارت رکھتے ہوں اور لڑائی میں جان کی بازی لگا دینے والے ہوں۔

یہ سردار اُسی وقت ایک گھوڑے پر سوار ہوا۔ اُس کے پیچھے ایک اور گھوڑا تھا جس کی باگ سائیس کے ہاتھ میں تھی اور سائیس پیدل چل رہا تھا۔ لوگ جو راستے میں آتے تھے، اس سردار کو جھک کر سلام کرتے تھے اور وہ سائیس کی طرف دیکھتے ہی نہیں تھے کیونکہ وہ اس سردار کا سائیس تھا۔ کسی کو ذرا سا بھی شبہ نہ ہوا کہ یہ سائیس ابلیس کا چیلا نہیں بلکہ سرتاپا اور اندر سے بھی وہی ابلیس ہے جسے خداوند تعالیٰ نے آدم کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں دھتکار دیا اور اس پر لعنت بھیجی تھی۔ اب وہ ابلیس آدم کی اولاد کے لئے بڑا ہی دلکش اور اسلام کے لئے بہت ہی خطرناک دھوکہ بنا ہوا تھا اور اولادِ آدم اس کے تخلیق کئے ہوئے ابلیس حسن بن صباح کی ایسی مرید اور معتقد بنتی جا رہی تھی کہ اُس پر جانیں قربان کر رہی تھی۔

شہر سے کچھ دور جا کر یہ سائیس جو دراصل احمد بن غطاش تھا گھوڑے پر چڑھ بیٹھا اور پھر سردار نے اور احمد بن غطاش نے گھوڑے دوڑا دیئے۔ اصفہان سے تھوڑی ہی دور قزوین نام کا ایک قصبہ تھا۔ آج کے نقشوں میں اس نام کا کوئی مقام نہیں ملتا اس لئے یہ بتانا ناممکن ہے کہ یہ اصفہان سے کتنی دور تھا۔ تاریخ میں اس قصبے کا نام موجود ہے۔ یہ مقام ان دونوں کی منزل تھی۔

قزوین کا رئیسِ شہر ابو علی تھا جس کا اس سارے علاقے میں اثر و رسوخ تھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس شخص نے حسن بن صباح کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ یہ حسن بن صباح کی تربیت یافتہ ایک لڑکی کا اور اُس حشیش کا کارنامہ تھا جو یہ لڑکی اسے دھوکے میں پلاتی رہتی تھی۔ احمد بن غطاش اور اس کا ساتھی سردار ابو علی کے گھر گئے اور اسے اس صورتِ حال سے آگاہ کیا کہ سلجوقی سلطان نے حسن بن صباح کی گرفتاری کے لئے سینکڑوں سواروں کا ایک دستہ بھیجا ہے۔ اسے بتایا کہ صورتِ حال کیا بن سکتی ہے اور اس کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

ان تینوں نے فوراً فیصلہ کر لیا۔ ابو علی نے کہا کہ وہ جس قدر سوار مل سکے تیار کر

لے گا۔ تاریخ میں علم ابو علی کا ہی آیا ہے کہ اُس نے بہت ہی تھوڑے سے وقت میں تین سو سوار تیار کر لئے اور پھر کمال یہ کیا کہ انہیں ایسی جگہ اکٹھا کر لیا جو قلعہ تبریز سے کچھ دور تھی۔ ان سواروں کو بتایا گیا کہ وہ ہر لحہ تیاری کی حالت میں رہیں اور اشارہ ملتے ہی قلعہ تبریز پہنچ جائیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باطنیوں کی جڑیں کتنی مضبوط ہو کر کتنی دُور دُور تک پہنچ گئی تھیں۔

ان کا جاسوسی کا نظام بھی بڑا تیز اور قابلِ اعتماد تھا۔ سالار امیر ارسلان کا دستہ اصفہان سے قلعہ تبریز پہنچا تو کسانوں اور تھکے ماندے مسافروں کے بہروپ میں باطنی جاسوس اسے دُور دُور سے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے لڑائی بھی دیکھی تھی۔ ان ہی میں سے کسی نے دیکھا کہ سلجوقی سوار قلعے میں داخل ہو جائیں گے اور اندر تمام باطنی مارے جائیں گے اور حسن بن صباح گرفتار ہو جائے گا...... اس جاسوس نے ابو علی کو جا اطلاع دی۔

تین سو سوار تیار تھے۔ انہیں پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ انہوں نے کیا کرنا ہے۔ ان کے دلوں میں سلجوقیوں کی اتنی نفرت پیدا کی گئی تھی کہ وہ اس انتظار میں تھے کہ سلجوقی سامنے آئیں تو ان کے جسموں کے پرخچے اڑا دیں۔

اب انہیں موقع مل گیا۔ اشارہ ملتے ہی وہ قلعہ تبریز پہنچے اور سلجوقیوں کو بے خبری میں جا لیا۔ سلجوقی بے خبری اور غلط فہمی میں مارے گئے ورنہ سلجوقیوں نے تو جنگجوئی میں دور دور تک دھاک بٹھائی ہوئی تھی مگر دھاک حسن بن صباح کی بیٹھ گئی۔ اس کے جانبازوں اور بستی تبریز کے باشندوں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ "آسمان سے اترنے والے تین سو گھوڑسوار فرشتوں" کا انتظام پہلے سے کر لیا گیا تھا۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ حسن بن صباح پر وحی نازل ہوئی تھی اور یہ مدد بھی حسن کے کہنے پر خدا نے بھیجی تھی۔

○

مزمل آفندی گھوڑا دوڑاتا مرو جا رہا تھا۔ اُس نے اپنے زخموں پر کپڑے کس کر باندھ لئے تھے پھر بھی زخموں سے خون رس رہا تھا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ زندہ سلطان ملک شاہ تک پہنچ جائے اور ہوش میں رہے تاکہ اسے قلعہ تبریز کی لڑائی کی خبر دے سکے اور اسے کہے کہ وہ فوراً" جوابی حملے کے لئے فوج بھیجے۔

یہ ایک دن اور ایک رات کی مسافت تھی جو مزمل آفندی نے کم سے کم وقت میں طے کی اور رات کو مرو پہنچا۔ سلطان ملک شاہ سو گیا تھا۔ سلطان کو جگانے کی جرأت کوئی

بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن مزمل خون میں نہایا ہوا اور نیم جاں تھا اور وہ سالار امیر ارسلان اور اس کے سوار دستے کی خبر لایا تھا۔ سلطان کو جگا کر بتایا گیا تو وہ بستر سے کُود کر اٹھا اور ملاقات والے کمرے میں گیا۔

مزمل دروازے میں داخل ہوا تو اس کا وجود گرنے والے درخت کی طرح ڈول رہا تھا اور سر کبھی دائیں کبھی بائیں ڈھلک جاتا تھا۔ اُس کے کپڑے خون سے لال ہو گئے اور زخموں سے تازہ خون رس رہا تھا۔ سلطان دوڑ کر اُس تک پہنچا اور اسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"اسے دیوان پر لٹاؤ" — سلطان ملک شاہ نے دربان سے کہا اور خود ہی مزمل کو اٹھا لیا۔

دربان نے بھی مدد کی اور مزمل کو دیوان پر لٹا دیا گیا۔ سلطان کے کپڑے بھی سامنے سے لال ہو گئے۔

"اسے دو شربت پلاؤ" — سلطان نے دربان سے کہا — "طبیب کو اور جراح کو بھی فوراً" ساتھ لے آؤ"۔

سلطان ملک شاہ نے شربت کا گلاس دربان کے ہاتھ سے لیا اور اُسے دوڑا دیا پھر مزمل کو سہارا دے کر اٹھایا اور اسے اپنے ہاتھ سے شربت پلایا۔

"اب لیٹ جاؤ" — سلطان نے مزمل آفندی کو لٹا کر پوچھا — "تم بہت زخمی ہو"۔

"میں انشاء اللہ زندہ رہوں گا" — مزمل آفندی نے بڑی مشکل سے ہانپتی کانپتی آواز میں کہا — "میں نے حسن بن صباح کو قتل کرنے کا عہد کر رکھا ہے...... میرا نام مزمل آفندی ہے۔ آپ کی فوج کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں...... پہلے اپنے سوار دستے اور سالار امیر ارسلان کی خبر سن لیں...... امیر ارسلان مارا گیا ہے اور اپنے دستے کے شاید سارے ہی سوار بھی مارے گئے ہیں"۔

"کیا کہا؟" — سلطان نے حیرت زدہ ہو کر کہا — "ارسلان مارا گیا ہے؟...... یہ ہوا کیسے؟ یہ لڑائی کہاں لڑی گئی ہے؟"

"قلعہ تبریز میں!" — مزمل آفندی نے جواب دیا۔

طبیب اور جراح دوڑے آئے۔ سلطان کے کہنے پر انہوں نے مزمل کے زخموں کو

دھونا شروع کر دیا۔ سلطان نے مزمل کے لئے پھل اور میوے منگوائے' پھر زخموں کی مرہم پٹی ہوتی رہی' مزمل پھل اور میوے کھاتا رہا اور سلطان کو سناتا رہا کہ وہ کس طرح میمونہ کو حسن بن صباح کی قید سے فرار کرا کے لایا تھا اور رے میں ابو مسلم رازی کے ہاں میمونہ کو اپنی بیٹی شمونہ مل گئی تھی۔ پھر اس نے حسن بن صباح کے تعاقب کا اور قلعہ تبریز کی لڑائی کا مکمل احوال سنایا۔

سلطان ملک شاہ آگ بگولہ ہو گیا۔ اُس نے اُسی وقت اپنے ایک سالار قزل ساروق کو بلایا۔ یہ سالار تُرک تھا۔ ابنِ اثیر نے لکھا ہے کہ قزل ساروق نامور سالار اور مشہور سلجوق جنگجو تھا۔ سلطان نے اسے کہا کہ وہ کم از کم ایک ہزار سواروں کا دستہ لے کر ابھی قلعہ تبریز کو روانہ ہو جائے۔

قزل ساروق سمجھ گیا کہ بہت جلدی تبریز پہنچنا ہے۔

وہ ایک ہزار منتخب سواروں کے ساتھ حیران کُن کم وقت میں قلعہ تبریز پہنچ گیا لیکن وہاں سالار امیر ارسلان اور اس کے سواروں کی لاشوں کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ کسی بھی لاش کے ساتھ ہتھیار نہیں تھا۔ ایک بھی گھوڑا نہیں تھا۔ ہتھیار بھی اور گھوڑے بھی باطنی لے گئے تھے۔

قزل ساروق قلعے کے اندر گیا۔ کوئی ایک بھی انسان نظر نہ آیا۔ مکان خالی پڑے تھے۔

"آگ لگا دو" — قزل ساروق نے کہا۔

کچھ ہی دیر بعد مکانوں سے شعلے اٹھنے لگے اور دھواں آسمان تک پہنچنے لگا۔

"قبریں کھودو اور اپنے ساتھیوں کو دفن کر دو" — قزل ساروق نے اپنے سواروں سے کہا — "ہم یہاں شاید اسی لئے آئے ہیں کہ اپنے ساتھیوں کو دفن کریں اور اس بستی کو آگ لگا دیں اور واپس چلے چلیں..... ہم یہاں کچھ دن ٹھہریں گے"۔

داستان گو

جس دَور کی داستان سنا رہا ہے وہ ابلیس کا دَور تھا۔ قرآن حکیم کی وہ پیش گوئی جو سورۃ الاعراف کی آیات 11 سے 23 تک واضح الفاظ میں آئی ہے' حرف بہ حرف صحیح ثابت ہو رہی تھی۔ ان آیات کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند تعالٰی نے ابلیس کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں دھتکار دیا اور اُسے کہا تو ذُلیل و خوار ہوتا رہے گا تو ابلیس نے کہا کہ مجھے روزِ قیامت تک مہلت دے۔ اللہ نے اسے مہلت دے دی۔ ابلیس نے کہا اب دیکھنا میں تیرے ان انسانوں کو کس طرح گمراہی میں ڈالتا ہوں۔ میں تیرے سیدھے راستے پر گھات لگا کر بیٹھوں گا اور تیرے انسانوں کو آگے سے' پیچھے سے' دائیں سے' بائیں سے اور ہر طرف سے گھیروں گا پھر تو دیکھے گا کہ اُن میں سے بہت سے تمہارے شکر گزار نہیں رہیں گے۔

اللہ تعالٰی نے آدم اور حوّا سے کہا کہ جنت میں رہو لیکن اُس درخت کے قریب نہ جانا ورنہ گنہگاروں میں لکھے جاؤ گے۔ شیطان نے آدم سے کہا کہ اللہ نے اس درخت کو تمہارے لئے اس لئے شجرِ ممنوعہ قرار دیا ہے کہ تم فرشتے نہ بن جاؤ اور تمہیں وہ زندگی نہ مل جائے جس کی موت ہوتی ہی نہیں یعنی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی..... ابلیس نے قسم کھا کر کہا کہ میں تمہارا سچا خیر خواہ ہوں۔

ابلیس نے زبان کا ایسا جادو چلایا اور الفاظ کا ایسا طلسم پیدا کیا کہ آدم اور حوّا کو شیشے میں اتار لیا۔ انہوں نے شجرِ ممنوعہ کا پھل چکھا اور اس حکم عدولی کے نتیجے میں آدم اور حوّا کے ستر بے نقاب ہو گئے اور وہ درختوں کے پتوں سے ستر ڈھانپنے لگے۔

بلت یہ سامنے آئی کہ یہ ابلیس تھا جس نے آدم اور حوّا کو ایک دوسرے کی شرمگاہوں سے روشناس کیا۔ انسان میں تجسس کی بیتابی پیدا کی اور یہ جذبہ بھی کہ اللہ

جس کام سے منع کرے وہ ضرور کر کے دیکھو اور شجرِ ممنوعہ کا پھل ضرور چکھو۔

حسن بن صباح نے یہی ابلیسی حربے استعمال کئے اور انسان کی ستر پوشی کو برہنگی میں بدل دیا۔ مرد پر عورت کی برہنگی کا طلسم طاری کیا اور یہ تاثر پیدا کیا کہ شجرِ ممنوعہ کا پھل ضرور کھاؤ۔

ابلیس اپنا یہ عہد پورا کر رہا تھا کہ اللہ کے سیدھے راستے پر گھات لگا کر جنوں کا اور اللہ کے بندوں کو ہر طرف سے گھیر کر اپنے راستے پر چلاؤں گا۔

پانچویں صدی ہجری میں حسن بن صباح اللہ کے سیدھے راستے پر گھات لگا کر اور اللہ کے بندوں کو ہر طرف سے گھیر کر اپنے راستے پر چلا رہا تھا۔

○

قلعہ تبریز کی لڑائی میں سلجوقی سالار امیر ارسلان مارا گیا' اُس کے پانچ سو مجاہدین ہلاک یا زخمی ہو گئے تو مزمل آفندی نے شدید زخمی حالت میں مَرو پہنچ کر سلطان ملک شاہ کو لڑائی کے اس انجام کی اطلاع دی۔ اُس کا زندہ رہنا معجزہ تھا۔

جب سے مزمل آفندی سالار امیر ارسلان اور اُس کے پانچ سو سواروں کے ساتھ چلا گیا تھا' رے میں شمونہ نے روز مرہ کا معمول بنا لیا تھا کہ بار بار چھت پر چلی جاتی اور اُس راستے کو دیکھنے لگتی جس راستے پر مزمل آفندی چلا گیا تھا۔ شمونہ کو معلوم تھا کہ دو چار دنوں میں اُدھر سے کوئی اطلاع نہیں آئے گی۔ بعد اوسے اتنی جلدی اطلاع آ ہی نہیں سکتی تھی لیکن شمونہ مزمل آفندی کی محبت میں پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ وہ حقائق کو تو قبول ہی نہیں کر رہی تھی۔ وہ چھت پر جا کر کبھی بالائی منزل کا اُس طرف والا دریچہ کھول کر اس راستے کو دیکھنے لگتی تھی۔ اُسے قاصد کا انتظار تھا۔

اور اسے انتظار تھا کہ مزمل آفندی اسی راستے سے واپس آئے گا۔ اُس کے چہرے پر فاتحانہ تاثر ہو گا۔ سینہ پھیلا ہوا اور گردن تنی ہوئی ہو گی' اور حسن بن صباح اس کے ساتھ ہو گا..... زندہ یا مُردہ!

دنوں پہ دن گزرتے جا رہے تھے۔ نہ جانے کتنی راتیں بیت گئیں' مزمل آفندی نہ آیا۔ مَرو سے کوئی قاصد نہ آیا۔

"شمونہ!" ــــ دو تین بار اُس کی ماں میمونہ نے اُسے کہا ــــ "ایک آدمی کی محبت میں گرفتار ہو کر تم دنیا کو بھول گئی ہو۔ تمہیں دن اور رات کا ہوش نہیں رہا۔ یوں تو زندگی اجیرن ہو جاتی ہے"۔

"میں صرف اُس کا انتظار نہیں کر رہی جسے میں چاہتی ہوں" ــــ شمونہ نے ماں سے کہا تھا ــــ "میں حسن بن صباح کے انتظار میں ہوں۔ اگر وہ زندہ آیا تو میں اُسے زنجیروں میں بندھا دیکھنا چاہوں گی اور اگر اُس کی لاش آئی تو میں سمجھوں گی کہ میرا زندگی کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ مزمل اسے زندہ یا مُردہ لے ہی آئے گا"۔

شمونہ کو کوئی قاصد یا مزمل آفندی آتا نظر نہیں آتا تھا۔ راستہ ہر روز کی طرح شہر سے نکل کر درختوں اور کھیتوں میں بل کھاتا ڈور ایک پہاڑی میں گم ہو جاتا تھا۔ اسے ہر روز ویسے ہی اونٹ' گھوڑے' بوجھ اٹھائے ہوئے ٹٹو اور پیدل چلتے ہوئے لوگ نظر آتے تھے۔ شمونہ کی بے چینی اور بے تابی بڑھتی جا رہی تھی اور وہ اکتانے بھی لگی تھی۔ اُس کی مزاجی کیفیت بھی کچھ اکھڑی سی گئی تھی۔ آخر ایک روز دن کے پچھلے پہر دور سے ایک گھوڑ سوار آتا نظر آیا۔ گھوڑے کی رفتار اور انداز بتاتا تھا کہ وہ کوئی عام سا مسافر نہیں۔ شمونہ کی نظریں اُس پر جم گئیں اور اُس کے ساتھ ساتھ شہر کی طرف آنے لگیں۔

گھوڑ سوار شہر میں داخل ہوا تو شمونہ کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ وہ شہر کی گلیوں میں گم ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ امیرِ شہر ابو مسلم رازی کے گھر کے قریب ایک گلی سے نکلا۔ شمونہ دوڑتی نیچے آئی۔ گھوڑ سوار اس شاہانہ حویلی کے احاطے میں داخل ہو رہا تھا۔

"تم قاصد تو نہیں ہو!" ــــ شمونہ نے اس سے پوچھا۔

"ہاں بی بی!" ــــ سوار نے گھوڑے سے اترتے ہوئے کہا ــــ "میں قاصد ہوں۔ امیرِ شہر سے فوراً ملنا ہے"۔

"کہاں سے آئے ہو؟"

"مَرو سے آیا ہوں"۔

"سالار امیر ارسلان اور مزمل آفندی کی کوئی خبر لائے ہو؟" ــــ شمونہ نے بچوں کے سے بے تابانہ اشتیاق سے پوچھا۔

"اُن ہی کی خبر لایا ہوں"۔

"کیا خبر ہے؟" ــــ شمونہ نے تڑپ کر پوچھا۔

"امیرِ شہر کے سوا کسی اور کو بتانے والی خبر نہیں" ــــ قاصد نے جواب دیا۔

شمونہ دوڑتی اندر گئی۔ دربان کے روکنے پر بھی نہ رکی۔ ابو مسلم رازی اپنے کسی
کام میں مصروف تھا۔ شمونہ نے ایسی زور سے دروازہ کھولا کہ ابو مسلم رازی چونک اٹھا۔
"مَرو سے قاصد آیا ہے" ــــ شمونہ نے بڑی تیزی سے کہا ــــ "اُسے فوراً بلا لیں"۔

ابو مسلم رازی نے ابھی کچھ جواب نہیں دیا تھا کہ شمونہ باہر کو دوڑ پڑی اور قاصد کو ابو مسلم رازی کے پاس لے گئی۔

"کیا خبر لائے ہو؟" ــــ ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

قاصد نے شمونہ کی طرف دیکھا اور پھر ابو مسلم رازی کی طرف دیکھا۔ بات بالکل صاف تھی۔ قاصد شمونہ کے سامنے پیغام نہیں دینا چاہتا تھا۔

"تم ذرا باہر چلی جاؤ شمونہ!" ــــ ابو مسلم رازی نے کہا۔

شمونہ وہاں سے ہلی بھی نہیں اور کچھ بولی بھی نہیں۔ اس کی نظریں ابو مسلم رازی کے چہرے پر جم گئی تھیں اور اُس کے اپنے چہرے کا تاثر یکلخت بدل گیا تھا۔ رازی کی دانشمندی نے راز پالیا۔ وہ شمونہ کی اس بات کو سمجھتا تھا۔ اس لڑکی نے ابو مسلم رازی کے دل میں اپنی قدر و منزلت پیدا کرلی تھی۔

"ہاں!" ــــ ابو مسلم رازی نے قاصد سے پوچھا ــــ "کیا خبر لائے ہو"۔

"خبر اچھی نہیں امیرِ شہر!" ــــ قاصد نے کہا ــــ "سالار امیر ارسلان مارے گئے ہیں اور ان کے پانچسو سواروں میں سے شاید ہی کوئی زندہ بچا ہو"۔

"مزمل آفندی کی کیا خبر ہے؟" ــــ شمونہ نے تیزی سے اٹھ کر پوچھا۔

"خاموش رہو شمونہ!" ــــ ابو مسلم رازی نے اُسے ڈانٹتے ہوئے کہا ــــ "میں تمہیں باہر بھیج دوں گا۔ تم ایک آدمی کا غم لئے بیٹھی ہو اور ہم اس سلطنت اور دینِ اسلام کے لئے پریشان ہو رہے ہیں" ــــ اُس نے قاصد سے کہا ــــ "آگے بولو"۔

"مزمل آفندی زندہ ہیں" ــــ قاصد نے کہا ــــ "لیکن بہت بری طرح زخمی ہیں۔ وہ مَرو میں سلطانِ عالی مقام کے پاس ہیں۔ وہی آگے کی خبر لائے تھے"۔

قاصد نے ابو مسلم رازی کو تفصیل سے وہ خبر سنائی جو مزمل آفندی نے سلطان ملک شاہ کو سنائی تھی۔ پھر اُس نے یہ بتایا کہ اب سلطانِ محترم نے سالار قزل سارُوق کو ایک ہزار سوار دے کر حسن بن صباح کی گرفتاری اور اُس کے پیروکاروں کی تباہی کے لئے بھیج

دیا ہے۔

قاصد پیغام دے چکا تو ابو مسلم رازی نے اُسے جانے کی اجازت دے دی۔

"میں مرو جانا چاہتی ہوں" ــــ شمونہ نے کہا ــــ "آپ مجھے اسی قاصد کے ساتھ بھیج دیں"۔

"تم وہاں جا کر کیا کرو گی؟" ــــ ابو مسلم رازی نے پوچھا۔

"میں مزمل آفندی کی تیمارداری کروں گی" ــــ شمونہ نے جواب دیا ــــ "اس شخص نے مجھ پر جو احسان کیا ہے کیا میں یہ بھول سکتی ہوں؟ اس نے مجھے بچھڑی ہوئی ماں سے ملایا ہے..... اور امیرِ شہر! میں نے اور مزمل آفندی نے عہد کیا ہے اور قسم کھائی ہے کہ حسن بن صباح کو ہم دونوں قتل کریں گے۔ اس مقصد کے لئے میں مزمل کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں"۔

"ایسے کام جذبات کے جوش سے نہیں ہوا کرتے شمونہ!" ــــ ابو مسلم رازی نے کہا ــــ "اس کے لئے تجربے کی اور دُور اندیشی سے ہر پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ تم میرے ساتھ رہو۔ تمہاری ماں یہیں ہے۔ میرا بھی یہی مقصد ہے۔ حسن بن صباح جب یہاں آیا تھا تو میں نے اس کی گرفتاری کا حکم دے دیا تھا لیکن اسے قبل از وقت پتہ چل گیا اور وہ فرار ہو گیا۔ میں نے بھی حسن بن صباح کے قتل کو اپنی زندگی کا مقصد بنا رکھا ہے۔ پھر اس لئے بھی میں تمہیں وہاں نہیں بھیج سکتا کہ مزمل آفندی سلطان کے پاس ہے۔ میری بات اور ہے' سلطان کے ہاں فضا اور ماحول کچھ اور ہے۔ انہوں نے مزمل آفندی کو اپنی نگرانی میں رکھا ہو گا اور وہ پریشان بھی ہوں گے کہ امیر ارسلان جیسا سالار اپنے تمام سواروں کے ساتھ مارا گیا ہے۔ یہ پریشانی اب مجھے بھی لاحق ہو گئی ہے کہ حسن بن صباح کے پاس اتنی فوجی طاقت اکٹھی ہو گئی ہے کہ اُس نے پانچ سو سلجوقی سواروں کو ختم کر دیا ہے۔ کسی کو سلجوقی کہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ جان کی بازی لگا دینے والا جنگجو ہے اور ناقابلِ تسخیر۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حسن بن صباح کے پیروکار سلجوقیوں سے زیادہ سرفروش ہیں..... تم یہیں رہو۔ ہو سکتا ہے سلطان تمہارا وہاں جانا پسند نہ کریں' اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں اس بنا پر شک کی نظروں سے دیکھیں کہ تم نے حسن بن صباح کے زیرِ سایہ تربیت حاصل کی ہے"۔

ابو مسلم رازی نے شمونہ کی ماں کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ اپنی بیٹی کے جذبات کو اپنے

قابو میں لے لے ورنہ یہ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کر بیٹھے گی۔

○

سالار قزل سارق نے تبریز کی قلعہ نما بستی کو نذرِ آتش تو کر دیا لیکن وہ اس بستی کو نذرِ آتش کرنے کے لئے نہیں گیا تھا۔ یہ تو غصے کا اظہار تھا جو اُس نے کیا۔ اصل مسئلہ تو یہ تھا کہ حسن بن صباح اور اس کے جنگجو پیروکار کہاں گئے۔ اُس نے جو لاشیں دیکھی تھیں اُن میں سالار امیر ارسلان کے سواروں کی لاشیں زیادہ تھیں اور حسن بن صباح کے آدمیوں کی لاشیں بہت ہی تھوڑی تھیں۔

سالار قزل سارق کے ساتھ جاسوسی کرنے والے آدمی بھی تھے۔ بھیس اور حُلیہ بدلنے کا بھی اُن کے پاس انتظام تھا۔ قزل سارق نے اپنے چار آدمیوں کو جاسوسی کے لئے تیار کیا اور انہیں ضروری ہدایات دے کر اِدھر اُدھر بھیج دیا۔ اُس نے خود ذرا سا بھی آرام نہ کیا۔ اپنے دو تین ماتحت کمانداروں کو ساتھ لے کر تبریز سے کچھ دُور زمین کو کھوجنے کے لئے چلا گیا۔ اُس نے ہر طرف زمین دیکھی۔ حسن بن صباح اکیلا ہی تو نہیں تھا کہ اُس کا کھرا کھوج نہ ملتا۔ اُس کے ساتھ بہت سے لوگ تھے جن میں گھوڑ سوار بھی تھے۔

ایک جگہ مل ہی گئی۔ زمین گواہی دے رہی تھی کہ یہاں سے ایک قافلہ یا لشکر گزرا ہے۔ قزل سارق زمین کے یہ نشان دیکھتا ہوا آگے ہی آگے چلتا گیا۔ یہ کوئی عام راستہ نہیں تھا۔ یہ لوگ اونچی نیچی زمین پر چلتے گئے۔ آگے ایک ندی تھی۔ وہ اس ندی میں سے بھی گزرے تھے۔ اگر یہ کوئی پُرامن لوگوں کا قافلہ ہوتا تو کسی باقاعدہ پگڈنڈی پر جا رہا ہوتا یا ہموار زمین پر چلتا۔ یہ قافلے لوٹنے والے ڈاکوؤں کا گروہ بھی ہو سکتا تھا اور یہ حسن بن صباح کا گروہ بھی ہو سکتا تھا۔

زمین کے ان نشانات سے تو صاف پتہ چل رہا تھا کہ وہ کس سمت کو جا رہے ہیں لیکن اصل بات تو یہ معلوم کرنی تھی کہ وہ گئے کہاں۔ آگے ایسا پہاڑی سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جس کے اندر کسی آبادی کا گمان نہیں کیا جا سکتا تھا۔

سالار قزل سارق ایک جگہ رُک گیا۔ اس کا آگے جانا ٹھیک نہیں تھا کیونکہ وہ دُور سے پہچانا جاتا تھا کہ یہ کسی شہر کا امیر یا فوج کا سالار ہے۔ اُس نے اپنے ماتحتوں سے کہا کہ اس طرف اپنا کوئی آدمی بھیس بدل کر جائے تو کچھ سراغ مل سکتا ہے۔ ایک ماتحت نے کہا کہ تبریز واپس چل کر ایک اور آدمی کو اس سمت میں روانہ کر دیتے ہیں۔

وہ واپس تبریز آ گئے۔

بہت دیر بعد ایک شتر سوار آتا نظر آیا۔ وہ بڑی تیز رفتار سے آ رہا تھا۔ قریب آیا تو وہ اپنا ایک جاسوس نکلا جسے علی الصبح بھیجا گیا تھا۔ وہ اونٹ سے اُترا اور اپنے سالار کے پاس گیا۔

"سراغ مل گیا ہے" ــــ جاسوس نے کہا ــــ "میں نے گھوڑوں، اونٹوں اور آدمیوں کے پاؤں کے نشان دیکھے اور ان پر چلتا گیا۔ یہ نشان مجھے ایک جگہ لے گئے جہاں تین مکان تھے جن کے مکینوں کے بچے مکانوں سے کچھ دُور کھیل رہے تھے۔ میں اونٹ سے اُترا اور ان بچوں سے پوچھا کہ ادھر ایک قافلہ گیا ہے۔ میں اس قافلے سے بچھڑ گیا تھا کیا تم بتا سکتے ہو کہ وہ قافلہ کدھر گیا ہے۔ بچوں نے مجھے صرف سمت بتائی"۔

اس جاسوس نے اپنے سالار کو جو تفصیل بتائی وہ یوں تھی کہ جب یہ شخص بچوں سے پوچھ رہا تھا اُس وقت ان مکانوں کے رہنے والے کسی آدمی نے دیکھ لیا اور اس کے پاس آکر پوچھا کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔ اُس نے وہی بات کہی جو وہ بچوں سے کہہ چکا تھا کہ وہ اس قافلے سے بچھڑ گیا تھا۔

"وہ ایک عجیب قافلہ تھا" ــــ اُس آدمی نے کہا ــــ "اس میں بہت سے آدمی تھے جو زخمی تھے۔ ان کے کپڑے خون سے لال تھے۔ ان میں کچھ گھوڑوں پر سوار تھے اور کچھ اونٹوں پر اور چند ایک پیدل بھی چلے جا رہے تھے۔ ہمیں تو وہ قافلوں کو لوٹنے والے ڈاکو لگتے تھے۔ ان کے ساتھ جو اونٹ تھے ان میں سے دو اونٹوں پر پالکیاں تھیں۔ دونوں میں ایک ایک یا شاید دو دو عورتیں تھیں۔ ہمیں شک ہے کہ وہ ڈاکو تھے۔ انہوں نے کسی قافلے کو لوٹنے کی کوشش کی ہو گی اور قافلے والوں نے مقابلہ کر کے انہیں مار بھگایا ہو گا"۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو میرے دوست!" ــــ جاسوس نے کہا ــــ "وہ ڈاکوؤں کا ہی گروہ ہے۔ انہوں نے ایک قافلے پر حملہ کیا تھا لیکن ناکام رہے کیونکہ قافلے میں لڑنے والے بہت سے آدمی تھے۔ انہوں نے ان ڈاکوؤں کے کئی ایک آدمی مار ڈالے اور باقی بھاگ آئے۔ میں سلجوقی فوج کا آدمی ہوں اور اس قافلے کا سراغ لیتا پھر رہا ہوں۔ اگر تم بتا سکو کہ یہ لوگ آگے کہاں گئے ہیں تو تمہیں سلطان کی طرف سے جھولی بھر کر انعام

ملے گا"۔

"میں یہ تو نہیں بتا سکتا کہ وہ کہاں گئے ہیں' میں صرف یہ بتا سکتا ہوں کہ اس پہاڑی علاقے کے اندر پرانے زمانے کا ایک چھوٹا سا قلعہ ہے جو دراصل قلعے کے کھنڈرات ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اس قلعے میں گئے ہوں۔ ان پہاڑیوں کے اندر کوئی اور آبادی نہیں۔ بڑے بڑے غار ہیں جہاں صرف ڈاکو ہی جاسکتے ہیں' کسی اور نے وہاں جا کر کیا کرنا ہے"۔

قزل سارق کا جاسوس وہیں سے واپس آگیا اور اپنے سالار کو بتایا۔

اس جاسوس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ جب وہاں سے قافلے کا سراغ لے کر آیا تھا تو پیچھے کیا ہوا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ جب جاسوس وہاں سے چلا تو ایک بوڑھا آدمی مکان سے نکلا اور اس نے اپنے اس آدمی کو بلایا اور پوچھا کہ یہ شتر سوار کون تھا اور کیا کہتا تھا۔ اس نے اس بوڑھے کو بتادیا کہ وہ کیا پوچھ رہا تھا اور اس نے کیا بتایا تھا۔

"بیوقوف آدمی!" — بوڑھے نے کہا — "جانتے ہو تم نے کیا کیا ہے؟"

"یہ سلطان کی فوج کا آدمی تھا" — اس آدمی نے کہا — "وہ ڈاکوؤں کے اسی گروہ کی تلاش میں تھا۔ میں جو جانتا تھا وہ اسے بتادیا ہے۔ اگر سلطان کی فوج نے ان ڈاکوؤں کو پکڑ لیا تو مجھے انعام ملے گا"۔

"تمہیں انعام بعد میں ملے گا" — بوڑھے نے کہا — "لیکن انعام لینے کے لئے نہ تم زندہ رہو گے نہ ہم میں سے کوئی زندہ رہے گا۔ تم نے ہم سے پوچھ کر بات کرنی تھی۔ تم نے جس کی نشاندہی کی ہے وہ حسن بن صباح تھا۔ کیا تم نہیں جانتے حسن بن صباح کون ہے؟"

"ہاں!" — اس نے کہا — "وہ آسمان سے اُترا ہے اور خدا نے اسے اپنا ایلچی بنا کر بھیجا ہے"۔

"وہ خدا کے بندوں کو سیدھا راستہ دکھانے آیا ہے" — بوڑھے نے کہا — "اس کے مقابلے میں کتنا ہی بڑا لشکر آجائے وہ تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ آسمان سے معلوم نہیں جنات اُترتے ہیں یا قہر برسانے والے فرشتے آجاتے ہیں جو لشکر کو کاٹ کر پھینک جاتے ہیں۔ کیا تم نے تبریز کی لڑائی نہیں سنی؟ ابھی چند دن ہی تو گزرے ہیں۔ سلطان کا پورے کا پورا لشکر اپنے ہی خون میں ڈوب گیا ہے"۔

"ہاں سنا تھا" — اس نے کہا۔

مکانوں سے ایک اور آدمی نکل آیا۔ بوڑھے نے اسے بتایا کہ اس نے سلطان کے ایک جاسوس کو بتادیا ہے کہ حسن بن صباح ادھر چلا گیا ہے۔

"یہ تو نیم پاگل ہے" — دوسرے آدمی نے کہا۔

"یہ تو میں جانتا ہوں" — بوڑھے نے کہا — "لیکن سوچنے والی بات یہ ہے کہ سلطان نے حسن بن صباح کے پیچھے فوج بھیج دی تو کیا ہم نہ مارے جائیں گے؟..... سوچو ہم کیا کریں!"

وہ حسن بن صباح ہی تھا جو تبریز سے اپنے تمام پیروکاروں کو اور ابو علی کے قزوین سے بھیجے ہوئے تین سو سواروں کو اپنے ساتھ لے کر یہاں سے گزرا تھا۔ ان مکانوں کے قریب آیا تو تمام مکین باہر آکر راستے میں کھڑے ہو گئے تھے۔ حسن بن صباح نے انہیں دیکھ کر اپنے دو مصاحبوں سے کہا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ کسی کو پتہ نہ چلنے دیں کہ ہم ادھر سے گزرے ہیں۔ اگر انہوں نے کسی کو بتایا تو ان کے بچے سے بوڑھے تک کو قتل کر دیا جائے گا اور ان کے مکانوں کو آگ لگا دی جائے گی۔

اب ان کے لئے یہ صورت پیدا ہو گئی تھی کہ ان کے ایک آدمی نے جسے وہ نیم پاگل کہہ رہے تھے' ایک جاسوس کو بتا دیا تھا کہ وہ لوگ آگے گئے ہیں اور یہ بھی بتادیا تھا کہ ان پہاڑیوں کے اندر ایک قدیم قلعے کے کھنڈرات ہیں اور ہو سکتا ہے کہ وہ اسی قلعے میں گئے ہوں۔

○

دوسرے جاسوس کسی اور طرف چلے گئے تھے۔ ان کی واپسی کے انتظار میں پوری رات گزر گئی۔ وہ اگلے روز یکے بعد دیگرے آئے تو آدھا دن گزر چکا تھا۔ ان سب نے یہی خبر دی کہ حسن بن صباح ان پہاڑیوں کے اندر گیا ہے۔ اس طرح تصدیق ہو گئی کہ اس وقت اُن کا شکار کہاں ہے۔ تبریز سے اس جگہ کا فاصلہ کم و بیش چالیس میل بتایا گیا تھا۔

آدھا دن گزر چکا تھا جب قزل سارق نے اپنے ایک ہزار سواروں کے لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔

لشکر انہی مکانوں کے قریب سے گزرا۔ ایک جاسوس نے راستہ معلوم کر لیا تھا۔ لشکر پہاڑی علاقے میں داخل ہو گیا۔ آگے راستہ بہت ہی دشوار تھا اس لئے لشکر کی رفتار

بہت ہی سُست رہی۔ ابھی پندرہ سولہ میل بھی طے نہیں ہوئے تھے کہ سورج غروب ہو گیا۔ چونکہ علاقہ پہاڑی اور جنگلاتی تھا اس لئے شام بہت جلدی گہری ہو گئی پھر بھی قزل ساروق نے سفر جاری رکھا۔ آگے راستہ دشوار ہوتا چلا گیا۔ یہ راستہ پہاڑی کے ساتھ ساتھ بل کھاتا جارہا تھا۔ رات بالکل تاریک تھی پھر بھی سالار نے لشکر کو نہ روکا۔

وہ تھوڑا ہی اور آگے گئے ہوں گے لشکر میں شور سا سنائی دیا۔ ایک گھوڑا بڑی زور سے ہنہنایا۔ دو تین آوازیں سنائی دیں کہ ایک سوار کا گھوڑا پھسل کر نیچے چلا گیا ہے اس جگہ راستہ تنگ تھا۔ ایک طرف پہاڑی اور دوسری طرف وادی کی گہرائی تھی۔ اس طرف پہاڑی ڈھلان تقریباً عمودی تھی۔ پہاڑ پر درخت تو تھے لیکن اتنے زیادہ نہیں تھے جو گھوڑے یا سوار کو روک لیتے۔ کچھ دیر تک گھوڑے کے گرنے اور لڑھکتے ہوئے نیچے جانے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔

قزل ساروق نے لشکر کو روک لیا۔ اُس کے کہنے پر اُس سوار کو آوازیں دی گئیں جو گر پڑا تھا۔ اُس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا یا مر گیا تھا۔

سالار قزل ساروق نے یہ کہہ کر کوچ کا حکم دے دیا کہ ایک سوار کے لئے پورے لشکر کی پیش قدمی نہیں روکی جا سکتی۔

سوار اور زیادہ محتاط ہو کر چلنے لگے۔ وہ چار اور موڑ مڑے تو راستہ نیچے کو جانے لگا۔ آخر وہ اُس پہاڑ سے اُترے تو آگے خاصی چوڑی وادی تھی جہاں قزل ساروق نے سواروں کو صبح تک کے لئے روک لیا۔ سواروں نے گھوڑوں کی زینیں اتاریں اور باقی رات آرام کرنے کے لئے اِدھر اُدھر لیٹ گئے۔

صبح طلوع ہوئی تو کوچ کی تیاری کا حکم ملا۔ سوار گھوڑوں پر زینیں کس رہے تھے کہ ایک طرف سے ایک ادھیڑ عمر آدمی ایک عورت کے ساتھ آتا نظر آیا۔ اُن کے ساتھ دو لڑکے تھے جن میں سے ایک چودہ پندرہ سال کا اور دوسرا گیارہ بارہ سال کا تھا۔ آدمی نے ایک ٹٹو کی باگ پکڑ رکھی تھی اور ٹٹو پر کچھ سامان لدا ہوا تھا۔ اُنہوں نے وہیں سے گزرنا تھا جہاں لشکر کوچ کے لئے تیار ہو رہا تھا۔ وہ ایک طرف سے گزرتے گئے۔ سالار قزل ساروق لشکر سے تھوڑا پرے تھا۔ وہ خود تیار ہو چکا تھا۔ اُس کا سائیس اُس کے گھوڑے کو تیار کر رہا تھا۔

کچھ دیر بعد اُس کے تین چار ماتحت کماندار اُس کے پاس آ گئے۔ وہ بالکل تیار ہو کر

ئے تھے۔

"یہ کون ہے؟" — قزل ساروق نے ادھیڑ عمر آدمی اور عورت کو دیکھ کر پوچھا۔

"ہم نے پوچھا نہیں" — ایک کماندار نے جواب دیا۔

"ان سے پوچھو" — قزل ساروق نے کہا — "ان کے ادھر سے گزرنے کا مطلب ہے کہ آگے یا اس علاقے میں کہیں کوئی آبادی ہے۔ اگر یہ یہاں کے رہنے والے ہیں تو انہیں معلوم ہوگا کہ وہ قدیم قلعہ کہاں ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہم غلط راستے پر جا رہے ہوں"۔

وہ لوگ قریب آئے تو اُنہیں روک لیا گیا۔

"السلام علیکم" — ادھیڑ عمر آدمی نے کہا — "آپ اس لشکر کے سالار معلوم ہوتے ہیں۔ آپ نہ روکتے تو بھی میں نے رُکنا تھا"۔

"آپ کہیں سے آ رہے ہیں یا کہیں جا رہے ہیں!" — قزل ساروق نے پوچھا۔

"ہم آ رہے ہیں سالارِ محترم!" — اُس نے جواب دیا — "ہم تقریباً ایک سال بعد واپس اپنے گھر آ رہے ہیں۔ الحمد للہ ہم فریضۂ حج ادا کرنے گئے تھے"۔

"کیا آپ پیدل ہی گئے تھے؟"

"پیدل بھی سمجھیں اور سوار بھی سمجھیں" — اس نے جواب دیا — "یہ ایک ٹٹو ساتھ تھا۔ باری باری اسی پر سوار ہوتے گئے۔ کہیں سب کو کرائے کی سواری مل گئی اور یوں ارضِ حجاز تک پہنچے، مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی، فریضۂ حج ادا کیا اور پھر جنگوں کے وہ میدان دیکھے جہاں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کفار سے لڑے تھے۔ بدر کا میدان دیکھا، اُحد کا میدان دیکھا اور پھر اُس جگہ کو سجدے میں جا کر چوما جہاں ہمارے رسول زخمی ہو کر گرے تھے..... خدا کی قسم، وہاں سے واپس آنے کو جی نہیں چاہتا تھا لیکن پیچھے بوڑھے ماں باپ کو نوکروں کے سپرد کر گئے تھے۔ ان کی خاطر واپس آ گئے ہیں"۔

"اللہ آپ کا حج قبول فرمائے" — قزل ساروق نے کہا — "آپ خوش نصیب ہیں جو اللہ کے گھر میں رکوع و سجود کر کے آئے ہیں..... کیا آپ کی بستی یہاں کہیں قریب ہی ہے؟"

"ابھی قریب بھی نہیں" — حج سے آنے والے نے جواب دیا — "تقریباً"

پورے دن کی مسافت ہے"۔

"کیا اس علاقے میں کوئی بہت پرانا قلعہ بھی ہے؟" — قزل ساروق نے پوچھا اور خود ہی کہا — "سنا ہے اس کے کھنڈر باقی ہیں"۔

"ہاں محترم سالار!" — حاجی نے جواب دیا — "کہنے کو تو اس پہاڑی کے دائیں طرف ہے لیکن وہاں تک پہنچتے آج کا دن گزر چکا ہو گا..... کیا آپ اس قلعے تک جانا چاہتے ہیں؟"

"ہاں!" — قزل ساروق نے کہا — "قصد تو یہی کا ہے' راستہ معلوم نہیں"۔

"راستہ مجھ سے پوچھیں" — حاجی نے کہا — "میرے ساتھ بیوی بچے نہ ہوتے تو میں آپ کے ساتھ چلتا تاکہ کہیں آپ بھٹک نہ جائیں۔ آپ جو فرض ادا کر رہے ہیں اسے میں تو فریضہ حج کے برابر سمجھتا ہوں..... آپ یقیناً" سلجوقی ہیں"۔

"اہل حجاز کے مسافر!" — قزل ساروق نے کہا — "ہم سب سے پہلے مسلمان ہیں اس کے بعد سلجوق ہیں"۔

○

اس اجنبی نے قزل ساروق کو اس قدیم قلعے کا راستہ سمجھانا شروع کر دیا۔ راستہ کوئی پیچیدہ تو نہیں تھا البتہ دشوار تھا۔ قزل ساروق کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ اُس وادی سے الٹے رخ چلنے والا تھا۔

"آپ تو فرشتہ معلوم ہوتے ہیں" — قزل ساروق نے کہا — "ہم تو کسی اور ہی طرف چلنے والے تھے۔ اللہ نے آپ کو ہماری رہنمائی کے لئے بھیجا ہے"۔

"اللہ مسبب الاسباب ہے" — حاجی نے کہا — "اللہ نے یہ سعادت بھی میری قسمت میں لکھی تھی کہ مجاہدین کی رہنمائی کروں۔ مجھے آپ کے کام میں دخل تو نہیں دینا چاہئے لیکن پوچھنا چاہوں گا کہ آپ اُس قدیم قلعے میں کیوں جا رہے ہیں؟"

"کیا آپ نے حسن بن صباح کا نام سنا ہے؟" — قزل ساروق نے پوچھا۔

"اُس ابلیس کا نام کس نے نہیں سنا ہو گا!" — حاجی نے کہا — "میں بغداد پہنچا تو وہاں سے یہاں تک اُسی کا نام سنتا آ رہا ہوں۔ افسوس یہ ہو رہا ہے کہ لوگ اُسے نبی اور اللہ کا ایلچی مان رہے ہیں۔ یہاں سے دور پیچھے مجھے پتہ چلا ہے کہ وہ اُسی قدیم قلعے میں ہے اور اس کے ساتھ بڑے خونخوار قسم کے جانباز ہیں..... اگر آپ اُس ابلیس کو ختم کر

دیں تو میں یقین دلاتا ہوں کہ آپ کو حج اکبر کا ثواب ملے گا"۔

"ہماری کامیابی کی دعا کریں" — سالار قزل ساروق نے عقیدت مندی کے لہجے میں کہا۔

"نہیں تک کی ایک ایک کھجور کھلا دیں" — حاجی کی بیوی بولی — "اور زم زم کے پانی کا ایک ایک گھونٹ پلا دیں"۔

اس شخص نے ٹٹو کی پیٹھ پر لدے ہوئے سامان میں سے چھوٹا سا ایک تھیلا نکالا۔ اس میں سے کچھ کھجوریں نکالیں۔ ایک ایک کھجور سالار قزل ساروق اور اُس کے ماتحتوں کو دی۔

"ان کی گٹھلیاں نکلی ہوئی ہیں" — حاجی نے کہا — "وہاں سے ایسے ہی ملتی ہیں۔ بڑی خاص قسم کی کھجوریں ہیں..... اگر آپ کے لشکر کے پاس بہت بڑا ڈول یا مشکا ہو تو وہ پانی سے بھر لیا جائے تو میں اس میں زم زم کا پانی ملا دوں گا۔ پورے لشکر کو دو دو گھونٹ پلائیں"۔

یہ ایک ہزار کا لشکر تھا جس کے کھانے پینے کا انتظام اور برتن وغیرہ ساتھ تھے۔ پانی سے بھرے ہوئے بڑے مشکیزے اونٹوں پر لدے ہوئے تھے۔ قزل ساروق کے حکم سے دو تین مشکیزے لائے گئے۔ حاجی نے خشک چمڑے کی بنی ہوئی ایک صراحی نکالی جس کا منہ بڑی مضبوطی سے بند تھا۔ حاجی نے یہ صراحی تینوں مشکیزوں میں خالی کر دی اور کہا کہ کوچ سے پہلے ہر آدمی یہ پانی پی لے۔

"پھر آپ دیکھنا سالارِ محترم!" — حاجی نے کہا — "آپ کو راستے کی دشواریوں کا احساس تک نہیں ہو گا اور آپ اور آپ کا ہر سوار یہ محسوس کرے گا کہ وہ اڑ کر اس قلعے تک پہنچ گیا ہے"۔

قزل ساروق اور اس کے ماتحتوں نے ایک ایک کھجور کھائی پھر انہوں نے مشکیزے سارے لشکر میں اس حکم کے ساتھ گھمائے کہ ہر سوار پانی پیئے۔ لشکر کو یہ بھی بتایا گیا کہ یہ آب زم زم ہے۔

حاجی اپنی بیوی اور بیٹوں کے ساتھ رخصت ہو گیا۔ سالار قزل ساروق نے صرف اس خیال سے اپنے آپ میں ایک نئی توانائی محسوس کی کہ اس نے مکے کی کھجور کھائی ہے اور آب زم زم پیا ہے۔ لشکر کے ہر سوار نے عقیدت مندی سے آب زم زم پیا اور پھر

لشکر اُس راستے پر چل پڑا جو حاجی نے بتایا تھا۔ حاجی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

○

لشکر کو ایک بار پھر پہاڑی راستے پر اوپر جانا پڑا۔ گزشتہ رات فن کا ایک گھوڑا اور اس کا سوار ضائع ہو چکے تھے۔ یہ راستہ اُس سے زیادہ تنگ اور خطرناک تھا۔ گھوڑے ایک دوسرے کے پیچھے جا رہے تھے۔ اُن کی رفتار بہت ہی سست تھی۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتے جا رہے تھے' راستہ تنگ ہی ہوتا جا رہا تھا اور آگے جا کر راستہ ختم ہو گیا۔ آگے پہاڑی دیوار کی طرح کھڑی تھی۔

"کیا اُس حاجی نے یہی راستہ بتایا تھا؟" — سالار قزل سارق نے اپنے ماتحتوں سے پوچھا جو اس کے پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔

"اس نے کہا تھا کہ یہ راستہ اوپر جا کر نیچے اُترے گا" — ایک ماتحت نے کہا۔
"یہاں اور کوئی راستہ ہے ہی نہیں"۔

قزل سارق نے اس پہاڑی کی ڈھلان کو دیکھا۔ اس سے آدمی سنبھل سنبھل کر اُتر سکتا اور گھوڑے بھی اُتر سکتے تھے لیکن سواروں کے بغیر۔

"کسی ایک سوار کو نیچے اُتارو" — قزل سارق نے اپنے ماتحت کمانداروں سے کہا — "گھوڑے سے اتر کر..... گھوڑے کو ساتھ رکھے"۔

ایک جگہ ایسی مل گئی جہاں ڈھلان کا زاویہ زیادہ خطرناک نہیں تھا۔ ایک سوار گھوڑے سے اُترا اور باگ پکڑ کر ڈھلان سے اُترنے لگا۔ وہ کبھی دائیں ہوتا کبھی بائیں' جہاں پاؤں جمانے کو جگہ ملتی پاؤں جما کر اُتر آیا۔ گھوڑے' خچر اور گدھے کو پہاڑی پر چڑھنے اور اُترنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ قدرت نے ان کے پاؤں ایسے بنائے ہیں کہ پہاڑی سے پھسلتے نہیں۔

بلندی خاصی زیادہ تھی۔ وہ سوار آخر اُتر گیا۔ قزل سارق نے حکم دیا کہ تمام سوار اسی طرح نیچے اتریں۔ یوں لگا جیسے پہاڑ کا بالائی حصہ ٹوٹ کر بہت بڑے بڑے تودوں کی طرح نیچے کو سرک رہا ہو۔ چند ایک گھوڑے گرے' لڑھکے اور سنبھل کر کھڑے ہو گئے۔ آدمی گرتے سنبھلتے اُترتے گئے اور جب سب اُتر گئے تو سورج اپنا بہت سا سفر طے کر گیا تھا۔

سواروں کو اکٹھا کر کے کوچ شروع ہوا۔ حاجی کی بتائی ہوئی نشانیوں کو دیکھتے وہ چلتے

گئے۔ بہت دور جا کر ایک پہاڑی کے درمیان سے انہیں راستہ مل گیا۔ قدرت نے پہلے پہاڑی کو کاٹ رکھا تھا۔ اس سے نکل کر آگے گئے تو ایک پُرشور ندی نے راستہ روک لیا۔ چونکہ یہ علاقہ پہاڑی تھا اس لئے ندی کا بہاؤ بہت ہی تیز تھا۔ پانی اتنا شفاف کہ اس کی تہ میں کنکریاں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ ندی کم و بیش بیس گز چوڑی تھی۔ درمیان میں اس کا بہاؤ بہت ہی تیز تھا۔ گہرائی اتنی نہیں تھی کہ گھوڑے ڈوب جاتے۔ گھوڑے ندی میں ڈال دیئے گئے۔ درمیان میں گہرائی اتنی ہی تھی کہ پانی رکابوں تک آ گیا تھا لیکن بہاؤ اتنا تیز کہ گھوڑوں کے پاؤں اُکھڑنے لگے اور گھوڑے پہلو بہ پہلو ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ بعض گھوڑے بہاؤ کے ساتھ ہی چلے گئے اور دُور جا کر کنارے لگے۔

آگے گھنا جنگل تھا۔ ایسا گھنا بھی نہیں کہ اس میں سے گزرا ہی نہ جا سکتا لیکن زمین ہموار نہیں تھی۔ نشیب فراز تھے' گھاٹیاں اور ٹیکریاں تھیں' اور جگہ جگہ پانی جمع تھا۔ اس کے ارد گرد پھسلن اور دلدل تھی۔ گھوڑوں کو اسی میں سے گزارا گیا۔

○

یہ بہت ہی پرانا قلعہ تھا اور یہ کوئی بڑا قلعہ نہ تھا۔ ایک جگہ سے دیوار کے پتھر گر پڑے تھے اور دیوار کی بلندی آدمی جتنی بھی نہیں رہ گئی تھی۔ آدمی گھوڑے کی پیٹھ پر کھڑا ہو کر قلعے کے اندر دیکھ سکتا تھا۔ دروازوں کی لکڑی کو دیمک نے چاٹ لیا تھا۔ ان کے لوہے کے فریم سلامت تھے۔ ان فریموں نے ادھ کھائی لکڑی کو تھام رکھا تھا۔

قلعے کے اندر بہت ہی وسیع کھلی زمین تھی۔ اس پر مکانوں کا ملبہ بکھرا ہوا تھا۔ یہ ان لوگوں کے کچے پکے مکان تھے جو کبھی یہاں آباد تھے۔ اس ملبے کے ارد گرد قلعے کے کمرے تھے۔ زیادہ تر کمروں کی چھتیں بیٹھ گئی تھیں۔ کئی ایک کمرے ابھی سلامت تھے۔ ان کی چھتوں میں چمگادڑوں نے بسیرا کر رکھا تھا۔

بڑے دروازے کے پیچھے ڈیوڑھی تھی۔ اس کے پہلو میں بڑے کمرے تھے۔ دیواروں کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا۔ فرش اور دیواروں پر کائی اُگ کر خشک ہو گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ کون تھے جنہوں نے یہ قلعہ بنایا تھا۔ اس سوال کا جواب بھی نہیں ملتا تھا کہ اس دشوار گزار علاقے میں آ کر یہ قلعہ کیوں تعمیر کیا گیا تھا۔ علاقہ سرسبز اور خوبصورت تھا۔ شاید صدیوں پہلے یہ علاقہ آباد ہو گا۔ اب تو یہ چمگادڑوں اور بدروحوں کا مسکن تھا۔ کوئی

زندہ انسان تو اس میں جھانکنے کی بھی جرأت نہیں کرتا تھا نہ جھانکنے کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔

یہ قلعہ گزرگاہوں سے بہت دُور تھا۔ شاید ڈاکو اور رہزن کبھی یہاں چھپنے کے لئے آتے ہوں گے ..... لیکن کچھ دنوں سے یہ قلعہ پھر سے آباد ہو گیا تھا۔ آباد ہونے والوں کی تعداد کم و بیش تین سو تھی۔ ان میں سات آٹھ عورتیں بھی تھیں۔ آدمی جو تھے ان میں کئی ایک زخمی تھے۔ شدید زخمی بھی تھے۔ ان کے گھوڑے بھی تھے اور اونٹ بھی۔

وہ عارضی طور پر یہاں آئے تھے۔ یہاں سے انہوں نے اپنی منزل کو روانہ ہونا تھا لیکن ابھی انہوں نے منزل کے راستے کا تعین نہیں کیا تھا۔

سلجوقی سالار قزل ساروق کی یہی منزل تھی اور یہی اُس کا ہدف تھا۔ اُس کا شکار اسی قلعے میں موجود تھا۔ وہ حسن بن صباح تھا۔

حسن بن صباح تبریز خالی کر آیا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ پانچ سو سلجوقی سواروں اور ان کے سالار کو مار کر اس کا راستہ صاف نہیں ہو گیا بلکہ راستے کی دشواریاں اب پیدا ہوئی ہیں۔ سلجوقیوں کے ساتھ اُس کا یہ پہلا تصادم تھا۔ اس نے سلجوقیوں کو اپنا خونی دشمن بنا لیا تھا۔ پہلے تو اُن کے ساتھ اس کا نظریاتی اختلاف تھا۔ حسن بن صباح باطل عقیدے کا بانی اور علمبردار تھا۔ سلجوقی صحیح العقیدہ مسلمان تھے۔ وہ ایک اسلامی سلطنت میں حسن بن صباح کا وجود برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اب نظریاتی اختلاف مرنے مارنے والی عداوت کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

تبریز کے خونریز تصادم کے بعد حسن بن صباح خلجان، شاہ در اور اپنے پیر و مرشد احمد بن عطاش کی تحویل میں کسی بھی قلعے میں جا سکتا تھا مگر وہ جانتا تھا کہ سلطان ملک شاہ اور خصوصاً ابو مسلم رازی جوابی کارروائی کریں گے اور فوراً کریں گے اور اُسے زمین کی ساتویں تہہ میں سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔

یہ سوچ کر تبریز میں اس کے جتنے پیروکار، فدائین اور وہاں تھوڑے سے جو لوگ آباد تھے، اُن سب کو ساتھ لے کر اس قدیم قلعے میں آ گیا تھا۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ اُسے کس نے مشورہ دیا تھا یا اُسے کس نے اس قلعے کی نشاندہی کر کے کہا تھا کہ وہاں جا کر روپوش ہو جائے۔

تاریخوں میں آیا ہے کہ اُس نے احمد بن عطاش کو اطلاع دے دی تھی کہ تبریز میں

کیسی خونریزی ہوئی ہے اور اب وہ ایک ایسے قلعے کے کھنڈروں میں روپوش ہے جہاں تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔

O

سورج غروب ہونے میں ابھی بہت وقت رہتا تھا۔ حسن بن صباح ایک کمرے میں فرش پر بیٹھا تھا۔ یہ کمرہ اُس کے لئے خاص طور پر صاف کیا گیا تھا۔ اُس کے ساتھ جو لوگ آئے تھے، انہوں نے فرش پر کمبل، کھیس اور ان پر صاف ستھری چادریں بچھا دی تھیں۔ تکیے بھی رکھ دیئے۔ وہ ان لوگوں کا سردار یا سالار نہیں بلکہ ان کا روحانی پیشوا تھا۔ بعض نے اُسے پیغمبری کا درجہ دے دیا تھا۔ تبریز والوں نے دیکھا تھا کہ وہ بھاگنے کا راستہ دیکھ رہے تھے تو حسن بن صباح نے اللہ کو پکارا تھا۔ پھر اُس نے اعلان کیا تھا کہ دیکھو اللہ کی مدد آ رہی ہے، پھر تین سو سوار آ گئے تھے جنہوں نے سلجوقی سواروں کو بے خبری میں آ لیا اور انہیں ان کے سالار سمیت کاٹ کر پھینک ڈالا تھا۔

"....اور تم جانتے ہو" — حسن بن صباح کمرے میں اپنے سامنے بیٹھے ہوئے چند ایک آدمیوں سے کہہ رہا تھا — "کہ ہر پیغمبر کو بھاگنا پڑا، روپوش ہونا پڑا، مصائب برداشت کرنے پڑے اور انہیں کہیں پناہ لینی پڑی۔ حضرت عیسیٰؑ کو صلیب پر چڑھا لیا گیا، حضرت موسیٰؑ کو فرعون نے قتل کرنے کی کوشش کی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکل کر مدینہ میں پناہ لینی پڑی۔ اگر میں آج ان کھنڈروں میں آن بیٹھا ہوں تو یہ نہ سمجھنا کہ مجھے اللہ نے فراموش کر دیا ہے۔ یہ اللہ کا اشارہ تھا کہ میں یہاں آ گیا ہوں۔ پیغمبروں کے ساتھیوں کو اللہ نے عام لوگوں سے زیادہ اونچا رتبہ دیا ہے۔ تم سب اللہ کی نگاہ میں اونچے رتبے کے افراد ہو۔ تم پر جب بھی مشکل وقت آئے گا، اللہ تمہاری مدد کو پہنچے گا....."

وہ یہیں تک کہہ پایا تھا کہ باہر سے ایک آدمی کی بڑی بلند آواز سنائی دی — "حملہ آ رہا ہے..... ہوشیار ہو جاؤ"۔

حسن بن صباح چپ ہو گیا اور اس کے کان کھڑے ہو گئے۔

"سلجوقیوں کا لشکر آ رہا ہے"۔

"بہت بڑا لشکر ہے"۔

"کسی کو اطلاع دے دو"۔

ان آوازوں کے ساتھ جب دوڑتے قدموں کی آہٹیں سنائی دینے لگیں تو حسن بن صباح اٹھا اور باہر نکل گیا۔ اُس نے اپنے آدمیوں میں بڑی بھگدڑ مچی دیکھی۔ کچھ آدمی قلعے کی ٹوٹی ہوئی خستہ حال سیڑھیوں سے اوپر جا رہے تھے اور کچھ دوسری طرف کی سیڑھیوں سے دوڑتے اتر رہے تھے۔ انہوں نے گھبراہٹ کے عالم میں شور و غل بپا کر رکھا تھا۔

"زخمیوں کا کیا بنے گا"

"ہم اتنے بڑے لشکر سے نہیں لڑ سکتے"۔

"رُک جاؤ" — حسن بن صباح نے اپنی مخصوص گرجدار آواز میں کہا — "جو جہاں ہے وہیں رہے"۔

حسن بن صباح بڑے تحمل اور اطمینان سے سیڑھیاں چڑھ گیا اور اُس طرف دیکھا جس طرف اس کے آدمی دیکھ رہے تھے۔ کم و بیش ڈیڑھ میل دور ایک ہزار سوار طوفانی سمندر کی لہر کی طرح چلے آ رہے تھے۔ ایک ہزار سوار بہت بڑی طاقت تھی۔ قلعہ تو محض ایک کھنڈر تھا جس کے دروازے دیمک نے کھا لئے تھے۔ حسن بن صباح کے ساتھ تین سو سے کچھ ہی زائد آدمی تھے جن میں آدھے تبریز کی لڑائی کے زخمی تھے۔ ابو علی نے قزوین سے تین سو آدمی بھیجے تھے ان میں سے زیادہ تر واپس چلے گئے تھے۔ زخمیوں میں چند ایک ہی تھے جو لڑنے کے قابل تھے۔ ان سب کا یہ واویلا بجا تھا کہ وہ اتنے بڑے لشکر سے نہیں لڑ سکیں گے لیکن وہ اپنے پیر و مرشد یا امام حسن بن صباح کے چہرے پر سکون اور اطمینان دیکھ رہے تھے۔

سالار قزل ساروق کے ایک ہزار سوار قریب آتے گئے۔ اُن کی رفتار اتنی سست تھی جیسے وہ آرام آرام سے سفر پر جا رہے ہوں۔

"کیا خیال ہے" — حسن بن صباح نے ایک آدمی سے پوچھا جو اُس کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔

"اور قریب آنے دیں" — ساتھ والے آدمی نے کہا — "ان کی رفتار بتاتی ہے کہ وار خالی نہیں گیا"۔

"یہ تو میں دیکھ رہا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "پہلے سے انہیں گھوڑے دوڑا دینے چاہئیں تھے۔ میں کچھ اثر دیکھ رہا ہوں"۔

قلعے کی دیوار پر اور نیچے حسن بن صباح کے آدمیوں نے ایسا غل غپاڑہ بپا کر رکھا تھا

کہ کانوں پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔

"ہر آدمی اپنا ہتھیار لے کر لڑنے کے لئے تیار ہو جائے" — حسن بن صباح نے دیوار سے اندر کی طرف منہ کر کے اپنے آدمیوں کو حکم دیا — "تیر انداز اوپر آ جائیں"۔

چونکہ یہ حسن بن صباح کا حکم تھا اور سب اسے نبی بھی مانتے تھے، امام بھی اور بعض نے تو اسے پیغمبر بھی بنا دیا تھا۔ انہوں نے حکم کی تعمیل کی لیکن بددلی اور بزدلی اُن کے چہروں پر صاف نظر آ رہی تھی۔ زخمیوں نے الگ ہنگامہ بپا کر رکھا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ وہ تو معذوری اور بے بسی کی حالت میں ہی مارے جائیں گے۔

"دوسری طرف سے نکل بھاگو" — قلعے سے ایک آواز اٹھی۔

"ہمیں ساتھ لے چلو بھائیو" — یہ زخمیوں کی آہ و بکا تھی۔

حسن بن صباح نے دیوار پر کھڑے تیر اندازوں کو دیکھا۔ پھر اندر کی طرف اپنے آدمیوں کو دیکھا اور ان کی باتیں سنیں۔ باہر دیکھا تو ایک ہزار سواروں کا لشکر قلعے کے قریب آ گیا تھا اور گھوڑے قلعے کے دائیں بائیں پھیلتے جا رہے تھے۔ سالار قزل ساروق اور اس کے سواروں کے چہروں پر وہ غیض و غضب نہیں تھا جو حملہ آوروں کے چہروں پر ہوا کرتا ہے۔ قزل ساروق کو تو آگ بگولہ ہونا چاہئے تھا کیونکہ ان باطنیوں نے اُس کے ساتھی سالار امیر ارسلان کو قتل کیا تھا اور انہوں نے پانچ سو سلجوقی سوار مار ڈالے تھے لیکن قزل ساروق کے چہرے پر اطمینان سا تھا۔

○

حسن بن صباح نے اپنے آدمیوں کا جائزہ لے لیا تھا۔ اُس نے دیکھ لیا تھا کہ ان میں لڑنے کا دم نہیں اور نہ ہی ان میں جذبہ ہے۔ اس حقیقت سے تو وہ آگاہ تھا کہ اتنے تھوڑے سے آدمی ایک ہزار سواروں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ وہ اچانک دیوار سے ہٹ کر پیچھے کو مڑا اور وہیں سے اندر کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

"اللہ ..... مجھے زمین پر اتارنے والے اللہ" — حسن بن صباح نے دونوں ہاتھ اور منہ آسمان کی طرف کر کے بڑی ہی بلند آواز میں کہا — "تیرا ایلچی جسے تُو نے امامت بخشی ہے بہت بڑی مشکل میں آ گیا ہے۔ اپنی راہ میں لڑ کر زخمی ہونے والے بندوں پر رحم فرما.... فرشتے اتار دے۔ میری امامت اور اپنی خدائی کی لاج رکھ لے"۔

حسن بن صباح پلٹ کر دیوار کی بیرونی طرف چلا گیا۔ سالار قزل ساروق اُس کے

سامنے تھا۔ اس سلجوقی سالار نے اپنے سواروں کو کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ وہ حسن بن صباح کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہو؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ہم لوگ یہاں کیا لینے آئے ہیں؟" — قزل ساروق نے اپنے ایک ماتحت سے پوچھا جو اُس کے پاس موجود تھا۔

ماتحت نے اُس کے منہ کی طرف دیکھا اور پھر منہ اُوپر کر کے دیوار پر کھڑے حسن بن صباح کو دیکھنے لگا۔

حسن بن صباح ایک بار پھر پیچھے کو مُڑا۔ اُس نے بازو اُوپر کیے اور بڑی ہی گرجدار آواز میں اعلان کیا — "فرشتے اُتر آئے ہیں۔ حوصلوں کو مضبوط رکھو۔ دشمن بھاگ رہا ہے"۔

وہ پھر دیوار کے باہر کی طرف مُڑا' دو تیراندازوں کو بلایا' انہیں کچھ کہا' اُنھوں نے ایک ایک تیر چلایا۔ ایک تیر ایک سوار کے سینے میں اور دوسرا ایک اور سوار کی شہ رگ میں اتر گیا۔ دونوں سوار گھوڑوں سے گر پڑے۔

"تم نے میرے سواروں کو کیوں مروایا ہے؟" — سالار قزل ساروق نے حسن بن صباح سے پوچھا۔

"اپنے سواروں کو یہاں سے لے جاؤ" — حسن بن صباح نے کہا — "ورنہ تمہارا ہر سوار اسی طرح مارا جائے گا پھر تمہیں گھوڑے کے پیچھے باندھ کر گھوڑے کو بھگا دیا جائے گا"۔

سالار قزل ساروق نے کچھ بھی نہ کہا۔ اُس نے اپنا گھوڑا پیچھے کو موڑا اور چل دیا۔ تمام سوار اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

"امام نے دشمن بھگا دیا ہے" — قلعے کی دیوار سے بڑی ہی بلند آواز اٹھی — "اوپر آ کر دیکھو"۔

"اپنے پیر، مرشد کا معجزہ دیکھو" — ایک اور آواز اٹھی۔

"پیر و مرشد نہیں" — کسی نے گلا پھاڑ کر کہا — "نبی کہو ...... خدا کا بھیجا ہوا امام کہو"۔

نیچے والے تمام آدمی جن میں چند ایک عورتیں بھی تھیں' دوڑتے ہوئے اوپر گئے

اور حیرت زدگی کے عالم میں جاتے ہوئے سواروں کو دیکھنے لگے۔ سلجوقی سوار جاتے جاتے جنگل کی ہریالی میں تحلیل ہو گئے اور اس کے ساتھ ہی سورج مغرب والی بلند و بالا بازیوں کے پیچھے چلا گیا۔

○

حسن بن صباح دیوار پر ہی کھڑا رہا اور اس کی نظریں اُدھر ہی لگی رہیں جدھر سالار قزل ساروق اور اس کے سوار نظروں سے اوجھل ہو گئے تھے۔

"امام کو سجدہ کرو" — کسی کی آواز اٹھی۔

سب لوگ جیسے اسی آواز کے منتظر تھے۔ جو دیوار پر تھے وہ دوڑتے آئے اور حسن بن صباح کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے۔ نیچے والے آدمی جہاں تھے وہیں سے انہوں نے منہ حسن بن صباح کی طرف کر لئے اور سجدے میں چلے گئے۔

حسن بن صباح کا سینہ تن گیا۔ شروع سے اس کے ساتھ جو اُدھیڑ عمر آدمی موجود رہا تھا جسے اس نے کہا تھا کہ میں کچھ اثر دیکھ رہا ہوں' وہ بھی سجدے میں تھا۔ حسن بن صباح نے اُسے آہستہ سے پاؤں کی ٹھوکر ماری۔ اُس آدمی نے سر اٹھا کر دیکھا۔ حسن بن صباح نے اُسے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ آدمی اٹھا تو حسن بن صباح نے اُس کے کان میں کوئی بات کی۔

"کیا ہم اپنے فرشتوں کو واپس بلا لیں؟" — اُس آدمی نے اپنی آواز کو بھاری کر کے جلالی لہجے میں کہا — "بولو میرے امام؟"

"اے خداوند دو عالم!" — حسن بن صباح نے کہا — "میں اپنے ان بندوں کی طرف سے تیری ذاتِ باری کا شکر ادا کرتا ہوں۔ تیرے فرشتوں نے ہمارے دشمن کو بھگا دیا ہے"۔

سب لوگ ابھی تک سجدے میں تھے۔ وہ حسن بن صباح کے ساتھی کی آواز کو خدا کی آواز سمجھے تھے۔

"اٹھو" — حسن بن صباح نے کہا — "تم نے اللہ کی آواز سن لی ہے"۔

سب سجدے سے اُٹھے۔ اب اُن کے چہروں پر کچھ اور ہی تاثر تھا۔ بعض کے منہ حیرت سے یا جوشِ عقیدت سے کھل گئے تھے اور وہ حسن بن صباح کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے وہ بھی اللہ کا بھیجا ہوا فرشتہ تھا اور وہ ابھی غائب ہو جائے گا اور آسمان پر جا پہنچے گا۔

عورتیں جو پیچھے تھیں' دوڑتی اوپر آئیں۔ ہر ایک نے باری باری آگے بڑھ کر حسن بن صباح کا دایاں ہاتھ پکڑا' آنکھوں سے لگایا اور چوما۔

شام کا دھندلکا گہرا ہو رہا تھا۔ قلعے کے اندر مشعلیں جل اٹھی تھیں۔ حسن بن صباح آہستہ آہستہ چلتا سیڑھیوں سے اترا۔ اس کی چال میں اور اس کے چہرے پر جلالی تاثر تھا۔ اس کے ہر آدمی کی یہ کوشش تھی کہ وہ اس کے قریب ہو کر اسے ہاتھ لگائے اور دیکھے کہ یہ شخص انسان ہے یا اللہ کی پسندیدہ کوئی آسمانی مخلوق ہے۔ تبریز میں بھی اس نے اللہ سے مدد مانگی تھی تو "اللہ" نے ایسی مدد بھیجی تھی کہ سلجوقیوں کے تمام کے تمام سوار مارے گئے تھے۔

○

شام کھانے کے بعد قلعے میں جشن کا سماں بندھ گیا۔ عورتوں نے گیت گائے' آدمی پاگلوں کی طرح ناچے۔ انہوں نے ایک اونٹ ذبح کر لیا تھا اور تھوڑے سے وقت میں پکا بھی لیا تھا۔ وہاں کوئی چیز نہیں تھی تو شراب نہیں تھی۔ شراب حسن بن صباح نے اپنے لئے رکھی ہوئی تھی۔ اس کے پیروکار اور مرید اس شراب کو اللہ کے حضور پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

فتح کا یہ جشن بہت دیر بعد ختم ہوا۔ سب سے زیادہ خوش تو وہ زخمی تھے جو لڑنا تو دور کی بات ہے' چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھے۔ وہ بال بال بچ گئے تھے۔

وقت آدھی رات کا تھا۔ حسن بن صباح اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ فانوس جل رہا تھا۔ شراب کی صراحی اور پیالے سامنے رکھے تھے۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے پاس ایک ادھیڑ عمر آدمی بیٹھا تھا اور ایک جوان سال عورت بھی تھی۔ وہ ایک حسین عورت تھی جس کی آنکھیں مسکراتی تھیں۔ اس کے ہونٹوں کے تبسم میں ایسا تاثر تھا کہ دیکھنے والا اس سے نظریں ہٹا نہیں سکتا تھا۔

یہ ادھیڑ عمر آدمی وہی تھا جو قزل ساروق کو صبح سویرے وادی میں ملا تھا اور اس نے اپنا تعارف کرایا تھا کہ وہ اپنی بیوی اور ان دو بیٹیوں کے ساتھ حج کر کے آیا ہے۔ اس کے ساتھ جو بیوی تھی وہ یہی عورت تھی جو حسن بن صباح کے پاس بیٹھی شراب پی رہی تھی۔ یہ اس شخص کی بیوی نہیں تھی۔ یہ حسن بن صباح کے خصوصی اور نخبہ گروہ کی عورت تھی' اور ان کے ساتھ صبح وادی میں جو دو لڑکے تھے وہ ان کے کچھ نہیں لگتے

تھے۔ وہ تبریز سے آئے ہوئے ایک آدمی کے بیٹے تھے۔

"یہ صرف تمہارا کمال ہے اسماعیل!" — حسن بن صباح نے اس ادھیڑ عمر آدمی سے کہا — "مجھے توقع نہیں تھی کہ تم اتنی جلدی یہ کام کر سکو گے۔ نہ کر سکتے تو میں تمہیں بے قصور اور مجبور سمجھتا"۔

"وہاں نہ سہی" — عورت نے کہا — "یہ سلجوقی وہاں نہ ملتے تو کہیں اور مل جاتے۔ خوش نصیبی یہ ہوئی کہ یہ ہمیں جلدی مل گئے"۔

"میں نے انہیں غلط راستے پر ڈال دیا تھا" — اسماعیل نے کہا — "وہ ٹھیک راستے پر آ رہے تھے۔ اس راستے سے وہ جلدی یہاں تک پہنچ جاتے۔ میں نے یہ سوچ کر انہیں غلط راستے پر ڈال دیا تھا کہ کھجوروں اور پانی کو اپنا اثر پورا کرنے کا وقت مل جائے۔ آپ نے بتایا تھا کہ ان میں جو چیز ملائی گئی ہے' اس کا اثر دیر سے شروع ہوتا ہے"۔

"میں تمہیں خراج تحسین پیش کرتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے ایک خوشی یہ بھی ہے کہ اس دوائی کا یہ پہلا تجربہ کیا گیا ہے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ اس حد تک کامیاب ہو گا کہ ایک ہزار کے لشکر کو ذہنی طور پر مفلوج کر دے گا' اور مفلوج بھی اس طرح کرے گا کہ متاثرہ آدمی ہر کام ٹھیک ٹھاک کرے گا لیکن جذباتی لحاظ سے اتنا سرد ہو جائے گا کہ کسی کو لڑنے جھگڑنے کے لئے نہیں للکارے گا اور اگر اسے کوئی للکارے گا تو وہ بزدلوں کی طرح منہ موڑ جائے گا"۔

"تو کیا یہ لشکر صحیح و سلامت اپنی منزل پر پہنچ جائے گا؟" — اسماعیل نے پوچھا۔

"کیا وہ یہاں تک صحیح و سلامت نہیں پہنچ گئے تھے؟" — حسن بن صباح نے کہا — "وہ جو تمہارے بتائے ہوئے اتنے دشوار راستے سے یہاں تک پہنچ گئے تھے' واپس بھی چلے جائیں گے"۔

"یہ اثر کب تک رہے گا؟" — اسماعیل نے پوچھا۔

"شاید دو دن تک" — حسن بن صباح نے جواب دیا۔

"ایک اور بات امام!" — اس جوان سال عورت نے پوچھا جو اس کام میں شامل تھی — "ایسا کیوں نہ کیا گیا کہ اسی دوائی کی زیادہ مقدار کھجوروں اور پانی میں ملا دی جاتی تاکہ یہ لشکر جہاں تھا وہیں سے واپس چلا جاتا؟"۔

"اس میں ایک راز ہے" — حسن بن صباح نے ہنستے ہوئے کہا — "اس لشکر کو

دہیں سے واپس بھیجا جا سکتا تھا اور جس عقیدت سے انہوں نے تمہاری دی ہوئی کھجوریں اور ندی کے پانی کو آب زم زم سمجھ کے منہ میں ڈال لیا تھا" انہیں انہی کھجوروں اور پانی میں ایسا زہر بھی دیا جا سکتا تھا جس کا نہ کوئی ذائقہ ہوتا ہے نہ بو لیکن انہیں قلعے تک زندہ آنے اور زندہ واپس جانے دیا گیا..... ولی اور پیغمبر ہر کوئی نہیں بن سکتا' بنتا وہ ہے جس کی سوچ آسمانوں تک چلی جاتی ہے۔ میں نے ان لوگوں کو یہ معجزہ دکھانا تھا جو ہمارے ساتھ ہیں۔ انہوں نے یہ دیکھا کہ میرے کہنے پر آسمان سے مدد آئی جو نظر نہیں آتی تھی پھر ان آدمیوں نے دیکھا کہ اتنا طاقتور گھوڑ سوار لشکر میری ایک ہی للکار پر واپس چلا گیا۔ اب یہ لوگ جہاں جائیں گے میرا یہ معجزہ سنائیں گے۔ انسانی فطرت میں زیب داستان بھی موجود ہے اس لئے یہ لوگ میرا معجزہ بیان کرتے زیب داستان کے لئے مبالغہ آرائی بھی کریں گے۔ یہ تین سو انسان تین ہزار بلکہ اس سے بھی زیادہ تعداد کو میرے پاس کھینچ لائیں گے"۔

"بلکہ یہ تعداد بڑھتی ہوئی آئے گی" ــــ اسماعیل نے کہا ــــ "مسلمان کی عقیدت مندی کی بھی کوئی حد نہیں۔ اُسے کسی کی ذرا سی مٹی پڑیا میں باندھ کر دے دو اور کہو کہ یہ مکہ اور مدینہ کی سوغات ہے تو وہ بلا سوچے سمجھے یہ مٹی کھا لے گا۔ ایسے ہی اس سلجوقی سالار اور اس کے ساتھیوں نے میری دی ہوئی کھجوریں حجاز کی کھجوریں سمجھ کر بڑے احترام سے کھائیں اور جب میں نے ندی میں سے بھری ہوئی صراحی دکھا کر کہا کہ یہ زم زم کا پانی ہے تو سالار نے فوراً "ایسا انتظام کر لیا کر سارے لشکر کو پانی پلا دیا"۔

"تم بڑے کام کی چیز ہو خدیجہ!" ــــ حسن بن صباح نے اس جوان سال اور دلنشیں عورت کو بازو سے پکڑ کر اپنے قریب کرتے ہوئے کہا ــــ "ابھی تو میں نے تم سے بہت کام لینا ہے" ــــ حسن بن صباح نے خدیجہ کو اپنے بازو کے گھیرے میں لے لیا اور اسماعیل کی طرف دیکھا۔

اسماعیل اشارہ سمجھ گیا اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

○

بیشتر مورخوں نے تبریز کی لڑائی کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ سالار امیر ارسلان اور اس کے سوار مارے گئے۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ایک باطنی سردار علی نے قزوین سے تین سو باطنی سواروں کی کمک بھیجی تھی۔ پھر انہوں نے یہ بھی لکھا

ہے کہ سلطان ملک شاہ نے غصے کے عالم میں سالار قزل ساروق کو ایک ہزار سوار دے کر بھیجا تھا اور اس کے ساتھ حکم یہ دیا تھا کہ واپس آؤ تو حسن بن صباح تمہارے ساتھ ہو' زندہ یا مردہ۔

یہ سب باتیں تو ان مورخوں نے لکھی ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کوئی گمنام سا قلعہ تھا' یہاں سے بھی حسن بن صباح کے پیروکار بھاگ نکلنے پر اُتر آئے تھے اور حسن بن صباح نے تبریز والا مظاہرہ کیا تھا کہ وحی نازل ہو گئی ہے اور خدائی مدد آ رہی ہے۔ یہ سن کر سب کے حوصلے قائم ہو گئے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ ان مورخوں میں سے کسی نے بھی نہیں لکھا کہ اس لڑائی کا انجام کیا ہوا۔ یہاں آ کر ان کی لکھی ہوئی تاریخ ایسے اندھیرے میں چلی جاتی ہے جہاں کچھ نظر نہیں آتا۔ البتہ یہ بتایا گیا ہے کہ حسن بن صباح قلعہ الموت میں پہنچ گیا۔

داستان گو نے قزل ساروق اور اس کے سواروں کو ذہنی طور پر مفلوج کرنے کا جو واقعہ سنایا ہے یہ تین غیر معروف سے مورخوں نے کچھ ایسے حوالوں اور دلائل سے لکھا ہے کہ یہ قابل قبول اور مستند سمجھا جاتا ہے۔ ان میں اٹلی کا ایک تاریخ نویس ہانسولیمی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اس کی تحریریں اطالوی زبان میں ملتی ہیں جن کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا گیا ہے۔

بظاہر یہ واقعہ افسانوی سا لگتا ہے لیکن حسن بن صباح کو خدا نے ایسا دماغ دیا تھا جسے اگر خارق الفطرت یا بالائے سطح انسانی کہا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ اُس کی تاریخ کا مطالعہ گہرائی میں جا کر کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ اُس نے اپنے ابلیسی فرقے کی بنیاد انسان کی فطری کمزوریوں پر رکھی تھی۔ ان میں ایک تو عورت اور دوسری تھی نشہ۔ یہ دونوں چیزیں جب انسان کے دماغ پر غالب آ جاتی ہیں تو پھر وہ انسان اگر ضرورت پڑے تو اپنے بچوں تک کو قتل کر دیتا ہے۔ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حسن بن صباح کی کامیابی کا راز حشیش اور حسین عورت تھی۔

حسن بن صباح جہاں بھی جاتا تھا' اُس کا جاسوسی کا نظام اُس کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ تبریز سے نکلا تو اُس نے اپنے دو تین آدمی اس علاقے میں چھوڑ دیئے تھے۔ سالار قزل ساروق تبریز پہنچا تو اتنی دُور بیٹھے ہوئے حسن بن صباح کو اطلاع مل گئی۔ اگر نیم پاگل سا شخص قزل ساروق کے جاسوس کو نہ بتاتا کہ حسن بن صباح کا قافلہ فلاں طرف گیا ہے تو

وہاں تک کوئی بھی نہ پہنچ سکتا لیکن انہی دو تین مکانوں میں سے ایک آدمی نے حسن بن صباح تک اطلاع پہنچا دی کہ اس کی نشاندہی ہو گئی ہے اور ایک ہزار سواروں کا لشکر آرہا ہے۔

حسن بن صباح کو اطلاع ملی تو اُس نے وہاں سے کہیں اور بھاگ جانے کی بجائے یہ طریقہ سوچ لیا جو بیان کیا گیا ہے۔ اُس نے اپنا خفیہ گروہ ساتھ رکھا ہوا تھا جس میں اسماعیل بھی تھا اور خدیجہ بھی۔ فوراً یہ طریقہ سوچ لیا گیا پھر جس طرح اسماعیل اور خدیجہ میاں بیوی کے روپ میں دو لڑکوں اور ایک ٹٹو کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ یہ حسن بن صباح کے دماغ کا بے مثال کمال تھا۔ اسماعیل اور خدیجہ رات بھر ان سواروں کے انتظار میں ایک جگہ بیٹھے رہے تھے۔ صبح انہیں یہ لشکر مل گیا۔

○

سالار قزل ساروق اپنے سواروں کے آگے آگے گھوڑے پر سوار چلا گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے ذہن سے یہ اتر ہی گیا ہو کہ وہ کس مقصد کے لئے ادھر آیا تھا۔ اُس کا انداز ایسا تھا جیسے لوگ سیر سپاٹے کے لئے آئے ہوں۔ ان کے دماغ صحیح کام کر رہے تھے۔ وہ راستہ بھولے نہیں تھے۔ ان کے دماغ کس وقت بھی حاضر تھے جب وہ بڑی خطرناک حد تک تنگ پہاڑی راستوں پر جا رہے تھے' البتہ انہیں یہ احساس نہیں تھا کہ کہیں رات بھر کے لئے پڑاؤ بھی کرنا ہے۔

انہوں نے دن کے وقت پڑاؤ کیا۔ کھانا تیار کیا کھایا بھی اور سو گئے۔ چونکہ ان کا احساس زندہ نہیں تھا یا احساس سویا ہوا تھا' وہ ایسے سوئے کہ اگلی صبح جاگے اور چل پڑے۔

تاریخوں میں یہ کھوج نہیں ملتا کہ وہ کتنے پڑاؤ کر کے مرو پہنچے' یہ سراغ ملتا ہے کہ وہ مرو سے ابھی کچھ دور ہی تھے تو سالار قزل ساروق نے اپنے سر کو زور سے ہلایا اور لشکر کو روک لیا۔ اُس نے اپنے ماتحتوں کو بلایا۔ وہی ماتحت جو خوش و خرم چلے آرہے تھے' اب کسی اور ہی ذہنی کیفیت میں تھے۔ ان کے چہروں پر حیرت اور تذبذب کے تاثرات تھے۔

"تم کیا محسوس کر رہے ہو؟" — سالار قزل ساروق نے ان سے پوچھا اور اپنی کیفیت یوں بیان کی — "لگتا ہے ہم خواب میں کہیں گھومتے پھرتے رہے ہیں اور شاید حسن بن صباح کو دیکھا تھا"۔

"میں بھی یہی محسوس کر رہا ہوں" — ایک ادھیڑ عمر ماتحت نے کہا — "کچھ کچھ یاد آرہا ہے کہ ہم وہاں تک پہنچے تھے"۔

"مجھے یاد ہے کہ ایک حاجی' اس کی بیوی اور دو بیٹے ملے تھے" — ایک اور ماتحت کماندار نے کہا — "پھر مجھے ندی تک یاد ہے"۔

سالار قزل ساروق یوں چونک کر سیدھا ہو گیا جیسے اسے سب کچھ یاد آگیا ہو۔

"ہمارے ساتھ دھوکا ہوا ہے" — اُس نے کہا — "ہم سلطان کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے لیکن میرے رفیقو! سلطان کے آگے جھوٹ نہیں بولنا۔ جو ہوا ہے وہ من و عن بیان کرنا ہے۔ اگر سلطان کو رحم آگیا تو وہ ہمیں معاف کر دے گا ورنہ وہ جو بھی سزا دے گا وہ ہم دل و جان سے قبول کریں گے"۔

"پھر یوں کرو دوستو!" — ایک ماتحت کماندار نے کہا — "اگر سلطان نے ہمیں سبکدوش کر دیا تو آؤ حلفیہ عہد کریں کہ ہم اپنے طور پر سب مل کر حسن بن صباح کو زندہ یا مردہ سلطان کے سامنے پیش کریں گے اور اس کے گروہ کے ایک بھی آدمی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔

"اگر سلطان نے ہمیں قید میں ڈال دیا" — ایک اور کماندار نے کہا — "تو ہم اُسے کہیں گے کہ ہمیں اپنی اس غلطی کا کفارہ ادا کرنے کے لئے آزاد کرے"۔

"یہ بھی سوچ لو دوستو!" — سالار قزل ساروق نے کہا — "حسن بن صباح کی جگہ کوئی اور دشمن ہوتا تو سلطان ہماری اس غلطی کو جو ہم سے دھوکے میں ہوئی' معاف کر دیتا لیکن یہاں معاملہ حسن بن صباح اور اسلام کے تحفظ کا ہے' سلطان مجھے اور تم سب کانداروں کو سزائے موت بھی دے سکتا ہے اور مجھے توقع سزائے موت کی ہی ہے لیکن ہماری وفاداری یہ ہے کہ ہم اُس کے سامنے جائیں گے اور مرنے کے لئے تیار ہو کر جائیں گے"۔

سلطان ملک شاہ کو سلار قزل سارق پر اتنا زیادہ اعتماد تھا کہ جس نے ایک بار بھی ایسے شک کا اظہار نہیں کیا تھا کہ اس کا یہ سالار ناکام لوٹے گا۔ اُس کا دانشمند وزیر خواجہ حسن طوسی نظام الملک دو تین بار کہہ چکا تھا کہ قزل سارق کا کوئی پیغام نہیں آیا۔ کم از کم ایک پیغام تو آنا چاہیے تھا۔

"لومڑی کا شکار آسان نہیں ہوتا خواجہ!" ـــ سلطان ملک شاہ نے کہا تھا ـــ "کیا آپ نہیں جانتے کہ حسن بن صباح جنگجو دشمن نہیں؟ وہ لومڑی ہے۔ وہ دکھاتا کچھ اور ہے اور مارتا بر چھی ہے۔ ہمارا سالار امیر ارسلان اس کے دھوکے میں مارا گیا ہے۔ وہ ان باطنیوں سے دو بدو لڑائی لڑا ہے۔ لیکن اُس پر وار پیٹھ پیچھے سے ہوا تھا۔ قزل سارق دھوکے میں نہیں آئے گا۔ وہ وثوق سے کہہ گیا تھا کہ وہ واپس آئے گا تو حسن بن صباح زندہ یا مُردہ اُس کے ساتھ ہو گا۔ نہ ہوا تو وہ خود بھی واپس نہیں آئے گا"۔

نظام الملک خاموش رہا تھا جیسے سلطان ملک شاہ کی اس بات کو وہ خوش فہمی سمجھا ہو اور اسے قزل سارق کی کامیابی مشکوک نظر آ رہی ہو۔ تاریخ شاہد ہے کہ خواجہ حسن طوسی دانشمند اور دُور اندیش تھا۔ اُس کی نگاہیں اُس حد سے آگے نکل جایا کرتی تھیں جس حد تک ملک شاہ کی نگاہیں دیکھ سکتی تھیں۔ ملک شاہ اُس کی دُور اندیشی کا قائل تھا۔ یہ الفاظ سلطان ملک شاہ کے ہی ہیں کہ خواجہ حسن طوسی روح کی آنکھ سے دیکھتا اور روحانی طاقت سے مشکلات پر قابو پا لیتا ہے۔

پھر ایک روز جب سورج ڈھل رہا تھا، سلطان ملک شاہ کے محل کے قریب ایک بڑی ہی بلند آواز اُٹھی ـــ "لشکر واپس آ رہا ہے"۔

پھر دوڑتے قدموں کے ساتھ آوازوں کا طوفان آ گیا۔

"سالار قزل سارق آ رہا ہے"۔

"لشکر پورا معلوم ہوتا ہے"۔

"فاتح آ رہے ہیں"۔

"سلطان عالی مقام!" ـــ سوار بان نے سلطان ملک شاہ کو اطلاع دی ـــ "سالار قزل سارق کا لشکر واپس آ رہا ہے۔ شہر سے ابھی کچھ دور ہے"۔

"ہمارا اور نظام الملک کا گھوڑا فوراً تیار کرو" ـــ ملک شاہ نے کہا۔

نظام الملک باہر کی آوازیں سُن کر ملک شاہ کے پاس پہنچ گیا۔

"ہم قزل سارق کا استقبال شہر سے باہر کریں گے" ـــ سلطان ملک شاہ نے کہا۔

سلطان اور نظام الملک گھوڑوں پر سوار شہر سے نکل گئے۔ محافظ دستے کے چار سوار اُن کے آگے اور بارہ پیچھے جا رہے تھے۔ سالار قزل سارق اور اُس کے ایک ہزار سوار شہر سے تھوڑی ہی دُور رہ گئے تھے۔

"قزل سارق نے ہمیں دیکھ کر بھی اپنے گھوڑے کو ایڑ نہیں لگائی" ـــ ملک شاہ نے نظام الملک سے کہا ـــ "کیا یہ فتح کے نشے کا اظہار ہے؟"

"اس کا چہرہ اور اس کا انداز فتح والا نہیں لگتا" ـــ نظام الملک نے کہا ـــ "اگر یہ فتح کے نشے سے سرشار ہوتا تو ہمیں دیکھتے ہی گھوڑے کو سرپٹ دوڑاتا ہم تک پہنچ چکا ہوتا۔ یہ تو لگتا ہے بڑی مشکل سے گھوڑے پر بیٹھا ہوا ہے"۔

"اور لشکر بھی خاموشی سے آ رہا ہے" ـــ سلطان ملک شاہ نے کہا اور گھوڑے کو ہلکی سی ایڑ لگائی۔

قریب آ کر قزل سارق نے اپنا گھوڑا لشکر کے آگے سے ایک طرف کر لیا اور ملک شاہ کے سامنے رُک گیا۔

○

"خوش آمدید سارق!" ـــ سلطان ملک شاہ نے اپنا ہاتھ اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ـــ "اگر تم حسن بن صباح کو زندہ یا مردہ اپنے ساتھ نہیں لا سکے تو یہ شرمساری کی معقول وجہ نہیں"۔

سلطان ملک شاہ نے دیکھا کہ اُس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا اور قزل سارق نے اپنا ہاتھ آگے نہیں کیا۔

"سالار قزل ساروق؟" — نظام الملک نے کہا — "سلطان محترم نے مصافحے کے لئے ہاتھ آگے کر رکھا ہے۔ میرا خیال ہے سالار کا رتبہ اتنا اونچا نہیں کہ وہ سلطان کے ہاتھ کو یوں نظر انداز کر دے"۔

"ٹھیک فرمایا محترم وزیر اعظم!" — قزل ساروق نے کہا — "لیکن آپ کا یہ سالار اس قابل نہیں رہا کہ سلطانِ عالی مقام کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے"۔

"کیوں؟" — سلطان ملک شاہ نے اپنا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے پوچھا — "کیا ہم غلط سمجھ رہے ہیں کہ تم فاتح لوٹے ہو؟..... سلجوق سالار شکست سے ناآشنا ہوتا ہے"۔

"سلطانِ محترم!" — سالار قزل ساروق نے کہا — "میری فتح یہی ہے کہ میں پورے دستے کو زندہ لے آیا ہوں۔ صرف دو سوار ضائع ہوئے ہیں لیکن یہ فتح حسن بن صباح کی ہے کہ ہم لڑے بغیر واپس آ گئے ہیں۔ اگر وہ ہم پر حملہ کر دیتا تو ہم میں سے کوئی بھی زندہ واپس نہ آتا..... کیا سلطانِ محترم اجازت دیں گے کہ آرام سے بیٹھ کر پورا واقعہ سناؤں؟"

ایک ہزار سواروں کا لشکر جس میں سے صرف دو آدمی کم ہوئے تھے ان کے قریب سے گزر تا جا رہا تھا۔ سلطان ملک شاہ سواروں کے چہرے دیکھ رہا تھا۔ ہر چہرہ سپاٹ تھا۔ ماتمی جلوس لگتا تھا۔

"ہمارے ساتھ آؤ" — سلطان ملک شاہ نے کہا۔

سلطان کے ہاں جا کر سالار قزل ساروق نے سلطان اور نظام الملک کو تمام واقعہ من و عن سنا دیا۔ کچھ بھی نہ چھپایا۔

"اس قدیم قلعے کی دیوار سے دو تیر آئے" — سالار قزل ساروق نے کہا — "اور میرے دو سوار مارے گئے۔ میں بہت حیران ہوا کہ ان تیر اندازوں نے ان سواروں کو کیوں مار ڈالا ہے۔ دیوار پر ایک اور آدمی کھڑا تھا۔ وہ حسن بن صباح تھا لیکن اس وقت وہ کوئی اور لگ رہا تھا۔ اس نے پوچھا تم یہاں کیوں آئے ہو؟ میں نے اپنے ساتھیوں سے پوچھا ہم یہاں کیوں آئے ہیں۔ حسن بن صباح نے کہا یہاں سے چلے جاؤ....."

"اور تم واپس چلے آئے" — سلطان ملک شاہ نے کہا۔

"ہاں سلطانِ محترم!" — قزل ساروق نے کہا — "میں کچھ نہیں سمجھ سکا" — اس کے آنسو بہنے لگے۔

"کیا آپ کو یاد ہے وہاں اور کیا کچھ ہوا تھا؟" — نظام الملک نے پوچھا۔

"یاد ہے" — قزل ساروق نے رندھی ہوئی آواز میں کہا — "سب کچھ یاد ہے بلکہ خواب کی طرح!"

"خوشامد مت کرو ساروق!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "ہم جاننا چاہتے ہیں یہ کیا ہوا تھا۔ یہ بتاؤ کہ واپسی سفر کے دوران تم اپنے آپ میں آئے تو تم نے یہ نہیں سوچا تھا کہ واپس جا کر قلعے پر حملہ کر دو؟"

"سوچا تھا سلطانِ عالی مقام!" — قزل ساروق نے جواب دیا — "اپنے ساتھی کمانداروں کے ساتھ صلاح مشورہ کیا تو سب نے کہا کہ واپس جانا بیکار ہے۔ جس طرح باطنی تبریز میں سالار امیر ارسلان اور اس کے پانچ سو سواروں کو قتل کر کے آگے نکل گئے تھے اسی طرح ان کھنڈروں سے نکل کر کہیں اور چلے گئے ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے سلطانِ محترم! مجھے ایسا صدمہ ہوا کہ میں کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکا۔ میں نے جو لڑائیاں لڑی ہیں وہ آپ کو یاد ہوں گی۔ میں خود بھی نہیں گن سکتا کہ میرے جسم پر کتنے زخموں کے نشان ہیں۔ سلطنتِ سلجوقیہ کی بنیادوں میں میرا اتنا زیادہ خون رچا بسا ہوا ہے کہ آج آپ بھی اس کی بو سونگھ سکتے ہیں۔ کیا کوئی مان سکتا ہے کہ میں ڈر کر بغیر لڑے واپس آ گیا ہوں؟"

"تم پر کوئی الزام نہیں ساروق!" — نظام الملک نے کہا — "تمہارے اور تمہارے لشکر کے ہوش و حواس ان کھجوروں نے گم کئے تھے جو تم کئی منزل کی مسافت تک کھاتے گئے تھے اور تم سب کی سوچنے کی صلاحیت اس پانی نے سلب کی تھی جسے تم آبِ زم زم سمجھے تھے"۔

"خواجہ طوسی!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "فوج کے لئے آج حکم جاری کر دو کہ باہر جا کر کوئی فوجی، وہ سالار ہے یا سپاہی، کسی اجنبی کے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں کھائے گا نہ کسی بھی قسم کا شروب پئے گا نہ پانی..... قزل ساروق! تم دھوکے میں آ گئے تھے۔ جاؤ آرام کرو۔ اپنے تمام لشکر سے کہہ دینا کہ تم پر کوئی الزام نہیں..... اور تمام سواروں کو بتا دینا کہ تمہیں کھجوروں اور پانی میں کوئی ایسا نشہ پلایا گیا تھا جس نے تمہاری عقل اور جذبے کو سلا دیا تھا۔ انہیں یہ بتانا اس لئے ضروری ہے کہ وہ اس وہم میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ حسن بن صباح کے پاس کوئی ایسی طاقت ہے جس سے وہ دشمن کی پوری

فوج کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیتا ہے"۔

"لشکر کے متعلق تو میں نے بتایا ہی نہیں" — قزل ساروق نے کہا — "میں نے اور میرے ماتحت کمانداروں نے سواروں کو یہ بتایا تھا لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ کئی ایک سوار اس وہم کو قبول کر چکے ہیں کہ حسن بن صباح کو خدا نے ایسی روحانی طاقت دی ہے کہ وہ اپنے جس دشمن کی طرف دیکھتا ہے وہ دشمن ہلاک ہو جاتا ہے یا ہماری طرح حسن بن صباح کی طرف پیٹھ کر کے وہاں سے غائب ہو جاتا ہے ...... یہ سب سوار میرے ساتھ آگئے ہیں لیکن ان کے دلوں میں وہم موجود ہے"۔

"ہم اس کا انتظام بھی کر لیں گے" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "تم جاؤ"۔

"میں آپ کا ممنون ہوں سلطانِ عالی مقام!" — قزل ساروق نے کہا — "آپ نے میری خطا معاف کی لیکن میں اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکتا۔ میں اس دھوکے کا انتقام لوں گا۔ میں گناہ کا کفارہ ادا کروں گا"۔

"میں تمہارے جذبات کو سمجھتا ہوں ساروق!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "لیکن تم نے وہ دشمن دیکھ لیا ہے، جس سے تم انتقام لینا چاہتے ہو۔ یہ آمنے سامنے آکر لڑنے والا دشمن نہیں۔ اس کے لئے ہمیں کوئی اور طریقہ سوچنا پڑے گا۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ تم جو تجربہ کار سالار ہو، اپنے منتخب سواروں کے ساتھ زندہ واپس آگئے ہو، امیر ارسلان کی طرح تمام سواروں کے ساتھ مارے نہیں گئے۔ اس دشمن کی سرکوبی میرا فرض ہے، اور اس فرض کی ادائیگی جہاد ہے۔ حسن بن صباح اور احمد بن عطاش نے اسلام کے نام پر ایک اور فرقہ بنالیا ہے اور لوگ دھڑا دھڑ اس فرقے میں شامل ہو رہے ہیں"۔

سالار قزل ساروق وہاں سے چلا تو گیا لیکن اس کے چہرے پر ایسے تاثرات تھے جیسے وہ سلطان ملک شاہ اور اس کے وزیر اعظم نظام الملک کی باتوں سے مطمئن نہ ہوا ہو۔ اس کا سوار دستہ اپنے ٹھکانے پر پہنچ کر گھوڑے کھول چکا تھا۔ ہر سوار کو آٹھ دس فوجیوں نے گھیر لیا اور ان سے سن رہے تھے کہ وہ کیا کر کے آئے ہیں۔

○

"آپ نے کیا سوچا ہے خواجہ؟" — سلطان ملک شاہ نے نظام الملک سے پوچھا۔

"ہمارے پاس فوج ہے" — نظام الملک نے کہا — "باطنیوں کی کوئی فوج نہیں

لیکن ہم نے ان پر دوبارہ حملہ کر کے کیا حاصل کیا ہے؟ ہمارے ایک سالار اور پانچ سو سواروں کو کس نے قتل کیا ہے؟ ...... ان لوگوں نے جن پر حسن بن صباح نے اپنی عقیدت مندی کا جنون طاری کر رکھا ہے۔ انہوں نے اپنی جانیں اس شخص کے لئے وقف کر رکھی ہیں۔ دوسرے حملے کا انجام دیکھ لیں۔ اس سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ یہ شخص جس کا نام حسن بن صباح ہے، اپنے مریدوں اور اندھی عقیدت رکھنے والے پیروکاروں سے ہماری فوج کو خون میں نہلا سکتا ہے۔ جس طرح اس نے سالار قزل ساروق اور اس کے دستے کو بیکار کیا ہے"۔

"لیکن خواجہ!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "میں آپ کا یہ مشورہ تو نہیں مانوں گا کہ حسن بن صباح کو ہم بھول جائیں"۔

"میں ایسا مشورہ دوں گا بھی نہیں عالی مقام!" — نظام الملک نے کہا — "میں نے عہد کر رکھا ہے کہ حسن بن صباح کو گرفتار کر کے اسے جلاد کے حوالے کر دوں گا"۔

"گرفتار کیسے کریں گے؟"

"ابھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکوں گا" — نظام الملک نے جواب دیا — "ابھی یہی کہوں گا کہ ضروری نہیں حسن بن صباح کی سرکوبی کے لئے فوج ہی استعمال کی جائے۔ میں ادھر سے غافل نہیں عالی جاہ! میں نے جاسوس بھیج رکھے ہیں۔ اب تک مجھے جو اطلاعیں ملی ہیں، ان سے بڑی بھدی اور خطرناک تصویر سامنے آتی ہے۔ یہ آپ کو پہلے ہی معلوم ہے کہ حسن بن صباح ان علاقوں کا بے تاج بادشاہ بن چکا ہے اور وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے اور اس کی مقبولیت بڑی تیزی سے بڑھتی جا رہی ہے"۔

"خواجہ حسن طوسی!" — سلطان ملک شاہ نے یوں کہا جیسے اچانک بیدار ہو گیا ہو — "ہم نے کوئی علاقہ اور کوئی ملک فتح نہیں کرنا۔ آپ کہتے ہیں کہ حسن بن صباح لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا ہے۔ ہم نے لوگوں کے دلوں کو باطل اور ابلیسیت سے آزاد کرنا ہے، اور یہ مہم تبلیغ سے سر نہیں ہوگی۔ یہ مبلّغوں کا نہیں یہ مجاہدین کا کام ہے ...... آپ کو ہماری سلطنت کی تاریخ تو معلوم ہی ہے خواجہ! آلِ سلجوق اسلام قبول کر کے یہ سلطنت قائم نہ کرتے تو اسلام کی بنیادیں ہل چکی ہوتیں اور اللہ کا یہ دین بڑا پرانا قصہ بن چکا ہوتا۔ پہلا دفاع اپنے دین کا پھر اپنی سلطنت کا۔ دین قائم و دائم ہے تو ہم سب

قائم ہیں۔ جس کا دین اور ایمان ہی نہ رہے اُس کی نگاہوں میں آزادی اور غلامی میں کوئی فرق نہیں رہتا ...... اسلام کو سامنے رکھو۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، اسلام کی بیخ کنی کے لئے ہو رہا ہے"۔

"سلطانِ عالی مقام!" ــــ نظام الملک نے کہا ــــ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی پوری ہو رہی ہے۔ آپؐ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد میری اُمت فرقوں میں بٹ جائے گی ..... اسلام کی بیخ کنی تو یہ فرقہ بندی کر رہی ہے"۔

"باتوں کا وقت نہیں رہا خواجہ!" ــــ سلطان ملک شاہ نے کہا ــــ "اب ہمیں کچھ کرنا ہو گا"۔

"سلطانِ معظم!" ــــ نظام الملک نے کہا ــــ "صرف دو آدمیوں کو رُوئے زمین سے اٹھا دیا جائے تو یہ فتنہ اپنے آپ ہی ختم ہو جائے گا"۔

"حسن بن صباح اور احمد بن عطاش کو!" ــــ ملک شاہ نے کہا ــــ "یہ میں سوچ چکا ہوں۔ کرنا یہی پڑے گا"۔

"لیکن یہ کام آسان نہیں" ــــ نظام الملک نے کہا ــــ "پھر بھی میں اس کا انتظام کروں گا ..... یہ انتظام کرنا پڑے گا"۔

○

سلجوقی سلطان ملک شاہ اور اُس کے وزیرِاعظم خواجہ حسن طوسی کا جذبہ قابلِ قدر تھا۔ ملک شاہ تو انتقام کی آگ میں جلنے لگا تھا۔ اُس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو سلطانی یا بادشاہی کے نشے میں لاؤ لشکر لے کر چڑھ دوڑتا اور نقصان اٹھاتا۔ سلطان ملک شاہ دانشمند تھا اور ہر طرح کی صورتِ حال میں ہوش و حواس قائم رکھتا تھا۔ نظام الملک اس سے زیادہ دانشمند اور دُور اندیش تھا۔

نظام الملک نے کچھ عرصے سے ان علاقوں میں جاسوس بھیج رکھے تھے جن علاقوں میں لوگ حسن بن صباح کے مرید اور پیروکار ہو گئے تھے بلکہ بعض لوگوں نے اسے امام کی بجائے پیغمبر سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ ان جاسوسوں میں سے کوئی نہ کوئی آتا اور اپنے مشاہدات بیان کر جاتا تھا۔ ان کا لُبِّ لباب یہی ہوتا تھا کہ باطنیوں کا ایک گروہ سارے علاقوں میں پھیلا ہوا حسن بن صباح کے معجزے اور کرامات بیان کرتا ہے۔

یہ رپورٹ تو ہر جاسوس دیتا تھا کہ یہ لوگ اسلام کے حوالے سے بات کرتے ہیں

اپنے آپ کو صحیح العقیدہ مسلمان کہتے ہیں۔

"تلبیس ابلیس" اور "آئینۂ تلبیس" میں بھی یہی آیا ہے کہ حسن بن صباح کے پیروکاروں کو شک تک نہ ہوتا تھا کہ جسے وہ امام اور نبی مانتے ہیں وہ باطنی ہے۔ اس کے مبلغ بڑے ہی دردناک انداز میں لوگوں کو اس قسم کی حکایتیں سناتے تھے کہ کفار نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر کیا کیا ظلم کئے اور کیسے کیسے ستم ڈھائے اور صحابۂ کرام نے اور رسالتؐ کے دوسرے شیدائیوں نے کس طرح ناموسِ رسالتؐ پر جانیں قربان کی تھیں۔

مؤرخوں نے لکھا ہے کہ ان علاقوں میں غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی اور یہ لوگ علم اور تعلیم سے بے بہرہ تھے اور اسلام کے معاملے میں بہت ہی جذباتی۔ انہیں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر یہود و نصاریٰ کے ظلم و ستم اشتعال انگیز الفاظ اور دردناک لہجے میں سناتے تھے کہ لوگ بھڑک اٹھتے تھے۔ ظلم و ستم کی ان حکایتوں میں زیادہ تر من گھڑت ہوتی تھی۔

یوں لوگوں کو مشتعل کر کے انہیں بتایا جاتا کہ حسن بن صباح وہ اسلام لے کر آسمان سے اترا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے تھے اور کفار نے سازش کے تحت اس کی روح بدل ڈالی اور چہرہ بگاڑ دیا ہے، اور اب حسن بن صباح پر کفار ہی نہیں بلکہ بگڑے ہوئے نظریات اور غلط عقیدوں کو صحیح ماننے والے مسلمان بھی حسن بن صباح اور اس کے معاون ساتھیوں پر ظلم و تشدد کر رہے ہیں۔

نظام الملک کے جاسوس اسی قسم کی خبریں دے کر پھر چلے جاتے تھے۔ تین چار جاسوس تو وہیں جا کر آباد ہو گئے تھے۔ وہ معلومات اور خبریں اکٹھی کرتے رہتے، اپنے ساتھی جاسوسوں کو بتاتے اور یہ جاسوس باری باری خبریں مَرو پہنچاتے رہتے تھے۔

"میرے دوستو!" ــــ ایک بار نظام الملک نے اُدھر سے آئے ہوئے دو جاسوسوں سے کہا تھا ــــ "آج تک تم جتنی خبریں لائے ہو ان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں جانتا ہوں کہ وہاں در پردہ کیا ہوتا ہے۔ میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ حشیش نشے اور بڑی ہی خوبصورت اور چنچل لڑکیوں کے ذریعے بعض اہم افراد کو وہ اپنا غلام بنا لیتے ہیں۔ ہماری ضرورت یہ ہے کہ وہاں پردوں کے پیچھے بند کمروں میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ معلوم ہو جائے اور یہ بھی دیکھا جائے کہ حسن بن صباح اور اس کے اُستاد احمد بن عطاش کو قتل

کس طرح کیا جاسکتا ہے"۔

ابھی تک کوئی جاسوس حسن بن صباح کے اندرونی حلقے میں داخل نہیں ہو سکا تھا اس لئے یہ پتا لگانا ممکن نہیں تھا کہ پردے کے پیچھے کیا ہو تا ہے۔

○

اب نظام الملک نے ایسے جاسوسوں کی تلاش شروع کر دی جو حسن بن صباح کے اتنے قریب پہنچ جائیں کہ اُس کے خاص مصاحبوں میں شامل ہو جائیں اور اندر کی خبریں لائیں۔

داستان گو موزوں سمجھتا ہے کہ اس داستان کو واپس قدیم قلعے کے اُن کھنڈرات میں لے جائے جہاں سے حسن بن صباح نے سلجوقی سالار قزل ساروق اور اُس کے سواروں کے لشکر کو کچھ پسپا کر کے واپس بھیج دیا تھا۔ پھر کیا حسن بن صباح انہی کھنڈرات میں بیٹھا رہا تھا؟

نہیں..... رات اُس کے پیروکاروں نے فتح کا جشن منایا اور اگلی صبح وہاں سے اُس سمت کوچ کر گیا تھا جس طرف مشہور تاریخی قلعہ الموت تھا۔ اُس کی اور اس کے پیرو مرشد کی نظریں اس قلعے پر لگی ہوئی تھیں۔ حسن بن صباح کی منزل یہی قلعہ تھا۔ اُسے اس نے اپنا مستقل اڈہ بنانا تھا' اور اسی قلعے کے اندر اور اس کے ارد گرد اُس نے اپنی جنت بنانی تھی..... وہ جنت جس نے تاریخ کو انگشت بدنداں کر دیا تھا۔ یہ جنت ایسی حیران کن حقیقت تھی کہ آج کے دَور کے کچھ لوگ اسے محض ایک افسانہ اور مبالغہ کہتے ہیں۔

قلعہ الموت کے کھنڈرات آج بھی ایک وسیع و عریض ٹیکری کی بلندی پر موجود ہیں۔ ایران کے اس علاقے کو طالقان کہتے ہیں۔ یہ بلند ٹیکری شہر قزوین اور دریائے خزر کے درمیان ہے۔ یہ قلعہ یوں تعمیر ہُوا تھا کہ کسی زمانے میں اس خوبصورت خطے میں دیلمی سلاطین کی حکمرانی تھی۔ ایک روز ایک سلطان اپنا عقاب ساتھ لے کر شکار کو گیا۔ اُس نے اُڑتے ہوئے ایک پرندے کے پیچھے عقاب چھوڑا۔ عقاب نے پرندے کو کچھ دُور جا کر پکڑ لیا لیکن پرندہ اس کے پنجوں سے نکل گیا۔ یہ اتنا زخمی تھا کہ زیادہ دُور تک اُڑ نہیں سکتا تھا۔ گرتے گرتے ٹیکری کی چوٹی پر جا گرا۔ یہ کوئی چھوٹا سا پرندہ نہیں ایک بڑا اور کبوتر نسل کا پرندہ تھا۔

عقاب نے اس پر ایک بار پھر جھپٹا مارا اور اُسے وہیں دبوچ لیا۔ سلطان جو گھوڑے پر سوار تھا گھوڑا دوڑاتا ٹیکری پر چڑھ گیا۔ اس کے ساتھ اُس کے محافظ اور کچھ مصاحب تھے۔ سلطان نے پرندہ عقاب سے لے لیا اور جب ٹیکری کی اس بلندی سے چار سو نظر ڈالی تو اُس کی تو جیسے روح بھی مخمور ہو گئی ہو۔ یہ خطہ ہریالی کی بدولت بہت ہی خوبصورت تھا۔ ایک طرف دریا تھا جس کا اپنا ہی حسن تھا۔

ٹیکری دامن سے اوپر تک گھنے درختوں اور مخمل جیسی گھاس سے ڈھکی ہوئی تھی۔ بعض درخت پھولدار تھے جن کی بھینی بھینی خوشبو خمار سا طاری کرتی تھی۔ ٹیکری کے چاروں طرف دُور دُور تک ایسا سبزہ زار تھا کہ اسے جنت نظیر ہی کہا جا سکتا تھا۔ دو جگہوں سے چشمے پھوٹتے تھے۔ دونوں جگہوں پر پچیس تیس گز چوڑی جھیلیں بنی ہوئی تھیں۔ ان کا شفاف پانی چھوٹی چھوٹی ندیوں کی شکل میں بہتا' پتھروں اور کنکریوں پر جل ترنگ بجاتا دریا میں جا گرتا تھا۔ بعض جگہوں پر قریب قریب کھڑے تین تین چار چار درختوں کے تنوں کو پھولدار بیلوں نے کچھ اس طرح اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا کہ کٹیاں سی بن گئی تھیں۔ دائیں' بائیں اور پیچھے ہرے پتوں اور پھولوں کی دیواریں اور اوپر چھتیں بنی ہوئی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ کٹیاں انسانوں نے بیلوں کو تراش کر بنائی ہوں لیکن یہ قدرت کی صناعی کا شاہکار تھا۔ ایک یورپی مؤرخ نے لکھا ہے کہ کوئی کہے کہ یہ خطہ بہشت کا حصہ تھا اور کسی وجہ سے زمین پر آن گرا تھا یا یہ کہے کہ آدم اور حوّا کو خدا نے بہشت کے اس حصے میں رکھا تھا تو میں اسے سچ مان لوں گا۔

سلطان کو اس خطے کے حسن نے مسحُور تو کر ہی لیا تھا' اُس نے دیکھا کہ دفاعی لحاظ سے بھی یہ جگہ موزوں ہے۔ یہ ٹیکری اوپر سے نوکیلی یا گول نہیں بلکہ چپٹی تھی اور اس کا طول ایک میل سے ذرا ہی کم اور عرض بھی کچھ اتنا ہی تھا۔

"بلاشبہ میں نے اتنی دلفریب زمین آج ہی دیکھی ہے" ___ سلطان نے کہا ___ "کیا تم میں کوئی ہے جو مجھے یہ مشورہ نہ دینا چاہے کہ میں یہاں ایک ایسا قلعہ تعمیر کروں جو اس خطے جیسا دلنشیں اور چٹانوں جیسا مضبوط ہو؟"

"کوئی نہیں عالی جاہ!" ___ مصاحبوں کی ملی جلی آوازیں اُٹھیں ___ "اس سے زیادہ دلفریب جگہ اور کہیں نہیں..... قلعہ جو یہاں بنے گا اس کی دیواروں اور اس کے دروازوں تک کوئی دشمن نہیں پہنچ سکے گا..... دشمن کا لشکر کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو' ٹیکری

پر چڑھتے ہمارے تیروں کی بوچھاڑوں سے لڑھکتا نیچے جائے گا"۔

سلطان نے شکار سے واپس آ کر پہلا کام یہ کیا کہ اس ٹیکری پر قلعے کی تعمیر کا حکم دیا۔ دُور دُور سے ماہر معمار بلوائے گئے۔ ان سے نقشے بنوائے گئے۔ ان میں ردّ و بدل کیا گیا، نقشے کو بڑی محنت سے آخری شکل دی۔ اس دیلمی سلطان نے نقشے میں جو نئی چیزیں شامل کیں، انہوں نے تعمیرات کے ماہرین کو حیران کر دیا۔ قلعے کی تعمیر کوئی پیچیدہ کام نہیں ہوا کرتا تھا لیکن اس سلطان نے (جس کا تاریخ میں نام نہیں ملتا) جو نقشہ معماروں کو دیا وہ قلعہ بھی تھا، محل بھی اور باقی جو کچھ تھا وہ پُراسرار تھا۔ اس میں تہہ خانہ بھی تھا جس میں بے شمار کمرے تھے۔ ان کے آگے، پیچھے اور دائیں بائیں گلیاں تھیں جو بھول بھلیاں تھیں۔ ان میں چھوٹے کمرے تھے، بڑے بڑے بھی اور بہت بڑے بھی اور تہہ خانے سے ایک سرنگ بھی نکلتی تھی۔ اسے اتنا کھلا اور اونچا رکھا تھا کہ تین آدمی پہلو بہ پہلو اس میں سے گزر سکیں۔ سرنگ بھی بھول بھلیوں جیسی بنائی تھی۔

قلعے کی تعمیر شروع ہو گئی۔ ملک کے بے شمار معماروں کو اس کام پر لگا دیا گیا۔ ملک کی آدھی آبادی مزدوری کے لئے پہنچ گئی۔ اتنی زیادہ مخلوق چیونٹیوں کی طرح کام کرنے لگی۔

اس قلعے کا نام آلہ مُوت رکھا گیا۔ دیلمی زبان میں مُوت عقاب کو کہتے تھے اور آلہ کے معنی تربیت گاہ ہوتے تھے۔ سلطان عقاب کے پیچھے اس جگہ گیا تھا۔ اگر اس کے عقاب کا شکار اس ٹیکری پر نہ گرتا تو سلطان کبھی اس حسین ٹیکری کو نہ دیکھ سکتا نہ اسے ایسا قلعہ بنانے کا خیال آتا جو اس دور کا ایک عجوبہ تھا اور جو بعد میں حسن بن صباح کی جنت بنا۔

اس قلعے کا نام آلہ مُوت رکھا گیا تھا جو بگڑتے بگڑتے اَلمُوت بن گیا۔

○

حسن بن صباح کے زمانے میں یہ قلعہ اپنی اصل حالت میں تھا۔ اس علاقے کا حکمران امیر جعفری تھا۔ کسی بھی مؤرخ نے اس کا پورا نام نہیں لکھا۔ امیر جعفری نے اپنی حیثیت کے ایک سرکردہ فرد مہدی علوی کو قلعہ الموت کا حاکم مقرر کر رکھا تھا۔

حسن بن صباح الموت سے تھوڑی ہی دُور رُک گیا۔ اس کے ساتھ قدیم قلعے میں تین سو کے لگ بھگ آدمی تھے۔ ان سب نے اس کے ساتھ جانا تھا لیکن ان میں سے

بہت سے آدمیوں کو پہلے ہی روانہ کر دیا گیا تھا۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ وہ الموت کے راستے میں آنے والی آبادیوں میں جا کر لوگوں کو حسن بن صباح کے یہ معجزے سنائے جائیں کہ تبریز میں صرف ستر آدمی تھے جن پر سلجوقیوں کے پانچ سو سے زائد سواروں نے حملہ کر دیا۔ حسن بن صباح نے خدا سے مدد مانگی تو غیب سے سینکڑوں سوار آ گئے اور تمام کے تمام سلجوقی سواروں کو قتل کر دیا۔ پھر قدیم قلعے میں تین سو آدمیوں پر ایک ہزار سے زائد سواروں نے حملہ کر دیا۔ حسن بن صباح نے قلعے کی دیوار پر کھڑے ہو کر اس گھوڑ سوار لشکر کے سالار کی طرف دیکھا پھر کہا، واپس چلے جاؤ۔ لشکر نے محاصرہ اٹھا لیا اور واپس چلا گیا۔

ان تین سو آدمیوں میں صرف تین آدمی تھے جو حقیقت سے آگاہ تھے اور ایک عورت تھی جو حسن بن صباح کی رازدار تھی۔ ان تین آدمیوں میں ایک اسماعیل تھا اور یہ عورت خدیجہ تھی۔ ان دونوں نے حج سے آئے ہوئے میاں بیوی بن کر سالار قزل ساروق اور اس کے لشکر کو "آبِ زم زم" پلایا اور ذہنی طور پر مفلوج کر دیا تھا۔

صرف یہ تین آدمی اور ایک عورت تھی جنہیں حسن بن صباح کے ان معجزوں کی حقیقت معلوم تھی، باقی سب نے ان "معجزوں" کو حقیقت تسلیم کر لیا تھا۔ انہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ ان "معجزوں" کی تشہیر کریں۔ وہ تو انہوں نے کہے بغیر بھی کرنی تھی۔ یہ انسانی فطرت کا خاصا ہے اور یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ کوئی عجوبہ دیکھتا ہے یا کوئی پُراسرار واقعہ اس کے سامنے رُونما ہوتا ہے تو وہ اُس کی تہہ تک نہیں پہنچتا۔ اُس کا تجزیہ نہیں کرتا بلکہ اپنے آپ پر ہیجانی کیفیت طاری کر کے یہ واقعہ ہر کسی کو سنسنی خیز لہجے میں سناتا ہے اور اس وہم میں مبتلا ہو کر کہ اس کی بات کو کچھ لوگ سچ نہیں مانیں گے، سنانے والا زیبِ داستان کا سہارا لیتا اور مبالغہ آرائی کرتا ہے۔

حسن بن صباح کو خدا نے ایسا دماغ دیا تھا کہ وہ انسان کی کمزوریوں کو سمجھتا اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرنا جانتا تھا۔ اُس نے اپنے تین سو میں سے دو سو سے زائد آدمیوں کو خود اپنی زبان سے نہیں بلکہ اپنے خاص مصاحبوں کی زبان سے کہلوایا کہ وہ آبادیوں میں امام کے معجزے سناتے جائیں۔

"یہ حکم امام کا نہیں"۔۔۔ مصاحبوں نے ان تین سو افراد سے کہا۔۔۔ "یہ ہمارا فرض ہے کہ ہر کسی کو معلوم ہو جائے کہ وہ امام جسے خدا نے ملّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو

صحیح راستہ دکھلانے کے لئے آسمان سے اتارا ہے۔ اس نے کیا معجزے دکھائے ہیں۔
لوگوں سے کہو کہ وہ امام کو خدا کا بھیجا ہوا امام مان لیں"۔

حسن بن صباح جب الموت سے تھوڑی دور رکا' اس وقت اس کے ساتھ تین سو کی بجائے تین ہزار سے زائد لوگ تھے۔ تاریخ میں یہ پتہ نہیں ملتا کہ پہاڑیوں کے اندر قدیم قلعے سے الموت تک کتنا فاصلہ تھا' البتہ یہ بات صاف ہے کہ حسن بن صباح کے آدمیوں نے اس علاقے کی آبادیوں میں "خدا کے بھیجے ہوئے امام" کے "معجزے" ایسے انداز سے سنائے کہ لوگ حسن بن صباح کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ حسن بن صباح نے ایک جگہ رک کر ڈیرے ڈال دیئے۔ اس کے لئے بڑے سائز کا شاہانہ خیمہ لگا دیا گیا تھا۔

تشہیر اور پروپیگنڈے کا کام صرف حسن بن صباح نے ہی نہیں کیا تھا' احمد بن غطاش اس کام میں ہمہ تن مصروف رہتا تھا۔ اس نے مبلغوں کی جماعتیں بنا دی تھیں جس کے ارکان اسلام کے حوالے سے باطنی نظریئے کی تبلیغ کرتے تھے۔ بڑے مورخوں' خصوصاً "ابن خلدون' ابوالقاسم رفیق دلاوری' ابن اثیر' نے تو یوں لکھا ہے کہ وہ باطنی نظریئے کی تبلیغ کرتے تھے۔ تفصیلات لکھنے والے وقائع نگاروں اور مبصروں نے لکھا ہے کہ یہ تبلیغ دراصل تشہیر تھی حسن بن صباح کی اور لوگ جوق در جوق حسن بن صباح کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے اکٹھے ہوتے جا رہے تھے لیکن حسن بن صباح کی جھلک انہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

حسن بن صباح کا خیمہ کپڑے کا ایک کمرہ تھا ..... چوکور اور خاصا کشادہ ..... چاروں طرف قناتیں تھیں اور ان پر مخروطی شامیانہ تھا۔ لوگوں کو یہ بتایا جا رہا تھا کہ امام خیمے میں نہیں اور اس کے قریبی مصاحبوں کو بھی معلوم نہیں کہ وہ کہاں غائب ہو گیا ہے۔

"امام کو خدا کبھی کبھی اپنے پاس بلا لیتا ہے" — ایک مصاحب نے شوشہ چھوڑا — "وہ کسی بھی وقت واپس آ سکتا ہے"۔

جس جگہ حسن بن صباح کا خیمہ تھا وہاں تک کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ اس سے ذرا پرے ہٹ کر اس کے اپنے آدمیوں کے خیمے تھے۔ لوگوں کو حسن بن صباح کے خیمے سے دور روک دیا جاتا تھا۔

○

حسن بن صباح یہاں پہنچا تھا تو تیسری رات خلجان سے اس کا پیرو مرشد احمد بن

غطاش اس کے پاس آگیا تھا۔ ان کی ملاقات دو اڑھائی سال بعد ہو رہی تھی۔ احمد بن غطاش نے حسن بن صباح کو مصر بھیجا تھا۔ اس کے بعد یہ دونوں پہلی بار مل رہے تھے۔ حسن بن صباح نے اپنے استاد کو اپنی کارگزاری سنائی اور استاد نے جب حسن بن صباح کو بتایا کہ اس نے قلعہ خلجان میں کیسے کیسے خفیہ انتظام کئے ہیں تو حسن بن صباح حیران رہ گیا۔

"اب قلعہ الموت پر قبضہ کرنا ہے" — احمد بن غطاش نے کہا — "جو بظاہر ناممکن نظر آتا ہے۔ امیر مہدی علوی کے پاس تین سو سواروں کا صرف ایک دستہ ہے۔ یہ اس کا محافظ دستہ ہے۔ اس کی فوج ہے ہی نہیں"۔

"پھر تو اس قلعے پر قبضہ کرلینا کوئی مشکل نہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "میرے پاس تین سو سے کچھ زائد تجربہ کار لڑنے والے آدمی ہیں ..... اور یہ جو میری زیارت کے لئے ہجوم آگیا ہے' کئی سو اس میں لڑنے والے مل جائیں گے"۔

"نہیں حسن!" — احمد بن غطاش نے کہا — "میں حیران ہوں کہ یہ بات تم کہہ رہے ہو۔ کیا ہم نے پہلے جو قلعے لئے ہیں وہ لڑ کر لئے ہیں؟ ..... خون کا ایک قطرہ نہیں بہے گا اور الموت ہمارا ہو گا ..... سنو' ہم کیا کریں گے"۔

احمد بن غطاش اور حسن بن صباح کی باتیں سرگوشیوں میں بدل گئیں۔ سرگوشیاں بھی ایسی جو خیمے کی کپڑے کی دیواریں بھی نہ سن سکیں۔ احمد بن غطاش سحری کے وقت خیمے سے نکلا اور خلجان کو چلا گیا۔

تین چار راتیں گزر گئیں۔ "اللہ کے امام" اور اس کے "معجزوں" کے چرچے اتنے زیادہ اور ایسے انداز سے کئے جا رہے تھے کہ تجسس اور پسماندگی کے ہاتھوں مجبور ہو کر لوگ حسن بن صباح کی زیارت کے لئے چلے آ رہے تھے۔ داستان گو سنا چکا ہے کہ پہلے بھی لوگوں نے سنا تھا کہ خدا کا ایلچی آسمان سے اترنے والا ہے تو لوگ اسی طرح اکٹھے ہو گئے تھے اور انہوں نے وہیں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ لوگوں کی فطرت میں کوئی انقلاب تو نہیں آگیا تھا۔ ان میں فطری کمزوریاں جوں کی توں موجود تھیں۔ اب وہ اس جگہ ہجوم کر کے آ گئے تھے۔

یہاں اس حقیقت کا بیان بے محل نہ ہو گا کہ امت کے ہاتھوں سے اسلام کا دامن چھوٹ گیا تھا اور اسلامی عقائد کی شکست و ریخت ہو رہی تھی۔ خلفائے راشدین کے

دَور میں اُمتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی رسّی مضبوطی سے پکڑے رکھی اور فاتح اور کامران رہے' پھر قرآن کی نافرمانی کرتے ہوئے قیادت' اقتدار اور دوسروں پر برتری حاصل کرنے والے ہوس کار سرداروں اور دین کے نام نہاد عالموں نے اپنے اپنے نظریات اور اپنے اپنے عقیدے وضع کرنے شروع کر دیئے' آیاتِ قرآنی کی تفسیریں بدل ڈالیں اور اُمت کو فرقوں میں بانٹ دیا۔

حسن بن صباح کے ابتدائی دَور تک مسلمان چھ بڑے فرقوں میں بٹ چکے تھے اور ہر فرقے کی بارہ بارہ شاخیں بن چکی تھیں' یعنی ہر فرقہ فرقوں میں بٹ گیا تھا اور یوں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق اُمت 72 فرقوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔

عبداللہ بن مسعودؓ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے ایک سیدھی لکیر کھینچی اور فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی راہ مستقیم ہے' پھر آنحضورؐ نے اس لکیر کے دائیں بائیں اس طرح لکیریں کھینچیں جیسے درخت سے شاخیں نکلتی ہیں اور فرمایا یہ سب راہیں ٹیڑھی ہیں اور ان میں کوئی ایک بھی راہ ایسی نہیں جس پر ایک شیطان موجود نہ ہو۔ یہ شیطان اپنی اپنی راہ پر بلاتے ہیں۔ پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی — "بے شک یہی میری (اللہ کی) راہ سیدھی ہے۔ تم اس پر چلو' دوسری راہوں پر نہ چلنا ورنہ وہ (شیطان) تمہیں میری راہ سے ہٹا کر تم میں تفرقہ ڈال دے گا"۔

ابو داؤد نے معاویہؓ بن ابی سفیانؓ کے حوالے سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہو کر فرمایا' خبردار ہو جاؤ' اہلِ کتاب جو تم سے پہلے تھے وہ 72 فرقوں میں بانٹے گئے تھے' اور میری اُمت عنقریب 73 فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی۔ ان میں سے 72 جہنم میں جائیں گے اور صرف ایک جنت میں جائے گا۔

داستان گو نے فرقوں کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ جب مسلمان اللہ کی اُس سیدھی پر چلتے رہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دکھائی تھی تو وہ روحانی طور پر مطمئن اور مسرور رہے اور اللہ کی حکمرانی کرۂ ارض پر پھیلتی چلی گئی مگر جب فرقوں میں بٹ گئے تو وہ اپنی فطرت میں بے اطمینانی' تشنگی اور خلاء سا محسوس کرنے لگے۔ وہ صاف محسوس کرنے لگے کہ وہ بھٹک گئے ہیں۔ ان کی ذہنی کیفیت یہ تھی جیسے — "یہ دَور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے" — ان کے کانوں میں آواز پڑتی کہ فلاں جگہ ایک بزرگ آیا ہے جو

غیب کی باتیں سناتا ہے' یا یہ کہ فلاں جگہ ایک بزرگ کا ظہور ہُوا ہے اور یہ اُس کی کرامات ہیں تو لوگ کوسوں کی مسافت طے کر کے وہاں پہنچے اور اُس بزرگ کے آگے سجدے کرتے تھے۔

یہ کیفیت مسلمان معاشرے میں شدت اختیار کرتی گئی جس نے آگے چل کر پیر پرستی' مزار پرستی اور خانقاہی نظام کی صورت اختیار کر لی۔ مملکتِ خداداد کے معاشرے کے بعض دُور افتادہ علاقوں میں یہ رواج مذہبی رنگ اختیار کئے ہوئے ہے کہ کوئی مشکل یا مصیبت آپڑے تو لوگ خدا سے مدد مانگنے کی بجائے اپنے اپنے پیر کے آستانوں کی دہلیزوں پر اور اُن کے مرے ہوئے باپوں کے مزاروں پر جا سجدے کرتے ہیں۔ ان کی زبان پر یااللہ کی بجائے یادستگیر کا وِرد ہوتا ہے۔

○

داستان گو کہہ رہا تھا کہ لوگوں نے حسن بن صباح کی زیارت کے لئے وہیں ڈیرے ڈال دیئے تھے۔ احمد بن عطاش حسن بن صباح سے مل کر اور کوئی نیا منصوبہ تیار کر کے چلا گیا۔ تاریخ میں ایک شہادت یہ بھی ملتی ہے کہ احمد بن عطاش گیا نہیں تھا' وہیں رُوپوش رہا تھا۔ اس منصوبے میں اُسے پس منظر میں رکھنا تھا۔

ایک رات آدھی گزر گئی تھی۔ رات کے سناٹے کو تین چار دھماکہ نما آوازوں نے تہہ وبالا کر ڈالا۔

"اِدھر دیکھو..... لوگو..... اُدھر دیکھو"۔

"زمین سے بادل اُٹھ رہے ہیں"۔

"لوگو' جاگو..... بادلوں کے رنگ دیکھو"۔

"یہ ضرور امام کا ظہور ہو رہا ہے"۔

پھر ایک ہڑبونگ تھی' ایک شور تھا' بھاگ دوڑ تھی' نفسا نفسی جیسی حالت تھی' لوگ دھکے دے رہے تھے' دھکے کھا رہے تھے اور اُس طرف دوڑے جا رہے تھے جدھر زمین سے بادل اُٹھ رہا تھا۔

وہ ہری سرسبز گھاس اور جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی ایک ٹیکری تھی جو زیادہ اونچی نہیں تھی۔ پندرہ نہیں تو سترہ ہاتھ اونچی ہو گی۔ اس کی لمبائی اڑھائی تین فرلانگ تھی۔ اُس کی ڈھلان پر اور اوپر بھی ایک دوسرے سے کچھ دُور دُور چھاتوں کی طرح پھیلے ہوئے

اور لیمو ترے بھی، درخت تھے۔

اس ٹیکری کے پیچھے ایک اور ٹیکری تھی جو اگلی ٹیکری سے زیادہ بلند تھی۔ ان کے دامن آپس میں ملے ہوئے تھے۔

لوگوں نے زمین سے اُٹھتا ہوا جو بادل دیکھا تھا بلکہ دیکھ رہے تھے، وہ آگے والی کم بلند ٹیکری کے عقب سے اُٹھ رہا تھا۔ یہ آگ کے دھوئیں کا بادل نہیں تھا۔ یہ بادل بادلوں کے اُن ٹکڑوں جیسا تھا جو برسات کے بعد سرسبز پہاڑیوں سے نیچے آجاتے اور وادیوں میں منڈلاتے رہتے ہیں۔

وہ رات تھی اور رات تاریک تھی لیکن بادل کا یہ دودھ جیسا سفید اور بہت بڑا ٹکڑا روشن تھا اور صاف نظر آرہا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس میں سرخ، سبز، نیلی اور پیلی روشنیاں تیر رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے قوس و قزح کے رنگ بکھر کر اٹکھیلیاں کرتے پھر رہے ہوں۔

بادل ٹیکری پر آگیا اور آہستہ آہستہ فضا میں تحلیل ہونے لگا اور اس میں ایک آدمی کا ہیولہ نظر آنے لگا۔ اُس کے بازو دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے۔

"لوگو!" — بڑی ہی بلند آواز میں کسی نے اعلان کیا — "بسم اللہ پڑھو۔ کلمۂ طیبہ پڑھو اور سجدے میں چلے جاؤ۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے امام حسن بن صباح کو زمین پر اُتار دیا ہے"۔

"جسے دشمن کے لشکر دیکھتے ہیں اور واپس چلے جاتے ہیں اُس کا ظہور ہو گیا ہے" — کسی اور نے اعلان کیا۔

لوگ سجدے میں چلے گئے تھے۔

حسن بن صباح کے تین سو آدمیوں کے جہاں خیمے لگے ہوئے تھے وہاں سے جلتی ہوئی دس بارہ مشعلیں نکلیں جو ٹیکری پر چڑھ گئیں۔ ہوا ذرا تیز چل رہی تھی اس لئے بادل کا یہ ٹکڑا ایک طرف ہٹ گیا اور فضا میں تحلیل ہوتے ہوتے غائب ہو گیا اور اس جگہ ٹیکری پر حسن بن صباح رہ گیا جو بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ وہ سبز رنگ کے چمکدار چغے میں ملبوس تھا۔ سر پر پگڑی اور اس پر اتنا بڑا سبز رومال پڑا ہوا تھا جس نے کندھے بھی ڈھانپ رکھے تھے۔

"سجدے سے اٹھو لوگو!" — ایک اعلان ہوا — "اور ٹیکری کے قریب آجاؤ"۔

لوگ اُٹھ دوڑے۔ انہیں تلواروں اور برچھیوں سے مسلح کچھ آدمیوں نے ٹیکری کے قریب روک کر بیٹھ جانے کو کہا۔ دس بارہ مشعلوں کی روشنی میں لوگوں کو حسن بن صباح کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔

"میں آگیا ہوں" — حسن بن صباح نے بلند آواز سے کہا — "اللہ سے یہ وعدہ لے کر آیا ہوں کہ ان مسلمانوں کو جو میرے دائرے میں آجائیں گے، دنیا میں ہی جنت دکھا دی جائے گی۔ میں تم سب کے گناہ بخشوا آیا ہوں"۔

"اے اللہ کی طرف سے آنے والے!" — لوگوں میں سے ایک نے پوچھا — "ہم تجھے امام کہیں، نبی کہیں ....."

"میں تم میں سے ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے جو کہنا چاہتے ہو کہہ لو، یہ سوچ لو کہ میرے راستے پر چلو گے تو رنج و آلام سے، مشکلات اور مصائب سے، تنگ دستی اور بیماری سے محفوظ رہو گے، شیطان سے اور جنات سے محفوظ رہو گے"۔

"ہم نے تجھے مان لیا" — ایک آدمی بولا — "امام بھی، نبی بھی، کوئی معجزہ دکھا"۔

لوگوں کے ہجوم پر ایسا سناٹا طاری تھا جیسے وہاں کوئی ایک بھی انسان نہ ہو۔ یہ تقدس اور عقیدت مندی کی انتہا تھی کہ لوگ جیسے اپنی سانسوں کو بھی روکنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ امام ناراض ہو جائے گا۔ اُن کے کانوں میں جب کسی کی آواز پڑی کہ کوئی معجزہ دکھا تو سناٹا اور گہرا ہو گیا۔

"کیا یہ معجزہ نہیں جو تم نے دیکھا ہے؟" — حسن بن صباح نے کہا — "اللہ نے مجھے جنت کے بادلوں کے ایک ٹکڑے پر سوار کر کے زمین پر اُتارا ہے۔ کیا تم نے دیکھا نہیں کہ یہ بادل قوس و قزح کے رنگوں سے سجا ہوا تھا؟..... مجھے زمین پر اُتار کر جنت کا بادل واپس چلا گیا ہے"۔

"ہم نے دیکھا ہے" — بہت سی آوازیں اٹھیں۔

"بے شک ہم نے دیکھا ہے یا امام" — اور بھی آوازیں اٹھیں۔

حسن بن صباح کو مشعل بردار ٹیکری سے اُتار کر اس خیمے میں لے گئے جو کپڑے کی دیواروں اور کپڑے کی چھت کا خوشنما کمرہ تھا۔ اسی خیمے میں احمد بن عطاش سے اس کی ملاقات ہوئی تھی، اور شاید احمد بن عطاش ابھی وہیں تھا۔

زیارت کے لئے آئے ہوئے ہجوم میں مختلف قبیلوں کے سردار اور دیگر سرکردہ

افراد بھی تھے۔ اگلی صبح ان لوگوں نے حسن بن صباح کی بیعت کا سلسلہ شروع کر دیا۔

○

کیا حسن بن صباح واقعی بادل کے ٹکڑے پر سوار ہو کر آسمان سے زمین پر آیا تھا؟

اس سوال کا جواب پہلے ایک باب میں دیا جا چکا ہے۔ حسن بن صباح کا پہلے بھی ایک پہاڑی پر "ظہور" ہوا تھا پہاڑی کے پیچھے ایک غار میں آگ جلا کر اس کی چمک آئینوں پر ڈالی جاتی تھی۔ ان میں آئینے بھی تھے اور چمکتی ہوئی دھات کی چادریں اور ایسی چادریں بھی تھیں جن پر ابرق چپکایا گیا تھا۔ ایک آئینہ شاہ بلوط کے درخت میں رکھا گیا تھا۔ آئینے یا چمکدار دھات کی پلیٹ سے آگ کی چمک شاہ بلوط والے آئینے پر منعکس کی جاتی تو رات کو یوں لگتا تھا جیسے شاہ بلوط میں آسمان کا ستارہ چمک رہا ہو۔ سیدھے سادے پسماندہ لوگ اسے آسمان کے ستارے کی چمک سمجھتے رہے' اور ایک روز اس شاہ بلوط کے ستارے کی چمک میں سے حسن بن صباح کا ظہور ہوا۔

اب ایک ٹیکری سے بادل اٹھا اور ٹیکری پر آیا۔ اس میں رنگ تیر رہے تھے اور اس میں سے حسن بن صباح نکلا۔ یہ بھی آگ' چمکدار دھات یا ابرق کی چادروں اور آئینوں کا کرشمہ تھا۔ ٹیکری کے پیچھے دامن میں پندرہ بیس گز لمبائی میں دہکتے انگارے پھیلائے گئے تھے اور ان پر دھواں پیدا کرنے والا بارود یا کوئی اور کیمیائی مادہ پھینکا گیا تھا جو سفید بادل کی شکل کا دھواں بن کر اوپر اٹھا۔ تاریخ میں یہ سراغ نہیں ملتا کہ یہ بارود تھا یا سفوف یا سیال مادہ تھا۔ یہ تحریر ملتی ہے کہ اس وقت تک مسلمانوں نے بارود سازی اور کیمیاگری میں یورپ والوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ترقی کر لی تھی۔

چونکہ وہ علاقہ جنگلاتی تھا' سبزہ زار تھا اور رات تھی اس لئے فضا میں نمی زیادہ تھی۔ نمی کی وجہ سے دھواں فوراً" اوپر نہیں اٹھا اور نہ جلدی بکھرا۔ اس میں جو رنگ تیر رہے تھے آئینوں یا دھات کی چمکدار چادروں سے اس طرح دھوئیں میں شامل کئے گئے تھے کہ ٹیکری کے پیچھے آگ جلا کر اس کی چمک منعکس کی گئی اور آئینوں وغیرہ کے آگے باریک رنگ دار کپڑے رکھے گئے تھے۔ تاریخ میں اس سے زیادہ تشریح اور وضاحت نہیں ملتی۔ ٹیکری کے پیچھے کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔

○

قلعہ الموت وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس بلندی پر جہاں قلعہ تھا' ایک شہر آباد

ہو گیا تھا۔ امیر الموت مہدی علوی کو اطلاعیں مل رہی تھیں کہ فلاں جگہ ایک قافلہ پڑاؤ کئے ہوئے ہے جس کا امیر کارواں ایک برگزیدہ شخصیت ہے۔ مہدی علوی کو اس بزرگ کے معجزے بھی سنائے گئے لیکن اس نے دھیان سے نہ سنے اور کوئی اہمیت نہ دی۔

مہدی علوی کو یہ تو پتہ ہی نہ چل سکا کہ حسن بن صباح کی تشہیر اور تبلیغ کی تیز و تند ہوا چلی ہے جس کا گزر الموت سے بھی ہوا ہے اور اس سے اس کا محافظ دستہ بھی متاثر ہوا ہے۔ یہ انتظام احمد بن عطاش کا تھا۔ مہدی علوی کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ حسن بن صباح نے بادل کے ٹکڑے میں سے اپنے ظہور کا جو ڈھونگ رچایا ہے' یہ الموت کے کچھ لوگوں نے بھی دیکھا ہے اور انہوں نے اسے برحق مانا ہے۔

"امیرِ عالی مقام!" — مہدی علوی کو اس کے ایک مشیر نے پریشانی کے سے عالم میں کہا — "ہم نے تو ادھر توجہ ہی نہیں دی تھی لیکن اپنے تمام لوگوں میں اور آپ کے محافظ دستے میں یہ عجیب و غریب خبر پھیل گئی ہے کہ امام حسن بن صباح بادل کے ایک ٹکڑے میں آسمان سے اترا ہے اور لوگ دھڑا دھڑ اس کی بیعت کر رہے ہیں"۔

"ہم یہی کر سکتے ہیں کہ اسے اپنے علاقے سے نکال دیں" — مہدی علوی نے کہا — "کسی مسلمان کو یقین نہیں کرنا چاہئے کہ کوئی امام یا کوئی نبی یا کوئی بزرگ آسمان سے اترا ہے۔ ہم نبوت پر یقین رکھنے والے مسلمان ہیں اور نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے"۔

"آپ نہ مانیں" — مشیر نے کہا — "میں بھی نہیں مانتا لیکن یہ صورتِ حال بڑی ہی خطرناک ہے کہ لوگوں نے بھی اسے سچ مان لیا ہے اور ہمارے سپاہیوں اور سواروں نے بھی ..... امیرِ محترم! میں نے جو معلومات فراہم کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ کوئی نیا فرقہ بن رہا ہے۔ اسے یہیں پر ختم کر دیا جائے تو اچھا ہے"۔

ان دونوں میں کچھ دیر تبادلۂ خیالات ہوا' کچھ بحث مباحثہ ہوا' آخر مہدی علوی نے اپنا حکم سنایا۔

"پچاس سواروں کا ایک دستہ لے جاؤ" — اس نے کہا — "وہاں حسن بن صباح کے مرید اور معتقد بھی ہوں گے۔ تم ساتھ جاؤ۔ حسن بن صباح سے کہنا کہ وہ تمہارے ساتھ آ جائے۔ نہ آئے تو اسے میرا حکم سنانا کہ تم زیرِ حراست ہو۔ ہو سکتا ہے اس کے مرید اور معتقد مزاحمت کریں۔ کوشش کرنا کہ خون خرابہ نہ ہو۔ ہونے کو وہاں بہت کچھ ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کچھ بھی نہ ہو۔ اگر معاملہ بگڑتا نظر آئے تو ایک سوار کو

دوزانو بیٹھ۔ میں اپنا تمام دستہ بھیج دوں گا۔ میں حسن بن صباح کو اپنے سامنے دیکھنا چاہتا ہوں"۔

مسدی علوی کے حکم کی تعمیل فوری طور پر ہوئی۔ مشیر پچاس سواروں کو ساتھ لے کر چلا گیا۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ یہ دستہ دن کے پچھلے پہر چلا تھا، رات کو حسن بن صباح کی خیمہ گاہ میں پہنچ گیا۔ وہاں اب لوگوں کا اتنا ہجوم نہیں تھا۔ انہوں نے حسن بن صباح کی زیارت کرلی تھی اور وہ چلے گئے تھے۔ پیچھے حسن بن صباح کے اپنے آدمی رہ گئے تھے۔

سواروں نے خیمہ گاہ کو گھیرے میں لے لیا۔ حسن بن صباح اپنے مصاحبوں میں بیٹھا تھا۔ اس نے گھوڑوں کے ٹاپ سنے اور چونکا۔ اس کے مصاحبوں کے چہروں پر گھبراہٹ آگئی۔ پیشتر اس کے کہ حسن بن صباح کوئی حرکت کرتا یا کوئی حکم دیتا، مسدی علوی کا مشیر خیمے میں داخل ہوا اور جھک کر سلام کیا۔

"یا امام!" ـــ مشیر عابد جیبی نے حسن بن صباح سے مصافحہ کر کے اور اس کے سامنے دو زانو بیٹھ کر کہا ـــ "امیر الموت مسدی علوی نے امام کے حضور سلام بھیجا ہے اور یہ عرض بھی کہ امام جنگل میں پڑے اچھے نہیں لگتے۔ اگر امام قلعے میں آجائیں اور کچھ دن یہاں رہ کر دیکھیں۔ اگر یہ جگہ پسند آجائے تو قلعے میں ہی رہیں"۔

"کیا دعوت نامہ رات کے اس وقت دیا جاتا ہے؟" ـــ حسن بن صباح نے عابد جیبی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتے ہوئے کہا ـــ "اور کیا تمہارے ہاں مہمان کو محاصرے میں لے کر اُسے دعوت دی جاتی ہے؟"

"امیر شہر نے حکم دیا کہ ابھی روانہ ہو جاؤ" ـــ عابد جیبی نے کہا ـــ "ہم ایسے وقت روانہ ہوئے کہ یہاں بے وقت پہنچے۔ اگر آپ کے خیمے میں روشنی نہ ہوتی تو میں کل صبح آپ کے حضور حاضر ہوتا..... اور یہ سوار؟ ..... یہ ہمارے ہاں رواج ہے کہ مہمان کے لئے ہم گھوڑ سوار بھیجا کرتے ہیں۔ آپ کے لئے پچاس گھوڑ سوار لایا ہوں"۔

"امیر شہر کو میرا سلام کہنا" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "اور ان کا شکریہ ادا کرنا پھر کہنا کہ میں آؤں گا لیکن میں اپنے رواج کے مطابق آؤں گا۔ رواج یہ ہے کہ پہلے امیر شہر کم از کم ایک رات کے لئے مجھے میزبانی کا شرف عطا کریں گے، پھر میں ان کے ساتھ

جس نے اسماعیل کے ساتھ مل کر سالار قزل ساروق کو کامیاب دھوکہ دیا تھا۔ خدیجہ اب لڑکی نہیں جوان عورت تھی۔ خوبصورت تو تھی ہی، اُس کی ٹریننگ ایسی ہوئی تھی کہ پتھروں کو بھی موم کرلیتی اور فرعونوں کو بھی اپنے قدموں میں جھکا لیتی تھی۔

احمد بن عطاش اس کے پاس دو اور لڑکیاں لے آیا تھا۔ انہیں قلعہ الموت پر قبضے کے لئے استعمال کرنا تھا۔ یہ بھی تربیت یافتہ اور آزمائی ہوئی لڑکیاں تھیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ کس صورت حال میں کیا کرنا ہے۔

تیسرے دن مسدی علوی آگیا۔ حسن بن صباح نے اُس کا استقبال اس طرح کیا کہ اپنے آدمیوں کو مسدی علوی کے راستے میں دو رویہ کھڑا کیا۔ ان کے ہاتھوں میں ننگی تلواریں تھیں جو اوپر کر کے ان کی نوکیں آمنے سامنے کے آدمیوں نے ملا رکھی تھیں۔ مسدی علوی ان تلواروں کے سائے میں گزر کر خیمے تک پہنچا۔ وہاں حسن بن صباح نے اُس کا استقبال کیا اور جب مہمان خیمے میں داخل ہُوا تو خدیجہ اور دوسری دو لڑکیوں نے اُس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں۔ مسدی علوی بڑی خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گیا۔

"کیا وہ آپ ہی ہیں جو آسمان سے اُترے ہیں؟" ـــ کھانے کے بعد مسدی علوی نے حسن بن صباح سے پوچھا۔

"کیا آپ کو یقین نہیں آرہا؟" ـــ حسن بن صباح نے پوچھا۔

"نہیں!" ـــ مسدی علوی نے کہا ـــ "کوئی مسلمان یقین نہیں کر سکتا کہ کوئی امام یا نبی آسمان سے اُترا ہو"۔

"کوئی مسلمان آپ کی کوئی بات یقین سے نہیں سنے گا جب تک اُسے یہ یقین نہ دلائیں کہ آپ آسمان سے اُترے ہیں" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "کیا آپ نہیں جانتے کہ نبیوں اور پیغمبروں کے ساتھ لوگوں نے کیا سلوک کیا تھا؟"

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" ـــ مسدی علوی نے پوچھا ـــ "نبوت؟ ..... امامت؟"

"عبادت!" ـــ حسن بن صباح نے جواب دیا ـــ "میں اللہ کی عبادت اور اس کے رسولﷺ کا عشق چاہتا ہوں ..... اور میں چاہتا ہوں کوئی ایسی جگہ مل جائے جہاں سکون ہو، الگ تھلگ ہو اور میں عبادت میں ڈوب جاؤں۔ میرے پیر و مُرشد نے مجھے بتایا ہے کہ خلوت میں مجھے ایک اشارہ ملے گا جو ویسا ہی ہو گا جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا تھا۔ اس اشارے میں میری راہ اور میری منزل کا تعین ہو گا"۔

ہی الموت چل پڑوں گا"۔

عابد جیبی کو مہدی علوی نے حکم دیا تھا کہ حسن بن صباح کو اپنے ساتھ لے آئے۔ اگر وہ نہ آئے تو اسے میرا حکم سنانا کہ تم حراست میں ہو۔ اگر اُس کے آدمی مزاحمت کریں تو جنگی کارروائی کرنا اور مدد کی ضرورت ہو تو مجھے اطلاع دینا۔ دراصل مہدی علوی کا حکم یہ تھا کہ حسن بن صباح کو گرفتار کر کے لے آنا۔

عابد جیبی نے پہلے دوستانہ انداز اختیار کیا تھا۔ اُس نے حسن بن صباح کو ایسے انداز سے امام کہا تھا جیسے اُس نے دل کی گہرائیوں سے اسے امام تسلیم کر لیا ہو لیکن حسن بن صباح نے اُس کے ساتھ جانے کی بجائے یہ کہہ دیا کہ پہلے امیر شہر اُس کے پاس آئے تو عابد جیبی نے یوں محسوس کیا جیسے امام نے اس کی اور اس کے امیر شہر کی عزت افزائی کی ہو۔

عابد جیبی کا ارادہ تو یہ تھا کہ حسن بن صباح نے اس کے ساتھ جانے سے انکار کیا تو وہ اسے گرفتار کر کے اپنے ساتھ لے جائے گا لیکن وہ جان نہیں سکا تھا کہ حسن بن صباح نے اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں اور اسی میں سارا راز تھا۔ عابد جیبی اپنی آنکھوں کو حسن بن صباح کی آنکھوں سے آزاد نہیں کرا سکا تھا۔ حسن بن صباح نے اُسے اپنا تابع کر لیا تھا۔ اس کا ذہن اب حسن بن صباح کے زیرِ اثر تھا۔ یہ تو ہر مؤرخ نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ سننے والے پر سحر کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی اور اُس کا استدلال خالصتاً" فریب کاری پر مبنی ہوتا تھا لیکن اچھے خاصے دانشور بھی اس کے فریب میں آجاتے تھے۔

عابد جیبی سدھائے ہوئے جانور کی طرح اٹھا اور رخصت ہو گیا۔

○

دو روز بعد الموت سے ایک گھوڑ سوار آیا۔ اُس نے حسن بن صباح کو پیغام دیا کہ امیر الموت مہدی علوی تیسرے دن آرہا ہے۔ سوار یہ پیغام دے کر چلا گیا تو حسن بن صباح نے اُس کے استقبال کی اور اس کے لئے رہائش کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اپنا شاہانہ خیمہ مہدی علوی کے لئے چھوڑ دیا۔ اپنے آدمیوں سے کہا کہ مہدی علوی آئے تو شام کو خوشبودار پھولوں کے گلدستے خیمے میں سجا دیں۔

اُس کے پاس مہمان کے ہوش گم کرنے کا ایک ذریعہ اور بھی تھا۔ ایک تو خدیجہ تھی

"لیکن آپ کا یہ شاہانہ خیمہ؟" — مہدی علوی نے کہا۔ "اور یہ حسین و جمیل لڑکیاں اور یہ انداز عبادت کرنے والوں کے تو نہیں ہوتے"۔

"اور یہ میرے لئے ہیں بھی نہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "میرے مریدوں اور معتقدوں میں آپ سے زیادہ اونچی حیثیت کے لوگ بھی ہیں۔ میرے لئے یہ شان و شوکت انہوں نے ہی بنائی ہے۔ میں تو چھوٹے سے ایک خیمے میں زمین پر بیٹھ کر اللہ کو یاد کرتا ہوں ..... آپ نے پوچھا ہے میں کیا چاہتا ہوں ..... میں چاہتا ہوں کہ سلطان اللہ کے حضور سجدہ ریز ہو جائیں اور اپنا وقار بحال کریں"۔

مہدی علوی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک انسان سے نہیں بلکہ ایک پُراسرار طاقت سے محو گفتگو ہے اور اُسے محسوس نہیں ہو رہا کہ مکڑی کے جالے کے تار اُس کے گرد لپٹے جا رہے ہیں۔

"آپ کے معجزوں کی حقیقت کیا ہے؟" — مہدی علوی نے پوچھا — "تبریز میں کیا ہوا تھا؟..... اور سلجوقیوں کے ایک ہزار سواروں کے لشکر کو آپ نے کس طرح پسپا کیا تھا؟"

"یہ آپ مجھ سے نہ سنیں" — حسن بن صباح نے کہا — "ہو سکتا ہے مجھ پر آپ مبالغہ آرائی کا شک کریں۔ یہ اُن سلجوقیوں سے پوچھیں جو میرے اتنا کہنے پر کہ واپس چلے جاؤ، وہ واپس چلے گئے تھے"۔

حسن بن صباح نے اسے اپنے یہ معجزے سنانے شروع کر دیئے۔ ایک ایک لفظ دروغ اور مبالغہ تھا لیکن سنانے کا انداز ایسا کہ مہدی علوی مسحور ہوتا چلا گیا۔ انسان کی خطرناک کمزوریوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ یہ جاننے کے لئے انسان ہاتھ پاؤں مارتا ہے کہ اس کا آنے والا وقت کیسا ہو گا اور اس کی قسمت میں کیا لکھا ہے اور اسے بڑا رتبہ اور خزانہ کیسے مل سکتا ہے۔

کچھ ایسی ہی بات مہدی علوی حسن بن صباح سے کر بیٹھا۔ حسن بن صباح قلعہ الموت سے واقف تھا اور یہ علاقہ تو اُسے بہت ہی پسند تھا۔ اس قلعے پر اُس نے قبضہ کرنا تھا۔ مہدی علوی کی بات سن کر حسن بن صباح نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنے اوپر مراقبے کی کیفیت طاری کر لی۔

"لمحہ!" — حسن بن صباح نے چونک کر آنکھیں کھول دیں اور گھبرائے ہوئے

سے لہجے میں بولا ـــــ "بڑی ہی کالی گھٹا ہے جو الموت پر چھاتی چلی جا رہی ہے۔ اس میں بجلیاں چھپی ہوئی ہیں" ـــــ اُس نے جھوٹ بولا ـــــ "میں نے آپ کا قلعہ کبھی نہیں دیکھا۔ مجھے جو نظر آ رہا ہے وہ تو بہت ہی مضبوط ہے۔ اس میں راہداریاں' تہ خانے' راستے اور چور راستے ایسے ہیں کہ کوئی اجنبی ان میں چلا جائے تو انہی میں بھٹک بھٹک کر مر جائے لیکن اتنے قیمتی قلعے اور اتنے خوبصورت شہر کے تحفظ کے لئے مجھے کوئی فوج نظر نہیں آ رہی..... کیا میں صحیح کہہ رہا ہوں یا مجھے غلط نظر آ رہا ہے؟"

مہدی علوی نے حسن بن صباح کی زبان سے اپنے قلعے کی تفصیلات سُنیں تو اس پر رعب طاری ہو گیا۔ اُس نے حسن بن صباح کو بتایا کہ اُس نے قلعے میں فوج رکھی ہی نہیں۔ صرف ایک محافظ دستہ ہے جس میں پانچ سو سوار ہیں۔

"فوج رکھیں" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "دشمن بڑھ رہا ہے۔ گھٹا گہری ہو رہی ہے۔ اگر آپ نے فوج رکھ لی تو یہ گھٹا جس میں بجلیاں چھپی ہوئی ہیں' اُڑ جائے گی اور آپ محفوظ رہیں گے۔ فوج تجربہ کار ہونی چاہئے۔ بغیر فوج کے آپ قلعہ گنوا بیٹھیں گے"۔

مہدی علوی' حسن بن صباح کے جال میں آ گیا۔ اُس نے حسن بن صباح کے ساتھ اس مسئلے پر بات شروع کر دی کہ وہ اتنی زیادہ فوج نہیں رکھ سکتا کیونکہ وہ فوج کے اخراجات پورے کرنے کے قابل نہیں۔ حسن بن صباح اُسے ڈراتا رہا کہ اُس نے فوج نہ رکھی تو کوئی نہ کوئی دشمن اپنی فوج لے آئے گا اور قلعے پر قبضہ کر لے گا۔

"حملہ آور سلجوقی بھی ہو سکتے ہیں" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "یہ گھٹا جو میں نے دیکھی ہے' یہ بڑا ہی خطرناک اشارہ ہے۔ میں آپ کی یہ مدد کر سکتا ہوں کہ میرے ساتھ جو آدمی ہیں' میں ان کی ایک فوج بنا سکتا ہوں۔ آپ انہیں دو وقت روٹی دے دیا کریں' ان کی تنخواہ اور دیگر اخراجات میں اپنے ذمے لے لوں گا۔ یہ میں جہاں سے بھی پورے کروں' یہ میری ذمہ داری ہو گی۔ آپ مجھے قلعے میں تھوڑی سی جگہ دے دیں جہاں میں عبادت کر سکوں اور جو لوگ میری زیارت کے لئے آئیں انہیں بٹھا کر ان کی راہنمائی کر سکوں۔ مجھے امید ہے کہ میں اپنے پیروکاروں کو مریدوں کو جو بھی حکم دوں گا وہ مانیں گے"۔

مہدی علوی حسن بن صباح کی باتوں میں آ گیا اور اُس کے ساتھ معاہدہ کر لیا۔ تاریخ

میں اس معاہدے کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ البتہ یہ واضح ہے کہ وہ امیرِ الموت مہدی علوی جس نے حسن بن صباح کی گرفتاری کا حکم دیا تھا' خود اس کے فریب میں گرفتار ہو گیا اور اُس کی عقل پر ایسا پردہ پڑا کہ یہ بھی نہ سوچ سکا کہ وہ کتنا خطرناک معاہدہ کر بیٹھا ہے۔

○

اُدھر مرو میں سلطان ملک شاہ اور نظام الملک پیچ و تاب کھا رہے تھے۔ سلطان ملک شاہ تو زیادہ فوج بھیج کر بہت بڑا حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن نظام الملک نے اُسے روک دیا اور کہا تھا کہ ایسے عقلمند اور غیر معمولی طور پر دلیر جاسوس بھیجے جائیں جو حسن بن صباح اور احمد بن عطاش کے خفیہ حلقے تک پہنچ کر اندر کی خبریں لائیں تاکہ ان کے مطابق کوئی کارروائی کی جائے۔

اصل پیچ و تاب تو سالار قزل ساروق کھا رہا تھا۔ وہ اپنی بے عزتی کا انتقام لینے کو تڑپ رہا تھا۔ اُس نے سلطان ملک شاہ اور وزیرِ اعظم سے کئی بار کہا تھا کہ اسے جاسوسی کے لئے بھیجا جائے۔

"یہ کام سالار کا نہیں ساروق!" ـــــ آخر ایک دن سلطان نے اُسے اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا تھا ـــــ "حملے کی صورت میں ہم تمہیں ہی بھیجیں گے لیکن دو تجربوں کے بعد ہم تیسرا ناکام تجربہ نہیں کریں گے"۔

"میں حسن بن صباح کو اپنے ہاتھوں قتل کرنا چاہتا ہوں" ـــــ قزل ساروق نے کہا تھا ـــــ "صرف یہ شخص قتل ہو جائے تو باطنیوں کا کھیل ختم ہو جائے گا"۔

"اس کی بجائے وہاں تم قتل ہو سکتے ہو" ـــــ نظام الملک نے کہا تھا ـــــ "اس صورت میں ہم سب کی بے عزتی ہو گی اور باطنی اور زیادہ شیر اور دلیر ہو جائیں گے"۔

مزمل آفندی صحت یاب ہو چکا تھا۔ سالار قزل ساروق جس طرح اپنے ایک ہزار سواروں کے ساتھ واپس آیا تھا' اس سے مزمل آفندی بھی واقف تھا۔ اسے وہ ملا بھی تھا اور اس کی قہر آلود باتیں بھی سنی تھیں۔ قزل ساروق نے اسے بھی بتایا تھا کہ وہ اکیلا حسن بن صباح کے قتل کے لئے جائے گا۔ مزمل نے اُسے کہا تھا کہ وہ بھی اُس کے ساتھ جائے گا۔ دونوں نے پلان تیار کر لیا تھا لیکن سلطان ملک شاہ نے قزل ساروق کو روک دیا۔ مزمل اکیلا نظام الملک سے ملا۔

"جس مقصد کے لئے آپ جاسوس بھیج رہے ہیں وہ مقصد صرف میں پورا کر سکتا ہوں" ——— مزمل آفندی نے کہا ——— "میں آپ سے صرف ایک گھوڑا یا ایک اونٹ مانگوں گا"۔

"نہیں مزمل!" ——— نظام الملک نے کہا تھا ——— "ہم تمہیں کسی خطرناک مہم پر نہیں بھیج سکتے کیونکہ تم ہمارے ملازم نہیں"۔

"ملازم جلدا" ——— مزمل نے کہا تھا ——— "اس خطرناک مہم میں وہی کامیاب ہو سکتا ہے جو ملازم نہیں ہوگا۔ یہ کام وہ شخص کرے گا جس میں جذبہ ہوگا۔ ملازم تو اپنے اہل و عیال کو روٹی کھلانے کے لئے زندہ رہنے کی کوشش کرے گا۔ میں حسن بن صباح کو اپنے دین اور اپنے عقیدے کے نام پر قتل کروں گا۔ اگر قتل نہ کر سکا تو ان کی پردوں کے پیچھے کی خبریں اور ان کے دلوں کے بھید لے کر آؤں گا...... یہ ایک قومی مسئلہ ہے، ہمارے دین کا مسئلہ ہے۔ جتنا آپ کا ہے اتنا ہی میرا ہے۔ میں آپ سے کوئی معاوضہ نہیں مانگ رہا۔ مجھے جہاد اور شہادت کے راستے سے نہ ہٹائیں"۔

نظام الملک کو ایسے ہی ایک آدمی کی تلاش تھی۔ وہ مزمل آفندی کے دو کارنامے دیکھ چکا تھا۔ شمونہ کی ماں میمونہ کو حسن بن صباح کے قبضے سے آزاد کرالایا تھا۔ داستان گو سنا چکا ہے کہ حسن بن صباح نے میمونہ کے خاوند کو ایسے طریقے سے قتل کروایا تھا کہ میمونہ کو ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوا تھا۔ یہ مزمل آفندی کا جذبۂ ایثار تھا کہ وہ جان کی بازی لگا کر میمونہ کو حسن بن صباح کے بڑے ہی خطرناک اور ابلیسی فریب سے نکال لایا اور رے لا کر ابو مسلم رازی کے گھر پہنچا دیا تھا۔ معجزے جیسا اتفاق یہ ہوا کہ وہاں شمونہ کی بیٹی میمونہ مل گئی جو بچپن میں اغوا ہوئی تھی۔

مزمل آفندی کا دوسرا کارنامہ بھی کم قابلِ قدر نہ تھا۔ اس نے سلطان ملک شاہ کو بتایا تھا کہ حسن بن صباح ایک قافلے کے ساتھ اصفہان جا رہا ہے۔ سلطان ملک شاہ نے پانچ سو سوار بھیجے جن کی راہنمائی مزمل آفندی نے کی تھی، پھر تبریز کی لڑائی میں مزمل اس لڑائی میں اتنا زیادہ زخمی ہوا تھا کہ اس کا زندہ رہنا مشکوک تھا لیکن وہ اتنی دور سے اس حالت میں مرو سلطان ملک شاہ کے پاس پہنچا تھا کہ طبیب اور جراح دیکھ کر حیران رہ گئے تھے کہ یہ زندہ کیسے رہا۔

اب یہ مزمل آفندی ایک بار پھر اپنی جان کی بازی لگا رہا تھا۔ نظام الملک اُسے سلطان

شاہ کے پاس لے گیا۔ سلطان نے اُسے اجازت دے دی۔

مزمل آفندی اس علاقے میں جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ اچانک شمونہ اپنی ماں کے ساتھ رے سے آگئیں۔ یہ دونوں رے میں ابو مسلم رازی کے ساتھ رہتی تھیں۔ وہاں جس روز اطلاع پہنچی تھی کہ مزمل شدید زخمی حالت میں مرو آیا ہے، اس روز سے شمونہ اس کے پاس پہنچنے کو تڑپ رہی تھی لیکن کسی مصلحت کی بنا پر اسے مرو نہیں جانے دیا جا رہا تھا۔ اب مزمل کی صحت یابی کی اطلاع ملی تو ابو مسلم رازی نے اونٹ پر پالکی بندھوا کر ماں بیٹی کو مرو بھیج دیا۔ محافظ دستے کے چند ایک سوار ساتھ بھیج دیئے۔

شمونہ پر مزمل کی محبت کا پاگل پن سوار تھا۔ وہ مزمل کو اتنی لمبی جدائی کے بعد دیکھ رہی تھی۔ اس کی جذباتی حالت اُس ماں جیسی تھی جسے اپنا گمشدہ بچہ خلافِ توقع مل گیا ہو۔ وہ تو اس کے زخموں کے نشان چوم رہی تھی۔

"میں پھر جا رہا ہوں شمونہ!" ——— مزمل نے کہا۔

"کہاں؟"

"تمہاری اور تمہاری ماں کی عصمت کا انتقام لینے!" ——— مزمل آفندی نے کہا اور بتایا کہ اُس کا مشن کیا ہے۔

"میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی" ——— شمونہ نے بے تابی سے کہا۔

"میرے لئے مشکل پیدا نہ کرو شمونہ!" ——— مزمل نے کہا ——— "تم حسن بن صباح کی دنیا سے بھاگی ہوئی ہو۔ وہاں فوراً پہچانی جاؤ گی"۔

"تم حسن بن صباح کی دنیا سے واقف نہیں مزمل!" ——— شمونہ نے کہا ——— "میں کئی بھیس بدل لوں گی اور تمہاری راہنمائی کروں گی"۔

اس نے اتنی ضد کی کہ نظام الملک کو اطلاع دی گئی۔ اس نے شمونہ سے کہا کہ ہم سلطان ہیں اور مسلمان اپنی بیٹیوں کو نہ میدان میں اتارا کرتے ہیں نہ انہیں جاسوسی کے لئے استعمال کیا کرتے ہیں۔

"مگر ایک دو باتیں سن لو مزمل!" ——— شمونہ نے کہا ——— "کسی خوش فہمی میں نہ رہنا۔ باطنیوں کی نظریں انسان کے جسم کے اندر بھی چلی جایا کرتی ہیں۔ کسی پر اعتبار نہ کرنا۔ وہاں تمہیں مجھ جیسی کوئی لڑکی مل جائے اور تمہارے آگے روئے اور فریادیں

کرے کہ میں مظلوم ہوں' میری مدد کرو تو پتھر بن جاتا۔ یہ بھی یاد رکھنا کہ وہاں پتھر بھی
موم ہو جایا کرتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ قتل کرنے سے پہلے خود قتل ہو جاؤ۔ کئی بے
پارساؤں کو پاپی بنایا ہے۔ وہ ابلیس کی ولایت ہے۔ وہاں لذت والے راستے سیدھے
جاتے ہیں"۔

شمونہ نے اُسے اور بھی بہت سی ہدایات دیں' خطروں کی نشاندہی کی اور کہا کہ وہ راتوں کو سوئے تو ایک آنکھ کھول کر سوئے۔

مزمل آفندی نے ... شب کے بعد مرو سے روانہ ہو گیا تھا۔ اُس نے داڑھی پہلے ہی بڑھالی تھی۔ اس سے پہلے اس کی داڑھی سلیقے سے تراشی ہوئی ہوتی تھی جو اس کے سفیدی مائل گندمی چہرے میں دلکشی پیدا کرتی تھی۔ اُس نے سر کے بال بھی بڑھالئے اور کچھ دن پہلے ہی انہیں دھونا چھوڑ دیا تھا۔ سلطان کے تجربہ کار جاسوسوں نے اس کا بہروپ تیار کیا اور اُسے شتربان بنا دیا تھا جو اپنے اُونٹ باربرداری اور سواری کے لئے کرائے پر دیتا تھا۔

○

وہ بڑی لمبی مسافت طے کر کے خلجان میں داخل ہُوا۔ اُسے بتا دیا گیا تھا کہ خلجان کہاں جائے اور کس سے ملے۔ خلجان میں ایک آدمی تھا جو سلجوقیوں کے جاسوسوں کو اپنے پاس رکھتا تھا۔ وہ خود جاسوس نہیں تھا' جاسوسوں کی راہنمائی کرتا تھا۔ سلجوقی جاسوس اپنے دائیں ہاتھ کی درمیانی اور چھوٹی انگلی کے درمیان والی انگلی میں ایک خاص ساخت کی انگوٹھی ڈال کر رکھتے تھے۔ کسی جاسوس کو جب خفیہ طور پر پناہ دینے والا آدمی مل جاتا اور وہ جاسوس کو پہچان لیتا تو جاسوس انگوٹھی اتار کر چھپا لیتا تھا۔

مزمل آفندی خلجان میں داخل ہُوا۔ حسن بن صباح مہدی علوی کے ساتھ الموت میں داخل ہُوا۔

مہدی علوی کو حسن بن صباح نے رات اپنے ہاں مہمان رکھا تھا۔ خود اپنی سادگی اور درویشی کے دکھاوے کے لئے معمولی سے ایک خیمے میں چلا گیا تھا اور مہدی علوی کو ایک شاہانہ خیمے میں ٹھہرایا اور اُس پر یہ ظاہر کیا تھا کہ یہ خیمہ اُس کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ خیمے میں پھول ہی پھول نظر آتے تھے۔ ان کی مہک خمار طاری کر رہی تھی۔

ان رنگا رنگ پھولوں میں ایک پھول اور بھی تھا جو چلتا پھرتا تھا' مسکراتا تھا' ہنستا

خوشبو اور اُس کے رنگ پھولوں سے جدا تھے۔ یہ تھی خدیجہ جسے حسن بن صباح نے ہدایات دے کر مہدی علوی کے ساتھ لگا دیا تھا۔ بظاہر خدیجہ کا کام یہ تھا کہ مہمان کی دیکھ بھال کرے۔ اُس کا بستر ٹھیک کر دے اور اُس کے پاس پانی رکھ دے اور اُس کے خیمے کی شمع بجھا کر باہر آجائے پھر صبح اُسے ناشتہ دے۔ لیکن خدیجہ کو کوئی اور ہی مقصد دیا گیا تھا۔

رات کھانے کے بعد حسن بن صباح مہدی علوی کو خیمے میں اکیلا چھوڑ کر اپنے خیمے میں چلا گیا تو خدیجہ مہدی علوی کے پاس آگئی۔ اُس نے لباس ایسا پہن رکھا تھا جس میں اس کا جسم پوری طرح مستور نہیں تھا لیکن اس کی باتوں اور حرکات میں بے حیائی نہیں بلکہ شرم و حجاب تھا۔ مہدی علوی ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ بڑھاپے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس عمر میں آدمی بڑھاپے کو فریب دیا کرتا ہے کہ وہ ابھی جوان ہے۔ مہدی علوی تو ایک شہر کا امیر یعنی حاکم تھا' دولت میں کھیلتا تھا۔ اُس کی دو بیویاں تھیں لیکن حاکم شہر دو بیویوں سے مطمئن نہیں ہُوا کرتے تھے۔ نت نئے غنچوں کے متلاشی رہتے تھے۔ داشتہ اُن کی زندگی کا لازمی جزو ہوتا تھا۔

خدیجہ کو دیکھ کر مہدی علوی نے اپنی جذباتی دنیا میں زلزلے کے جھٹکے محسوس کئے۔ خدیجہ کو معلوم تھا کہ مرد کو کوئی بات کئے بغیر کس طرح جال میں لایا جاتا ہے۔ وہ خیمے میں گلدستے اور دیگر اشیاء قرینے سے رکھ رہی تھی اور وہ جانتی تھی کہ مہدی علوی کی نظریں اس پر لگی ہوئی ہیں۔ وہ کوئی چیز اٹھا کر کہیں اور رکھنے کے لئے جھکتی تھی تو اُس کے جسم کا کوئی ذرا سا حصہ عریاں ہو جاتا تھا۔

"تم کون ہو؟" — مہدی علوی نے پوچھا۔

"خدیجہ!" — خدیجہ نے جھوٹ بولا — "بیوہ ہوں۔ خاوند تبریز کی لڑائی میں مارا گیا ہے..... میں امام کی خدمت کے لئے اس کے ساتھ رہتی ہوں"۔

"بیوی بن کر؟" — مہدی علوی نے پوچھا — "یا شادی کے بغیر ہی....."

"نہیں معزز مہمان!" — خدیجہ نے جواب دیا — "امام کسی عورت کے ساتھ کیا تعلق نہیں رکھتا..... نہ بیوی نہ داشتہ..... امام تو آسمان کی مخلوق ہے۔ خوبصورت لڑکیوں کو ساتھ رکھتا ہے لیکن بالکل اس طرح جس طرح گلدانوں میں پھول رکھے ہوئے ہیں"۔

"تم بیوہ ہو خدیجہ!" — مہدی علوی نے کہا — "جوان ہو اور اتنی حسین ہو کر میں نے تم جیسی خوبصورت لڑکی کم ہی کبھی دیکھی ہے۔ کیا تم مرد کے ساتھ کی ضرورت محسوس نہیں کرتیں؟ تشنگی سی..... اور میں کیا کہوں!"

خدیجہ نے شرمانے کی ایسی اداکاری کی جیسے زمین میں اُتر جانا چاہتی ہو۔ مہدی علوی نے اپنا سوال دہرایا تو خدیجہ نے سر کے ہلکے سے اشارے سے بتایا کہ مرد کے ساتھ کی ضرورت محسوس کرتی ہے۔

"کیا میرا ساتھ پسند کرو گی؟" — مہدی علوی نے کہا — "تمہارے امام سے اجازت لے لوں گا۔ تمہیں بیوی نہیں ملکہ بناؤں گا..... میرے قریب آؤ۔ میرے پاس بیٹھو"۔

"میں آپ کو ایک خاص شربت پلاتی ہوں" — خدیجہ نے کہا — "یہ ہم اپنے بہت ہی خاص مہمانوں کو پلایا کرتے ہیں"۔

اُس نے ایک صراحی میں سے ایک پیالہ بھرا اور مہدی علوی کو پیش کیا۔ یہ شربت خاص طور پر خیمے میں رکھا گیا تھا۔ مہدی علوی نے شربت پی لیا اور خدیجہ کو اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے لیا۔ پھر جب شربت نے اپنا اثر دکھایا تو خدیجہ ایک طلسم یا ایک بڑا ہی حسین آسیب بن کر مہدی علوی پر غالب آ گئی۔

خدیجہ جب آدھی رات سے کچھ پہلے خیمے سے نکلی تو اس کا جسم ویسا ہی پاک نہ تھا جیسا اُس وقت تھا جس وقت وہ اُس خیمے میں داخل ہوئی تھی۔

صبح مہدی علوی کی آنکھ کھلی تو اُس نے سب سے پہلے خدیجہ کو پکارا..... اور اُسی روز وہ حسن بن صباح اور اس کے تمام آدمیوں کو اپنے ساتھ قلعہ الموت میں لے گیا۔ خدیجہ اور دوسری لڑکیاں بھی ساتھ تھیں۔

اِدھر مزمل آفندی خلجان میں داخل ہوا۔ اُسے بتا دیا گیا تھا کہ اُس آدمی کا گھر کہاں ہے جس کے ہاں اس نے قیام کرنا ہے۔ اُس کا نام احمد اوزال تھا۔ وہ سلجوق تھا۔ مزمل نے تین چار آدمیوں سے اس کا گھر پوچھا۔ آخر اُس نے دو آدمیوں کو روکا اور اُن سے احمد اوزال کا گھر معلوم کیا۔ انہوں نے اسے صحیح راستے پر ڈال دیا۔ وہ چلا گیا تو ان دونوں میں سے ایک آدمی اُسے جاتے دیکھتا رہا۔

"شاید میں اس شخص کو جانتا ہوں" — ایک نے کہا۔

"جانتے ہو گے" — دوسرے نے کہا — "شتربان ہے۔ کبھی تم نے اس کا اونٹ استعمال کیا ہو گا"۔

"نہیں، یہ شتربان نہیں" — پہلے آدمی نے کہا — "اور اس نے جس کا گھر پوچھا ہے وہ بھی مشکوک آدمی ہے"۔

مزمل آفندی پہچانا گیا تھا اور وہ بے خبر تھا۔

رات

کھانے کے بعد مزمل آفندی اور احمد اوزال الگ بیٹھ گئے۔

"اب بتاؤ مزمل!" — احمد اوزال نے پوچھا — "کیا تم کسی خاص مقصد کے لئے آئے ہو یا میری طرح جاسوسی کے لئے یہیں رہو گے؟"

"میں بہت بڑا مقصد لے کر آیا ہوں احمد بھائی!" — مزمل نے کہا — "حسن بن صباح کو قتل کرنا ہے یا اسے زندہ پکڑ کر سلطان ملک شاہ کے حوالے کرنا ہے"۔

"کیا تمہیں سلطان نے کہا ہے کہ یہ کام کرنا ہے؟" — احمد اوزال نے پوچھا۔

"ہاں احمد بھائی!" — مزمل نے جواب دیا — "سلطان نے کہا ہے اور وزیر نظام الملک نے بھی"۔

"نظام الملک نے بھی؟" — احمد اوزال نے حیرت سے کہا — "وہ دونوں اسے کوئی عام سا فریب کار اور شیطان فطرت انسان سمجھ رہے ہیں جسے وہ بڑی آسانی سے قتل کرا دیں گے"۔

"اسی لئے انہوں نے مجھے تمہارے پاس بھیجا ہے" — مزمل نے کہا — "مجھے بتاؤ کہ میں اسے کہاں اور کس طرح قتل کر سکتا ہوں۔ اگر تم اسے ناممکن سمجھتے ہو تو یہ بھی بتا دو۔ میں ناممکن کو ممکن کر کے دکھا دوں گا"۔

"تم جذبات کے غلبے میں بات کر رہے ہو مزمل!" — احمد اوزال نے کہا — "تم ناممکن کو ممکن نہیں بلکہ ممکن کو ناممکن بنا دو گے۔ سلطان اور نظام الملک حسن بن صباح کے ہاتھوں قتل ہو سکتے ہیں اسے قتل نہیں کروا سکتے......

نہ کچھ دلنا یہاں رہو' میں تمہیں الموت بھی لے جاؤں گا۔ خود ہی دیکھ لینا کہ تم کس طرح قتل کر سکتے ہو۔ ہم تین چار آدمی یہاں سے ہر چھوٹی بڑی خبر سلطان تک پہنچا رہے ہیں"۔

"ایک بات کہوں احمد؟" — مزمل نے کہا — "بُری لگے تو معاف کر دینا...... میرا خیال ہے تم سلطان کے تنخواہ دار ملازم ہو۔ تم اپنی جان کو خطرے میں نہیں ڈال سکتے۔ میں جذبہ لے کر آیا ہوں"۔

"اس میں بُری لگنے والی کوئی بات نہیں مزمل!" — احمد اوزال نے کہا — "بے شک ہم اس علاقے میں جو چند ایک آدمی جاسوسی کے لئے آئے ہیں' سب تنخواہ دار ملازم ہیں لیکن ہم رضا کارانہ طور پر آئے ہیں اور وہی جذبے لے کر آئے ہیں جس نے تمہیں یہاں آنے پر مجبور کیا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ہمیں تجربہ کار استادوں نے جاسوسی کی تربیت دی تھی پھر ہمیں آزمائشوں میں ڈال کر پرکھا اور اُس وقت یہاں بھیجا جب انہوں نے اطمینان کر لیا کہ ہم اس کام کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ صرف جذبہ کچھ نہیں کر سکتا...... اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں مزمل! جس میں جذبہ نہیں وہ بھی کچھ نہیں کر سکتا"۔

"تم میری راہنمائی کرو گے احمد؟"

"کیوں نہیں کروں گا؟" — احمد اوزال نے کہا — "میں تمہیں الموت لے جاؤں گا۔ خود دیکھنا کہ حسن بن صباح تک قتل کے ارادے سے پہنچنا کس قدر دشوار اور خطرناک ہے۔ اس نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا لیکن لوگوں نے اسے نبی ماننا شروع کر دیا ہے۔ اس نے لوگوں سے کہا ہے کہ وہ انہیں دنیا میں جنت دکھا دے گا"۔

"یہ میں جانتا ہوں" — مزمل آفندی نے کہا — "اس نے اپنی شخصیت میں ابلیسی اوصاف پیدا کر لئے ہیں"۔

"ہاں!" — احمد اوزال نے کہا — "تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ انسانی فطرت کی کمزوریوں اور کبھی پوری نہ ہونے والی خواہشات کو اگر تسکین ملتی ہے، تو وہ ابلیسی اوصاف سے ملتی ہے یا اُس انسان سے ملتی ہے جس نے اپنے آپ میں یہ اوصاف پیدا کر لئے ہوں۔ ابلیس کا بنیادی وصف ہے بندگانِ خدا کو خدا

اور رسولؐ کے بتائے ہوئے راستے سے ہٹانا اور نفسانی لذت پرستی کا عادی بنا دینا"۔

"باتیں بہت ہو چکیں احمد بھائی!" — مزمل آفندی نے کہا — "اب کچھ کرنا ہے۔ اس ابلیس کا راستہ روکنا ہے۔ یہ صرف سلطان ملک شاہ کا مسئلہ نہیں' یہ ہر مسلمان کا مسئلہ ہے' یہ میرا اور تمہارا مسئلہ ہے' یہ دین اسلام کا مسئلہ ہے۔ میں حسن بن صباح پر دو وار کر چکا ہوں۔ اس کے قبضے سے ایک عورت کو آزاد کرایا تھا"۔

مزمل نے احمد اوزال کو سنایا کہ اس نے میمونہ کو کس طرح حسن بن صباح سے آزاد کرایا تھا۔ یہ بھی سنایا کہ اس نے کس طرح اس قافلے پر پانچ سو سواروں کا چھاپہ مروایا تھا جس قافلے کے ساتھ حسن بن صباح اصفہان جا رہا تھا۔

"میں اپنی جان کی قربانی دینے آیا ہوں احمد بھائی!" — مزمل نے کہا — "مجھے تمہارے پاس بھیجا گیا ہے۔ تم نے میری راہنمائی کرنی ہے۔ میں عہد کر کے آیا ہوں کہ زندہ اسی صورت میں واپس جاؤں گا کہ حسن بن صباح زندہ نہیں ہو گا۔ میں کامیاب لوٹنا چاہتا ہوں"۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں مزمل!" — احمد اوزال نے کہا — "میں تمہارا حوصلہ توڑ نہیں رہا' صرف خطروں سے آگاہ کر رہا ہوں۔ میں تمہیں چند دن اپنے پاس رکھ کر تمہاری تربیت کروں گا۔ جاسوسی اور تباہ کاری کے معاملے میں تم بالکل کورے ہو۔ تمہیں کچھ تو معلوم ہونا چاہئے۔ یہاں تمہیں اپنے دوستوں سے بھی ملوانا ہے ..... کل صبح باہر نکل جانا اور سارے شہر میں گھوم پھر کر یہاں کی گلیاں اور بازار بھی دیکھنا اور یہاں کے لوگوں کو بھی دیکھنا۔ یہ خیال رکھنا کہ کوئی تمہارے ساتھ ملیک سلیک کرے تو اُسے تپاک اور خندہ پیشانی سے ملنا ..... یہ بتاؤ کہ تم سے کوئی پوچھ لے کہاں سے آئے ہو اور کیوں آئے ہو تو کیا جواب دو گے؟"

"کہہ دوں گا بغداد سے آیا ہوں" — مزمل نے جواب دیا — "اصفہان کہہ دوں گا۔ میں نے بہت سفر کیا ہے اور بڑے شہروں سے واقف ہوں۔ یہاں

آنے کی وجہ سیر و سیاحت بتاؤں گا"۔

"یہ ٹھیک ہے" — احمد اوزال نے کہا — "تم عقل والے ہو۔ میں سوچتا تھا کہ تم مَرو' رے یا نیشاپور کہو گے۔ یہاں کسی کو پتہ نہ چلے کہ تمہارا سلطنتِ سلجوق کے ساتھ کوئی تعلق ہے..... میرے متعلق دل میں کوئی غلط فہمی نہ رکھنا مزمل! میں مسلمان تو ہوں لیکن میں سلجوق ہوں' ترک ہوں۔ اس سلطنت کی بنیادوں میں میرے آباؤ اجداد کا خون رچا بسا ہُوا ہے۔ میں اس سلطنت کے ساتھ غداری نہیں کر سکتا۔ میں پہلے مسلمان ہوں پھر سلجوق ہوں۔ اس طرح اس سلطنت کے ساتھ میرے دو رشتے بنتے ہیں۔ مجھے تنخواہ دار ملازم نہ سمجھنا۔ میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں گا تو بھی مجھے اپنے ساتھ سمجھنا..... اور بہت ہی ضروری بات یہ ذہن میں رکھنا کہ اس شہر میں باطنیوں کے جاسوس بھی موجود ہیں۔ کہیں پکڑے نہ جانا"۔

○

اگلی صبح مزمل آفندی احمد اوزال کے گھر سے اس خیال سے نکلا کہ سارے شہر میں گھوم پھر کر شہر سے واقفیت حاصل کرے گا۔ گلی میں اسی کی عمر کا ایک آدمی ٹہل رہا تھا۔ مزمل نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ اسے صرف دیکھا اور ایک طرف نکل گیا۔ وہ اس شہر میں اجنبی تھا۔ گلیوں کے موڑ مڑتا گیا۔

ایک گلی سے مڑ کر ایک اور گلی میں داخل ہوا۔ ایک اور گلی اس گلی کے ساتھ ملتی تھی۔ مزمل نے اس آدمی کو جسے اس نے احمد اوزال کے گھر سے نکلتے دیکھا تھا' اسے دوسری گلی میں آہستہ آہستہ چلتے دیکھا۔ اب کے مزمل نے اسے ذرا توجہ سے دیکھا۔ اسے یاد آیا کہ کل اس نے اسی آدمی سے احمد اوزال کا گھر پوچھا تھا۔

مزمل بازار میں چلا گیا اور ایک دکان پر رک گیا۔ یہ خنجروں اور چھوٹی بڑی تلواروں کی دکان تھی۔ مزمل خنجر اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگا۔ اس نے دائیں طرف دیکھا۔ اگلی دکان پر وہی آدمی کھڑا مزمل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مزمل نے اسے دیکھا تو اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اس کے بعد مزمل جدھر بھی گیا اس نے کچھ فاصلے پر اس آدمی کو دیکھا۔

دوپہر کے کھانے کے وقت مزمل واپس احمد اوزال کے گھر آیا اور اسے بتایا کہ ایک آدمی اس کا پیچھا کرتا رہا ہے۔

"میں نے اسی آدمی سے تمہارے گھر کا پتہ پوچھا تھا" — مزمل نے کہا۔

"یہ حسن بن صباح کا جاسوس ہے" — احمد اوزال نے کہا — "تم نے تین چار دن ابھی یہیں رہنا ہے۔ اس آدمی سے بچ کے رہنا۔ یہ تمہیں قتل نہیں کرے گا نہ تمہیں گرفتار کرے گا۔ یہ کسی وقت تمہیں ملے گا اور تمہیں دوست بنائے گا۔ اسے اچھی طرح ملنا لیکن ایسی کوئی بات نہ کرنا جس سے اسے شک ہو جائے۔ یہی بتانا کہ تم سفر پر ہو۔ میرے متعلق بتانا کہ میری تمہاری ملاقات حلب میں ہوئی تھی۔ تم گھومو پھرو۔ شہر سے باہر جنگل بھی دیکھنا۔ بہت خوبصورت علاقہ ہے۔ ایک ندی گذرتی ہے"۔

"ضرور جاؤں گا" — مزمل نے کہا — "قدرت کے حسن کا تو میں دلدادہ ہوں"۔

"نہیں مزمل!" — احمد اوزال نے کہا — "تم نے قدرت کے حسن میں کھو نہیں جانا بلکہ یہ دیکھنا ہے کہ تمہیں اگر یہاں سے بھاگنا پڑے تو جنگل میں کہاں کہاں چھپتے ہوئے بھاگو گے ..... یاد رکھو مزمل! جاسوس اور تخریب کار کو کیڑوں مکوڑوں کی طرح رہنا ہوتا ہے"۔

احمد اوزال نے اسے اور بھی بہت سی ہدایات دیں۔ وہ مزمل کو باقاعدہ ٹریننگ دے رہا تھا۔

کھانے کے بعد مزمل پھر باہر نکل گیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے توقع تھی کہ وہی آدمی پھر اسے نظر آئے گا لیکن وہ نظر نہ آیا۔ مزمل شہر سے نکل کر جنگل کی طرف ہو لیا۔ آگے اونچی نیچی ٹیکریاں تھیں جو سبز گھاس، خوبصورت جھاڑیوں اور درختوں سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ واقعی بہت خوبصورت علاقہ تھا۔

مزمل تنومند جوان آدمی تھا۔ ایسے روح افزا علاقے اسے بہت ہی اچھے لگتے تھے۔ وہ دو تین ٹیکریوں کے درمیان سے گزر کر آگے چلا گیا۔ اسے ندی نظر آئی۔ اس کے کناروں پر گھنے درخت تھے۔ ان کے پس منظر میں پہاڑی تھی۔ وہ بھی سبزپوش تھی۔ اس پر بادلوں کے سفید ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔

مزمل ندی کی طرف جا رہا تھا۔

○

اسے اپنے پیچھے ایسی سرسراہٹ سنائی دی جیسے کوئی خشک گھاس پر چل رہا ہو۔ اس نے گھوم کر پیچھے دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اسے یوں شک ہُوا جیسے اس نے کسی جنگلی جانور یا کتے یا بلی کو ٹیکری کی اوٹ میں ہوتے دیکھا ہو۔ اسے وہم سمجھ کر وہ ندی تک پہنچ گیا اور کنارے پر ٹہلنے لگا۔ ندی کا جل ترنگ بجاتا ہُوا شفاف پانی دلوں پر وجد طاری کر رہا تھا۔

مزمل کو یاد آیا کہ احمد اوزال نے اسے کہا تھا کہ قدرت کے حسن میں ہی نہ کھو جانا بلکہ وہاں چھپنے کی جگہیں دیکھنا ..... اس نے ہر سو دیکھا۔ اسے جھاڑیوں کے اور اونچے اور گھنے پودوں کے جھرمٹ نظر آئے۔ بعض ٹیکریاں دیواروں جیسی تھیں۔ ان کے دامن میں ہاتھی گھاس بھی تھی اور ہرے سرکنڈے بھی۔ بعض گھنے درخت ایسے بھی تھے جن کے نیچے والے ٹہن زمین کے قریب آ گئے تھے۔ مزمل کو خیال آیا کہ وہ ایسے کسی ٹہن پر چڑھ جائے گا اور چوڑے پتوں والی گھنی شاخیں اسے چھپا لیں گی۔

اسے ندی کے کنارے کے قریب تین چار درختوں کا جھنڈ دکھائی دیا۔ ان پر چوڑے پتوں والی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ یہ درختوں کے درمیان سے اٹھ رہی تھیں۔ ان بیلوں نے درختوں کے نیچے غار یا گف کی طرح کا کمرہ سا بنا رکھا تھا۔

مزمل ندی کے ساتھ ساتھ وہاں تک جانے کی بجائے چکر کاٹ کر عقب سے آگے گیا۔ اسے سامنے سے دیکھنے کو آگے ہُوا تو وہ ٹھٹھک کر ایک قدم پیچھے ہو گیا۔ وہاں ایک آدمی بیٹھا ہُوا تھا۔ مزمل کو کسی آدمی سے کوئی ڈر اور خطرہ نہیں ہو سکتا تھا لیکن یہ وہی آدمی تھا جو گلیوں اور بازار میں اس کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے مزمل نے اپنے پیچھے جو آہٹ اور سرسراہٹ سنی تھی وہ اسی آدمی کی تھی۔

اسے وہاں دیکھ کر مزمل فوراً سمجھ گیا کہ یہ شخص جنگل میں بھی اس کے پیچھے آ گیا ہے۔ وہ غصے سے آگ بگولہ ہو گیا۔ اس نے اپنے کپڑوں کے اندر خنجر

اُوس رکھا تھا۔ وہ آدمی اٹھ رہا تھا۔ مزمل نے بڑی تیزی سے خنجر نکال لیا۔ اس کے ذہن میں احمد اوزال کے الفاظ گونجے — "یہ حسن بن صباح کا جاسوس ہے" — مزمل کو یوں سنائی دیا جیسے اسے کسی نے کہا ہو — "یہ حسن بن صباح ہے"۔

وہ آدمی اٹھا ہی تھا کہ مزمل کا بایاں ہاتھ تیر کی طرح آگے ہُوا اور اس ہاتھ نے اس آدمی کی گردن دبوچ لی۔ مزمل کے دوسرے ہاتھ میں خنجر تھا۔ اس کے خنجر کی نوک اس شخص کے دل کے مقام پر رکھ دی۔ بائیں ہاتھ کا پنجہ اتنی زور سے دبایا کہ اس آدمی نے اپنے دونوں ہاتھوں سے مزمل کی بائیں کلائی پکڑ لی اور تڑپنے لگا۔ اس میں اتنی طاقت نہیں رہی تھی کہ مزمل کے پنجے سے اپنی گردن چھڑوا سکتا۔ اس نے دم گھٹنے سے مر جانا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مزمل کے خنجر کی نوک اس کے دل کے مقام پر چبھ رہی تھی۔

مزمل اسے جان سے مار سکتا تھا لیکن اسے خیال آگیا کہ اس سے یہ تو پوچھ لے کہ وہ کون ہے اور چاہتا کیا ہے اور اگر وہ حسن بن صباح کے باطنی فرقے کا جاسوس ہے تو اس سے راز کی کچھ باتیں پوچھ لے..... یہ خیال آتے ہی اس نے اس شخص کی ٹانگوں کے پیچھے اپنی ایک ٹانگ کر کے بائیں ہاتھ سے ایسا دھکا دیا کہ وہ آدمی پیٹھ کے بل گرا۔ مزمل کود کر اس کے پیٹ پر بیٹھ گیا اور خنجر کی نوک اس کی شہ رگ پر رکھ دی۔

"کیا چاہتے ہو؟" — مزمل نے پوچھا — "میرے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہو؟"

"میں بتا نہیں سکتا" — اس نے کہا — "بتایا تو تم مجھے قتل کر دو گے"۔

"قتل تو میں تمہیں کر ہی دوں گا" — مزمل نے کہا — "سچ بول دو گے تو شاید میں تمہیں چھوڑ دوں"۔

"اس وقت میری جان تمہارے ہاتھ میں ہے" — اس نے کہا — "اس لئے میں تمہیں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وعدہ کرو تم کسی کو بتاؤ گے نہیں"۔

"سچ بولو گے تو جو وعدہ چاہو گے پورا کروں گا" — مزمل نے کہا۔

"میں نے تمہیں قتل کرنا تھا" — اس شخص نے کہا — "لیکن ایک بت کا یقین کرتا تھا"۔

"میرا قصور؟"

"تم باطنیوں کے جاسوس ہو" — اس آدمی نے کہا — "تم حسن بن صباح کے اُس گروہ کے آدمی ہو جو بڑے لوگوں کو قتل کرتے ہیں' اور میں حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے گھر سے نکلا ہوں..... تم نے کہا تھا سچ بولو۔ میں نے سچ بول دیا ہے۔ اب چاہو تو مجھے قتل کر دو"۔

"تمہیں کس نے بتایا ہے میں حسن بن صباح کے قاتل گروہ کا آدمی ہوں؟" — مزمل آفندی نے پوچھا۔

"کل تم نے مجھ سے احمد اوزال کا گھر پوچھا تھا" — اس نے جواب دیا — "میرے ساتھ ایک اور آدمی تھا۔ اس نے تمہارے متعلق کہا تھا کہ اسے شک ہے کہ تم باطنی ہو اور شاید تم قاتل گروہ کے آدمی ہو۔ میں یہی معلوم کرنے کے لئے تمہارے پیچھے پھر رہا تھا۔ شک صحیح ہونے کی صورت میں میں نے تمہیں قتل کرنا تھا۔ ہمیں بتایا گیا ہے کہ حسن بن صباح کے پیشہ ور صرف ایک قاتل کو قتل کرنے کا اتنا ہی ثواب ملتا ہے جیسے تم نے حسن بن صباح کو قتل کر دیا..... بے شک اس وقت میری جان تمہارے قبضہ و اختیار میں ہے لیکن تم میں مردانگی ہے تو تم بھی سچ بتا دو کہ تم پر میرا جو شک ہے یہ صحیح ہے یا غلط؟"

"کم عقل انسان!" — مزمل نے کہا — "اگر تمہارا شک صحیح ہوتا تو اب تک میرا خنجر تمہاری شہ رگ کاٹ چکا ہوتا"۔

مزمل آفندی نے اس کی شہ رگ سے خنجر ہٹا لیا پھر اس کے پیٹ سے اُتر کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ آدمی اٹھ بیٹھا۔

"کون سے فرقے سے تعلق رکھتے ہو؟" — مزمل نے اس سے پوچھا — "نام کیا ہے تمہارا؟"

"اہلِ سنت ہوں" — اس نے جواب دیا — "عبید ابنِ عابد میرا نام ہے سب مجھے بن عابد کہتے ہیں"۔

"حسن بن صباح قلعہ الموت میں ہے" — مزمل نے کہا — "اور تم یہاں فلجان میں اُسے کس طرح قتل کرو گے؟"

"دیکھو میرے دوست!" — ابن عابد نے کہا — "میں نے تمہیں اپنا راز دے دیا ہے۔ اب اور زیادہ بھید لینے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارا خنجر میرے دل پر اور شہ رگ تمہارے پنجے میں آگئی تھی اور میں بے بس ہو گیا تھا۔ اب تمہارے ہاتھ میں خنجر ہے اور میں خالی ہاتھ ہوں۔ مجھ پر حملہ کر کے دیکھو۔ میں استادوں سے خالی ہاتھ لڑنے اور قتل کرنے کی تربیت لے کر آیا ہوں۔ میں کوئی گیا گزرا آدمی نہیں ہوں۔ میرے آباؤ اجداد ثقفی تھے۔ مجھے تم پر شک ہے کہ تم کسی اور فرقے کے آدمی ہو"۔

"میں اہلِ سُنّت ہوں ابن عابد!" — مزمل نے کہا — "میرے دادا اصفہان میں آباد ہو گئے تھے...... میں تم سے ایک خاص مقصد کے لئے پوچھ رہا ہوں کہ حسن بن صباح کو کس طرح قتل کرو گے!"

"یہ کام ایک آدمی کا نہیں" — ابن عابد نے کہا — "مجھے ایک ساتھی کی ضرورت ہے۔ میں اسی مقصد کے لئے فلجان میں رکا ہوا ہوں۔ میں حیران ہوں کہ ایک سے بڑھ کر ایک دلیر آدمی موجود ہے۔ جذبے والے بھی موجود ہیں۔ یہ وہ پکے مسلمان ہیں جو حسن بن صباح کا نام سنتے ہیں تو تھوک دیتے ہیں لیکن حسن بن صباح کے قتل کے لئے کوئی بھی تیار نہیں ہوتا"۔

"وجہ کیا ہے؟"

"بزدلی!" — ابن عابد نے جواب دیا — "کہتے ہیں وہاں جا کر بندہ خود قتل ہو جاتا ہے۔ حسن بن صباح کو قتل نہیں کیا جا سکتا"۔

"تمہارا اپنا کیا خیال ہے؟"

"میرے بھائی!" — ابن عابد نے جواب دیا — "میرا اپنا کوئی خیال نہیں، مسلمان جو کچھ کرتا ہے اللہ کے حکم سے کرتا ہے، اس کا اپنا کوئی خیال نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ اللہ کی راہ میں جان قربان کر دیا کرتا ہے...... اگر دو دنوں تک مجھے کوئی ساتھی نہ ملا تو میں اکیلا قلعہ الموت چلا جاؤں گا پھر دیکھوں گا کون قتل ہوتا ہے...... میں یا حسن بن صباح؟"

بعید بن عابد بولتا چلا گیا اور اس کا لہجہ پہلے سے زیادہ جذباتی ہو گیا۔ ایک جو سا تھا جو مزمل آفندی پر طاری ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اسے ایک ایسا آدمی مل گیا تھا جو اس کا صرف ہم خیال ہی نہیں تھا بلکہ وہ بھی وہی عزم لے کر گھر سے نکلا تھا جو مزمل کو اتنی دور سے یہاں لے آیا تھا۔

"اگر میں کہوں کہ میں بھی اسی ارادے سے یہاں آیا ہوں" — مزمل نے کہا — "تو مان لو گے؟"

"نہیں!" — ابن عابد نے کہا — "میں پچھتا رہا ہوں کہ تمہیں اپنا راز دے دیا ہے۔ مجھے تم پر اعتبار نہیں کرنا چاہئے تھا"۔

"میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں ابن عابد؟" — مزمل نے کہا — "یوں سمجھو کہ تم جس ساتھی کی تلاش میں ہو وہ تمہیں مل گیا ہے"۔

مزمل اتنا جذباتی ہو گیا تھا کہ اس نے خنجر اپنے سامنے زمین پر رکھ دیا۔ وہ ابن عابد کے سامنے بیٹھا ہُوا تھا۔ ابن عابد نے بڑے آرام سے خنجر اٹھا لیا اور اسے دیکھنے لگا جیسے بچہ کوئی چیز اپنے ہاتھوں میں لے کر اشتیاق سے دیکھا کرتا ہے۔ ابن عابد پہلے سے زیادہ جذباتی لہجے میں بول بھی رہا تھا۔

وہ بیٹھے بیٹھے اچانک اچھلا اور مزمل پر جا پڑا۔ مزمل اس اچانک حملے سے پیٹھ کے بل گرا۔ ابن عابد اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا اور خنجر کی نوک اس کی شہ رگ پر رکھ دی۔

"اب بتا تُو کون ہے باطنی مردود؟" — ابن عابد نے کہا — "تُو ان باطنیوں کا جاسوس ہے۔ تُو حسن بن صباح ابلیس کے خاص گروہ کا آدمی ہے۔ میں نے تجھے اپنا راز دے دیا ہے۔ تجھے میں زندہ کیسے رہنے دوں؟"

مزمل منت سماجت کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا؟ وہ قسمیں کھا کھا کر یقین دلا رہا تھا کہ وہ راسخ العقیدہ مسلمان ہے اور وہ حسن بن صباح کے قتل کے ارادے سے آیا ہے۔ ابن عابد مان نہیں رہا تھا۔

"پھر یوں کرو" — ابن عابد بڑی ہی مشکل سے مانا اور شرط یہ بتائی — "میرے ساتھ وہاں چلو جہاں میں رہتا ہوں"۔

ابن عابد اس کے سینے سے ہٹ گیا اور مزمل اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"میں اپنے دوست احمد اوزال کے ہاں ہی کیوں نہ رہوں؟" — مزمل نے کہا — "الموت تمہارے ساتھ چلوں گا"۔

"نہیں؟" — بن عابد نے کہا — "میں تمہیں اس لئے اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں کہ مجھے مکمل طور پر یقین کرنا ہے کہ تم قابلِ اعتماد ہو...... اور تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ احمد اوزال ٹھیک آدمی نہیں۔ میں جانتا ہوں وہ سلجوق ہے اور شاید سلجوقی سلطان کے لئے جاسوسی بھی کرتا ہے۔ میرے یہاں کے دوستوں کو شک ہے کہ وہ باطنیوں کا بھی وفادار ہے...... وہ دوغلا آدمی ہے...... تمہیں اس نے کیا کہا ہے؟"

"میں نے اسے بتا دیا ہے کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں" — مزمل نے جواب دیا — "اس نے کہا ہے کہ وہ الموت تک میرے ساتھ چلے گا اور میری راہنمائی کرے گا"۔

"بچہ میرے دوست!" — بن عابد نے کہا — "یہ تمہیں الموت لے جا کر مروائے گا...... تمہیں میرے ساتھ چلنا ہو گا...... میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ ہمارے پاس رہنے کی تم پر پابندی نہیں۔ میرے دوستوں سے ملو گے اور ان کی باتیں سنو گے تو خود محسوس کرو گے کہ تمہیں ہمارے پاس ہی رہنا چاہئے۔ اس صورت میں ہم تمہارے دوست کو پتہ نہیں چلنے دیں گے"۔

مزمل آفندی پر خاموشی طاری ہو گئی۔ اس کا ذہن الجھ گیا۔ وہ بن عابد کے ساتھ چل پڑا۔ اسے چلتے چلتے خیال آیا کہ احمد اوزال کو تو وہ جانتا ہی نہیں تھا۔ اس کے پاس آئے ابھی ایک رات ہی گزری اور اگلا دن گزر رہا تھا۔

○

عبید ابن عابد اسے ایک گھر میں لے گیا جہاں دو آدمی موجود تھے۔ وہ اٹھ کر بڑے تپاک سے مزمل سے ملے۔ بن عابد نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ مزمل بھی اسی مشن پر آیا ہے جو مشن عابد کا ہے۔ ان دونوں آدمیوں نے مزمل کے ساتھ وہی باتیں کیں جو بن عابد نے کی تھیں۔ مزمل نے انہیں بھی یقین دلانے کی کوشش کی کہ باطنیوں کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں۔

"مزمل آفندی!" — ایک آدمی نے کہا — "تم قرآن ہاتھوں پر اٹھا کر

قسم کھا سکتے ہو۔ مسجد میں جا کر بھی قسم کھا سکتے ہو لیکن یہ کوئی ثبوت نہیں ہو گا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو یہ سچ ہے۔ میں تمہیں ایک بات بتا دوں۔ اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو زندہ نہیں رہو گے۔ دنیا کے کسی بھی گوشے میں چلے جاؤ گے، تمہیں قتل کرنے کے لئے ہمارا ایک آدمی وہاں پہنچ جائے گا...... اگر تم اسلام کے ساتھ مخلص اور دیانتدار ہو تو ہمارے پاس رہو...... اب چونکہ ہم نے ایک دوسرے کو اپنا اپنا راز دے دیا ہے اس لئے یہ بھی بتا دو کہ تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟"

"سلطان ملک شاہ کے وزیر نظام الملک نے!" — مزمل نے صحیح بات بتا دی — "انہوں نے ہی کہا تھا کہ خلجان جا کر احمد اوزال کا گھر پوچھ لینا اور اسے بتانا کہ تمہیں ہم نے بھیجا ہے، پھر اسے بتانا کہ تم کیوں آئے ہو۔ وہ تمہارا ساتھ دے گا"۔

"بن عابد نے تمہیں بتایا ہو گا" — اس آدمی نے کہا — "احمد اوزال قابلِ اعتماد آدمی نہیں۔ اگر یہ تمہیں پکڑوا دے گا تو ہم حیران نہیں ہوں گے۔ ہمیں بن عابد کے لئے ایک ساتھی کی ضرورت تھی۔ ہم تو کہتے ہیں کہ اللہ نے ہماری مدد کی ہے کہ تمہیں بھیج دیا ہے، اور یہ بھی اللہ کی ہی مدد ہے کہ تم ہمیں مل گئے اور ہم نے تمہیں احمد اوزال سے بچا لیا"۔

"تم ایک بات ضرور سوچو گے" — دوسرے آدمی نے کہا — "تم پوچھ سکتے ہو کہ ہم میں سے کوئی بن عابد کے ساتھ کیوں نہیں گیا؟"

"یہ تو میں ضرور پوچھوں گا" — مزمل نے کہا۔

"جواب پر غور کرنا مزمل!" — اس آدمی نے کہا — "اگر ہم بن عابد کے ساتھ چلے گئے تو پیچھے ہمارے محاذ کو چلانے والا کوئی نہیں رہے گا۔ ہمارے محاذ میں کچھ آدمی اور بھی ہیں لیکن وہ اتنے بڑے خطرے میں جانے کے قابل نہیں اور وہ جانے سے ڈرتے بھی ہیں"۔

"میں ڈرنے والوں میں سے نہیں" — مزمل نے کہا — "لیکن میں یہ یقین کس طرح کروں کہ تم لوگ مجھے دھوکہ نہیں دے رہے"۔

"یہی سوال ہم تم سے پوچھنا چاہتے ہیں" — اس آدمی نے کہا — "ہم

کس طرح اعتبار کر سکتے ہیں کہ تم ہمیں دھوکہ نہیں دو گے؟"

اس مسئلے پر باتیں شروع ہوئیں تو مزمل آفندی کو یقین آگیا کہ یہ لوگ قابلِ اعتماد ہیں اور اس نے انہیں یقین دلا دیا کہ وہ بھی قابلِ اعتماد ہے۔ اس کا اس نے یہ ثبوت پیش کیا کہ اپنا فیصلہ سنا دیا کہ وہ احمد اوزال کے پاس نہیں جائے گا۔

اس جماعت کا جو سردار بنا ہوا تھا' اس نے فیصلہ کیا کہ آج ہی رات بن عابد اور مزمل قلعہ الموت کو روانہ ہو جائیں۔

"تمہارے دو آدمی وہاں بھی موجود ہیں مزمل!" — سردار نے کہا — "بن عابد کو معلوم ہے۔ وہ بڑی اچھی اور محفوظ پناہ ہے۔ تمہیں کسی بہروپ کی بھی ضرورت نہیں۔ یہ خیال رکھنا کہ کوئی تم سے پوچھے کہ تم کون ہو تو کہنا' میں امام کا شیدائی ہوں۔ کسی کے ساتھ حسن بن صباح کے خلاف کوئی بات نہ کرنا"۔

"قتل کس طرح کریں گے؟" — مزمل نے پوچھا۔

"یہ تم نے وہاں جا کر دیکھنا ہے" — سردار نے کہا — "ویسے اس تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ وہ لوگوں کے سامنے آتا ہے لیکن لوگوں کے درمیان یعنی قریب نہیں آتا۔ تم دونوں یوں کرنا کہ اس کے محافظوں تک پہنچ جانا اور رو رو کر' تڑپ تڑپ کر منت سماجت کرنا کہ تم امام کے ہاتھ چومنے کے لئے اصفہان سے آئے ہو...... اگر تمہیں اجازت مل جائے تو خنجر تمہارے پاس ہوں گے۔ یہ سوچ لو کہ اسے تو قتل کر دو گے لیکن خود وہاں سے زندہ نہیں نکل سکو گے۔ دوسرا طریقہ تیر ہے۔ حسن بن صباح کبھی کبھی باہر نکلا کرتا ہے۔ یہ تم نے دیکھنا ہے کہ اس پر کہاں سے تیر چلا سکتے ہو۔ اس صورت میں تمہیں بھاگ نکلنے کا موقع مل سکتا ہے"۔

"میرا مقصد اسے قتل کرنا ہے" — مزمل نے کہا — "بھاگ سکے تو بھاگ آئیں گے ورنہ بھاگنا میرا مقصد نہیں"۔

"یہ ہوئی ناں بات!" — بن عابد نے کہا — "ایسا ساتھی مجھے کہاں مل سکتا تھا!"

○

سورج غروب ہو گیا تو احمد اوزال مزمل کا انتظار کرتے کرتے تھک گیا اور پریشان ہو گیا۔ اس نے مزمل سے کہا بھی تھا کہ غروب آفتاب سے پہلے واپس آجائے۔ وہ وہاں اجنبی تھا۔ کہیں گھر کا رستہ نہ بھول گیا ہو۔ احمد اوزال کو یہ خطرہ بھی نظر آرہا تھا کہ مزمل جاسوسی کی اونچ نیچ اور خطروں سے بالکل ہی واقف نہیں تھا' کسی باطنی کے جال میں نہ آگیا ہو۔

احمد اوزال گھر سے نکلا اور گلیوں میں گھومنے پھرنے لگا۔ بازار بھی چھان مارا۔ واپس گھر آیا۔ مزمل واپس نہیں آیا تھا۔ احمد اوزال اپنے ایک ساتھی کے گھر گیا اور اسے مزمل کے متعلق بتایا۔ یہ شخص بھی سلجوقیوں کا جاسوس تھا۔

"یہ تمہاری غلطی ہے احمد!" — اس کے ساتھی نے کہا — "تم نے یہ آدمی مجھے دکھایا ہی نہیں۔ میں اسے کہاں ڈھونڈ سکتا ہوں؟"۔

"کل شام ہی مرو سے آیا تھا" — احمد اوزال نے کہا — "میں نے آج رات اسے تمہارے پاس لانا تھا"۔

"وہ بچہ تو نہیں کہ رستہ بھول گیا ہو گا" — اس آدمی نے کہا — "تم جانتے ہو خلجان حسن بن صباح کے اُن آدمیوں سے بھرا پڑا ہے جو مخالفوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ وہ اتنے ماہر ہیں کہ اجنبی کا چہرہ دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ یہ شخص مشکوک ہے یا بے ضرر ہے۔ مجھے تو یہی نظر آرہا ہے کہ ہمارا یہ مہمان اسی جال میں آگیا ہے۔ اصل خطرہ یہ ہے کہ وہ تمہاری نشاندہی کر دے گا"۔

"میں وزیراعظم نظام الملک کو کیا جواب دوں!" — احمد اوزال نے کہا — "انہوں نے اسے میرے پاس بھیجا تھا"۔

"صرف کل شام تک انتظار کرو" — احمد کے ساتھی نے کہا — "اگر وہ نہ آیا تو رات کو ہی نکل جانا۔ مرو جا کر سلطان کو بتانا کہ آپ کا بھیجا ہوا آدمی لاپتہ ہو گیا ہے"۔

"سلطان کیا کرے گا؟" — احمد اوزال نے کہا — "جاسوسی کا نظام وزیراعظم نظام الملک نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے۔ اس شخص کو بھی اسی نے بھیجا ہے۔ یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ اس آدمی میں عقل کی باریکی بھی ہے یا نہیں۔

اس کی صرف جذباتی باتیں سنیں اور اسے بھیج دیا حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے"۔

"وزیراعظم کو یہی جاتا" ــــ اس کے ساتھی نے کہا ــــ "انہیں کہتا کہ اس قسم کے اناڑیوں کو نہ بھیجا کریں۔ یہ ہمیں بھی پکڑوائیں گے..... ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ اس نے جذبات میں آکر غیر دانستہ طور پر تمہاری نشاندہی کر دی ہو"۔

احمد اوزال پھر بھاگم بھاگ اپنے گھر اس توقع پر گیا کہ مزمل شاید آگیا ہو لیکن مزمل نہیں آیا تھا۔ اب اس نے اس حقیقت کو قبول کر لیا کہ مزمل کا پتہ ہو گیا ہے۔ اسے اپنے ساتھی کا مشورہ دانشمندانہ لگا کہ اسے قلعان سے نکل جانا چاہئے۔

رات کے اُس وقت جب احمد اوزال مزمل آفندی کے لئے پریشان ہو رہا تھا اور جب اسے یہ خطرہ اور پریشان کر رہا تھا کہ مزمل نے بھولے پن میں اس کی نشاندہی کر دی ہو گی' اُسی وقت دو گھوڑے شہر سے نکلے۔ ایک پر بن عابد اور دوسرے پر مزمل آفندی سوار تھا۔ شہر سے نکل کر انہوں نے قلعہ الموت کا رخ کر لیا۔

ان کے ساتھ بن عابد کے وہ دو ساتھی تھے جن کے ہاں بن عابد مزمل کو لے گیا تھا اور انہوں نے مزمل کو قائل کر لیا تھا کہ وہ احمد اوزال کے پاس نہ جائے..... یہ دونوں شہر کے باہر تک بن عابد اور مزمل کے ساتھ گئے تھے اور انہیں دعاؤں سے رخصت کیا تھا۔

"اللہ تمہیں امان میں رکھے" ــــ ایک نے کہا تھا۔

"اللہ تمہیں کامیاب واپس لائے گا" ــــ دوسرے نے کہا تھا۔

گھوڑے رات کی تاریکی میں تحلیل ہو گئے تو یہ دونوں واپس آگئے۔

"ایک تو ہاتھ آگیا" ــــ ان میں سے ایک نے جو اس خفیہ جماعت کا سردار تھا' اپنے ساتھی سے کہا ــــ "اب جاؤ عمر! اُسے ابھی پکڑ لیں؟"

"احمد اوزال کو؟" ــــ عمر نے پوچھا اور خود ہی جواب دیا ــــ "اس کے متعلق کوئی شک تو رہا نہیں۔ یہ شخص مزمل سارے شک صحیح ثابت کر گیا ہے..... ایک بات بتاؤ شمس! کیا ہم دو آدمی اسے پکڑنے کے لئے کافی ہیں؟"

"کیوں نہیں؟" ــــ شمس نے کہا ــــ "وہ اکیلا رہتا ہے۔ ذرا عقل سے کام لو۔ وہ اپنے اس مہمان مزمل کے لئے پریشان ہو گا کہ وہ کہاں گیا۔ ہم یہ ذہن میں رکھ کر اس کے گھر میں داخل ہو سکیں گے"۔

"رات اسے اپنے گھر باندھ کر رکھیں گے" ــــ عمر نے کہا۔

"اور کل رات اسے یہاں سے لے جائیں گے" ــــ شمس نے کہا ــــ "اور امام کے حوالے کر کے کہیں گے' کہ ایک اور سلجوقی جاسوس آگیا ہے..... امام الموت پہنچ گیا ہے"۔

○

احمد اوزال مزمل آفندی کے متعلق سوچتا' پریشانی کے عالم میں ابھی ابھی سویا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کی آنکھ پہلی دستک پر ہی کھل گئی۔ وہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے ذرا بلند آواز سے کہا ــــ "اللہ کرے مزمل ہو" ــــ اس نے دیا جلایا۔ دیا ہاتھ میں لے کر صحن میں نکلا اور دروازہ کھولا۔ دو آدمی اسے دھکیلتے ہوئے اندر آگئے۔ ایک شمس تھا اور دوسرا عمر۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے خنجر تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ احمد اوزال اکیلا رہتا ہے لیکن انہیں شک تھا کہ یہ شخص سلجوق ہے اور سلطنتِ سلجوق کا جاسوس ہے لیکن مزمل نے ان لوگوں کے شک کی تصدیق کر دی تھی۔

احمد اوزال کے دونوں پہلوؤں کے ساتھ خنجروں کی نوکیں لگی ہوئی تھیں جو اسے چبھ رہی تھیں۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ اس کے ہاتھ میں بڑے سائز کا جلتا ہُوا دیا تھا۔ دیا آدھے سے کچھ زیادہ تیل سے بھرا ہُوا تھا۔

"تم چاہتے کیا ہو؟" ــــ احمد اوزال نے پوچھا۔

"خاموشی سے اندر چلے چلو" ــــ شمس نے کہا ــــ "اندر چل کے بتائیں گے"۔

وہ اسے خنجر کی نوکوں سے دھکیلتے اندر لے گئے۔ شمس نے دروازہ بند کر دیا۔

"تمہارے پاس سونا ضرور ہو گا" ــــ شمس نے کہا ــــ "وہ اور نقدی

ہمارے حوالے کر دو"۔

"کیوں کہو کہ تم ڈاکو ہو" — احمد اوزال نے کہا — "خنجر ہٹاؤ۔ میرے پاس سونے کے تین ٹکڑے اور کچھ نقدی ہے، وہ میں تمہیں دے دیتا ہوں۔ لے لو اور جاؤ"۔

"ہم تمہیں بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے" — شمس نے کہا — "ہمیں دراصل ضرورت تو تمہاری ہے"۔

"مجھے ساتھ لے جا کر کیا کرو گے؟" — احمد اوزال نے پوچھا۔

"کیا فضول باتیں شروع کر دی ہیں شمس؟" — عمر نے کہا — "ختم کر اس سلجوقی جاسوس کو۔ اس کا مال اسباب ہمارا ہی ہے۔ ادھر سے تم خنجر کھاؤ ادھر سے میں دباتا ہوں"۔

"اگر یہ بتا دے کہ خلجان میں اس کے کتنے ساتھی ہیں تو اسے زندہ رہنے دیں گے" — شمس نے کہا — "یہ بھی بتا دے وہ کہاں کہاں رہتے ہیں"۔

احمد اوزال سمجھ گیا کہ یہ حسن بن صباح کے آدمی ہیں اور انہیں پتہ چل گیا ہے کہ وہ جاسوس ہے۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ مزمل آفندی کسی طرح ان کے ہاتھ چڑھ گیا ہے اور اس نے بھانڈہ پھوڑ دیا ہے۔ اسے یہ تو معلوم ہی تھا کہ حسن بن صباح نے جانبازوں کے گروہ بنا رکھے ہیں جو درندوں سے بڑھ کر ہیں، کم نہیں اور ان کے اندر انسانی جذبات ہیں ہی نہیں۔ وہ ان دو آدمیوں سے رحم اور مفاہمت کی توقع رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ قتل کرنا ہی جانتے تھے لیکن ایسے رحم دل نہیں تھے کہ فوراً مار ڈالتے، وہ بڑی ظالمانہ ایذا رسانی سے جان نکالتے تھے۔

احمد بڑی تیزی سے سوچ رہا تھا۔

"اس شہر میں تمہارے ساتھی کہاں کہاں رہتے ہیں؟" — عمر نے پوچھا — "ان کے نام اور گھر فوراً بتا دو۔ ۔ ۔ یہ دیا رکھ دو"۔

احمد اوزال نے دیا اوپر کی طرف سے شمس کے منہ پر مارا اور حیران کن پھرتی سے پہلو بدل کر لات اتنی زور سے عمر کے پیٹ میں ناف کے نیچے ماری کہ عمر کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا اور وہ ناف کے نیچے ہاتھ رکھ کر آگے کو جھک گیا۔

احمد اوزال نے بڑی تیزی سے خنجر اٹھا لیا اور جھکے ہوئے عمر کی پیٹھ میں اتنی زور سے گھونپ دیا کہ خنجر کا صرف دستہ باہر رہ گیا۔ احمد نے فوراً خنجر باہر نکالا۔ دوسرا وار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ عمر گر پڑا تھا۔

احمد اوزال نے دیا شمس کے منہ پر مارا تھا۔ اس سے کمرے میں اندھیرا ہو جانا چاہئے تھا لیکن کمرہ پہلے سے زیادہ روشن ہو گیا تھا کیونکہ دیا خاصا بڑا تھا اور آدھے سے کچھ زیادہ تیل سے بھرا ہوا تھا اور اس کی بتی خاصی موٹی تھی۔ تیل شمس کی آنکھوں میں چلا گیا اور اس کے چہرے سے تیل اس کے کپڑوں پر گرا تھا۔ اس کی ڈیڑھ دو انچ لمبی داڑھی تھی۔ اتنے بڑے شعلے والی جلتی بتی نے اس کی داڑھی کو آگ لگا دی۔ وہاں سے آگ پلک جھپکتے کپڑوں کو لگی۔

شمس کے ہاتھ سے بھی خنجر گر پڑا اور وہ چیخنے لگا۔ احمد اوزال کے ہاتھ میں عمر کا خنجر تھا۔ اس نے شمس کے ایک پہلو میں خنجر گھونپا اور زور سے دوسرے پہلو کی طرف جھٹکا دیا۔ شمس کا پیٹ چاک ہو گیا اور انتڑیاں باہر آ گئیں۔ شمس گرا۔ اس کے کپڑوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔ پیٹ چاک ہوا تو اس کی چیخیں بند ہو گئیں۔ وہ بہت تڑپا اور ختم ہو گیا۔

یہ سارا عمل چند سیکنڈ میں ہو گیا۔

احمد اوزال نے بڑی تیزی سے اپنی قیمتی چیزیں ایک گٹھڑی میں باندھیں۔ تلوار کمر سے باندھی اور شمس کی لاش کو جلتا چھوڑ کر صحن میں نکلا۔ دروازہ بند کر دیا اور زین اٹھا کر اپنے گھوڑے پر کسی۔ گٹھڑی زین کے ساتھ باندھی اور گھوڑے پر سوار ہو کر اپنے دوست کے گھر پہنچا۔ دستک دی۔ دوست باہر آیا تو احمد اوزال نے اسے سارا واقعہ سنایا۔

"میں مرو جا رہا ہوں" — اس نے کہا۔

"فوراً نکلو" — دوست نے کہا — "صبح تک بہت ہی دور نکل جانا"۔

"مزمل آفندی کا کچھ پتہ نہیں چلا" — احمد اوزال نے کہا — "وہ باطنیوں کے قبضے میں آ گیا ہے۔ میری نشاندہی اسی نے کی ہے"۔

"جس نے بھی کی ہے" — دوست نے کہا — "اور جو کچھ بھی ہوا ہے، تم یہاں سے نکلو۔ تم خوش قسمت ہو کہ حسن بن صباح کے دو آدمیوں کو

قتل کر کے جا رہے ہو۔ اس کے جانباز قتل کیا کرتے ہیں قتل ہُوا نہیں کرتے"۔

احمد اوزال خدا حافظ کہہ کر روانہ ہو گیا۔ شہر سے وہ آہستہ آہستہ نکلا۔ کچھ دور جا کر اس نے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

○

امیر الموت مہدی علوی حسن بن صباح اور اس کے تمام آدمیوں کو الموت لے گیا۔ حسن بن صباح کو اس نے اپنے محل کے دو کمرے دیئے جن میں شاہانہ زندگی کی ہر آسائش موجود تھی۔ کمروں میں سجاوٹ ایسی جو صرف بادشاہوں کے ہاں ہی ہوا کرتی تھی۔ حسن بن صباح نے ان کمروں میں ٹھہرنے سے انکار کر دیا۔

"کسی ایک پیغمبر کا نام لو جس نے ایسی شاہانہ رہائش اختیار کی تھی" — حسن بن صباح نے کہا — "کیا ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم بوریا نشین نہیں تھے؟ کیا ہمارے خلفاء راشدین کے بھی ایسے محل ہوتے تھے؟...... نہیں مہدی علوی! میں نبیوں اور پیغمبروں سے بہتر تو نہیں۔ مجھے کٹیا دے دو"۔

"نہیں امام!" — مہدی علوی نے کہا — "آپ کو کٹیا میں بٹھا کر میں خدا کے حضور کیا جواب دوں گا"۔

"میرے اور خدا کے درمیان جو باتیں ہوتی ہیں وہ آپ نہیں جانتے" — حسن بن صباح نے کہا — "میں خدا کے حکم کا پابند ہوں...... ہاں' ایک بات سوچی جا سکتی ہے۔ اگر آپ کو میرا کٹیا میں رہنا پسند نہیں تو سادہ سا کوئی کمرہ دے دیں۔ میری ضرورت یہ ہے کہ سر پر چھت ہو' اور روحانی ضرورت یہ ہے کہ چھت آسمان ہو لیکن یہ آپ کو اچھا نہیں لگتا۔ میں نہیں چاہتا کسی کو میری طرف سے ذرا سی بھی پریشانی ہو"۔

مہدی علوی نے محل سے ہٹ کر ایک مکان حسن بن صباح کے لئے خالی کرا دیا تھا۔ یہ سادہ سا مکان تھا جس میں بہت سے کمرے تھے۔ ایک کمرہ حسن بن صباح کے لئے اور دوسرے کمرے اس کے خاص آدمیوں کے لئے تھے۔ باہر محافظ کھڑے رہتے تھے۔ کسی کو مکان کے قریب بھی جانے کی اجازت نہیں

تھی۔ مہدی علوی جو امیر شہر تھا اور حسن بن صباح کا میزبان بھی تھا' وہ بھی اس مکان تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

اس مکان کے اندر کیا ہوتا تھا' کسی کو معلوم نہیں تھا۔ باہر کے لوگ کہتے تھے کہ امام عبادت میں مگن رہتا ہے اور اس پر وحی نازل ہوتی ہے۔ اس کے عقیدت مندوں کے ہجوم میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔

تاریخ میں آیا ہے کہ احمد بن عطاش اپنے کام اور مطلب کے آدمیوں کو خلجان' شاہ در اور دوسرے شہروں اور علاقوں سے قلعہ الموت میں لا لا کر آباد کر رہا تھا لیکن اس نے اپنے آپ کو پس منظر میں رکھا ہُوا تھا۔ مہدی علوی کو کبھی کبھار ملتا تھا لیکن خلجان اور شاہ در کے قلعہ دار اور امیر شہر کی حیثیت سے' یا حسن بن صباح کے مرید کی حیثیت سے۔

مہدی علوی کو تو پتہ ہی نہیں چل رہا تھا کہ جس شہر کا وہ امیر ہے اس میں ہو کیا رہا ہے۔ حسن بن صباح نے اسے کہا تھا کہ اتنے خوبصورت شہر کے دفاع کا کوئی انتظام نہیں' اس کے لئے فوج کی ضرورت ہے۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ سلجوقیوں کے پاس بڑی ہی مضبوط فوج ہے۔ وہ کسی بھی وقت حملہ کر کے یہ شہر لے لیں گے۔

حسن بن صباح نے مہدی علوی کو پہلی ملاقات میں ہی اپنے اوپر کشف اور مراقبے کی کیفیت طاری کر کے پیش گوئی کی تھی — "دشمن بڑھ رہا ہے۔ گھٹا گہری ہو رہی ہے۔ اگر آپ نے فوج رکھ لی تو یہ گھٹا جس میں بجلیاں چھپی ہوئی ہیں' اڑ جائے گی اور آپ محفوظ رہیں گے۔ فوج تجربہ کار ہونی چاہئے۔ بغیر فوج کے آپ قلعہ گنوا بیٹھیں گے"۔

مہدی علوی یہ پیش گوئی سن کر گھبرا گیا تھا اور اس نے کہا تھا کہ وہ اتنی زیادہ فوج رکھ نہیں سکتا کیونکہ فوج کے اخراجات پورے کرنا اس کے بس کی بات نہیں۔ حسن بن صباح نے اسے کہا تھا کہ وہ فوج کو صرف دو وقت روٹی دے دیا کرے۔ باقی اخراجات حسن بن صباح نے اپنے ذمے لے لئے اور مہدی علوی کے ساتھ تحریری معاہدہ کر لیا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے دو ہزار نفری کی فوج بن گئی۔ یہ تمام فوج حسن بن صباح

کے مریدوں کی تھی جو اس پر جانیں قربان کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اس فوج کے کمانڈر حسن بن صباح کے اپنے تربیت یافتہ آدمی تھے جو نہ کسی سے رحم مانگتے تھے نہ کسی پر رحم کرتے تھے۔

ایک روز حسن بن صباح نے مہدی علوی کو بلایا۔ مہدی علوی دوڑا آیا اور اس نے حسن بن صباح کے آگے باقاعدہ سجدہ کیا۔

"کیا آپ نے اپنی فوج دیکھ لی ہے؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"دیکھ لی ہے یا امام!"

"کیا آپ اپنے اندر کوئی تبدیلی محسوس کر رہے ہیں؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"کر رہا ہوں یا امام!" — مہدی علوی نے جواب دیا — "یہ فوج دیکھ کر میں اپنے آپ کو محفوظ ہی نہیں بلکہ طاقتور سمجھ رہا ہوں۔ کبھی یوں بھی محسوس کرتا ہوں کہ سلجوقی سلطانوں کو یا کسی اور قوم کو للکاروں کہ میرے مقابلے میں آئے"۔

"نہیں امیر شہر!" — حسن بن صباح نے کہا — "یہ رعونت ہے' تکبر ہے۔ ایسا نہ سوچیں...... میں نے آپ کو کچھ اور بتانے کے لئے بلایا ہے۔ گزشتہ رات مجھے اللہ کی طرف سے ایک اشارہ ملا ہے...... الموت میں جنت بنے گی۔ یہاں حوریں اتریں گی' فرشتے اتریں گے اور یہاں ہر لمحہ اللہ کی رحمت برستی رہے گی"۔

مہدی علوی کی باچھیں کھلتی جا رہی تھیں۔ وہ محسوس نہیں کر رہا تھا کہ حسن بن صباح اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بات کرتا ہے اور ایک لمحے کے لئے بھی آنکھیں اِدھر اُدھر نہیں کرتا۔ اس کے علاوہ اس کے بولنے کا انداز اتنا پیارا اور اتنا اثر انگیز ہے کہ اس کے منہ سے نکلا ہُوا ایک ایک لفظ سننے والے کی روح میں اترتا جا رہا ہے۔

یہ تھا ایک ابلیسی وصف جو حسن بن صباح نے اپنے آپ میں پیدا کر لیا تھا۔ اس انداز میں ہپناٹائز کر لینے کی طاقت تھی۔ مہدی علوی ہپناٹائز ہو چکا تھا۔

"میں آپ کو ایک بات اور بتاتا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "ابھی یہ بات بتانی تو نہیں چاہئے تھی لیکن یہ جگہ آپ کی ہے اور یہاں جو کچھ ہے آپ کا ہے...... یہ جو آپ کو بڑی ہی حسین لڑکیاں نظر آتی ہیں' یہ میرے ساتھ آئی ہیں' یہ دراصل حوریں ہیں۔ آسمان کی مخلوق ہیں جو زمین پر بسنے والی عورتوں کے روپ میں میرے پاس آگئی ہیں۔ اگر یہ اس دنیا کی لڑکیاں ہوتیں تو میں انہیں اپنے پاس نہ رکھتا"۔

"یہ خدیجہ اور دوسری لڑکیاں......"

"ہاں ہاں!" — حسن بن صباح نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا — "یہ آسمانی مخلوق ہے لیکن آپ انہیں زمین کی مخلوق سمجھیں۔ ان سے جو خدمت لینا چاہیں' لیں۔ ان کی روحیں میرے قبضے میں ہیں۔ انہیں اپنا سمجھیں"۔

حسن بن صباح کو معلوم تھا کہ اس کی بہت ہی حسین اور فریب کاری کی ماہر جواں سال عورت خدیجہ مہدی علوی پر چھا گئی ہے اور مہدی علوی اسے رات اپنے پاس رکھتا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ دو تین نوجوان لڑکیاں بھی مہدی علوی کے ہوش گم کئے رکھتی ہیں۔ خدیجہ مہدی علوی کو خاص قسم کا شربت بھی پلا رہی تھی اور اس پر دیوانگی طاری کر کے اس سے اپنا دامن بھی بچا رہی تھی۔

"یا امام!" — مہدی علوی نے التجا کے لہجے میں کہا — "ایک عرض ہے۔ اجازت ہو تو......"

"میرے ساتھ بات کرنے کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "اگر کوئی بات میرے خلاف بھی دل میں آئے تو بلا خوف کہو...... اب بتاؤ کیا بات ہے!"

"میں خدیجہ کی بات کرنا چاہتا ہوں" — مہدی علوی نے جھکتے ہوئے کہا۔

"آپ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتے ہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "انسان کے دل کی بات اس کے چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ پڑھنے والی آنکھ چاہئے...... دلوں کی تحریر روح کی آنکھ سے پڑھی جاتی ہے"۔

مہدی علوی جو اچھا خاصا دانشمند اور معزز ہُوا کرتا تھا' حسن بن صباح کی

اس بات پر حیران رہ گیا کہ اس نے اس کے دل کی بات پڑھ لی ہے، حالانکہ یہ بات قابلِ فہم تھی کہ خدیجہ حسن بن صباح کے ساتھ آئی تھی۔ مہدی علوی نے خدیجہ سے کہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اب وہ اتنی سی بات نہ سمجھ سکا کہ خدیجہ نے ہی حسن بن صباح کو یہ بات بتائی ہو گی لیکن مہدی علوی کی اتنی برین واشنگ ہو چکی تھی کہ عام فہم باتیں بھی سمجھنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

داستان گو اگلے باب میں مہدی علوی کی برین واشنگ کا عمل تفصیل سے سنائے گا۔

"ہاں امام!" — مہدی علوی نے کہا — "آپ نے میرے دل کی تحریر پڑھ لی ہے لیکن آپ فرماتے ہیں کہ یہ حوریں ہیں جو زمین کی عورتوں کے روپ میں آئی ہیں"۔

"پھر بھی اس کے ساتھ آپ کی شادی ہو سکتی ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "شرط یہ ہے کہ آپ کو انسانیت کی سطح سے اوپر اٹھنا پڑے گا، اور یہ کوئی مشکل کام نہیں"۔

"کیا مجھے کچھ کرنا پڑے گا؟" — مہدی علوی نے احمقوں کے انداز سے پوچھا۔

"ہاں!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "روح کی سوئی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنا پڑے گا"۔

"وہ کیسے؟"

"مراقبہ..... چلّہ کشی!" — حسن بن صباح نے کہا — "ریاض..... آپ کو تنہائی میں دنیا سے لاتعلق ہو کر میری طرح اللہ کے حضور بیٹھنا پڑے گا..... آپ یہ کام کر لیں گے اور میرے والا مقام حاصل کر لیں گے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ لڑکیاں پروانوں کی طرح میرے اردگرد منڈلاتی رہتی اور میرے آگے بچھ بچھ جاتی ہیں"۔

"کیا آپ میری راہنمائی کریں گے؟" — مہدی علوی نے پوچھا۔

"آپ نے جس پیار اور عقیدت سے مجھے اپنے ہاں مہمان رکھا ہے میں

اس کا صلہ ضرور دوں گا" — حسن بن صباح نے کہا — "میری راہنمائی کے بغیر آپ یہ کام کر ہی نہیں سکتے۔ میں آپ کا ہاتھ تھاموں گا"۔

مہدی علوی ذہنی اور روحانی طور پر حسن بن صباح کی نظر نہ آنے والی الجھنوں میں جکڑا گیا۔ اسے ذرا سا بھی شک نہ ہوا کہ الموت جیسا مضبوط، ناقابلِ تسخیر اور خوبصورت قلعہ ہاتھ سے جا رہا ہے۔ اس کی تو اپنی شخصیت پر، اپنی ذات اور اپنے کردار پر گرفت نہیں رہی تھی، اتنے بڑے قلعے اور اتنے بڑے شہر کو وہ کیسے گرفت میں رکھ سکتا تھا۔

الموت پر حسن بن صباح نے ابھی باقاعدہ قبضہ تو نہیں کیا تھا، امیر شہر اس کے قبضے میں آ گیا تھا۔

○

احمد اوزال چوتھے دن مَرو پہنچ گیا۔ نظام الملک سے ملا اور اسے سنایا کہ مزمل آفندی لاپتہ ہے۔

"آپ نے جذباتی اور اناڑی آدمی کو اتنی خطرناک مہم پر بھیجنا ہی نہیں چاہئے تھا" — احمد اوزال نے کہا — "مجھے یقین ہے کہ وہ حسن بن صباح کے خفیہ گروہ کے ہاتھ چڑھ گیا ہے اور میری نشاندہی اسی نے کی تھی۔ یہ تو اللہ نے میری مدد کی اور میں دو آدمیوں کو مار کر نکل آیا ورنہ میں قتل ہو جاتا"۔

"مزمل کو انہوں نے قتل کر دیا ہو گا" — نظام الملک نے کہا — "تم آرام کرو۔ میں کچھ سوچ لوں"۔

"محترم!" — احمد اوزال نے کہا — "میں آپ کو صاف صاف بتا دوں۔ ہم ان باطنیوں کو جاسوسی اور تخریب کاری کے میدان میں شکست نہیں دے سکتے۔ آپ کے پاس فوج ہے۔ خلجان اور الموت پر حملہ کرنا پڑے گا..... مزمل آفندی کو بھول جائیں۔ اسے وہ لوگ قتل کر چکے ہوں گے"۔

اُس وقت مزمل بن عابد کے ساتھ قلعہ الموت پہنچ گیا تھا۔ بن عابد اسے اُسی مکان میں لے گیا جس کے ایک کمرے میں حسن بن صباح رہتا تھا۔ مزمل کو ایک کمرے میں بٹھا کر بن عابد اُس کمانڈر سے ملا جس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص حسن بن صباح کے کمرے کے قریب سے بھی نہیں گزر سکتا تھا۔ بن عابد

ہے۔ کمانڈر کو بتایا کہ وہ سلجوقیوں کے بھیجے ہوئے ایک آدمی کو لایا ہے۔ یہ آدمی حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہے۔

کمانڈر نے بن عابد سے پورا واقعہ سنا اور اسے حسن بن صباح کے پاس لے گیا۔ بن عابد نے ایک بار پھر پوری بات سنائی کہ اس نے مزمل کو کس طرح پکڑا اور کیا دھوکہ دے کر ساتھ لے آیا ہے۔

حسن بن صباح کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آگئی۔ ان ہونٹوں سے یہی حکم نکلنا تھا — "سر کاٹ دو"۔ — حسن بن صباح قتل سے کم سزا نہیں دیا کرتا تھا لیکن.....

"اسے بند کر دو" — حسن بن صباح نے کہا — "دو دن نہ کھانے کے لئے دو نہ پینے کے لئے، پھر مجھے اطلاع دیں میں اسی شخص کو نظام الملک کے قتل کے لئے تیار کروں گا۔ یہ شخص نظام الملک کو قتل کر کے خوشی محسوس کرے گا"۔

مزمل آفندی

کمرے میں بیٹھا اپنے نئے دوست بن عابد کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اسے اپنا ایک ہم خیال مل گیا تھا۔ بن عابد بھی اسی جذبے سے سرشار تھا جس جذبے نے مزمل آفندی کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ اس کے دماغ پر خون سوار تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ حسن بن صباح کو وہ کس طرح قتل کرے گا۔ اس نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ وہ حسن بن صباح کا سر کاٹ کر اپنے ساتھ لے جائے گا اور سلطان ملک شاہ کو پیش کرے گا، پھر وہ اس سر کو برچھی کی انی میں اڑس کر مرو کے سارے شہر میں اس کی نمائش کرے گا۔

تھوڑی دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا۔ مزمل آفندی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ بن عابد کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ بن عابد نے اسے یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ یہ اسی شخص کا گھر ہے جسے وہ قتل کرنے آیا ہے۔ اس نے دیکھا کہ کمرے میں داخل ہونے والا بن عابد نہیں تھا بلکہ وہ دو اجنبی تھے جنہیں مزمل نے پہلے دیکھا ہی نہیں تھا۔

"کیا تم بن عابد کے ساتھ آئے ہو؟" — ایک آدمی نے مزمل سے پوچھا۔

"ہاں" — مزمل نے جواب دیا — "میں ہی ہوں"۔

"ہمارے ساتھ آؤ" — اس آدمی نے کہا۔

مزمل اٹھا اور ان کی طرف بڑھا۔ دونوں آدمی اسے اپنے درمیان رکھ کر چل پڑے۔

"بن عابد کہاں ہے؟" — مزمل نے پوچھا۔

"وہ یہیں ہے" — مزمل کو جواب ملا — "ہم تمہیں اسی کے پاس لے جا

رہے ہیں؟"۔

وہ چلتے گئے اور شہر کے ایک اور حصے میں جا پہنچے۔ وہ کہیں بھی نہ رُکے۔ شہر ختم ہو رہا تھا۔ مزمل آفندی نے سوچا کہ بن عابد اتنی جلدی کہاں چلا گیا ہے۔

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" — مزمل نے پوچھا — "کیا وہ اتنی جلدی اتنی دُور نکل آیا ہے؟"

"ہم جانتے ہیں میرے دوست!" — ایک آدمی نے کہا — "تم حسن بن صباح کا کام تمام کرنے آئے ہو نا!"

"ہاں بھائی!" — مزمل نے کہا۔

"تو پھر ہم سے کچھ بھی نہ پوچھو" — دوسرے آدمی نے کہا — "ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔ تم وہ کام اکیلے نہیں کر سکتے جو کرنے آئے ہو۔ خاموشی سے ہمارے ساتھ چلتے چلو"۔

وہ اب ایسے علاقے میں سے گزر رہے تھے جہاں بے آب و گیاہ چٹانیں تھیں۔ یہ خطہ سرسبز اور روح پرور تھا لیکن اس کا یہ تھوڑا سا حصہ بالکل خشک، بنجر اور ویران تھا۔ گھاس کی ایک پتی بھی نظر نہیں آتی تھی۔ اگر وہاں کوئی درخت تھا بھی تو وہ بالکل خشک تھا۔

وہ چٹانوں کے اندر چلے گئے۔ چند ایک موڑ کاٹ کر اور چٹانوں کے اندر ہی گھوم پھر کر وہ اس چٹانی سلسلے سے باہر نکلے۔ آگے دیکھا تو کچھ اور ہی منظر تھا۔ سامنے قلعے کی طرح ایک عمارت تھی۔ اس کی دیواریں پتھروں کی تھیں اور پتھر بدرنگ اور سیاہ تھے۔ یہ چھوٹا سا قلعہ ہی معلوم ہوتا تھا۔ دیواریں بہت اونچی تھیں۔ دیواروں کے چاروں کونوں پر لکڑی کے جھونپڑے سے بنے ہوئے تھے۔ یہ برج معلوم ہوتے تھے۔ سامنے والی دیوار کے درمیان ایک بہت بڑا آہنی دروازہ تھا جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ دو آدمی برچھیاں اٹھائے اس دروازے کے باہر یوں کھڑے تھے جیسے پہرہ دے رہے ہوں۔ اس آہنی دروازے کے بالکل اوپر دیوار پر چہروں کا ہی ایک گرد بنا ہوا تھا۔ چہروں کا رنگ ایسا ہو گیا تھا جسے دیکھ کر ڈراؤنی کا تاثر پیدا ہوتا تھا۔ مزمل آفندی کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔ اس نے ان دو آدمیوں سے پوچھا بھی نہیں کہ یہ کیا عمارت ہے۔ اس نے خود ہی سوچ لیا کہ یہ قلعے کے اندر ایک چھوٹا سا

قلعہ ہے۔ یہ شاہی خاندان کے لئے بنایا گیا ہو گا کہ جب کوئی دشمن قلعے کا محاصرہ کرے تو شاہی خاندان اس اندرونی قلعے میں منتقل ہو جاتا ہو گا۔

مزمل آفندی کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ یہ جگہ شاہی خاندان کے لئے نہیں بلکہ یہ الموت کا ہیبت ناک قید خانہ ہے جہاں نہ جانے اُس وقت تک کتنے ہزار لوگوں کے سر کٹ چکے تھے اور کتنے ہی ہزار لوگ اس قید خانے کی کال کوٹھڑیوں میں مر گل سڑ گئے تھے۔

وہ قید خانے کے سیاہ کالے آہنی دروازے پر پہنچ گئے۔ اس دروازے کے ایک کواڑ میں چھوٹا سا ایک اور دروازہ تھا۔ اندر سے ایک آدمی چابیوں کا گچھا اٹھائے ہوئے دوڑا آیا اور اندر سے تالا کھولنے لگا۔

"لے آئے ہو اسے!" — دروازہ کھولنے والے نے کہا — "ہمیں اطلاع مل چکی ہے"۔

دونوں آدمی مزمل آفندی کو چھوٹے دروازے میں سے اندر لے گئے۔ جب اس دروازے پر بڑا سارا تالا لگ گیا، اُس وقت مزمل ذرا سا چونکا اور اُس نے ان دو آدمیوں کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ ان دونوں نے اس کا ایک ایک بازو پکڑ لیا اور اسے اندر لے گئے۔

"کون ہے یہ؟"

مزمل نے پیچھے دیکھا۔ وہ آدمی بھی پیچھے پیچھے آ رہا تھا جس نے چھوٹا دروازہ کھولا اور پھر تالا لگا دیا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں چابیوں کا وہی گچھا تھا جو مزمل نے دروازے میں داخل ہوتے وقت دیکھا تھا۔ اسی نے پوچھا تھا کہ یہ کون ہے۔

"یہ امام کو قتل کرنے آیا ہے" — مزمل کو اندر لانے والے ایک آدمی نے جواب دیا۔

تینوں آدمیوں نے بڑی زور سے قہقہہ لگایا اور وہ کچھ دیر ہنستے ہی رہے۔ مزمل رک گیا۔

"بن عابد کہاں ہے؟" — مزمل نے پوچھا۔

ایک آدمی نے اُس کی گردن پر پیچھے سے ہاتھ رکھا اور اس قدر زور سے دھکا دیا کہ مزمل تین چار قدم آگے جا کر منہ کے بل گرا۔ وہ اٹھا تو دوسرے آدمی نے اسی

طرح اُس کی گردن پر ہاتھ رکھا اور ویسا ہی دھکا دیا۔ مزمل ایک بار پھر منہ کے بل گرا۔ وہ اٹھا تو ایک آدمی نے اسے کندھوں سے پکڑ کر آہستہ آہستہ لٹو کی طرح گھمایا۔

"اچھی طرح دیکھ لو تم کہاں ہو" ــــ اس آدمی نے کہا۔

مزمل نے دیکھا۔ یہ ایک وسیع و عریض جگہ تھی جو بد رنگ پتھروں کی چار بہت ہی اونچی اونچی دیواروں میں گھری ہوئی تھی۔ ایک طرف پتھروں کی بارکیں سی کھڑی تھیں۔ بہت سا حصہ میدانی تھا۔ وہاں قیدی مختلف کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ ہر ایک قیدی کے پاؤں بیڑیوں میں جکڑے ہوئے تھے۔ پہریدار ہاتھوں میں ہنٹر اٹھائے ان کے درمیان گھوم پھر رہے تھے۔ کوئی قیدی ذرا سی بھی سستی کرتا تو پہریدار اُسے دو تین ہنٹر مار کر اُس کی چیخیں نکال دیتا تھا۔ قیدی پورے لباس میں نہیں تھے۔ ناف سے اوپر ان کے جسم ننگے تھے۔ ان کی پسلیاں گنی جا سکتی تھیں۔ ان کے چہرے سوکھ گئے تھے۔ چہروں پر کرب کا تاثر تھا۔ ان قیدیوں کے دو ہی کام تھے۔ ایک جانوروں کی طرح مشقت کرنا اور دوسرا مار کھانا۔ مزمل کے قریب جو قیدی تھے، ان کی پیٹھوں پر لمبے لمبے لال سرخ نشان تھے۔ یہ ہنٹروں اور بیدوں کے نشان تھے۔

مزمل آفندی پر ہول طاری ہو گیا۔ وہ اگر حسن بن صباح کو قتل کر کے اس قید خانے میں آتا تو اُسے ذرا سا بھی افسوس نہ ہوتا۔ وہ تو پہلے ہی پکڑا گیا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اُس کا ساتھی بن عابد بھی پکڑا گیا ہو گا اور اُسے بھی اس قید خانے میں لایا گیا ہو گا یا اُسے لے آئیں گے۔ اُسے تو وہم بھی نہیں ہوا تھا کہ جس پر اُس نے اعتماد کیا اور اُس کا ہم سفر بن کر الموت آیا تھا، اس کا نام بن عابد نہیں تھا۔ اس کا اصل نام کچھ اور تھا۔ بن عابد حسن بن صباح کے خاص گروہ کا آدمی تھا۔

آگے ایک اور اونچا دروازہ آ گیا۔ یہ لکڑی کا دروازہ تھا جس کے آگے تالا لگا ہوا تھا۔ یہ بھی ایک عمارت تھی جس کی دیواریں پتھروں کی بنی ہوئی تھیں۔ چابیوں والے سنتری نے آگے ہو کر دروازہ کھولا۔ مزمل کو دھکیلتے ہوئے اس کے اندر لے گئے۔ آگے سیڑھیاں نیچے اترتی تھیں۔ وہ سیڑھیاں اتر گئے۔ یہ ایک راہداری تھی۔ نیچے جا کر چند قدم آگے گئے تو ایک دیوار آ گئی۔ وہ بائیں کو گھومے۔ کچھ اور آگے جا کر دائیں کو مڑے تو پھر پانچ چھ سیڑھیاں آ گئیں جو نیچے کو اترتی تھیں اور ایک ذرا

فراخ راہداری تھی جس میں یہ لوگ آگے چلے گئے۔ مزمل کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے زمین کی آخری تہہ تک لے جایا جا رہا ہو۔ اسے یاد ہی نہ رہا کہ وہ کتنی بار دائیں یا بائیں مڑ چکا ہے۔ آخر وہ جگہ آ گئی جس کے دونوں طرف آمنے سامنے کوٹھڑیاں تھیں۔

یہ قید خانے کا تاریک تہہ خانہ تھا جسے مشعلوں سے روشن کیا گیا تھا۔ وہاں ایسا تعفن تھا کہ صاف ستھری زندگی بسر کرنے والے مزمل جیسے آدمی کے لئے ناقابل برداشت تھا۔ ایک تو دیواروں کے ساتھ اُڑسی ہوئی مشعلوں کے تیل کی بدبو تھی اور دھواں تھا اور اس بدبو میں ایک تعفن ایسا تھا جیسے اس زمین دوز دنیا میں انسانی لاشیں یا جانوروں کے مردار پڑے گل سڑ رہے ہوں۔ مزمل کو چکر سا آیا اور اس کے قدم رکنے لگے۔ ایک آدمی نے پیچھے سے اس کی کمر میں اتنی زور سے لات ماری کہ وہ چند قدم آگے پتھروں کے فرش پر اوندھے منہ گرا۔ اُس سے تو جیسے اُٹھا ہی نہیں جا رہا تھا۔ اسے گھسیٹ کر اٹھایا گیا اور دھکیل لے گئے۔

وہ دو آدمی جو مزمل کو لائے تھے، قید خانے کے باہر انسانوں کی طرح بولتے اور چلتے تھے لیکن قید خانے میں داخل ہوتے ہی وہ درندے بن گئے۔ مزمل نے دائیں بائیں دیکھا۔ ہر کوٹھڑی کی سلاخوں کی اندر تین چار قیدیوں کو کھڑے دیکھا تو وہ حیران ہوا کہ لاشوں جیسے یہ انسان اپنے پاؤں پر کھڑے کس طرح ہیں۔

مزمل کو ایک اور طرف موڑ کر لے جایا گیا۔ چابیوں والے سنتری نے دوڑ کر ایک کوٹھڑی کا دروازہ کھولا۔ مزمل کو اس کے سامنے کھڑا کر کے یہ نہ کہا گیا کہ اندر چلو بلکہ اسے اس کوٹھڑی میں داخل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ ایک آدمی نے اس کا ایک بازو پکڑا اور دوسرے نے دوسرا بازو پکڑا اور ذرا آگے ہو کر ان دونوں نے اتنی زور سے مزمل کو اندر کی طرف جھٹکا دیا کہ وہ تنگ سی اس کال کوٹھڑی کی دیوار کے ساتھ جا لگا۔ وہ سر دیوار سے ٹکرانے کی وجہ سے چکرا گیا اور گر پڑا۔ جب ذرا سنبھل کر اور اپنے آپ میں آ کر اٹھا تو دروازہ بند ہو چکا تھا اور اسے کال کوٹھڑی میں پھینکنے والے جا چکے تھے۔

مزمل نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور دیکھا، اُس کا ہاتھ خون سے لال ہو گیا تھا۔ اُس نے کرتے کا دامن ماتھے پر رکھا۔ جب ہٹایا تو دامن خون سے تر ہو گیا تھا۔ اُس

کی مرہم پٹی کرنے والا کوئی نہ تھا۔ حسن بن صباح نے کہا تھا کہ اسے دو دن بھوکا اور پیاسا رکھا جائے۔ مزمل کو اس حکم کا علم نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو وہ کیا کر لیتا۔ اُس کے ماتھے سے خون بہہ بہہ کر اس کی آنکھوں کے راستے اس کے گالوں پر آکر اُس کے سامنے قطرہ قطرہ گرتا رہا۔

مزمل آفندی کا دماغ جو ماؤف ہو گیا تھا، آہستہ آہستہ بیدار ہو گیا اور مزمل سوچنے لگا کہ وہ اس کال کوٹھڑی تک کس طرح آن پہنچا ہے۔ اُسے اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا۔ احمد اوزال نے اُسے کہا بھی تھا کہ سلطان ملک شاہ اور نظام الملک حسن بن صباح کے ہاتھوں قتل ہو سکتے ہیں، اسے قتل کرا نہیں سکتے۔ احمد اوزال کی اس بات پر مزمل نے توجہ نہیں دی تھی۔ وہ یہ سمجھتا رہا کہ حسن بن صباح کوئی عام سا فریب کار آدمی ہے جو ادھر اُدھر گھومتا پھرتا بھی ہو گا اور اُسے آسانی سے قتل کیا جا سکے گا۔ مزمل کے جذبے کا یہ عالم تھا کہ وہ حسن بن صباح کے قتل کے لئے اپنی جان قربان کر دینے کا عہد کر کے آیا تھا۔ مزمل جذبات میں الجھ کر جس طرح غلطیاں پہنچا تھا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان ملک شاہ اور اس کے وزیرِ اعظم نظام الملک نے اسے نہیں روکا تھا اور لئے نہیں بتایا تھا کہ حسن بن صباح کوئی معمولی سا آدمی نہیں بلکہ وہ اس علاقے کے لوگوں کے دلوں پر راج کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سلطان اور وزیرِ اعظم کو خود معلوم نہیں تھا کہ حسن بن صباح کیا طاقت حاصل کر چکا ہے۔
مزمل کے لئے اب ہر سوچ محض بیکار تھی۔ اُسے بن علید یاد آیا تو اسے احساس ہوا کہ حسن بن صباح کے یہ لوگ کس قدر عقلمند اور تجربہ کار ہیں کہ بن علید نے اسے پتہ ہی نہیں چلنے دیا تھا کہ وہ حسن بن صباح کے ایک خاص گروہ کا آدمی ہے۔

مزمل آفندی کا خون بہتا رہا۔ اُس کا دماغ سوچ سوچ کر تھک گیا اور وہ دروازے کی سلاخیں پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ پیاس سے مرا جا رہا تھا مگر وہاں اُسے پانی پلانے والا کوئی نہ تھا۔ کوئی ہوتا بھی تو اس نے مزمل کو پانی نہیں دینا تھا۔

○

ولمت کے کھانے کے بعد امیرِ الموت حسن بن صباح کے پاس گیا۔ اُسے اس احترام سے بٹھایا گیا جس احترام کا وہ حقدار تھا اور اسے بتایا گیا کہ امام عبادت میں مصروف ہیں اور کچھ دیر بعد باہر آئیں گے۔ مہدی علوی اُس کے انتظار میں بیٹھ گیا۔

حسن بن صباح جس عبادت میں مصروف تھا، وہ یہ تھی کہ وہ شراب پی رہا تھا اور اس کے ساتھ اس کے زنانہ گروہ کی دو سب سے زیادہ حسین لڑکیاں تھیں۔ اسے اطلاع دے دی گئی کہ امیرِ الموت ملنے آیا ہے۔

خاصا انتظار کرا کر حسن بن صباح اُس کمرے میں آیا جہاں مہدی علوی بیٹھا تھا۔ مہدی علوی اسے اٹھ کر اس طرح ملا کہ اس کے آگے رکوع میں چلا گیا اور اُس کے گھٹنے چھو لئے۔

مہدی علوی کی اہمیت صرف یہ تھی کہ وہ الموت کا امیر تھا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ جنگجو بھی نہیں تھا اور اس نے کوئی لڑائی فتح نہیں کی تھی۔ وہ ولی اللہ بھی نہیں تھا اور وہ صوفی بھی نہیں تھا، عالم دین بھی نہیں تھا۔ وہ قلعے یا کسی بھی شہر کے امراء جیسا ایک امیر تھا۔ وہ عیش و عشرت کا دلدادہ تھا اور اسی کو وہ زندگی سمجھتا تھا۔ اُس میں ہر وہ عیب تھا جو امراء میں ہوتا تھا۔ وہ حسین عورتوں کا شیدائی اور خزانے کا متمنی تھا۔ حسن بن صباح نے اس کی یہ خواہش معلوم کر لی تھی کہ وہ اس کے گروہ کی ایک بڑی ہی خوبصورت اور جوان عورت خدیجہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔

"یا امام!" — مہدی علوی نے حسن بن صباح سے منت سماجت کے لہجے میں کہا — "آپ نے کہا تھا کہ آپ مجھے چلّہ کاٹنے کے سلسلے میں کچھ راہنمائی کریں گے"۔

"آپ اچھے وقت آگئے ہیں" — حسن بن صباح نے کہا — "مجھے گذشتہ رات اشارہ ملا ہے کہ آپ کہاں بیٹھ کر چلّہ کریں گے۔ یہ سوچ لیں کہ چلّہ چالیس دن کرنا پڑے گا۔ آپ ایک جگہ بیٹھے رہیں گے اور چالیس دن وہیں گزارنے ہوں گے"۔

"یا امام!" — مہدی علوی نے کہا — "آپ جو بتائیں گے وہ میں کروں گا"۔

"گذشتہ رات ہی مجھے صاف ایک تصویر نظر آئی ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "کسی بھی وقت میں آپ کو بلاؤں گا۔ آپ نے اُسی وقت جنگل کی طرف میرے ساتھ چلنا ہو گا۔ وہاں اُس جگہ کا اشارہ ملے گا جہاں آپ ایک دائرے میں بیٹھ کر چلّہ کریں گے۔ میں آپ کو بتاؤں گا کہ آپ نے کیا پڑھنا ہے۔ یہ ایک ورد ہو گا

جو آپ چالیس دن کریں گے۔ دن نہیں بلکہ رات کہیں کیونکہ چلہ رات کو ہوگا دن کے وقت آپ سو سکتے ہیں اور آپ نے خیمے کے اندر ہی رہنا ہے"۔

حسن بن صباح نے مہدی علوی میں وہ تمام کمزوریاں بیدار کر کے انہیں اس کی عقل پر غالب کر دیا تھا جن انسانی کمزوریوں نے بادشاہیوں کے تختے الٹے ہیں۔ ان کمزوریوں میں ایک تو خوبصورت عورت ہے' دوسری ایسا خزانہ جو کبھی ختم نہ ہو اور تیسری کمزوری یہ کہ شب و روز عیش و عشرت میں گزریں۔ مہدی علوی اپنے گھر چلا گیا۔

اگلے روز دوپہر کے وقت مہدی علوی کو حسن بن صباح نے یہ پیغام بھیجا کہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر فوراً" آجائے۔

حسن بن صباح تیار ہو کر باہر نکل آیا تھا۔ اس کا گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ اس کے ساتھ اپنے چند ایک آدمی تھے۔

مہدی علوی؛ تھوڑی سی دیر میں گھوڑے پر سوار ہوا اور وہ جنگل کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک جنگل تو وہ تھا جو بہت ہی خوشنما اور سرسبز تھا۔ لوگ وہاں سیر سپاٹے کے لئے جایا کرتے تھے۔ جنگل کا ایک حصہ ایسا تھا جہاں اونچی نیچی چٹانیں تھیں اور وہاں اتنی ہریالی نہیں تھی کہ اس علاقے کو دیکھنے کے قابل سمجھا جاتا۔ حسن بن صباح شہر سے بہت دور اس علاقے میں جا پہنچا۔

"جگہ یہی ہے" ـــــ حسن بن صباح نے کہا ـــــ "لیکن یہ اشارہ ابھی ملنا باقی ہے کہ آپ کا خیمہ کس جگہ لگایا جائے ..... یہ اشارہ ایک کبوتر دے گا۔ ایک کبوتر اڑتا آئے گا وہ درخت پر نہیں بلکہ زمین پر بیٹھے گا۔ جہاں کبوتر زمین پر اترے گا اس جگہ خیمہ لگتا ہے اور آپ وہاں چلہ پورا کریں گے"۔

حسن بن صباح نے اوپر دیکھنا شروع کیا۔ وہ فضا میں ہر طرف دیکھ رہا تھا۔ مہدی علوی اور دوسرے چند ایک جو آدمی تھے وہ بھی آسمان کی طرف دیکھنے لگے۔

"بتا دے اللہ!" ـــــ حسن بن صباح نے آسمان کی طرف منہ کر کے کہا ـــــ "بتا دے اللہ' بتا دے"۔

بہت وقت گزر گیا۔ مہدی علوی تو بہت ہی بے چین تھا۔ اسے کوئی بھی پرندہ اڑتا نظر آتا تو وہ کہہ اٹھتا' وہ رہا کبوتر لیکن وہ کبوتر نہیں ہوتا تھا اور وہ جو پرندہ بھی

ہوتا' آگے نکل جاتا تھا۔

"وہ دیکھئے" ـــــ ایک آدمی نے بلند آواز میں کہا ـــــ "وہ بلاشک و شبہ کبوتر ہے"۔

سب نے دیکھا' وہ کبوتر تھا اور وہ دوسرے پرندوں کی طرح سیدھا نہیں اڑتا جا رہا تھا بلکہ زمین پر اترتا آ رہا تھا۔ آخر وہ ایک جگہ زمین پر اترا اور ایک طرف کو چل پڑا۔ حسن بن صباح گھوڑے سے کود کر اترا۔ مہدی علوی بھی گھوڑے سے اترا۔

حسن بن صباح نے اس جگہ پر جا پاؤں رکھا جہاں پر کبوتر اترا تھا۔

"یہاں خیمہ لگے گا" ـــــ حسن بن صباح نے مہدی علوی سے کہا ـــــ "ابھی اپنے آدمی بھیجو جو یہاں سپاہیوں والا خیمہ گاڑ دیں"۔

○

دو مؤرخوں نے دو مختلف حکایتیں لکھی ہیں کہ حسن بن صباح نے قلعہ الموت پر کس طرح قبضہ کیا تھا لیکن یہ دونوں حکایتیں قابلِ اعتبار نہیں لگتیں۔ داستان گو یہاں ان کا بیان موزوں نہیں سمجھتا۔ تین اور مؤرخوں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے جو بالکل صحیح معلوم ہوتا ہے۔ دھوکا دہی اور فریب کاری میں حسن بن صباح کو غیر معمولی مہارت حاصل تھی۔ یہ تو پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حسن بن صباح اپنے سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کو صرف متاثر ہی نہیں بلکہ بولنے کے انداز سے اور الفاظ کے انتخاب سے ہپناٹائز کر لیا کرتا تھا۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ مہدی علوی کے اندر نفسانی خواہشات ابھر آئی تھیں جو حسن بن صباح نے خاص طور پر ابھاری تھیں۔

قرآنِ پاک میں واضح الفاظ میں اللہ تبارک و تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو بھی مصیبت میرے بندوں پر آتی ہے وہ بندوں کے اپنے اعمال کی وجہ سے آتی ہے۔ مہدی علوی نے اپنے اعمال کو اور اپنی سوچوں کو اپنی نفسانی خواہشات کے تابع کر لیا تھا۔ اب یہ دیکھیں کہ حسن بن صباح نے الموت جیسا قلعہ بند شہر مہدی علوی سے کس طرح خون کا ایک قطرہ بھی بہائے بغیر لے لیا۔

آہستہ آہستہ یہ خبر شہر میں پھیل گئی کہ امیرالموت تارک الدنیا ہو گیا ہے اور اس نے جنگل کے ویران اور اجاڑ حصے میں جا خیمہ لگایا اور وہاں اللہ اللہ کرتا رہتا ہے۔ اس طرف کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ خیمے سے دور دور دو تین آدمی

گھومتے رہتے تھے جو کسی بھی آدمی کو اس طرف جانے نہیں دیتے تھے۔ خیمے کے اندر مہدی علوی کا بستر تھا جو فرش پر بچھایا گیا تھا۔ جہاں کبوتر زمین پر اُترا تھا اُس جگہ ایک مصلّٰی بچھا دیا گیا تھا۔ مہدی علوی سورج غروب ہونے کے کچھ دیر بعد قبلہ رو ہو کر بیٹھ جاتا اور ان الفاظ کا ورد شروع کر دیتا تھا جو اسے حسن بن صباح نے جائے تھے۔ تاریخ میں وہ الفاظ یا وہ وظیفہ نہیں ملتا جو حسن بن صباح نے مہدی علوی کو بتایا تھا۔

حسن بن صباح نے اسے سختی سے کہا تھا کہ پہلے دو دن اور دو راتیں وہ صرف پانی پی سکتا ہے لیکن کچھ کھا نہیں سکتا۔ اس نے مہدی علوی کو کہا تھا کہ وہ اپنی ذات کو اور اپنی ضروریات کو بالکل بھول جائے' اور اگر وہ دو دن کچھ کھائے پیئے بغیر تکلیف کے گزار گیا تو جنگل کے درخت بھی اس کے آگے سجدہ کریں گے اور جنگل میں چلتے اگر شیر بھی اس کے سامنے آجائے گا تو اسے راستہ دے دے گا۔

"تیسرے روز میں خود یہاں آؤں گا" ــــ حسن بن صباح نے اسے کہا تھا ــــ "کچھ دیر اس مصلے پر بیٹھوں گا اور کشف کے ذریعے مراقبے میں جا کے بتاؤں گا کہ یہ چلّہ آپ کو کیا کچھ دے گا"۔

اسے یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ ایک آدمی اس کے خیمے کے باہر حاضری میں موجود رہے گا جو اسے پانی پلاتا رہے گا۔

مہدی علوی کو بتانے والا کوئی نہ تھا کہ وہ کبوتر جو اُڑتا آیا اور زمین پر بیٹھ گیا تھا' وہ خود نہیں آیا تھا۔ اس جگہ کے قریب ہی ایک چٹان تھی۔ حسن بن صباح کا ایک آدمی کبوتر لے کر بہت پہلے اس چٹان کے پیچھے چلا گیا تھا۔ اس نے کبوتر کے پر کھینچ لئے اور اُسے لمبی اُڑان کے قابل چھوڑا ہی نہیں تھا۔ حسن بن صباح مہدی علوی کو ساتھ لے کر وہاں گیا تو ادھر سے اس آدمی کو ایک مخصوص اشارہ ملا۔ اس نے چٹان کے پیچھے سے کبوتر کو زور سے اوپر پھینکا۔ کبوتر زیادہ اُڑنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ جتنا اُڑ سکا اڑا اور زمین کی طرف آنے لگا' حتیٰ کہ وہ اس جگہ زمین پر اُتر آیا۔ حسن بن صباح فوراً" اس جگہ پہنچا اور جہاں کبوتر اترا تھا وہاں پاؤں رکھ دیا۔ مہدی علوی کی توجہ حسن بن صباح کی طرف تھی۔ اس کی عقل پر حسن بن صباح نے پردہ ڈال دیا تھا۔ وہ دیکھ ہی نہ سکا کہ کبوتر کہاں چلا گیا ہے۔ کبوتر اُڑنے کی بجائے چل پڑا تھا اور چلتے چلتے دور نکل گیا تھا۔

مہدی علوی کے خیمے سے تھوڑے سے فاصلے پر ایک اور خیمہ نصب کیا گیا تھا۔ اس میں ایک آدمی رہتا تھا۔ اس نے پانی کا ذخیرہ اپنے پاس رکھ لیا تھا اور اپنے کھانے پینے کا انتظام بھی اس نے وہیں کر لیا تھا۔ اس شخص نے مہدی علوی کی دیکھ بھال اور خدمت کرنی تھی۔

دن کے وقت جب بھی مہدی علوی اس سے پانی مانگتا وہ اسے پانی پلا دیتا۔ شام کے بعد جب مہدی علوی مصلے پر ورد شروع کرتا تو حسن بن صباح کا یہ آدمی اسے پانی ضرور پلاتا تھا۔ اس پانی میں تھوڑی سی مقدار میں حشیش ڈال دی جاتی تھی۔ حسن بن صباح نے اپنے اس آدمی سے کہہ رکھا تھا کہ وہ دوسرے تیسرے روز حشیش کی مقدار میں اضافہ کرتا جائے۔

یہ تو ایک نشہ تھا جو مہدی علوی کو دھوکے میں آہستہ آہستہ پلایا جا رہا تھا۔ دوسرا نشہ حسن بن صباح نے اُس پر پہلے ہی طاری کر رکھا تھا۔ اس نشے میں بھی اس نے آہستہ آہستہ اضافہ کرنا تھا۔ دو دن گزر گئے تو حسن بن صباح نے اسے کہا تھا کہ اب وہ اونٹنی کا دودھ پی سکتا ہے لیکن کھا کچھ نہیں سکتا۔ مہدی علوی کو یہ اجازت تھی کہ دن کے وقت وہ قریبی ندی میں جا کر نہا سکتا ہے اور دیگر قدرتی حاجات سے فراغت حاصل کر سکتا ہے۔

چلّے کا ساتواں دن تھا۔ حسن بن صباح نے اسے پیغام بھیجا کہ آج رات تقریباً" نصف شب قریب سے اسے اُلو کی آواز آئے گی۔ وہ اس آواز پر مصلے سے اٹھے اور مصلے کے نیچے عین درمیان سے زمین کھودے۔ حسن بن صباح نے پیغام میں کہا تھا کہ اسے معلوم نہیں کہ زمین میں سے کیا برآمد ہو گا۔ وہ اللہ کی طرف سے کوئی تحریری پیغام بھی ہو سکتا ہے اور کوئی اور چیز بھی ہو سکتی ہے۔ وہ جو کچھ بھی برآمد ہو نکال کر اس جگہ مٹی ڈال دے۔ یہ خیال رکھے کہ اردگرد زیادہ زمین نہ کھودے۔

رات آدھی گزر گئی تھی۔ مہدی علوی مصلے پر بیٹھا چلّہ کر رہا تھا۔ اسے اُلو کی آواز سنائی دی جو قریب ہی سے آئی تھی۔ مہدی علوی فوراً" اٹھا۔ اس کے لئے جو خادم چھوڑا گیا تھا وہ بھی اُلو کی آواز سن کر دوڑا آیا۔ اسے بھی بتا دیا گیا تھا کہ آج رات کیا ہونے والا ہے۔ مہدی علوی نے فوراً" مصلّٰی ہٹایا۔ خادم نے آکر مصلے کے درمیان کی جگہ سے زمین تھوڑی سی کھودی اور ہاتھ ڈالا تو اُسے کوئی چیز محسوس

ہوئی۔ اُس نے مہدی علوی سے کہا کہ وہ خود یہ چیز نکالے' کہیں ایسا نہ ہو کہ اُس کا یعنی خادم کا ناپاک ہاتھ لگ جائے تو غیب سے آئی ہوئی یہ چیز غیب کو ہی واپس چلی جائے۔

مہدی علوی نے چھوٹے سے اس گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو اُس کے ہاتھ ایک چیز آئی جو اس نے باہر نکال لی۔ مشعل کی روشنی میں یہ چیز چمکی تو مہدی علوی پر کوئی اور ہی تاثر طاری ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ کیا ہے۔ یہ سونے کا ایک چوکور ٹکڑا تھا۔ مہدی علوی نے اس ٹکڑے کو ہتھیلی پر رکھ کر اس کے وزن کا اندازہ کیا۔ یہ ایک پاؤ سے کچھ زیادہ وزنی تھا۔ اس نے گڑھے میں پھر ہاتھ ڈالا تو ایسے ہی دو ٹکڑے اور نکلے۔ حسن بن صباح کی ہدایت کے مطابق گڑھا اس سے گہرا یا چوڑا نہیں کھودنا تھا۔ اُس زمانے میں ان ٹکڑوں کو سونے کی اینٹیں کہا جاتا تھا۔ حسن بن صباح کی ہدایت کے مطابق یہ گڑھا بھر دیا گیا اور اس پر پھر مہدی علوی نے مصلے بچھا لیا اور خادم سے کہا کہ وہ علی الصبح یہ تینوں ٹکڑے امام کی خدمت میں پیش کر دے۔ مہدی علوی کی ذہنی حالت کچھ اور ہی ہو گئی تھی۔ وہ یوں مسرت و شادمانی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ اس حسین اور دلنشیں پگڈنڈی پر جا رہا ہو جو ذرا ہی آگے جا کر جنت میں جا نکلے گی اور اُسے اسی دنیا میں ابدی زندگی حاصل ہو جائے گی۔

فردوسِ بریں سے نکالے ہوئے آدم کو ابلیس جنتِ ارضی میں داخل کر رہا تھا۔ اس جنت کی کوئی حقیقت نہیں تھی' اگر کچھ حقیقت تھی تو وہ تصوراتی تھی۔ انسان جب نفسانی خواہشات کے چنگل میں آجاتا ہے تو اس کے تصورات اس قدر دلفریب ہو جاتے ہیں کہ وہ حقیقی زندگی سے ناطہ توڑ کر تصوراتی دنیا کو حقیقی سمجھنے لگتا ہے۔ یہ کیفیت مہدی علوی پر طاری ہو چکی تھی۔ اسے یہ جاننے والا کوئی نہ تھا کہ رات کو جو اُلو بولا تھا وہ اُلو نہیں بلکہ اس کا خادم تھا جس نے خیمے سے ذرا پرے جا کر اُلو کی آواز نکالی تھی اور یوں دوڑا آیا تھا جیسے اُلو کی آواز پر اس کی آنکھ کھلی ہو اور وہ مہدی علوی کے پاس پہنچ گیا ہو۔

اُس وقت اس علاقے میں کوئی اُلو نہیں تھا اگر کوئی اُلو تھا تو وہ مہدی علوی تھا۔ مہدی علوی کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ سونے کے یہ ٹکڑے غیب سے نہیں آئے تھے بلکہ یہ حسن بن صباح کی طرف سے آئے تھے۔ صبح جب مہدی علوی ندی پر گیا

تھا اُس وقت خادم نے مصلے کے نیچے چھوٹا سا گڑھا کھودا اور سونے کے یہ تین ٹکڑے رکھ کر اوپر مٹی ڈال دی تھی اور پھر اس پر مصلے بچھا دیا تھا۔ خادم کو معلوم تھا کہ مہدی علوی کو یہ شک نہیں ہو گا کہ یہاں پہلے ہی گڑھا کھودا گیا تھا۔ خادم نے ہی اُس گڑھے کو کھودنا تھا۔ دھوکا دہی کا یہ کام مشکل نہ تھا۔

○

اگلی صبح مہدی علوی کا خادم جو حسن بن صباح کا خاص آدمی تھا' سونے کے ٹکڑے لے کر شہر آیا اور حسن بن صباح سے ملا۔

"لو امام!" ــــ اس نے کہا ــــ "یہ کام بھی ہو گیا ہے۔ یہ لیں اپنی سونے کی اینٹیں"۔

حسن بن صباح کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"اس شخص کا چلہ کامیاب رہے گا" ــــ حسن بن صباح نے ہلکی سی ہنسی سے کہا ــــ "وہ چلہ کشی ختم کرے گا تو اُس کا یہ شہرالموت ہمارا ہو گا..... تم جاؤ' اُس کے پاس چلے جاؤ اور کل سے اگلا عمل شروع کر دینا"۔

الموت شہر میں ایک بڑی مسجد تھی۔ شہر کے لوگ جمعہ اور عیدین کی نمازیں اس مسجد میں پڑھا کرتے تھے۔ اس مسجد کا خطیب ایک عالمِ دین امام شاہی تھا۔ تاریخ میں اس کا پورا نام نہیں ملتا سوائے اس کے کہ وہ دُور دُور تک امام شاہی کے نام سے مشہور ہو گیا تھا۔ وہ کئی برسوں سے حج کے لئے گیا تھا پھر خانہ کعبہ کا ہی ہو کے رہ گیا۔ لوگ اسے بھول تو نہیں سکتے تھے لیکن وہ یہی سمجھ بیٹھے تھے کہ وہ امام شاہی جیسے عالمِ دین سے محروم ہو گئے ہیں۔ مسجد میں ایک اور خطیب موجود تھا لیکن اس میں وہ بات اور وہ عظمت نہیں تھی جو ضعیف العمر شاہی میں تھی۔ جس رات مہدی علوی کو سونے کی تین اینٹیں مصلے کے نیچے سے ملیں' اُس رات اچانک امام شاہی آگیا۔ لوگ فجر کی نماز کے لئے مسجد میں گئے تو امام شاہی کو دیکھ کر انہیں خوشگوار دھچکا لگا۔ لوگ تو اُسے پیر و مرشد کی طرح مانتے تھے۔ لوگوں نے اُس کے ہاتھ چومے' اس کے آگے صرف سجدہ ریز نہ ہوئے' باقی کسر انہوں نے چھوڑی کوئی نہیں تھی۔ شہر بھر میں خوشی منائی گئی کہ شہر کا محبوب امام اور خطیب واپس آگیا ہے۔

لوگ امام شاہی کو دیکھ کر تو خوش ہو گئے لیکن امام شاہی لوگوں کو دیکھ کر خوش نہ

ہوا۔ اُس نے پہلی بات یہ دیکھی فجر کی نماز کے وقت اُن تعداد کے آدھے نمازی بھی نہیں تھے جو پہلے ہُوا کرتے تھے، نماز کے بعد جب لوگ اسے مل رہے تھے، اُس نے شہر کے دو معمر بزرگوں سے پوچھا کہ نمازی کہاں کھو گئے؟ اسے جو جواب ملا اُس جواب نے اُسے پریشان کر دیا۔ ابھی اسے تفصیلات معلوم نہیں ہوئی تھیں۔ صرف یہ پتہ چلا کہ ایک اور امام شہر میں آگیا ہے جو مسجد میں تو کبھی نہیں آیا لیکن اپنے گھر میں' سنا ہے' ہر وقت عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ امام شامی کو یہ بھی بتایا گیا کہ لوگ اسے صرف امام یا ولی اللہ ہی نہیں بلکہ نبی تک تسلیم کرنے پر آگئے ہیں۔

امام شامی چپ رہا۔ اُس نے کسی سے کوئی سوال نہ کیا، نہ کسی سے کوئی تفتیش کی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ امیرِ شہر مہدی علوی کے پاس جائے گا اور اس سے پوچھے گا کہ شہر میں کیا انقلاب آگیا ہے اور یہ کون سا امام ہے جو مسجد کی بجائے اپنے گھر اکیلا ہی عبادت کرتا ہے۔

مہدی علوی عبادت گزار یا زاہد اور پارسا تھا یا نہیں' یہ ایک الگ بات ہے' وہ امام شامی کا مرید تھا اور دل و جان سے اس کی قدر کرتا تھا۔ قدر بھی اس حد تک کہ انتظامی امور میں امام شامی سے مشورے لیا کرتا اور آخری بات امام شامی کی ہی چلتی تھی۔

نماز سے اور ملاقاتوں سے فارغ ہو کر امام شامی مہدی علوی کے گھر چلا گیا۔ مہدی علوی کی دو بیویاں تھیں' دو بیٹے اور تین چار بیٹیاں تھیں۔ یہ اولاد ابھی لڑکپن میں اور کچھ بچپن میں تھی' ان میں کوئی بھی جوان نہیں تھا۔ اس گھر میں امام شامی کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ اُسے دیکھ کر مہدی علوی کی دونوں بیویاں دوڑی آئیں اور اُس کے آگے جھک کر سلام کیا۔ اُس نے پوچھا کہ امیرِ شہر کہاں ہے۔ جواب میں دونوں بیویاں خاموش رہیں اور ان کے چہروں پر اداسی کا تاثر آگیا۔

"کیوں؟" ــــ امام شامی نے پوچھا ــــ "کیا بات ہے؟"

بیویوں نے امام شامی کو اندر بٹھایا اور وہیں بیٹھ گئیں۔

"امیرِ شہر تارک الدنیا ہو کر جنگل میں چلّہ کشی کر رہے ہیں" ــــ بڑی بیوی نے کہا ــــ "سات روز گزر گئے ہیں۔ سنا ہے چالیس روز پورے کرنے پڑیں گے"۔

"اس راستے پر اسے کس نے ڈالا ہے؟" ــــ امام شامی نے پوچھا۔

"شہر میں ایک امام آیا بیٹھا ہے" ــــ بڑی بیوی نے کہا ــــ "لوگ اس کے مرید ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ چند ایک اتنی حسین اور نوجوان لڑکیاں ہیں جنہیں دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ اس زمین کی پیداوار ہیں' وہ جنت کی حوریں لگتی ہیں"۔

"اور محترم امام!" ــــ چھوٹی بیوی نے کہا ــــ "ہمارے امیرِ شہر بھی اس کے مرید بن گئے ہیں۔ یہ کوئی راز کی بات نہیں کہ ان پر ان حوروں جیسی لڑکیوں کا جادو چل گیا ہے۔ گھر میں انہوں نے ایسی باتیں کی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تو خدا کو بھی بھول گئے ہیں اور اس نئے امام کو اپنا امام نہیں بلکہ پیغمبر تسلیم کر لیا ہے جس کا نام حسن بن صباح ہے۔ اسی امام نے امیرِ شہر کو چلّہ کشی کے راستے پر ڈالا ہے"۔

"حسن بن صباح؟" ــــ امام شامی نے چونک کر کہا ــــ "وہ یہاں پہنچ گیا ہے؟ اس کی شہرت تو وہاں خلافۂ بغداد تک پہنچ چکی ہے۔ اس شخص کا نام مدینہ میں سنا تھا لیکن سنانے والے نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ شخص کوئی برگزیدہ شخصیت ہے' بلکہ اس نے کہا تھا کہ ابلیس ایک بار پھر دنیا میں انسان کے روپ میں آگیا ہے۔ ایک آدمی ایسا بھی ملا تھا جس نے حسن بن صباح کو برگزیدہ شخصیت کہا تھا۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ جس آدمی نے مہدی علوی جیسے دانشمند آدمی کو چلّہ کشی پر لگا دیا ہے وہ اللہ کا برگزیدہ بندہ نہیں ہو سکتا۔ اسلام نے عبادت کا حکم دیا ہے' چلّہ کشی کا نہیں۔ چلّہ کشی دنیاوی مقاصد اور اپنی دنیاوی خواہشات کی تکمیل کے لئے کی جاتی ہے"۔

"امیرِ شہر عقلمند یا پرہیزگار تھے یا نہیں" ــــ بڑی بیوی نے کہا ــــ "حسن بن صباح نے انہیں چلّہ کشی جیسی گمراہی میں ڈال دیا ہے"۔

"نہیں!" ــــ امام شامی نے کہا ــــ "انہیں حسن بن صباح نے نہیں بلکہ اپنے نفس نے اس گمراہی میں ڈالا ہے۔ انسان جب اپنی خواہشات کا غلام ہو جاتا ہے تو وہ ایسے ہی جھوٹے سہارے تلاش کرتا ہے..... بہرحال میں وہاں جاؤں گا اور امیرِ شہر کو واپس لانے کی کوشش کروں گا"۔

"آپ وہاں نہ جائیں" ــــ بڑی بیوی نے کہا ــــ "وہاں پہرے لگے ہوئے ہیں۔ امیرِ شہر نے بھی حکم جاری کیا ہے کہ کوئی بھی اس علاقے کی طرف نہ جائے جہاں وہ چلّہ کشی کر رہے ہیں۔ اس حکم میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ کوئی آدمی اُدھر جائے

دیکھا گیا تو اسے دُور سے تیر مار دیا جائے گا"۔

"امیرِ شہر گھر میں ایک دو خوبصورت اور نوجوان لڑکیاں لانا چاہتے ہیں" ۔۔۔ چھوٹی بیوی نے کہا ۔۔۔ "یہ تو کوئی معیوب بات نہیں۔ وہ دو بیویاں اور لا سکتے ہیں۔ ہم دونوں ان کا استقبال کریں گی لیکن امیرِ شہر اس نئے امام کے فریب میں آ گئے ہیں۔ کیا امیرِ شہر کے لئے خوبصورت اور نوجوان لڑکیوں کی کمی ہے؟"

اُس دَور میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ امراء کے گھروں میں دو دو، تین تین اور بعض کے ہاں چار بیویاں بھی ہوتی تھیں۔ چونکہ یہ ایک رواج تھا اس لئے بیویاں آپس میں لڑتی نہیں تھیں نہ ان میں سوکنوں والی رقابت ہوتی تھی۔ یہاں تک بھی ہوتا تھا کہ کوئی بیوی اپنے طور پر اپنے خاوند کے لئے کوئی خوبصورت لڑکی لے آتی اور اسے اپنے خاوند کے ساتھ بیاہ دیتی تھی۔

"محترم امام!" ۔۔۔ بڑی بیوی نے کہا ۔۔۔ "ہمارے شوہر کو واپس لے آئیں۔ ہمیں خزانے نہیں چاہئیں۔ ہمیں اپنے شوہر کی ضرورت ہے"۔

"میں اس نئے امام حسن بن صباح سے ملوں گا" ۔۔۔ امام شامی نے کہا ۔۔۔ "پہلے تو یہ دیکھوں گا کہ یہ شخص ہے کیا اور یہ کرتا کیا ہے۔ میں نے یہ دیکھنا ہے کہ اس شخص کے پاس کوئی علم ہے بھی یا نہیں"۔

مہدی علوی کے گھر سے اٹھ کر امام شامی حسن بن صباح کے ہاں چلا گیا۔ حسن بن صباح کے ایک آدمی نے اندر اطلاع دی کہ امام شامی آئے ہیں۔ یہ کہنے کی بجائے کہ امام شامی کو اندر بھیج دو، وہ اٹھا اور دوڑتا ہوا اُس کمرے میں گیا جہاں امام شامی کو بٹھایا گیا تھا۔ وہ امام شامی کے سامنے فرش پر دو زانو ہو کر بیٹھ گیا، اُس کے پاؤں چھوئے پھر گھٹنے چھوئے پھر اپنا سر امام شامی کے گھٹنوں پر رکھ دیا۔ امام شامی نے اُس کا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اوپر کیا اور اسے کہا کہ وہ ان کے پاس بیٹھ جائے۔

"نہیں امام!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے رندھی ہوئی آواز میں کہا ۔۔۔ "میں اس قابل نہیں کہ آپ جیسے عظیم امام اور خطیب کی برابری میں بیٹھوں۔ میں اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ آج آپ کے قدموں میں بیٹھنے کی سعادت نصیب ہوئی ہے۔ میں نے آپ کی شہرت برسوں پہلے سنی تھی اور ملتا ہی چلا آ رہا ہوں۔

یہاں آ کر پتہ چلا کہ آپ تو کئی برسوں سے خانہ کعبہ میں بیٹھ کر عبادت کر رہے ہیں۔ میں علم کی تلاش میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔ یہاں آیا تو کچھ لوگوں نے بتایا کہ امام شامی واپس آ جائیں تو تم یوں سمجھو کہ علم و فضل کا چشمہ پھوٹ پڑا ہے۔ آپ مجھے اپنے قدموں میں بٹھا لیں اور میری تشنگی کی تسکین کریں"۔

"میں نے تو کچھ اور سنا ہے" ۔۔۔ امام شامی نے کہا ۔۔۔ "میں نے سنا ہے کہ تم امام کہلاتے ہو اور کچھ لوگوں نے تمہیں نبی بھی کہنا شروع کر دیا ہے"۔

"یہ ان لوگوں کی سادگی ہے، بھول ہے" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "میں نے تو امامت کا بھی دعویٰ نہیں کیا، آپ کہہ رہے ہیں کہ کچھ لوگ مجھے نبی ماننے ہیں۔ میں ان لوگوں کو کئی بار کہہ چکا ہوں کہ میں اگر دن رات عبادت میں لگا رہتا ہوں تو یہ میری اپنی ذات کے لئے ہے۔ میں کسی کی قسمت تبدیل نہیں کر سکتا۔ یہ وہی بات ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی کہ سزا اور جزا کا انحصار تمہارے اپنے اعمال پر ہے۔ ہر انسان دنیا سے ہی اپنی جنت اور اپنا جہنم لے کر جاتا ہے"۔

"یہ تو تم ٹھیک کہتے ہو" ۔۔۔ امام شامی نے کہا ۔۔۔ "لیکن یہ چلہ کشی دینِ اسلام میں تم کہاں سے لے آئے ہو؟"

"میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا اشارہ امیرِ شہر مہدی علوی کی طرف ہے" ۔۔۔ حسن بن صباح نے کہا ۔۔۔ "انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ وہ چلہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے انہیں روکا تھا لیکن وہ اسے عبادت کے رنگ میں لیتے ہیں۔ میں نے انہیں بہت کچھ سمجھایا تھا لیکن حقیقت یہ ہے محترم امام! امیرِ شہر اپنے نفس کے غلام ہو گئے ہیں۔ میں نے سوچا کہ انہیں چلہ کرنے دوں لیکن میرے ذہن میں عبادت تھی۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ چالیس روز جنگل میں جا بیٹھیں اور یوں عبادت کریں کہ اس دنیا سے تعلق توڑ دیں۔ اس سے میرا مطلب یہ تھا کہ دنیا سے لاتعلق ہو کر جب یہ عبادت کریں گے تو چالیس دنوں بعد یہ دنیا کو بھولے ہوئے ہوں گے"۔

امام شامی عالمِ دین تھے اور معمر بھی تھے۔ ان کی عمر کا اندازہ اس سے ہوتا تھا کہ ان کے سر اور داڑھی کا کوئی ایک بھی بال سیاہ نہیں رہا تھا۔ ان کی آنکھوں کا نور بھی ختم ہو چکا تھا پھر بھی اُن کی آنکھوں میں ایک چمک تھی جو علم و دانش اور روح کا نور

تھا۔ انہوں نے کتابیں بھی پڑھی تھیں، دنیا کے اچھے برے انسانوں کو بھی پڑھا تھا لیکن حسن بن صباح وہ انسان تھا جس کا ذکر کسی کتاب میں نہیں ملتا تھا نہ انہوں نے ایسا انسان پہلے کبھی دیکھا تھا۔ وہ جب باتیں کر رہا تھا تو امام شامی نے صاف طور پر محسوس کیا کہ یہ شخص عام انسانوں کی سطح سے یا تو بالا ہے یا بہت ہی پست، بہرحال حسن بن صباح کو انہوں نے سمجھنے میں دشواری محسوس کی۔

"میں امیر شہر کے پاس جاؤں گا" — امام شامی نے کہا — "میں اُسے واپس حقیقی دنیا میں لے آؤں گا"۔

"ہاں امام محترم!" — حسن بن صباح نے کہا — "اگر آپ انہیں نہ لے آئیں تو میں سمجھوں گا کہ آپ نے ان پر نہیں، مجھ پر احسان کیا ہے۔ جو بات میں انہیں سمجھانا چاہتا تھا، ہو سکتا ہے وہ آپ کی زبان سے سمجھ جائیں"۔

اگر حسن بن صباح امام شامی کے ساتھ اس مسئلے پر بحث میں الجھ جاتا تو امام شامی کا رویّہ اور ان کا استدلال کچھ اور ہوتا لیکن حسن بن صباح نے ایسی فریب کاری کا انداز اختیار کر لیا تھا کہ امام شامی نے کچھ بھی کہنا مناسب نہ سمجھا تھا نہ وہ اس شخص کی اصل نیت کو سمجھ سکے۔ وہ اٹھے اور کچھ کہے بغیر وہاں سے آ گئے۔ ان کے باہر نکلتے ہی حسن بن صباح اپنے کمرے میں چلا گیا اور اس نے اپنے تین بڑے ہی خاص آدمیوں کو بلایا اور انہیں کچھ ہدایات دینے لگا۔

○

اُس روز ظہر کی نماز کے وقت مسجد میں نمازیوں کی تعداد بہت ہی زیادہ تھی کیونکہ سب کو معلوم ہو گیا تھا کہ ان کے محبوب امام اور خطیب امام شامی آ گئے ہیں۔ انہوں نے امام شامی کے پیچھے نماز پڑھی لیکن عصر کی نماز کے وقت امام مسجد میں نہ آیا۔ مغرب کی نماز کے وقت بھی امام شامی غیر حاضر تھے اور عشاء کی نماز کے وقت بھی لوگوں کا محبوب امام لاپتہ تھا۔ ان کے گھر سے پتہ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ وہ عصر کی نماز کے بعد کہیں چلے گئے تھے۔ ایک معمہ تھا جو حل نہ ہو سکا۔ کوئی بھی نہ تھا جو یہ بتاتا کہ امام شامی کہاں چلا گیا ہے۔ دو یا تین آدمیوں نے بتایا کہ امام کو شہر سے باہر جاتے دیکھا گیا تھا۔ رات کو انہیں کہاں تلاش کیا جاتا، لوگ صبح کا انتظار کرنے لگے۔

فجر کی نماز کے وقت بھی امام شامی نہ آئے لیکن نماز کا وقت گزر گیا تو شہر میں ایک سنسنی خیز خبر پھیل گئی جو یہ تھی کہ ایک آدمی شہر کے باہر سے آ رہا تھا تو اس نے ویرانے میں ایک درخت کے تنے کے ساتھ کسی کا کٹا ہوا سر لٹکتا دیکھا۔ اُس نے اچھی طرح دیکھا تو اس پر سکتہ طاری ہو گیا۔ یہ سر امام شامی کا تھا جو بڑی صفائی سے جسم سے کاٹا گیا تھا۔ لوگ حیران اس پر ہوئے کہ امام شامی کے ساتھ کسی کی کیا دشمنی ہو سکتی تھی کہ انہیں اس بیدردی سے قتل کیا گیا ہے۔

یہ خبر حسن بن صباح کو پہنچائی گئی۔ وہ دوڑتا باہر نکلا۔ لوگوں میں خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ حسن بن صباح نے گھوڑا منگوایا اور اس پر سوار ہو کر اُس طرف چل پڑا جدھر بتایا گیا تھا کہ امام شامی کا سر درخت کے ساتھ لٹکتا دیکھا گیا ہے۔ شہر کے لوگ ہجوم کر کے اس کے ساتھ دوڑے جا رہے تھے۔

حسن بن صباح اُس درخت تک پہنچا جہاں ابھی تک امام شامی کا سر لٹک رہا تھا۔ اُس نے سر دیکھا۔ یہ درخت کے ایک تنے کے ساتھ بالوں سے بندھا ہوا تھا۔ امام شامی کے بال شانوں تک لمبے تھے۔

"یہ دیکھو ایک بازو!" — کسی آدمی کی بڑی ہی بلند اور گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

لوگ اُس طرف دیکھنے لگے اور پھر سب اُس طرف دوڑ پڑے۔ حسن بن صباح بھی اُس طرف گیا اور گھوڑے سے اُتر کر بازو دیکھا جو کندھے سے کاٹا گیا تھا۔

"سب لوگ اِدھر اُدھر پھیل جاؤ" — حسن بن صباح نے اعلان کیا — "امام کے جسم کے کچھ اور ٹکڑے ملیں گے۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ ان کا قاتل کون ہے۔ وہ انسان نہیں، کسی اور دنیا کی مخلوق ہے جو یقیناً جنات میں سے ہو گی"۔

لوگ اِدھر اُدھر بکھر گئے اور تلاش کرنے لگے۔ تھوڑی سی تلاش کے بعد آوازیں آنے لگیں — "یہ ایک ٹانگ پڑی ہے" — پھر کچھ دور سے آواز آئی — "یہ ایک بازو پڑا ہے" — اس طرح آوازیں آتی رہیں اور امام شامی کے کٹے ہوئے اعضاء مل گئے۔ بازو الگ اور ٹانگیں الگ پھینک دی گئی تھیں۔

سعدی علوی رات بھر ٹیلے میں بیٹھا رہا تھا اور صبح طلوع ہوتے ہی وہ سو گیا تھا۔ اُس کا خیمہ وہاں سے کچھ دور تھا اور چٹانوں کی اوٹ میں تھا۔ اُسے پتہ ہی نہ چلا کہ

امام شاہی قتل ہو چکا ہے اور اس کے جسم کے کٹے ہوئے اعضا اکٹھے کئے جا چکے ہیں۔ لوگوں پر خوف و ہراس طاری ہو گیا تھا اور حسن بن صباح کے ارد گرد اکٹھے ہو گئے اور اس سے پوچھنے لگے کہ یہ حادثہ کس طرح ہوا ہے۔ حسن بن صباح پہلے بتا چکا تھا کہ امام شاہی کے قاتل جنات ہیں۔ اب اس نے دیکھا کہ لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے ہیں تو اس نے لوگوں کو اصل صورتِ حال سے آگاہ کیا۔

"لوگو! ہوش میں آؤ اور میری بات غور سے سنو" — حسن بن صباح نے گھوڑے پر سوار ہو کر بڑی ہی بلند آواز میں کہا — "تم سب جانتے ہو کہ امیرِ شہر یہاں سے تھوڑی دور آگے چلہ کشی کر رہے ہیں۔ تمام شہر میں یہ اعلان کرا دیا گیا تھا کہ کوئی شخص اس طرف نہ آئے۔ لوگوں کو روکنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ امیرِ شہر کی چلہ کشی میں خلل نہ پڑے اور اصل وجہ یہ تھی کہ وہ ایسا چلہ کر رہے ہیں کہ بہت سے جنات اس علاقے میں آ گئے ہیں۔ امیرِ شہر جو وظیفہ پڑھتے ہیں اس میں ایسا اثر ہے جو جنات کو متاثر کر لیتا ہے اور وہ وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ اگر کوئی آدمی اس خیال سے ادھر آئے کہ امیرِ شہر کو چلہ کشی کی حالت میں دیکھے تو جنات اسے روکتے ہیں، اور اگر وہ نہ رکے تو اس کا وہی حال کر دیتے ہیں جو تم لوگوں نے اپنے امام کا دیکھا ہے۔ اسی لئے میں نے انتظام کر دیا تھا کہ یہاں دور دور کچھ آدمی بٹھا دیے تھے جو کسی کو ادھر آنے نہیں دیتے تھے۔ میں تم سب کے سامنے ان آدمیوں سے پوچھتا ہوں کہ انہوں نے امام کو اس طرف آتے دیکھا ہو گا"۔

"یا امام!" — ہجوم میں سے ایک آدمی کی آواز سنائی دی — "میں نے کل شام سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے امام شاہی کو اس طرف آتے دیکھا تھا۔ میں ان کی طرف دوڑا اور انہیں روک دیا اور بتایا کہ وہ آگے نہ جائیں۔ انہیں وجہ بھی بتائی لیکن انہوں نے مجھے ڈانٹ دیا اور کہا کہ وہ ضرور آگے جائیں گے۔ میں فیصلہ نہ کر سکا کہ میں امام حسن بن صباح کا حکم مانوں یا امام شاہی کا۔ امام شاہی کے سامنے میری حیثیت ہی کیا تھی۔ میں نے سوچا کہ یہ اللہ کے برگزیدہ اور عظیم امام ہیں۔ جنات ان کے قریب آنے کی جرأت نہیں کریں گے۔ میں ان کے راستے سے ہٹ گیا۔ وہ آگے چلے گئے اور پھر میری نظروں سے اوجھل ہو گئے کیونکہ آگے ٹیلے بھی تھے اور چٹانیں بھی۔ یہ تو صبح میرے ایک ساتھی نے مجھے بتایا کہ امام شاہی کا سر ایک

درخت کے تنے کے ساتھ بالوں سے بندھا ہوا ہے۔ اب تم سب نے دیکھ لیا ہے کہ ان کے جسم کو کاٹ کر جنات نے کس طرح بکھیر دیا ہے"۔

لوگوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ حسن بن صباح نے ہجوم پر نظر گھمائی۔ اس نے ہر کسی کے چہرے پر خوف کا تاثر دیکھا۔

"اتنا زیادہ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں" — حسن بن صباح نے لوگوں سے کہا — "تم لوگ اب احتیاط کرنا کہ کوئی بھی اس علاقے میں نہ آئے۔ میں اس قاتل جن کو حاضر کر کے زندہ جلا دوں گا"۔

لوگ آہستہ آہستہ شہر کی طرف چل پڑے۔ حسن بن صباح گھوڑے پر سوار کسی اور طرف چلا گیا۔

قتل کی یہ ہولناک واردات یوں ہوئی تھی کہ امام شاہی جب حسن بن صباح کے گھر سے نکلا تھا تو حسن بن صباح نے اپنے آدمیوں کو بلایا تھا۔ انہیں جو ہدایات دی تھیں وہ یہ تھیں کہ وہ امام شاہی پر نظر رکھیں۔ اگر وہ اس طرف جاتا ہے جہاں مہدی علوی چلہ کشی کر رہا ہے تو اسے وہیں کہیں ختم کر دیں۔

"یا امام!" — حسن بن صباح کے ایک دستِ راست نے کہا — "یہ نہ کہیں کہ اگر وہ ادھر جائے تو اسے قتل کیا جائے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ امام شاہی کا اس شہر کے لوگوں پر اس قدر اثر و رسوخ ہے کہ لوگ اسے پیر اور مرشد مانتے ہیں۔ میں نے گھوم پھر کر دیکھا ہے پھر آپ سے یہ بات کر رہا ہوں۔ اگر یہ شخص الموت میں رہا تو کوئی بعید نہیں کہ یہ ہمارے خلاف محاذ بنا لے اور ہم نے اس شہر کے لوگوں میں جس طرح اثر پیدا کیا ہے وہ رائیگاں چلا جائے۔ اس آدمی کا اس شہر میں رہنا بلکہ اس دنیا میں رہنا خطرناک ہو گا"۔

"تو اسے ختم کر دو" — حسن بن صباح نے کہا — "لیکن قتل اس طرح کرو کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ کسی انسان نے قتل کیا ہے۔ یہ مہدی علوی کے پاس ضرور جائے گا۔ اسے اس ویرانے میں قتل کرو اور اس کے بازو، ٹانگیں، سر کاٹ کر الگ الگ پھینک دو پھر میں آ کر لوگوں کو بتاؤں گا کہ اس کا قاتل کون ہے۔ پھر لوگ اسے بھول جائیں گے اور میرے اور زیادہ معتقد ہو جائیں گے"۔

امام شاہی کے دن پورے ہو چکے تھے۔ وہ اسی شام موت کی وادی کی طرف چل

پڑا اور حسن بن صباح کے آدمیوں نے اُسے اُسی طرح قتل کر دیا جس طرح حسن بن صباح نے بتایا تھا اور پھر اس ابلیس نے لوگوں سے منوا لیا کہ یہ قتل جنات نے کیا ہے۔

○

سورج غروب ہونے کو تھا جب امام شافی کو قبر میں اتارا گیا۔ نماز جنازہ حسن بن صباح نے پڑھائی تھی اور اس کے بعد اُس نے امام شافی کی وفات پر ایسی نوحہ خوانی کی تھی کہ لوگوں کے آنسو ہی نہیں بلکہ سسکیاں اور ہچکیاں نکل آئی تھیں۔

اگلی صبح حسن بن صباح سدی علوی سے ملنے چلا گیا۔ سدی علوی خیمے میں زمین پر بچھے ہوئے بستر پر گہری نیند سویا ہوا تھا۔ یہ چلے کا آٹھواں یا نواں دن تھا۔ خادم نے اسے جگایا اور بتایا کہ امام حسن آئے ہیں۔ سدی علوی ہڑبڑا کر اٹھا۔ حسن بن صباح خیمے میں آکر اس کے پاس بیٹھ گیا تھا۔ اُس نے سدی علوی کے چہرے کا جائزہ لیا۔ وہ اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ سدی علوی پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں اور اس کی ذہنی حالت کیا ہے۔

"کیا آپ یہ چلہ جاری رکھ سکیں گے؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"ہاں امام!" — سدی علوی نے جواب دیا — "میں چلہ جاری رکھوں گا۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہو رہی بلکہ ایک عجیب سا سرور محسوس ہوتا ہے جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ تصورات بہت ہی حسین ذہن میں آتے ہیں اور یہ اپنے آپ ہی آجاتے ہیں"۔

"آپ کو تو سکون ملتا ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "لیکن آپ کے ارد گرد جو علاقہ ہے یہ بڑا ہی خطرناک ہو گیا ہے۔ میں نے آپ کو جو وظیفہ بتایا ہے اس کے اثرات پوری کائنات پر ہوتے ہیں۔ یہ دراصل سلیمان علیہ السلام کا وظیفہ ہے جو جنات پڑھا کرتے تھے۔ آپ کے خیمے کے ارد گرد جنات کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا ہے۔ یہ اس وظیفے کی کشش اور جنات کی عقیدت مندی ہے"۔

"تو کیا یہ جنات مجھے نقصان نہیں پہنچائیں گے؟" — سدی علوی نے ذرا ڈرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں امیر الموت!" — حسن بن صباح نے جواب دیا — "یہ تو آپ کی خوش

نصیبی کی نشانی ہے کہ آپ کا پڑھا ہوا وظیفہ کائنات پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ جنات انسانوں کے روپ میں آکر آپ کے آگے سجدہ ریز ہو جائیں۔ اگر ایسا ہوا تو آپ ڈریں بالکل نہیں۔ وہ خاموشی سے آپ کا وِرد سنتے رہیں گے اور پھر چلے جائیں گے"۔

"مجھے یہ بتائیں کہ سونے کی یہ تین اینٹیں کس طرح برآمد ہوئی ہیں؟" سدی علوی نے پوچھا — "کیا سلے کے نیچے سے مزید خزانہ برآمد ہو گا؟"

"میں گذشتہ رات سو نہیں سکا" — حسن بن صباح نے کہا — "سونے کی یہ تین اینٹیں ایک اشارہ ہے۔ میں رات بھر مراقبے میں رہا ہوں۔ معلوم یہ کرنا تھا کہ یہ کیسا اشارہ ہے۔ صبح کاذب کے وقت مجھے یہ راز معلوم ہوا ..... خزانہ برآمد ہو گا لیکن ابھی یہ پتہ نہیں چل رہا کہ وہ خزانہ کہاں سے برآمد ہو گا۔ مجھے امید ہے کہ پندرہ سولہ دنوں بعد یہ بھی پتہ چل جائے گا۔ سونے کے یہ تین ٹکڑے ایک بڑا واضح اشارہ ہیں کہ آپ کو تین اور شہر ملیں گے پھر الموت کو ملا کر ان چار شہروں کی ایک سلطنت بن جائے گی جس کے سلطان آپ ہوں گے۔ اس سلطنت کو حاصل کرنے کا طریقہ یہی ایک ہے کہ آپ اسی طرح صبر و تحمل اور پوری یکسوئی کے ساتھ پورے چالیس دن یہ وظیفہ پورا کر دیں"۔

سدی علوی کو باقاعدہ حشیش پلائی جا رہی تھی۔ خادم حشیش کی مقدار میں اضافہ کرتا چلا جا رہا تھا۔ اسے اونٹنی کا دودھ پینے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ یہ دودھ ہر روز اس کے خیمے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ اس میں بھی ذرا سی حشیش ڈال دی جاتی تھی۔ کچھ تو اُس کی اپنی خواہشات کے تصور تھے جو اس کے ذہن میں ابھرتے ہی چلے آرہے تھے، کچھ حسن بن صباح کی باتوں کے اثرات تھے کہ سدی علوی کے ذہن سے اترتا جا رہا تھا کہ وہ الموت کا امیر ہے اور اس کی حیثیت ایک بادشاہ جیسی ہے۔

"میں آپ کو ایک بُری خبر سنا رہا ہوں" — حسن بن صباح نے کہا — "آپ کے محبوب امام شافی اچانک حجاز سے واپس آگئے تھے۔ انہیں پتہ چلا کہ آپ یہاں چلہ کشی میں بیٹھے ہیں تو وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ وہ آپ کو چلہ کشی سے روکیں گے۔ میرے دل میں امام شافی کا بے تحاشا احترام ہے۔ میں نے انہیں کہا کہ وہ آپ کی چلہ کشی میں مداخلت نہ کریں ورنہ اس میں آپ کی جان جانے کا خطرہ

ہے اور امیرالموت کے لئے بھی بہت بڑا خطرہ پیدا ہو سکتا ہے۔ ان کی اور ہم سب کی بد قسمتی کہ وہ نہ مانے اور کل آپ کے پاس آنے کے لئے چل پڑے۔ ہمیں اطلاع ملی کہ ان کا سر ویرانے میں ایک درخت کے ساتھ بالوں سے لٹک رہا تھا۔ مجھے صاف پتہ چل گیا کہ انہیں جنات نے کاٹ کر پھینک دیا تھا کیونکہ وہ جنات کے پیغمبر حضرت سلیمان علیہ السلام کے وظیفے کی توہین کر رہے تھے۔ یہ توہین تھی کہ وہ آپ کو اس وظیفے سے ہٹانے آ رہے تھے۔ کل میں نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی ہے اور انہیں سپرد خاک کر دیا گیا ہے"۔

حسن بن صباح کو توقع تھی کہ مہدی علوی کا ردّعمل بڑا ہی شدید ہو گا اور وہ روئے گا کیونکہ وہ امام شامی کا معتقد تھا بلکہ اس کا مرید تھا لیکن اس نے اپنے امام کی موت کی خبر سنی تو اس کا چہرہ بے تاثر رہا جیسے اس پر ذرا سا بھی اثر نہ ہوا ہو۔ اس کی آنکھیں خشک رہیں۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ حسن بن صباح نے جب یہ دیکھا کہ مہدی علوی نے کوئی اثر لیا ہی نہیں تو وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوا کہ وہ مہدی علوی کی حِسّیں مُردہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"میں یہ چلّہ پورا کروں گا امام محترم!" ـــ مہدی علوی نے کہا ـــ "یہ دیکھنا آپ کا کام ہے کہ میں اس میں کامیاب ہو جاؤں گا یا نہیں"۔

"وہ تو میں دیکھ چکا ہوں" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "اور میں آپ کو بتا بھی چکا ہوں۔ سونے کی تین اینٹوں کا برآمد ہونا وظیفے کی کامیابی کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے ..... اور امام شامی کا جنات کے ہاتھوں قتل ایک اور ثبوت ہے۔ آپ دلجمعی سے چلّہ جاری رکھیں"۔

"کیا میں اونٹنی کا دودھ ہی پیتا رہوں؟" ـــ مہدی علوی نے پوچھا۔

"ہاں!" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ "آج کا دن ملا کر دو دن اور آپ اونٹنی کے دودھ پر ہی رہیں گے۔ اس کے بعد آپ اس دودھ کے ساتھ دن رات میں صرف ایک بار آدھی روٹی کھا سکتے ہیں اس سے زیادہ نہیں"۔

حسن بن صباح نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اتنے تندرست اور اتنے صحت مند جسم والا امیر شہر غذائیت کی کمی کی وجہ سے کچھ کمزور ہو گیا تھا۔ حسن بن صباح نے اسے اور زیادہ کمزور کرنا تھا۔

حسن بن صباح مہدی علوی کی اور زیادہ حوصلہ افزائی کر کے وہاں سے آ گیا۔ مہدی علوی نے حسن بن صباح کی جو پیش گوئیاں سنی تھیں انہوں نے اسے نہایت حسین اور دل پسند تصوروں میں دھکیل دیا۔

سات آٹھ دن اور گزر گئے۔ مہدی علوی اب ایسی ذہنی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا جس میں اس کے ذہن کے تصورات حقیقی زندگی کی صورت میں محسوس ہونے لگے اور حقیقی زندگی اس کے ذہن سے بہت حد تک نکل گئی۔

پندرہ سولہ دن گزر گئے تو حسن بن صباح ایک بار پھر مہدی علوی کے خیمے میں گیا۔ اس نے مہدی علوی کے چہرے کا اور ذہنی کیفیت کا اندازہ کیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ بڑے اچھے نتائج حاصل کر رہا ہے۔ مہدی علوی بڑی جاندار آواز میں بولتا تھا لیکن صاف پتہ چلتا تھا کہ اس کا ذہنی توازن صحیح نہیں رہا۔ یہ شخص اس طرح زندگی کی حقیقتوں سے کٹ گیا ہے جس طرح ہرے بھرے درخت کی ایک شاخ کٹ کر گر پڑتی ہے۔ اس شاخ کو سوکھ کر پتا پتا ہو جانا ہوتا ہے۔ یہی کیفیت مہدی علوی کی ہو رہی تھی۔

"کیا آپ کچھ اور بھی دیکھ رہے ہیں؟" ـــ حسن بن صباح نے پوچھا ـــ "کوئی اور چیز آپ کو نظر آئی ہو؟"

"ہاں محترم امام!" ـــ مہدی علوی نے مخمور سی آواز میں کہا ـــ "میں نے گزشتہ رات ایک عجیب چیز دیکھی ہے۔ میں وظیفے میں مصروف تھا کہ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی اس طرح میرے سامنے سے گزر گئی جیسے وہ چل نہیں رہی تھی بلکہ بادلوں پر تیر رہی تھی۔ میں چونکہ وظیفے میں مصروف تھا اس لئے میں نے اس کی طرف زیادہ نہ دیکھا۔ اتنا ہی دیکھا کہ وہ میرے سامنے سے گزری اور غائب ہو گئی۔ میں تو کہوں گا کہ وہ آسمان سے اتری ہوئی حور تھی ..... میں نے اپنی پوری کی پوری توجہ وظیفے پر مرکوز کر دی۔ ذرا ہی دیر بعد ایک اور لڑکی جو پہلی جیسی حسین اور دلکش تھی میرے سامنے سے گزر گئی۔ میں کچھ ڈرا بھی اور گھبرایا بھی لیکن اپنے آپ کو یقین دلایا کہ یہ آسمان کی مخلوق ہے۔ پھر یہ خیال بھی آیا کہ یہ جنات ہی نہ ہوں جو آپ نے بھی کہا تھا کہ انسان کے روپ میں آ سکتے ہیں"۔

"ابھی کچھ اور چیزیں بھی آپ کو نظر آئیں گی" ـــ حسن بن صباح نے کہا ـــ

"آپ، جو کچھ بھی خدا سے مانگ رہے ہیں وہ سب کچھ آپ کو مل جائے گا۔ یہ خدائی اشارے ہیں۔ سونے کے تین ٹکڑوں کا اشارہ آپ کو بتایا ہے۔ اب آپ نے دو لڑکیاں دیکھی ہیں۔ آپ خود ہی سمجھ لیں کہ آپ کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی جس طرح آپ چاہتے ہیں"۔

مسدی علوی یہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ دو لڑکیاں حسن بن صباح کی بھیجی ہوئی ہو سکتی ہیں۔ کوئی اُسے بتاتا تو بھی وہ یقین نہ کرتا کیونکہ رات کے وقت شہر سے دور اس ویرانے میں کوئی لڑکی نہیں آسکتی تھی۔ حقیقت یہ تھی جس سے وہ بے خبر تھا کہ یہ دونوں لڑکیاں شام کو ہی وہاں پہنچا دی گئی تھیں۔ مسدی علوی مصلے پر بیٹھ چکا تھا۔ لڑکیاں خادم کے خیمے میں بیٹھی رہیں۔ انہیں ایسے لباس پہنائے گئے تھے جو عام طور پر لڑکیاں نہیں پہنا کرتی تھیں۔ وہ رنگ دار باریک ریشمی کپڑوں میں لپٹی ہوئی تھیں۔ اس کے باوجود وہ عریاں لگتی تھیں کیونکہ کپڑے بہت ہی باریک تھے۔ وہ جب مسدی علوی کے آگے سے گزری تھیں تو ان کی چال عام چال نہیں تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ قدم اٹھا نہیں رہیں بلکہ زمین پر کھڑے کھڑے تیرتی جا رہی ہوں۔

○

آخر چالیسویں رات بھی گزر گئی۔ مسدی علوی کو اچھلتے کودتے نعرے لگاتے خیمے سے باہر آنا چاہئے تھا لیکن وہ اس طرح سر جھکائے ہوئے باہر جا رہا تھا جیسے اُس نے منوں بوجھ اٹھا رکھا ہو۔ خیمے سے باہر آکر اس نے دیکھا۔ اسے اس کے خادم کا خیمہ نظر نہ آیا۔ اُس نے خادم کو پکارا، بہت آوازیں دیں لیکن اُسے کوئی جواب نہ ملا۔ وہ آہستہ آہستہ شہر کی طرف چل پڑا۔ اسے تو جیسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ اس نے چالیس راتیں چلہ کیا ہے، اور شاید وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس نے چلہ کیوں کیا تھا۔ اس کا دماغ کسی وقت روشن ہو کر سوچنے کے قابل ہو جاتا لیکن فوراً ہی بعد دماغ پھر سو جاتا۔ اُس کے ذہن میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس کا ذہن ذرا سا اپنے آپ میں آتا تو اُسے یاد آتا کہ یہاں وہ اکیلا نہیں تھا پھر وہ پریشان ہو جاتا کہ وہ اکیلا کیوں ہے۔ اُس کا ذہن پھر خالی ہو جاتا اور اسی کیفیت میں وہ قدم گھسیٹ گھسیٹ کر چلتا گیا۔ وہ لاشعوری طور پر چلتا جا رہا تھا یا جیسے وہ خواب میں چل رہا ہو۔

سورج بہت اوپر آگیا تھا جب حسن بن صباح کو اُس کے ایک آدمی نے اطلاع دی کہ امیرالموت آرہا ہے۔ حسن بن صباح اس کے انتظار میں تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ مسدی علوی کس حالت میں واپس آئے گا۔ حسن بن صباح باہر نکل آیا اور اس نے دیکھا کہ مسدی علوی چلا آرہا ہے۔ وہ قدم گھسیٹ رہا تھا۔ اُس کا حال حلیہ اس قدر بدل گیا تھا کہ حسن بن صباح کو یہ نہ بتایا جاتا کہ امیرالموت آرہا ہے تو وہ اُسے پہچان ہی نہ سکتا۔ اُس کی داڑھی سلیقے سے تراشی ہوئی ہوتی تھی لیکن چالیس دنوں میں داڑھی لمبی اور بے ترتیب ہو گئی تھی۔ اس کے سر کے بال بھی کندھوں تک پہنچ رہے تھے۔ حسن بن صباح اسے اپنے مکان کی طرف آتا دیکھتا رہا، حتیٰ کہ مسدی علوی حسن بن صباح کے سامنے آرکا۔

"آگئے امیرالموت!" — حسن بن صباح نے بے رخی سے پوچھا — "اندر آجائیں"۔

"پانی پلاؤ!" — مسدی علوی نے نحیف سی آواز میں کہا — "بہت تھک گیا ہوں..... پانی پلاؤ"۔

حسن بن صباح اُسے اندر لے گیا اور اپنے کمرے میں بٹھایا۔ اُس نے ایک آدمی سے کہا کہ اسے سادہ پانی پلاؤ۔ مسدی علوی کو سادہ پانی دیا گیا جو اس نے پی لیا۔

"مجھے پانی پلاؤ" — مسدی علوی نے ذرا جاندار آواز میں کہا۔

"امیرالموت!" — حسن بن صباح نے کہا — "پانی تو آپ پی چکے ہیں"۔

"یہ پانی نہیں" — مسدی علوی نے ذرا غصیلی آواز میں کہا — "جو وہاں مجھے خادم پلایا کرتا تھا"۔

حسن بن صباح سمجھتا تھا کہ یہ کون سے پانی کی طلب محسوس کر رہا ہے، پھر بھی اُس نے اسے شربت پلایا۔ مسدی علوی نے شربت پی لیا۔

"میں وہ پانی مانگ رہا ہوں" — مسدی علوی نے اب کے ذرا بلند آواز میں کہا۔

وہ دراصل اُس پانی کا عادی ہو گیا تھا جو اُسے چالیس روز خادم پلاتا رہا تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اس پانی میں حشیش ملی ہوئی ہوتی تھی۔ وہ جو سرور محسوس کرتا تھا اسے وہ روحانی سکون سمجھتا تھا اور اس سکون کو وظیفے کی فضیلت کہتا تھا۔ گزشتہ شام

اُس نے حشیش والا پانی پیا تھا۔ وہ وظیفے کے دوران بھی رات کو یہ پانی پیا کرتا تھا۔ خادم اچھا خاصا پانی اس کے بستے کے پاس رکھ دیا کرتا تھا۔ گزشتہ شام سے اگلے دن پہلے پہر تک اسے وہ پانی نہیں ملا تھا۔ وہ نشے سے ٹوٹا ہوا تھا۔

"آپ ہیں کون؟" — حسن بن صباح نے پوچھا۔

"میں امیرِ الموت ہوں" — مہدی علوی نے جواب دیا — "میرا نام مہدی علوی ہے"۔

اس کے بعد یوں ہوا کہ الموت کی گلیوں اور بازاروں میں ایک پاگل بلند آواز سے کہتا پھرتا تھا — "میں اس شہر کا امیر ہوں ...... میں مہدی علوی ہوں!" — بہت سے بچے اسے پتھر اور ڈھیلے مار رہے تھے اور وہ آگے آگے بھاگتا پھر رہا تھا۔ اس آدمی کا حلیہ یہ تھا کہ سر کے بال لمبے جو کندھوں پر آئے ہوئے تھے اور کچھ بال چہرے پر گرے ہوئے تھے۔ اس کی داڑھی لمبی تھی اور اس نے میلے کچیلے کپڑے پہن رکھے تھے۔

"شہر میں آسمان سے حوریں اتریں گی" — یہ پاگل کہتا پھر رہا تھا — "میں آسمان سے خزانے لاؤں گا۔ مجھ پر آسمان سے خزانے اتریں گے۔ میں اس شہر کا امیر ہوں۔ حوریں آئیں گی۔ میں تمہارا امیر ہوں"۔

وہ اپنے گھر کی طرف گیا۔ یہ گھر مہدی علوی کا تھا۔ وہ جب گھر میں داخل ہونے لگا تو وہاں جو دو دربان کھڑے تھے، انہوں نے اسے دھکے دے دے کر باہر نکال دیا۔ اس کی اپنی دونوں بیویوں اور اولاد نے بھی اسے پہچاننے سے انکار کر دیا۔ تین چار فوجی آ گئے۔ انہوں نے اس پاگل کو پکڑ لیا اور اسے گھڑ دوڑ کے میدان میں لے گئے۔ سارا شہر اُمڈ کر اس میدان میں اکٹھا ہو گیا۔ فوج کا ایک دستہ وہاں آ گیا۔ سپہ سالار اس کے ساتھ تھا۔ یہ پاگل مہدی علوی ہی تھا اور اس میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ وہی اس شہر کا امیر تھا لیکن وہ پاگل ہو چکا تھا اور لوگ مانتے ہی نہیں تھے کہ یہ مہدی علوی ہے۔ سپہ سالار اسے بازو سے پکڑ کر ایک ذرا بلند جگہ پر لے گیا جہاں لوگ اسے اچھی طرح دیکھ سکتے تھے۔

"الموت کے لوگو!" — سپہ سالار نے اعلان کیا — "یہ شخص پاگل ہے اور سارے شہر میں بدامنی پھیلا رہا ہے۔ کیا آپ اسے امیرِ شہر تسلیم کریں گے؟"

لوگوں کے ہجوم نے اسے امیر شہر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

"اگر یہ واقعی مہدی علوی ہے" — سپہ سالار نے کہا — "تو بھی اسے ہم امیر شہر نہیں مانیں گے کیونکہ یہ پاگل ہو چکا ہے"۔

"ہم کسی پاگل کو امیر شہر نہیں بنائیں گے" — ہجوم میں سے ایک آواز اٹھی۔

پھر ہجوم نے اس آواز کی تائید میں ایسا شور و غل بپا کیا کہ سوائے اس کے کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا کہ شہر کے لوگ اس پاگل کو امیر شہر بنانے کی سخت مخالفت کر رہے تھے۔

تاریخوں میں آیا ہے کہ لوگ مخالفت کرتے یا حمایت، پوری کی پوری فوج نے اس پاگل کو امیر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ پوری کی پوری فوج حسن بن صباح کی بنائی ہوئی تھی اور اس میں اس نے اپنے مریدوں کو بھرتی کیا تھا اور انہیں ذہن نشین کرایا تھا کہ اس شہر پر قبضہ کرنا ہے۔

سپہ سالار نے لوگوں سے کہا کہ اس اتنے بڑے شہر کے دفاع کے لئے فوج تھی ہی نہیں۔ ہم نے لوگوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کے لئے فوج بنائی ہے اور اس کے اخراجات امام حسن بن صباح پورے کر رہے ہیں۔ سپہ سالار نے اعلان کیا کہ یہ فوج کا فیصلہ ہے کہ امام حسن بن صباح کو امیر شہر بنایا جائے۔

اُس وقت تک بے شمار لوگ حسن بن صباح کے مرید بن چکے تھے۔ انہوں نے بیک زبان کہا کہ امیر شہر حسن بن صباح کو بنایا جائے۔ اس طرح حسن بن صباح الموت کا امیر بن گیا۔ اس نے مہدی علوی کی دونوں بیویوں اور اس کی اولاد کا باقاعدہ وظیفہ مقرر کروا دیا۔

○

مہدی علوی کو خوش و خرم، فتح کے نشے سے سرشار خیمے سے نکلنا چاہئے تھا کہ اس نے چالیس راتوں کا چلہ کامیابی سے کاٹ لیا تھا۔ شہر میں آ کر وہ حسن بن صباح سے کہتا کہ اب مجھے اس چلے کے نتائج دکھاؤ لیکن وہ خیمے سے پاگل ہو کر نکلا۔

مزمل آفندی کو قید خانے میں بند کر دیا گیا تھا۔ اُسے چالیس دنوں کے بعد قید خانے سے رہا کر دیا گیا۔ اسے پاگل ہو کر نکلنا چاہئے تھا لیکن وہ جب قید خانے سے نکلا تو اُس کی گردن تنی ہوئی تھی اور اس کی چال ڈھال ایسی تھی جیسے اس شہر کا امیر

وہی ہو اور جو کوئی اس کے راستے میں آئے گا اُسے وہ قتل کر دے گا۔ وہ قید خانے سے نکل کر سیدھا حسن بن صباح کے پاس پہنچا۔ حسن بن صباح نے اُس کا پُرتپاک استقبال کیا۔

"آ گئے مزمل!" — حسن بن صباح نے اس سے دوستوں کی طرح پوچھا — "اب کیا کرو گے؟"

"میرے کرنے کا ایک ہی کام ہے" — مزمل آفندی نے بڑی دلیری اور جرأت مندی سے جواب دیا — "مرو جاؤں گا اور نظام الملک کو قتل کروں گا"۔

"کب جاؤ گے؟"

"جب آپ حکم دیں گے" — مزمل نے کہا — "کہیں تو میں آج ہی روانہ ہو جاتا ہوں۔ چند دنوں میں نظام الملک کا سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں لا رکھوں گا"۔

حسن بن صباح نے اُسے اپنے پاس بٹھائے رکھا اور اسے اپنے ہاتھوں سے شراب پیش کی۔ اُس رات مزمل نے کھانا بھی حسن بن صباح کے ساتھ کھایا۔

اگلی صبح اسے ایک نہایت اعلیٰ نسل کا گھوڑا دیا گیا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ حسن بن صباح نے باہر آکر اسے رخصت کیا۔ مزمل گھوڑے پر یوں تن کے بیٹھا ہوا تھا جیسے یہ سارا علاقہ دُور دُور تک اس کی سلطنت ہو اور وہ اس کا سلطان ہو۔ اُس کی کمر کے ساتھ ایک تلوار لٹک رہی تھی اور اُس کے پاس بڑا ہی خوبصورت خنجر بھی تھا۔ وہ سلجوقیوں کے دارالسلطنت مرو جا رہا تھا۔

اس عرصے میں سلطان ملک شاہ اور نظام الملک اگر مزمل آفندی کو بھول نہیں گئے تھے تو انہوں نے اسے یاد بھی نہیں رکھا تھا۔ انہیں احمد اوزال نے یقین دلا دیا تھا کہ مزمل قتل ہو چکا ہے اور اب اس کی واپسی کی امیدیں دل سے نکال دی جائیں۔ وہ اگر زندہ تھا تو شمونہ اور اُس کی ماں میمونہ کے دلوں میں زندہ تھا۔ داستان گو پہلے تفصیل سے سنا چکا ہے کہ شمونہ مزمل آفندی پر دل و جان سے قربان ہو رہی تھی۔ یہ محبت جذباتی تو تھی ہی لیکن دونوں کا جذبہ بھی مشترک تھا۔ دونوں حسن بن صباح کو قتل کرنے کا عزم لئے ہوئے تھے۔ شمونہ اور مزمل کی محبت میں رومان کی چاشنی تو تھی ہی لیکن عزم کی گرمی زیادہ تھی۔

مزمل حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ اب شمونہ کے کانوں میں ایک ہی آواز گونجتی تھی کہ مزمل باطنیوں کے ہاتھوں قتل ہو چکا ہے۔ مزمل کو گئے ڈیڑھ مہینہ گزر گیا تھا۔ جب احمد اوزال خلجان سے بھاگ کر مرو آیا تھا تو اس نے یہ خبر سنائی تھی کہ مزمل آفندی حسن بن صباح کے جال میں آگیا ہے اور اب تک وہ قتل ہو چکا ہو گا۔ سلطان ملک شاہ اور نظام الملک نے تو فوراً مان لیا تھا کہ احمد اوزال جو کچھ کہہ رہا ہے وہی ہُوا ہو گا لیکن شمونہ نہیں مانتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ مزمل زندہ ہے۔ وہ احمد اوزال کے پیچھے پڑ گئی تھی کہ وہ واپس جائے اور مزمل کو ڈھونڈ کر لائے۔ احمد اوزال جانتا تھا کہ یہ حسین لڑکی جذبات کی رو میں بہی جا رہی ہے اور یہ حقیقت کو قبول نہیں کر رہی۔ احمد اوزال نے اسے یقین دلانے کی بہت کوشش کر ڈالی تھی کہ مزمل اس دنیا سے اٹھ گیا ہے لیکن شمونہ چیخ چیخ کر کہتی تھی کہ مزمل مر نہیں سکتا، وہ حسن بن صباح کو مار کر مرے گا۔ یہ الفاظ اُس کی زبان پر چڑھ گئے تھے کہ حسن بن صباح زندہ ہے تو میرا مزمل بھی زندہ ہو گا۔

شمونہ اپنی ماں کو ساتھ لے کر سلطان ملک شاہ کے پاس گئی تھی اور رو رو کر اُس نے سلطان کی منتیں کی تھیں کہ وہ دو تین آدمیوں کو خلجان اور الموت بھیجے جو مزمل کو ڈھونڈ کر واپس لے آئیں۔ سلطان نے اسے بڑے پیار سے اور ہمدردی سے سمجھایا تھا کہ مزمل کے زندہ نکل آنے کی کوئی صورت ہے ہی نہیں۔ پھر وہ نظام الملک کے پاس گئی تھی۔ نظام الملک نے بھی اسے وہی جواب دیا تھا جو سلطان ملک شاہ دے چکا تھا۔

شمونہ احمد اوزال کے لئے مصیبت بن گئی تھی۔ احمد اوزال نے اسے ہر بار یہی کہا تھا کہ وہ خلجان اور الموت جانے سے نہیں ڈرتا لیکن وہاں اسے حسن بن صباح اور اس کے خفیہ آدمی بڑی اچھی طرح سے پہچانتے ہیں اور وہ اس خفیہ گروہ کے دو آدمی قتل کر کے بھاگا ہے۔ وہ فوراً پکڑا جائے گا اور فوراً ہی اسے قتل کر دیا جائے گا۔

"میں خود وہاں چلی جاؤں" — شمونہ نے کئی بار کہا تھا — "لیکن حسن بن صباح کے ساتھ میں رہی ہوں۔ بہت سارے لوگ وہاں مجھے پہچانتے ہیں۔ حسن بن صباح پہلے ہی مجھے قتل کرنے کا حکم دے چکا ہے۔ وہ تو مجھے دیکھتے ہی مار ڈالے گا۔ وہ

نہ دیکھ سکا تو اُس کا کوئی بھی آدمی مجھے پہچان لے گا اور مجھے پکڑ لے گا اور حسن بن صباح کے حوالے کر دے گا"۔

سلطان ملک شاہ نے شمونہ اور اس کی ماں کو مرو میں ایک بڑا اچھا مکان دے دیا تھا جس میں ماں بیٹی اکیلی رہتی تھیں۔ سلطان نے ان کے لئے وظیفہ بھی مقرر کر دیا تھا۔ سلطان اور نظام الملک کے بعد احمد اوزال سے مایوس ہو کر شمونہ نے ماں کو پریشان کرنا شروع کر دیا تھا۔ ماں نے کئی بار اسے ڈانٹ دیا اور کہا کہ وہ اپنے دماغ کو اپنے قابو میں رکھے ورنہ وہ پاگل ہو جائے گی۔ وہ مزمل کو بھولتی ہی نہیں تھی اور یہ مانتی ہی نہیں تھی کہ مزمل قتل ہو چکا ہے۔ اس کا یہ روز مرہ کا معمول بن گیا تھا کہ صبح چھت پر چلی جاتی اور اُس راستے کو دیکھتی رہتی تھی جو طلیطان سے مرو آتا تھا۔ دن میں کئی بار وہ چھت پر اُس طرف سے آنے والی پگڈنڈی کو دیکھنا شروع کر دیتی۔ کئی بار ماں چھت پر جا کر اُسے گھسیٹتے ہوئے نیچے لائی اور اسے ڈانٹا لیکن شمونہ ایک ہی بات کہتی تھی کہ مزمل زندہ ہے اور وہ واپس آئے گا۔

وہ گھوڑ سواری کی شوقین تھی۔ کبھی کبھی وہ سلطان کے اصطبل سے گھوڑا منگوا لیتی اور شہر سے باہر نکل جایا کرتی تھی۔ گھوڑے کو کچھ دیر دوڑاتی اور گھر آجایا کرتی تھی۔ ایک روز اس نے ماں سے کہا کہ اسے گھوڑا منگوا دے وہ باہر جانا چاہتی ہے۔

"شمونہ!" — ماں نے کہا — "اب میں تمہیں باہر جانے کی اجازت نہیں دے سکتی۔ تمہارا دماغ دن بدن بیکار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ باہر جا کر طلیطان کا رخ کر لو گی"۔

"نہیں ماں!" — شمونہ نے کہا — "میں پہلے جا چکی ہوں کہ میں مزمل کی تلاش میں باطنیوں کے علاقوں میں نہیں جا سکتی۔ میں پہلے نہیں گئی تو اب بھی نہیں جاؤں گی۔ گھر میرا دم گھٹتا ہے۔ مجھے ذرا کھلی ہوا میں گھومنے پھرنے کے لئے جانے دیں"۔

ماں نے اسے گھوڑا منگوا دیا اور وہ گھوڑے پر سوار ہوئی اور باہر نکل گئی۔ اس کی ماں بھی چاہتی تھی کہ یہ لڑکی اسی طرح گھوم پھر کر دل بہلائے رکھے تو ٹھیک ہے ورنہ وہ تو پاگل ہوئی جا رہی تھی مرو کے ارد گرد بہت ہی دلفریب مناظر تھے۔ ندی بھی قریب سے گزرتی تھی اور ایک جگہ سے چشمہ پھوٹتا تھا لوگ سیر و تفریح کے

لئے وہیں جایا کرتے تھے لیکن شمونہ کو سیر کے لئے وہی پگڈنڈی اچھی لگتی تھی جو طلیطان سے آتی تھی۔ اُس روز بھی وہ گھوڑے پر سوار ہوئی' شہر سے نکلی اور گھوڑا اسی پگڈنڈی پر ڈال دیا۔ یہ اس کا معمول تھا۔ اس پگڈنڈی پر جا کر وہ گھوڑے کو ایڑ لگاتی' گھوڑا سرپٹ دوڑتا اور شمونہ کوس ڈیڑھ کوس جا کر گھوڑا روک لیتی اور وہاں سے واپس آجاتی۔ اُس روز بھی وہ اسی پگڈنڈی پر چلی گئی۔ اُس نے اپنے معمول کے مطابق گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا۔ سامنے سے ایک گھوڑا سوار چلا آرہا تھا۔ شمونہ اس کے قریب سے گزری تو اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اُس کا گھوڑا ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔

"شمونہ!" — گھوڑے کے قدموں کے بے ہنگم شور اور ہوا کی شائیں شائیں میں ایک آواز سنائی دی۔ پکارنے والا کوئی آدمی تھا۔

شمونہ نے گھوڑا روک لیا اور پیچھے کو موڑا۔ وہ گھوڑا سوار جو اُس کے قریب سے گزرا تھا' اس نے بھی گھوڑا موڑ لیا اور اس کی طرف بڑی تیزی سے آرہا تھا۔

دونوں گھوڑے قریب آئے اور سواروں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔

"مزمل!" — شمونہ کے منہ سے تو جیسے چیخ نکل گئی ہو۔

شمونہ کود کر گھوڑے سے اتری — وہ مزمل آفندی ہی تھا۔ بلاشک و شبہ وہ مزمل ہی تھا — نظر کا دھوکہ نہیں تھا اور یہ خواب بھی نہیں تھا۔ شمونہ بازو پھیلا کر مزمل کی طرف دوڑی اور مزمل اُسی کی طرح بازو پھیلا کر اس طرف آیا پھر دونوں ایک دوسرے کے بازوؤں میں جکڑے گئے جیسے دو جسم ایک ہو گئے ہوں۔

"میں ہر روز کہتی تھی کہ میرا مزمل زندہ ہے" — شمونہ کی الفاظ کے جا رہی تھی۔

شمونہ کی جذباتی کیفیت اور بے تابی کا یہ عالم تھا جیسے ماں کو اس کا کھویا ہوا بچہ مل گیا ہو۔ وہ مزمل کو اپنے بازوؤں میں سے نکلنے ہی نہیں دے رہی تھی۔ بچھڑے ہوئے دو دلوں کو اس بے تابی اور دیوانگی سے ملتا ہوا دیکھ کر سورج افق کے پیچھے چھپ گیا اور ان پر شام کا پردہ ڈال دیا۔

رات شمونہ مزمل کو اپنے گھر لے گئی۔ مزمل کو اسی گھر میں آنا تھا۔ شمونہ کی ماں میمونہ نے بھی مزمل کو دیکھا تو اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔

"میں ابھی وزیرِ اعظم نظام الملک کو اطلاع دیتی ہوں" — میمونہ نے کہا — "وہ سن کر بہت خوش ہوں گے کہ مزمل واپس آگیا ہے۔ یہاں تو سب یقین کئے بیٹھے تھے کہ تم قتل ہو چکے ہو"۔

"نہیں!" — مزمل نے کہا — "اُسے کوئی اطلاع نہیں دے گا۔ میں خود اُس کے پاس جاؤں گا"۔

میمونہ نے مزمل اور شمونہ کو تنہا بیٹھنے کے لئے یوں کیا کہ نیند کا بہانہ کر کے اپنے کمرے میں چلی گئی۔ شمونہ یہی چاہتی تھی۔ وہ مزمل کو اپنے کمرے میں لے گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ وہ مزمل سے سننا چاہتی تھی کہ خلجان میں اُس پر کیا بیتی ہے۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ مزمل ذرا رک رک کر اور کچھ سوچ سوچ کر بات کرتا ہے۔

"سلطان اور وزیرِ اعظم نظام الملک کہتے تھے کہ مزمل باطنیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا ہے" — شمونہ نے کہا — "میں کہتی تھی کہ مزمل زندہ ہے اور وہ واپس آئے گا۔ یہ لوگ نہیں مانتے تھے۔ احمد اوزال بھی یہی کہتا تھا"۔

"نظام الملک چاہتا ہی یہی تھا کہ میں قتل ہو جاؤں" — مزمل نے سنجیدہ سے لہجے میں کہا — "اب دیکھنا کون کس کے ہاتھوں قتل ہو گا"۔

"کیا کہہ رہے ہو؟" — شمونہ نے کہا — "میں محسوس کر رہی ہوں کہ وہاں تم پر بہت بُری گزری ہے جس کا تمہارے دماغ پر بہت بُرا اثر معلوم ہوتا ہے۔ کس کے قتل کی بات کر رہے ہو؟"

"بہت بُری نہیں شمونہ!" — مزمل نے کہا — "مجھ پر بہت اچھی گزری ہے۔ میری تو آنکھیں کھل گئی ہیں اور میرا دماغ روشن ہو گیا ہے۔ میں حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا۔ وہاں جا کر مجھ پر یہ راز کھلا کہ میں نے حسن بن صباح کو نہیں بلکہ کسی اور کو قتل کرنا ہے۔ میں نے بہت سوچا لیکن یہ راز مجھ پر نہیں کھل رہا تھا کہ وہ کون ہے جس نے میرے ہاتھوں قتل ہونا ہے۔ مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ میں نے کسی کو قتل ضرور کرنا ہے..... کچھ دنوں بعد یہ راز بھی کھل گیا..... وہ شخص آنکھوں کے سامنے آگیا تھا جس کا خون میرے ہاتھ پر لکھا ہوا ہے"۔

"کون ہے وہ؟" — شمونہ نے گھبرا کر پوچھا۔

"نظام الملک!" — مزمل نے کہا۔

"مزمل؟" — شمونہ نے اس کے گالوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر پوچھا — "کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم نظام الملک کو قتل کرو گے؟"

"شمونہ!" — مزمل نے شمونہ کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اور اُسے اپنے قریب کر کے کہا — "اندازہ کرو کہ تمہاری محبت میرے دل اور روح میں کتنی گہری اُتری ہوئی ہے کہ میں تمہیں ایک ایسا راز بتانے لگا ہوں جو مجھے کسی کو بھی نہیں دینا چاہئے تھا۔ تمہارے بغیر میں ایک قدم چل نہیں سکتا۔ میں کسی اور ارادے سے خلجان گیا تھا لیکن اب میں کسی اور ارادے سے الموت سے یہاں آیا ہوں"۔

"کھل کر بات کرو مزمل!" — شمونہ نے کہا — "میں نے اپنی جان تمہارے لئے وقف کر رکھی ہے..... یہ راز اپنے سینے میں چھپا کر رکھوں گی۔ میں تم سے یہ سننا چاہتی ہوں کہ تم پر وہاں کیا گزری ہے"۔

"وہاں مجھ پر جو گزری ہے وہ اچھی گزری ہے" — مزمل نے بڑے سنجیدہ اور کچھ طنزیہ سے لہجے میں کہا — "بلکہ بہت اچھی گزری ہے۔ وہاں تک تو میں اندھیرے میں پہنچا تھا۔ یہ مجھے وہاں جا کر پتہ چلا کہ میری روح اب تک بھٹکتی رہی ہے۔ وہاں میری روح کو روشنی ملی پھر مجھے پتہ چلا اور میں نے صاف دیکھا کہ دوست کون اور دشمن کون ہے۔ میرے خیالات اور میرے عقیدے بدل گئے۔ اگر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی تو وہ یہ تھی کہ مجھے شمونہ سے محبت ہے اور میرا دل اس تبدیلی کو بھی قبول نہیں کرے گا کہ میرا دل شمونہ کی محبت کو نکال دے"۔

شمونہ مزمل کی باتیں تو غور سے سن ہی رہی تھی مگر وہ زیادہ غور ان تاثرات پر کر رہی تھی جو مزمل کے چہرے پر آ اور جا رہے تھے۔ اس نے ایسے تاثرات مزمل کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھے تھے۔

"راز اپنے سینے میں چھپا کر رکھوں گی مزمل!" — شمونہ نے کہا — "میرے جسم سے جان نکل سکتی ہے، یہ راز نہیں نکلے گا لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم نظام الملک جیسے عظیم آدمی کو کیوں قتل کرو گے؟"

"عظیم انسان!" — مزمل نے کہا — "عظیم نظام الملک نہیں، حسن بن صباح عظیم ہے۔ میں اُسے قتل کرنے چل پڑا تھا لیکن وہاں جا کر میں نے محسوس کیا کہ میں

خوش نصیب ہوں کہ مجھے اس عظیم شخصیت کے پاس آنے کا ایک بہانہ مل گیا"۔

شمونہ لرز کر رہ گئی لیکن اس نے اپنے ردِ عمل کا اظہار نہ کیا نہ مزمل کو پتہ چلنے دیا کہ اس کا ردِ عمل کس قدر شدید ہے جسے برداشت کرنا اس کے لئے محال ہے۔

"ایک بات بتاؤ مزمل!" — شمونہ نے پوچھا — "نظام الملک کو کب قتل کرو گے؟..... میں اس لئے پوچھ رہی ہوں کہ تم جلد بازی نہ کر بیٹھو۔ تم نے مجھے کہی ہے کہ میں تمہارا ساتھ دوں۔ اگر تمہیں مجھ پر اعتماد ہے تو یہ کام مجھ پر چھوڑ دو۔ میں موقع پیدا کروں گی اور تم اپنا کام کر گزرنا لیکن میں موقع ایسا پیدا کروں گی کہ تم اسے قتل بھی کر دو اور پکڑے بھی نہ جاؤ"۔

"ہاں شمونہ!" — مزمل نے کہا — "مجھے تم پر اعتماد ہے اور مجھے تم سے یہی امید تھی کہ تم میرے اس کام میں میری مدد کرو گی۔ تم موقع پیدا کرو"۔

مزمل آفندی بڑے لمبے سفر سے آیا تھا اس لئے تھکا ہوا تھا۔ باتیں کرتے کرتے اُس کی آنکھ لگ گئی۔ شمونہ اٹھی، کمرے کا دروازہ بند کر دیا اور اپنی ماں کے پاس چلی گئی۔ اس نے اپنی ماں کو کچھ بھی نہ بتایا۔

شمونہ ساری رات سو نہ سکی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ مزمل کو باطنیوں نے پکڑ لیا تھا لیکن قتل کرنے کی بجائے انہوں نے یہ بہتر سمجھا کہ اسے قاتل ہی رہنے دیا جائے لیکن وہ قتل کسی اور کو کرے..... شمونہ حسن بن صباح کے ساتھ رہ چکی تھی۔ وہ حسن بن صباح کے منظورِ نظر داشتہ تھی۔ وہ قدرتی طور پر غیر معمولی ذہانت کی لڑکی تھی۔ اس نے حسن بن صباح سے کئی ایک راز لئے تھے اور حسن بن صباح اسے راز دے بھی رہا تھا کیونکہ وہ شمونہ کے حسن و جوانی کو اپنے مقاصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرتا تھا۔ خود شمونہ اپنے حسن کو بڑی خوبی اور کامیابی سے استعمال کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ حسن بن صباح کے پاس ایسے حربے اور طریقے ہیں کہ وہ پتھر کو بھی موم کر لیتے ہیں۔ وہ کسی بھی شخص کو ایک خاص عمل میں سے گزار کر اس کی سوچیں، اس کے ارادے اور اس کے عقیدے یکسر بدل دیتے ہیں۔ اس کے سامنے دو آدمیوں پر یہ عمل کیا گیا تھا۔ یہ کوئی جادو یا روحانی عمل نہیں تھا بلکہ یہ ایک نفسیاتی طریقۂ کار تھا۔ شمونہ جان گئی کہ مزمل کا جسم اور اس کا نام نہیں بدلا جا سکا، اس کے کردار کو اور اس کے عقیدے کو اور اس کے ارادوں کو بالکل الٹ کر دیا گیا

ہے۔ مہینہ ڈیڑھ مہینہ اس عمل کے لئے خاصا عرصہ تھا۔ اسے نظام الملک کے قتل کے لئے واپس بھیجا گیا ہے اور یہ محض عزم لے کر آیا ہے کہ نظام الملک کو قتل کرنا ہے

○

اگلی صبح مزمل آفندی اٹھا۔ شمونہ خود ناشتہ لے کر اُس کے کمرے میں گئی اور دونوں نے اکٹھے ناشتہ کیا۔

"اب میری بات سنو مزمل!" — شمونہ نے کہا — "میں نے اپنی ماں کو یہ بات نہیں بتائی اور تم بھی نہ بتانا۔ نظام الملک سے ملے ہوئے مجھے کچھ دن گزر گئے ہیں۔ میں ابھی اس کے پاس جا رہی ہوں اور کچھ جذباتی سی باتیں کروں گی کہ میں اُسے صرف ملنے آئی ہوں۔ میں اُسے اسی طرح دو تین مرتبہ ملوں گی اور مجھے اُمید ہے کہ میں اسے اپنے جذبات میں الجھا لوں گی اور پھر میں ایک دن اسے باہر لے جاؤں گی۔ تمہیں پہلے بتا دوں گی۔ تم نے کوئی اوچھی اور الٹی سیدھی حرکت نہیں کرنی۔ میرے آخری اشارے کا انتظار کرنا"۔

مزمل آفندی کے چہرے پر سکون اور اطمینان کا تاثر آ گیا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی شمونہ!" — مزمل نے شمونہ کو اپنے ایک بازو کے گھیرے میں لے کر کہا — "تم تصور میں نہیں لا سکتیں کہ میں یہ کام کر چکا تو تمہیں کس جنت میں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔ تم موقع پیدا کرو۔ میں تمہارے آخری اشارے کا انتظار کروں گا"۔

شمونہ کو بہت دکھ ہوا کہ مزمل جیسا پیارا اور جذبے والا آدمی اور دینِ اسلام پر اپنا آپ بھی قربان کرنے والا یہ خوبرو جوان کس طرح ضائع ہو گیا ہے۔ اس نے مزمل پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ اسے کتنا دکھ پہنچا ہے۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر بڑی ہی جانفزا مسکراہٹ قائم رکھی۔ وہ ناشتے کے بعد کمرے سے نکل آئی۔ ماں سے کہا کہ وہ برتن اٹھا لے اور وہ خود گھر سے نکل گئی۔ وہ نظام الملک سے ملنے جا رہی تھی۔

نظام الملک گھر ہی مل گیا۔ وہ ابھی ابھی ناشتے سے فارغ ہوا تھا۔ اسے اطلاع ملی کہ شمونہ آئی ہے تو اُس نے اُسے بلا لیا اور سوچا کہ یہ لڑکی آج پھر ضد کرنے آئی ہے کہ وہ تین آدمیوں کو طلبان اور الموت بھیجو جو مزمل کو ڈھونڈ لائیں۔ اس نے

شمونہ کو اس خیال سے بلا لیا تھا کہ اسے بہلائے پھسلائے گا اور اس کے دل سے مزمل کو نکالنے کی کوشش کرے گا۔

"آؤ شمونہ!" — نظام الملک نے کہا — "بیٹھو۔ آج شاید تمہیں پھر مزمل یاد آرہا ہے یا خواب میں آیا ہو گا!"

"نہیں محترم!" — شمونہ نے کہا — "وہ خواب میں نہیں آیا بلکہ وہ حقیقت میں آگیا ہے۔ کل شام زندہ و سلامت میرے پاس پہنچ گیا ہے"۔

"کیا تمہارا دماغ حاضر ہے شمونہ!" — نظام الملک نے اس طرح کہا جیسے اسے شک ہوا ہو کہ یہ لڑکی دماغی توازن کھو بیٹھی ہے — "وہ میرے پاس کیوں نہیں آیا؟..... کیا وہ کچھ بتاتا ہے کہ اس پر کیا بیتی ہے؟"

"محترم!" — شمونہ نے کہا — "میں اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ وہ میرے پاس آگیا تھا لیکن وہ سیدھا آپ کے پاس نہ پہنچ گیا ورنہ بات کچھ اور بن جاتی"۔

"کیا کہہ رہی ہو؟" — نظام الملک نے پوچھا — "کیا بات بن جاتی؟ معلوم ہوتا ہے تم ذہنی طور پر بہت پریشان ہو"۔

"ہاں محترم!" — شمونہ نے کہا — "میں ساری رات سوئی نہیں۔ میں تمہید باندھے بغیر یہ بتانے آئی ہوں کہ آپ نے جس کو حسن بن صباح کو قتل کرنے کے لئے بھیجا تھا وہ آپ کو قتل کرنے کے لئے واپس آیا ہے"۔

"مجھے حیران نہیں ہونا چاہئے" — نظام الملک نے کہا — "مجھے معلوم ہے کہ حسن بن صباح کے پاس ایسا جادو ہے جو مزمل جیسے جوانوں کو اپنا گرویدہ بنا لیتا ہے۔ مزمل پر بھی یہی جادو چل گیا ہو گا"۔

"محترم!" — شمونہ نے کہا — "آپ نے تو صرف سنا ہے کہ حسن بن صباح کے پاس کوئی ایسا جادو ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے یہ جادو چلتا دیکھا ہے۔ یہ میں آپ کو تفصیل سے بتاؤں گی لیکن فوری طور پر یہ سوچیں کہ مزمل کا کیا کیا جائے۔ اسے اس طرح آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ میں اسے محبت کی زنجیروں میں باندھ کر رکھ سکتی ہوں لیکن یہ زنجیریں کسی وقت کچی بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی بھی وقت وہ آپ پر قاتلانہ حملہ کر دے؟..... میں ڈرتی ہوں ایسا ہو جائے گا۔ آپ دانشمند ہیں۔ میں آپ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں۔ ایک مشورہ

ہے' اگر آپ کو اچھا لگے تو مزمل کو قید خانے میں بند کر دیں"۔

"نہیں شمونہ!" — نظام الملک جو عقل و دانش کے لئے مشہور تھا بولا — "میں اتنا خوبصورت جوان اور اتنا جذبے والا جوان ضائع نہیں کروں گا۔ اسے کچھ دنوں کے لئے آزاد رکھنا پڑے گا لیکن میں اس کے لئے ایک جواز پیدا کروں گا۔ جس طرح اسے حسن بن صباح نے اپنے مقاصد کے لئے آلۂ کار بنایا ہے اسی طرح میں اسے واپس لاؤں گا اور اسے ویسا ہی مرد مومن بناؤں گا جیسا یہ تھا۔ اندازہ کرو شمونہ! اس نے اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کو دل سے اتار دیا تھا اور یہ ایک عزم لئے ہوئے تھا کہ حسن بن صباح کو قتل کرے گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ حسن بن صباح کو ایک انسان سمجھ کر قتل نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ ایک باطل نظریے اور ابلیسیت کا گلا کاٹنا چاہتا تھا..... میں اسے صراط مستقیم پر لے آؤں گا لیکن اس کے لئے ہمیں ایک کھیل کھیلنا پڑے گا جس میں اپنے آپ کو خطرے میں ڈالوں گا"۔

"اگر اس کھیل میں میں نے کچھ کرنا ہے تو مجھے بتا دیں" — شمونہ نے کہا۔

"تمہارے ذمے ایک کام ہے" — نظام الملک نے کہا — "آج شام اسے میرے پاس بھیج دو۔ اسے کہنا کہ میں فلاں کمرے میں اکیلا ہوں گا۔ اسے یقین دلانا کہ نظام الملک کو قتل کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔ قتل کرنے کا طریقہ یہ بتانا کہ نظام الملک پیٹھ پھیرے تو خنجر نظام الملک کی پیٹھ میں اتار دینا..... باقی میں سنبھال لوں گا"۔

"نہیں محترم وزیر اعظم!" — شمونہ نے کہا — "میں ڈرتی ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ کھیل ہی کھیل میں خنجر آپ کے دل میں اتر جائے"۔

"تم اسے بھیج دینا" — نظام الملک نے کہا — "میں چوکنا رہوں گا..... تم جاؤ"۔

شمونہ واپس آئی اور اس نے مزمل کو ویسے ہی بتایا جیسے نظام الملک نے اسے بتایا تھا۔ شمونہ نے مزمل سے کہا کہ آج موقع ہے۔ یہ کام آج ہی کر گزرو۔

نظام الملک نے شمونہ کو وہ کمرہ دکھا دیا تھا۔ وہ کمرہ ایسا تھا جس کا تعلق اتنے بڑے مکان کے دوسرے کمروں کے ساتھ نہیں تھا۔ نظام الملک صرف اس وقت اس کمرے میں بیٹھا کرتا تھا جب اسے کسی پیچیدہ مسئلے پر غور کرنا ہوتا تھا۔ کوئی بھی

اس کے کلام میں قتل نہیں ہو سکتا تھا۔

شام کو مزمل آفندی اپنے کپڑوں کے اندر خنجر چھپائے نظام الملک کے ہاں چلا گیا۔ دروازے پر کوئی دربان نہیں تھا۔ یہ بھی اس کھیل کا ایک حصہ تھا کہ دربان ہٹا دیئے گئے تھے۔ شمونہ نے مزمل کو وہ خاص کمرہ اچھی طرح سمجھا دیا تھا۔ مزمل اس گھر میں زخمی حالت میں رہ بھی چکا تھا پھر اس گھر میں وہ صحت یاب ہُوا تھا اس لئے وہ اتنی بڑی حویلی سے واقف تھا۔ وہ اس کمرے کے دروازے پر پہنچ گیا اور دستک دی۔ نظام الملک نے خود اٹھ کر دروازہ کھولا۔ باہر مزمل کھڑا تھا۔ نظام الملک نے اُسے گلے لگا لیا اور خوشی کا اظہار کیا کہ وہ زندہ واپس آگیا ہے۔ اُسے کمرے میں لے جا کر اشارہ کیا کہ یہاں بیٹھ جاؤ۔

نظام الملک نے اس کی طرف پیٹھ کی اور دو تین قدم آگے کو چلا۔ اُسے معلوم تھا کہ اب کیا ہو گا۔ مزمل جو ابھی بیٹھ ہی رہا تھا' تیزی سے کھڑا ہو گیا' اور اسی تیزی سے کپڑوں کے اندر سے خنجر نکالا اور نظام الملک کی پیٹھ پر مارنے کے لئے اُس نے ہاتھ اوپر اٹھایا۔ جب اس کا ہاتھ خنجر مارنے کے لئے آگے ہُوا تو اُسی تیزی سے نظام الملک پیچھے کو مُڑا اور اُس نے خنجر والے ہاتھ کی کلائی اپنے ہاتھ پر روک لی اور اس کلائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کو اس نے زور سے جھٹکا دیا تو مزمل اس کے جسم کے ساتھ لگ گیا۔ نظام الملک نے نیچے سے اپنا گھٹنا اوپر کو مارا جو مزمل کے پیٹ میں لگا۔ مزمل درد کی شدت سے دوہرا ہو گیا۔ نظام الملک نے اس کی کلائی دونوں ہاتھوں سے مروڑی۔ مزمل اس طرف گھوما۔ نظام الملک نے ایسا داؤ چلا کہ مزمل پیٹھ کے بل فرش پر گرا اور اس کے ہاتھ سے خنجر گر پڑا۔ نظام الملک نے اپنا پاؤں گرتے ہوئے مزمل کی شاہ رگ پر رکھ کر پورے جسم کا زور ڈالا۔ مزمل تڑپنے لگا۔

نظام الملک نے ایک آواز کا اشارہ مقرر کر دیا تھا جو اس نے دیا۔ اس کے دونوں دربان دوڑے آئے اور آگے یہ منظر دیکھا۔ خنجر فرش پر پڑا تھا اور مزمل نظام الملک کے پاؤں کے نیچے تھا۔ دربانوں نے مزمل کو پکڑ لیا۔

"لے جاؤ" — نظام الملک نے کہا — "قید خانے میں بند کر دو۔ میں اسے کل دیکھوں گا"۔

دربانوں نے رسیوں سے مزمل کے ہاتھ باندھ دیئے اور اُسے لے گئے۔

نظام الملک بوڑھا آدمی تھا۔ اس میں اگر طاقت تھی تو وہ عقل و دانش کی اور ایمان کی طاقت تھی۔ وہ مزمل جیسے گٹھے ہوئے جوان آدمی کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں تھا لیکن اس کی روحانی قوتیں بیدار تھیں۔ پھر وہ صرف عالم دین ہی نہ تھا' وہ سالار بھی تھا۔ تیغ زنی اور تیر اندازی میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے اُسی روز سلطان ملک شاہ کو یہ واقعہ سنایا اور کہا کہ وہ مزمل کو واپس اپنی طرف لے آئے گا۔

"سلطان مکرم!" — نظام الملک نے کہا — "اب ہمیں الموت پر فوج کشی کرنی پڑے گی۔ اس باطل کو فوجی طاقت سے ہی کچلا جا سکتا ہے۔ حملہ آور فوج کا سپہ سالار میں خود ہوں گا۔ آپ کی اجازت چاہئے"۔

"ہاں خواجہ!" — سلطان ملک شاہ نے کہا — "آپ کو اجازت ہے"۔

مزمل آفندی کو جب گھسیٹتے دھکیلتے ہوئے قید خانے میں لے گئے اور اسے ایک کوٹھڑی میں بند کر دیا تو اس نے سلاخوں کو پکڑ کر زور زور سے ہلانا اور چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

"تم مجھے قبر میں دفن کر دو تو بھی اس شخص کو قتل کرنے کے لئے نکل آؤں گا"۔ — مزمل یہی الفاظ دہرائے چلا جا رہا تھا۔

نظام الملک نے جب حکم دیا تھا کہ مزمل آفندی کو قید خانے میں ڈال دو تو اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میں اسے کل دیکھوں گا۔ اگلے روز اس نے قید خانے میں جانے کا ارادہ کیا تو اسے خیال آگیا کہ پہلے معلوم کر لیا جائے کہ مزمل کس حال میں ہے اور اس کا ردِ عمل اور رویہ کیا ہے۔ نظام الملک نے قید خانے میں ایک آدمی کو یہ پیغام دے کے بھیجا کہ معلوم کر کے آئے کہ مزمل کس حال میں ہے۔

کچھ وقت بعد اسے بتایا گیا کہ مزمل رات بھر جاگتا، چیختا اور چلاتا رہا ہے اور اب بھی وہ اسی کیفیت میں ہے۔

"کیا کہتا ہے؟" — نظام الملک نے پوچھا۔

"کہتا ہے میں نظام الملک کو قتل کر کے مروں گا" — قید خانے سے آنے والے آدمی نے جواب دیا۔

نظام الملک کو شمونہ نے تفصیل سے بتایا تھا کہ حسن بن صباح کے ہاں کس طرح لوگوں کے دماغوں اور دلوں پر قبضہ کر کے انہیں اپنے سانچے میں ڈھال لیا جاتا ہے اور کس طرح انہیں قاتل بنایا جاتا ہے۔ نظام الملک نے اپنے ایک خاص معتمد کو بلایا اور اسے سرگوشیوں میں کچھ ہدایات دے کر بھیج دیا۔ اس شخص کے جانے کے بعد نظام الملک نے اپنے ملازم کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ طبیب نجم کو اپنے ساتھ لے آئے۔

جس طبیب کو نظام الملک نے بلایا تھا اس کا پورا نام نجم بن الحجم مدنی تھا۔ وہ ضعیف

العمر آدمی تھا۔ مرو میں ہی نہیں اور سلطنتِ سلجوقیہ میں ہی نہیں بلکہ دوسری بادشاہیوں اور دُور دُور کے علاقوں میں بھی اس کی شہرت تھی۔ اسے سلجوقی سلطان کچھ ایسے اچھے لگے کہ وہ یہیں کا ہو کے رہ گیا تھا۔ وہ اسلام کا اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا شیدائی تھا۔ وہ اتنا ضعیف ہو چکا تھا کہ اب کم ہی کبھی باہر نکلتا تھا اور عام قسم کی بیماریوں کے مریضوں کو دیکھنے کا اس کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا اور نہ اس میں اتنی ہمت رہی تھی لیکن وہ آرام بھی نہیں کرتا تھا کیمیاگری اور تجربات میں لگا رہتا تھا۔

اسے جونہی نظام الملک کا پیغام ملا وہ سواری پر بیٹھا اور نظام الملک کے پاس پہنچ گیا۔ نظام الملک کو اطلاع ملی کہ طبیب نجم مدنی کی سواری آئی ہے تو وہ باہر کو دوڑ پڑا اور طبیب کا استقبال اس طرح کیا جس طرح اس نے سلطان ملک شاہ کا بھی نہیں کیا تھا۔

"محترم طبیب!" — نظام الملک نے کہا — "مجھے خود آپ کے پاس آنا چاہئے تھا میں آپ کو زحمت نہ دیتا....."

"وزیراعظم!" — طبیب نجم مدنی نے اس کی بات کاٹ کر کہا — "کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ آپ نے مجھے جس مقصد کے لئے بلایا ہے وہ بیان کر دیں؟"

نظام الملک نے طبیب کو مزمل آفندی کے متعلق بتانا شروع کر دیا۔ اس نے تفصیل سے بتایا کہ مزمل اس کے پاس کس جذبے سے اور کس طرح یہاں پہنچا تھا اور پھر اس نے ایک جنگ میں کیا کارنامہ سرانجام دیا تھا اور پھر اس نے طبیب کو تفصیل سے بتایا کہ مزمل آفندی نے اپنے جینے کا یہی ایک مقصد بنا لیا تھا کہ وہ حسن بن صباح کو قتل کرے گا۔ پھر اس نے طبیب کو بتایا کہ مزمل آفندی حسن بن صباح کے قتل کے ارادے سے چلا گیا لیکن چالیس بیالیس روز بعد واپس آیا تو اس کی شکل و صورت اور چال ڈھال تو وہی تھی لیکن وہ بالکل ہی بدل گیا تھا۔

"اس نے آتے ہی مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا" — نظام الملک نے کہا — "یہ تو مجھے کل از وقت معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مجھے قتل کرے گا اس لئے میں بچ گیا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسے یہ موقع میں نے خود فراہم کیا تھا کہ وہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کرے"۔

نظام الملک نے شمونہ کا حوالہ دے کر طبیب کو تفصیل سے بتایا کہ اس لڑکی نے اسے پہلے ہی خبردار کر دیا تھا کہ مزمل مجھ پر قاتلانہ حملہ کرے گا۔ نظام الملک نے طبیب کو شمونہ کے متعلق بھی سب کچھ بتایا اور اسے قاتلانہ حملے کا اور مزمل کی گرفتاری کا

واقعہ سنایا۔

"کیا وہ اس لڑکی شمونہ کو چاہتا ہے؟" — طبیب نے چونک کر پوچھا۔

"چاہتا ہی نہیں محترم طبیب!" — نظام الملک نے جواب دیا — "وہ تو اس لڑکی کو عشق کی حد تک چاہتا ہے اور اگر کسی انسان کے آگے سجدہ کرنے کی اجازت ہوتی تو مزمل اس لڑکی کے آگے سجدے کرتا رہتا"۔

"اس لڑکی کو یہیں بلا لو" — طبیب نے کہا — "آپ نے ابھی تک مجھے یہ نہیں بتایا کہ آپ چاہتے کیا ہیں۔ کیا آپ اس شخص مزمل آفندی کی قسمت کا فیصلہ کرنا چاہتے ہیں اور مجھ سے مشورہ لے رہے ہیں؟"

"اس کی قسمت کا فیصلہ کرنا میرے لئے کوئی مشکل نہیں تھا" — نظام الملک نے کہا — "فیصلہ کرنا ہوتا تو مجھے کسی کے مشورے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں اُسے اسی وقت اپنے محافظوں کو حکم دے کر قتل کروا دیتا اور کہتا کہ اس کی لاش کو دفن نہیں کرنا' باہر پھینک دو کہ اسے کتے اور گدھ کھا جائیں' لیکن محترم طبیب! میں مزمل آفندی جیسے قیمتی' جواں سال اور خوبرو آدمی کو ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ میں شاید آپ کو اچھی طرح بتا نہیں سکتا کہ اس جواں سال آدمی میں اسلام کی کس قدر شدید اور جذباتی محبت ہے۔ میرا ایک مقصد تو یہ ہے کہ میں اسے واپس اپنی اصلی حالت میں لے آؤں۔ دوسرا مقصد یہ ہے جو صرف آپ پورا کر سکتے ہیں' وہ یہ کہ اسے حسن بن صباح کے ہاں کسی ایسے عمل سے گزارا گیا ہے جس نے اس کے دل و دماغ کو اُلٹا دیا ہے۔ اُس کی نگاہ میں دوست دشمن بن گئے ہیں۔ میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ اپنے تجربے کی روشنی میں دیکھیں کہ وہ باطنی کس طرح اچھے بھلے انسان کو اپنوں کا ہی قاتل بنا دیتے ہیں"۔

"معزز نظام الملک!" — طبیب نے کہا — "آپ نے یہ بات آج سوچی ہے' میں بڑے لمبے عرصے سے اس مسئلے پر کام کر رہا ہوں۔ ایک مدت گزری مجھے پتہ چلا ہے کہ باطنی لوگوں کی سوچوں پر اور خیالوں پر قابض ہو کر انہیں مکمل ابلیس اور مکمل انسان نما بلکہ آدم خور بنا رہے ہیں۔ میں نے اپنے آدمی وہاں بھیجے جنہوں نے مجھے کچھ ضروری باتیں بتائیں۔ یہ حشیش کا کمال ہے اور پھر یہ کمال ہے ان لوگوں کا یعنی ان باطنیوں کے اپنے دماغ کا کہ انہوں نے انسانی فطرت کی سب سے بڑی کمزوری کو استعمال کیا ہے"۔

"محترم طبیب!" — نظام الملک نے کہا — "یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی

جانتا ہوں کہ وہ کس طرح لوگوں کے دل و دماغ پر قبضہ کرتے اور انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس اس کا کوئی توڑ ہے؟"

"جی ہاں!" — طبیب نے جواب دیا — "اس کا توڑ میں نے سال ہا سال کی محنت سے تیار کیا ہے..... لیکن میرے عزیز نظام الملک! ہم صرف اس شخص کو واپس اس کی اصلیت میں لا سکیں گے جو مزمل جیسا اِکا دُکا ہمارے پاس پہنچ جائے گا۔ حسن بن صباح اور اس کے ابلیسی گروہ نے اپنے زیرِ اثر علاقوں میں اجتماعی طور پر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ اس کا ہمارے پاس کوئی توڑ نہیں..... ہاں' آپ کے پاس اس کا ایک علاج موجود ہے۔ وہ کریں اور اس ابلیسی فتنے کو ختم کریں..... یہ ہے فوج کشی..... حملہ کریں' حسن بن صباح' احمد بن عطاش اور ان کے خاص گروہ کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیں اور اس کے بعد اسلام کی تبلیغ کریں"۔

"یہ تو ہم کر ہی رہے ہیں" — نظام الملک نے کہا — "میں نے سلطان ملک شاہ سے حملے کی اجازت لے لی ہے اور اس حملے کی قیادت میں خود کروں گا"۔

"لیکن آپ کو بہت کچھ سوچ کر قدم اٹھانا ہو گا" — طبیب نجم مدنی نے کہا — "میں نے کسی زمانے میں قلعہ الموت دیکھا تھا۔ اب تو سنا ہے کہ اس کے قابلِ انتظامات اور زیادہ مضبوط کر دیئے گئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ وہ قلعہ بلندی پر ہے"۔

"ہاں محترم طبیب!" — نظام الملک نے کہا — "یہ فوجی اور جنگی مسئلے ہیں۔ یہ مجھ پر چھوڑ دیں۔ آپ اتنا کریں کہ مزمل آفندی کے دماغ کو اس کی اصلی حالت میں لے آئیں"۔

○

قید خانے کی ایک کوٹھڑی میں مزمل آفندی چیخ چلا کر تھک گیا تھا اور دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ دروازے کی سلاخوں کے باہر ایک آدمی آ کر رُک گیا۔

"مزمل!" — اس آدمی نے سرگوشی کی۔

مزمل نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا۔

"مزمل آفندی!" — اس آدمی نے اب ذرا بلند سرگوشی کی — "یہاں آؤ"

"مجھے کیوں بلا رہے ہو؟" — مزمل آفندی نے تڑپ کر کہا — "یہاں سے چلے

جاؤ ورنہ میں....."

"آہستہ بول احمق آدمی!" — اس آدمی نے ذرا اور بلند سرگوشی میں کہا — "میں تمہارا دوست ہوں۔ یہاں آؤ"۔

مزمل آفندی سلاخوں کے قریب آکر اس آدمی کے سامنے بیٹھ گیا۔

"مجھے آج صبح پتہ چلا ہے کہ تمہیں قید کر دیا گیا ہے" — اس آدمی نے کہا — "میں تمہیں یہاں سے فرار کرادوں گا۔ خاموشی سے یہاں بیٹھے رہو۔ انہیں تنگ نہ کرو ورنہ یہ تمہیں اتنا ماریں پیٹیں گے کہ تم جان سے ہی ہاتھ دھو بیٹھو گے۔ میں جانتا ہوں کہ تم الموت سے کیوں یہاں آئے تھے۔ تمہیں جن لوگوں نے بھیجا ہے میں ان کا جاسوس ہوں اور مجھے ہدایات کا علم ہے۔ اس قید خانے میں میرا اثر و رسوخ چلتا ہے۔ میں بھی نظام الملک کو قتل کرنا چاہتا ہوں لیکن الموت سے امام حسن بن صباح کا پیغام ملا ہے کہ یہ کام مزمل آفندی کرے گا۔ مجھے یہ فرض سونپا گیا ہے کہ میں تمہاری مدد کروں اور تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ تو میں تمہیں اس میں سے نکالوں۔ تم آرام سے اور مکمل خاموشی سے یہاں بیٹھے رہو' تمہیں یہاں سے نکلوانا اور واپس الموت بھیج دینا میرا کام ہے"۔

"کیا میں نظام الملک کو قتل کر سکوں گا؟" — مزمل نے پوچھا۔

"پہلا کام تمہیں یہاں سے فرار کرانا ہے" — اس آدمی نے کہا — "اس کے بعد دیکھنا ہے کہ نظام الملک کو قتل کرنے کا موقع مل سکتا ہے یا نہیں۔ اگر دو یا تین دن موقع نہ ملا تو تمہیں واپس الموت بھجوا دیں گے اور موقع پیدا کر کے تمہیں واپس لے آئیں گے"۔

"ایک کام کر سکتے ہو؟" — مزمل آفندی نے کہا — "شمونہ نام کی ایک لڑکی یہاں ہے....."

"ہاں مزمل!" — اس آدمی نے کہا — "میں اسے جانتا ہوں۔ یہ بھی کیا جاسوسی ہوئی کہ میں شمونہ کو جان نہ سکتا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ اس وقت وہ نظام الملک کے ہاں گئی ہوئی ہے"۔

"میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ٹھیک تو ہے" — مزمل نے کہا — "کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے بھی پریشان کیا جا رہا ہو"

"نہیں!" — اس آدمی نے کہا — "اسے کوئی پریشانی نہیں۔ اگر تمہارے ساتھ تعلقات کی وجہ سے اسے بھی مشکوک سمجھا گیا ہوتا تو اسے تمہارے ساتھ ہی قید خانے میں پھینک دیا گیا ہوتا..... تم چاہو گے تو اسے بھی یہاں سے نکلوا کر تمہارے ساتھ بھیج دیں گے"۔

مزمل آفندی یوں مطمئن ہو گیا جیسے دہکتے ہوئے انگاروں پر پانی پھینک دیا گیا ہو۔

"اب تمہارے کھانے پینے کا انتظام میرے ہاتھ میں ہوگا" — اس آدمی نے کہا — "میری کوشش یہ ہوگی کہ میں خود تمہیں کھانا دینے آیا کروں۔ اگر میں نہ آسکوں تو جو کوئی آدمی جو کچھ بھی کھانے پینے کے لئے لائے وہ آرام اور اطمینان سے لے کر کھا لینا..... یوں ظاہر کرو جیسے تم اندر سے مر گئے ہو اور اب تم کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کرو گے..... مجھے اب یہاں سے چلے جانا چاہئے"۔

"ہاں بھائی میرے!" — مزمل نے کہا — "میں تم پر بھروسہ کروں گا۔ تم جاؤ لیکن میرے فرار کا انتظام جلدی کرو۔ میں کوشش یہ کروں گا کہ نظام الملک کو قتل کر کے واپس الموت جاؤں"۔

"ایسا ہی ہوگا مزمل!" — اس شخص نے کہا اور وہ چلا گیا۔

○

شمونہ نظام الملک کے خاص کمرے میں جیٹھی طبیب نجم مدنی کو سنا رہی تھی کہ وہ جب حسن بن صباح کے ساتھ تھی تو کیا کیا طریقے استعمال کر کے اپنے مطلب کے لوگوں کو اپنا آلۂ کار بنایا جاتا تھا۔ شمونہ نے طبیب کو یہ بھی بتایا کہ اُسے اور اُس جیسی لڑکیوں کو تربیت دے کے استعمال کیا جاتا تھا۔

"محترم بزرگ!" — شمونہ نے کہا — "حسن بن صباح کے پاس جادو بھی ہے اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ یہ جادو اُس نے احمد بن عطاش سے سیکھا ہے لیکن یہ جادو کم ہی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی بجائے ایک اور جادو استعمال کیا جاتا ہے جس سے کوئی نہیں بچ سکتا' وہ جادو میں ہوں۔ مجھے دیکھ لیں..... میں نے یہ جادو اپنے ہاتھوں اور اپنی زبان سے چلایا بھی ہے اور چلتا دیکھا بھی ہے"۔

"تو اب میری بات سنو شمونہ!" — طبیب نجم نے کہا — "اب تمہیں یہی جادو مزمل آفندی پر چلانا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تمہارا جادو آسانی سے چل جائے گا کیونکہ مجھے

بتایا گیا ہے کہ وہ تم سے دلی نہیں بلکہ روحانی محبت کرتا ہے"۔

"ہاں میرے بزرگ!" ـــــ شمونہ نے کہا ـــــ "مزمل کو واپس اُسی مقام پر لانے کے لئے میں تو اپنی جان بھی قربان کر دوں گی۔ آپ مجھے کہیں گے کہ اپنی جان دے دو تو مزمل اپنی اصلی حالت میں آجائے گا تو میں اس کے لئے تیار ہوں"۔

"ایسی ضرورت نہیں پڑے گی" ـــــ طبیب نے کہا ـــــ "میں تمہیں کچھ باتیں اور کچھ طریقے بتاؤں گا۔ تم نے اس کے مطابق عمل کرنا ہے"۔

اُس زمانے میں برین واشنگ کی اصطلاح سے کوئی واقف نہیں تھا لیکن برین واشنگ کا عمل موجود تھا اور حسن بن صباح برین واشنگ کا غیر معمولی طور پر ماہر تھا اور اُس نے جو طریقے وضع کئے تھے انہیں آج کے ماہرینِ نفسیات اور ڈاکٹر بھی مستند مانتے ہیں۔

"میرے عزیز نظام الملک!" ـــــ طبیب نجم مدنی نے کہا ـــــ "اللہ نے ہر جاندار کا جوڑا پیدا کیا ہے..... نر اور مادہ..... کیا آپ نے جانوروں کو دیکھا نہیں کہ ایک مادہ کی خاطر وہ ایک دوسرے کا خون بہا دیتے ہیں۔ انسان کو خدا نے عقل دی ہے' جذبات دیے ہیں اور کچھ جبلتیں دی ہیں اس لئے انسانی نر اور مادہ ایک دوسرے کی محبت حاصل کرنے کے لئے ایسے ایسے طریقے سوچ لیتے ہیں کہ انسان خود بھی حیران رہ جاتا ہے۔ مرد کی فطرت میں عورت کی طلب بڑی شدید ہوتی ہے۔ مرد نے جب بھی دھوکا کھایا عورت کے ہاتھوں کھایا۔ اس لڑکی شمونہ جیسی عورت ایک دلکش نشہ بن کر اپنی پسند کے آدمی پر طاری ہو جاتی ہے۔ اگر عورت خود غرض ہے اور وہ اپنی پسند کے مرد سے کوئی دنیاوی فائدہ اٹھانا چاہتی ہے مثلاً اس کے مال و اموال پر قبضہ کرنا چاہتی ہے تو وہ اپنی نسوانیت کے نشے کے ساتھ کوئی اور نشہ بھی شامل کر لیتی ہے جو وہ دھوکے سے اس شخص کو دیتی رہتی ہے۔ اُس کے ساتھ وہ پیار و محبت کی ایسی ایسی مصنوعی حرکتیں کرتی ہے کہ اُس نے جنگل میں آیا ہوا مرد اس کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہوتا رہتا ہے۔ حسن بن صباح یہی نسخہ استعمال کر رہا ہے۔ میں اس کی عقل کی تعریف کرتا ہوں کہ حشیش کو جس طرح اس نے استعمال کیا ہے وہ آج تک اور کسی کے دماغ میں نہیں آیا..... میں مزمل آفندی کے دماغ پر جو حشیش کے اثرات ہیں وہ اتار دوں گا"۔

"کیا آپ اسے کوئی دوا پلائیں گے یا کوئی اور طریقہ اختیار کرنا ہے؟" ـــــ نظام الملک نے پوچھا۔

"ہاں!" — طبیب ہم بے جواب دیا — "اسے دوائی پلائی جائے گی لیکن آپ نے بتایا ہے کہ وہ قید خانے کی کوٹھڑی میں بہت زیادہ اودھم برپا کر رہا ہے۔ آپ اسے دوائی کس طرح پلائیں گے؟ یہ کام آپ کو کرنا ہو گا"۔

"ہاں محترم طبیب!" — نظام الملک نے کہا — "میں نے ایک انتظام تو کیا ہے کہ اس شخص پر قابو پایا جا سکے..... ذرا ٹھہرئیے..... میں معلوم کرتا ہوں کہ وہ آدمی واپس آیا ہے یا نہیں"۔

نظام الملک نے دربان کو بلا کر پوچھا کہ وہ آدمی آیا ہے کہ نہیں۔ دربان کو معلوم تھا کہ کس شخص کے متعلق پوچھا جا رہا ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ ابھی ابھی آیا ہے۔ نظام الملک نے اسے کہا کہ اسے فوراً" اندر بھیج دو۔ دربان کے جانے کے تھوڑی دیر بعد وہی آدمی جو قید خانے میں حسن بن صباح کا جاسوس بن کر مزمل آفندی کے پاس گیا اور اسے ٹھنڈا کر آیا تھا' اندر آیا۔

"کہو بھائی!" — نظام الملک نے اس سے پوچھا — "کیا کر کے آئے ہو!"

"سب ٹھیک کر آیا ہوں" — اس شخص نے جواب دیا — "وہ بالکل ٹھنڈا ہو گیا ہے۔ میں نے اسے کہا ہے کہ آئندہ اس کے کھانے پینے کا انتظام میں کروں گا۔ اس نے بخوشی یہ صورت قبول کر لی ہے۔ اس نے مجھ پر مکمل اعتماد کیا ہے"۔

"آفرین!" — نظام الملک نے کہا پھر وہ طبیب سے مخاطب ہوا — "اب اُسے وہ دوائی آسانی سے پلائی جا سکے گی جو آپ اسے دینا چاہیں گے"۔

نظام الملک نے اس آدمی کو باہر بھیج دیا۔

"میں آپ کو خبردار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں" — طبیب نے کہا — "دوائی تو میرے پاس تیار ہے۔ یہ میرا پہلا تجربہ ہو گا۔ اس دوائی کا اثر یہ ہو گا کہ مزمل بے ہوش ہو جائے گا یا یوں کہہ لیں کہ سو جائے گا۔ ایسا ہونا تو نہیں چاہئے لیکن میں ڈرتا ہوں کہ دوائی کی مقدار ایک آدھا قطرہ بھی زیادہ ہو گئی تو اس شخص کی موت واقع ہو سکتی ہے"۔

"نہیں میرے بزرگ!؟" — شمونہ نے تڑپ کر کہا اور طبیب کے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر التجا کے لہجے میں بولی — "ایسا نہ کہیں۔ جان لینی ہے تو میری لے لیں۔ موت واقع ہو تو میری ہو۔ مجھے کوئی طریقہ بتائیں۔ اگر کہیں تو میں اس کی کال کوٹھڑی میں بند ہو جاتی ہوں۔ شب و روز اس کے ساتھ رہوں گی اور مجھے امید ہے کہ اسے

واپس اپنی اصلی ذہنی اور جذباتی حالت میں لے آؤں گی"۔

"شمونہ بیٹی!" — نظام الملک نے کہا — "ہم مزمل جیسے قیمتی آدمی کو زیادہ دیر تک ایسی حالت میں نہیں دیکھ سکتے۔ میں بھی تمہاری طرح مزمل کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں"۔

"گھبراؤ نہیں لڑکی!" — طبیب نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا — "میں نے یہ تو نہیں کہا کہ وہ ضرور ہی مر جائے گا' میں نے صرف اظہار کیا ہے ایک خطرے کا۔ ہمیں یہ خطرہ مول لینے دو۔ زیادہ تر کام تو تم نے کرنا ہے اور یہ میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم نے کیا کرنا ہے"۔

"محترم طبیب!" — نظام الملک نے کہا — "آپ وہ دوائی دے دیں۔ صرف یہ خیال رکھیں کہ اس کی مقدار کم رکھیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ جڑی بوٹیوں سے بنائی ہوئی دوائی کسی کی جان بھی لے سکتی ہے"۔

"میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ اس دوائی میں کیا کیا ڈالا گیا ہے؟" — طبیب نے کہا — "یہ نایاب جڑی بوٹیوں سے بنی ہے جو ہمارے علاقے میں شاید ہی کہیں نظر آئیں۔ اس میں صحرائی سانپ کے زہر کا کشتہ بھی شامل ہے۔ اس میں کچھوے کی چربی بھی ایک خاص عمل سے گزار کر شامل کی گئی ہے۔ یہ تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ صحرائی سانپ ملنا کتنا دشوار ہے۔ صحرا کہاں ہے' اور کون وہاں سانپ کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہو گا۔ بہرحال میں نے یہ سانپ حاصل کیا اور اس کا زہر مار کر دوائی میں شامل کیا ہے"۔

طبیب نے شمونہ اور نظام الملک کو کچھ ہدایات دینی شروع کر دیں۔

○

سورج غروب ہو گیا۔ قید خانے کی راہداریوں کی مشعلیں جلا دی گئیں۔ کچھ دیر بعد قیدیوں میں کھانا تقسیم ہونے لگا۔

ایک سنتری نے مزمل آفندی کی کوٹھڑی کا دروازہ کھولا اور خود ایک طرف ہو گیا۔ کوٹھڑی میں وہ شخص داخل ہوا جو مزمل کو نصف دن اکر گیا تھا۔ اس نے کھانا اٹھا رکھا تھا۔ سالن اور روٹیوں کے علاوہ ایک پیالہ دودھ کا بھرا ہوا تھا۔ مزمل یہ کھانا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"تمہارے چہرے پر حیرت کیوں؟" — اس آدمی نے کہا — "میں نے تمہیں کہا

تھا کہ آئندہ تمہارے کھانے کا انتظام میں کیا کروں گا۔ تمہیں اب یہی کھانا ملا کرے گا۔ میں نے تمہارے فرار کا انتظام کر لیا ہے۔ صبر کرو یا تین دن انتظار کرنا پڑے گا۔ آرام سے کھانا کھاؤ اور یہ دودھ پی لو۔ میں جا رہا ہوں"۔

اس شخص نے یہ بات مزمل کے کان میں اتنی دھیمی آواز میں کہی تھی کہ سنتری کو سنائی نہیں دیتی تھی..... کوٹھڑی کا دروازہ پھر بند ہو کر مقفل ہو گیا۔ سنتری اس راہداری میں جس میں مزمل آفندی کی کوٹھڑی تھی' آہستہ آہستہ ٹہل رہا تھا۔ یہ اس کی اور اس جیسے سنتریوں کی ہر رات کی ڈیوٹی تھی لیکن یہ سنتری جب مزمل کی کوٹھڑی کے آگے سے گزرتا تھا تو اس کے قدم رک جاتے اور مزمل کو وہ سلاخوں میں سے غور سے جھانکتا تھا۔ مزمل کھانا کھا رہا تھا۔ سنتری دوسرے چکر پر آیا تو دیکھا کہ مزمل نے دودھ کا پیالہ منہ سے لگا رکھا تھا۔

سنتری آگے نکل گیا اور کہیں رک گیا تھا۔ کچھ وقت گزار کر وہ پھر راہداری میں آیا اور حسب معمول مزمل کی کوٹھڑی کے سامنے آ کر بہت آہستہ ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ پیالہ فرش پر پڑا تھا۔ مزمل نے سارا دودھ پی لیا تھا اور وہ دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے بیٹھا تھا۔ اس کا سر ڈول رہا تھا اور آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ سنتری دو چار قدم آگے گیا اور رک گیا۔ وہ پھر واپس آیا تو دیکھا کہ مزمل فرش پر پیٹھ کے بل پڑا تھا اور اس کے خراٹے سنائی دے رہے تھے۔ سنتری دوڑ پڑا اور راہداری سے نکل گیا۔

تھوڑی ہی دیر بعد وہی شخص آیا جو مزمل کا دوست بن کر اسے کھانا اور دودھ دے گیا تھا۔ سنتری اس کے ساتھ تھا۔ اس کے اشارے پر سنتری نے دروازہ کھولا۔ وہ شخص اندر گیا اور مزمل کے پاس بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس نے مزمل کے سر پر ہاتھ رکھ کر ہلایا۔

مزمل بیدار نہ ہوا۔

دوسری بار اس آدمی نے مزمل کے سر کو ذرا زور سے ہلایا' پھر بھی مزمل کی آنکھ نہ کھلی۔ وہ آدمی اٹھا اور سنتری کو یہ کہہ کر تیزی سے نکل گیا کہ کوٹھڑی کو مقفل کر دو۔

وہ آدمی دوڑتا ہوا راہداری سے نکلا' دوڑتا ہوا ہی قید خانے سے نکلا' باہر اس کا گھوڑا کھڑا تھا' اس پر سوار ہو کر اس نے ایڑ لگا دی۔ قید خانہ شہر سے ذرا دور ویران اور بنجر علاقے میں تھا۔

اُس نے گھوڑا ملک شاہ کے دروازے پر جا روکا اور وہ کود کر گھوڑے سے اُترا۔ یہ دوڑتا ہوا اندر چلا گیا۔ دربان اور محافظ کھڑے تھے لیکن انہوں نے اُسے نہ روکا۔ وہ جانتے تھے کہ یہ شخص آئے تو اسے روکنا نہیں۔

وہ ایک کمرے میں چلا گیا جہاں طبیب نجم مدنی، نظام الملک اور شمونہ موجود تھے۔

"کیا خبر ہے؟" ___ نظام الملک نے پوچھا۔

"بڑی اچھی خبر ہے" ___ اس آدمی نے جواب دیا ___ "وہی اثر ہوا ہے جو محترم طبیب نے بتایا تھا۔ وہ اتنی گہری نیند سو گیا ہے کہ میں نے اسے زور زور سے ہلایا، اُس کے سر کو جھنجھوڑا لیکن اُس کے پپوٹوں میں ذرا سی بھی حرکت نہیں ہوئی"۔

"کیا وہ زندہ ہے؟" ___ شمونہ نے تڑپ کر پوچھا۔

"ہاں، وہ زندہ ہے" ___ اس آدمی نے جواب دیا ___ "کیا میں اتنا احمق نظر آتا ہوں کہ مجھے سوئے ہوئے اور مرے ہوئے آدمی میں فرق معلوم نہ ہو؟"

"نظام الملک!" ___ طبیب نجم نے کہا ___ "اسے یہاں لے آؤ"۔

○

کچھ دیر بعد مزمل آفندی کی کوٹھڑی کا دروازہ کھلا۔ ایک چارپائی کوٹھڑی میں داخل ہوئی جس کے ساتھ چار آدمی تھے۔ چارپائی فرش پر رکھ کر ان آدمیوں نے فرش پر پڑے ہوئے مزمل کو اٹھایا اور چارپائی پر ڈال دیا۔ اس میں بیداری کے کوئی آثار نہیں تھے۔

ان آدمیوں نے چارپائی اٹھائی اور کوٹھڑی سے نکل گئے پھر وہ قید خانے سے بھی نکل گئے۔

نظام الملک، طبیب اور شمونہ بیتابی سے انتظار کر [illegible]ن میں شمونہ بہت ہی بے چین اور بیتاب تھی۔ اس کے حسین چہرے پر گھبراہٹ اور دل میں دعائیں تھیں۔ وہ بار بار باہر دیکھتی تھی۔

آخر وہ لوگ مزمل کو اٹھائے ہوئے آ گئے اور چارپائی اسی کمرے میں لا رکھی۔ شمونہ نے لپک کر مزمل کی کلائی پکڑی اور اس کی نبض محسوس کی۔ اس کے چہرے پر سکون اور اطمینان کا تاثر آ گیا۔ مزمل آفندی زندہ تھا۔

مزمل کو اٹھا کر پلنگ پر ڈال دیا گیا اور وہ آدمی چارپائی اٹھا کر کمرے سے نکل گئے۔

"شمونہ!" ___ طبیب نے مزمل کی نبض پر انگلیاں رکھے ہوئے کہا ___ "خطرہ ٹل گیا ہے۔ نبض بالکل ٹھیک چل رہی ہے۔ اگر دوائی کا اثر وہ ہوتا جو میں نے بتایا تھا کہ ہو سکتا ہے تو مزمل کی نبض اس وقت تک خاموش ہو چکی ہوتی..... ہم چلے جائیں گے۔ تم یہاں رہو گی اور اگر تمہیں ساری رات جاگنا پڑا تو جاگتی رہنا۔ میں نے تمہیں ساری بات بتا دی ہے اور اچھی طرح سمجھا دیا ہے کہ تم نے کیا کرنا ہے۔ دودھ وہ رکھا ہے۔ یہ جاگ اٹھے تو پہلا کام یہ کرنا کہ اسے یہ دودھ پلا دینا اور جو کچھ تم نے کرنا ہے وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ یہ پھر سو جائے گا۔ اسے زبردستی بیدار کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم خود بھی سو جانا۔ یہ بہت دیر بعد، کل دن کو کسی وقت جاگے گا۔ آج رات کے پچھلے پہر اسے کچھ بیدار ہونا چاہئے"۔

"اور شمونہ!" ___ نظام الملک نے کہا ___ "دروازے کے باہر چار آدمی ہر وقت موجود رہیں گے۔ کوئی مشکل پیش آ جائے یا مزمل بیدار ہو کر پھر ہنگامہ برپا کرے یا بھاگنے کی کوشش کرے تو یہ آدمی اسے سنبھال لیں گے"۔

"اب یہ سوچ لو شمونہ!" ___ طبیب نجم نے کہا ___ "اب تم پر منحصر ہے کہ اسے سنبھال لیتی ہو یا مزید بگاڑ دیتی ہو۔ تم خود عقل والی ہو اور مردوں کو لگام ڈالنا جانتی ہو۔ یہ تو پہلے ہی تمہاری محبت میں گرفتار ہے"۔

شمونہ نے انہیں تسلی دی کہ وہ مزمل کو سنبھال لے گی۔ وہ دونوں کمرے سے نکل گئے اور شمونہ اُس پلنگ پر بیٹھ گئی جس پر مزمل چت لیٹا دھیمے دھیمے خراٹے لے رہا تھا۔

○

یہ کمرہ خاص طور پر مزمل آفندی کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ نظام الملک کے گھر کا کوئی کمرہ اسی طرح تیار کیا جا سکتا تھا لیکن طبیب نے وہ مناسب نہ سمجھا کیونکہ مزمل نظام الملک کی دشمنی لے کر آیا تھا۔ خطرہ تھا کہ بیداری کے بعد اسے پتہ چلتا کہ وہ نظام الملک کے گھر میں ہے تو وہ پھر بے قابو ہو سکتا تھا۔ نظام الملک نے سلطان ملک شاہ کو اس سارے واقعے سے باخبر رکھا ہوا تھا۔ طبیب نے سلطان سے کہا تھا کہ وہ اس کے محل کا ایک کمرہ استعمال کرنا چاہتا ہے۔ سلطان نے بخوشی اجازت دے دی تھی۔

اس کمرے کی زیب و زینت کا اہتمام طبیب نے اپنی پسند اور ضرورت کے مطابق کیا تھا۔ بستر نہایت نرم ملائم اور آرام دہ تھا۔ کمرے کے دروازوں اور کھڑکیوں پر خاص،

رنگ کے پردے لٹکائے گئے تھے۔ قالین بیش قیمت اور دلفریب تھا۔ کمرے میں خاص قسم کے پھولوں والے پودے جو گملوں میں لگے ہوئے تھے' رکھوائے گئے تھے۔ طبیب نے ایک خاص قسم کا عطر تیار کر رکھا تھا جو اس نے تھوڑا تھوڑا بستر پر اور پردوں پر مل دیا تھا۔

شمونہ کے لئے طبیب نے کچھ سوچ کر انتخاب کیا تھا کہ یہ کون سا لباس پہنے۔ اُس نے شمونہ سے کہا تھا کہ وہ بالوں کو گوندھ کر یا باندھ کر نہ رکھے بلکہ بال کھلے چھوڑ دے۔ اُسے قمیض ایسی پہنائی گئی تھی کہ اُس کے کندھے اور بازو ننگے رکھے گئے تھے۔ طبیب نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو کس طرح استعمال کرے گی۔ طبیب نے زور دے کر کہا تھا کہ اپنے جسم کو بچا کر رکھے اور اپنی روح کو پیار اور محبت کے ذریعے مزمل کی روح پر غالب کر دے۔ شمونہ نے طبیب سے کہا تھا کہ وہ اس کھیل کی مہارت اور تجربہ رکھتی ہے۔ مزمل کے معاملے میں سہولت یہ تھی کہ وہ ایک دوسرے کو دل کی گہرائیوں سے چاہتے تھے۔

شمونہ سوئے ہوئے مزمل کو دیکھتی رہی۔ وہ اس کے بیدار ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔ کبھی وہ اٹھ کھڑی ہوتی اور کمرے میں ٹہلنے لگتی۔ کبھی وہ مزمل کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگتی۔ اس کا انداز ایک ماں جیسا تھا جس کا بڑا ہی پیارا بچہ سویا ہوا ہو۔

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔ شمونہ کو غنودگی آنے لگی تھی۔ وہ سو ہی جانے کو تھی کہ مزمل کے جسم کو حرکت ہوئی۔ شمونہ بیدار ہو گئی اور مزمل کے پلنگ پر جا بیٹھی۔ مزمل نے کروٹ بدلی۔ شمونہ کو معلوم تھا کہ اب اس نے کیا کرنا ہے۔

مزمل نے کروٹ اس طرح بدلی تھی کہ اُس کا منہ شمونہ کی طرف تھا۔ شمونہ اُس کے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ مزمل کا ایک ہاتھ شمونہ کی گود میں آ گیا۔ شمونہ وہ ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے آہستہ آہستہ مسلنے لگی۔ پھر اس نے مزمل کے بالوں میں انگلیاں پھیرنی شروع کر دیں۔

مزمل کی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔

"مزمل!" — شمونہ نے اس پر جھک کر اپنے ہونٹ مزمل کے کان کے قریب کر کے کہا — "تم میرے پاس آ گئے ہو۔ اب کوئی ہمیں جدا نہیں کر سکتا"۔

مزمل کی آنکھیں پوری کی پوری کھل گئیں اور وہ پیٹھ کے بل ہو گیا۔ شمونہ اس پر

اس طرح جھک گئی کہ اس کے ریشم جیسے کھلے بال مزمل کے گالوں اور گردن پر رینگنے لگے۔

"میں کہاں ہوں؟" — مزمل نے خوابناک آواز میں پوچھا — "تم کون ہو؟"

"تم میرے پاس ہو" — شمونہ نے پیار بھری آواز میں کہا — "تم اُس پیار کی جنت میں آ گئے ہو جہاں کوئی کسی کا خون نہیں بہا سکتا۔ میں ہوں تمہاری روح"۔

"میں قید خانے میں ہوں؟" — مزمل نے یوں پوچھا جیسے نیند میں بول رہا ہو۔

"ہاں تم میرے دل کے قید خانے میں بند ہو" — شمونہ نے پہلے سے زیادہ پیاری آواز میں کہا — "تم میری محبت کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہو"۔

مزمل آفندی کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ اس کے اور مزمل آفندی کے چہرے کے درمیان فاصلہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے آپ ہی شمونہ کے بالوں میں الجھ گیا۔ شمونہ کے ہونٹوں پر تبسم تھا۔ اس نے آنکھیں مزمل کی آنکھوں میں ڈال دیں۔ طبیب نے شمونہ کو جو ہدایات دی تھیں' ان کے مطابق اس نے مزمل کے ساتھ باتیں کیں۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ مزمل ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ کمرے کو دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں سارے کمرے میں گھوم گئیں۔

"شمونہ!" — مزمل نے وحشی سی اور حیرت زدہ سی آواز میں پوچھا — "تم آ گئیں؟..... تم جھوٹ تو نہیں بولو گی..... میں کہاں سویا تھا؟..... میں نے..... میں نے شمونہ!..... میں نے شاید خواب دیکھا ہے" — اس کے ماتھے پر شکنیں ظاہر ہوئیں جیسے وہ ذہن کے ویرانے میں کچھ ڈھونڈ رہا ہو لیکن اُسے کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔

شمونہ نہیں چاہتی تھی کہ مزمل ایک بار پھر سو جائے۔ وہ اسے بیدار رکھنا چاہتی تھی اور اُسے واپس اسی ذہنی کیفیت میں لانا چاہ رہی تھی جس کیفیت میں وہ حسن بن صباح کو قتل کرنے کے ارادے سے روانہ ہوا تھا لیکن طبیب نجم مدنی نے اسے کہا تھا کہ یہ جاگ اٹھے تو اس کے ساتھ ایک دو باتیں کرنا اور یہ تمہیں پہچان لے کہ تم شمونہ ہو اور اس کے بعد اسے پھر دودھ کا پیالہ پلا دینا۔ شمونہ کو معلوم تھا کہ اس دودھ میں وہی دوائی شامل کی گئی ہے لیکن اس کی مقدار اب کم رکھی گئی ہے۔

"مزمل!" — شمونہ نے اس کے گالوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر کہا — "تم بڑے لمبے اور بڑے کٹھن سفر سے واپس آئے ہو۔ میں تمہیں دودھ پلاؤں گی پھر

جاتا۔ تھکن دور ہو جائے گی تو میں تمہارے پاس بیٹھوں گی اور ہم پھر وہی پیار کی باتیں کریں گے"۔

شمونہ اٹھی اور دودھ کا پیالہ اٹھا لائی۔ مزمل اسے حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ شمونہ نے پیالہ اپنے ہاتھوں میں ہی رکھا اور اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ مزمل نے دو تین سانسوں میں دودھ پی لیا۔ دودھ میں اتنا میٹھا ڈالا گیا تھا جس سے دوائی کا ذائقہ دب گیا تھا۔

مزمل پھر غنودگی میں چلا گیا۔ شمونہ کو طبیب نے بتایا تھا کہ یہ پھر غنودگی میں جائے گا تو اس کے ساتھ کیا باتیں کرنی ہیں اور اس وقت تک یہ باتیں کرنی ہیں جب تک یقین نہ ہو جائے کہ یہ سو گیا ہے۔

شمونہ نے اب جو پیار کی باتیں شروع کیں تو اس کے اپنے آنسو نکل آئے۔ پیار کی ان باتوں میں ایک انسان کی دوسرے انسان سے محبت کی بات نہیں تھی بلکہ بنی نوع انسان کی محبت ان باتوں میں رچی بسی ہوئی تھی۔ طبیب کا دراصل مطلب یہ تھا کہ غنودگی کے عالم میں مزمل کے ذہن سے تخریب کاری اور قتل کے خیالات نکال کر اس میں پیار و محبت اور روحانیت کا نور بھرا جائے۔ شمونہ نے ایسے پُراثر طریقے سے یہ باتیں آہستہ آہستہ کیں کہ مزمل نے شمونہ کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہونٹوں سے لگایا اور اس کے ساتھ ہی وہ گہری نیند سو گیا۔ شمونہ کو ایسی بڑی نیند آئی تھی کہ وہ بھی وہیں لڑھک گئی اور سو گئی۔

○

صبح طلوع ہوئی تو طبیب اور نظام الملک یہ دیکھنے آئے کہ رات کس طرح گزری ہے۔ نظام الملک نے دروازے پر دستک دی اور انتظار کرنے لگا۔ خاصی دیر گزر جانے کے بعد بھی اندر سے کوئی جواب نہ آیا نہ شمونہ باہر نکلی تو اس نے ایک بار پھر دستک دی۔ پھر بھی کوئی جواب نہ آیا تو نظام الملک نے دروازہ کھولا اور طبیب کو ساتھ لے کر وہ اندر چلا گیا۔ دیکھا کہ شمونہ اس طرح گہری نیند سوئی ہوئی تھی کہ اس کا سر مزمل کے سینے پر تھا اور اس کی ٹانگیں پلنگ سے نیچے لٹک رہی تھیں۔ مزمل ہلکے ہلکے خراٹے لے رہا تھا۔ طبیب نے وہ پیالہ دیکھا جس میں رات کو پلانے والا دودھ تھا۔ پیالہ خالی تھا۔

"آ میرے نظام الملک!" ۔۔۔ طبیب نے کہا ۔۔۔ "شمونہ نے اسے رات کو دودھ پلا دیا تھا۔ پیالہ خالی پڑا ہے۔ یہ دوپہر کے بعد جاگے گا۔ شمونہ شاید جلدی جاگ اٹھے۔ اس کی نیند جاتی رہی ہے کہ یہ رات بھر سو نہیں سکی"۔

دونوں کمرے سے نکل گئے۔

تین دن اور راتیں مسلسل مزمل کو یہ دوائی دودھ میں ملا کر پلائی جاتی رہی۔ ہر بار دوائی کی مقدار کم کرتے چلے گئے۔ وہ جب بیدار ہوتا تھا تو شمونہ اس کے ساتھ اس طرح کی باتیں کرتی تھی جس طرح اسے طبیب نے سمجھا کے بتائی تھیں۔ اس وقت مزمل کا ذہن نیم بیدار ہوتا تھا اور شمونہ جس پیارے انداز میں بات کرتی تھی وہ اس کے ذہن میں اترتی چلی جاتی تھی۔

یہ عمل طبیب کی نگرانی میں جاری رکھا گیا اور چوتھے دن اسے کوئی دوائی نہ دی گئی۔ جب وہ بیدار ہوا تو طبیب نے اس کے پاس بیٹھ کر اس کی کنپٹیاں اپنے دونوں انگوٹھوں سے آہستہ آہستہ ملنی شروع کر دیں اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کچھ باتیں کیں۔ یہ ایک قسم کا وہ عمل تھا جسے آج ہپناٹزم کہتے ہیں۔ یہ برین واشنگ جیسا ہی ایک عمل تھا جو سات آٹھ روز چلتا رہا اور کامیاب رہا۔ مزمل آفندی شیرازی نے واپس اپنے آپ میں آگیا۔ طبیب کو توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اصلی ذہنی کیفیت میں آ جائے گا۔ طبیب کی دوائی کا اپنا اثر تو تھا ہی خود طبیب نے کہا کہ اس دوائی کے اثر کو تیز اور کئی گنا زیادہ کرنے میں شمونہ کا ہاتھ تھا۔ ایک روز نظام الملک مزمل کے سامنے آیا۔ کوئی نہیں بتا سکتا تھا کہ مزمل کا ردعمل اور رویہ کیا ہو گا۔ طبیب بھی وہاں موجود تھا اور شمونہ بھی تھی۔ کمرے کے دروازے کے ساتھ ہی باہر نظام الملک کے محافظ تیار کھڑے تھے۔

مزمل آفندی نے نظام الملک کو دیکھا اس کے چہرے پر حیرت کا تاثر تھا۔ نہایت آہستہ آہستہ اٹھا۔ نظام الملک بازو پھیلا کر اور ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے ہوئے اس کی طرف تیزی سے بڑھا۔

مزمل نے بھی بازو پھیلا دیئے اور دوسرے لمحے وہ ایک دوسرے کے بازوؤں میں تھے۔

"کیوں مزمل!" ۔۔۔ نظام الملک نے اس کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بڑے پیار سے پوچھا ۔۔۔ "کہاں چلے گئے تھے؟ ..... میں تو سمجھا کہ تم چلے ہی گئے ہو۔

"یہ تو میں بتا نہیں سکتا" ۔۔ مزمل نے کہا ۔۔ "آپ کو دیکھ کر کچھ یاد آتا ہے..... یہ بھی یاد آتا ہے کہ آپ نے مجھے جانے سے روکا تھا اور میں پھر بھی چلا گیا تھا"۔

"اور اب؟" ۔۔ نظام الملک نے بڑے پیارے لہجے میں پوچھا ۔۔ "اب تو نہیں جاؤ گے؟"

"نہیں!" ۔۔ مزمل نے مسکرا کر جواب دیا ۔۔ "نہیں جاؤں گا..... اب کہیں نہیں جاؤں گا"۔

دو تین دن اور گزرے تو مزمل کو سب کچھ یاد آنے لگا۔ اب ایسا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ اس کی حالت پھر بگڑ جائے گی۔ اس پر ایک اور ہی قسم کی کیفیت طاری ہو گئی۔ یہ پچھتاوے، شرمندگی اور حسن بن صباح سے انتقام لینے والی کیفیت تھی۔ نظام الملک اور شمونہ نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور ایک دو دن صرف کر کے اسے اس کیفیت سے نکال لیا۔

"مزمل آفندی!" ۔۔ ایک روز نظام الملک نے اسے کہا ۔۔ "جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب مجھے یہ بتاؤ کہ وہاں تمہارے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا۔ یہ میں اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ ہمیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ باطنی کس طرح تم جیسے جذبے والے آدمی پر بھی غالب آ جاتے ہیں اور اسے اپنا آلۂ کار بنا لیتے ہیں"۔

"میں بتا سکتا ہوں" ۔۔ مزمل آفندی نے کہا ۔۔ "مجھے وہاں گذارا ہوا ایک ایک لمحہ یاد آ گیا ہے..... میں خود چاہتا ہوں کہ آپ کو وہ ساری روداد سناؤں۔ آپ کسی اور خیال سے مجھ سے وہ باتیں سننا چاہتے ہیں لیکن میں اس خیال سے آپ کو سنانا چاہتا ہوں کہ آپ کو پتہ چلے کہ میں کتنا مجبور ہو گیا تھا۔ میرا دماغ میرے قابو سے نکل گیا تھا"۔

"وہ بھول جاؤ" ۔۔ نظام الملک نے کہا ۔۔ "تم نے کوئی گناہ نہیں کیا۔ مجھے بتاؤ کہ تمہارے ذہن پر قبضہ کس طرح کیا گیا تھا؟"

"انہوں نے مجھے کال کوٹھڑی میں بند کر دیا" ۔۔ مزمل آفندی نے کہا ۔۔ "اس کوٹھڑی میں ایسی بدبو تھی جیسے وہاں مردار یا انسانی لاشیں گل سڑ رہی ہوں۔ مجھے تین دن نہ کچھ کھانے کے لئے دیا گیا اور نہ پینے کے لئے پانی کا گھونٹ دیا گیا۔ ایک طرف میرا خون کھولتا تھا، اپنا تھا کہ میں دھوکے میں آ گیا ہوں۔ اگر میں حسن بن صباح کو قتل کر چکا ہوتا تو پھر وہ مجھے کیسی ہی اذیتیں کیوں نہ دیتے، میں برداشت کر لیتا اور اس موت کو خندہ

پیشانی سے قبول کر لیتا جو آہستہ آہستہ اور مجھے اذیتیں دے دے کر مارتی۔ دوسری طرف جسم جواب دے رہا تھا۔ میں سات آٹھ دن بھوکا رہ سکتا تھا لیکن پانی کے بغیر ایک دن بھی گزارنا محال تھا.....

"اس کمرے میں جو بدبو تھی وہ میں بیان ہی نہیں کر سکتا کہ یہ کیسی تھی۔ اس بدبو نے میرا دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا۔ پھر میں خود اپنا خون پی رہا تھا کیونکہ میں جس مقصد کے لئے آیا تھا وہ پورا نہیں ہوا تھا۔ ایک طرف بھوک اور پیاس اور دوسری طرف یہ جلنا اور کڑھنا۔ تیسرے چوتھے دن مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں بہت جلدی پاگل ہو جاؤں گا بلکہ پاگل پن شروع ہو چکا تھا۔ پھر ایک روز مجھے آدھی روٹی اس طرح دی گئی کہ دروازہ کھلا اور وہیں سے ایک آدمی نے میری طرف آدھی روٹی اس طرح پھینکی جیسے کتے کی طرف کوئی چیز پھینکی جاتی ہے۔ اس نے مٹی کا ایک غلیظ سا پیالہ دروازے کے قریب رکھ دیا اور چلا گیا۔ میں اپنی خودداری اور اپنے وقار کو بھول گیا تھا۔ میں کتوں کی طرح ہی روٹی کے آدھے ٹکڑے پر جھپٹ پڑا اور گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل اس چھوٹے سے پیالے تک گیا جو وہ آدمی دروازے کے اندر رکھ گیا تھا۔ وہ تھوڑا سا سالن تھا۔ میں نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ یہ کس چیز کا شوربہ تھا یا گدلا نمکین پانی تھا، میں نے اس میں ڈبو ڈبو کر حلق میں اتار ما گیا۔ آدھی روٹی ذرا سی دیر میں ختم ہو گئی اور اس سے میری بھوک اور تیز ہو گئی۔ میں اٹھا اور دروازے کی سلاخیں پکڑ کر چلانے لگا کہ مجھے اور روٹی دو، خدا کے لئے مجھے اور روٹی دو.....

"ایک سنتری آیا۔ میں دروازے کی سلاخیں پکڑے کھڑا تھا۔ اس نے سلاخوں کے درمیان سے میرے منہ پر اتنی زور سے گھونسہ مارا کہ میں پیچھے دیوار کے ساتھ جا لگا۔ سر کا پچھلا حصہ بڑی زور سے ٹکرایا تھا جس سے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ معلوم نہیں میں کتنی دیر غشی میں پڑا رہا.....

"جب میں ہوش میں آیا تو میں کوٹھڑی میں نہیں تھا۔ وہ ذرا بستر اور صاف ستھرا کمرہ تھا۔ میں فرش پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک آدمی ہاتھ میں برچھی لئے میرے پاس کھڑا تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ میری آنکھیں کھل گئی ہیں تو اس آدمی نے میرے پہلو میں پاؤں سے ٹھوکر لگا کر کہا، ہوش آ گئی ہے؟ میں تو بول بھی نہیں سکتا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ آدمی باہر نکل گیا پھر وہ فوراً ہی واپس آ گیا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی تھا جس کی چال ڈھال،

ڈیل ڈول اور لباس ایسا تھا جس سے پتہ چلتا تھا کہ یہ شخص کوئی بڑا عہدیدار ہے"۔

مزمل آفندی نے آگے اپنی جو داستان سنائی وہ کچھ اس طرح تھی۔ یہ معزز آدمی اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

"مزمل آفندی!" ۔۔۔ اس آدمی نے کہا ۔۔۔ "تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

"پانی!" ۔۔۔ مزمل کے منہ سے جیسے سسکی نکلی ہو ۔۔۔ "پانی ..... پانی .....!"

"تم یہاں کیوں آئے تھے؟" ۔۔۔ اس عہدیدار نے کہا ۔۔۔ "میرے سوال کا جواب دو گے تو پانی مل جائے گا ..... تم یہاں کیوں آئے تھے؟"

"قتل ہونے کے لئے!" ۔ مزمل نے بڑی مشکل سے یہ الفاظ اپنے منہ سے باہر دھکیلے۔

"یہ میرے سوال کا جواب نہیں" ۔ عہدیدار نے کہا۔

مزمل آفندی کا منہ پیاس کی شدت سے کھل گیا تھا۔ وہ تو اب سرگوشی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر اشارہ کیا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ بولنے کے قابل نہیں۔ اس کے ہونٹ ہلے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس نے دو مرتبہ پانی پانی کہا ہے۔

"نہیں!" ۔۔۔ عہدیدار نے کہا ۔۔۔ "پانی نہیں ملے گا"۔

مزمل کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ پیاس کی شدت نے اس پر غشی طاری کر دی تھی۔

مزمل آفندی ہوش میں آیا تو اس نے محسوس کیا کہ وہ اب فرش پر نہیں ایک نرم سے بستر پر پڑا ہے۔ اس کے پاس ایک نوخیز دوشیزہ بیٹھی ہوئی تھی۔ مزمل نے آنکھیں کھولیں تو اسے سب سے پہلی جو چیز نظر آئی وہ اس لڑکی کی دلفریب مسکراہٹ تھی۔

مزمل نے نظام الملک کو سنایا کہ وہ اسے خواب سمجھا۔

"اٹھو مزمل!" ۔۔۔ لڑکی نے بڑے پیار سے کہا ۔۔۔ "کھانا کھا لو"۔

"پانی!" ۔۔۔ مزمل کے ہونٹوں سے سرگوشی پھسلی ۔۔۔ "پانی!" ۔۔۔ مزمل کا منہ کھلا رہا۔ اس کے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اور اس کی زبان اکڑ گئی تھی۔

"خالی پیٹ پانی نہیں دوں گی" ۔۔۔ لڑکی نے کہا ۔۔۔ "پہلے کھانا کھا لو ..... تھوڑا سا کھا لو پھر پانی پینا"۔

مزمل اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ اس لڑکی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔ مزمل نے دیکھا کہ یہ نہایت اچھا سجا سجایا کمرہ تھا کمرے کے وسط میں ایک گول میز رکھی ہوئی تھی اور اس میز پر کھانا پڑا ہوا تھا۔ تب مزمل کو پکے ہوئے گوشت اور روٹیوں کی بو محسوس ہوئی۔ وہ فوراً اٹھا اور میز کے قریب پڑے ہوئے سٹول پر بیٹھ گیا۔

وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سالن ایک قسم کا نہیں بلکہ تین چار قسم کے سالن تھے۔ یہ کسی شہزادے یا بہت بڑے حاکم کا کھانا تھا۔ مزمل آفندی ذرا جھینپ گیا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ کھانا اس کے لئے رکھا گیا ہے لیکن وہ اس قدر بھوکا تھا کہ اس نے نتائج سے بے پرواہ کھانا شروع کر دیا۔ وہ شائستہ اور معزز خاندان کا تہذیب یافتہ بیٹا تھا لیکن بھوک نے اور پیاس نے اس کا دماغ ایسا ناکارہ کر دیا تھا کہ وہ جانوروں کی طرح کھانا کھا رہا تھا۔ اسے یہ بھی خیال نہیں رہا تھا کہ سالن میز پر گر رہا ہے۔ وہ دسترخوان کے آداب بھول چکا تھا۔

بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے پیچھے چھ ایک نوالے حلق سے اتار کر وہ صراحی پر لپکا جو میز پر پڑی ہوئی تھی۔ لڑکی بڑی تیزی سے آئی اور اس نے مزمل کے ہاتھ سے صراحی لے لی۔

"پانی میں پلاؤں گی" ۔۔۔ لڑکی نے کہا ۔۔۔ "بہت تھوڑا تھوڑا ایک ایک گھونٹ پلاؤں گی ..... ایک ہی بار پانی نہیں پینا"۔

لڑکی نے ایک خوشنما پیالے میں تھوڑا سا پانی ڈال کر مزمل کو دیا۔ مزمل ایک ہی بار یہ پانی پی گیا اور پھر کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ تھوڑا سا کھا کر وہ پھر صراحی پر جھپٹا لیکن لڑکی نے پہلے کی طرح اس کے ہاتھ سے صراحی لے لی اور اب ذرا زیادہ پانی پیالے میں ڈال دیا۔ مزمل نے وہ پانی بھی ایک ہی سانس میں پی ڈالا۔

دیکھتے ہی دیکھتے مزمل تمام روٹیاں اور اتنے زیادہ سالن صاف کر گیا۔ یوں پتہ چلتا تھا جیسے سالن والے برتن دھلے ہوئے ہیں۔ مزمل نے ان میں لقمے پھیر پھیر کر ان برتنوں کو صاف کر دیا تھا۔ اب کے اس نے لڑکی سے پانی مانگا۔

"اب پانی نہیں" ۔۔۔ لڑکی نے بڑی دلفریب مسکراہٹ سے کہا ۔۔۔ "اب شربت پلاؤں گی"۔

لڑکی نے ایک اور صراحی اٹھائی اور اس میں سے شربت گلاس میں انڈیل دیا جو

مزمل نے اٹھا کر ایک ہی بار خالی کر دیا۔

مزمل آفندی لڑکی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اسے اتنی غلیظ کوٹھڑی سے نکال کر یہاں کیوں لایا گیا ہے اور ایسا امیرانہ کھانا اسے کیوں دیا گیا ہے لیکن وہ کچھ بھی نہ پوچھ سکا کیونکہ اس پر غنودگی طاری ہو گئی تھی اور وہ بستر کی طرف دیکھنے لگا تھا۔ لڑکی نے اسے کہا کہ وہ سو جائے۔ وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھا تو حیرت زدہ نظروں سے لڑکی کو دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سوال تھا لیکن یہ سوال زبان پر آنے سے پہلے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور لڑکی نے اسے سہارا دے کر پلنگ پر لٹا دیا۔

○

صبح جب مزمل اس کمرے سے نکلا تو اس نے یوں محسوس کیا جیسے یہ دنیا ہی بدل گئی ہو۔ اس کے سامنے ایک وسیع باغ تھا جس میں ایسے ایسے پھول تھے جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ گھاس بہت ہی سرسبز تھی اور یہ گھاس اوپر سے اس طرح تراشی ہوئی تھی جیسے زمین پر سبز رنگ کا قالین بچھا ہوا ہو۔ مزمل آگے بڑھا تو کمرے سے لڑکی نکل آئی۔ وہ بھی اس کے ساتھ چل پڑی۔

"کیا تم مجھے کچھ بتا سکتی ہو؟" — مزمل نے لڑکی سے پوچھا — "مجھے اُس غلیظ کوٹھڑی میں سے نکال کر اس امیرانہ کمرے میں کیوں لایا گیا ہے اور ایسا مرغن اور پُرلطف اور لذیذ کھانا کیوں دیا گیا ہے؟"

"تمہیں امام کے حکم سے قید خانے سے نکالا گیا" — لڑکی نے جواب دیا — "اور یہ کھانا اسی کے حکم سے تمہیں کھلایا گیا ہے اور مجھے امام نے ہی تمہاری خدمت کے لئے بھیجا ہے"۔

"کون امام؟" — مزمل نے حیران سا ہو کے پوچھا۔

"امام حسن بن صباح!" — لڑکی نے جواب دیا۔ مزمل چلتے چلتے رک گیا اور اس نے حیرت زدگی کے عالم میں لڑکی کو دیکھا۔ لڑکی مسکرا رہی تھی۔

"کیا میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟" — مزمل نے کہا جیسے اپنے آپ سے بات کر رہا ہو۔

"میں سمجھتی ہوں تم کیا سوچ رہے ہو" — لڑکی نے کہا — "امام کو کل بتایا گیا ہے کہ تم اسے قتل کرنے کے لئے آئے تھے۔ اسے یہ بھی بتایا گیا کہ تمہیں قید خانے کی

انتہائی غلیظ کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا ہے۔ امام نے تمہیں قید خانے میں ڈالنے والوں کو بلایا اور حکم دیا کہ انہیں بیس بیس کوڑے لگائے جائیں کیونکہ انہوں نے اس کے حکم کے بغیر ایک مہمان کو قید خانے میں ڈال دیا تھا۔ اس طرح تمہاری رہائی کا حکم دیا گیا اور تم یہاں پہنچ گئے..... کیا تم واقعی حسن بن صباح کو قتل کرنے آئے تھے؟"

"ہاں!" — مزمل نے یوں کہا جیسے اسے شرمندگی تھی کہ وہ حسن بن صباح کو قتل کرنے آیا ہے۔

"امام کسی وقت یہاں آئے گا" — لڑکی نے کہا — "یا وہ تمہیں اپنے پاس بلائے گا"۔

"کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ یہاں نہ آئے؟" — مزمل نے پوچھا — "اور کیا یہ ممکن ہے کہ وہ مجھے اپنے پاس نہ بلائے؟"

"تم یہ کیوں سوچ رہے ہو؟"

"میں نے اگر اسے کہہ دیا کہ میں اسے قتل کرنے آیا تھا تو وہ پھر مجھے قید خانے میں پھینک دے گا" — مزمل نے کہا — "میں اس کے آگے جھوٹ نہیں بول سکوں گا"۔

"تم نہیں جانتے مزمل!" — لڑکی نے کہا — "امام حسن بن صباح ایک برگزیدہ اور اللہ کی بڑی پیاری شخصیت ہے۔ وہ صرف سچ سنتا ہے اور سچ بولتا ہے..... تم صاف کہہ دینا کہ میں آپ کے دشمنوں سے متاثر ہو کر آپ کو قتل کرنے چلا آیا تھا"۔

لڑکی مزمل کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے حسن بن صباح کی ایسی تصویر پیش کرتی رہی جو کسی فرشتے کی یا کسی پیغمبر کی ہی ہو سکتی تھی۔ باتیں کرتے کرتے وہ مزمل کو واپس کمرے میں لے آئی۔ مزمل نے کمرے میں پہنچتے ہی اسی شربت کی فرمائش کی جو لڑکی نے گزشتہ رات اسے پلایا تھا۔ صراحی کمرے میں ہی رکھی تھی۔ لڑکی نے اسے پیالہ بھر دیا جو مزمل نے پی لیا۔

مزمل کا جی چاہتا تھا کہ یہ لڑکی اس کے ساتھ باتیں کرتی رہے اور وہ خود بھی بولے اور بولتا ہی چلا جائے۔ اس غلیظ اور بدبودار کوٹھڑی کی قید نے بھوک اور پیاس نے اس کے دماغ پر ایسا اثر کیا تھا جیسے اس کی سوچنے کی صلاحیت سو گئی ہو یا آدمی سے زیادہ صلاحیت مر ہی گئی ہو۔ پھر اس کے دماغ پر یہ لڑکی اور اس کی باتیں غالب آگئیں۔ بات وہی ہوئی کہ ایک تو یہ لڑکی نشہ بن کر اس پر طاری ہوئی اور دوسری یہ بات کہ اس لڑکی

نے اسے حشیش پلانی شروع کر دی تھی۔

O

مزمل کے ذہن اور ضمیر پر بھی اب کوئی بوجھ نہیں تھا۔ وہ ایسے احساس سے سرشار اور مخمور ہوا جا رہا تھا جیسے وہ مافوق الفطرت ہو اور یہ احساس بھی کہ وہ مکمل طور پر ہوش میں ہے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ مزمل نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ لڑکی نے جا کر دروازہ کھولا۔

"امام تشریف لا رہے ہیں" ۔۔۔ مزمل کو باہر سے آواز سنائی دی۔

لڑکی نے دروازے کے دونوں کواڑ کھول دیئے۔ حسن بن صباح کمرے میں داخل ہوا۔ مزمل اسے دیکھ کر اٹھا اور حیرت سے اسے دیکھتا ہی رہا۔

لڑکی دروازہ بند کر کے باہر ہی کھڑی ہو گئی۔ کمرے میں حسن بن صباح اور مزمل رہ گئے۔ حسن بن صباح کے چہرے پر سنجیدگی سی تھی۔ مزمل اسے خاموشی سے دیکھتا رہا اور حسن بن صباح آہستہ آہستہ کمرے میں ٹہلنے لگا۔ کمرے میں سناٹا طاری تھا۔ یہی وہ حسن بن صباح تھا جسے قتل کرنے کو مزمل اس قدر بے تاب تھا کہ منع کرنے کے باوجود وہ اسے قتل کرنے یہاں پہنچ گیا تھا لیکن اب اس کی حالت یہ تھی کہ اس کے دماغ میں یہ بھی سوچ نہیں ابھر رہی تھی کہ وہ حسن بن صباح کا سامنا کس طرح کرے اور کیا کہے۔ اس کا دل اس جذبے سے خالی ہو چکا تھا جو جذبہ اسے یہاں لایا تھا۔

دہکتے ہوئے انگارے برف کے ٹکڑے بن گئے تھے۔

"مزمل آفندی!" ۔۔۔ حسن بن صباح نے مزمل کے سامنے کھڑے ہو کر کہا ۔۔۔ "مجھے بہت ہی افسوس ہے کہ تم میرے قلعے میں مہمان بن کر آئے اور تمہیں ان بدبختوں نے قید خانے میں بند کر دیا..... تم مجھے قتل کرنے آئے ہو؟"

حسن بن صباح مزمل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر رہا تھا اور مزمل یوں محسوس کر رہا تھا جیسے یہ شخص اس کی روح میں اتر گیا ہو۔ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔ اس نے اتنا ہی محسوس کیا کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہے لیکن نہ دماغ اس کا ساتھ دے رہا ہے نہ زبان میں حرکت ہو رہی ہے۔

حسن بن صباح نے چغہ پہن رکھا تھا جو اس کے ٹخنوں تک لمبا تھا۔ اس نے چغے

کے اندر ہاتھ ڈالا اور جب ہاتھ باہر نکلا تو اس ہاتھ میں تلوار تھی۔ مزمل نے جب حسن بن صباح کے ہاتھ میں تلوار دیکھی تو اسے موت نظر آنے لگی۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔

"یہ لو" ــــ حسن بن صباح نے تلوار اپنے دونوں ہاتھوں میں رکھ کر مزمل کو پیش کی اور بولا ــــ "تلوار لو اور مجھے قتل کرو"۔

مزمل تلوار کی طرف تو دیکھ ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی نظریں حسن بن صباح کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ حسن بن صباح نے تلوار کا دستہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ مزمل نے تلوار اپنے ہاتھ میں لے لی۔ حسن بن صباح نے اس کی طرف پیٹھ کر لی۔

مزمل خاص طور پر محسوس کر رہا تھا کہ اس میں اتنی ہمت ہے ہی نہیں کہ وہ تلوار سے حسن بن صباح کی گردن اُڑا دے۔ اسے تو جیسے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ حسن بن صباح کو وہ اپنا نہیں بلکہ اسلام کا بدترین دشمن سمجھتا تھا۔

حسن بن صباح کچھ دیر مزمل کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا رہا پھر وہ آہستہ آہستہ مڑا اور اس نے مزمل کا سامنا کیا۔

"اگر میں جھوٹا ہوتا تو اب تک میرا سر تمہارے ہاتھوں میرے جسم سے الگ ہو چکا ہوتا" ــــ حسن بن صباح نے کہا ــــ "تم ایسے لوگوں کی باتوں سے متاثر ہو کر یہاں آ گئے ہو جو میری صداقت سے واقف نہیں۔ سلطنتِ سلجوق کے سلطان نہیں چاہتے کہ کوئی ایسی طاقت ابھرے جو بنی نوع انسان کو ان سلطانوں اور بادشاہوں سے آزاد کرا دے۔ بادشاہی صرف اللہ کی ہے اور میں جو کچھ کر رہا ہوں وہ اللہ کے حکم سے کر رہا ہوں ..... تم تلوار چلاؤ۔ تلوار میرے جسم کے قریب آ کر رک جائے گی کیونکہ اللہ نے ابھی میرے خلاف فیصلہ نہیں دیا"۔

مزمل کی برین واشنگ پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اگر کچھ کسر رہ گئی تھی تو وہ حسن بن صباح نے پوری کر دی۔ مزمل نے تلوار اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھائی اور حسن بن صباح کے آگے دو زانو ہو کر اس نے ہاتھ آگے کئے اور تلوار حسن بن صباح کو پیش کی۔ حسن بن صباح نے تلوار لے لی اور چغے کے اندر نیام میں ڈال لی۔

"مزمل آفندی!" ــــ حسن بن صباح نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پیار سے کہا ــــ "تم میرے مہمان ہو..... میرے ساتھ آؤ"۔

مزمل آفندی حسن بن صباح کے ساتھ چلا گیا۔ حسن بن صباح نے غالباً" دیکھ لیا تھا کہ مزمل دلیر اور خطرے مول لینے والا جوان ہے اور یہ بڑا ہی آسان شکار ہے اس لئے حسن بن صباح نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔

"محترم وزیراعظم!" — مزمل نے نظام الملک کو اپنی یہ پُراسرار داستان سناتے ہوئے کہا — "حسن بن صباح مجھے جب اپنے ساتھ لے گیا تو میں ایک ایسی دنیا میں داخل ہو گیا جسے میں آج ایک بڑا ہی حسین اور طلسماتی خواب سمجھتا ہوں۔ اگر جنت کا وجود ہے تو میں نے وہ حسن بن صباح کی دنیا میں دیکھی ہے۔ آج جب میں اپنے ہوش و حواس میں آگیا ہوں' اس جنت کو خواب ہی سمجھتا ہوں۔ حسن بن صباح میرے ساتھ خاص طور پر شفقت کرتا تھا۔ میں اسے یوں مقدس اور متبرک شخصیت سمجھنے لگا تھا کہ آسمان پر خدا ہے تو زمین پر حسن بن صباح ہے۔ اس نے چند دنوں میں ہی مجھے اپنے راز دینے شروع کر دیئے تھے۔ اُس نے نہایت پُرکشش طریقے سے مجھے آپ کے خلاف کیا اور میرے دل میں آپ کی دشمنی بھر دی۔ میں تو بہت جلدی آپ کو قتل کرنے کے لئے تیار ہو گیا تھا۔ حسن بن صباح کو مجھ پر ایسا اعتبار آیا کہ اس نے اپنے کچھ راز بھی مجھے دے دیئے"۔

"اب دوسری باتوں کو چھوڑو" — نظام الملک نے کہا — "میں راز کی باتیں سننا چاہتا ہوں"۔

مزمل آفندی نے راز کی جو باتیں سنائیں وہ ابوالقاسم رفیق دلاوری نے متعدد مؤرخوں کے حوالوں سے آئمہ تلبیس میں تفصیل سے بیان کی ہیں۔ وہ یوں ہیں کہ حسن بن صباح نے اپنے خاص مریدوں کو تین گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ ایک گروہ دوسرے ملکوں میں تبلیغ کا کام کرتا تھا لیکن اس گروہ کے آدمی عام لوگوں کے ساتھ کوئی رابطہ نہیں رکھتے تھے بلکہ وہ حاکموں اور سرداروں کی سطح کے لوگوں سے ملتے اور انہیں اپنے نظریات بتاتے اور ایسے طریقے اختیار کرتے کہ یہ سرکردہ لوگ ان کے ہمنوا ہو جاتے تھے۔ دوسرے گروہ کے آدمیوں کو رفیق کہا جاتا تھا۔ یہ حسن بن صباح کا ذاتی حلقہ تھا اور تمام رفیق اس کے اس حلقے میں شامل تھے۔

تیسرا گروہ فدائیوں کا تھا۔ یہ جانباز لوگ تھے جن میں سے وہ کسی کو حکم دیتا کہ اپنے آپ کو قتل کر دو تو وہ شخص تلوار اپنے دل میں اتار لیتا تھا۔ مزمل نے بتایا کہ اس تیسرے

گروہ میں جو لوگ شامل تھے اور جنہیں شامل کیا جا رہا تھا وہ تھے تو انسان ہی لیکن ان کی فطرت میں خونخواری اور مردم کُشی بھر دی گئی تھی۔ انہیں بلّی کا گوشت کھلایا جاتا تھا۔ وہ اس لئے کہ بلّی جب حملہ کرتی ہے تو بڑی غضبناک ہو کر حملہ کرتی ہے اور اپنے شکار کو مار کر ہی دم لیتی ہے۔

فدائیوں کو تو بلّی کا گوشت کھلایا جاتا تھا لیکن رفیقوں کو یعنی دوسرے گروہ کے آدمیوں کو بادام' شہد اور کلونجی کھلائی جاتی تھی۔ یہ خوراک ان کے جسموں میں گرمی پیدا کرتی تھی اور جب یہ گرمی دماغ کو چڑھتی تھی تو انہیں جو بھی حکم دیا جاتا وہ اُسی وقت پورا کرتے تھے۔ رفیق آمنے سامنے کی لڑائی لڑتے تھے لیکن فدائی اپنے شکار کو دھوکے میں لا کر زمین دوز طریقوں سے ختم کرتے تھے۔ حسن بن صباح نے جتنی تاریخی شخصیتوں کو قتل کروایا ہے وہ ان ہی فدائیوں کے ہاتھوں کروایا ہے۔

داستان گو آگے چل کر حسن بن صباح کی جنت اور اس کی دنیا کے خفیہ گوشے تفصیل سے بیان کرے گا۔ یہاں بات صرف مزمل آفندی اور نظام الملک کی ہو گی۔ نظام الملک نے قلعہ المُوت پر حملے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کی فوج کو ٹریننگ دی جا رہی تھی۔

"اب بتاؤ مزمل" — نظام الملک نے پوچھا — "کیا اب بھی تم چاہتے ہو کہ اکیلے جا کر حسن بن صباح کو قتل کر دو؟"

"نہیں وزیراعظم!" — مزمل نے جواب دیا — "مجھے المُوت جانے سے روکنے والے سچ کہتے تھے کہ انسان حسن بن صباح کے ہاتھوں قتل ہو سکتا ہے اسے دھوکے میں لا کر قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم حسن بن صباح کو زندہ رہنے کا حق دیئے رکھیں۔ اگر آپ میرے مشورے کو قبول کریں تو میں یہی کہوں گا کہ فوج کشی کے بغیر آپ باطنیوں کے پھیلتے ہوئے طوفان کو نہیں روک سکتے۔ میں کچھ دن اس دنیا میں گزار آیا ہوں۔ میں نے وہاں دیکھا ہے اور میں پورے وثوق سے کہتا ہوں کہ آپ نے حسن بن صباح کا راستہ نہ روکا تو وہ دن جلدی آجائے گا جب سلطنتِ سلجوق پر بھی حسن بن صباح کی بادشاہی ہو گی"۔

○

نظام الملک نے اپنی فوج کو قلعہ المُوت پر حملے کے لئے تیار کر لیا تھا۔ اس نے بہتر یہ سمجھا کہ خونریزی نہ ہی ہو تو اچھا ہے۔ اس نے سلطان ملک شاہ سے کہا کہ وہ حسن بن

صباح کی طرف اپنا ایک ایلچی بھیجنا چاہتا ہے سلطان نے اسے اجازت دے دی اور اسی روز ایک ایلچی اس پیغام کے ساتھ الموت بھیج دیا گیا کہ حسن بن صباح اپنی یہ سرگرمیاں جو اسلام کے سراسر خلاف ہیں ختم کردے اور سلطان ملک شاہ کی اطاعت قبول کرلے۔

ایلچی چلا گیا اور الموت پہنچ کر وہ حسن بن صباح سے ملا اور اسے سلطان ملک شاہ اور نظام الملک کا پیغام دیا۔

"اپنے سلطان کو اور نظام الملک کو میرا پیغام دینا" ___ حسن بن صباح نے کہا ___ "میں نے کبھی کسی کی اطاعت قبول نہیں کی۔ اے نظام الملک! ہم دونوں اکٹھے پڑھے ہیں اور ایک ہی استاد سے پڑھے ہیں۔ مجھے تم اُس زمانے سے جانتے ہو۔ میں تمہیں ایک مخلص دوست کی حیثیت سے مشورہ دیتا ہوں کہ الموت کا کبھی رُخ نہ کرنا اور اے سلطنتِ سلجوق کے سلطان ملک شاہ! اپنی سلطنت کی حدود میں رہو، یہی تمہارے لئے بہتر ہے اور تمہارے لئے یہ بھی بہتر ہے کہ مجھے میری دنیا میں آزاد رہنے دو۔ اگر تمہیں میرا یہ مشورہ اچھا نہ لگے تو میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ تمہارا اور تمہاری فوج کا انجام بہت بُرا ہوگا"۔

ایلچی وہاں سے رخصت ہونے لگا تو حسن بن صباح نے اسے روک لیا۔

"ٹھہر جاؤ" ___ حسن بن صباح نے اسے کہا ___ "تم شاید سمجھے نہیں کہ میں نے کیا کہا ہے، یا شاید تم یہ سمجھے ہو گے کہ میں نے ویسے ہی بڑ ماری ہے۔ میں تمہیں اپنے الفاظ کو عملی شکل میں دکھاتا ہوں"۔

حسن بن صباح کے حکم سے سوڈیڑھ سو آدمی جو دراصل اس کے فدائین تھے وہاں ایک صف میں آکر کھڑے ہوگئے۔

"میرے دوستو!" ___ حسن بن صباح ان سے مخاطب ہوا ___ "میں تم سے کسی ایک کو اللہ کے پاس بھیجنا چاہتا ہوں۔ جو اللہ کے پاس جانا چاہتا ہے وہ آگے آجائے"۔

تمام آدمی ایک ہی بار آگے آگئے اور ہر ایک نے بلند آواز سے کہا کہ میں اللہ کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ حسن بن صباح نے ایک آدمی کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ وہ آدمی دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔

"اپنے آپ کو قتل کردو" ___ حسن بن صباح نے اسے کہا۔

جواں سال آدمی نے اپنے کمر بند میں اُڑسا ہوا خنجر نکالا، خنجر کی نیام الگ کر کے

پرے پھینکی اور خنجر پوری طاقت سے اپنے دل میں اتار دیا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا پھر اس کے منہ سے بڑی زور کا نعرہ نکلا ___ "امام حسن بن صباح زندہ باد" ___ اور اس کے بعد وہ آدمی گر پڑا اور مر گیا۔

حسن بن صباح نے ایک اور ویسے ہی جواں سال آدمی کو بلایا۔ وہ سب آدمی جوان تھے یا نوجوان تھے۔ وہ آدمی دوڑتا ہوا حسن بن صباح کے سامنے جا رکا۔

"دوڑ کر قلعے کی دیوار پر چڑھ جاؤ" ___ حسن بن صباح نے اسے کہا ___ "اور اپنے آپ کو سر کے بل نیچے گرا دو"۔

وہ نوجوان فوراً" دوڑ پڑا اور تھوڑی دیر بعد وہ قلعے کی اتنی اونچی دیوار پر کھڑا نظر آیا۔ اس نے اپنے آپ کو اس طرح سر کے بل دیوار سے گرایا جس طرح تیراک بلندی سے پانی میں ڈائیو کیا کرتے ہیں۔

زیادہ تر مورخوں نے ان دو آدمیوں کا ہی ذکر کیا ہے، بعض مورخوں نے لکھا ہے کہ حسن بن صباح نے اپنے ایک اور فدائی کو بلایا اور اسے کہا کہ وہ ڈوب کر مر جائے۔ وہ فدائی اُسی وقت چلا گیا اور ڈوب کر مر گیا۔ اس تیسرے فدائی کی موت کے ساتھ یہ نہیں لکھا گیا کہ وہ دریا میں کودا تھا یا کوئی جھیل تھی یا کوئی گہرا حوض تھا، بہرحال یہ لکھا گیا ہے کہ وہ ڈوب کر مر گیا۔

"اپنے سلطان ملک شاہ کو یہ سب کچھ سنانا جو تم نے دیکھا ہے" ___ حسن بن صباح نے ایلچی سے کہا ___ "میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ میرے پاس اس قسم کے بیس ہزار فدائین ہیں۔ سلطان سے پوچھنا کہ تمہارے اتنے بڑے لشکر میں کوئی ایک بھی سپاہی ہے جو اس طرح تمہارے اشارے پر اپنی جان دے دے؟..... اور میرے دوست نظام الملک سے کہنا کہ میں آج بھی تمہارا احترام کرتا ہوں۔ لڑکپن کی دوستی کو قائم رکھو اور مجھ پر فوج کشی کا خیال دل سے نکال دو۔ اگر تمہیں میری بات سمجھ نہیں آئی تو بے شک آجاؤ اور جتنا بڑا لشکر اکٹھا کر سکتے ہو، لے آؤ"۔

ایلچی کے چہرے پر حیرت زدگی بلکہ کسی حد تک خوف زدگی کے تاثرات صاف نظر آرہے تھے۔ وہ چپ چاپ وہاں سے چل پڑا۔

○

ایلچی واپس مرو پہنچا تو سلطان ملک شاہ اور نظام الملک نے بیتابی سے اس سے پوچھا

کہ حسن بن صباح نے کیا جواب دیا ہے۔ ایلچی نے جو سرفروشی اور جاں نثاری کے مظاہرے وہاں دیکھے تھے' وہ انہیں سنا دیئے اور حسن بن صباح نے جو جواب دیا تھا وہ بھی انہیں سنا دیا۔

سلطان ملک شاہ پر خاموشی طاری ہو گئی لیکن نظام الملک کو جیسے غصہ آگیا ہو۔ وہ اٹھ کر کمرے میں تیز تیز ٹہلنے لگا اور بار بار وہ اپنے ایک ہاتھ کا مُکا اپنے دوسرے ہاتھ پر مارتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو خواجہ؟" ــــ سلطان ملک شاہ نے پوچھا۔ اس کا لب و لہجہ کچھ ٹھنڈا سا تھا۔

"میں اس کے سوا اور کچھ بھی نہیں سوچ سکتا کہ فوراً کوچ کیا جائے" ــــ نظام الملک نے کہا ــــ "کیا یہ ابلیس یہ سمجھتا ہے کہ ہم اس کی گیدڑ بھبکیوں سے ڈر جائیں گے؟..... سلطانِ محترم! میں کل صبح فجر کی نماز کے بعد کوچ کر جاؤں گا۔ اُمید ہے آپ مجھے روکیں گے نہیں"۔

"ہاں خواجہ!" ــــ سلطان ملک شاہ نے کہا ــــ "تم کل صبح لشکر لے کر نکل جاؤ' میری دعائیں تمہارے ساتھ جائیں گی"۔

اگلی صبح فجر کی نماز سے فارغ ہو کر خواجہ حسن طوسی نظام الملک نے اپنے لشکر سے خطاب کیا۔ اس نے گزشتہ روز تمام لشکر کو تیاری کا حکم دے دیا تھا۔ صبح لشکر کوچ کے لئے تیار تھا۔ نظام الملک نے مختصر الفاظ میں اپنے لشکر سے کہا کہ وہ کسی کا ملک فتح کرنے نہیں جا رہا ہے۔ اس نے حسن بن صباح اور باطنیوں کے متعلق کچھ باتیں کیں اور کہا کہ ہم سلطنتِ سلجوق کی توسیع کے لئے نہیں جا رہے بلکہ ایک ابلیسی قوت کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے جا رہے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر ہم نے وقت ضائع کیا یا وہاں جا کر ہم نے جانیں قربان کرنے سے منہ پھیر لیا تو سمجھ لو کہ تمہارا دینِ اسلام چند دنوں کا مہمان ہے۔ پھر یہاں نہ کوئی اللہ کا اور نہ اللہ کے رسولؐ کا نام لینے والا زندہ رہے گا۔

لشکر روانہ ہو گیا۔ عورتوں نے اپنے گھروں کی چھتوں پر کھڑے ہو کر لشکر کو اپنی دعاؤں کے ساتھ رخصت کیا۔ کچھ لوگ لشکر کے ساتھ دور تک گئے اور لشکر کو خدا حافظ کہہ کر واپس آگئے۔

لشکر ابھی آدھے راستے میں ہی تھا کہ حسن بن صباح کو جاسوسوں نے اطلاع دی کہ

سلجوقیوں کا لشکر آرہا ہے۔ انہوں نے لشکر کی صحیح تعداد بھی بتا دی۔ حسن بن صباح کے جاسوس ہر جگہ موجود تھے۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ کوئی بات ابھی سلطان تک نہیں پہنچتی تھی لیکن حسن بن صباح تک پہلے پہنچ جاتی تھی۔

مسلمان مؤرخوں کے علاوہ دو یورپی مؤرخوں نے بھی لکھا ہے کہ جب حسن بن صباح کو اطلاع ملی کہ نظام الملک لشکر لا رہا ہے تو حسن بن صباح کا ردِّ عمل صرف اتنا سا تھا کہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے ایسا نہیں کیا کہ اٹھ کر دوڑ پڑتا اور اپنے لشکر کو تیاری کا حکم دیتا یا لشکر کو اکٹھا کر کے کوئی اشتعال انگیز تقریر کرتا' وہ اطمینان اور آرام سے بیٹھا رہا۔ اس کے پاس تین چار خاص معتمد اور مشیر بیٹھے ہوئے تھے۔

"تم نے سن لیا ہے" ــــ حسن بن صباح نے انہیں کہا ــــ "نظام الملک کو راستے میں ہی قتل کر دو"۔

بس اتنی سی بات تھی جو حسن بن صباح کے منہ سے نکلی۔ اس کے پاس بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے ایک اٹھا اور باہر نکل گیا۔

یہاں تاریخ نویسوں میں تھوڑا سا اختلاف پایا جاتا ہے جو کوئی اتنا اہم نہیں لیکن اس کا ذکر ضروری ہے۔ کچھ نے لکھا ہے کہ نظام الملک کو سلطان ملک شاہ نے مَرو سے ہی رخصت کر دیا تھا لیکن زیادہ تعداد تاریخ نویسوں کی ایسی ہے جنہوں نے لکھا ہے کہ سلطان ملک شاہ بغداد جا رہا تھا۔ وہ لشکر کے ساتھ چل پڑا اس کا ارادہ یہ تھا کہ راستے سے بغداد کی طرف چلا جائے گا۔ چونکہ مؤرخوں کی زیادہ تعداد نے یہی لکھا ہے کہ سلطان ملک شاہ لشکر کے ساتھ گیا تھا اور اس سے آگے کے جو حالات تاریخ میں نظر آتے ہیں' وہ بھی گواہی دیتے ہیں کہ سلطان ملک شاہ ساتھ گیا تھا اس لئے داستان گو یہی صحیح سمجھتا ہے۔

راستے میں جا کر سلطان ملک شاہ نے خواہش ظاہر کی کہ نہاوند کے مقام پر پڑاؤ کیا جائے۔ نہاوند بڑا مشہور قصبہ تھا جس کی جغرافیائی اور تاریخی اہمیت تھی۔ بیسویں ہجری میں یہ مقام حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں فتح ہوا تھا۔ اس لڑائی میں صحابہ کرامؓ کی اچھی خاصی تعداد شہید ہوئی تھی۔

وہ رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ ان لوگوں نے نہاوند پہنچ کر روزہ افطار کیا۔ رات تراویح کی نماز سب نے پڑھی۔ نمازِ تراویح کے بعد نظام الملک اپنی قیام گاہ کی طرف چل

پڑا۔ تاریخ کے مطابق لشکر نے تو اپنے لئے خیمے گاڑ لئے تھے لیکن سلطان ملک شاہ اور نظام الملک کی رہائش کا انتظام قصبے میں ایک بڑے اچھے مکان میں کیا گیا تھا۔ اُس وقت سلطان ملک شاہ نظام الملک کے ساتھ نہیں تھا۔

نظام الملک جب اپنی قیام گاہ کے قریب پہنچا تو وہاں بہت سے لوگ اکٹھے دیکھے جو نظام الملک کو دیکھنے یا اسے ملنے آئے تھے۔ نظام الملک ان کے درمیان جا پہنچا اور جو کوئی بھی آگے آیا اس کے ساتھ اس نے ہاتھ ملایا۔

”کیا سلجوقیوں کا وزیرِاعظم ایک مظلوم کی فریاد سنے گا؟“ —— ایک آواز سنائی دی —— ”میں درخواست لکھ کر لایا ہوں“۔

نظام الملک عدل و انصاف کا پابند تھا اور ہر کسی سے انصاف کرنا وہ اپنا دینی فریضہ سمجھتا تھا۔ اس نے جب یہ فریاد سنی تو بلند آواز سے کہا کہ یہ شخص آگے آکر اپنی عرضی مجھے دے۔

ایک جواں سال آدمی آگے آیا اور اس نے احتجاج یا غصے کا مظاہرہ اس طرح کیا کہ اس کے ہاتھ میں جو کاغذ تھا وہ نظام الملک کے ہاتھ میں دینے کی بجائے اس کے قدموں میں پھینک دیا اور غصے سے بولا' یہ لو میری فریاد اور مجھے انصاف دو۔

نظام الملک کاغذ اٹھانے کے لئے جھکا۔ کاغذ پھینکنے والے شخص نے بڑی تیزی سے اپنے کپڑوں کے اندر سے خنجر نکالا اور جھکے ہوئے نظام الملک کی پیٹھ میں اس قدر زور سے مارا کہ خنجر دل کو چیرتا ہُوا دوسری طرف نکل گیا۔

لوگوں نے قاتل کو وہیں پکڑ لیا' نظام الملک پیٹھ میں خنجر لئے ہوئے سیدھا ہُوا۔ اس کے آخری الفاظ یہ تھے —— ”اسے میرے قصاص میں قتل نہ کرنا“ —— لیکن لوگوں نے اس کی نہ سنی۔ کچھ نے نظام الملک کو اٹھالیا اور زیادہ تر نے قاتل کے جسم کو قیمہ بنا ڈالا۔

اس قاتل کا نام ابو طاہر تھا وہ حسن بن صباح کے فدائین میں سے تھا۔

نظام الملک کو 1092ء میں قتل کیا گیا تھا۔

سلطان ملک شاہ کو اطلاع ملی تو وہ دوڑا آیا۔ نظام الملک فوت ہو چکا تھا اور قاتل کی لاش اس حالت میں باہر پڑی تھی کہ لوگوں نے اس کے اعضاء بھی کاٹ کر اِدھر اُدھر پھینک دیئے تھے۔ سلطان نے المُوت پر فوج کشی کا ارادہ ترک کر دیا اور وہیں سے واپس آگیا۔

خواجہ حسن طُوسی نظام الملک کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ درباری قسم کا یا رسمی سا وزیرِاعظم بھی نہیں تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں ہی ایک مدرسہ کھولا تھا جو آج بھی بغداد میں موجود ہے۔ نظام الملک نے اس مدرسے کا نام مدرسہ نظامیہ رکھا تھا۔ اس مدرسے نے بڑی نامور اور تاریخی شخصیتیں پیدا کی ہیں۔ امام غزالیؒ اسی مدرسے سے پڑھے تھے۔ سلطان صلاح الدّین ایوّبی نے اسی مدرسے سے تعلیم حاصل کی تھی اور بہاؤالدین شدّاد جو ایک مشہور سکالر اور عالم تھا' سلطان صلاح الدّین ایوبی کے ساتھ اس مدرسے میں پڑھا تھا۔ بہاؤالدین شدّاد تمام صلیبی جنگوں میں صلاح الدّین ایوّبی کے ساتھ پرسنل سیکرٹری کی حیثیت سے' ایلچی اور مشیر کی حیثیت سے رہا تھا۔ سلطان ایوّبی کی وفات کے بعد بہاؤالدین شدّاد نے اس کی زندگی پر ایک کتاب لکھی تھی جس کا حال ہی میں انگریزی میں ترجمہ ہُوا ہے۔

سلطان ملک شاہ کی فوج جب واپس آتے ہوئے مَرْو سے کچھ دور تھی تو لوگ گھروں سے نکل آئے اور جو کوئی جس کام میں مصروف تھا وہ چھوڑ کر اُس راستے پر آکھڑا ہُوا جس پر فوج آرہی تھی۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ گئیں۔ لوگوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ سمجھے فوج جو اتنی جلدی واپس آرہی ہے' وہ یقیناً فتح یاب واپس آرہی ہے۔

لوگ دوڑ کر آگے چلے گئے تاکہ اپنی فاتح فوج کا استقبال جوش و خروش اور فتح کے نعروں سے کریں۔ انہوں نے دیکھا کہ فوج کے آگے آگے مجاہدین نے کسی کی لاش اٹھا رکھی تھی۔ پوچھا تو جواب ملا کہ وزیرِاعظم نظام الملک قتل ہو گئے ہیں۔ یہ بھی لوگوں کو بتا دیا گیا کہ قاتل باطنیوں کا فدائی تھا۔ لوگ واپس شہر کی طرف دوڑے اور نظام الملک کے

قتل کی خبر سارے شہر میں پھیلا دی۔

پورا شہر ماتم کدہ بن گیا۔ نظام الملک لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتا تھا۔ وہ ہر کس و ناکس کا ہمدرد تھا۔ شہر میں کہرام بپا ہو گیا۔ عورتیں باہر آکر بین کرنے لگیں۔

لوگوں نے حسن بن صباح اور باطنیوں کے خلاف اشتعال انگیز نعرے لگانے شروع کر دیئے۔

"ایک بھی باطنی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔

"حسن بن صباح کو یہاں لا کر درخت کے ساتھ لٹکا کر پھانسی دیں گے"۔

"انتقام..... خون کا بدلہ خون..... انتقام!"

"فوج کو پھر واپس لے جاؤ"۔

اور ایسی بے شمار آوازیں تھیں جو بگولے بن کر اٹھ رہی تھیں۔ مائیں بین کرتے ہوئے کہہ رہی تھیں کہ ہم اپنے جوان بیٹے قربان کر دیں گی۔ لڑکے اور نوجوان بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ وہ الگ لشکر بنا کر الموت پر حملہ کریں گے۔

نظام الملک کی میّت اس کے گھر لائی گئی جہاں میت کو غسل دے کر اسے کفن پہنا دیا گیا پھر میّت کو ایک خوشنما پلنگ پر رکھ کر سرسبز لان میں رکھ دیا گیا۔ شہر کے تمام لوگ ایک قطار میں میت کے قریب سے گزرنے اور اپنے محبوب وزیر اعظم کا آخری دیدار کرنے لگے۔ وہاں صرف یہ نہیں تھا کہ تمام آنکھیں اشکبار تھیں بلکہ لوگ دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ بعض جوشیلے آدمی میّت کے قریب کھڑے ہو کر انتقام اور خون کا بدلہ خون کے نعرے لگا کر آگے جاتے تھے۔ لوگ اس قدر مشتعل تھے کہ ماتم ایک بے قابو ہنگامے کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ کئی عورتیں سینہ کوبی کر رہی تھیں۔

سلطان ملک شاہ کی جذباتی حالت عام شہریوں جیسی ہی تھی۔ وہ تو ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ نظام الملک اس کا دستِ راست تھا۔ اس کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔ نظام الملک صرف انتظامی امور کا ہی ماہر نہ تھا بلکہ جنگی امور اور سپہ سالاری میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ سلطان ملک شاہ نے دیکھا کہ لوگ انتقام کی آگ میں جلنے لگے ہیں اور ان پر قابو پانا ضروری ہے تو وہ نظام الملک کے گھر کے اندر چلا گیا۔ وہ بالائی منزل کی ایک کھڑکی میں جا کھڑا ہوا جو باہر کی طرف کھلتی تھی۔

"مَرو کے لوگو!" ——— سلطان ملک شاہ نے بلند آواز سے کہا ——— "تھوڑی سی دیر

کے لئے خاموش ہو جاؤ"۔

کئی آوازیں سنائی دیں ——— "خاموش..... خاموش..... سلطان کی بات سنو..... خاموش"۔

"اپنے جذبات پر قابو پاؤ" ——— سلطان ملک شاہ نے کہا ——— "مت سوچو کہ میں نظام الملک کے خون کو بھول جاؤں گا۔ باطنیوں نے نظام الملک کی پیٹھ میں خنجر نہیں مارا بلکہ انہوں نے سلطنت سلجوقیہ کے دل میں خنجر اتار دیا ہے لیکن یہ سلطنتِ خداداد اس طرح نہیں گرے گی جس طرح حسن بن صباح اور اس کے باطنی سمجھتے ہیں۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ نظام الملک کے خون کے ایک ایک قطرے کے بدلے بیس بیس باطنیوں کا خون بہایا جائے گا۔ یہ باطنی اسلام کا چہرہ مسخ کر رہے ہیں۔ ہم نے لشکر کشی سے کوئی ملک فتح نہیں کرنا۔ ہم نے اس باطل کو خاک و خون میں گم کر دینا ہے۔ میں اپنی فوج کو نہاوند سے ہی اس لئے واپس لے آیا ہوں کہ تمام فوج پر رنج و غم کے بادل چھا گئے تھے اور ہر مجاہد پر ماتم اور انتقام کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس جذباتی کیفیت میں لڑائیاں لڑی تو جا سکتی ہیں لیکن جیتی نہیں جا سکتیں۔ میں اپنے لشکر کی نفری میں اضافہ کروں گا اور ہم الموت پر ایسا حملہ کریں گے کہ باطنیوں کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہے گا اور الموت کو ہم کھنڈر بنا کر واپس آئیں گے"۔

"ہم سب اس لشکر میں شامل ہوں گے" ——— پہلے ایک آواز آئی اور پھر بہت سی آوازیں گونجنے اور گرجنے لگیں ——— "لشکر فوراً بناؤ۔ ہم سب تیار ہیں۔ ہم کسی باطنی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے"۔

عورتوں کا جوش و خروش الگ تھا۔ عورتوں کی طرف سے بار بار یہی للکار سنائی دے رہی تھی ——— "ہمارے بیٹوں کو لے جاؤ۔ انہیں اسلام کے نام پر قربان کر دو۔ نظام الملک کے خون کا انتقام لو"۔

○

اُدھر الموت میں حسن بن صباح کو خبر مل چکی تھی کہ نظام الملک کو نہاوند میں ابو طاہر نام کے ایک فدائی نے قتل کر دیا ہے۔ حسن بن صباح نے یہ خبر ملتے ہی اپنے خصوصی نائبین کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا تھا۔

"ابو طاہر نے ایک آدمی کو ہی قتل نہیں کیا" ——— حسن بن صباح کہہ رہا تھا ———

"اس نے ایک فوج کو قتل کر دیا ہے..... کہاں ہے سلجوقیوں کی وہ فوج جو الموت کو محاصرے میں لینے آ رہی تھی؟.....وہ فوج واپس چلی گئی ہے۔ میں نے تمہیں کچھ عرصہ پہلے یہ بات کہی تھی کہ فوج کا آمنے سامنے آکر لڑنا نقصان دہ ہوتا ہے۔ اس کا بہترین علاج یہ ہے کہ حملہ آور فوج کو مارنے کی بجائے اُس حاکم کو مار ڈالو جس کے حکم سے فوج لڑتی ہے۔ اب تم نے عملی طور پر اس اصول کا مظاہرہ اور نتیجہ دیکھ لیا ہے۔ تم کسی دشمن بادشاہ کے لشکر کو کیوں مارنے یا شکست دینے کی کوشش کرتے ہو؟..... خود اس بادشاہ کو ہی مار ڈالو' اس کا لشکر خود ہی بھاگ جائے گا..... کیا مَرو تک ہمارا کوئی آدمی پہنچا ہے یا نہیں؟"

"ہاں امام!" — ایک آدمی نے جواب دیا — "وہ تو اُسی وقت بھیج دیا گیا تھا جس وقت یہ اطلاع پہنچی تھی کہ نظام الملک کو ہمارے ایک فدائی نے قتل کر دیا ہے"۔

"مجھے بہت جلدی معلوم ہو جانا چاہئے کہ مَرو کے لوگوں کا کیا ردِ عمل ہے" — حسن بن صباح نے کہا — "سب سے زیادہ ضروری بات تو یہ معلوم کرنی ہے کہ سلطان ملک شاہ اب کیا جوابی کارروائی کرے گا۔ وہ دبک کر تو نہیں بیٹھ جائے گا' اس نے انتقامی کارروائی ہر حال میں کرنی ہے لیکن میں وہاں کے لوگوں کے تاثرات معلوم کرنا چاہتا ہوں"۔

"ہاں امام!" — وہی آدمی بولا — "ہم نے یہ بندوبست بھی کر لیا ہے"۔

"مجھے ایک ایک لمحے کی اطلاع ملنی چاہئے کہ مَرو میں کیا ہو رہا ہے" — "حسن بن صباح نے کہا — "اگر سلطان ملک شاہ الموت پر حملے کی تیاری کر رہا ہو تو ہم اسے بھی نظام الملک کی طرح خدا کے پاس بھیج دیں گے"۔

سلطان ملک شاہ کے تین بیٹے تھے۔ بڑے کا نام برکیارق تھا اس سے چھوٹا محمد تھا اور اس کے بعد سنجر تھا۔ چھوٹے دونوں بھائی نوجوان تھے اور برکیارق اچھا خاصا بارعب جوان بن چکا تھا اور وہ عقلی طور پر اتنا بالغ ہو گیا تھا کہ باپ کو بڑے کارآمد مشورے دینے لگا تھا۔ ان کا ردِ عمل تو بہت ہی شدید تھا۔ مزمل آفندی بھی مَرو میں ہی رہتا تھا۔ اس کی سلطان ملک شاہ کے تینوں بیٹوں کے ساتھ گہری دوستی تھی۔ مزمل آفندی پر تو دیوانگی طاری ہو چکی تھی۔ وہ حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا لیکن وہاں اس کی ایسی برین واشنگ ہوئی کہ وہ نظام الملک کو قتل کرنے کے ارادے سے واپس آ گیا تھا۔ یہ تو شمونہ

شمونہ کا کمال تھا کہ ان دونوں نے مزمل آفندی پر قابو پا لیا اور اسے بیدار کر لیا
طلب
تھا۔ اس کے سینے میں تو حسن بن صباح کی نفرت ایسی شدید صورت اختیار کر گئی تھی جیسے اس کے وجود میں آگ لگی ہوئی ہو۔ اس کے ذہن میں ایک ہی سوچ تڑپتی رہتی تھی کہ وہ حسن بن صباح کو قتل کرے گا۔ لیکن ہُوا یہ کہ اس کا پیر و مرشد نظام الملک حسن بن صباح کے ایک فدائی کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

نظام الملک کو دفن ہوئے بہت دن گزر گئے تھے۔ سلطان ملک شاہ نے حکم دے دیا تھا کہ لشکر کی نفری بڑھائی جائے اور لشکر کو تیار کیا جائے۔ شہر کے جوان دھڑا دھڑ لشکر میں شامل ہو رہے تھے اور ان کی ٹریننگ شروع کر دی گئی تھی۔ ان ہی دنوں مزمل آفندی سلطان ملک شاہ کے تینوں بیٹوں کے پاس گیا۔ ملک شاہ کے بیٹوں پر بھی جوش و خروش اور انتقام کا جذبہ غالب تھا۔

"میرے دوستو!" — مزمل آفندی نے کہا — "بہت بڑا لشکر تیار ہو رہا ہے۔ میں تمہیں آج ہی بتا دیتا ہوں کہ بڑے سے بڑا لشکر بھی الموت جا کر ناکام ہو جائے گا۔ اس کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ ایک تو الموت کا قلعہ ایسا ہے کہ اسے محاصرے میں لیا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ حسن بن صباح کے پاس جو جانباز ہیں ان جیسے جانباز ہمارے لشکر میں نہیں۔ حسن بن صباح کوئی ایسی چال چلے گا جس سے ہمارا لشکر بیکار ہو کر رہ جائے گا"۔

"پھر کیا کرنا چاہئے؟" — سلطان ملک شاہ کے بڑے بیٹے برکیارق نے پوچھا — "یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہم خاموش ہو کر بیٹھ جائیں"۔

"یہی بات تو میں تم تینوں سے کرنے آیا ہوں" — مزمل آفندی نے کہا — "باطنیوں کو شکست دینے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ حسن بن صباح اور اس کے پیر و مرشد احمد بن عطاش کو قتل کر دیا جائے لیکن کام یہ بھی آسان نہیں۔ تم تینوں اچھی طرح جانتے ہو کہ میں حسن بن صباح کو قتل کرنے گیا تھا پھر مجھ پر جو بیتی وہ بھی تم جانتے ہو۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس قسم کے چند ایک جانباز تیار کرو جیسے حسن بن صباح نے تیار کر رکھے ہیں۔ میں ان کے ساتھ جاؤں گا اور ان کی راہنمائی کروں گا' لڑنا ہُوا تو لڑوں گا اور قتل کرنے کا موقعہ ملا تو جس جس کو قتل کرنا ہے کروں گا"۔

"میں آج ہی سالاروں کو بلا کر کہہ دوں گا" — برکیارق نے کہا — "مجھے امید

ہے کہ اپنی جانوں پر کھیلنے والے چند ایک آدمی تو ضرور ہی مل جائیں گے"۔

"لیکن برکیارق!" — مزمل آفندی نے کہا — "اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ تم کسی کو سونے چاندی کا لالچ دے کر تیار کر لو گے کہ وہ اپنی جان پر کھیل جائے گا تو تم بہت بڑی اور بڑی ہی خطرناک خوش فہمی میں اپنے آپ کو مبتلا کرو گے۔ حسن بن صباح نے اپنے جانبازوں پر مذہب اور عقیدے کا جنون طاری کر رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے جانبازوں کو حشیش پلا پلا کر ان کے دماغوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہاں تو یہ عالم ہے کہ سوچتا حسن بن صباح ہے اور عمل اس کے فدائی کرتے ہیں۔ کیا ہم اس طرح اور اس طریقے سے جانباز پیدا نہیں کر سکتے؟"

"کر سکتے ہیں" — برکیارق کے چھوٹے بھائی محمد نے کہا — "لیکن پہلے سالاروں کے ساتھ بات کر لی جائے"۔

یہاں جانبازوں کی باتیں تو ہو رہی تھیں اور ان لوگوں کو اُمید تھی کہ وہ اسی قسم کے جانباز تیار کر سکیں گے جیسے حسن بن صباح نے تیار کر رکھے تھے لیکن مؤرخ لکھتے ہیں کہ حسن بن صباح نے جس طرح فدائی تیار کئے تھے اس طرح بعد میں کوئی نہیں کر سکا۔ داستان گو پہلے تفصیل سے سنا چکا ہے کہ حسن بن صباح کے جانبازوں کو خوراک کیا کھلائی جاتی تھی، پلایا کیا جاتا تھا اور انہیں عیش و عشرت کے لئے کیسے کیسے سامان مہیا کئے جاتے تھے۔ باطنی جانبازوں کو تو حسن بن صباح نے درندے بنا ڈالا تھا جن کا کام چیرنے پھاڑنے کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ ان کے ذہنوں میں یہ ڈالا گیا تھا کہ جان دے کر ایک اور زندگی شروع ہوتی ہے جس میں صرف عیش و عشرت ہے، اس کے سوا اور کوئی ذمہ داری اور کوئی کام نہیں۔

مرو میں شمونہ بھی تھی۔ اسے چھوٹی سی عمر میں حسن بن صباح کے ڈاکوؤں نے قافلے سے اغوا کیا تھا اور اس طرح اسے ماں باپ سے جدا کر دیا تھا پھر ان لوگوں نے اُس کے باپ کو قتل کر دیا تھا۔ وہ مرو میں جس طرح آئی اور جس طرح نظام الملک کے سائے میں پہنچی وہ داستان گو سنا چکا ہے۔ وہ تو نظام الملک کو اپنا روحانی باپ سمجھتی تھی۔ اس باپ کو بھی حسن بن صباح کے ایک فدائی نے قتل کر دیا۔ وہ اس قدر روئی کہ اس کی ماں کو یہ خطرہ نظر آنے لگا تھا کہ یہ لڑکی روتے روتے مرجائے گی یا دماغی توازن کھو بیٹھے گی۔

ایک روز اچانک اس کا رونا بند ہو گیا اور اس کی آنکھیں خشک ہو گئیں۔ وہ ماں کے

پاس جا بیٹھی۔

"رات خواب میں نظام الملک سے ملاقات ہوئی ہے" — شمونہ نے ماں سے کہا — "انہوں نے گلہ کیا ہے کہ تم نے ابھی تک میرے قتل کا انتقام نہیں لیا"۔

اُس کی ماں نے یہ بات سنی اور جس انداز سے شمونہ نے یہ بات کی تھی، اس سے ماں کو یقین ہونے لگا کہ اس کی بیٹی کا دماغی توازن بگڑ گیا ہے۔

"انہیں تم سے بہت پیار تھا" — ماں نے کہا — "بس یہ وجہ ہے کہ وہ تمہیں خواب میں نظر آئے ہیں"۔

"نہیں ماں!" — شمونہ نے کہا — "وہ مجھے کہنے آئے تھے کہ میرے خون کا انتقام صرف تم لے سکتی ہو اور تم انتقام لو..... میں اب انتقام لے کے ہی رہوں گی۔ نظام الملک میرے روحانی باپ تھے"۔

"انتقام لو گی کیسے؟" — ماں نے پوچھا — "کیا تم الموت جا کر حسن بن صباح کو قتل کر سکتی ہو؟" — ماں نے پوچھا اور کہا — "تم اس کے پاس رہ چکی ہو۔ وہ جونہی تمہیں دیکھے گا حکم دے دے گا کہ اس لڑکی کو قتل کر دیا جائے۔ اس کے کئی آدمی تمہیں پہچانتے ہوں گے"۔

"میری بات غور سے سنو ماں!" — شمونہ نے کہا — "میں نے زبان کے داؤ پیچ اور ہیر پھیر حسن بن صباح سے سیکھے ہیں۔ یہ اسی پر آزماؤں گی۔ میرے پاس خنجر ہو گا۔ میں اس کے پاس چلی جاؤں گی اور کہوں گی کہ تمہاری محبت مجھے تمہارے پاس کھینچ لائی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مجھے جلاد کے حوالے کرے میں خنجر اس کے دل میں اتار چکی ہوں گی"۔

ماں نے اسے اس ارادے سے باز رکھنے کے لئے بہت دلیلیں دیں۔ اپنی محبت کا واسطہ بھی دیا اور یہ بھی کہا کہ تم نہ رہیں تو میرا اس دنیا میں اور کون ہو گا، میں اپنی جان خود ہی لے لوں گی لیکن شمونہ پر کسی بات کا ذرا سا بھی اثر نہ ہوا۔ شمونہ اپنے ارادے پر ڈٹی رہی۔ وہ ماں کی کوئی بات سننے کے لئے تیار ہی نہ ہوتی تھی۔

ماں نے جا کر مزمل آفندی کو بتایا۔ مزمل آفندی ان کے گھر چلا گیا۔ اس نے شمونہ کو ایسی جذباتی اور ہیجانی کیفیت میں دیکھا جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ حسین و جمیل لڑکی اپنے آپ میں ہے ہی نہیں اور اس کا دماغی توازن مشکوک ہے۔ مزمل نے اس پر اپنی

محبت کا طلسم طاری کرنے کے لئے کچھ جذباتی باتیں کیں۔

"مجھے کچھ نہ کہو مزمل!" — شمونہ نے کہا — "محبت بعد کی بات ہے۔ اس وقت میری عقل اور میری روح پر نظام الملک کا خون سوار ہے۔ جب تک میں اس خون کا قرض چکا نہیں لیتی میں اس محبت کو ذہن میں لا ہی نہیں سکتی"۔

"یہ بھی سن لو شمونہ!" — مزمل نے کہا — "جب تک میں زندہ ہوں تم گھر سے باہر قدم نہیں رکھو گی۔ کیا تم یہ سمجھتی ہو کہ ہم مرد مر گئے ہیں یا ہم اتنے بے حس اور بے غیرت ہو گئے ہیں کہ نظام الملک جیسے انسان کا خون ذہن سے اتار دیں گے؟..... میں جاؤں گا۔ ہم جانبازوں کا ایک گروہ تیار کر رہے ہیں۔ مجھے پوری امید ہے کہ وہ دن جلدی طلوع ہو گا جس دن میں احمد بن غطاش اور حسن بن صباح کی لاشیں تمہارے قدموں میں لا کر رکھوں گا"۔

"تم تو پہلے بھی وہاں گئے تھے!" — شمونہ نے کہا۔

"وہ تجربہ اب مجھے کام دے گا" — مزمل نے کہا — "اب میں اکیلا نہیں جاؤں گا۔ جانبازوں کا ایک گروہ لے کر جاؤں گا۔ کیا تم دیکھ نہیں رہی ہو کہ الموت پر حملے کے لئے اتنا بڑا لشکر تیار ہو رہا ہے؟"

"میں کچھ دن انتظار کر لوں گی" — شمونہ نے کہا — "اگر تم لوگ ناکام ہو گئے تو پھر یہ کام میں کر کے دکھا دوں گی"۔

وہاں اگر کوئی سب سے زیادہ اذیت میں مبتلا تھا تو وہ سلطان ملک شاہ تھا۔ اس سلطان کے آباؤ اجداد نے اسلام کے گرتے ہوئے پرچم کو سنبھالا اور سلطنتِ سلجوقیہ قائم کی تھی۔ تمام مؤرخ اس حقیقت پر متفق ہیں کہ سلطان ملک شاہ اُس دور میں اسلام کا محافظ اور پاسبان تھا۔ اُس وقت کا خلیفہ تو برائے نام خلیفہ تھا۔ سلطان ملک شاہ حالات کے ایسے بھنور میں آ گیا تھا جس میں سے اس کے لئے اکیلے نکلنا محال تھا۔ اس کے انتظامی اور دیگر امور اور مسائل میں نظام الملک کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے جسم میں دماغ ہوتا ہے، نظام الملک سلطان ملک شاہ کا بازو ہی نہیں بلکہ زورِ بازو بھی تھا۔ اسے اپنے تین بیٹوں میں سے کسی پر بھی اعتماد نہیں تھا۔ ان میں قومی اور دینی جذبہ تو تھا اور ان میں جوش و خروش بھی تھا لیکن ان میں وہ عقل اور فہم و فراست نہیں تھی جس کی ان حالات میں ضرورت تھی۔

جو مشکلات اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی تھیں، ان میں ایک یہ تھی کہ قلعہ الموت عام قلعوں جیسا نہیں تھا۔ پہلے اس قلعے کی ساخت اور محلِ وقوع بیان ہو چکا ہے۔ یہاں مختصراً ذکر ہو گا کہ یہ قلعہ کیسا تھا۔ یہ قلعہ پہاڑی کے اوپر تھا۔ اس کے ایک طرف دریا اور دوسری طرف دلدل اور جھیلیں تھیں۔ یہ خطّہ تو بہت ہی خوبصورت اور خوشنما تھا۔ وہاں گھنے درخت تھے، رنگا رنگ پھولوں والے خود رو پودے تھے، رنگا رنگ پتوں والی خوشنما جھاڑیاں تھیں اور گھاس مخمل کے فرش کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ جس پہاڑی پر یہ قلعہ اور شہر تھا، وہ تو ہریالی اور خود رو پھولدار پودوں اور بڑے ہی خوشنما درختوں کی وجہ سے اس قدر خوبصورت تھی کہ یہ اس زمین کا حصہ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس سارے خطّے کو دیکھ کر بڑے ہی حسین خواب کا گماں ہوتا تھا لیکن قدرت کے اس حسن میں بڑے ہی خوفناک خطرے پوشیدہ تھے۔

یہ ایک قدیم قلعہ تھا جو سلطان ملک شاہ نے دو تین مرتبہ دیکھا تھا۔ اس قلعے میں خطرہ یہ تھا کہ جتنا اوپر نظر آتا تھا اس سے تین گنا زیادہ نیچے پہاڑی کے اندر یعنی زمین دوز تھا۔ نیچے بڑی مضبوط چٹان تھی جو خاصی لمبی اور چوڑی تھی۔ کاریگروں نے اس چٹان کو نیچے سے کاٹ کاٹ کر راہداریوں، کمروں اور راستوں کی بھول بھلیاں بنا ڈالی تھیں۔ کوئی اجنبی وہاں جا نکلتا تو پھر اس کا وہاں سے نکل آنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ وہاں گھوڑے اور اونٹ غائب ہو جاتے تھے۔ سلطان ملک شاہ کو جو مسئلہ پریشان کر رہا تھا وہ یہ تھا کہ اس قلعے کو محاصرے میں لینے کے لئے اور پھر اس پر حملہ کرنے کے لئے بہت ہی بڑے لشکر کی ضرورت تھی اور پھر اصل ضرورت یہ تھی کہ اس لشکر کو خاص قسم کی ٹریننگ دی جائے۔

سلطان ملک شاہ نے وہاں اور ارد گرد کے علاقے میں اپنے جاسوس پھیلا رکھے تھے۔ الموت کے اندر بھی جاسوس موجود تھے۔ وہ وقتاً فوقتاً مرو آکر سلطان ملک شاہ کو وہاں کی خبریں اور اطلاعیں دیتے رہتے تھے لیکن اب وہاں سے جو اطلاعیں آ رہی تھیں وہ مشکلات میں اضافہ کر رہی تھیں مثلاً نظام الملک کے قتل کے ایک مہینے بعد دو جاسوسوں نے الموت سے آکر سلطان ملک شاہ کو آکر بتایا کہ باطنیوں کے حوصلے بلند ہو گئے ہیں اور انہوں نے تبلیغ کا کام تیز کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے ارد گرد کے بلکہ دُور دور تک کے قلعوں پر لڑے بغیر قبضہ کرنے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ سب نے

زیادہ خطرناک خبر یہ تھی کہ ان تمام علاقوں پر باطنی اس طرح غالب آگئے تھے جیسے وہاں کے لوگ حسن بن صباح کو امام ہی نہیں بلکہ نبی تک ماننے لگے تھے۔ عام سی قسم کے لوگوں میں بھی حسن بن صباح کے حکم پر جانیں قربان کرنے کا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔

ایک روز سلطان ملک شاہ نے اپنے تینوں بیٹوں کو بلایا۔

"میرے عزیز بیٹو!" ـــ سلطان ملک شاہ نے کہا ـــ "اسلام پر اتنا خطرناک وقت پہلے کبھی نہیں آیا تھا جتنا خطرناک اور خوفناک وقت اب آیا ہے۔ ہم نے اپنی سلطنت کا ہی دفاع نہیں کرنا بلکہ ہماری ذمہ داری اسلام کا تحفظ اور فروغ ہے۔ جس روز سلطنتِ سلجوقیہ ختم ہو گئی اُسی روز اسلام کا پرچم بھی گر پڑے گا۔ بادشاہ کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہوا کرتے لیکن میں اللہ کے حضور جوابدہ ہوں۔ یہ سلطنت میری نہیں، تمہاری نہیں اور تمہارے آباؤ اجداد کی بھی نہیں۔ یہ اللہ کی سلطنت ہے جس کا دفاع ہماری ذمہ داری ہے۔ میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا کہ میں کئی راتیں سویا بھی نہیں ہوں۔ میں ہمہ وقت پریشان رہتا ہوں۔ میں اپنے سر میں گرانی محسوس کرنے لگا ہوں۔ میں اکیلا رہ گیا ہوں"۔

"پدرِ محترم!" ـــ بڑے بیٹے برکیارق نے کہا ـــ "ہم تین بھائیوں کی موجودگی میں آپ کو یہ نہیں کہنا چاہئے کہ آپ اکیلے رہ گئے ہیں۔ میں ایک بات کہوں گا۔ نظام الملک شہید کو ہم اپنا روحانی باپ سمجھتے تھے۔ اللہ نے جو عقل و دانش انہیں عطا کی تھی وہ ہر کسی کو عطا نہیں ہوا کرتی۔ یہ میں بھی محسوس کیا کرتا ہوں کہ نظام الملک کے اٹھ جانے سے ہم کمزور ہو گئے ہیں لیکن ہم نے یہ کمزوری اپنے آپ میں اُن کی زندگی میں ہی پیدا کر لی تھی۔ آپ کے سامنے کوئی مسئلہ آیا تو آپ نے خود سوچنے اور فیصلہ کرنے کی بجائے وہ مسئلہ نظام الملک کے سپرد کر دیا۔ یہ وجہ ہے کہ آج آپ اپنے آپ کو تنہا اور کمزور سمجھ رہے ہیں۔ بہت بڑا لشکر تیار ہو رہا ہے اور اس لشکر میں آگ جیسا جذبہ موجود ہے۔ یہ لشکر جب حملہ کرے گا تو باطنیوں کے لئے یہ خاک و خون کا طوفان ثابت ہو گا"۔

"نہیں بیٹے!" ـــ سلطان ملک شاہ نے کہا ـــ "یہی تو اس مسئلے کا وہ پہلو ہے جسے تم سمجھ نہیں رہے۔ الموت کو لشکر کے زور پر فتح نہیں کیا جا سکتا۔ میں تو سوچ سوچ کر پریشان ہو گیا ہوں۔ تم مجھے سوچنے میں مدد دو۔ ہمیں کوئی اور طریقہ اختیار کرنا پڑے

گا"۔

"ہمیں موقع دیں پدرِ محترم!" ـــ اس کے بیٹے محمد نے کہا ـــ "آپ اتنے زیادہ بھی پریشان نہ ہو جائیں۔ ہم خود بھی ایک اور طریقہ اختیار کر رہے ہیں۔ ہم جانبازوں کا ایک گروہ تیار کر رہے ہیں"۔

سلطان ملک شاہ نے اپنے بیٹوں کو اپنی جو ذہنی اور جذباتی حالت بتائی تھی وہ بہت ہی کم بتائی تھی۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ اُس وقت سلطان ملک شاہ اعصابی تکلیف میں مبتلا ہو چکا تھا۔ مسائل تو الگ تھے، صرف نظام الملک کے غم نے ہی اسے نڈھال کر دیا تھا۔ وہ عیش و عشرت کا دلدادہ سلطان نہیں تھا۔ بنی نوع انسان کی محبت دل میں رکھنے والا سادہ طبیعت انسان تھا۔ اس کی عمر بھی کچھ زیادہ ہو گئی تھی جس سے جسم میں قوتِ مدافعت کم ہو گئی تھی۔ غم اور مسائل نے اس کے اعصاب پر اتنا زیادہ بوجھ ڈال دیا تھا جو اس کے اعصاب برداشت نہ کر سکے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ تنہائی میں اسے روتے بھی دیکھا گیا تھا۔ اس کی چال ڈھال میں پہلے والی شان و شوکت نہیں رہی تھی۔ اُس نے راتوں کو اٹھ اٹھ کر اللہ کی عبادت شروع کر دی تھی۔ شب بیداریوں کا اثر الگ تھا۔

○

جس طرح الموت کی خبریں اور اطلاعیں سلطان ملک شاہ کے جاسوس مَرو تک پہنچا رہے تھے اسی طرح حسن بن صباح کے جاسوس مَرو کی خبریں حسن بن صباح تک لے جا رہے تھے۔

دونوں اطراف میں فرق یہ تھا کہ سلطان ملک شاہ کو جب الموت کے بارے میں راز کی کوئی بات معلوم ہوتی تھی تو وہ پریشان ہو جاتا تھا لیکن جب حسن بن صباح کو اس کا کوئی جاسوس مَرو سے جا کر یہ بتاتا تھا کہ مَرو میں بہت بڑا لشکر تیار ہو رہا ہے اور اس لشکر کو جنگی تربیت دی جا رہی ہے اور اس لشکر میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے تو حسن بن صباح کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمودار ہونے کی بجائے اس کے ہونٹوں پر لطیف سا تبسم آ جاتا تھا۔ اسے یہاں تک معلوم ہو گیا تھا کہ سلطان ملک شاہ پہلے والا تندرست و توانا اور چاق و چوبند سلطان نہیں رہا۔ جاسوسوں نے حسن بن صباح کو یہ بھی بتایا تھا کہ سلطان ملک شاہ کی چال ڈھال اور بولنے کے انداز میں بھی نقاہت آ گئی ہے۔

ایک روز مزمل آفندی گھڑ دوڑ کے میدان کے باہر تماشائیوں میں کھڑا سواروں کی

ٹریننگ دیکھ رہا تھا۔ اسے کوئی جواں سال آدمی ملتا تو وہ اسے سب سے پہلے یہ بات کہتا تھا کہ وہ لشکر میں کیوں شامل نہیں ہُوا۔ اُس روز وہ گھوڑ سواروں کی ٹریننگ اتنی دلچسپی سے نہیں دیکھ رہا تھا جتنی توجہ سے وہ تماشائیوں کو دیکھتا پھرتا تھا۔ وہ تین چار نوجوانوں سے کہہ چکا تھا کہ وہ تماشا دیکھنے کی بجائے لشکر میں شامل ہو جائیں تو انہیں شہسوار بنا دیا جائے گا۔ وہ اس کوشش میں تھا کہ لشکر میں اضافہ ہوتا چلا جائے اور زیادہ نوجوان لشکر میں بھرتی ہوں۔

وہ تماشائیوں میں گھوم پھر رہا تھا کہ اسے اپنی عمر کا یعنی جواں سال ایک آدمی نظر آیا۔ یہ چہرہ اسے کچھ مانوس سا معلوم ہُوا۔ وہ سوچنے لگا کہ اسے اس نے پہلے کہاں دیکھا ہے۔ اتنا تو وہ سمجھ سکتا تھا کہ اس شہر کی آبادی بھی کچھ کم نہیں۔ چلتے پھرتے' کہیں نہ کہیں یہ شخص سامنے آگیا ہو گا لیکن مزمل یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے کہیں اور دیکھا تھا اور کسی خاص موقعہ پر اور کس خاص صورتِ حال میں دیکھا تھا۔ اس نے اس آدمی کے چہرے کو اور زیادہ غور سے دیکھا۔

مزمل کو دراصل اس آدمی کی دائیں آنکھ کے ذرا نیچے گال کی ہڈی پر ایک تِل نظر آرہا تھا جو مٹر کے دانے جتنا تھا اور یہ کالا تِل اُبھرا ہُوا تھا۔ مزمل اس تِل یا موکے کو نظرانداز نہ کر سکا۔ اس آدمی نے مزمل کی طرف دیکھا تو اس شخص کے چہرے کا تاثر بدل گیا اور وہ وہاں سے کھسکنے لگا۔ اس سے مزمل کو کچھ شک ہُوا۔

"ذرا رُکنا بھائی!" ـــ مزمل نے اُس کے پیچھے جاتے ہوئے کہا۔

وہ آدمی یوں چلتا چلا گیا جیسے اس نے مزمل کی آواز سنی نہ ہو۔ مزمل تیز تیز چلتا اس کے پاس جا پہنچا۔

"ہم اس سے پہلے کہاں ملے تھے؟" ـــ مزمل نے پوچھا اور اس کا چہرہ اور زیادہ غور سے دیکھتے ہوئے بولا ـــ "آپ کو میں نے یہاں اس شہر میں نہیں دیکھا' ہم کہیں اور ملے تھے"۔

"ضرور ملے ہوں گے بھائی!" ـــ اس آدمی نے کہا ـــ "میں تمہارے اخلاق کی تعریف کروں گا کہ تم نے مجھے یاد رکھا اور اتنی محبت سے مجھے بلایا۔ مجھے بالکل یاد نہیں کہ ہم کہیں ملے بھی تھے یا نہیں۔ ہو سکتا ہے ہم کسی قافلے میں ہمسفر رہے ہوں یا کسی سرائے میں تم نے مجھے دیکھا ہو۔ میں تجارت پیشہ آدمی ہوں۔ شہر شہر' قصبہ قصبہ گھومتا

رہتا ہوں۔ میں یہاں کا رہنے والا نہیں!"

"مجھے تمہارا یہ موٹا تِل یاد ہے" ـــ مزمل نے کہا۔

اس آدمی نے زوردار قہقہہ لگایا اور مزمل کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر زور سے دبایا۔

"اس تِل کی وجہ سے ہی جو مجھے ایک بار دیکھ لیتا ہے وہ ہمیشہ یاد رکھتا ہے" ـــ اس آدمی نے بڑے ہی شگفتہ لہجے میں کہا اور پوچھا ـــ "کیا تم یہیں کے رہنے والے ہو؟"

"ہاں بھائی!" ـــ مزمل آفندی نے جواب دیا ـــ "میں یہیں کا رہنے والا ہوں"۔

"اچھا دوست!" ـــ اس آدمی نے مزمل سے ہاتھ ملایا اور کہا ـــ "میں تمہاری محبت کو یاد رکھوں گا"۔

وہ آدمی چلا گیا اور مزمل کھڑا سوچتا رہا۔ اسے اتنا ہی یاد آرہا تھا کہ یہ شخص اسے کسی خاص صورتِ حال اور کسی خاص جگہ ملا تھا اور اس کے ساتھ اس کی اچھی خاصی باتیں بھی ہوئی تھیں۔ کچھ دن اور گزر گئے۔ مزمل سلطان ملک شاہ کے بیٹوں سے ملتا ملاتا ہی رہتا تھا۔ ان میں بڑا بیٹا برکیارق چونکہ عمر میں ذرا بڑا تھا اس لئے فہم و فراست رکھتا تھا اس لئے ہوش مندی کی بات کر بھی لیتا تھا اور سمجھتا بھی تھا۔ مزمل آفندی زیادہ تر اسی کے ساتھ رابطہ رکھتا تھا۔ دوستی کے علاوہ ان کا ایک تعلق یہ بھی تھا کہ دونوں ایک جانباز گروہ تیار کر رہے تھے۔ ایک صبح مزمل برکیارق کے ہاں گیا۔ دونوں اکٹھے وہاں جایا کرتے تھے جہاں فوجیوں کو تیغ زنی' تیراندازی اور برچھی بازی سکھائی جاتی تھی۔ مزمل نے اُس روز برکیارق کو پریشان سا دیکھا۔ مزمل نے اس سے پوچھا کہ آج کوئی خاص بات ہو گئی ہے کہ وہ اتنا پریشان نظر آرہا ہے؟

"ہاں بھائی!" ـــ برکیارق نے بتایا ـــ "سلطان تو صاحب فراش ہی ہو گئے ہیں"۔

"کوئی خاص تکلیف ہو گئی ہے؟" ـــ مزمل نے پوچھا۔

"کسی خاص مرض کا نام نہیں لیا جا سکتا" ـــ برکیارق نے جواب دیا ـــ "کہتے ہیں کہ سر میں گرانی ہے اور کسی وقت سارے جسم میں ایسی بے چینی شروع ہو جاتی ہے جو ان کی برداشت سے باہر ہو جاتی ہے۔ کمزوری اتنی محسوس کرنے لگے ہیں کہ ان کی ٹانگیں جسم کا بوجھ سہارنے کے قابل نہیں رہیں"۔

"طبیب نے دیکھا ہو گا؟"

"طبیب تو تین چار دنوں سے باقاعدہ آرہا ہے" ــــ برکیارق نے جواب دیا ــــ "طبیب نے کہا ہے کہ سلطان کو ذہنی سکون کی شدید ضرورت ہے۔ وہ مسکّن اور مقوّی دوائیاں دے رہا ہے لیکن کوئی افاقہ نظر نہیں آتا بلکہ حالت کبھی تو زیادہ ہی بگڑ جاتی ہے"۔

"انہیں نظام الملک کا غم لے بیٹھا ہے" ــــ مزمل نے کہا ــــ "پھر ان کے ذہن اور دل پر یہ بوجھ آپڑا ہے کہ وہ باطنیوں کو شکست نہیں دے سکیں گے۔ یہ ہمارا کام ہے کہ انہیں یقین دلائیں کہ ہم باطنیوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیں گے..... کیا یہ مناسب ہو گا کہ مجھے سلطان کے پاس لے چلو؟ مجھے امید ہے کہ میں انہیں اٹھالوں گا۔ میرے ساتھ ان کا اچھا خاصا پیار ہے"۔

"نہیں مزمل بھائی!" ــــ برکیارق نے کہا ــــ "طبیب نے سختی کے ساتھ کہہ دیا ہے کہ باہر کا کوئی آدمی سلطان کے پاس نہ آئے۔ جب تک سلطان خود کسی کو نہ بلائیں' گھر کا بھی کوئی فرد ان کے پاس نہ جائے"۔

اس کے بعد مزمل اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ اس کا اب یہی ایک عزم تھا کہ جانبازوں کا ایک گروہ تیار کرنا ہے اور انہیں اسی طرح بنانا ہے جس طرح سلطان کا ایک ایلچی الموت جا کر حسن بن صباح کے فدائیوں کو دیکھ آیا تھا۔ مزمل چاہتا تھا کہ خواہ بیس ہی جانباز تیار ہو جائیں لیکن وہ اس طرح تیار ہوں کہ اگر کسی سے کہا جائے کہ وہ اپنے پیٹ میں تلوار اتار لے تو وہ بلا حیل و حجت اپنے پیٹ میں تلوار اتار لے۔ مزمل کا یہ عزم تو تھا لیکن اسے ایسا کوئی تجربہ حاصل نہیں تھا کہ اس طرح کے جانباز کیسے تیار کئے جاتے ہیں۔ بہرحال اسے دس بارہ نوجوان مل گئے تھے جنہیں ایک سالار ہتھیاروں کے استعمال کی تربیت دے رہا تھا۔ اس کے بعد انہیں حسن بن صباح کے فدائیوں کی طرح جانبازی کے لئے تیار کرنا تھا۔ مزمل زیادہ تر وقت ان کے ساتھ صرف کر رہا تھا اور ان کے دلوں میں وہ باطنیوں کی نفرت کی آگ جلانے کی کوششیں کر رہا تھا۔

○

ایک روز برکیارق اپنے گھر سے نکلا تو اسے باہر والے دروازے پر ایک درویش صورت آدمی کھڑا نظر آیا۔ دربان اس آدمی کو اندر جانے سے روک رہے تھے۔ اس

درویش نے برکیارق کو دیکھا تو دور سے ہی ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا۔ برکیارق اُس تک جا پہنچا۔ دربانوں نے اسے بتایا کہ یہ درویش اندر جانے اور سلطان کو دیکھنے کی اجازت مانگ رہا تھا۔

درویش کے ایک ہاتھ میں تسبیح اور دوسرے ہاتھ میں عصا تھا۔ اس نے سر پر سفید پگڑی لپیٹ رکھی تھی اور اس پر ایک چوڑا سبز رنگ کا کپڑا ڈال رکھا تھا جو اس کے کندھوں تک آیا ہُوا تھا۔ اُس نے سبز رنگ کا چغہ پہن رکھا تھا جو اُس کے ٹخنوں تک لمبا تھا۔ اس نے گلے میں موٹے موتیوں کی ایک مالا ڈال رکھی تھی۔ اس کی داڑھی خشخشی تھی اور اس داڑھی اور چہرے سے وہ چالیس سال کے لگ بھگ عمر کا لگتا تھا۔ بہرحال وہ ہر پہلو سے درویش معلوم ہوتا تھا۔

"آپ سلطان سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" ــــ برکیارق نے پوچھا اور اسے بتایا ــــ "آپ کو شاید معلوم نہیں کہ سلطان بیمار پڑے ہیں اور طبیب نے ان کی ملاقاتیں بند کر دی ہیں۔ آپ مجھے بتائیں میں آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ یہاں جو بھی آتا ہے وہ مایوس واپس نہیں جایا کرتا۔ میں نے آپ کو مجبوری بتادی ہے ورنہ سلطان فوراً آپ کو ملاقات کے لئے بلاتے"۔

"میں جانتا ہوں" ــــ درویش نے کہا ــــ "میں یہی سن کر آیا ہوں کہ سلطان بیمار پڑے ہیں۔ میں نے یہ بھی معلوم کر لیا ہے کہ سلطان کو کیا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ سلطان کو طبیب نے ایسی دوائیاں دی ہیں جن کے زیرِ اثر سلطان سوئے رہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ طبیب کا علاج روک دیا جائے۔ وہ علاج جاری رکھا جائے۔ میں روحانی عامل ہوں۔ مجھے شک ہے کہ سلطان پر کوئی سفلی عمل کیا گیا ہے اور میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہ سفلی عمل باطنیوں نے کروایا ہے۔ مجھے صرف ایک بار سلطان سے ملنے دیں' میں صرف انہیں دیکھوں گا"۔

"میں سلطان سے پوچھ کر آپ کو کچھ بتا سکوں گا" ــــ برکیارق نے کہا ــــ "اس وقت تو وہ سوئے ہوئے ہیں"۔

"انہیں بے آرام نہیں کرنا" ــــ درویش نے کہا ــــ "میں ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کو مجھ پر اتنی جلدی اعتماد نہیں کرنا چاہئے۔ میں آپ کے لئے اجنبی ہوں۔ اپنے متعلق یہ بتا دوں کہ میں آگے جا رہا ہوں' یہاں کچھ دنوں کے لئے رکا ہوں اور

سرائے میں ٹھہرا ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو سرائے میں آجائیں اور میری کچھ باتیں سنیں اور کچھ باتیں میں آپ سے پوچھوں گا۔ پھر آپ مجھ پر اعتماد کر لیں گے۔ مجھے کوئی لالچ نہیں۔ آپ میرے پاس آئیں"۔

"میں ابھی نہ چلا چلوں؟" ——— برکیارق نے پوچھا۔

"یہ تو اور زیادہ اچھا رہے گا" ——— درویش نے کہا ——— "آیئے!"

راستے میں درویش باتیں کرتا گیا۔ برکیارق کو بولنے کا موقع نہ ملا لیکن درویش کی باتوں سے وہ متاثر ہو گیا تھا۔

چلتے چلتے وہ سرائے میں جا پہنچے۔ درویش برکیارق کو بالائی منزل پر لے گیا۔ اس کا کمرہ اوپر تھا۔

وہ جب کمرے میں داخل ہوئے تو ایک نوجوان لڑکی نے ان کا استقبال کیا۔

"یہ سلطانِ مکرّم کے بڑے فرزند برکیارق ہیں" ——— درویش نے لڑکی سے کہا ——— "سلطان سوئے ہوئے تھے۔ ان سے ملاقات ہو گئی اور یہ میرے ساتھ ہی آگئے ہیں"۔

"خوش آمدید!" ——— لڑکی نے ذرا جھک کر کہا ——— "سلطان کی بیماری نے ہمارے دلوں پر بہت اثر کیا ہے۔ میں ان کے لئے دعا کرتی رہتی ہوں۔ اگر یہ ممکن ہو تو میں اپنی زندگی سلطان کو دے دوں۔ سلطان ملک شاہ ہی ہیں جو اسلام کے ایک بڑے ہی مضبوط ستون ہیں۔ اللہ انہیں سلامت رکھے"۔

"یہ میری چھوٹی بہن روزینہ ہے" ——— درویش نے کہا ——— "فرزندِ سلطان! یہ میرے کندھوں پر بہت بڑی اور بڑی ہی نازک ذمہ داری ہے۔ میں اس ذمہ داری سے فارغ ہونا چاہتا ہوں لیکن کوئی موزوں آدمی نظر نہیں آتا۔ اگر کوئی آدمی ٹھیک ملتا بھی ہے تو اس کا خاندانی پس منظر ٹھیک نہیں ہوتا۔ نظریات اور عقیدوں کا فرق بھی ہوتا ہے۔ میں اس بہن کو پھینکنا یا ضائع نہیں کرنا چاہتا"۔

برکیارق سلطان زادہ تھا' حکمران خاندان کا چشم و چراغ تھا اور وہ جوان بھی تھا۔ وہ تھا تو پکا مسلمان لیکن اپنے باپ کی طرح مومن نہ تھا۔ وہ عیش پرست اور مے نوش تو نہ تھا لیکن اتنی نوجوان اور حسین لڑکی کو دیکھ کر متاثر نہ ہونا اس کی فطرت میں نہیں تھا۔ کچھ دیر کے لئے تو وہ یہ بھول ہی گیا کہ لڑکی کا بڑا بھائی درویش کمرے میں موجود ہے۔ برکیارق کی نظریں اس لڑکی کی زلفوں میں الجھ کے رہ گئیں۔ برکیارق کی نظروں سے ایک

سے بڑھ ایک لڑکی گزری تھی۔ بعض کو تو وہ کچھ دیر بعد بھول جاتا تھا' کچھ اسے ایک دو دن یاد رہتی تھیں اور کبھی کوئی لڑکی اسے اپنے حسن و جوانی کی وجہ سے کئی کئی دن یاد رہتی تھی۔ وہ شہزادوں کی طرح لڑکیوں میں دلچسپی رکھنے والا آدمی نہیں تھا۔ اس پر اپنے باپ کا کم از کم یہ اثر ضرور تھا کہ وہ لڑکیوں کا شیدائی نہیں تھا لیکن آخر وہ جواں سال آدمی تھا۔ اس لڑکی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ روزینہ حسین تو تھی ہی لیکن برکیارق نے اس میں کوئی ایسی کشش' ایسی جاذبیت یا کوئی ایسا طلسماتی تاثر دیکھا کہ اس کے جی میں یہی آتی تھی کہ کچھ وقت اس کمرے میں اس لڑکی کے ساتھ گزارے۔ لڑکی کے چہرے کے نقش و نگار کوئی غیر معمولی طور پر پُرکشش نہیں تھے' لڑکی کا انداز کچھ ایسا تھا جس کے اثر سے برکیارق' اپنے آپ کو بچا نہ سکا۔ برکیارق لڑکی کی طرف دیکھتا تو وہ نظریں جھکا لیتی تھی۔ جب برکیارق درویش کی طرف متوجہ ہوتا تو لڑکی برکیارق کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتی تھی۔

"میں حج کے لئے جا رہا ہوں" ——— درویش نے کہا ——— "لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس سال بھی میں حج نہیں کر سکوں گا۔ میں حج پر اُس وقت جاؤں گا جب روزینہ کا ہاتھ کسی معزز انسان کے ہاتھ میں دے دوں گا۔ یہ میرے مرحوم ماں باپ کی امانت ہے۔ اسے بچا بچا کر اور سینے سے لگا کر رکھ رہا ہوں"۔

برکیارق نے ابھی شادی نہیں کی تھی۔ وہ یہ تو بھول ہی گیا کہ وہ اس درویش کے ساتھ کیوں آیا تھا' وہ اس سوچ میں گم ہو گیا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہے تو کیا سلطان ملک شاہ اسے اس کی اجازت دے دے گا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ شادی کرے گا تو اس لڑکی کے ساتھ کرے گا۔ مشکل یہ تھی کہ سلطان ملک شاہ اعصاب زدگی میں پڑا تھا۔ اس حالت میں برکیارق اس سے یہ نہیں پوچھ سکتا تھا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے' کیا اسے اجازت مل سکتی ہے یا نہیں۔

"میں سلطان ملک شاہ کا معتقد اور مرید ہوں" ——— درویش نے کہا ——— "یہاں آکر پتہ چلا کہ وہ تو بیمار پڑے ہیں۔ میں نے ان کے مرض کی علامات اِدھر اُدھر سے معلوم کیں۔ میرا باپ علمِ روحانیت میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے دو تین کرامات مجھے ورثے میں دی تھیں۔ مجھے جب سلطان کی علامات معلوم ہوئیں تو میرا دھیان حسن بن صباح اور اس کے باطنی فتنے کی طرف چلا گیا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ آپ کے پدرِ محترم

نے اس فتنے کی سرکوبی کے لئے کیا کیا جتن کیے ہیں۔ مجھے یہ بھی خیال آیا کہ حسن بن صباح اور اس کا استاد سفلی علم کے ماہر ہیں۔ نظام الملک تو قتل ہو گئے ہیں لیکن سلطان کو یہ باطل پرست سِفلی عِلم سے مفلوج کر دینا چاہتے ہیں یا اُنہیں ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں گذشتہ رات نفل پڑھ کر مراقبے میں گیا' مجھے جو صورت حال نظر آئی اس سے میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ سلطان پر کوئی دوائی اثر نہیں کرے گی لیکن دوائی روکنی بھی نہیں کیونکہ یہ دوائی انہیں سلا دیتی ہے اور ان کے لئے سوئے رہنا ہی اچھا ہے۔ میں ان کا روحانی علاج کرنا چاہتا ہوں اور اس کے سوا کوئی ذریعہ نہیں جو انہیں سِفلی اثرات سے نجات دلا دے۔"

اُس کے بعد درویش نے ایسی طلسماتی اور پُراسرار سی باتیں کیں کہ برکیارق نے شدت سے محسوس کیا کہ ابھی اس درویش کو اپنے باپ کے پاس لے جائے اور انہیں کہے کہ وہ اس درویش کا علاج فوراً" شروع کر دیں۔

"ایک بات بتائیں" ___ برکیارق نے درویش سے پوچھا ___ "کیا سِفلی عمل سے کوئی ہماری پوری سلطنت کو تباہ کر سکتا ہے؟"

"نہیں!" ___ درویش نے جواب دیا ___ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ ذرا تصور میں لائیں کہ ایک گھر کے ذمہ دار افراد کو ذہنی طور پر مفلوج کر دیا جائے یا ان پر اعصابی مرض طاری کر دیا جائے تو اس کا نتیجہ کیا ہو گا؟..... وہ گھر تباہ حال ہو جائے گا۔ یہی مثال ایک سلطنت کی ہوتی ہے۔ سلطان ملک شاہ کو دماغی اور جسمانی لحاظ سے معذور کر دیا گیا ہے۔ اگر آپ ان کے جانشین ہوں گے تو آپ کا بھی یہی انجام ہو گا' پھر سلطنت نے تو تباہ ہونا ہی ہے"۔

"آپ کا طریقۂ علاج کیا ہو گا" ___ برکیارق نے پوچھا ___ "کیا آپ ان کے لئے دعا کریں گے یا کوئی اور طریقہ اختیار کریں گے؟"

"میں دعا بھی کروں گا" ___ درویش نے کہا ___ "اور میں کلام اللہ کے تعویذ لکھ کر بھی دوں گا لیکن میرا طریقۂ علاج اُس وقت کامیاب ہو گا جب میں سلطان کو دیکھ لوں گا..... آپ مجھے ان سے جلدی ملوا دیں۔ میں اپنے پیر و مرشد کو اُس روحانی اذیت میں پڑا ہوا نہیں دیکھ سکتا"۔

"میں خود بھی تو انہیں اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا" ___ برکیارق نے کہا ___

"وہ آپ کے پیر و مُرشد ہیں اور میرے باپ ہیں۔ میں جاتا ہوں۔ وہ جونہی جاگے میں یہاں آجاؤں گا اور آپ کو ساتھ لے جاؤں گا..... کیا آپ سارا دن یہیں ہوں گے؟"

"ہاں!" ___ درویش نے جواب دیا ___ "میں جب تک سلطان کو دیکھ نہ لوں یہیں رہوں گا"۔

"بھائی جان!" ___ روزینہ نے درویش سے کہا ___ "آپ وہ کام کر آئیں لیکن ذرا جلدی آجانا"۔

"ہاں!" ___ درویش نے کہا ___ "تم نے یاد دلا دیا ہے۔ میں وہ کام کر آتا ہوں۔ اتنی دیر فرزندِ سلطان تمہارے ساتھ رہیں گے" ___ درویش نے برکیارق سے کہا ___ "یہ اکیلے ڈرتی ہے۔ میرا چھوٹا سا ایک کام ہے۔ آپ اس کے پاس بیٹھیں' میں ابھی آتا ہوں"۔

درویش باہر نکل گیا۔

"آپ تو شادی شدہ ہوں گے؟" ___ روزینہ نے برکیارق سے کہا۔

"نہیں روزینہ!" ___ برکیارق نے کہا ___ "ہمارے خاندان کا یہ دستور ہے کہ اولاد کی شادی اُس وقت کرتے ہیں جب وہ ذہنی طور پر پوری طرح بالغ ہو جاتی ہے۔ میں نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا کہ میں کس کے ساتھ شادی کروں گا"۔

"کیا آپ کسی خاص لڑکی کو چاہتے ہیں؟" ___ روزینہ نے شرماتے ہوئے پوچھا۔

"لڑکیاں بہت دیکھی ہیں" ___ برکیارق نے کہا ___ "ایک سے بڑھ کر ایک لڑکی دیکھی ہے لیکن میرے دل نے کسی ایک کو بھی پسند نہیں کیا"۔

"کیا آپ لڑکی میں کوئی خاص وصف دیکھنا چاہتے ہیں؟" ___ روزینہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں!" ___ برکیارق نے جواب دیا ___ "میں خاص وصف ہی ڈھونڈ رہا ہوں"۔

"کیا وہ کسی ایک بھی لڑکی میں نظر نہیں آیا؟" ___ روزینہ نے پوچھا۔

"آج نظر آگیا ہے" ___ برکیارق نے کہا ___ "وہ وصف تم میں نظر آیا ہے"۔

"لیکن میں شاہی خاندان کے قابل تو نہیں" ___ روزینہ نے کہا ___ "میں اپنی حیثیت کو اچھی طرح پہچانتی ہوں"۔

"دیکھو روزینہ!" ___ برکیارق نے کہا ___ "تھوڑی سی دیر کے لئے بھول جاؤ کہ

میں سلطان زادہ ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ کا ایک آدمی سمجھو اور دیانتداری سے بتاؤ کہ میں تمہیں اچھا لگتا ہوں یا نہیں؟"

"آپ نے بڑا ہی مشکل سوال کیا ہے" —— روزینہ نے کہا —— "اگر میں نے کہا کہ آپ مجھے بہت ہی اچھے لگتے ہیں تو آپ کہیں گے کہ آپ شاہی خاندان کے فرد ہیں اس لئے مجھے اچھے لگتے ہیں۔ اگر میں نے کہا کہ میں نے آپ میں اچھا لگنے والا کوئی وصف نہیں دیکھا تو آپ ناراض ہو جائیں گے۔ دانشمند کہتے ہیں کہ بادشاہوں سے دُور رہو۔ خوش ہوتے ہیں تو اشرفیوں سے جھولی بھر دیتے ہیں۔ ناراض ہو جائیں تو سُولی پر کھڑا کر دیتے ہیں"۔

"میں تم میں ایک اور وصف دیکھنا چاہتا ہوں" —— برکیارق نے کہا —— "میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم میں جرأت بھی ہے نہیں۔ میں ایسی لڑکی کی تلاش میں ہوں جو اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے"۔

"یہ وصف بھی مجھ میں ہے" —— روزینہ نے کہا —— "میں سچّی بات کہہ چکی ہوں۔ وہ ایک بار پھر کہہ دیتی ہوں۔ اگر میں نے کہا کہ آپ میرے دل کو بہت ہی اچھے لگتے ہیں تو آپ کے دماغ میں سلطانی بیدار ہو جائے گی اور آپ شک کریں گے کہ مجھے آپ کے ساتھ نہیں آپ کے رتبے کے ساتھ محبت ہے۔ آپ نے بہت سی لڑکیاں دیکھی ہیں اور کسی ایک کو بھی اپنے قابل نہیں پایا۔ میں نے بھی بہت لڑکے دیکھے ہیں نوجوان بھی اور پکی عمر کے جوان بھی۔ آپ کی طرح مجھے بھی کسی میں وہ وصف نظر نہیں آیا جو آپ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں"۔

"کیا وہ وصف مجھ میں نہیں؟" —— برکیارق نے پوچھا —— "اب میں توقع رکھوں گا کہ تم جرأت سے سچ بولو گی"۔

"ہاں، آپ میں مجھے وہ خوبی نظر آگئی ہے"۔

"کیا ہے وہ خوبی؟" —— برکیارق نے پوچھا۔

"آپ سلطان کے بیٹے ہیں" —— روزینہ نے جواب دیا —— "لیکن میں نے آپ کے انداز میں سلطانی نہیں دیکھی۔ آپ نے میرے درویش بھائی سے کہا تھا کہ آپ نے لڑکیوں میں کبھی دلچسپی نہیں رکھی۔ اگر آپ نے سچ بولا تھا تو آپ وہ آدمی ہیں جسے میں اپنے خاوند کی حیثیت سے پسند کروں گی لیکن میں اتنی کمتر ہوں کہ آپ سے یہ

درخواست کروں گی ہی نہیں کہ آپ مجھے قبول کر لیں اور میرا بھائی میرے فرض سے فارغ ہو کر حج کے لئے چلا جائے"۔

تاریخ گواہی دیتی ہے کہ برکیارق لڑکیوں کا شیدائی نہیں تھا جس طرح کہ شہزادے ہُوا کرتے ہیں۔ یہ پہلی لڑکی تھی جو اس کے دل میں اُتر گئی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں روزینہ اس کے دل پر ہی نہیں بلکہ دماغ پر بھی غالب آگئی۔ اس نے روزینہ کو اپنا فیصلہ سنا دیا لیکن روزینہ نے پھر بھی یہ کہا کہ وہ ڈرتی ہے کہ برکیارق کے دماغ میں سلطانی بیدار ہو گئی تو وہ روزینہ کو اٹھا کر باہر پھینک دے گا۔

"نہیں..... نہیں!" —— روزینہ نے کہا —— "یہ شادی نہیں ہو سکے گی۔ سلطان ملک شاہ آپ کو اجازت نہیں دیں گے کہ آپ ایک ایسی لڑکی سے شادی کر لیں جس کا نہ کوئی گھر گھاٹ ہے اور نہ اس کا کوئی ٹھکانہ ہے"۔

برکیارق نے اسے قسمیں کھا کھا کر یقین دلانا شروع کر دیا کہ اسے اگر سلطان نے شادی کی اجازت نہ دی تو وہ روزینہ کو ساتھ لے کر یہاں سے چلا ہی جائے گا۔

"میں تمہاری محبت پر سلطنت کی جانشینی اور وراثت قربان کر دوں گا" —— برکیارق نے کہا —— "اللہ گواہ ہے کہ تم پہلی لڑکی ہو جسے میں یہ الفاظ کہہ رہا ہوں"۔

"آپ میری محبت پر سلطنت کی وراثت قربان کر رہے ہیں" —— روزینہ نے کہا —— "اور میں آپ کی سلطانی پر اپنی محبت قربان کرتی ہوں..... آپ سلطان کے بڑے بیٹے ہیں۔ ان کے بعد آپ سلطان بنیں گے۔ میں آپ کو سلطان کے روپ میں دیکھنا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے زیادہ مجبور نہ کریں"۔

"تمہارے بھائی جان آرہے ہوں گے" —— برکیارق نے کہا اور اس سے پوچھا —— "اگر میں تمہیں تنہائی میں ملنا چاہوں تو کیسے مل سکتا ہوں؟"

"میں آپ کو تنہائی میں بھی مل سکتی ہوں" —— روزینہ نے کہا —— "لیکن میں آپ کو یہ بتا دیتی ہوں کہ آپ سلطان کے بیٹے کی حیثیت سے مجھے ملنے آئے تو وہ ہماری آخری ملاقات ہو گی۔ میرے پاس کوئی دولت نہیں۔ میرا بھائی درویش ہے۔ اس کے پاس اتنی سی پونجی ہوتی ہے کہ ہم دو وقت عزت کی روٹی کھا لیتے ہیں اور سفر کے اخراجات ادا کر سکتے ہیں لیکن میرے پاس جو دولت ہے وہ میری آبرو، میری عصمت ہے۔ میں جان دے دوں گی، اس دولت سے دست بردار نہیں ہوں گی۔ آپ میرے

قدموں میں اشرفیوں کا انبار لگا دیں۔ آپ مجھے خرید نہیں سکیں گے"۔

"کیا تم میری محبت کو بھی قبول نہیں کرو گی؟" ـــــ برکیارق نے پوچھا ـــــ "کیا تم اس روحانی محبت کو نہیں پہچان سکو گی جس کا تعلق جسموں کے ساتھ نہیں ہوتا؟"

"میں اسی محبت کی جستجو میں ہوں" ـــــ روزینہ نے کہا ـــــ "لیکن سنا ہے شاہی خاندانوں میں ایسی محبت نہیں ملا کرتی جس کا تعلق روح کے ساتھ ہوتا ہے جسموں کے ساتھ نہیں"۔

"میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں" ـــــ برکیارق نے کہا ـــــ "تم یہ بتاؤ کہ تنہائی میں کہاں اور کس وقت مل سکو گی؟"

"رات کو میرا بھائی بڑی ہی گہری نیند سویا کرتا ہے" ـــــ روزینہ نے کہا ـــــ "اس کے سر پر ڈھول بجتے رہیں' اس کی آنکھ نہیں کھلتی۔ سرائے کے پچھواڑے بڑا خوبصورت باغ ہے۔ آپ نے دیکھا ہو گا درخت بے شمار ہیں۔ آپ آدھی رات کے وقت یہاں آجائیں۔ میں آپ کے ساتھ باغ تک چلی چلوں گی"۔

"میں آج رات باغ میں آجاؤں گا" ـــــ برکیارق نے کہا ـــــ "آدھی رات کے وقت آؤں گا اور تمہارا انتظار کروں گا"۔

برکیارق تو جیسے بھول ہی گیا تھا کہ وہ اتنی بڑی سلطنت کے سلطان کا بیٹا ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ روزینہ صرف خوبصورت ہی نہیں' اس میں خود اعتمادی اور جرأت بھی ہے۔ ان اوصاف نے روزینہ کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔ کچھ دیر پہلے برکیارق اس سے محبت کی بھیک مانگ رہا تھا۔ یہ لڑکی اس پر طلسم ہوشربا بن کر غالب آگئی تھی اور برکیارق یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اس پر کوئی نشہ طاری ہو گیا ہو۔

درویش آگیا۔ وہ خاصا وقت لگا کر آیا تھا لیکن برکیارق نے یوں محسوس کیا جیسے وہ صرف ایک لمحہ باہر رہا ہو۔ اس نے برکیارق کا شکریہ ادا کیا کہ اس کی غیر حاضری میں وہ اس کی بہن کے پاس بیٹھا رہا تھا۔

برکیارق وہاں سے اٹھنا ہی نہ چاہتا تھا لیکن اسے اٹھنا پڑا۔ وہ اٹھا اور قدم گھسیٹنے کے انداز سے چلتا کمرے سے باہر نکل آیا۔

⊙

اُس روز برکیارق دن بھر کے کام کاج بھول گیا تھا۔ وہ سرائے سے سیدھا اپنے گھر

گیا۔ اس نے باپ کو جا کر دیکھا۔ باپ جاگ اٹھا تھا۔ وہ باپ کے پاس بیٹھ گیا۔

"برکیارق بیٹا!" ـــــ سلطان ملک شاہ نے بڑی ہی نحیف آواز میں کہا ـــــ "میری زندگی کا اب کوئی بھروسہ نہیں۔ اس حقیقت کو قبول کر لو کہ میں دو چار دنوں کا ہی مہمان ہوں۔ سلطنت کی ساری ذمہ داریاں تمہارے کندھوں پر آرہی ہیں۔ تم نے صرف اتنی بڑی اسلامی سلطنت کو ہی نہیں سنبھالنا بلکہ اسلام کی پاسبانی بھی کرنی ہے اور اولیت دینِ اسلام کو دینا....."

"اتنی مایوسی؟" ـــــ برکیارق نے سلطان ملک شاہ سے کہا ـــــ "ابھی تو اللہ نے آپ سے بہت کام لینے ہیں۔ خدا کے لئے اس مایوسی کو اپنے ذہن سے جھٹک ڈالیں۔ میں نے طبیب سے پوچھا ہے۔ وہ کہتا ہے سلطان کو کوئی جسمانی مرض لاحق نہیں۔ انہوں نے اپنے ذہن اور دل پر خود ہی بوجھ ڈال لیا ہے..... اب آپ میری ایک بات غور سے سنیں۔ میں آپ کا روحانی علاج کرانا چاہتا ہوں"۔

"میں خود روحانیت کا قائل ہوں" ـــــ سلطان ملک شاہ نے کہا ـــــ "لیکن مجھے کوئی علمِ روحانیت کا عالم نظر نہیں آتا"۔

"مجھے ایک عالم اور روحانی علاج کا ماہر نظر آگیا ہے" ـــــ برکیارق نے کہا ـــــ "اس نے یہی بتایا ہے کہ آپ کو کوئی جسمانی عارضہ لاحق نہیں۔ آپ پر کوئی عمل کیا گیا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ یہ عمل کس نے کیا ہو گا..... حسن بن صباح کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا..... اس عالم نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے بڑی لمبی عمر پائی ہے"۔

برکیارق نے سلطان ملک شاہ کو وہ ساری باتیں سنائیں جو درویش نے اس کے ساتھ کی تھیں۔ جوں جوں وہ درویش کی باتیں سنتا جا رہا تھا' اس کے مُرجھائے ہوئے چہرے پر رونق عود کرتی آرہی تھی۔ طبیب نے اسے کئی بار بتایا تھا کہ وہ ذہنی طور پر بیدار ہو جائے اور یقین کر لے کہ وہ کسی جسمانی مرض میں مبتلا نہیں۔ طبیب نے اسے الگ الگ کر کے بتایا تھا کہ اس کے ذہن پر کون کون سی باتیں اثر انداز ہو رہی ہیں اور اس کا علاج یہ نہیں کہ انسان ہتھیار ڈال کر لیٹ ہی جائے اور اپنے آپ کو مُردہ سمجھ لے لیکن سلطان ملک شاہ طبیب کی کسی بات کو قبول نہیں کرتا تھا۔ وہ اس کی صرف دوائیاں قبول کر رہا تھا۔ اس کے اپنے بڑے بیٹے برکیارق نے اس درویش کا تفصیلی ذکر کیا تو وہ فوراً مان گیا اور اس نے بیٹے سے کہا کہ وہ اس درویش کو ساتھ لے آئے۔

برکیارق اٹھ دوڑا۔ اسے اپنے باپ کی صحت کے ساتھ تو دلچسپی تھی ہی، لیکن اس سے زیادہ دلچسپی روزینہ کے ساتھ تھی۔ وہ یہ سوچ کر سرائے کی طرف جا رہا تھا کہ درویش سے کہے گا کہ روزینہ کو کمرے میں اکیلی نہ چھوڑے اور اسے اپنے ساتھ لے چلے۔

ایسے ہی ہُوا جیسا اس نے سوچا تھا۔ وہ درویش کو شاہی بگھی میں بٹھا کر لے آیا۔ روزینہ بھی اس کے ساتھ تھی۔ اپنے محل جیسے گھر میں آکر برکیارق نے روزینہ کو اپنی ماں اور بہنوں کے پاس بھیج دیا اور درویش کو اپنے باپ کے پاس لے گیا۔

درویش نے سلطان ملک شاہ کو اپنے سامنے بٹھا لیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا۔ وہ کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور مراقبے میں چلا گیا۔ اس دوران تسبیح جو اس کے ہاتھ میں تھی اس کے دانے وہ انگلیوں سے آگے چلاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور تسبیح کے دانوں کو دیکھنے لگا پھر اس نے تسبیح الگ رکھ دی اور سلطان ملک شاہ کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔

"قابلِ صد احترام سلطان!" ——— درویش نے کہا ——— "بات وہی نکلی ہے جو میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ دشمن نے گھر بیٹھے وار کیا ہے۔ اس محل کے احاطے کے اندر کہیں نہ کہیں کالی بلّی کا سر دفن ہوگا۔ میں ابھی یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ سر کہاں دفن کیا گیا ہے۔ یہ بعد کی بات ہے۔ میں وہ سر نکال کر آپ کو دکھاؤں گا۔ فوری طور پر کرنے والا کام یہ ہے کہ آپ پر اس سفلی عمل کے جو اثرات ہیں وہ اُتر جائیں اور آپ کا دماغ پہلے کی طرح کام کرنے لگے"۔

"آپ یہ علاج کس طرح کریں گے؟" ——— سلطان ملک شاہ نے پوچھا ——— "کیا مجھے بھی کچھ کرنا پڑے گا؟"

"میں آپ سے نماز پڑھواؤں گا" ——— درویش نے کہا ——— "ایک وظیفہ بتاؤں گا جو آپ نے ہر نماز کے بعد کرنا ہوگا۔ باقی سارا کام میں خود کروں گا۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ مجھے کیا عمل کرنا ہے۔ آپ سات دنوں بعد پہلے کی طرح تروتازہ ہو جائیں گے"۔

"ایک اور بات بتائیں" ——— سلطان ملک شاہ نے پوچھا ——— "کیا آپ کے پاس کوئی ایسا عمل یا وظیفہ ہے جو کیا جائے تو طاقتور دشمن بھی زیر ہو جائے؟"

"بہت کچھ ہو سکتا ہے" ——— درویش نے کہا ——— "لیکن ایک سے زیادہ کام ایک

ہی بار شروع نہیں ہوں گے۔ سب سے پہلے تو آپ کو زندگی کے راستے پر رواں کرنا ہے جیسا کہ آپ پہلے ہُوا کرتے تھے۔ اس کے بعد اگلا کام ہوگا"۔

داستان گو جس دَور کی داستان سنا رہا ہے اُس دور میں انسانی فطرت کی کمزوریاں عروج پر پہنچی ہوئی تھیں۔ یوں کہیں تو زیادہ صحیح ہوگا کہ انسان کی فطرت میں کمزوریاں تو ہر وقت رہی ہیں لیکن حسن بن صباح کی ابلیسی فطرت نے ان کمزوریوں کو اس طرح ابھارا اور لوگوں کو یقین دلا دیا کہ یہی کمزوریاں ان کی خوبیاں ہیں جنہیں اللہ زیادہ پسند کرتا ہے۔ اِدھر حسن بن صباح تھا اور اُدھر سُلطان ملک شاہ کو ایک روحانی عامل مل گیا۔ اُس سلطان کی اپنی فطری کمزوریاں تھیں۔ یہی وہ شخص تھا جو جنگی قوت سے یا کسی بھی طریقے سے ابلیسیت کے اس طوفان کو اور اس سیلاب کو روک سکتا تھا اور روکنے کی پوری کوشش کر بھی رہا تھا۔ اس کی فطرت کی کمزوریاں ابھریں تو اس نے اپنے آپ کو ایک ایسے شخص کے حوالے کر دیا جو یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ پردوں کے پیچھے کی باتیں بتا سکتا ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ سلطان پہلے یہ دیکھتا کہ یہ شخص ہے کون اور کیا اس میں اتنی بڑی طاقت ہے بھی یا نہیں کہ یہ غیب کی باتیں بتا سکے۔

اُدھر اس کے بڑے بیٹے برکیارق میں ایک فطری کمزوری ایک حسین اور نوجوان لڑکی نے ابھار دی۔ وہ جو کہتا تھا کہ اس نے لڑکیوں میں کبھی دلچسپی نہیں لی، اس نے اس لڑکی کو اپنے اعصاب بلکہ اپنی عقل پر غالب کر لیا۔ یہ ذمہ داری برکیارق کی تھی کہ وہ پہلے دیکھ لیتا کہ اس درویش کے پاس کوئی علم یا کسی عمل کی کوئی طاقت ہے بھی یا نہیں یا یہ سلطان کو خوش کر کے انعام و اکرام حاصل کرنے کے چکر میں ہے۔

اُس وقت ضرورت یہ تھی کہ سُلطان ملک شاہ کو بیدار کیا جاتا اور اُس کی جو ذمہ داریاں تھیں وہ اس کے آگے رکھی جاتیں اور اسے کہا جاتا کہ ان ذمہ داریوں کو نبھانے کے لئے تیار ہو جاؤ اور میدانِ عمل میں کود پڑو۔

یہاں تک تو بات بالکل ٹھیک تھی کہ اس درویش نے اسے کہا تھا کہ وہ نماز باقاعدگی سے پڑھے اور ایک وظیفہ بھی کرے۔ سلطان ملک شاہ ویسے بھی عبادت کا قائل تھا اور صوم و صلوٰۃ کا پابند بھی تھا لیکن درویش نے اسے یہ جو کہا تھا کہ باقی عمل وہ خود کرے گا تو اس کا مطلب یہ تھا کہ سلطان کے ہاتھ میں روحانیت کی لاٹھی دے دی گئی تھی کہ وہ اس کے سہارے چلے گا۔ یہ درویش بھی مخلص ہو سکتا تھا اور اس کی بہن روزینہ بھی سچے دل

سے برکیارق کے ساتھ محبت کر سکتی تھی لیکن اس وقت کی صورتِ حال ایسی تھی کہ سلطان کو خود بھی اور اس کے بیٹوں کو بھی بیدار اور ذہنی طور پر چوکس رہنا تھا اور ہر وقت اللہ سے مدد مانگنی تھی۔

"سلطانِ عالی مقام!" ـــــ درویش نے کہا ـــــ "میں نے غیب کے پردے اٹھا کر دیکھ لیا ہے۔ حسن بن صباح نے جو سِفلی عمل آپ پر کروایا ہے وہ اُلٹا ہو کر اُسی پر جا پڑے گا۔ اس کی وہی حالت ہو جائے گی جو آپ کی ہو رہی تھی۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ جب کسی کا کیا ہوا عمل اُلٹا ہو کر اس پر جاتا ہے تو بہت ہی زیادہ نقصان کرتا ہے۔ میں ابھی یقین سے تو نہیں کہہ سکتا لیکن دھندلی سی ایک بات ہے جو میں آپ کو بتا دیتا ہوں۔ امکان موجود ہے کہ حسن بن صباح اس اثر کو برداشت ہی نہ کر سکے اور مر جائے۔ وہ مر گیا تو اس نے جو فتنہ کھڑا کیا اور اسے پھیلایا ہے' وہ خود ہی ختم ہو جائے گا۔ میں آپ کو باداموں کی سات گریاں اور سات ہی چھوہارے دوں گا۔ آپ نے یوں کرنا ہے کہ بادام کی ایک گری ہر صبح نہار منہ کھا لینی ہے اور رات سونے سے پہلے ایک چھوہارا کھانا ہے۔ یہ خیال رکھیں کہ بادام کی گری اور چھوہارا بہت دیر چباتے رہنا ہے اور جب یہ لعاب کی صورت اختیار کر لے تو نگل لینا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان سات دنوں میں آپ یوں محسوس کریں جیسے آپ کی تکلیف بڑھ گئی ہے تو پریشان نہیں ہونا۔ آٹھویں روز آپ اچھل کر پلنگ سے اٹھیں گے اور زندگی کے اُس راستے پر چل پڑیں گے جو خدا نے آپ کو دکھایا ہے"۔

درویش نے اپنے تھیلے میں سے باداموں کی سات گریاں اور سات چھوہارے نکالے اور سلطان ملک شاہ کے ہاتھ میں دے دیے۔

"یہ الگ رکھ دیں" ـــــ درویش نے کہا ـــــ "میں نے ان پر اپنا عمل کر دیا ہے۔ اس عمل کے لئے میں گذشتہ رات سویا بھی نہیں۔ یہ رات بھر کا عمل تھا"۔

درویش نے اپنے مخصوص انداز سے باتیں شروع کر دیں۔ ان باتوں میں امید کی چمکتی ہوئی کرنیں تھیں اور یہ کرنیں دلفریب رنگوں والی تھیں جن میں سلطان ملک شاہ کو مستقبل دَرخشاں نظر آ رہا تھا۔ درویش کی باتیں جو تھیں وہ اپنی جگہ پُراثر تھیں لیکن درویش کے بولنے کا جو انداز تھا' اصل اثر تو اس کا تھا۔ یہ اثر ایسا تھا جیسے کسی کو ہپناٹائز کیا جا رہا ہو۔ یہ اثرات سلطان ملک شاہ کے چہرے پر صاف نظر آنے لگے تھے۔ اس کی

آنکھوں میں چمک آتی جا رہی تھی اور اس کا چہرہ جو زردی مائل ہو گیا تھا' اپنے قدرتی رنگ میں نظر آنے لگا تھا۔

سلطان مکمل طور پر بلکہ کچھ غیر قدرتی طور پر بیدار ہو گیا اور اس نے درویش سے اس کے متعلق کچھ ذاتی سوالات پوچھنے شروع کر دیے۔ درویش نے سلطان کو وہی باتیں بتائیں جو وہ برکیارق کو بتا چکا تھا۔

"سلطانِ عالی مقام!" ـــــ درویش نے کہا ـــــ "میرے سر پر صرف ایک ذمہ داری ہے جس سے میں فارغ ہو گیا تو باقی عمر خانۂ کعبہ میں اللہ اللہ کرتے گزار دوں گا..... میرے ساتھ میری چھوٹی بہن ہے۔ میں اس کی شادی کسی ایسے آدمی کے ساتھ کرانا چاہتا ہوں جو مخلص اور دردمند ہو اور صحیح معنوں میں مسلمان ہی نہ ہو بلکہ مردِ مومن ہو"۔

"تمہاری بہن کہاں ہے؟" ـــــ سلطان نے پوچھا۔

"میرے ساتھ ہے" ـــــ درویش نے جواب دیا ـــــ "اسے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ میں اسے اکیلی نہیں چھوڑتا"۔

"پدرِ محترم!" ـــــ برکیارق بولا ـــــ "میں نے ان کی بہن کو دیکھا ہے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ مجھے اس کے پاس کچھ دیر بیٹھنا پڑا۔ میں نے اس کے ساتھ باتیں کیں تو میں نے محسوس کیا کہ ان کی بہن صرف خوبصورت ہی نہیں بلکہ ان میں عقل بھی ہے اور فہم و فراست بھی ہے۔ اگر آپ اجازت دیں گے تو میں ان کی بہن کے ساتھ شادی کر لوں گا"۔

"لڑکی کو یہاں لاؤ" ـــــ سلطان ملک شاہ نے کہا۔

لڑکی آ گئی۔ اس کے ساتھ برکیارق کی ماں بھی تھی۔ سلطان ملک شاہ پر درویش نے ایسا تاثر پیدا کر دیا تھا کہ اس نے کچھ زیادہ سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ اس نے لڑکی کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھا' ایک دو رسمی سی باتیں کیں۔ لڑکی نے ان باتوں کے معقول جواب دیے۔

"برکیارق!" ـــــ سلطان ملک شاہ نے ایسے لہجے میں کہا جیسے کوئی فرمان جاری کر رہا ہو ـــــ "تم اس لڑکی کے ساتھ شادی کرو گے"۔

برکیارق کی ماں بھی اس لڑکی سے متاثر ہو گئی تھی۔ اس نے خندہ پیشانی سے اپنے

خلوند کے فرمان کی تائید کر دی۔

"نہیں سلطانِ عالی مقام!" ــــ درویش نے ہاتھ جوڑ کر کہا ــــ "میں اس قابل نہیں ہوں کہ اتنی اونچی پرواز کی توقع رکھوں۔ فیصلہ سوچ سمجھ کر کریں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس محل میں میری بہن کو یہ طعنے ملنے شروع ہو جائیں کہ تو ایک بے گھر اور بے ٹھکانہ درویش کی بہن ہے"۔

"میں نے فیصلہ دے دیا ہے" ــــ سلطان نے کہا ــــ "یہ اسلام کے شیدائیوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عاشقوں کا خاندان ہے۔ یہاں لڑکی کو سر آنکھوں پر بٹھایا جائے گا۔ جو خدشہ تم نے ظاہر کیا ہے وہ ان دیواروں کے اندر ایک گناہِ کبیرہ سمجھا جاتا ہے"۔

"سلطان!" ــــ برکیارق کی ماں نے کہا ــــ "آپ پہلے صحت یاب ہو لیں۔ جونہی آپ اٹھ کر باہر نکلیں گے' برکیارق کی شادی اس لڑکی کے ساتھ کر دی جائے گی"۔

برکیارق کی ماں تو بہت ہی خوش تھی کیونکہ وہ سلطان کے چہرے پر تندرستی اور بشاشت کے آثار دیکھ رہی تھی۔ وہ بھی درویش سے متاثر ہوئی اور اس نے انعام واکرام کا اشارہ کیا لیکن درویش نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ وہ کسی انعام کے لالچ میں سلطان کو زندگی کی گہماگہمی میں واپس نہیں لا رہا بلکہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔

کچھ دیر بعد درویش روزینہ کو ساتھ لے کر رخصت ہو گیا۔

○

سلطان ملک شاہ کا معمول بن گیا کہ صبح جاگتا تو پہلا کام یہ کرتا کہ درویش کی دی ہوئی بادام کی ایک گری منہ میں ڈال کر چبانے لگتا۔ اس کے بعد وہ نہا کر نماز پڑھتا اور پھر درویش کا بتایا ہوا وظیفہ کرنے لگتا۔ عشاء کی نماز کے بعد بھی وہ وظیفہ کرتا اور اس کے بعد ایک چھوہارا منہ میں ڈال کر چبانے لگتا۔

برکیارق ہر روز روزینہ سے ملنے چلا جاتا تھا۔ روزینہ نے اسے کہا تھا کہ وہ اسے سرائے کے پچھواڑے والے باغ میں آدھی رات کے وقت ملا کرے گا لیکن اب اس احتیاط اور خفیہ ملاقات کی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ چند دنوں بعد برکیارق اور روزینہ نے میاں بیوی بن جانا تھا۔ برکیارق سرائے میں درویش کے کمرے میں چلا جاتا

اور درویش کسی نہ کسی بہانے سے باہر نکل جاتا۔ روزینہ اس پر ایک بڑے ہی حسین طلسم کی طرح طاری ہو جاتی اور برکیارق خود فراموشی کی کیفیت میں گم ہو جاتا۔

درویش ہر روز کچھ دیر کے لئے سلطان کے پاس جا بیٹھتا' اس کی آنکھوں میں جھانکتا اور پھر آنکھوں میں پھونکیں مار کر کچھ باتیں کرتا اور وہاں سے چلا آتا۔

پانچواں یا چھٹا روز تھا کہ سلطان نے اپنے سینے میں بے چینی سی محسوس کرنی شروع کر دی۔ اس نے کہا کہ درویش کو فوراً بلایا جائے۔ کچھ دیر بعد درویش آگیا۔ اس کے آنے تک سلطان ملک شاہ کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ سینے کی بے چینی بڑھ گئی اور ایسی ہی بے چینی کھوپڑی کے اندر دماغ میں بھی شروع ہو گئی تھی۔

"ایسا ہونا تھا" ــــ درویش نے کہا ــــ "یہ تکلیف برداشت کریں۔ کل اس وقت تک یہ تکلیف کم ہونے لگے گی اور اس کے بعد آپ بالکل قدرتی حالت میں آجائیں گے"۔

وہ دن اور وہ رات سلطان ملک شاہ سو بھی نہ سکا۔ اگلی صبح اس نے اپنی سانسیں رُکتی ہوئی محسوس کیں۔ اس نے ایک بار پھر درویش کو بلایا۔ درویش نے آکر پھر کل جیسی تسلیاں دیں اور مسرت کا اظہار کیا کہ جو عمل سلطان پر کیا گیا تھا وہ نکل رہا ہے اور یہ اس کے اثرات ہیں۔

اگلے روز سلطان نے صبح اٹھ کر بادام کی آخری گری کھائی۔ سارا دن تڑپتے گزرا اور سورج غروب ہو گیا۔ سلطان نے کہا کہ درویش کو بلاؤ اور اسے کہو کہ آج کی رات وہ اُس کے ساتھ گزارے۔ تکلیف اُس کی برداشت سے باہر ہوئی جارہی تھی۔

مزمل آفندی بہت دنوں سے سلطان کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ اسے یہی بتایا جاتا رہا کہ طبیب نے اور اب درویش نے سختی سے کہا ہے کہ سلطان کے پاس کوئی ملاقاتی نہ آئے۔ اس شام جب سلطان کی تکلیف بہت ہی بڑھ گئی تھی' مزمل بیتاب سا ہو گیا اور سلطان کو دیکھنے چلا گیا۔ برکیارق سے تو اس کی ملاقات ہر روز ہی ہوتی تھی اور برکیارق اسے بتاتا رہتا تھا کہ درویش نے کیا کہا ہے اور سلطان کی حالت کیا ہے لیکن اُس شام وہ اس قدر بے چین ہوا کہ وہ سلطان کے محل میں چلا گیا۔ اسے برکیارق ملا۔ مزمل نے برکیارق سے کہا کہ وہ سلطان کو دیکھنا چاہتا ہے۔ اس نے ایسی بیتابی کا اظہار کیا کہ برکیارق اسے سلطان کے کمرے میں لے ہی گیا۔

وہ سلطان کے کمرے میں داخل ہوُا تو دیکھا کہ سلطان پلنگ پر لیٹا ہوا اپنے سینے پر ہاتھ پھیر رہا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ لاش کی طرح سفید تھا۔ مزمّل تو سلطان ملک شاہ کا مرید تھا اور سلطان کو بھی مزمّل سے بہت پیار تھا۔ مزمّل کی نظر درویش کے چہرے پر پڑی جو قریب ہی بیٹھا ہُوا تھا۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی مزمّل کو دھچکا سا لگا جیسے اس کے پاؤں فرش سے اکھڑ رہے ہوں..... مزمّل نے درویش کی آنکھ کے قریب گال کی ابھری ہوئی ہڈی پر کالا تِل دیکھا جو مٹر کے دانے کے برابر تھا۔

ایسے تِل والا آدمی اسے گھوڑ دوڑ کے میدان میں ملا تھا اور مزمّل نے اسے پہچاننے کی کوشش کی تھی اور اسے کہا بھی تھا کہ وہ کہیں مل چکے ہیں۔ مزمّل کو یاد آیا کہ اس تِل والے آدمی کی داڑھی بڑے سلیقے سے تراشی ہوئی اور چھوٹی چھوٹی تھی اور وہ جوان تھا لیکن اس درویش کی داڑھی لمبی اور خشخشی تھی اور اس کی عمر کا اندازہ چالیس سال کے لگ بھگ تھا۔ اچانک مزمّل کو یاد آ گیا کہ اس نے اس تِل والا آدمی خلجان میں دیکھا تھا اور یہ آدمی اس کے ساتھ المُوت تک گیا تھا۔ اب اسے خیال آیا کہ یہ تو حسن بن صباح کا آدمی ہے۔

مزمّل کی کھوپڑی کے اندر جیسے دھماکہ ہُوا ہو۔ اس نے کچھ سوچے بغیر لپک کر بلکہ جھپٹ کر اپنا ہاتھ درویش کی لمبی داڑھی پر رکھا اور زور سے جھٹکا دیا۔ لمبی داڑھی مزمّل کے ہاتھ میں آ گئی اور درویش کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی کالی داڑھی رہ گئی۔ یہ وہ آدمی تھا جو اسے خلجان میں ملا تھا اور المُوت تک اس کے ساتھ گیا تھا اور یہی آدمی اسے گھوڑ دوڑ کے میدان میں ملا تھا۔ مزمّل نے اس کی پگڑی اتار دی۔ دیکھا کہ اس کے لمبے بال جو اس کے کندھوں تک پہنچتے تھے مصنوعی تھے۔ سلطان چونک کر اٹھ بیٹھا۔ برکیارق کھڑا ہو گیا۔

"سلطانِ محترم!" ـــــ مزمّل آفندی نے کہا ـــــ "اس شخص نے آپ کو باداموں کی گریوں اور چھوہاروں میں زہر کھلا دیا ہے..... فوراً طبیب کو بلائیں"۔

سلطان کی تلوار دیوار کے ساتھ لٹک رہی تھی۔ مزمّل نے لپک کر وہ تلوار نیام سے نکالی اور اس کی نوک درویش کی شہ رگ پر رکھ دی۔

"سچ بتاؤ تم کون ہو؟" ـــــ مزمّل نے پوچھا ـــــ "اور تمہارے ساتھ جو لڑکی ہے وہ کون ہے؟..... وہ تمہاری بہن نہیں..... اور تم حسن بن صباح کے بھیجے ہوئے آدمی

ہو"۔

"میرے دوست!" ـــــ درویش نے مسکرا کر کہا ـــــ "تم مجھے قتل کر سکتے ہو۔ میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔ یہ لڑکی جو میرے ساتھ ہے' اسے مشکوک یا مجرم نہ سمجھنا۔ یہ میری بہن ہے۔ یہ میری خفیہ زندگی سے لاعلم ہے۔ میں سلطان کا قاتل ہوں اس لئے میں اس حق سے محروم ہو گیا ہوں کہ سلطان سے درخواست کروں کہ میری بہن کو پناہ دی جائے اور میرے جرم کی سزا اسے نہ دی جائے"۔

سلطان ملک شاہ نے سنا کہ اس شخص نے درویش کے بہروپ میں اسے زہر دے دیا ہے تو اسے موت سر پر کھڑی نظر آنے لگی۔

"او ظالم انسان!" ـــــ سلطان نے اس جعلی درویش سے کہا ـــــ "اگر تو اس زہر کا اثر اتار دے تو میں تیرا یہ جرم معاف کر کے عزت سے رخصت کروں گا اور تیری بہن کی شادی اپنے بیٹے کے ساتھ کر دوں گا..... اور جو انعام مانگو گے دوں گا"۔

"نہیں بد نصیب سلطان!" ـــــ اس شخص نے کہا ـــــ "اس زہر کا کوئی تریاق نہیں جو میں نے باداموں اور چھوہاروں میں ملا کر آپ کو دیا ہے۔ مجھے مرنے کا ذرا سا بھی غم نہیں۔ مجھے انعام نہیں چاہئے۔ میں امام حسن بن صباح کا فدائی ہوں۔ میرے لئے یہی انعام کافی ہے کہ میں نے امام کی خوشنودی حاصل کر لی ہے اور میں سیدھا جنّت میں جا رہا ہوں۔ امام نے مجھے جس کام کے لئے بھیجا تھا' وہ میں نے کر دیا ہے"۔

طبیب آ گیا تھا۔ اُس نے سلطان کی نبض دیکھی' ایک دوائی بھی دی لیکن اُس کے چہرے پر مایوسی کا جو تاثر آ گیا تھا اسے وہ چھپا نہ سکا۔

برکیارق کی ماں اور روزینہ بھی سلطان کے کمرے میں آ گئی تھیں۔ ماں نے تو رونا اور چلاّنا شروع کر دیا تھا۔ برکیارق کے دونوں بھائی' محمد اور سنجر' بھی وہاں موجود تھے۔

"سلطان محترم!" ـــــ مزمّل آفندی نے کہا ـــــ "اس شخص کو میرے حوالے کر دیا جائے۔ اسے میں اپنے ہاتھوں قتل کروں گا"۔

"اسے لے جاؤ" ـــــ سلطان نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ـــــ "اسے کمر تک زمین میں گاڑ کر اس پر خونخوار کُتے چھوڑ دو..... اور ایک قبر کھود کر اس کی بہن کو زندہ دفن کر دو"۔

روزینہ نے خوفزدہ نظروں سے برکیارق کو دیکھا۔ برکیارق روزینہ کے آگے جا کھڑا

ہُوا۔

"نہیں!" ـــــ اُس نے کہا ـــــ "بے گناہ کو سزا نہیں ملے گی"۔

"بیوقوف نہ بنو برکیارق!" ـــــ مزمل نے کہا ـــــ "یہ ناگن ہے جسے تم اپنی پناہ میں لے رہے ہو"۔

"خبردار!" ـــــ برکیارق نے کہا ـــــ "اس لڑکی کے قریب نہ آنا' اور سب یہ بھی سوچ لو کہ سلطان زندہ نہ رہے تو میں ان کا جانشین ہوں۔ میں سلطان ہوں۔ اب میرا حکم چلے گا" ـــــ اس نے حسن بن صباح کے فدائی کی طرف اشارہ کر کے کہا ـــــ "اسے اسی طرح ہلاک کیا جائے جس طرح سلطانِ معظم نے حکم دیا ہے"۔

یہ ہنگامہ جاری ہی تھا کہ سلطان ملک شاہ نے آخری ہچکی لی اور فوت ہو گیا۔

جعلی درویش کو قید خانے میں بھیج دیا گیا۔ اسے اگلے روز کتوں سے مروانا تھا۔

اب برکیارق سلطنتِ سلجوقیہ کا سلطان تھا۔

یہ دوسری بڑی شخصیت تھی جسے حسن بن صباح نے نظام الملک کے بعد قتل کروایا۔